سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات)

ماسٹر محمد نواز

سیرتِ سرورِ عالمؐ

(پر اعتراضاتِ مستشرقین کے جوابات)

ماسٹر محمد نواز

(ریٹائرڈ ایس۔ ایس۔ ٹی، انچارج ہیڈ ماسٹر)

حسنِ ادب، فیصل آباد

ASIAN RESEARCH INDEX

ARI ID: 1689956726155

”جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں“

کتاب: سیرتِ سرورِ عالم ﷺ
پر اعتراضاتِ مستشرقین کے جوابات
(جلد اول)

مصنف: محمد نواز

ترتیب و تدوین: اقرار مصطفٰے

حروف بندی: عامر عباس (733 گ۔ب)

نظرِ ثانی: طالب ری
پروفیسر عطر عال (ساہیوال)

سرورق: عاطف عارف

ناشر: حسنِ اب فیصل آ. با

اشاعت: 2022ء

قیمت: 1200

رابطہ: 0321.6568941

OPEN ACCESS

CC BY

ECO FRIENDLY

انتساب

حضور نبی کریم احمد مجتبیٰؐ، محبوبِ خدا

محمدِ مصطفیٰؐ

کی خدمتِ اقدس میں

بہ صد عجز و نیاز

اشارات برائے مطالعہ

عبارت میں جہاں یہ علامتیں استعمال ہوئی ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ن: نقوش رسول نمبر

ص: صفحہ نمبر

ج: جلد نمبر

م۔م۔ک۔الف۔ف: مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر

الف۔ن۔پ: اعلان نبوت سے پہلے

ش: شبلی نعمانی کی سیرت مراد ہے

اگر ۱۱/۶۰۷ جیسا لکھا ہو تو جلد اور صفحہ دونوں مراد ہوں گے

س: سیرت النبیؐ

س۔ش: سیرت النبی،شبلی نعمانی

ترتیب

❖ وصیتِ علم وعمل ۷

❖ کارِ سعادت ۱۰

❖ حضرت محمدؐ، حضرت ابراہیمؑ اور خانہ کعبہ ۱۳

ملکِ عرب	۱۳	حضرت ابراہیمؑ کی مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت	۳۰
نسب نامہ	۴۴	قصیٰ بن کلاب	۶۹
حضرت عبدالمطلب	۸۴	اصحابِ فیل کا قصہ	۸۵

❖ حضرت محمدؐ کی ولادت، بچپن اور معجزات ۹۷

نور کی برسات	۱۲۲	مہرِ نبوت	۱۳۶
دودھ پلائی والی پہلی خاتون	۱۴۲	رسمِ عقیقہ اور نام رکھنا	۱۴۳
بدھ کی پیشین گوئی	۱۵۴	اسمِ محمد ﷺ سے مطابقت	۱۶۱
رضاعت	۱۷۴	برکات کا نزول	۱۹۴
رضاعی ماؤں پر ایک بحث	۱۹۶	شقِ صدر	۲۰۰
سیدہ آمنہ کی وفات	۲۰۹	حضرت عبدالمطلب کی کفالت	۲۱۸
حضرت ابوطالب کی کفالت میں	۲۲۶	حضرت محمدؐ کا خاندان	۲۴۰
صرع کے دوروں کا الزام	۱۵۷	صرع کے الزام میں مستشرقین کی تردید	۲۶۴

❖ اسلامی عقاید اور دیگر مذاہب ۲۶۹

❖ حلف الفضول ۳۱۱

حلف الفضول کی امتیازی شان	۳۲۳	عصریات	۳۲۶
شام کا دوسرا سفرِ تجارت	۳۳۶		

❖ حضرت خدیجہؓ سے شادی اور ان کا کاروبار ۳۳۷

حضرت خدیجہؓ	۳۳۸	شادی سے متعلق روایات	۳۳۹
روایات کے بارے میں تضادات	۳۴۱		

❖ اعلانِ نبوت سے پہلے حضورؐ کا عقیدہ اور ایمان ۳۶۱

❖ ازواجِ مطہرات، زیادہ شادیاں اور عرب روایات ۲۶۹

ام المومنین حضرت خدیجہ	۳۸۳	ام المومنین حضرت سودہؓ	۳۹۴
ام المومنین حضرت عائشہؓ	۴۰۱	واقعہ اِفک	۴۰۸
ام المومنین حضرت جویریہؓ	۴۳۵	ام المومنین حضرت حفصہؓ	۴۳۷
ام المومنین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ	۴۴۰	ام المومنین حضرت ام سلمیٰؓ	۴۴۰
ام المومنین حضرت زینبؓ بنتِ جحش	۴۴۶	ام المومنین حضرت امِ حبیبہؓ	۴۷۷
ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیئ	۴۸۰	ام المومنین حضرت میمونہؓ بنت الحارث	۴۹۵
ام المومنین سیدہ ماریہ قبطیہؓ	۵۱۱	تعدد ازواج پر الزامات	۵۱۸
اجتہادی غلطیاں	۵۳۴	کتابیات	۵۵۳

وصیتِ علم و عمل

وجودِ انسانی کے ارتقا کی تاریخ کو نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو اس کی تمام تر ترقی ''علم'' کی مرہون منت ہے۔علم ہی وہ اکائی ہے جس میں تہذیب وتمدن اور تربیت کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔علم کی خصوصیت کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے اس کے سبب سے اسے فرشتوں پر فضیلت ملی اور اسی کی بدولت خلافت کا تاج سر پر سجا۔حد تو یہ ہے کہ پہلی وحی کا آغاز ہوا۔ارشاد ربانی ہے ترجمہ:۔''اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا''۔یہ بھی ارشاد ربانی سنتے چلیے ۔ ترجمہ:۔''اللہ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجات بلند فرماتا ہے''۔قرآن کریم میں ہی اللہ پاک نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو یہ دعا عطا فرمائی ۔ترجمہ:۔''کہو،اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما''۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے'' یہی وہ علم ہے جس کی افضلیت کے پیش نظر حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں ''ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم عطا کیا اور جاہلوں کو دولت دی کیوں کہ دولت تو عنقریب فنا ہو جائے گی اور علم کو زوال نہیں''۔

تاریخ انسانی میں ایک خواہش جو اپنے تمام تر مدارج سمیت جھلک رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جداگانہ شناخت اور منفرد پہچان کا متمنی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے مثبت اعمال و افعال بروئے کار لاکر ہی ازلی و ابدی پہچان تک رسائی حاصل کر لینا اصل شناخت اور پہچان ہے ۔اہل علم جانتے ہیں کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب علم کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا جائے اور فضل باری تعالیٰ بہ وسیلہ نبی مکرم ﷺ کا اقرار دل و جان سے کیا جائے۔

اگر غور وخوض سے کام لیا جائے تو یہ عمل عین فطرت ہے اور فطرت بھی اپنے اظہار کے لیے ہر دو حوالہ سے سرگرم عمل ہے ۔میرے والد مرحوم (ماسٹر محمد نواز ،ایس ایس ٹی،انچارج ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول 736 کمالیہ) درس وتدریس سے دم آخر تک منسلک رہے گو وہ 60 سال کی عمر میں ریٹائرڈ ہوئے ،مگر اس کے بعد بھی علم تقسیم کرنے سے کبھی پیش وپس نہ کیا۔اس حوالے سے ان کا نظریہ اس شعر کے مصداق تھا کہ

سینے میں ہی دبانے سے کس کام کا ہے علم
تقسیمِ رزقِ فکر سے اس کا ثمر سمیٹ

ماسٹر محمد نواز میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو شرف انسانی کو ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ان کی زندگی کا ایک ایک پہلو نمایاں ہے۔اگر ان پہلوؤں پر قلم فرسائی کروں تو کئی دفتر تحریر ہو جائیں۔مگر

میں ایسا اس لیے نہیں کروں گا کہ نہ تو قصیدہ نگاری مقصد ہے نہ ہی یہ سوانح نگاری کا محل ہے اور نہ ہی ان کو کبھی ایسی خواہش رہی، بس ایک پہلو جوا کائی کی صورت ہے، جس سے زندگی کے تمام پہلوؤں میں سر سبزی دکھائی دیتی ہے وہ ہے علم۔ وہ علم سے منور، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حقیقی حب دار اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کی شخصیت ڈاکٹر محمد علامہ اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر تھی۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ان کی علمی اثاث اور علمی موانست جوان کے تمام شاگردان، دوست احباب، تکلف کی ملاقات والے، رشتہ دار، خاندان اور انجان ہر ایک میں یکساں تقسیم ہوئی، جس سے مستفیض ہو کر اب تک بہت سے حضرات زندگی کو شاداب کیے ہوئے ہیں۔ انھیں علم، صاحبان علم، تشنگان علم اور متلاشیان علم سے محبت تھی، ان کا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا سب کچھ علم، حصول علم اور تقسیم علم کے لیے وقف تھا۔ حتیٰ کہ وفات سے کچھ دن قبل انھوں نے مجھے وصیت فرمائی جو وصیت کی وصیت اور دعا کی دعا تھی۔ فرماتے ہیں کہ ''ساری زندگی مجھے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رہنے دی ہمیشہ نوازشات کا سلسلہ جاری رہا اور ان شاء اللہ تمھیں بھی کبھی اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کسی بھی چیز کی کمی نہیں رہنے دے گا۔ میری تالیف جو نبی آخر الزماں کی سیرت کے حوالہ سے اُن صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفقت، محبت اور اللہ پاک کے فضل سے مکمل ہو گئی ہے اس کی اشاعت لازمی کروانا''۔

میں نے عرض کی کہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ ہم مل کر اس کتاب کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے منصۂ شہود پر لائیں گے۔ وہ زیرِ لب مسکرائے اور یوں گویا ہوئے کہ ''نہیں، میں نہیں ہوں گا یہ کام تجھے کرنا ہے''۔ اس وصیت اور دعا کے چند روز بعد وہ انتقال فرما گئے۔ مجھے ان کی سنائی ہوئی حدیث یاد پڑتی ہے کہ حضرت ابو قتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنی موت کے بعد جو کچھ دنیا میں چھوڑ جاتا ہے اس میں تین چیزیں بہترین ہیں۔ ایک نیک اولاد (جو بعد میں اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے)، دوسری صدقہ جاریہ (کنواں، نلکا، سرائے یا سڑک وغیرہ تعمیر کروائے) کا اجر ملتا رہتا ہے اور تیسری، وہ علم (جس پر اس کے بعد عمل ہوتا رہتا ہے)''۔ ابن ماجہ، فضائل اخلاق، کتاب اسوہ حسنہ جلد دوئم صفحہ نمبر 270۔

علم دو حیثیتوں سے باقی رہتا ہے ایک صورت یہ ہے کہ علم دوسروں کو سکھایا جائے اور انہیں اس پر عمل کی تلقین کی جائے، جسے عرف عام میں سینہ بہ سینہ علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ کہ انسان اپنا علم کتابی صورت میں پیش کرے جو اس کے بعد پڑھا جائے اور اس پہ عمل ہوتا رہے۔ لہٰذا علم کی ان دو حیثیتوں کی پہلی صورت جو سینہ بہ سینہ علم کی ہے اس میں محمد نواز احسن طریقہ سے سینوں کو علم سے منور

کرتے رہے، جبکہ دوسری صورت کتابی صورت ہے جس کے لیے حدیث، وصیت اور دعا کی روشنی میں سبک دوش ہونے کا قصد کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے محبوب ﷺ کے وسیلہ سے میں اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں کام گار رہوا۔ کتاب کی حروف بندی پہ نظر ثانی (proof reading) کے لیے اور خاص کر کے قرآنی آیات کے لیے حفاظ اکرام نے کمال محبت دکھائی، ممکن ہے اب بھی کہیں آیات کے اعراب درست نہ ہوں اس کے لیے پیشگی معذرت، اور آپ حضرات سے استدعا ہے کہ اگر کہیں کوئی اعرابی غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تا کہ آنے والی مزید اشاعتوں میں اس کو رفع کیا جا سکے۔

جو احباب اس کتاب کے لیے مدد و معاون ثابت ہوئے، اللہ پاک ان سب احباب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں سلامت و شاداب رکھے۔

میری طرف سے آپ کو ہر دم دعا برائے خیر
صبح و مسا ہو آپ پر نظر خدا برائے خیر

یہ کتاب جہاں مرحوم محمد نواز کے لیے توشہ آخرت ہے وہیں میرے لیے بھی دنیا و آخرت کی کامرانی اور کامیابی کا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ اسی کے ساتھ باپ کی دعا ہمیشگی کا روپ لیے ہوئے سایہ فگن ہے۔ اللہ پاک میرے والد مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور اپنے محبوب کے صدقے صالحین، صادقین، صابرین، شاکرین، عابدین، ذاکرین اور سچے سُچے علما و فضلا کے ساتھ بروز حشر اٹھائے (آمین ثم آمین)

اقرار مصطفیٰ

کمالیہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

☆☆☆☆☆☆

کارِ سعادت

قیاس ذاتی کسی بھی اعتراض گزار کی بنیادی قوت ہوتی ہے جسے وہ شعور (خود ساختہ شعور جو آرٹ کے درجے میں ہے) کے ذریعے کسی معروضی حقیقتِ مطلق کو اپنے شعور کے مطابق قیاس کر کے مسرور ہوتا ہے تبھی کہا جاتا ہے خود سے یگانگی حقیقت سے بیگانگی کے مترادف ہوتی ہے۔ ہر ہیچ مدان و ناتواں کو اپنے عقلِ کل ہونے کا زعم وقوف سے عاری کرتا ہے اس لیے مضحکہ خیز اعتراضات کو فتوحات گردانتا ہے۔ حالاں کہ راست علم ہمیشہ کسی واقعی معروض کی تمیز سے اٹھتا ہے یعنی موجود پر قوتِ امتیاز یا وجدانی ادراک کے ذریعے جوہر کے اسماو شناخت کا سفر طے کیا جاتا ہے۔ ہر چند ہر مذہب موضوعِ علم بننے کی پوری استطاعت رکھتا ہے۔ ہاں مگر ناظر کا صاحبِ وجدان ہونا ازحد ضروری ہوتا ہے۔ چوں کہ ہر قضیہ وجدانی ادراک کے متحرک ہونے سے جنم لیتا ہے۔ ہم زمان و مکان کا ادراک اسی استعداد کی تحریک سے کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک طے شدہ امر ہے کہ شعورِ علمی کی تشکیل میں خارجی معروض کا ہونا بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اگر خارجی معروض اور اس سے منسوب شعورِ انسانی میں مطابقت نہ ہو تو قضیہ کے بجائے بے بنیاد مناقشات ظہور کرتے ہیں، جن پہ خارجی واقعیت دلالت نہیں کرتی اور نتیجہ خیز حقانیت کی راہیں بھی برابر مسدود ہوتی جاتی ہیں۔ جب معترضین اپنے خود ساختہ علم کا قابلِ قبول شعور پیدا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں تو اس کی غلط توجیہات پر قانع ہونے کے شعور سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ نظریاتی تسکین جب بھی ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو معیاری اور یقینی علم کو محال کر دیتی ہے۔

اعتراض محاذ تب بنتا ہے جب علمی کے بجائے ذاتی تسکین اور ضرورت سر بلند ہو کر دل و دماغ پر چڑھ دوڑتی ہے۔ سوال بنیادی طور پر غذائے علم و جستجو ہے۔ شعور کا عینی، واقعی اور آزادانہ تحرک نہ ہو تو ہر قسم کے قضایہ دم توڑ دیں۔ سچ یہ ہے کہ علم اور علم کی صورت گری مماثلت و مغائرت سے ہی ممکن ہے۔ تخالف کبھی علم و امکان کے در بند ہونے نہیں دیتا البتہ اس کی نوعیت کا فطری اور حقیقی ہونا لازم ہے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام، حضور ﷺ کی سیرت مبارک پر اعتراضات کی نوعیت عالمانہ اور محققانہ کی بجائے بالعموم متعصّبانہ، مخالفانہ یا عدم واقفیت کی بنا پر رہی ہے۔ موضوعات و محتویات میں تحقیق و تجزیہ کی کارفرمائی نہ ہونے کے مترادف ہے۔ اکثر معترضین کا مدعا مخالف کی دل آزاری اور آزردگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے حقائق کو توڑ موڑ کر بیان کرنا قیاسی روایت و درایت پہ ایمان لانا، تاریخی معلومات اور جغرافیائی اعتبار سے بعض آیاتِ قرآنی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا، معترضین کا شیوا رہا ہے۔ ایسی

ناانصافیاں صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔ بعض معترضین (مذہبِ غیر کے حامل) حقانیت اسلام کی بابت حق گئی اور تسلیمات سے جی خوش ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''جان ڈیون پورٹ'' اور ''گارڈ فری'' کی کتب معتبر ہیں۔ بے بنیاد اعتراضات، بے جا طرف داری اور تنگ نظری کی مثال ولیم میور ایسے مورخ بھی ہیں جو حقائق کو مسخ کرنے اور انھیں اپنے مقصد کی بجا آوری میں استعمال کرنے کے ماہر ہیں۔ ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' جب سر سید کی نظر سے گزری تو ان کی حالت یوں ہوئی کہ ''ان دنوں ذرہ قدرے دل کو سوزش ہے ۔ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا۔ اور اس کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا'' حقائق کی راست بازیافت میں کوتاہیوں کی داستان صرف غیر مذہب معترضین نے ترتیب نہیں دیں بلکہ ان کے اعتراضات کو ہوا دینے میں اکثر مسلمان مفسرین نے بھی حصہ ڈالا ہے۔ ابتدائی کتب احادیث و سیر میں مفسرین نے بعض روایات کو طبعی جولان سے زیبِ داستان کیا ہے۔ جس پر مخاصمین نے انحصار کر کے اعتراضات کو تقویت دی ہے۔ یعنی غیر تو غیر ہی تھے اپنوں نے بھی ایسے کام انجام دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سرسید لکھتے ہیں ''اپنی تصنیفات کا حجم بڑھانے کی نیت سے مفسرین اور اہلِ سیر نے تمام مہمل اور بے ہودہ افسانوں کو جو عوام الناس میں مشہور تھے بہ کمالِ آرزو جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے۔ بعض نے اپنی تفسیروں میں واعظین کے لیے دل چسپ اور عجیب وغریب حمکاء کے خوش کرنے کے لیے دور از عقل و قیاس مضامین جو یہودیوں کے ہاں مروج تھے جمع کر دیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی حدیثیں جناب پیغمبرِ خداؐ کے نام سے جھوٹی اور موضوع بنائی گئیں'' (خطباتِ احمدیہ، ص ۸۰، ۸۱) حالاں کہ ایسی من گھڑت باتوں کی وہاں کیا ضرورت ہوسکتی ہے جہاں ایک ایسی ذات ہو جو بے شمار خصائل (وحدت، کثرت، اولیت، آخریت، بے مثالیت، خیریت) کی حامل ہو۔ اپنی مثال آپ ہو اور سچ یہ ہے کہ جن کی محبت ایمان کی بنیاد ہو اور صاحبِ ایمان ہونے کا واحد اور حتمی ذریعہ ہو۔

انھی ضعیف روایات کے سبب بعض سائنسی نکتہ نظر کے حامل افراد اکثر کہتے رہتے ہیں۔ یہ احادیث کی کتب ہیں یا تاریخ کی۔ اس سوال کا جواب جو بھی ہو یہ طے ہے کہ اس منفی پہلو نے معترضین کے اعتراضات کے لیے راہ ہموار کی۔ حقیقت یہ ہے ذرائع علم کے ماخذ کا مضبوط ہونا از حد ضروری ہے۔ جب ذرائع علم ہی بدل جائیں یا ماخذ غیر مستند ہو تو ہر توضیع و تفسیر بلا جواز ہوگی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بعض مسلم محققین نے اعلیٰ وارفع مقاصد کی بجا آوری کے لیے روایت و درایت کے بے مثل تحقیقی اصول و ضوابط کی مضبوط بنیادیں رکھیں۔ اس ضمن میں ان کا حزم و احتیاط کا سلیقہ واقعتاً قابلِ قدر اور قابلِ فخر ہے۔ کسی بھی کم فہم راوی کو ''مجروح'' اور اس کی روایت کو بلا تکلف ''مردود'' قرار دیا ہے۔ ان کے معیارِ تحقیق پر اقسامِ حدیث (مرفوع، موقوف، قولی و فعلی و تقریری، نیز آحاد و متواتر، مشہور و عزیز و غریب، صحیح و

حسن، مقبول و مردود وغیرہ) گواہ ہیں۔ درایت کی بابت منافقین کی افترا پردازی کی قلعی کھولنے کے لیے سکہ و مستند ہونے کے ساتھ منطقی صحت امانت، دیانت، صداقت کو معیار بنایا۔ روایت کے ضمن میں راوی کے لیے کوئی رو رعایت نہیں رکھی۔ ہر دو طرح کی چھان بین کو خارجی، نقد یا نقدِ سند سے گزارا۔ جب کہ متنِ حدیث کی پرکھ کے لیے نقد یا نقدِ متن کے پیمانے وضع کیے۔

تحقیق کی بابت کسی بھی محقق کا فی نفسہٖ معتدل و متوازن و غیر محتسب، حق گو و عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع سے طبعی مناسبت کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ اندازِ تحقیق سائنسی ہو یا اطلاقی نتائج کا منطقی پہلو زوردار اور پروقار ہونا چاہیے۔ جوشِ خطابت میں بے جا طوالت یا پھر زعمِ علمیت میں ہٹ دھرمی دلائل کے بجائے طبعی مناسبت کو ترجیح محقق کے لیے زہرِ قاتل کے مصداق ہے۔ ان معیارات کو اپناتے ہوئے اور حشو و زوائد سے بچتے ہوئے محمد نواز صاحب (جو پیشہ کے اعتبار سے درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں) نے شاندار علمی و تحقیقی کارنامہ ''سیرتِ سرورِ عالم پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات'' کے نام سے ترتیب دیا ہے، جس میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر اعتراضات کو حقائق اور دلائل سے بے بنیاد ثابت کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے دستاویزی تحقیق میں سائنسی اور منطقی طریقے کو ترجیح دی ہے۔ حقائق پسندی میں اس قدر دلچسپی مثالی ہے کہ کسی بھی مرحلے پر جذباتی اسلوبِ بیان کی چھاپ نہیں پڑنے دی۔ مسائل کو استخراجی اور استقرائی طریق پر قوتِ استدلال کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں انھیں اخلاقی معیار قوتِ ارتکاز مسلسل توجہ، استقامت اور بااصول جدوجہد پر داد دیتا ہوں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایسے کام کیے نہیں جاتے بلکہ کروائے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ کارِ سعادت انھی کے حصے میں آیا ہے۔ اسی لیے موصوف نے اداروں کا کام تنہا کر دکھایا۔ سیرتِ طیبہ کے اعتراضات کے جواب میں وسیع خزینہ تیار کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب اکرم ﷺ کے صدقے اس علمی و تحقیقی کاوش کو اپنی بارگاہ میں خاص مقام عطا فرمائے۔ سیرت کے باب میں ان کی خدمات قبول فرمائے اور نافع بنائے۔ آمین

ڈاکٹر غلام شبیر اسد

جھنگ، ۲۔ رمضان، ۱۴۴۳ ھجری

حضرت محمدؐ، حضرت ابراہیم اور خانہ کعبہ

ملک عرب:

محل وقوع: براعظم ایشیاء کے جنوب مغرب میں واقع ملک عرب کے تین اطراف سمندر اور چوتھی طرف خشکی ہے۔مغرب میں بحیرہ قلزم ہے جو مکہ معظّمہ سے مغربی جانب تقریباً ستتر (۷۷) کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔اس کے علاوہ مغرب میں آبنائے سویز اور بحیرہ روم ہے۔مشرق میں خلیج فارس اور عمان' جنوب میں بحر ہند اور اس کے شمال میں شام وعراق اور شمال سے جنوب تک ایک سلسلہ کوہ پھیلا ہوا ہے' جسے جبل السراۃ کہتے ہیں' شمال میں یہ شام اور فلسطین کے پہاڑوں سے جا ملتا ہے۔اس سلسلہ کو جگہ جگہ سے وادیاں قطع کرتی ہیں۔سلسلہ جبال السراۃ کو توریت میں سلسلہ کوہ فاران کا نام دیا گیا ہے۔(سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ص۲۰) جغرافیہ کے ماہرین نے اس ملک کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔جن میں سے ایک حجاز ہے۔چونکہ ''تہامہ'' اور ''نجد'' کے درمیان حاجز ہے جو تہامہ اور نجد کو الگ کرتا ہے اس لیے ملک کے اس حصہ کو حجاز کہتے ہیں۔حجاز کا زیادہ حصہ بنجر اور بے آب وگیاہ ہے جسے قرآن مجید نے ''وادی غیر ذی زرع'' کہا ہے۔اس میں صدیوں سے موجود (عرب کا قدیم شہر مکہ) یا بکہ ایک تجارتی مرکز تھا۔یمن، شام اور حبشہ کے مابین تجارتی قافلوں کی گزرگاہ پر واقع تھا۔ یہاں کے باشندے بھی خوب تجارت کرتے تھے۔یمن اور حبشہ کی مصنوعات اور پیداوار خرید لاتے اور انہیں مصر اور شام کے بازاروں میں جا کر فروخت کرتے۔وہ بصریٰ اور دمشق کے میلوں سے بھی سامان خرید لاتے اور اس کے بدلے میں اپنا سامان فروخت کرتے تھے۔موسم گرما میں شام و مصر اور موسم سرما میں یمن کو اپنا سامان تجارت لے جاتے تھے۔

ارشاد ربانی ہے''لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ o اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ o فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ o الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ o وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ o ترجمہ:اس لیے کہ قریش کو میل دلایا' ان کے جاڑے اور گرمی دونوں کے کوچ میں میل دلایا تو انہیں چاہیے اس گھر کے رب کی بندگی کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور انہیں ایک بڑے خوف سے امان بخشا''۔(القریش، پارہ ۳۰)

اعتراض نمبر ا

کئی عیسائی مورخین کا کہنا ہے کہ'' مکہ کی قدامت کا دعویٰ جو مسلمان کرتے ہیں' قدیم تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔جدید انسائیکلو پیڈیا میں محمد ﷺ کے مضمون جو مستشرق ''مارگولیس'' کا ہے وہ اس میں مکہ معظّمہ کی نسبت لکھتا ہے کہ'' قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا' بجز اس کے کہ

زبور(۸۴۔۶) میں وادی بکہ کا لفظ ہے لیکن وہ اسے زبور کی ضعیف عبارت سمجھتا ہے۔ عبارت یہ ہے ''بکہ کی وادی میں گزرتے ہوئے اسے ایک کنواں بتاتے ہیں' برکتوں سے ''مورہ'' کو ڈھانک لیتے' قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے''۔

جواب: قرآن مجید زبور کی عبارت میں دو لفظوں کی تصدیق کرتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے ''اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا '' ترجمہ (بے شک پہلا گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا وہ بکہ میں تھا' برکت والے سارے جہان کا'')۔ (آل عمران ۹۶، پارہ ۴)

لفظ بکہ کے بعد مورہ کے بارے ارشاد ربانی ہے۔ ''اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَۃَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ '' ترجمہ ''بے شک صفا اور مروہ اللہ کے نشانوں میں سے ہیں'' (البقرہ ۱۵۸، پارہ ۲)۔ زبور کی عبارت کی تصدیق قرآن مجید نے صراحتاً کردی ہے جس سے مسلمانوں کا مکہ کی قدامت کا دعویٰ درست ثابت ہوتا ہے۔

مکہ قدیم زبانوں کے بعض محققین کے نزدیک بابری یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنی گھر کے ہیں اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل اور کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے۔ دوسرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اس گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا بکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے (کتاب زبور ۸۴۔۶ میں ہے) بکہ کی وادی سے گزرتے ہوئے ایک کنواں بتاتے؛ برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے؛ قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے۔ (سیرت النبی۔ ۱،۱۰۲) اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے یہ وہی مکہ معظّمہ ہے اور یہ مکہ کا قدیم نام ہے۔ قرآن کریم میں یہ نام سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۰ میں آیا ہے ارشاد ربانی ہے۔

''اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا '' (آل عمران ۹۶، پارہ ۴)۔ حضرت داؤد خدا سے کہتے ہیں اے فوجوں کے خدا تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں۔ میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق ہے بلکہ عاشق ہے، اے خدا تیرے قربان گاہ میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارک ہو ان لوگوں کو جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں:

۱۔ قربانی گاہ ہو۔ ۲۔ حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو۔

۳۔ وہ وادی مکہ وادی بکہ کہلاتی ہو۔ ۴۔ وہاں مقام مورۃ بھی ہو۔

یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں اور قطعی طور پر یہ یقینی بات ہے کہ بکہ وہی مکہ معظّمہ اور مورۃ وہی مروۃ ہے، مورۃ

کی وضاحت قرآن پاک نے بھی کردی ہے " اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰه "(البقرہ۱۵۸، پارہ۲)

دوم: ریاست مکہ کے حکمران:؛ سن ۲۰۷ء میں بنوخزاعہ نے بنوجرہم کونکال دیا اور مکہ پر قابض ہو گئے۔خزاعہ کا سردار عمرو بن لحی تھا جس نے مکہ میں بت پرستی کو رواج دیا تھا۔خزاعہ کا آخری حکمران حُلیل تھا۔قصی بن کلاب نے اس سے حکومت حاصل کی تھی۔قصی کے مکہ پر قابض ہونے سے قبل مکہ پر قبائلی حکمرانوں کی حکومت تھی۔ یہ نہ جانے کس نوعیت کی تھی؟ فرد واحد یا پورے قبیلے کی حکومت تھی؟ کیا سردار کے سامنے قبیلہ کی حیثیت رعایا کی تھی؟ حکومت کرنے کا کون سا طریقہ تھا؟ خانۂ خدا کی تولیت کا انتظام کس قسم کا تھا اور کس کے قبضہ میں تھا؟ حجاج کی ضروریات پوری کرنے اور ان کی خدمات کا کیسا انتظام تھا؟ ان سولات سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ مکہ قدیم شہر ہے جس پر قبل مسیح سے حکومت قائم تھی۔''جیرالڈ ڈی گاری''(gevald de gaory) نے قصی سے پہلے مکہ کے حکمرانوں کی ایک فہرست تیار کی ہے، جس کو درج کرنا ضروری ہے تا کہ اس سے ہمارے موقف کہ'' مکہ'' قدیم زمانہ سے نقشہ ارض پر موجود تھا' کو تقویت ملتی ہے اور مستشرقین کے الزامات کا بھانڈا چورا ہے میں پھوڑ دیتا ہے جو اسے قدیم نہیں مانتے۔ملاحظہ فرمائیں۔

نام حکمران	سن کیفیت
۱۔جرہم بن جہلا	۴۷تا۴۴۔ق۔م
۲۔ابوحلیل بن جرہم	۴۴تا۱۴ق۔م
۳۔جرہم بن ابویلیل	۱۴تا۱۶عیسوی سن
۴۔عبدالمنان بن جرہم	۱۶عیسوی تا۴۲ء
۵۔بقیلہ بن عبدالمنان	۴۶ءتا۷۶ء
۶۔عبدالمسیح بن بقیلہ	(اس کا اصل نام عمرو تھا)
۷۔مواحدہ اکبر بن عبدالمسیح	۱۰۶ءتا۱۳۶ء
۸۔عمرو بن معاذ	۱۳۶ءتا۱۷۰
۹۔حارث بن مواحدہ	
۱۰۔عمرو بن حارث	
۱۱۔بشر بن حارث	۱۷۰تا۲۰۶ء
۱۲۔معدالاصغر بنعمرو بن محد	(نقوش رسول نمبر۲۔۴۰۹)

اوپر کی فہرست میں ان حکمرانوں کے علاوہ عرب میں قدیم پانچ حکومتیں تھیں۔

اول: یمنی یا معینی: تقریباً ان کے پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے۔
دوم: حضرموتی   سوم: قیتبانی
چہارم: سبائی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۱۱۵ سال قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور کے بعد حمیر نے قبضہ کر لیا۔ حمیر کے ۲۶ حکمران ہوئے۔
پنجم: نابتی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلامؑ کے بیٹے نابت کی طرف منسوب ہے۔

گلازر کا خیال ہے کہ یمنی یا معینی حکومت ۱۵۰۰ ق۔م میں موجود تھی جبکہ ''مولر'' کا کہنا ہے کہ کوئی یمنی کتبہ آٹھ سو سال پہلے کا نہیں ملتا' لیکن پروفیسر نولدیکی' جرمنی کے مستشرق کا کہنا ہے کہ ولادت عیسیٰ سے پہلے ہزار سال قبل جنوبی و مغربی عرب یعنی یمن' حمیر اور سبا کا ملک تھا۔ تورات میں سبا کی شان میں کئی عبارتیں ملتی ہیں۔ (جلد ا۔س۔ش۔۸۲۔۸۱) سبا کے ملک کی حکمران شہزادی بلقیس کا ذکر قرآن مجید میں ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ انہوں نے شہزادی مذکور کو خط بھی لکھا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد حضرت داود علیہ السلام کی ولادت ۹۴۵ سال قبل مسیح میں ہوئی تھی اس حساب سے نولدیکی کا بیان اور رائے درست لگتی ہے۔ گویا ہزار سال ق۔م مکہ کا شہر قائم ہی نہیں تھا بلکہ شہر اس سے پہلے موجود تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دو ہزار سال ق۔م مکہ لا کر آباد کیا تھا۔ (حیات محمد۔۹۰) اتنے حوالہ جات کی موجودگی میں مستشرقین کا مکہ شہر کی قدامت سے انکار کرنا دشمنی اور تعصب کا نتیجہ ہے بجز اس کے کچھ نہیں۔

توریت کی شہادت: توریت میں مکہ کو ''مشاء'' کہا گیا ہے۔ یہ واضح نہیں کہ مشاء مکہ یا بکہ کی تحریف شدہ صورت ہے یا توریت کے مطابق اس کا تعلق حضرت اسمعٰیل علیہ السلام کے بیٹے مشاء سے ہے۔

سوم: ''مورہ'' کے بارے توریت میں تصریح ہے ''اور مدیانیوں کی فوج شمال کی جانب ''مورہ' پہاڑی پر وادی میں تھی''۔ (سیرت النبی۔۹۷) مورہ سے مراد مروہ پہاڑی ہے جس کی شہادت بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۸ میں موجود ہے۔

چہارم: فرانس کا مشہور عربی دان عالم پروفیسر ڈوزی لکھتا ہے کہ ''مکہ کی تاریخ کا آغاز حضرت داودؑ کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ (حضرت داودؑ کی ولادت ۹۴۵ قبل مسیح ہے۔)۔ اس کا ذکر تورات و انجیل میں ہے۔ مزید پروفیسر ڈوزی کہتا ہے کہ بکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ دان ''ماکروبا Macorba لکھتے ہیں''۔ جس کے معنی لوگوں کو معبدوں کے قریب لانے کے ہیں۔ بعض اور محققین نے ''ماکروبا'' کے معنی عبادت گاہ کے لیے ہیں۔ قدیم زمانے سے لوگ یہاں حج کرنے آیا کرتے تھے۔ رومی مورخ پٹالمی ''مکاربا'' کے معنی عبادت خانہ کے کرتا ہے اور بکہ میں خانہ خدا موجود تھا' اس مناسبت

سے پٹالمی نے اسے مکاربا کہا ہوگا۔ یہ لفظ ''مکاربا'' دولفظوں کا مرکب ہے۔ ''مکہ اور ربہ''۔ ربہ کے معنی اعظم کے ہوتے ہیں اس طرح ''پٹالمی'' نے مکہ کی بین الاقوامی شہرت جو تجارتی اور جغرافیائی لحاظ سے تھی، اسے مکہ عظیم شہر کہا ہو۔ یہی رائے زیادہ قوی لگتی ہے۔ (ن۔۱۔۴۱۵) پر ہے کہ مکہ کے اندر ''بکہ'' نام کی وادی ہے اور چونکہ وہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا' اس لیے اس کو بکہ کہتے ہیں ابن ہشام نے بھی بحوالہ ابوعبید روایت کی ہے اور جو اشعار پیش کیے ہیں' اس میں بکہ کے معنی ہجوم کے ہوتے ہیں' لیے گئے ہیں۔ بقول ملک اسلم کے یہی معنی درست ہیں' سرکشی کے درست نہیں ہیں۔ امام مالکؒ نے فرمایا: خانہ کعبہ کی جگہ کو ''بکہ'' اور سارے شہر کو مکہ کہتے ہیں۔ محمد ابن شہاب سے مروی ہے کہ صرف خانہ کعبہ کو نہیں بلکہ ساری مسجد حرام کو بکہ کہا جاتا ہے اور باقی دوسرے شہر کو مکہ۔ (ضیاالقرآن۔ آل عمران۔ ۹۶)

مزید (نقوش رسول نمبر۔۲۔۴۱۶) پر ہے ''نیز قرآن پاک میں بکہ کے نام کا ذکر ہے جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ اس شہر کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھا تھا اور یہی مشہور ہوا۔ اس کی قدامت اس کے نام سے بھی ظاہر ہے کہ ہزار ہا سال گزرنے کے باوجود اس کا نام وہی ہے جو پہلے تھا۔ قرآن مجید میں اس شہر کا نام ''بکہ'' آیا ہے۔ جو بعد ازاں تھوڑے سے فرق کے ساتھ مکہ کے نام سے مشہور ہوا۔ تاہم قرین قیاس امر یہ ہے کہ بکہ کا نام رسالت مآب کے زمانہ اقدس میں مستعمل ہوگا ورنہ قرآن مجید اس متروک لفظ کا استعمال کیوں کرتا نیز قرآنی مطالب کو آسان اور سہل بنانے کی بجائے چیستاں بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

پنجم: ایک اور روایت بحوالہ ابوعبید (ن۔۲۔۴۱۵) میں بکہ بالخصوص کعبۃ اللہ کی جگہ اور مسجد کو ہی کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیھم السلام نے عبادت گاہ یعنی کعبۃ اللہ کی بنیاد اٹھائی۔ قرآن مجید میں ہے ''وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ'' (البقرہ ۱۲۷، پارہ ۱) ترجمہ ''اور جب ابراہیم و اسمعیل علیھم السلام خانہ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔'' اسی جگہ کے لیے بکہ کا لفظ مخصوص تھا چونکہ بکہ جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ نام ابتدائی طور پر خانہ خدا کے لیے مخصوص تھا۔ اس سبب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار حج اور قربانی کی ادائیگی کے لیے وہاں جمع ہوتے تھے۔ اس حج کے عظیم اجتماع سے جو مرکزیت خانہ خدا کی تعمیر سے حاصل ہوئی' اس کے لیے بکہ سے بہتر کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نام پوری وادی کے لیے استعمال ہونے لگا جو مسجد سے تھوڑی دور قائم ہوگئی تھی۔ حجاج کرام کی آمدورفت میں اضافہ ہوا۔ تجارتی سرگرمیاں بڑھ گئیں اور عوام کو حج کے لیے اذنِ عام مل گیا۔ ارشاد خداوندی ہے۔ ''وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ o لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ'' (الحج ۲۷، ۲۸، پارہ ۱۷) ترجمہ ''اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام

دے دو تا کہ وہ تمہارے پاس دور دراز مقامات سے پیدل اور اونٹوں پر آئیں تا کہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں۔" معبد یا خانۂ خدا کا قیام ظاہر کرتا ہے کہ بکہ شہر قدیم تھا' اگر بکہ کا شہر آباد نہیں تھا تو وہاں خانۂ خدا کو بنانے کی کیا ضرورت تھی؟۔ کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا' اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہوتا ہے۔

ششم : دائرۃ المعارف اسلامیہ (ج ۲۱۔۴۹۴) میں ہے کہ" مکہ ۲۱ درجہ ۲۸ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۳۷ درجہ ۵۴ دقیقہ طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔ جبکہ مولانا شبلی نعمانی (سیرت النبی ۔۱۔۱۰۴) لکھتے ہیں کہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکہ معظّمہ کا عرض بلد اور طول بلد بطلیموس کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے۔۔۔ طول ۷۸ درجہ۔ عرض بلد ۱۳ درجہ۔ بطلیموس نہایت قدیم زمانے کا مصنف ہے' اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے تو اس سے زیادہ قدامت کی اور کون سی سند درکار ہے"۔؟

ہفتم : یہ بات متفق علیہ ہے کہ مکہ شہر کی بنیاد آج سے قریباً چار ہزار سال پیشتر ۲۲۰۰ قبل مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے رکھی تھی تاہم عرب مورخین کا دعویٰ کہ مکہ شہر اس سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اور بہت سے مستشرقین بھی اسے مانتے ہیں۔ بکری کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ شہر کے عبادت خانہ کو چوتھی مرتبہ تعمیر کیا تھا۔ (ن۔۲۔۴۰۲)

اہم نکتہ: "وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ" (البقرہ ۱۲۷، پارہ ۱) اس کی تفسیر میں بعض محققین کہتے ہیں کہ دو پیغمبروں (حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ) نے کعبہ کی بنیاد نہیں رکھی کیونکہ اس کی بنیاد تو کہیں پہلے سے رکھی جا چکی تھی اور ان دو پیغمبروں نے صرف منہدم خانہ خدا کی دیواروں کو اٹھایا تھا یعنی کعبہ پہلے سے موجود تھا اور ان پیغمبروں نے پہلی عمارت کی بنیاد ہی کو دوبارہ اٹھایا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ سے حضرت محمد ﷺ تک ۶۲ یا ۶۳ پشتیں ہیں۔ ان پشتوں کے امجاد عظام کی عمریں ہزاروں سال پر محیط ہیں گویا اس قدر مدتوں پہلے خانہ خدا کی عمارت کو دوبارہ بلند کرنے والے حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ ہیں جنہوں نے مکہ شہر میں اس معبد کی عمارت کو کھڑا کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہر مکہ قدیم ہے۔

ہشتم : بخاری شریف میں روایت ہے کہ حضرت ہاجرہؑ نے بنو جرہم کو مکہ میں رہائش رکھنے کے لیے عام اجازت عطا کر دی مگر کہا کہ پانی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ۔۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خاندان اسمٰعیل علیہ السلام کو مذہبی تقدس کی بناء پر سیاسی تغلب حاصل ہو گیا تھا ۔۔۔ وہ بلاشرکت غیرے اس کے مالک تھے۔ (ن۔۵۔۴۰۷) معلوم ہوتا ہے کہ شہری آبادی کے لیے اصول جناب حضرت اسمٰعیلؑ کی زندگی ہی میں طے پا چکے تھے۔ آباد کاروں کے لیے اس میں بے پناہ کشش تھی صرف مذہبی لحاظ سے نہیں بلکہ آبادی کے لحاظ سے بھی، تو آباد کاروں کے جمع ہونے کی جگہ بکہ بن گیا۔ یہ بات بھی ثابت شدہ

ہے کہ یہ نام حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیھم السلام کا رکھا ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ دنیا میں سب سے بڑے آباد کار تھے۔ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے قوموں کو پیغام توحید پہنچاتے تھے' اس لیے ان کا نام ابراہیم یعنی قوموں کا باپ پڑ گیا۔ کئی نو آبادیاں مکہ کی طرح بسائیں۔ ان آبادیوں میں ''رملہ'' اور ''ایلیا'' کی بستیاں آج بھی صفحہ ہستی پر موجود ہیں۔

مکہ یا بکہ: قاضی عبدالدائم دائم (بلاوہ۔۶۹) لکھتے ہیں دنیا کی ہر زبان میں اس کو مکہ کہا جاتا ہے۔ حدیث' تاریخ اور سیرت کی تمام کتابوں میں بھی مکہ لکھا ہوا ہے اور سارا جہان اس کو مکہ کے نام ہی سے جانتا پہچانتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جس دلدار کی نگری ہے' وہ اس میں پائے جانے والے اپنے گھر کا تذکرہ کرتا ہے تو اس شہر کو مکہ کی بجائے بکہ کہتا ہے۔ ''اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا'' (آل عمران ۹۶، پارہ۴) ترجمہ ''بے شک پہلا گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا تھا وہ بکہ میں تھا' برکت والے سارے جہان کا۔''

مکہ کیا ہے اور بکہ کیا ہے۔۔۔؟ کیا ان کے مصداق اور مفہوم میں کوئی فرق ہے یا دونوں ایک ہی ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ان کا مصداق مختلف ہے۔ مکہ پورے شہر کو کہا جاتا ہے اور بکہ خاص اس قطعہ زمین کو جہاں کعبہ معظّمہ ہے۔ لیکن اکثر اہل تفسیر دونوں کا مصداق ایک ہی سمجھتے ہیں یعنی پورا شہر۔ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بکہ کوئی جدا لفظ ہی نہیں ہے بلکہ مکہ کی میم کو ''با'' سے بدل دیا گیا ہے اور عربی زبان میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ جیسے ''لازم'' کو ''لاذب'' بھی بولتے ہیں جبکہ بعض کے نزدیک یہ دونوں لفظ علیحدہ علیحدہ مفہوم کے حامل ہیں اگرچہ مصداق دونوں کا ایک ہے۔ ان کی رائے کے مطابق ''مکہ'' تجلیاتِ جمال کی تلمیح ہے اور ''بکہ'' جلوہ ریزئ جمال کا مظہر ہے کیونکہ مکہ مک' یمک' مکا سے ماخوذ ہے اور یہ مادہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹنی کا بچہ سارا دودھ پی لے اور پوری طرح سیراب ہو جائے' گویا ارض مکہ وہ اونٹنی ہے جو دودھ بھرے تھن لیے کھڑی ہے اور دنیا بھر سے پیاسے لپکے چلے آتے ہیں اور فیوض و برکات کی دھاریں پی پی کر سیراب و شاداب ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بکہ' بک' یبک بکا سے مشتق ہے' یعنی دھکا دینا' گردن توڑنا گویا جو بھی بکہ کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے گا اس کی گردن توڑ دی جائے گی اور اس کا حشر وہی ہوگا جو ابرہہ کے لشکر کا ہوا تھا۔ فجعلھم کعصف ما کول ۰ چونکہ اس شہر جلیل و جمیل میں قہاری و غفاری پہلو بہ پہلو چلتی ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بکہ کا لفظ استعمال کر کے شان قہاریت کا اظہار کیا ہے اور لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ اس شہرِ باجبروت کی طرف کبھی گستاخانہ نگاہ اٹھانے کی جرات نہ کرنا ورنہ تباہ و برباد ہو جاؤ گے کیونکہ یہ بکہ ہے۔۔۔ سرکشوں اور نافرمانوں کی گردنیں توڑنے والا۔ اور اس سے اگلی آیت میں شان غفاریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زائرین کو مژدہ

جانفزا سنا کر سرشار کیا کہ ''مَن دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِناً'' (جو اس میں داخل ہو گیا اس کو امان مل گئی)۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی ' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے '' جیسے '' خانہ خراب کو ترے '' شہر '' بندہ نواز میں

اس لحاظ سے یہ بکہ ہے۔۔۔ دوسری طرف وہ ناقہ مہربان کہ جس کے پاس پہنچتے ہی بچہ آسودہ وسیراب اور محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔

نکتہ: اوپر کی عبارت میں ''حدیث' تاریخ اور سیرت کی تمام کتابوں میں مکہ لکھا ہوا ہے۔'' اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ قرآن کریم میں مکہ کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مکہ کا ذکر قرآن کریم کی سورت الفتح آیت نمبر ۲۴ میں ہے۔ وھوالذی کف۔۔۔ بما تعملون بصیرا ''ترجمہ'' اور (اللہ) وہی ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے مکہ کی سرحد پر روک دیا' بعد اس کے اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر قابو بھی دے دیا تھا اور تم نے ان کو گرفتار بھی کر لیا تھا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے۔'' مجاہد نے کہا کہ بکہ اور مکہ یہ ایک ہی شہر کے دو نام ہیں اور کسی بھی شہر کے دو یا دو سے زیادہ نام ہو سکتے ہیں مثلاً یثرب اور مدینۃ النبیؐ ہے پہلا نام یثرب تھا اور بعد میں آپ کے دم قدم سے مدینۃ النبیؐ کے نام سے موسوم ہوا، اور تا حال اسی نام سے مشہور ہے۔ گویا ایک سے زیادہ ناموں میں کئی حکمتیں ہیں۔ جن میں ایک حکمت قدامت کی ہے۔

قرآن مجید کے حروف اور الفاظ معجزہ ہیں۔ قرآن مجید میں حروف کی تعداد کا بھی اعلیٰ طریق سے خیال رکھا گیا ہے۔ املا میں کہیں تبدیلی واقع ہوتی ہے یعنی حرف کا املاء میں تغیر واقع ہوتا ہے جیسے ''ص'' کی جگہ ''س'' یا ''م'' کی جگہ ''ب'' کا استعمال ہوتا ہے جبکہ ہر جگہ ''ص'' اور ''ب'' کے ساتھ وہ لفظ لکھے گئے ہیں۔ یہ اعجازِ قرآن ہے مثلاً پورے قرآن میں لفظ بکہ سورہ آل عمران کے علاوہ اس املا کے ساتھ نہیں ہے اس میں مکہ کے حرف م کی بجائے حرف ب کا استعمال ہے۔

بکہ کا لفظ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۹۶ میں ہے۔ جن سورتوں سے پہلے م کا حرف ہے ان تمام سورتوں میں حرف ''م'' کی تعداد ۸۶۸۳ رکھنا مقصود تھی کہ یہ عدد انیس پر پورا تقسیم ہو جاتا ہے اگر یہاں بھی لفظ مکہ لکھا جاتا تو حروف م کی تعداد ۸۶۸۴ ہو جاتی اور یہ ہندسہ انیس پر تقسیم نہیں ہو سکتا اسی طرح سورت اعراف، سورۃ مریم اور سورۃ ص میں کل ص کی تعداد ۱۵۲ ہے اگر سورہ بقرہ والا ''بَسْطَۃً'' کا املا ایسے نہ ہوتا تو ایک ''ص'' بڑھ جاتا جس سے وہ انیس پر تقسیم نہ ہو پاتا لہٰذا معجزانہ طور پر انشاء میں غیر معمولی تبدیلیاں کلام الٰہی کا معجزانہ نظام ہے اس لیے سورہ بقرہ میں بَصْطَۃ کی بجائے بَسْطَۃ لکھا گیا جہاں یہ قرآن پاک کے حسابی نظام کی معجزاتی کارفرمائی ہے وہاں قرآن مجید کا کلام الٰہی ہونا بداہتاً ثابت

ہے۔ نیز قرآن پاک میں ہر جگہ بصطۃ آیا ہے لیکن صرف سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۴۷ میں بسطۃ لکھا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا عظیم الشان اظہار ہے۔ اسی طرح یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی شہکار حکمتوں کا اظہار ہے۔ جوڑوں کے قانون سے کسی چیز کو استثنا حاصل نہیں حیران کن بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے خاص الفاظ میں بھی یہی قانون پایا جاتا ہے۔ بے شک وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝ (یٰسین، ۱۲، پارہ ۲۲) اور ہر چیز کا پورا حساب امام مبین میں رکھا گیا ہے درج ذیل قرآنی الفاظ کی تعداد اور ترتیب کے معجزانہ نظام پر غور کریں (قرآن پاک ایک ابدی معجزہ۔ ۱۳۱)۔ لفظ یوم جس کا معنی دن ہے کلام پاک میں ۳۶۵ مرتبہ آیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک شمسی سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔ یوم کی جمع یومین، یہ ۳۰ مرتبہ آیا ہے جو ایک ماہ کے دنوں کا اظہار ہے لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی لفظ شھر جس کا مطلب مہینہ ہے وہ بھی پورے قرآن پاک میں ۱۲ مرتبہ ہی آیا ہے جو ایک سال میں مہینوں کی تعداد ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور ان کی تعداد اور ان کے املا میں ایسا معجزاتی نظام موجود ہے جو قرآن پاک کے ابدی معجزہ ہونے کا ثبوت ہے۔

مکہ مکرمہ کے اطراف میں مندرجہ ذیل مشہور مقامات واقع ہیں۔ خانہ کعبہ، صفا، مروہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات، غار حرا، غار ثور، جبل، تنعیم اور جعرانہ وغیرہ۔ کعبہ پہلی بار تعمیر ہوا، تو اس وقت گھر کی چار دیواری تھی مگر نہ چھت نہ دہلیز نہ دروازہ، جس کا طول ۳۲ اور عرض ۲۲ اور بلندی ۹ گز تھی کعبہ زمانہ قدیم سے موجود تھا۔ یمن کے حمیری بادشاہ اسد تبع نے سب سے پہلے اس پر غلاف چڑھایا۔ ہر دور میں اس کی عزت و عظمت برقرار رہی اس کے تقدس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ دو پیغمبروں نے بنیادیں اٹھائیں۔ سورۃ البقرہ: ۱۰ میں ہے ترجمہ ''اور جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خانہ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے'' اور سورت آل عمران کی آیت نمبر ۹۶ میں ارشاد ربانی ہے۔ ''ترجمہ'' ''بے شک پہلا گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا تھا وہ بکہ میں تھا، برکت والے سارے جہان کا۔'' ملکی اور مذہبی روایتوں کے سوا غیر مذہب مورخوں کی تحقیقات سے بھی کعبہ کا نہایت قدیم زمانہ سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے مسٹر گبن نے۔۔۔ اپنی تاریخ میں کعبہ کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ کعبہ کی صحیح قدامت سن عیسوی سے پہلے کی ہے۔ ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ تھیمو دیت اور سیبین کے بیان میں ایک مشہور معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے، جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام اہل عرب تعظیم کرتے ہیں۔'' اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت قدیمی زمانہ (ابرہیم علیہ السلام کا زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیے۔ (خطبات احمدیہ۔ ۳۱۳) معبد کی قدامت مکہ شہر کے قدیم ہونے پر دال ہے۔

اعتراض نمبر۲

سر ولیم میور مذکورہ عبارت پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ”جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کے پاس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اس کے تمام مراسم کی اصلیت ابراہیمؑ و اسمعیلؑ سے ہے کوئی کیا سوچ سکتا ہے کہ عرب کی یہ روایت مسلمانوں کی بنائی ہوئی نہ تھی بلکہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے بہت مدت پہلے اہل مکہ کی عام رائے تھی ورنہ قرآن میں بطور ایک حقیقت مسلمہ کے اس کا ذکر نہ ہوتا اور نہ بعض مقامات کے نام جو کعبہ کے گرد واقع ہیں، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے متعلق کیے جاتے جیسا کہ وہ متعلق کیے گئے ہیں۔

جواب: سر سید کہتے ہیں کہ سر ولیم میور نے بلاشبہ یہاں غلطی کی ہے جو کچھ ڈایوڈرس نے لکھا ہے اس سے عرب کی اس قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ملتا ہے اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پیشتر اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ کو اور ان تمام مراسم کو جو کعبہ سے علاقہ رکھتی ہیں، ابراہیمؑ سے تعلق ہے۔ اس کی اصلیت و صحت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنی جرہم نے اور تمام مختلف عرب کی قوموں نے اس کو ابراہیم و اسمٰعیل علیھم السلام سے منسوب کیا تھا۔ عرب ایک بت پرست قوم تھی اور ابراہیم علیہ السلام بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھا۔ اس لیے ضرور تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیم و اسمٰعیل علیھم السلام سے نفرت کرتیں اور کبھی اپنے معبد کو ان دو سے منسوب نہ کرتیں۔ باوجود اس مغائریت اور منافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم کرنا کہ کعبہ کو اور اس کے مراسم کو ابراہیم و اسمٰعیل علیھم السلام سے تعلق ہے، اعلانیہ اس کی صحت و اصلیت کی دلیل ہے، نہ اس کے برخلاف جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے، اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے پیشتر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا ہمارے لیے دلیل ہے نہ کہ ہمارے مخالف کے لیے۔ (خطبات احمدیہ۔۳۱۴)

اعتراض نمبر۳

مارگولیس کعبہ کو آنحضرت (ﷺ) سے صرف سو برس پہلے کی عمارت تسلیم کرتا ہے۔ مزید کہتا ہے کہ اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البناء قرار دیا ہے، لیکن صحیح روایت سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ مکرمہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (ﷺ) کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی اور اس کی دلیل ”اصابہ“ کی روایت سے دیتا ہے۔ (س۔ش۔ا۔۱۰۲)۔

جواب: ڈھاک کے تین پات، مستشرقین خانہ خدا کی اولیت و قدامت کے منکر ہیں۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا ”(آل عمران ۹۶، پارہ ۴) کے بارے مفتی احمد یار خان نعیمی تفسیر کبیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ ”جس مضمون کا کوئی منکر موجود ہو یا آئندہ ہونے والا ہو، اسے ”اِنَّ“

''لام'' تاکید یا ''لقد'' وغیرہ کے تحقیقی الفاظ سے شروع کیا جاتا ہے' چونکہ خانہ کعبہ کی افضلیت و اولیت دونوں کے یہود منکر ہیں۔اسی لیے اس آیت کو لفظ ''اِنَّ'' سے شروع کیا گیا ہے۔عربی میں اول وہ ہے جو اپنے ماسوا سے پہلے اور سابق ہو'اس طرح کے کوئی نام اس سے پہلے ہو اور نہ اس کے ساتھ' اس کے بعد کچھ ہونہ ہو جیسے آخر وہ ہے جس کے ساتھ اور بعد کوئی نہ ہو' پہلے ہو یا نہ ہو۔ ہمارے نبی ﷺ آخری نبی ہیں' کیا معنی؟ یعنی کہ نہ آپ کے زمانہ میں کوئی نبی ہو نہ آپ کے بعد۔آپ کا دین تمام دینوں کا ناسخ ہے ۔مزید فرماتے ہیں کہ اولیت دو قسم کی ہے۔(۱) حقیقی اور (۲) اضافی

حقیقی اول وہ ہے جو سب سے پہلے ہو،اور اضافی اول وہ ہے جو کسی خاص چیز سے پہلے ہو' یہاں گھروں کے لحاظ سے اولیت حقیقی ہے اور تمام عالم کے اعتبار سے اولیت اضافی ہے۔۔۔۔خیال رہے کہ ایک ہے کعبہ کا تقرر' ایک ہے وہاں عمارت کا موجود ہونا،اور ایک ہے انسانوں کا وہاں گھر بنانا' کعبہ کا تقرر تو سارے اجسام عالم سے پہلے ہوا،اور وہاں عمارت کا موجود ہونا حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہوا۔ پہلے جبکہ زمین و آسمان بلکہ بیت المعمور بھی بن چکے تھے اور انسانوں کا بشکل بیت بنانا سیدنا ابراہیمؑ سے ہوا۔ پہلے معنی سے کعبہ اول حقیقی اور دوسرے معنوں میں اول اضافی ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں ''وُضِعَ'' فرمایا ''بُنِیَ'' نہ فرمایا۔(مفتی صاحب کا بیان ختم ہوا)۔

بیت اللہ کو بیت العتیق بھی کہتے ہیں۔ارشاد ربانی ہے۔''وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ'' (ترجمہ) ''اور وہ بیت العتیق کا طواف کریں'' اس بیت کو بیت العتیق اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے قدیم ہے اور عتیق کا معنی قدیم ہے۔(تبیان القرآن ۲۔۲۶۵)

علامہ شبلی نعمانی (سیرت النبی۔۱۔۱۰۳) کارلائل کا حوالہ دیتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ میں لکھا کہ رومن مورخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے اور یہ ولادت عیسیٰؑ سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔

علامہ حلبیؒ نے اپنی سیرت کی کتاب میں لکھا ہے کہ نئے سرے سے کعبہ کی تعمیر جدید صرف تین مرتبہ ہوئی ہے۔

۱۔حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی تعمیر۔

۲۔زمانہ جاہلیت میں قریش کی عمارت اور ان دونوں تعمیرات کے درمیان ۲۷۳۵ سال کا فاصلہ ہے۔

۳۔حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر قریش کی تعمیر کے ۸۲ سال بعد ہوئی۔(لیکن عبدالملک بن مروان اموی کے ظالم گورنر حجاج بن یوسف ثقفی نے حضرت عبداللہؓ کو شہید کر دیا اور ان کے بنائے ہوئے کعبہ کو ڈھا دیا اور پھر زمانہ جاہلیت کے نقشہ کے مطابق کعبہ کو بنا دیا جو آج تک موجود ہے۔(سیرت مصطفیٰ۔۱۔۶۸)

دوم: مارگولیس پھر ڈنڈی مارتا ہے اور ہیر پھیر کی باتیں کر کے اور واقعات کو خلط ملط کر کے پیش کرنا اس کا معمول ہے کیونکہ اس کا مقصد محض شکوک وشبہات پیدا کرنا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اتنا بھی بے خبر نہیں کہ وہ نہ جانتا ہو کہ جس شے کی بنیاد شک پر ہوتی ہے اس کا حقیقت سے دور تک کا واسطہ نہیں ہوتا یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ کی اچھی طرح جانچ پڑتال نہیں کرتا اور لکھتا چلا جاتا ہے، ایسے عالم کے علم سے اللہ کی پناہ!۔ البتہ اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ مستشرق اسلام اور پیغمبر اسلام کا متعصب نقاد ہے تو پھر کیونکر جانب داری سے کام نہ لے گا۔ یہاں بھی اس کے شک پیدا کرنے کا ثبوت واضح ہے' وہ اس طرح کہ اپنے اعتراض کو قوی ثابت کرنے کے لیے ''اصابہ'' کی جس روایت کا حوالہ دیتا ہے وہ عمارت خانہ کعبہ کی عمارت نہیں ہے بلکہ وہ پہلی عمارت ہے جس کو سعد یا سعید بن عمرو نے بنایا تھا' جسے مارگولیس نے خانہ کعبہ کی عمارت کہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت شہر میں خانہ کعبہ کے آس پاس عمارتیں نہیں تھیں بعد میں تعمیر ہوئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے قبل خانہ کعبہ کے آس پاس عمارتیں کیوں نہیں تھیں یا کیونکر نہیں بنائی گئی تھیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب یعنی مکہ کے قبائل کعبۃ اللہ کے آس پاس عمارت تعمیر کرنا بے ادبی اور عیب سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانہ میں شہری آبادی شمال مشرق کی سمت کوہ قیقعان کے نزدیک واقع تھی۔ کعبہ کے تقدس کی وجہ سے لوگ شامیانوں میں رہا کرتے تھے۔ اس کے احترام وتقدس کی بنیاد پر لوگ سیاہ رنگ کے شامیانے نصب کرتے تھے اور عمارتیں بنانے سے گریزاں تھے ان خیموں کی وجہ سے مکہ شہر خیموں کا وسیع شہر بن گیا تھا۔ ۱۱۰۰ق۔م میں بھی قیدار (آل اسمٰعیلؑ) کا ذکر خیمہ والے کہہ کر کیا گیا ہے اگرچہ مکہ میں اجالہ' اجیاد اور باقیان جیسے مکانات موجود تھے۔ (ن۔۲۔۴۱۹)

سوم: ہیکل (حیات محمد۔۹۲) لکھتے ہیں کہ بعض کا خیال ہے کہ قُصَیؒ کی تولیت سے قبل خانہ کعبہ کے گرد کوئی بستی نہ تھی۔ بنو جرہم اور بنو خزاعہ کا اعتقاد تھا کہ حرم کعبہ کے آس پاس بستی کا ہونا، بیت اللہ کی بے حرمتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کے سب لوگ رات کے وقت حدود حرم سے باہر جہاں سے گھاس توڑنا اور جہاں شکار کرنا جائز تھا' وہاں بسیرا کرتے ۔۔۔ قصی نے قریش کو جمع کیا اور حرم کے آس پاس رہائشی مکانات تعمیر کرنے کی تحریک دی' اس پر سب سے پہلے چوپال کھڑی کی گئی جسے بعد میں دارالندوہ کے نام سے موسوم کیا گیا ۔۔۔ اس مشاورتی عمارت کی تعمیر کے بعد قصی کے منصوبہ کے مطابق کعبۃ اللہ کے اردگرد مکانات بنائے گئے تھے۔ قصی نے شہر مکہ فتح کرنے کے بعد شہری تقسیم کی۔ سن ۴۴۰ میں مکہ میں حکومت قائم کی' اس وقت کعبہ کے اردگرد مکانات نہ تھے۔ قصی کی تحریک سے مکانات تعمیر کرنے کا سلسلہ چل نکلا' اس طرح موجودہ شہر کی بنیاد پڑی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور اور قصی کی حکومت کے درمیان ۱۳۰ سال کا فاصلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے تقریباً سوا سو سال قبل مکانات بننے

لگے اس سے بھی ہمارے موقف کی پرزور تائید ہوتی ہے اور مارگولیس کے الزام باطلہ کی تردید ہوتی ہے۔ گویا خانہ کعبہ موجود تھا اور رہائشی مکانات نہ تھے۔ مارگولیس کو دھوکا ہوا ہے یا جان بوجھ کر ہیر پھیر کی باتیں کرتا ہے اور کعبہ کے آس پاس بننے والی پہلی رہائشی عمارت کو کعبۃ اللہ کی عمارت کہہ دیتا ہے۔

رات کو دن سے ملا بیٹھے بڑے نادان تھے

مارگولیس کا یہ کہنا کہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز یعنی کعبہ کو قدیم البناء قرار دیا ہے۔ یہ درست نہیں بلکہ اصابہ کی روایت سے مترشح ہوتا ہے کہ سعید یا سعد بن عمرو نے مکہ میں پہلی عمارت بنائی' یہ رہائشی عمارت تھی نہ کہ عبادت خانہ کی عمارت کیونکہ معبد یعنی کعبۃ اللہ پہلے ہی سے موجود تھا جس کی تصدیق ماخذ سے ہوتی ہے لہٰذا مذہبی خیال کی وجہ کے بغیر مسلمانوں کا کعبۃ اللہ کو قدیم البناء قرار دینا درست ہے جس کے منہدم ہونے کے بعد دو جلیل القدر پیغمبروں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے بنیاد اٹھائی تھی۔ ہزاروں برس سے قائم خانہ خدا کو قدیم کہنے میں مسلمان حق بجانب ہیں۔ مگر نہ جانے مارگولیس کو اس بات سے چڑ کیوں ہے اور اسے یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی کیوں؟۔ آیئے! اس کی وجہ کو دریافت کریں اس خفیہ راز سے پردہ اٹھائیں اور اس کے باطنی روگ کا پتہ لگائیں۔

مکہ شہر کی قدامت کو تسلیم نہ کرنا اور کعبۃ اللہ کی عمارت کو سو برس پہلے کی عمارت کہنے میں مستشرق بہت دور کی کوڑی لایا ہے۔ اس سے اس کا مقصد یہ ہے کہ مکہ شہر کی قدامت سے انکار کریں گے اور بیت اللہ کو صرف سو برس کی عمارت کہیں گے تو حضرت ابراہیمؑ کا اپنے اہل بیت یعنی بی بی ہاجرہ علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیلؑ کو یہاں آباد کرنے کا صدیوں پرانا قصہ حرف مکرر کی طرح مٹ جائے گا۔ نیز حضرت ابراہیمؑ کی عرب میں آمد اور اپنے اہل بیت کو مکہ میں آباد کرنے کی بات ثابت نہیں ہوگی اور نہ ہی خانہ کعبہ کی عمارت کی بنیاد ان دو پیغمبروں نے اٹھائی ہوگی اور نہ ہی ان پیغمبروں کے مقدس ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوں گے اور نہ یہ دعا مانگی ہوگی کہ ہماری نسل سے ایک رسول بھیج۔ اس طرح سے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کا ظہور عرب میں ثابت نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ ﷺ اللہ کی طرف سے رسول مبعوث ہوئے ہوں گے۔

مارگولیس نے در پردہ یہ الزام لگایا مگر سر ولیم میور نے صاف صاف الزام دھر دیا اور کہا۔

اعتراض نمبر۴

اسرائیلی گفتار سازوں نے ظہور اسلام سے پہلے یہ افسانہ تراشا اور ابراہیمؑ کے فرزندان کو عرب میں آباد کر دیا۔ جس سے یہودیوں کا مقصد اسمٰعیلؑ کے عربی النسل ہونے کی وجہ سے یہودی خود کو اسحاقؑ کی اولاد ہونا ثابت کر سکیں تاکہ عربوں کے ساتھ عم زادگی کے وسیلے سے اس ملک میں اپنی تجارت کو فروغ دے سکیں۔ (حیات محمد ﷺ۔ ۸۶)

جواب: سرسید (خطبات احمدیہ ۲۵۔۲۶) لکھتے ہیں کہ ’’اب یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ (علیہ السلام) اور حضرت ہاجرہؑ کی سکونت کے باب میں ملکی وقومی دونوں طرح کی روایتیں نہایت معتبر ذریعہ سے ہمارے زمانوں تک پہنچی ہیں اور وہ ایسی روایتیں ہیں کہ جن کو تمام قوم نے بلا تامل صحیح مان لیا ہے۔ پھر ہم کس طرح کسی طرف دار عیسائی مصنف (سر ولیم میور) کے محض بے دلیل بیانات کو صحیح اور معتبر تصور کر سکتے ہیں جو یہ بھی کہتا ہے کہ یہ روایت ایک کہانی ہے یا تورات سے اخذ کر کے تحریر کر دی گئی ہے‘۔ مگر جس وقت اس عالی مرتبہ مصنف نے یہ بیان کیا‘ ان کو معلوم نہ ہوگا کہ خود توریت ہی سے حضرت ابرہیمؑ کے نسب کی بابت اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ چلتے چلتے موصوف نے کم سن اسمٰعیلؑ اور ان کی بے کس والدہ کی سکونت کی اصلیت کی نسبت اس طرح قیاس دوڑایا ہے کہ ’’بنی اسمٰعیل اور عمالیق کی قومیں جزیرہ عرب کے شمال اور وسط میں پھیلی ہوئی تھی‘ غالباً یہی لوگ مکہ کے اصلی متوطن ہوں گے یا زمانہ سابق میں یمن کے لوگوں کے بشمول وہاں آ بسے ہونگے‘ اس کے بعد فرقہ بنی اسمٰعیلؑ خواہ وہ نباتی خواہ کسی ہم نسل خاندان کا وہاں کے کنوؤں اور کاروانی تجارت کے دل پسند موقع کے لالچ میں وہاں چلا گیا ہوگا اور بہت ہی ذی اختیار ہو گیا ہوگا‘ یہ فرقہ اپنی ابراہیمی پرانی روایتوں کو ساتھ لے گیا ہوگا اور مقامی اوہام اور اعتقادات پر خواہ وہ کسی ملک کے ہوں یا یمن سے لائے گئے ہوں‘ ان کو منقش کر دیا ہو گا۔‘‘ سرسید اس کے جواب میں لکھتے ہیں ’’ان کے قیاسی باتوں کی غلطی اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر جبکہ ان کو باپ نے گھر سے نکالا تھا‘ توریت کے مطابق سولہ برس کی تھی اور یہ عمر ایسی تھی کہ جو روایتیں انہوں نے اپنے والد سے سنی تھیں‘ ان کے سمجھنے اور تمیز کرنے اور یاد کرنے کے قابل تھے‘ اس کے سوا وہ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے رہے اور حضرت ابراہیمؑ بھی اکثر ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے‘ انجام کار سب سے بڑھ کر یہ بات کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر جب نواسی برس کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے وقت وہ اپنے والد کے پاس موجود تھے۔ یہ سب باتیں ہر ذی فہم اور غیر متعصب شخص کے ذہن نشین کرنے کو کافی ہوں گی کہ یہ تمام روایتیں جو مختلف اقوام عرب میں اس قدر شائع ہیں وہ لوگوں کو حضرت ابراہیمؑ سے اور حضرت اسمٰعیلؑ سے پہنچی ہیں۔ اگر پھر کوئی شخص براہ جرت یہ کہے کہ یہ روایتیں یہودیوں کی وساطت سے پہنچی ہیں‘ تعجب خیز نہیں‘ مگر تعجب اس بات پر آتا ہے کہ مصنف موصوف نے اپنی قیاس وخیال کو ثابت کرنے کا ادعا کیا ہے اور لکھتا ہے کہ ’’مگر ان بنی اسرائیل کو جو توریت پڑھتے ہیں صرف نام اور مقام ہی سے اس نسب کا احتمال عائد ہوتا ہے اور یہودی مصنفوں میں الہامی ہوں خواہ غیر الہامی‘ ہم کافی اظہار اس امر کا پاتے ہیں کہ ایسا خیال درحقیقت کیا گیا تھا‘ یہ قدرتی استنباط یا خود ان قوموں میں جن سے وہ علاقہ رکھتا تھا قرب وجوار کے یہودیوں کے ذریعہ

سے وقتاً فوقتاً شائع ہو گیا ہو گا اور ان کی بے جوڑ روایتوں کے غیر مکمل آثار کو جو ہنوز ان کے تخیلات اور ان کی عادات اور ان کی زبان میں موجود تھے' تقویت دے دی ہوگی''۔ سر سید کہتے ہیں کہ عرب کی قوموں کی عادت پر خیال کرنے سے اس رائے کی اور زیادہ غلطی واضح ہوتی ہے۔ عرب کے قدیم رہنے والوں نے اپنی جبلی عادت کے موافق اپنی اصلی روایتوں میں کوئی نئی روایت اضافہ نہیں کی تھی اور تمام غیر قوموں سے بالکل الگ رہتے رہے' یہاں تک کہ جب حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے ہم راہی وہاں آ کر آباد ہوئے تو قدیمی عرب ان کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل لقب ''مستعربہ'' سے ان کو ملقب کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے بنی اسمٰعیل اور خصوصاً اہل عرب بنی اسمٰعیل کو ہمیشہ دو مختلف قومیں سمجھتے رہے اور قدیم عربوں نے اپنی قدیمی روایتوں کا ان سے تبادلہ نہ کیا اور بنی اسرائیل کے پاس عرب کی قوموں اور عرب کے انبیاء کی نسبت زبانی خواہ تحریری کوئی روایت نہ تھی۔

دوم: سلمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے عرب' حجاز' یمن و حضر موت کے لیے نبی مبعوث فرمایا تھا اور ان کا وجود مختلف قوموں اور ملکوں کے اتحاد کا ذریعہ تھا غور کریں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلامؑ کے پہلوٹے فرزند ہیں جو عراق میں پیدا ہوئے اور شام میں سکونت فرمائی وہ سیدہ ہاجرہؑ کے اکلوتے بیٹے ہیں' جو مصر میں پیدا ہوئیں اور شوہر کے ساتھ سالہا سال تک فلسطین اور شام میں رہ کر عرب میں آباد ہوئیں۔ وہ بنو جرہم کے داماد ہیں۔ جو عرب کا حکمران قبیلہ تھا' اسمٰعیل کا مسکن ایسی جگہ ہے۔ جس کے ایک طرف مصر ہے' جہاں ان کے ننھیال ہیں' ایک طرف عراق ہے جہاں ان کے ددھیال ہیں۔ ایک طرف شام ہے جہاں ان کے بھائی حضرت اسحٰقؑ رونق افروز ہیں۔ ایک طرف یمن ہے جہاں ان کے بھائی ابنائے قطورا پھیلے ہوئے ہیں۔ عیسو بن اسحٰق ان کا داماد ہے جو اٹلی کے کنارے تک اپنی کثیر اولاد کے ساتھ قابض ہے۔

سر ولیم میور نے یہ بات فرض کر لی ہے کہ مکہ کے قریب حضرت اسمٰعیلؑ کا آباد ہونا اور یہ بات کہ یقطان اہل عرب کے مورث اعلیٰ تھے' سب بناوٹ اور قصہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور احتمال سے مبرا ہے''

اس کے جواب میں سر سید لکھتے ہیں کہ اس بات سے پہلے سر ولیم میور پر فرض تھا کہ یہ بات کرتے کہ اہل عرب کو اگر وہ نسل میں اور رسومات میں اور مذہب میں یقطان اور اسمٰعیل سے بالکل مختلف تھے تو اس بناوٹ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی اور کیوں تمام ملک اور تمام قبیلے جو آپس میں نہایت دشمن اور سخت عداوت رکھتے تھے اور روز خانہ جنگیاں اور باہمی لڑائیاں کرتے تھے' اس ایک بات پر متفق ہو گئے تھے۔ عرب کی تمام تاریخوں سے جن کو عیسائی مورخین نے ہی تسلیم کیا ہے' ثابت ہوتا ہے کہ یقطان عرب کا مورث اعلیٰ تھا۔ ان تمام باتوں کی کس طرح سر ولیم میور تردید کرتے ہیں کیونکہ ایسے موقع پر بمقابل ثبوت صرف انکار کر دینا کافی نہیں ہے۔۔۔ یونانی مورخ اہل جغرافیہ حجاز میں حضرت اسمٰعیل علیہ اسلام

کی اولاد کی سکونت کا نشان بتاتے ہیں۔ان مورخین نے حجاز کی ان بستیوں کا ذکر کیا ہے جو اسمٰعیلؑ کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں۔(خطبات احمدیہ۔۳۱۴)

حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ فرزند ہوئے جن کے ناموں پر کئی بستیاں آباد اور موجود ہیں اور ان کے ناموں سے مشہور ہیں۔آپ کے صاحب زادوں کے نام یہ ہیں۔

نبیت، قیدار، روبیل (اوبیل) بسام، دومہ، سمعا، مشاء، حدر، تیمہ، وطور، نفیس، اور قدمہ۔تورات سے ثابت ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ فرزند اپنی اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے، یہ بھی ہے کہ ان کی بستیوں اور قلعوں کے نام بھی ان ہی کے نام پر ہیں۔ہم یقین کرتے ہیں کہ جب تورات میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں، اس وقت ابنائے اسمعیل کی بستیاں اور قلعے ان ہی کے نام سے زیادہ مشہور تھے اور زبان زد عام تھے مگر آج ان کا نشان صحیح طور پر نہیں ملتا، البتہ جن جن کا نشان ملتا ہے وہ سب عرب ہی کے اندر واقع ہیں اور اس طرح سے تورات کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہؑ کو عرب کے شہر مکہ میں بسایا تھا۔ان بستیوں اور شہروں کے نام یہ ہیں۔

نبیت : نیبوع کے متصل ایک آبادی ہے۔یقیناً نبیت کی ہی وادی ہے۔

الحضیر ::مذکور آبادی سے تھوڑے فاصلہ پر شہر الحضیر ہے جس کا تلفظ دال کے مشابہ ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ابتدائی نام القید ار تھا۔

سام:: ان کے نسباً نام نجد میں ملتے ہیں۔

دومہ:: شام اور مدینہ کے درمیان موجود ہے اور عرب کے اندر واقع ہے۔آپ کے عہد میں یہ یہودیوں کی ریاست تھی اور دومۃ الجندل کے نام سے یہ شہر مشہور تھا۔

موسیٰ:: مشاء غالباً یمن میں گیا۔وہاں موسیٰ نام کی بستیاں ہیں۔

حدر:: حدر کے نام سے یہ شہر جدیدہ جنوبی عرب میں موجود ہے۔

تیما:: اس بستی کا نام ہے جو اب تک موجود ہے۔یہ مقام فدک کے متصل ہے اور راہ خیبر کے قریب واقع ہے۔

قدمہ:: غالباً۔یہ یمن میں تھا۔مسعودی نے قوم قدمان کا ذکر کر کے ان کو بنو اسمٰعیل بتایا ہے۔باقی بستیوں کا صحیح پتہ معلوم نہیں۔

مزید سلمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو جو حضرت ہاجرہ کے بطن سے تھے، مکہ مکرمہ میں لا کر آباد کیا اور عرب کی زمین ان کو عطا کی۔آپ کے دوسرے فرزند اسحٰقؑ ہیں جو حضرت بی بی سارہ علیہا السلام کے بطن مبارک سے تولد ہوئے تھے، ان کو ملک شام میں آباد کیا۔آپ کی تیسری

بیوی حضرت قطورا کے پیٹ سے جو اولاد "مدین" وغیرہ ہوئی ان کو یمن میں آباد کیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے ان کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے برکت و وسعت فرمائی حتیٰ کہ سارے عرب میں پھیل گئے یہاں تک کہ مغرب میں مصر تک ان کی آبادیاں جا پہنچیں اور جنوب کی طرف ان کے خیمے یمن تک پہنچے اور شمال کی طرف ان کی بستیاں شام سے جا ملیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے جس پر ماخذ شاہد ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل بیت، حضرت اسمٰعیلؑ وحضرت ہاجرہؑ کو مکہ مکرمہ میں لا کر آباد کیا تھا۔

اعتراض نمبر۴ کا دوسرا جز جس میں کہا گیا ہے کہ "یہودیوں کا مقصد حضرت اسمٰعیلؑ کے عربی النسل ہونے کی وجہ سے یہودی خود کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد ہونا ثابت کر سکیں تا کہ عربوں کے ساتھ عم زادگی کے وسیلے سے اس ملک میں اپنی تجارت کو فروغ دے سکیں"۔ (حیات محمد۔ ۸۶) اس اعتراض کی دلیل بھونڈی اور کمزور ہے وہ یوں کہ اس سے کئی سوالات ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ مثلاً کیا اس سے پہلے یہود کے عربوں کے ساتھ تعلقات اچھے نہ تھے؟ کیا ان کے درمیان جنگ ہوئی جس سے فاصلے بڑھ گئے؟ کیا عربوں نے انہیں اپنے ملک میں تجارت کرنے سے منع کر رکھا تھا ایسے کون سے اختلافات تھے جو ختم نہیں ہو رہے تھے اور تجارت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے' جن کو محض رشتہ داری کی بنیاد پر ختم کیا جا سکتا تھا بجز اس کے ممکن نہ تھا؟ کیا تجارت رشتہ داری کی مرہون منت ہے جس سے تجارت فروغ پا سکتی ہے؟ ایسے ڈھیر سارے سوالات مذکورہ الزام کی تردید کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تجارت کے لیے رشتہ داری لازمی اور ضروری نہیں ہے بلکہ رشتہ داری کے ذریعہ سے تجارت کو فروغ دینا مجذوب کی بڑ ہے۔ زمانہ قدیم اور جدید میں تجارتی معاہدے کیے جاتے ہیں ایسا نہیں کہ تجارت کرنے والے ملکوں سے رشتہ داری پہلے قائم کی جاتی ہے اور بعد میں اس رشتہ کے طفیل تجارت کی جاتی ہے۔ آج کے دور پر ہی نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ملک اپنی وافر اشیاء دوسرے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں اور اپنے ملک میں ضرورت کی اشیاء ان ملکوں سے درآمد کرتے ہیں۔ اس تجارتی کاروبار کے لیے ملکوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی معاہدے ہوتے ہیں جن میں مختلف امور طے کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تجارت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ تجارت کرنا اور اسے ترقی اور فروغ دینا تحریری معاہدوں کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ تجارت کے فروغ کا دارو مدار رشتہ داری پر موقوف ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر کہیں تجارت کرنے والے ملک سے رشتہ داری نکل آئے تو اچھا ہے ورنہ تجارت کے لیے رشتہ داری ضروری نہیں ہے۔ یہ رشتہ داری کے بغیر چلتی رہتی ہے نیز ہر ملک سے رشتہ داری نہیں گانٹھی جا سکتی ہے کیونکہ کبھی کسی کی حکومت ہوئی ہے اور کبھی کسی کی۔ البتہ تجارتی معاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا یہ مستشرقین اس بات سے انجان ہیں کہ پیغمبر ﷺ کے اجداد عظام کے غسان اور روم کے بادشاہوں

کے ساتھ تجارتی معاہدے تھے۔ رشتہ داری کو تجارت کے ساتھ جوڑنے والے کی ذہانت اور علمی قابلیت کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ ''بایں عقل و دانش بباید گریست۔''

حضرت ابراہیمؑ کی مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ اور اسمٰعیلؑ کو ہمراہ لیا اور یہاں سے جنوب کی سمت روانہ ہوگئے اور ان کا یہ سفر اس درہ کوہ پر جا کر ختم ہوا جہاں آج کل مکہ معظّمہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مکہ کی طرف ہی ہجرت کیوں کی؟۔ شاہ معین الدین ندوی (تاریخ اسلام جلد اول، ص۱۳) لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ عراق و شام و مصر کی متمدن دنیا گھوم پھر کر دیکھ چکے تھے۔ یہاں کوئی پیغام توحید سننے والا نہیں تھا اس لیے توحید کی تبلیغ کے لیے ریگستان عرب کا سادہ صفحہ جو اپنی اصل فطرت پر اور تمدن کی نقش آرائیوں سے پاک تھا' کا انتخاب کیا۔ اس درہ میں کوئی مستقل آبادی نہ تھی' صرف شام اور یمن سے آنے جانے والے قافلے ستانے کے لیے پڑاؤ کر لیتے اور ان کے چلے جانے کے بعد وہی تنہائی اور ویرانی کا بسیرا ہوتا حضرت ابراہیمؑ نے اہل بیت کو تھوڑا بہت کھانے پینے کا سامان دیا جو گھر سے لائے تھے اور خود واپس ہو لیے۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے ایک چھوٹی سی کٹیا بنائی جب کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ خورونوش کا انتظام کریں۔ اسی تلاش میں انہوں نے صفا اور مروہ پہاڑیوں پر سات چکر لگائے پانی کا نشان تک پایا اور نہ ہی کسی انسان کو دیکھا مایوس ہو کر لوٹیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ کم سن بچہ زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور ان کے نیچے سے پانی ابل رہا ہے۔ خود پیا اور بچے کو پلایا پھر اس چشمہ کے چاروں طرف مینڈھ بنادی۔ اس کے بعد کھانے پینے کے لیے آنے والے قافلوں اور تاجروں سے کھانے کا سامان خرید لیتیں' جو یہاں پڑاؤ کرتے۔ یہ درہ کوہ صدیوں سے مشہور تھا مگر پانی کے چشمہ کے پھوٹ پڑنے کے بعد اور زیادہ مشہور ہوگیا۔ عرب کے کچھ قبیلے یہاں آکر آباد ہوگئے ان میں سے پہلا قبیلہ جو یہاں آکے آباد ہوا' وہ قبیلہ بنوجرہم کا تھا اور حضرت اسمٰعیلؑ بالغ ہوئے تو اسی قبیلہ بنوجرہم کی ایک خاتون سے جو مضاض بن عمرو جرہمی کی بیٹی تھی' عقد کیا۔ آہستہ آہستہ آبادی بڑھتی گئی اور اطراف سے قبائل آ آکر آباد ہوتے گئے۔ اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو مکہ مکرمہ میں آباد کیا تھا۔ مگر واقعہ کی جزئیات میں بعض محققین کو اختلاف ہے مثلاً

(۱) اس جگہ چشمہ پہلے سے جاری تھا۔

(۲) بنوجرہم کا قبیلہ حضرت ابراہیمؑ کی آمد سے پہلے آباد تھا۔ اور آپ کی آمد پر انہوں نے استقبال کیا۔

(۳) حضرت بی بی ہاجرہ علیہا السلام کا کھانے پینے کے لیے صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر چکر لگانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ ہیکل (حیات محمد۔۸۴) لکھتے ہیں کہ محققین یا تاریخ دان اس واقعہ کے

بارے میں چاہے جو بھی اختلاف رکھتے ہوں، ہم ان سے قطعاً اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس قرآن مجید، احادیث اور سلف کی کتب سے واضح دلائل موجود ہیں۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحم کرے اگر وہ چشمہ زم زم کو اسی طرح رہنے دیتیں یا آپ نے فرمایا اگر آپ اس سے جلدی سے چلو نہ بھرتیں تو زم زم جاری چشمہ ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند اور اس کی والدہ کو وادی غیر ذی زرع میں بسا کر واپس چلے، ایک گھاٹی کے پاس پہنچے، جہاں آپ کو اپنا بیٹا اور بیوی نظر نہ آئی۔ اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَo

ترجمہ: اے ہمارے رب میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کھیتی باڑی نہیں تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں، اے ہمارے رب! یہ اس لیے تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ پس کر دے لوگوں کے دلوں کو کہ وہ محبت سے ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں سے تاکہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں''۔ (ابراہیم ۳۷، پارہ ۱۳)

قرآن مجید میں مکہ کو وادی غیر ذی زرع کہا گیا ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اگر پانی میسر ہوتا تو کم از کم پہاڑی علاقوں کے بجز تھوڑے بہت میدانی علاقوں میں کھیتی باڑی ہونا چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے اہل بیت کے لیے رزق کی فراخی کی دعا کرتے ہیں۔ اس درہ میں کسی قسم کی سہولت میسر نہیں تھی، تبھی لوگ یہاں نہیں بستے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کی آمد کے وقت بھی یہاں ویرانی تھی۔ انہوں نے توحید کا پیغام پہنچانے کے لیے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ اس دوران انہوں نے کئی بستیاں بھی بسائیں۔ اس بستی یعنی مکہ کو بسانے کا سہرا بھی حضرت ابراہیمؑ کے سر ہے۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء میں ہے مکہ میں اس وقت نہ کوئی جاندار تھا اور نہ پانی تھا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بی بی ہاجرہ علیہا السلام کو یہاں چھوڑ کر جانے لگے تو شوہر اور بیوی میں یوں باتیں ہوئیں۔

ہاجرہ علیہا السلام::: ہم کو کس کے پاس چھوڑ چلے۔؟

ابراہیمؑ::؛ خدا کے پاس۔

ہاجرہ علیہا السلام: میں خدا پر راضی ہوں۔ (رحمۃ اللعالمین۔۲۔۴۴)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ چشمہ پہلے سے جاری تھا اور بی بی ہاجرہ علیہا السلام نے صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے چکر نہیں لگائے، دراصل وہ لوگ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کی شان اور عظمت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ع ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے کیونکہ عزت وذلت اسی ذات کے قبضہ

قدرت میں ہے۔ارشاد ربانی ہے۔وَتعزمن تشاوتذل من تشاء۔

جبرائیل کے پر مارنے یا حضرت اسمٰعیلؑ کی ایڑیاں رگڑنے سے چشمہ پھوٹا۔اگر جبرائیلؑ کے پر مارنے سے بحکم ربی چشمہ ابل پڑا تب بھی یہ حضرت ابراہیمؑ اوران کے اہل بیت کے لیے انعام خداوندی تھا۔جس چشمہ سے اب ساری دنیا فیض یاب ہورہی ہے۔یہ پیغمبر کے خاندان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کتنی عزت وعظمت ہے' کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اگر اسمٰعیلؑ علیہ السلام کی ایڑیاں رگڑنے سے چشمہ جاری ہوا' تب بھی یہ معجزہ اسمٰعیلؑ کا ہے جو عطایا خدا وندی ہے۔ہر دوصورتوں میں یہ عزت وعظمت حضرت ابراہیم علیہ السلام اوران کے اہل بیت کے لیے ہے۔یہی تو مخالفین کو دکھ ہے جوانہیں گھن کی طرح چاٹ رہا ہے اوران کا کہنا کہ وہاں چشمہ جاری تھا۔لوگ آباد تھے۔اور بی بی کو کھانے پینے کے سامان کے لیے پہاڑیوں کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہ تھی۔مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ الہامی کتاب' حدیث اوراسلاف کی کتب میں یہ بات موجود ہے کہ وہاں نہ کوئی جاندار اور نہ پانی تھا تو کس طرح ان ماخذ کے ہوتے ہوئے مخالفین کی رائے کوتسلیم کیا جاسکتا ہے۔

توریت میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ہوئی جس کا نام اسمٰعیلؑ رکھا گیا۔ان کے بعد بی بی سارہ علیہا السلام کے بطن سے اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے۔حضرت اسمٰعیلؑ جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہاجرہ اوراس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو۔ان واقعات کے بعد تورات کے خاص الفاظ یہ ہیں ترجمہ:''ابراہیم علیہ السلامؑ نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کے کندھے پر دھر دی اوراس لڑکے (اسمٰعیلؑ) کو بھی رخصت کیا وہ روانہ ہوئی اور بئیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تب اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور وہ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے دور جا کر بیٹھ گئی' کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں' سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی' تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور کہا! اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا' مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی' اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اوراس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا۔اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا اور تیر انداز ہو گیا' اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی۔ (س۔ش۔ا۔۹۲) اگرچہ توریت کی مذکورہ عبارت نہایت دلخراش اور جگر سوز ہے پھر بھی اس عبارت سے

ہمارے موقف کی تائید اور مستشرقین کے الزامات کی تردید ہوتی ہے۔

سر ولیم میور اپنے موقف یعنی اسرائیلی گفتار سازوں نے ظہور اسلام سے پہلے یہ افسانہ تراشا اور ابراہیمؑ کے فرزندوں کو عرب میں آباد کر دیا' کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک اور الزام لگاتا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

اعتراض نمبر ۵

''اہل عرب کو حضرت ابراہیم (علیہ اسلام) کے دین سے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ بت پرستی کرتے تھے اور ابراہیمؑ خدا پرست موحد تھے۔'' (حیات محمد۔ ۸۶)

جواب: سر ولیم میور اس اعتراض میں تنہا ہے جب کہ بیسیوں یہودی مورخین نہ صرف خاندان قریش بلکہ تمام شمالی عرب وحجاز کو ابراہیمی نسل تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے کلدانیہ' اشوریہ، لبنان' فلسطین اور مصر میں شمع توحید جلائی اس روشنی کی ایک شمع حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی شکل میں عربوں کو دی۔ قریش کا صرف یہی دعویٰ ہے کہ وہ اسمٰعیلی ہیں۔ خود توریت نے بنی اسمٰعیل کے بارہ قبیلے بیان کیے ہیں۔ قریش کے جد امجد قیدار جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے صاحب زادے ہیں بنی نابت کے جنوب (حجاز) میں مقرر کیا۔ عہد وسطیٰ کے مورخین نے سراسین کو اسمٰعیلی قرار دیا ہے۔ کونسا امر مانع ہے کہ یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ عربوں میں جو رسوم رائج تھیں وہ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیھم السلام نے متعارف کرائیں۔ (مستشرقین کا انداز فکر۔ ۲۳۶)

قس بن ساعدہ ایادی' زید بن عمرو بن نفیل' امیہ بن ابی صلت' ابوکرب' سیف ذی یزن اور ورقہ بن نوفل وغیرہ' ایسے لوگوں کو تاریخ حنفا کہتی ہے۔ حنفا حنیف کی جمع ہے اور حنیف حضرت ابراہیمؑ کے پیروؤں کا لقب ہے تو پھر کیسے مان لیا جائے کہ اہل عرب بت پرست تھے اور انہیں دین ابراہیمی سے کوئی نسبت نہ تھی۔

سوم: عرب خانہ خدا کی عزت واحترام میں بڑھے ہوئے تھے' بایں سبب کہ ان کے جد امجد حضرت ابراہیم واسمٰعیلؑ دونوں نے اس کی بنیادیں اٹھائی تھیں۔ حج کی عبادات جیسے بیت اللہ کا طواف' حجر اسود کا استیلام' صفا مروہ کے درمیان سعی اور عرفات کی عبادتیں سب کی سب ان پیغمبروں نے متعارف کروائیں اور یہ عبادتیں عرب کیا کرتے تھے۔ مگر یہ بات درست ہے کہ ان عبادات میں ردوبدل ہو چکا تھا اور کئی قسم کی خرافات در آئی تھیں مثلاً کعبہ کا طواف تو کرتے تھے مگر ننگے دھڑ نگے کرتے تھے احترام خانہ کعبہ تو تھا لیکن اسے ۳۶۰ بتوں سے مزین کر رکھا تھا۔ مہینوں کی قدر تو تھی مگر ان کو آگے پیچھے کرنے کی ''نسی'' موجود تھی۔ انکی نمازیں بھی کسی کام کی نہیں تھیں' وہ سیٹیاں بجا کر یا تالیاں بجا کر کرتے تھے ارشاد خداوندی ہے'' وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً '' (انفال ۳۵، پارہ ۹) کعبے میں ان کی نمازیں کیا تھیں (رائگاں) سیٹیاں (اکثر) بجانی یا بجانی تالیاں۔ (ڈاکٹر حمید اللہ محمد رسول اللہ۔ ۳۲)

گویا عبادتیں اور رسوم تو وہی تھیں لیکن وہ اصلی حالت میں نہیں رہی تھیں۔ان میں تحریف کردی گئی ۔اب تحریف شدہ رسوم ان کی عبادتیں بن چکی تھیں' اس بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اہل عرب کو دین ابراہیمی سے کوئی نسبت نہ تھی اور وہ بت پرست تھے اور ابراہیمی تعلیمات ان تک پہنچی نہیں تھیں۔

چہارم::؛ عربوں کا بت پرستی کرنے سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے اہل عرب کو بت پرستی سے منع نہیں کیا تھا جبکہ اللہ واحدہ لاشریک کو معبود ماننے کی تبلیغ اپنے ہم وطنوں کو کی' جس کی پاداش میں انہیں آگ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم فرمایا'' یا نار کونی برد وسلام علی ابراہیم'' آگ حضرت ابراہیمؑ پر ٹھنڈی ہوگئی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے پیغمبر کو بچالیا۔اس صورت حال میں اور اپنے ہم وطنوں کی ڈھٹائی کے سبب جو بتوں کی پوجا پاٹ پر ڈٹے ہوئے تھے' اس لیے انہوں نے حجاز کی طرف ہجرت فرمائی اور یہاں کے بت پرستوں کو بھی خدائے واحد کی عبادت کی تلقین کی لیکن اکثریت اس قبیح رسم یعنی بت پرستی سے نہ ہٹ سکی گویا اکثریت کا بتوں کی پوجا پاٹ کرنے سے سرولیم میور کا یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اہل عرب کو دین ابراہیمی سے کوئی نسبت نہ تھی' درست نہیں ہے۔اس وجہ سے کہ عربوں نے دین ابراہیمی میں ردوبدل کر کے اپنی مرضی کا دین بنالیا تھا اور اصل دین ابراہیمی کی تعلیمات بھلا چکے تھے یا از خود چھوڑ چکے تھے اور اپنے مرضی کے بنائے ہوئے مذہب پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ ان کے اپنے تیار کردہ مذہب کو واقعی دین ابراہیمی سے کوئی نسبت نہ تھی۔ دین ابراہیمی کی تعلیم کردہ عبادات مثلاً حج ،طواف اور نماز کی عبادت بجالاتے تھے مگر اس میں اپنی مرضی کی نہایت لغو تبدیلیاں کرلی تھیں۔لہذا تحریف شدہ مذہب کی پیروی ہوتی تھی۔تو یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ عربوں کو دین ابراہیمی سے کوئی نسبت نہ تھی اور وہ بت پرست تھے۔

اس اعتراض کا دوسرا جز یہ ہے کہ عرب بت پرستی کرتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ خدا پرست موحد تھے۔اس کا جواب: ہیکل (حیات محمد۔۸۶) لکھتا ہے''لیکن معترض کی یہ کمزور سی دلیل تاریخ کے ایک مسلمہ واقعہ کی تردید کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کی وفات کے صدیوں بعد بت پرست بن جانا اس بات کی دلیل کیسے بن سکتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اہل بیت کو حجاز میں آباد کیا' اس وقت سے لے کر دونوں باپ اور بیٹے کے ہاتھوں تعمیر ہونے والے بیت اللہ تک عرب کے رہنے والے بت پرست ہی تھے تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہم وطنوں کو بت پرستی سے منع کیا انہیں اللہ واحدہ لاشریک کو معبود ماننے کے دلائل کے ساتھ دعوت دی وہ نہیں مانے تو آپ نے حجاز کی طرف ہجرت کرلی، یہاں بھی انہوں نے بت پرستوں کو اللہ کی عبادت کرنے کی تبلیغ کی مگر یہاں کے لوگوں نے بھی بت پرستی کو نہ چھوڑا لیکن سارے لوگ بت پرست نہیں تھے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو موحد اور عربوں کو بت پرست کہنے سے یہ مستشرق یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہ رہا ہے کہ ابراہیم علیہ

السلام اور اہل عرب کے عقائد میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔اس بعد کی بناء پر یہ کیسے مان لیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل بیت کو مکہ مکرمہ میں آباد نہیں کیا تھا۔اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ابراہیمؑ کے زمانہ میں یہ لوگ بت پرست تھے، تب بھی سر ولیم میور کے لیے یہ دلیل موید نہیں ہو سکتی۔آخر اس میں کونسا پہلو نکلتا ہے جس کی بنیاد پر حضرت ابراہیمؑ کے حجاز آنے سے انکار ضروری سمجھ لیا جائے، خصوصاً عقل صریح اور نقل صحیح دونوں ہماری تائید اور میور کی تردید میں پیش پیش ہیں۔

اہم نکتہ: کوہ فاران عرب میں ہے جبکہ عیسائی علماء اسے فلسطین کے جنوب میں واقع ایک صحرا کا نام بتاتے ہیں تورات میں ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ''فاران'' میں رہے اور تیراندازی سیکھی اور اس کی والدہ نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی''

جواباً عرض ہے کہ عیسائی اہل بیت ابراہیمؑ کی مکہ آمد اور سکونت کو نہیں مانتے اس سلسلے میں وہ یہ بھی نہیں مانتے کہ کوہ فاران عرب میں واقع ہے بلکہ وہ اس صحرا کا نام لیتے ہیں جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے۔گویا عیسائیوں کو اس پر اعتراض ہے کہ فاران عرب میں نہیں اس لیے وہ حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب میں آنا خلاف واقعہ کہتے ہیں۔عرب کے جغرافیہ دان اس بات پر متفق ہیں کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے۔معجم البلدان میں صاف تصریح ہے لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔۔۔مولانا شبلی (سیرت النبی۔ا۔۹۳) کہتے ہیں کہ اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی شمالی حد کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔''موسولیبان'' تمدن عرب میں لکھتا ہے کہ اس جزیرہ کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں، یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ غزہ فلسطین کا ایک شہر''اور'' بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب میں بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لاکر خلیج میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حد شمالی کہہ سکتے ہیں''۔اس طرح عرب کے حجازی حصہ میں فاران کا ہونا قرین قیاس ہے۔تورات میں جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جائے سکونت کا بیان ہے وہاں یہ الفاظ ہیں''اور وہ'' حویلہ سے ''شور'' تک اس تحدید میں مصر کے سامنے زمین پڑتی ہے، وہ عرب ہی ہو سکتا ہے''۔

دوم:: حبقوق نبی نے صدیوں پہلے نعرہ لگایا خدا جنوب سے، اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا اور اسکی شوکت سے آسمان چھپ گیا، زمین احمد کی حمد سے بھر گئی۔'' (النبی الخاتم۔۲۴) مزید لکھتا ہے کہ خدا سینا سے نکلا، سعیر سے چمکا اور فاران ہی کے پہاڑ مورہ سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ''۔(حوالہ بالا)

سوم: سرسید لکھتے ہیں کہ ''بنی اسمٰعیلؑ اس وسیع قطعہ میں آباد ہوئے تھے جو شمالی حد یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہیٰ ہوتا ہے، یہ جگہ اب بنام حجاز مشہور ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے۔ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا

کی جانب عزیمت کرے اور تورات مقدس کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے ”جو کہ سامنے مصر کے ہے اگر تو اسیریا کی طرف روانہ ہو یعنی مصر کے سامنے ہے اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسیریا تک کھینچو“۔

چہارم:: قاضی محمد سلیمان سلمان (رحمتہ اللعالمین ۔۲۔۵۴) لکھتے ہیں کہ تورات میں ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے۔۔۔۔۔وہ اپنی اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے یہ بھی ہے کہ ان کی بستیوں اور قلعوں کے نام بھی ان ہی کے نام پر ہیں۔ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ جب یہ الفاظ لکھے گئے تھے اس وقت ابنائے اسمٰعیلؑ کی بستیاں اور قلعے ان ہی کے نام سے زیادہ مشہور اور زبان زد عام تھے۔۔وہ سب عرب کے اندر ہی واقع ہیں اور اس طرح تورات کے اس فقرہ سے کہ ”اسمٰعیل علیہ السلام فاران کے بیابان میں رہا“ ان کے مقامات کی صحت ہو جاتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ فاران عرب میں واقع ہے اور مکہ ہی کے پہاڑ کا نام ہے۔

پنجم: امام بیہقی لکھتے ہیں ”رب آیا سینا سے اور اس نے ان کے لیے آگ اٹھائی اور وہ کوہ فاران سے بلند ہوا اور وہ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دائیں ہاتھ سے ان کے لیے شریعت کی آگ نکلی“۔اور وہ مزید کہتے ہیں کہ شواہد سب کے سب کوہ فاران کے مکہ میں موجود ہونے کے بارے خبر دیتے ہیں“۔(اردو ترجمہ دلائل النبوت۔ا۔۶۷)

تورات میں ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے اسمٰعیلؑ کی شادی مصر میں کی تھی۔ممکن ہے کہ کسی مصری عورت سے شادی بھی کی ہو مگر یہ بات مسلمہ ہے اور محقق ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جرہمی عرب بیوی سے ہوئی۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (پیغمبر اعظم و آخر۔۲۷۲) بحوالہ محمد حمید اللہ لکھتے ہیں کہ غار حرا میں قرآن مجید جو نور و ہدایت ہے آپ ﷺ پر نازل ہونا شروع ہوا تھا اس لیے وہ جبل النور کے نام سے مشہور ہے بائبل میں اس کا ترجمہ فاران آیا ہے۔جبل نور مکہ معظّمہ کے شمال مشرق میں منیٰ و عرفات کی شاہراہ کی بائیں جانب چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے۔

تورات میں اتنی تحریف اور تبدیلی کے بعد بھی آپ ﷺ کا ذکر خیر باقی ہے۔ابن ظفر اور ابن قتیبہ نے ”اعلام النبوۃ“ میں تحریر کیا ہے ”اللہ رب العزت سینا سے تجلی فرمائے گا، ساعیر (سعیر) سے چمکے گا، وہ فاران کے پہاڑوں سے آشکار ہوگا“ سینا وہ پہاڑ ہے جس پر رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا، ساعیر وہ پہاڑ ہے جس پر رب تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا اس میں ان کی نبوت کو ظاہر کیا تھا۔فاران کے پہاڑ مکہ مکرمہ میں بنو ہاشم کے پہاڑ ہیں۔ان میں سے ایک پہاڑ میں حضور ﷺ خلوت گزیں ہوئے تھے اسی میں غار حرا ہے جہاں وحی الٰہی کا آغاز ہوا تھا۔ابن قتیبہ نے کہا ہے ”اس عبارت میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ سینا میں رب تعالیٰ کی تجلی سے مراد طور سینا

پر حضرت موسیٰ کلیم اللہ پر تورات نازل کرنا ہے، ساعیر سے ان کا چمکنا سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل کرنا ہے، اور فاران کے پہاڑوں سے عیاں ہونے سے مراد حضور ﷺ پر قرآن پاک نازل کرنا ہے۔ فاران مکہ مکرمہ کے پہاڑوں کا نام ہے اس میں اہل کتاب اور مسلمانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں اگر ان میں سے کسی کو اعتراض ہے کہ فاران مکہ کے پہاڑوں میں سے نہیں ہے تو ہم اسے کہیں گے کیا تورات میں یہ عبارت موجود نہیں ''اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجرہ و اسمٰعیل علیھم السلام کو فاران میں سکونت دی، ذرا ہمیں اس پہاڑ کے بارے میں بتاؤ جس سے رب تعالیٰ کی ذات آشکار ہوئی ہو اور اس کا نام فاران ہو، اور نبی جس پر کتاب نازل ہوئی ہو، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوں، کیا تم ایسے دین کو جانتے ہو جو اسلام کی طرح ظاہر ہوا ہو اور پھر وہ زمین کے مشارق و مغارب میں جا پہنچا ہو۔''
(السیرت النبویہ زینی دھلانی۔۲۔۵۵۴)

اہم نکتہ: ''مستشرقین بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، جس طرح کئی جگہوں اور مقامات کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں اور ان کو ان کی اصل جگہ اور مقام پر نہیں رکھتے مثال کے طور پر ایک جگہ یا مقام ملک عرب میں ہے مگر وہ اسے عراق میں بتاتے ہیں۔ جس طرح پیچھے کوہ فاران کا ذکر ہوا کہ وہ عرب میں ہے مگر غیر مسلم اسے عراق میں بتاتے ہیں اور اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ واقعات جو کوہ فاران سے منسوب ہیں ان کو غلط ثابت کیا جا سکے۔ اسی طرح بطحا کے متعلق وہ قیاس آرائیاں کرتے ہیں''۔ سر ولیم میور کا خیال ہے کہ ''موسیو کوسین'' نے بطحا کو کسی جگہ کا نام تصور کرنے میں غلطی کی ہے۔ ان کے خیال میں وہ سنگریزوں والی سرزمین ہے جس پر مسلمانوں کو اذیت دی جاتی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سید امیر علی خود اپنے بیان اور موسیو کوسین ڈی پرسیوال کے بیان کی تصدیق میں کہتا ہے کہ میرے لیے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ بطحا کا موجود ہونا ایک ایسا امر ہے جس کے بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسلم مصنفین نے اکثر بطحا کا ذکر ایک ایسے مقام کی حیثیت سے کیا ہے جو مکہ کے قرب وجوار میں واقع ہے۔

چو علمت ہست خدمت کن ' چو بے علما ں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفت در بطحا

(روح اسلام۔۱۲۳)

رمضا کی پہاڑی اور بطحا یہ دونوں مقام ان بے رحمانہ ایذا رسانیوں کا محمل بن گئے تھے۔ بلال کو ان کا آقا امیہ بن خلف ہر روز انھیں ٹھیک دوپہر کے وقت بطحا لے جاتا ' وہاں ان کی پیٹھ ننگی کر کے اور ان کا منہ سورج کی طرف کر کے لٹا دیتا اور ان کے سینے پر بھاری چٹان رکھ کر کہتا ''تو اسی حال میں رہے گا جب تک

تیری جان نہ نکل جائے یا تو اسلام سے توبہ نہ کرے"۔ بطحا کی موجودگی کے بارے میں شاعروں نے خوب شعر کہے ہیں جس طرح عبدالرحمٰن جامی بطحا کو شعر میں یوں بیان کرتے ہیں۔

نسیما جانب بطحا گزر کن
ز احوالم محمدؐ را خبر کن

سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کی وفات پر جو اشعار کہے ان میں بھی بطحا کا ذکر ہے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔ "ہاشم کا ایک فرزند بطحا کی جانب جا کر چھپ گیا' وہ لحد میں بہادروں کی بانگ و خروش کے ساتھ جا سویا۔ موت نے اسے پکارا اور وہ چلا گیا' افسوس کہ موت نے اس کا نظیر بھی دنیا میں نہیں چھوڑا۔ اس کے دوست شام کے وقت اس کی لاش اٹھالے چلے اور از راہ محبت وہ نوبت بہ نوبت کاندھا بدلتے اور اس کے اوصاف باری باری بیان کرتے تھے خواہ موت نے اسے ہم سے دور ہی کر دیا مگر اس میں تو شک نہیں کہ وہ بہت سخی اور غریبوں کا بہت زیادہ ہمدرد تھا۔ (رحمت اللعالمین ۔۲۔۹۵)

بابُ الصلوۃ بذی الحلیفہ (ذوالحلیفہ میں نماز پڑھنا) کے باب میں ہے کہ بطحا چار ہیں۔ بطحا مکہ ۲ بطحا ذی قار ۳ بطحا ازہر ۴ بطحا ذوالحلیفہ ۔ مذکور باب کی حدیث میں بطحا کو ذوالحلیفہ سے مقید کیا' بعض غزوات میں آپ ﷺ نے بطحا ازہر میں آرام فرمایا' وہاں مسجد بھی ہے۔ اور بطحا ذوالحلیفہ کو اہل مدینہ معرّس کہتے ہیں۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جاتے ہوئے آپ ﷺ آرام فرمایا کرتے تھے اور ظاہر بھی یہی ہے کیونکہ آپ کو خواب میں یہ دکھایا گیا اور کہا گیا کہ بطحا مبارکہ ہے۔ اس لیے آپ وہاں بطور تبرک نماز پڑھا کرتے تھے اور مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے ہوئے یہاں آخر رات کو آرام فرمایا کرتے تھے تاکہ صبح مدینہ منورہ جلدی تشریف لے جائیں۔ (تفہیم البخاری ۔۲۔۵۷) تفہیم البخاری کی عبارت اور سیدہ آمنہ کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ بطحا مدینہ منورہ کے قریب ہے۔ وہ اس طرح کہ بی بی آمنہ رضی اللہ عنہا کے شوہر نامدار کو دار نابغہ میں دفن کیا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ نے موضع ابواء جو مدینہ سے ۲۳ میل کی مسافت پر ہے، رحلت فرمائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (خاتم النبین ۔۱۱۳)۔ گویا جائے مدفون بطحا قرار دیا اس کا مطلب ہے کہ مقام مدفون بطحا ذوالحلیفہ ہے۔ چونکہ بطحا چار ہیں اس لیے مصنفین نے مکہ کے قریب بطحا کا ذکر بھی کیا ہے اور ان چار جگہوں میں بطحا یا تو مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ کے قریب ہے۔ اور موسیو کوسین پر سیوال نے صحیح کہا ہے اور سر ولیم میور کا خیال محض باطل ہے۔

ذبیح کون ہے اور قربانی کی جگہ کہاں ہے؟؟ یہ دو امور ایسے ہیں جن میں مسلم اور غیر مسلم فریقین کا اختلاف شدید پایا جاتا ہے۔ یہ امور جس فریق کے حق میں موافق قرار پا جائیں' اس کی جزئیات بھی اسی کے مطابق مان لینی چاہییں ۔(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلامؑ کے اہل بیت (بی بی ہاجرہ اور حضرت

اسمٰعیل علیھم السلام) عرب کے شہر مکہ میں آباد ہوئے یا نہیں؟

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندوں حضرت اسمٰعیلؑ وحضرت اسحٰقؑ میں سے کس کی قربانی دی گئی۔؟ یہود کا دعوی ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ذبیح ہیں اور قربان گاہ شام میں ہے لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح ہیں تو قربان گاہ سے متعلق عرب کی روایتیں تسلیم کرنا پڑیں گی اور ابراہیمؑ کے اہل بیت کا عرب میں سکونت اختیار کرنا بھی ماننا پڑے گا' اس لحاظ سے تاریخی واقعات کے تمام سلسلے باہم مل جائیں گے۔ مولانا شبلی نعمانی کی تقریر؛ تورات میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہ علیہ السلام کے بطن سے ہوئی جس کا نام اسمٰعیل علیہ السلام رکھا گیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد حضرت سارہ علیہا السلام کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں حضرت ابراہیم سے کہا کہ بی بی ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو۔۔۔ تورات یہود کی ذاتی اغراض اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہوگئی ہے اور خصوصاً پیغمبر خاتم ﷺ کے متعلق جو تصریحات اور تلمیحات تھیں یہود کے دستِ تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ تورات میں گو تصریحاً حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ذبیح ہونا لکھا ہے لیکن مطاوی کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز نہ ذبیح تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ درج ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ا؛ شریعت سابقہ کی رو سے قربانی صرف اس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلوٹا بچہ ہو' اسی بناء پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی' وہ پہلونٹے بچے تھے۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جہاں لادیوں کے متعلق احکام ہیں' وہاں فرمایا' ترجمہ'' کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لیے ہے۔

(۲) پہلونٹے بچے کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی۔ تورات میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں' ایک محبوبہ دوسری غیر محبوبہ' تو افضلیت اسی اولاد کی ہوگی جو پہلونٹی ہو' گو وہ غیر محبوبہ سے ہو کیونکہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اسی کو اولاد اولین ہونے کا حق ہے۔

(۳) جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا' تورات میں ہے'' تب خدا نے لادی کی اولاد کو اس لیے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو' تاکہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں۔ یہی وجہ ہے کہ لادیوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے۔''

(۴) جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا جس طرح آج کل حج کے احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں۔ تورات میں ہے ''اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے کیونکہ یہ بچہ خدا کی نذر کیا جائے۔'' (۵) جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا اس کے لیے خدا کے سامنے کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

(۶) حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ملا تھا اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربان کیا جائے جو اکلوتا ہو اور محبوب ہو۔ اب غور کریں۔۔۔۔

(۱) حضرت اسحٰقؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کے بعد پیدا ہوئے، اس بناء پر حضرت اسحٰقؑ اکلوتے بیٹے نہیں اور چونکہ قربانی کے لیے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے اس لیے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی قربانی کا حکم نہیں ہوسکتا تھا۔

(۲) حضرت اسحٰقؑ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا تمام ترکہ دیا، بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اس کی والدہ کو پانی کی ایک مشک اور تھوڑا سا کھانے کا سامان دے کر رخصت کیا۔ یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰقؑ علیہ السلام کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

(۳) حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈواتے تھے، حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈواتے، یہ اسی سنت اسمٰعیلی کی یادگار ہے۔

(۴) جو الفاظ قربانی اور نذر کے لیے ملت ابراہیمی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے استعمال کیے نہ کہ حضرت اسحٰقؑ کے لیے۔ تورات میں ہے کہ ''جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا'' کاش اسمٰعیلؑ تیرے سامنے زندہ رہتا'' تورات میں ہے جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) انہی معنوں میں ہوا ہے۔ (۵) حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے۔ تورات جو تمام تر حضرت اسحٰق علیہ السلام کی یک طرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحٰق اور حضرت اسمٰعیل علیہم السلام کے جو امتیازی خصائص بیان کیے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ علیہ السلام خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں۔

(ب) حضرت اسمٰعیلؑ دعوت ابراہیم علیہ السلام ہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے، اس بناء پر خدا نے ان کا نام اسمٰعیلؑ رکھا کیونکہ اسمٰعیلؑ دو لفظوں کا مرکب ہے۔ ''سمع'' اور ''ایل''۔ سمع کے معنی سننے کے ایل کے معنی خدا کے ہیں یعنی خدا نے ان کی دعا سن لی۔ تورات میں ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ علیہ السلام سے کہا کہ اسمٰعیلؑ کے بارے میں ''میں نے تیری سن لی''۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس

موقعہ پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو یاد کیا۔ غرض چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا' اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو' اس لیے حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ ۔(بیٹے سارے محبوب ہوتے ہیں لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کے محبوب ترین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاں اولاد نہ تھی بارگاہ الٰہی میں دعا کی' اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرما کر حضرت اسمٰعیلؑ بیٹا عطا فرمایا)۔(۶) حضرت اسحٰقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ یہ بشارت بھی دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا تورات میں ہے''پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لیے ایک بیٹا جنے گی اور اس کا نام اسحٰقؑ رکھے گا اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا''۔۔۔۔حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربان کرنا چاہا تو فرشتے نے ندا دی کہ ہاتھ روک لے،تو فرشتے نے یہ الفاظ کہے: خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا ہے اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا' میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا''۔اب غور کیجئے کہ خدا نے جب حضرت اسحٰقؑ علیہ السلام کی بشارت کے وقت بھی یہ کہہ دیا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس وقت تک حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد پیدائش نہیں ہوئی تھی' ان کی قربانی کا حکم ہوتا لیکن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں۔حضرت اسمٰعیلؑ اولاد اکبر تھے' محبوب تر تھے۔قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے۔قربانی سے پہلے ان کی کثرت نسل کی بشارت نہیں دی گئی۔تورات میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنا چاہا' اس لیے اس بیٹے کی کثرت نسل کی بشارت دی گئی یعنی یہ کثرت نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی۔اس لیے ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ حضرت اسحٰقؑ کی تکثیر نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت کے وقت ہو چکا تھا جو کسی انعام وصلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔(مولانا شبلی کا بیان ختم ہوا)

البدایہ والنہایہ میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے سامنے کسی نے فخر سے اپنے باپ داداؤں کا نام لیا تو آپ نے فرمایا'' قابل فخر باپ دادا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے تھے جو یعقوب بن اسحٰقؑ ذبیح اللہ بن ابراہیمؑ خلیل اللہ تھے۔عکرمہ' ابن عباس اور خود عباس' علی' سعید بن جبیر' مجاہد' شعبی 'بعید بن عمیر' ابو میسرہ' زید بن اسلم' عبداللہ بن شقیق' زہری' قاسم بن ابو برزہ' مکحول' عثمان بن ابی حاضر' سدی' حسن' قتادہ' ابوالہذیل' ابن سابط' کعب احبار اور ابن جریر سب حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح مانتے ہیں مگر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب بزرگوں کے استاد کعب احبار ہیں' یہ خلافت فاروقی میں مسلمان ہوئے تھے اور کبھی کبھی حضرت عمر کو قدیمی کتابوں کی باتیں بتاتے تھے۔لوگوں نے اسے رخصت سمجھ کر پھر ان سے ہر ایک کو بات بیان کرنا شروع کر دیا اور صحیح وغلط کی تمیز اٹھ گئی' حق تو یہ ہے کہ اس امت کو اگلی

کتابوں کی ایک بات کی بھی حاجت نہیں۔ ''بغوی'' نے کچھ اور صحابہ اور تابعین کے نام بتلائے ہیں جنہوں نے کہا کہ ذبیح اللہ حضرت اسحٰقؑ ہیں۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی یہ آیا ہے، اگر وہ حدیث صحیح ہوتی تو جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ مگر وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس میں دو، راوی ضعیف ہیں۔ حسن بن دینار متروک ہیں اور علی بن زید ابن جدعان منکر الحدیث ہیں اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ہے بھی موقوف۔

خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے جب محمد بن قرظی نے یہ فرمایا اور ساتھ ہی اس کی دلیل بھی دی کہ ذبیحہ کا ذکر کرنے کے بعد قرآن مجید میں خلیل اللہ کو حضرت اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت کا ذکر ہے اور ساتھ ہی بیان ہے کہ ان کے ہاں بھی لڑکا ہوگا، یعقوب نامی۔ جب ان کی اور ان کے ہاں لڑکا ہونے کی بشارت دی گئی تھی پھر باوجود ان کے ہاں لڑکا ہونے سے پیشتر ان کے ذبح کرنے کا حکم کیسے دیا جاتا ہے؟۔ تو حضرت عمر نے فرمایا: بہت صاف دلیل ہے، میرا ذہن یہاں نہیں پہنچا تھا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ پھر شاہ اسلام نے ایک یہودی عالم سے پوچھا جو مسلمان ہو گئے تھے کہ تم اس بارے میں کیا علم رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ امیر المسلمین سچ تو یہ ہے کہ جن کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔ لیکن چونکہ عرب ان کی اولاد میں سے ہیں تو یہ بزرگی ان کی طرف لوٹتی ہے۔ اس حسد کے مارے یہودیوں نے اسے بدل دیا اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کا نام لے دیا۔

حضرت عبداللہ نے اپنے والد امام احمد بن حنبل سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ تھے۔ حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، ابوالطفیل، سعید بن مسیبؒ، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد، شعبی، محمد بن کعب، ابوہریرہ، ابو جعفر محمد بن علی، ابوصالح رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر سورہ الصافات)

سلمان منصور پوری (رحمت اللعالمین ۔۲۔ ۴۹۔۵۰) لکھتے ہیں بات یہ ہے کہ جمہور مسلمانوں کے نزدیک یہی امر زیادہ صحیح اور زیادہ قوی ہے کہ ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلامؑ تھے۔ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ سچی شہادت قرآن مجید کی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے'' وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔۔۔۔۔ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ O (الصّٰفّٰت ۹۹،۱۱۲، پارہ ۲۳)

ترجمہ: ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے خدا کی طرف جاتا ہوں وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اے خدا مجھے نیک بیٹا عطا کر، تب ہم نے اسے ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی پھر ایسا ہوا کہ ابراہیم اس لڑکے کو لے کر مقام سعی پر پہنچا اور اسے سنایا کہ بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں تو غور کر تیری اس میں کیا رائے ہے۔؟ بیٹا بولا اے باپ! کر گزر جو تجھے حکم ملا ہے۔ ان شا اللہ مجھے صابر پائے گا جب دونوں نے حکم کے سامنے گردن جھکا دی اور بیٹے کو پیشانی کے بل گرایا تو ہم نے کہہ دیا کہ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب پورا کر دیا، ہم اس طرح احسان کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک

یہ ایک کھلا کھلا امتحان تھا پھر ہم نے بڑی قربانی کو اس کا فدیہ بنایا اور اس قربانی کو پچھلی نسلوں میں باقی رکھا' ابراہیمؑ پر سلام!۔ ہم احسان والوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں اور ابراہیم ہمارے ان بندوں میں سے ہے جو کامل الاعتقاد ہیں اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق کی بشارت دی جو صالح نبیوں میں سے ہے۔''

ان آیات سے وجہ استدلال یہ ہے کہ ان میں دو فرزندوں کی بشارتوں کا دو دفعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اول ایک بردبار لڑکے کی بشارت کا ذکر فرمایا اور اسی ذکر کے ساتھ قربانی کا تمام قصہ بیان کر دیا۔ اس کے ختم ہو جانے کے بعد پھر حضرت اسحٰقؑ کی بشارت کا ذکر فرمایا۔ اب اگر غلام علیم وہی اسحٰقؑ ہیں تو بشرناہ باسحٰقؑ فرمانا اس سارے قصے کے بعد کسی طرح بھی صحیح نہیں رہ سکتا۔ اس کی تائید سورہ حجر اور سورہ ذاریات کی آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی صفت ''بغلام علیم'' فرمائی گئی ہے یعنی اسمٰعیل علیہ السلام غلام حلیم تھے اور اسحٰق غلام علیم تھے۔ اس استدلال کے خاتمہ سے پہلے یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ کتاب پیدائش میں جہاں قربانی فرزند کا حکم ہے' وہاں یہ بھی ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کر۔ یہ امر تورات سے ثابت ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش حضرت اسمٰعیلؑ سے تیرہ سال بعد ہوئی تھی۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو اکلوتا بیٹا نہیں کہہ سکتے جب کہ ان سے بڑا بھائی موجود تھا۔ قرآن مجید میں واقعہ قربانی کے بعد الفاظ ''وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحٰقَ'' وارد ہوئے ہیں اور ان سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہ واقعہ قربانی قبل از ولادت حضرت اسحٰق علیہ السلام وقوع میں آچکا تھا کیونکہ اس وقت اسمٰعیلؑ ہی واحد پسر اپنے باپ کے تھے' اس لیے اکلوتے کی صفت ان ہی پر صادق آتی ہے۔

دوسری وجہ استدلال یہ ہے کہ والصافات کی آیات بالا نے ایک اندرونی شہادت کو بھی پیش کیا ہے یعنی قربانی عظیم کو پچھلی نسلوں میں ہمیشہ کے لیے جاری رکھا جانا ہے۔ فدیہ ذبیح بنایا گیا تھا۔ اب بنو اسمٰعیل کی قوموں کے حالات اور بنو اسحٰق کی قوموں کے حالات دنیا کے سامنے ہیں۔ ہر ایک شخص دیکھ سکتا ہے کہ کس قوم میں ذبیح کی یادگار پانچ ہزار سال سے زائد عرصہ سے لگاتار چلی آرہی ہے اور کسی قوم میں اس یادگار کا کوئی نام ونشان بھی کبھی نہیں پایا گیا ہے۔ ہم اس کے ثبوت میں تورات ہی کا ایک مقام پیش کرتے ہیں۔ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے۔۔۔ اونٹنیاں کثرت سے تجھے آکے چھپالیں گی' اور مدیان اور عیفا کے اونٹ' وہ سب جو سبا کے ہیں' آئیں گے' وہ سونا اور لوبان لائیں گے اور خداوند کی بشارت سنائیں گے۔

قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہونگی' نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہونگے' وہ میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنے شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا''۔

مقام قربانی: تورات میں قربانی گاہ کا جو موقع بتایا گیا ہے وہ ''مریا'' ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہیکل تھا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں

حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی، لیکن یورپ کے محققین نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے۔ سر اسٹانلی لکھتے ہیں "حضرت ابراہیم (علیہ السلام) صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا لیکن یہ "موریا" کا پہاڑ نہیں جیسا یہود کا دعویٰ ہے نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے اور اس سے بعید مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ جبل عرفات ہے، غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے"۔ اس سے اتنا تو ثابت ہوا کہ موریا کے تعین میں یہود و نصاریٰ کا دعویٰ غلط ہے اور جہاں تک مسلمانوں کے دعویٰ غلط ہونے کی بات ہے تو اس کی تحقیق درج ذیل ہے۔۔۔۔۔ مورہ کی نسبت تورات میں تصریح ہے "اور مدیانیوں کی فوج شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی۔ (مدیان عرب میں واقع ہے) تمام واقعات اور قرائن سے یہ ثابت ہو جائے گا یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ "مروہ ہے" جو کہ مکہ معظّمہ کی پہاڑی ہے اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح اور احادیث کے تعین میں تمام ایسی چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "قربان گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربان گاہ ہیں۔ (حوالہ موطا امام مالک)۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قربانی مروہ میں نہیں ہوتی تھی بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی جو مکہ سے تین میل پر ہے تاہم آنحضرت ﷺ نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا۔ یہ اسی بناء پر تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کرنی چاہی تھی۔ قرآن مجید میں ہے "ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ"۔ (الحج ۳۳، پارہ ۱۷) ترجمہ: "پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے"۔ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ" (المائدہ ۹۵، پارہ ۷) ترجمہ "قربانی وہ جو کہ کعبہ میں پہنچے"۔ مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے منیٰ نہیں، لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔ قربانی کے مقام سے متعلق (شبلی کا بیان ختم ہوا)۔ پس ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی حضرت اسمٰعیلؑ کی دی گئی اور قربانی کی جگہ بھی کعبہ ہے۔ یہود اور عیسائیوں کا دعویٰ غلط ہے۔ قرآن مجید، احادیث مبارکہ اور تورات کی عبارات سے ان کا رد ہوتا ہے۔

نسب نامہ

اعتراض نمبر ۶

مارگولیس کے در پردہ دوسرا اعتراض کہ آنحضرت ﷺ آل اسمٰعیلؑ سے نہیں تھے، کے بارے

اعلانیہ سر ولیم میور نے کہہ دیا کہ ''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر ﷺ کو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ خواہش کہ وہ نسل اسمٰعیل سے ثابت کیے جائیں' ان کی حین حیات میں پیدا ہوئی تھی o اور اس طرح محمد ﷺ کے ابراہیمی نسل کے نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے ہیں o اور اسمٰعیلؑ اور بنی اسمٰعیل کے بے شمار قصے نصف یہودی نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے ہیں'' o (ضیاالنبی۔ ۷۔ ۱۷۱)

جواب: ارشاد خداوندی ہے رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيهِمۡ رَسُولًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيهِمۡۚ (البقرہ ۱۲۹، پارہ ۱) ''ترجمہ: اے ہمارے رب ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے بھیج تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی اور پاک صاف کردے انہیں''۔ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت باپ بیٹے (ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ) دونوں نے اپنی اولاد کے لیے دعا مانگنے کے بعد ایک رسول کی بعثت کے لیے التجا کی۔ دیکھنا یہ کہ اس دعا کا مصداق کون ہے۔ "وابعث فیھم رسولا منھم' پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ھم'' کی ضمیر کا مرجع امت مسلمہ ہے یا ذریتنا ہے۔ ھم کی ضمیر کا مرجع کسی تاویل سے اور قرار نہیں دیا جا سکتا' اب ان دو صورتوں میں پہلی صورت یہ ہے کہ امت مسلمہ میں سے جو ہماری اولاد سے ہو' رسول مبعوث فرما۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوگا کہ ہماری اولاد میں سے ایک رسول بھیج۔ ہر دو صورتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی اولاد یعنی نسل سے ہو کیونکہ دعا مانگنے والے یہی دو پیغمبر ہیں اور جو حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہو' لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے نہیں یعنی (اولاد اسحٰق) سے ہو وہ اس دعا کا مصداق نہیں ہو سکتا لہٰذا، اس دعا کے مصداق آنحضرت ﷺ ہیں جو نسل ابراہیم و اسمٰعیلؑ سے ہیں۔

قرآن مجید کا یہ فرمان'' ومن ذریتنآ امۃ مسلمۃ لك ''ترجمہ: اور ہماری نسل سے ایک امت بھی پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو' خیال کیجیے کہ قید ہماری نسل کی لگائی جا رہی ہے یعنی وہ نسل ابراہیمی جو حضرت اسمٰعیلؑ کے واسطہ سے ہو' اس قید سے بنی اسحٰق خارج ہو گئے ' اور امت مسلمہ بنی اسمٰعیل سے منسوب ہو کر رہ گئی۔ اب اس کا رسول کون اور کیسا ہو؟ پڑھیے'' رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيهِمۡ رَسُولًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيهِمۡ'' (البقرہ ۱۲۹، پارہ ۱) ترجمہ:: ہماری نسل سے ایک رسول پیدا فرما اور اسی امت سے رسول بھیج یا ہماری اولاد (نسل) سے رسول بھیج گویا ہر دو صورتوں میں آپ ﷺ جو حضرت اسمٰعیلؑ کے واسطہ سے ہیں کا ظہور ہوا۔

ارشاد نبوی صحیح مسلم میں ہے'' واثلہ بن الاسقع سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:: اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے فرزندوں میں سے کنانہ کو برگزیدہ کیا اور کنانہ سے قریش کو برگزیدہ کیا اور بنی ہاشم

کو قریش سے برگزیدہ کیا اور مجھ کو بنی ہاشم سے برگزیدہ کیا۔

محمد کرم شاہ الازہری (ضیاالنبی ۷۔۱۸۰) فرماتے ہیں کہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس مقالہ نگار Chronicle of Sebeos) کہتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ ایک اسمٰعیلی تھے جنہوں نے اپنے ہم وطن لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ دین ابراہیمی کی طرف رجوع کریں اور ان خدائی وعدوں سے بہرہ یاب ہوں جو نسل اسمٰعیل سے کیے گئے ہیں۔

مسٹر فاسٹر: اب اس بات کا دیکھنا بھی ہے کہ قدیمی روایتوں کو عربوں کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایات جن کی تائید اور حمایت میں اور کوئی ثبوت نہ ہو' گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہو مگر روایات کی جانچ پڑتال کے قانون مسلمہ ہیں۔ ان کے مطابق ان پر غور کرنے سے اس بات کا انکار نا ممکن ہے کہ روایت مذہبی یا دنیاوی دونوں طرح کی تاریخ کے مطابق ہے۔ اسی طرح خاص عرب کے لوگوں کی یہ قدیمی روایت ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتدا میں حجاز میں آباد ہوئی تھی چنانچہ قوم قریش خصوصاً مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ سے اس بزرگ قیدار کی نسل اور اولاد سے ہیں۔ (حوالہ بالا۔۷۔۱۸۲)

گبن کی رائے: اسلام کے خلاف گبن نہایت زہر آلود جذبات رکھتا ہے آپ ﷺ کے نسب پر شدت سے تنقید کرتا ہے' وہ کہتا ہے کہ ''محمد ﷺ کی اصل کو حقیر اور عامیانہ ثابت کرنے کی کوشش عیسائیوں کی ایک غیر دانشمندانہ تہمت ہے' جس سے ان کے مخالف کا مقام بجائے گھٹنے کے مزید بڑھا ہے۔ ''عیسائیوں پر دل کا غبار ہلکا کرتا ہے اور انہیں تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی شان گھٹانے کی بجائے بڑھا رہے ہیں۔ ان کی تہمت بے کار اور بے سود ہے اگر یہ تہمت ان کے سرمنڈھ دینا ہی تھی تو اس سے مخالف کا مقام تو نہ بڑھتا' پھر تو بات وزنی اور درست ہوتی پھر تو بات بن جاتی' لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ صاف پیغمبر ﷺ کے نسل اسمٰعیل سے ہونے کا اقرار نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ تو جل بھن کر کباب ہوا جا رہا ہے اسے تو دکھ ہے اور یہ دکھ اس کے کلیجہ کو کھائے جا رہا ہے کہ عیسائیوں نے آپ کے مرتبہ کو بڑھا دیا ہے بجائے گھٹانے کے۔ یہی گبن اپنی کتاب ''دی ڈیکلائین اینڈ فال آف رومن ایمپائر کے فٹ نوٹ پر لکھتا ہے کہ تھیوفینز جو پرانے زمانے کے یونانیوں ہی سے ہے' وہ تسلیم کرتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی کتاب کے فٹ نوٹ میں لکھتا ہے کہ ''ابوالفدا'' اور گیگنیئر نے اپنی اپنی کتابوں میں پیغمبر اسلام کا وہ نسب نامہ درج کیا ہے' جو مستند ہے۔ (حوالہ بالا)

سانڈر لکھتا ہے کہ ''تاریخ عالم کے وسیع تناظر میں ہم اسمٰعیلؑ کے بیٹوں میں سے حضرت محمد ﷺ کو عظیم ترین یوں ممیّز کر سکتے ہیں کہ طویل عرصہ تک' سکندر اعظم کے تسلط کا شکار مشرق نے جس کو یونانیوں

نے ایک ہزار سال سے زیرنگین کر رکھا تھا' وہاں سے اس کی بساط لپیٹ دی گئی۔'' گویا سانڈر بھی آپ ﷺ کو اسمٰعیلی نسل سے تسلیم کرتا ہے۔(امہات المومنین اور مستشرقین۔۴۵)

سرسید کہتا ہے۔'' یہ قیاس کرنا ایک غلط قیاس ہے کہ یہ خواہش آنحضرت ﷺ کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی کہ آپ کو اسمٰعیلؑ کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ خواہش کہ وہ نسل اسمٰعیلؑ سے ثابت کیے جائیں' ان کی حین حیات میں پیدا ہوئی تھی درست نہیں ہے۔ہمارے علماء نے جب آنحضرتؐ کا نسب نامہ لکھنا چاہا تو اس کی تحقیقات کیں اور اس کی نسبت جوان کی رائے اور تحقیقات ہوئیں' بلا کسی تامل کے بلا کسی تردد' بلا کسی پکڑ دھکڑ نہایت سادگی سے لکھ دیں جس سے یہ بات خود ثابت ہوئی کہ مسلمانوں کے دل میں کبھی اس امر میں شبہ نہ ہوا' ان کو نہ تردد تھا نہ کبھی ان کو اس بات کی فکر تھی اور نہ کبھی چوری وفریب ان کے دل میں تھا اور نہ کبھی اس کے ثبوت کے درپے تھے جس کا قیاس سر ولیم میور نے اپنی رائے میں کیا ہے۔پس ان کا قیاس محض غلط ہے' اور مطلق اعتبار کے لائق نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی (سیرت النبی۔ا۔۹۱) کہتے ہیں پیغمبر اسلام ﷺ اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نسل اسمٰعیلؑ سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت ﷺ کو عنائت ہوئی' وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی۔قرآن مجید میں ہے'' مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا '' (الحج ۷۸، پارہ ۱۷) ترجمہ: تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب' اسی نے اس سے پہلے تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس میں یعنی (قرآن میں بھی)''۔اس آیت مبارکہ میں تصریح ہے کہ آپ ﷺ کے باپ ابراہیم علیہ السلام ہیں یعنی آپ ﷺ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اسمعیل علیہ السلام سے ہیں۔قرآن مجید کی اس سچی شہادت کے ہوتے ہوئے کسی مستشرق کا بیان کوئی وقعت نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی مستشرق کی بات قابل تسلیم ہوسکتی ہے۔

نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے ہوئے ہیں۔اب اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

پہلے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ عرب کچھ ایسی صفات کے مالک تھے کہ شائد ان خوبیوں اور صفات میں ان کا کوئی ہم سر ہو۔ان خوبیوں میں ایک خوبی ان کا حافظہ تھا۔وہ حافظہ کی دولت سے مالا مال تھے' لاجواب اور بے مثال تھے۔اسی قوی حافظہ کی بنیاد پر قبائل نے نہ صرف اپنا شجرہ نسب یاد رکھا بلکہ دوسرے قبائل کا نسب بھی یاد رکھتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی بھی وقت اور کسی بھی موقع پر کسی سے اگر سامنا ہوتا' بڑائی کی بات چل نکلتی تو وہ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں یا اپنی خوبیوں کو بیان کرتے اور دوسروں کی کمزوریوں کو طشت از بام کر دیتے تھے۔اپنی بڑائی ظاہر کر کے دوسروں کو زیر کرنے کا یہ ایک اہم اور کارگر ہتھیار تھا۔ایسی صورت حال میں کسی فرد واحد کے لیے ممکن نہ تھا کہ کسی روایت کو غلط یا توڑ

مروڑ کر پیش کرنے کی جرات کر سکے۔ یہ باتیں ان کے حافظہ میں موجود تھیں وہ صرف انسانوں کے نسب سے ہی واقف نہ تھے بلکہ وہ جانوروں مثلاً گھوڑوں کے نام اور ان کے نسب کو بھی اچھی طرح جانتے تھے ۔ جو گھوڑا میدان جنگ میں غیر معمولی شجاعت اور کارکردگی کا مظاہرہ کرتا اس کے نسب سے وہ پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔ نیز ہر شاعر کا ایک راویہ ہوا کرتا تھا جو شاعر کی زبان سے نکلنے والے ہر شعر کو یاد کر لیتا تھا۔ راویہ کو شاعری کی مختلف اصناف' رجز' قصیدہ وغیرہ کے اشعار اس قدر یاد ہوتے تھے جن کا شمار مشکل تھا۔ اصمعی کہتا ہے کہ ''بالغ ہونے سے پہلے مجھے اعراب بادیہ کے بارہ ہزار اشعار یاد تھے''۔ خلیفہ ولید سے حماد نامی راویہ نے کہا کہ وہ کھڑے کھڑے یہاں ایک سو قصیدہ زبانی سنا سکتا ہے اور ہر قصیدہ بیس سے سو شعر پر مشتمل ہوگا۔ (سیرت مصطفیٰ جان رحمت۔۱۔۱۴۲۔۱۴۳)

ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر قبیلہ کا اپنا جدا جدا نام ہوتا تھا۔ اس ذریعہ سے ایک شخص اپنی قوم اور قبیلہ کو بخوبی جانتا تھا اور اپنے نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا اور جس طرح کہ پرانی قوموں سکندنیوں اور سسٹک کے ہاں گڑ گیٹ ہوتی تھی' اسی طرح عرب قوموں میں بھی ہوتی تھی جن کا لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کو ان کے حسب نسب جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا۔ پھر فاسٹر کے حوالہ سے سر سید لکھتے ہیں کہ عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص و عام ہے' تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے''۔ اس تمہید کے بعد ثابت کرتے ہیں کہ نسب کے ابتدائی سلسلے گھڑے ہوئے نہیں تھے۔

مصنف (رحمت اللعالمین۔۲۔۲۸) کہتے ہیں کہ ''علامہ ابن جریر طبری کا بیان ہے کہ مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا کہ عرب میں ایسے علماء بھی ہیں جو معد بن عدنان سے اسمٰعیل علیہ السلامؑ تک ساٹھ پشتوں کے نام لیتے ہیں اور اس کی شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے ہیں' اس سلسلے کو اہل کتاب سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی' نیز شہر قدمہ کے یہودی ابو یعقوب نے کہا کہ ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا نسب نامہ لکھا جو میرے پاس موجود ہے۔ اس شجرہ کی عدنان سے اسمٰعیل علیہ السلام تک ساٹھ پشتیں بنتی ہیں اور اسی سلسلہ نسب سے حضرت محمد ﷺ تھے''۔

نسب نامہ سے متعلق آراء: (۱) حضرت محمد ﷺ سے عدنان تک شجرہ نسب کے بارے حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ المعروف بابن عبدالبر العمری القرطبی کتاب الاستیعاب میں لکھا ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ (۲) عدنان سے اوپر کے شجرہ نسب کو ابن اسحٰق' ابن جریر اور امام بخاری جائز سمجھتے ہیں۔ (۳) عدنان سے اوپر کے شجرہ کو ہم نہیں جانتے' ہمارا انتساب عدنان تک صحیح ہے۔ (حضرت عمر

رضی اللہ عنہ سے مروی ہے)

(۴) عدنان تک سلسلہء نسب یقینی ہے تاہم عرب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس فروگزاشت (یعنی درمیانی پشتیں چھوڑنے سے واقف تھے) (۵) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عدنان اور حضرت اسمٰعیلؑ کے درمیان تیس اجداد ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا ہے۔

(۶) عروہ ابن زبیرؓ کی روایت ہے کہ ہمیں کسی ایسے شخص کے بارے معلوم نہیں جو عدنان اور اسمٰعیل علیہ السلام کی درمیانی نسبی کڑیوں کو جانتا ہو۔

(۷) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحت کے ساتھ یہ روایت منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدنان تک انتساب کیا ہے بلکہ ابن عباسؓ کی سند سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عدنان تک پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علمائے انساب کا بیان جھوٹ سے مبرا نہیں۔

(۸) امام مالک اور علماء کی ایک جماعت نے اس بات کو ناپسند قرار دیا ہے کہ کوئی شخص اپنا نسب حضرت آدم علیہ السلام تک بیان کرے کیونکہ عدنان کے اوپر کے شجرہ نسب کوئی حتمی چیز نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے بلکہ ظنیات کے قبیل سے ہے۔۔مزید املاء' اسماء میں بھی کثیر اختلاف ہے۔(نقوش رسول نمبر۔۱۱۔۱۰)۔ابوالفد الکھتا ہے کہ ''نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عدنان تک متفق علیہ ہے بغیر اختلاف کے اور اس میں بھی کہ عدنان اولاد اسمعیلؑ بن ابراہیمؑ میں سے ہے'' کچھ اختلاف نہیں ہے لیکن ان پشتوں کی تعداد میں اختلاف ہے جو عدنان اور حضرت اسمٰعیلؑ کے درمیان ہیں۔بعض نے چالیس پشتوں کے قریب شمار کی ہیں اور بعض نے ساٹھ۔اس اختلاف کو ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں جسے ہم ڈعف سمجھنے کی غلطی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ان آراء سے ثابت ہوتا ہے کہ عدنان تک نسب صحیح ہے۔اس کے اوپر یعنی عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک' میں اختلاف ہے جو املاء' اسماء اور پشتوں وغیرہ کا ہے۔لیکن یہ کہیں ذکر نہیں ملتا کہ عدنان کا نسب حضرت اسمٰعیلؑ سے جا کر نہیں ملتا۔عدنان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بائیسویں پشت میں ہیں اور کنانہ سے عدنان تک آٹھ پشتیں ہیں عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک چالیس پشتیں ہیں۔پشتوں میں کمی بیشی ہو سکتی ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اولاد اسمٰعیلؑ سے ہونا قطعی ثابت ہے نیز یہ حدیث بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے فرزندوں میں سے کنانہ کو برگزیدہ کیا اور کنانہ سے قریش کو برگزیدہ کیا اور بنی ہاشم کو قریش سے برگزیدہ کیا اور مجھ کو بنی ہاشم سے برگزیدہ کیا۔'' آپ نے اپنا انتساب مذکور حدیث میں کنانہ تک فرمایا جبکہ اوپر مذکورہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف عدنان تک انتساب فرمایا۔''ان روایتوں میں تعارض نہیں' آپ نے ایک موقع پر عدنان تک اور کسی اور موقع پر کنانہ تک انتساب فرمایا ہوگا۔لہٰذا آپ کا سلسلہء نسب حضرت اسمٰعیلؑ

سے جا ملتا ہے اور مستشرقین کا الزام محض باطل ہے۔

اہم نکتہ: بعض یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عدنان سے آگے نو پشتیں گنوا کر شجرہ نسب حضرت اسمٰعیلؑ تک جا پہنچتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خاص خاص مشاہیر کے نام کو ذکر کر دیا گیا ہے اور یہ طریقہ بنی اسرائیل میں بھی رائج تھا۔ انجیل متی میں ہے کہ یسوع مسیح ابن داود بن ابراہیمؑ یہ ظاہر کرتا ہے کہ متی میں یسوع مسیحؑ اور داوٗدؑ کے درمیان چھبیس پشتیں اور داوٗدؑ اور ابراہیمؑ کی بارہ پشتیں دانستہ طور پر اختصار کے لیے چھوڑ دیں اور مشاہیر کو لے لیا۔ (رحمۃ اللعالمین۔۲۔۲۲)

شجرہ نسب کے سلسلے گھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ درمیانی پشتوں کی تعداد کم و بیش ہونے یا اسماء کی املاء میں اختلاف سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ ان جلیل القدر پیغمبروں (ابراہیم و اسمٰعیل علیہم السلام) کے خاندان کے چشم و چراغ نہیں تھے۔ کنانہ سے اور عدنان سے آپ ﷺ نے انتساب فرما کر تمام اعتراضات کی، جو نسب سے متعلق ہیں، جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی، وہ اس طرح کہ کنانہ اور عدنان امجاد بنی اسمٰعیلؑ سے ہیں اور ان دو بزرگوں تک آپ ﷺ نے انتساب فرمایا جس سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ آل اسمٰعیلؑ سے ہیں۔ اب مستشرقین کے نہ ماننے کے لیے صرف یہ بچا ہے کہ آپ ﷺ کے امجاد عظام ''کنانہ'' اور عدنان کو اسمٰعیلؑ کی اولاد میں شمار نہ کریں اور خارج کر دیں۔ (نعوذ باللہ) اور ان کا شجرہ کسی اور شاخ سے ثابت کریں مگر ایسا مستشرقین کے لیے ثابت کرنا ناممکن ہے اب سوائے اس کے ان کے پاس اور چارہ کار نہیں کہ اپنی دشمنی اور تعصب کو چھوڑ کر آنحضرت ﷺ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے تسلیم کر لیں اور خواہ مخواہ بات بات پہ جھگڑا اچھا نہیں اور بال کی کھال نہ اتارا کریں۔

ان کی روش جدا ہے، ہماری روش جدا
ہم سے تو بات بات پہ جھگڑا کیا نہ جائے

اس سے قطع نظر ہماری نہ مانیں مگر اپنوں کی بات تو مان جائیں۔ گبین کہتا ہے کہ آپ ﷺ کا اسمٰعیلی النسل ہونا قومی اعزاز تھا یا افسانہ؟ لیکن اگر ان کے نسب نامہ کی کڑیاں تاریک اور مشکوک ہوں تو بھی وہ اپنے نسب نامہ کی کئی نسلوں سے ایسے عظیم لوگ پیش کر سکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں شریف اور عظیم تھے۔ انہوں نے قریش کا قبیلہ اور خاندان ہاشم میں جنم لیا تھا۔ وہ معزز ترین عرب تھے، مکہ کے رئیس تھے اور خانہ کعبہ کے موروثی پاسبان تھے۔ ہاشم جو مالدار اور سخی تھا، انہوں نے قحط کی سختیوں کو اپنے مال تجارت کے ذریعہ کم کیا تھا۔ اہل مکہ جسے باپ کی کشادہ دلی نے حالات قحط میں کھانا کھلایا تھا، اس مکہ کو اسی باپ کے بیٹے (عبدالمطلب) نے ابرہہ بادشاہ سے اللہ کے حضور دعا مانگ کر بچایا تھا۔ (ضیاالنبی۔۷۔۲۰۲۔۲۰۳)

میتھیو پیرس کی ہرزہ سرائی: مسلمانوں نے شجرہ نسب کو نہیں گھڑا بلکہ وہ کام میتھیو پیرس نے کر دکھایا۔

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی میں زہر چکانی کرتا ہے جو مستشرقین کی عام عادت ہے جبکہ ایسی منسوبیات کسی عام فرد کے لیے بھی نہیں کی جاتیں۔ اس نے ایک لمبا چوڑا سلسلہ نسب فراہم کیا ہے جس کی ابتدا حضرت اسمٰعیلؑ سے کی ہے۔ اٹھائیسویں پشت میں حضور کے ہم نام کا ذکر کیا ہے اور پھر ان کی اولاد میں ترتیب وار، عبد شمس، ہومنلا، ابیلاز الکفان، مورکن، عبدالملب، عبدالرحمٰن (یہی عبد مینف بھی کہلاتے ہیں) کا تذکرہ کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ آخر الذکر حضور کے والد تھے۔ (مستشرقین کا انداز فکر۔۱۹۲) حدیث میں سعد اور ابوبکرہ دونوں سے روایت ہے "ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور دل میں یاد رکھا، آپ فرماتے تھے جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کو باپ بنائے تو اس پر جنت حرام ہے۔ (مسلم شریف۔ا۔۱۶۳)

مذکور نسب نامہ کو تاریخی شواہد جو دیگر علماء نے مہیا کیے ہیں، اس کے باطل ہونے میں قطعی دلائل ہیں جو اس کا رد کرتے ہیں اس سے اتنا تو ثابت ہوا کہ دیگر مستشرقین جو آپ ﷺ کو اولاد اسمٰعیل سے نہیں مانتے اس سے ان کا رد کیا ہوتا ہے یعنی میتھیو آپ ﷺ کو اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد مانتا ہے۔ سر سید (خطبات احمدیہ۔۳۴۵) کہتے ہیں کہ برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کے نیچے الجراد کا نسب نامہ جو اس کا تتمہ ہے، لگا دیتے ہیں جس سے آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ حضرت اسمٰعیلؑ بن ابراہیم علیہ السلام تک پورا ہو جاتا ہے۔۔۔ اور ان کی صحت کو تسلیم کیا ہے اس کی وجوہات یہ ہیں۔ اول یہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ ۲۰۹۴ دنیاوی بمطابق ۱۹۱۰ قبل مسیح پیدا ہوئے۔ محمد ﷺ دنیاوی بمطابق ۵۸۰ بعد از مسیح پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں ولادتوں میں ۲۴۹۰ برس کا فرق ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ سے آپ تک اس نسب نامہ میں ستر پشتیں گزرتی ہیں جو از روئے حساب اس سلسلہ نسب کے جو علی العموم علوم طبیعی کی تحقیقات سے اختیار کیا جاتا ہے، بالکل صحیح ہے یعنی قریب تین پشت کے ایک صدی میں۔

دوم: بخت نصر نے عربوں پر حملہ کیا تو معد بن عدنان کو اس سے بچا کر ارمیا نبی اور برخیا اپنے ساتھ لے گئے۔۔۔ ارمیا نبی کا زمانہ سال دنیوی کے حساب سے ۴۵۸۴ سال ہے یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں تھا اور جو نسب نامہ ہم نے صحیح کیا، اس میں بھی نسلوں کا عام سلسلہ بموجب معد بن عدنان بھی اسی زمانہ میں ہوتا ہے جو ایک نہایت قوی دلیل ہے۔ اس کی صحت کے لیے اور برخیا کاتب الوحی کی تاریخانہ تحریر اور عالم عرب کی مشہور روایات سے عجب طرح مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کے نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے من گھڑت اور افسانے نہیں ہیں بلکہ میتھیو کا فراہم کردہ نسب نامہ لائق اعتبار نہیں بلکہ یہ اس کی خواہش کبیدہ کا اظہار ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو پورا ہونا تھا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ علیہ السلام کی زبانی کیا کہ "میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیلؑ میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا۔" کچھ اسی بات پر کہ بنی اسمٰعیلؑ کی نسلیں محمد ﷺ سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری

تعداد سے یاد ہوں اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں سے یا برخیا کاتب الوحی اور ارمیا نبی کی تحریروں سے۔ وہ تو حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا۔ وہ محمد ﷺ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے پچھلے مورخ خواہ عرب کے رہنے والے ہوں خواہ کسی اور ملک کے، مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے، اس بات میں ذرا بھی فرق نہیں رکھتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد ﷺ بنی ہاشم قریش حضرت اسمٰعیلؑ بن ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ محمد ﷺ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ''ابیکم ابراہیم''، جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرات ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔'' (خطبات احمدیہ۔۳۴۹)

بقیہ اعتراض نمبر ۶ کا تیسرا جز ''اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے ہیں'، کو زیرِ بحث لاتے ہیں کیونکہ مستشرقین کو ہر شے من گھڑت یا بنی اسرائیل کے قصے معلوم ہوتے ہیں جو عربی سانچہ میں ڈھالے گئے ہیں۔

جواب: عرب کے قدیم رہنے والوں نے اپنی جبلی عادت کے موافق اپنی اصلی روایتوں میں کوئی نئی روایت اضافہ نہیں کی تھی اور تمام غیر قوموں سے بالکل علیحدہ رہے تھے، یہاں تک کہ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کے ہم راہی یہاں آ کر آباد ہوئے تھے، تو قدیمی عرب ان کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل لقب ''مستعربہ'' سے ان کو ملقب کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل اور خصوصاً اہلِ عرب، بنی اسمٰعیل کو ہمیشہ دو مختلف قومیں سمجھتے تھے اور قدیم عرب نے اپنی قدیمی روایتوں کا ان سے تبادلہ نہیں کیا تھا اور بنی اسرائیل کے پاس عرب قوموں اور عرب انبیاء کی نسبت زبانی خواہ تحریری کوئی روایت نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے جب یہ بات فرمائی کہ جمیع انبیاء بنی اسرائیل برحق ہیں، ان پر ایمان لانا چاہیے، اس وقت بنی اسرائیل کی اور ان کے نبیوں کی روایتیں اور قصے عرب کی روایتوں اور قصوں میں مخلوط ہو گئے لیکن بنی اسرائیل کے ہاں عرب کی کچھ روایتیں نہیں تھیں، اس وجہ سے عرب کی روایتیں بجائے خود بجنسہٖ برقرار رہیں۔ (خطبات احمدیہ۔۲۶)

اعتراض نمبر ۷

''انساب کے بارے میں ابن سعد کی روایتیں من گھڑت ہیں، افسانے ہیں۔ اس کا استدلال یوں ہے کہ ہم آپ تو ایک دو پیڑھیوں سے زیادہ اپنے آبا و اجداد کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے، پھر عربوں کو اپنے انساب کی ایسی کیا ضرورت تھی؟ (واٹ علوم اسلامیہ۔۱۰۲)

جواب: ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی (علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔۱۰۲) لکھتے ہیں کہ شائد منٹگمری واٹ کو ''جان وان'' کے اس واقعہ کا علم نہ تھا، اس کی ملاقات ایک ایسے بچے سے ہوئی جس کو پندرہ پشت تک اپنے آبا و اجداد کے نام ازبر تھے۔

دوم: ابن سعد کی روایتوں کو من گھڑت اور افسانے کہنے والا ایسی دلیل پیش کرتا ہے کہ بایں عقل ودانش بباید گریست'' اگر واٹ صاحب اپنے اسلاف کی ایک دوپشتوں کے نام سے زیادہ یاد رکھنے سے قاصر ہیں تو اس میں کس کا قصور ہے؟ ہر فرد کا نسب تو ہوتا ہے اگر وہ یاد کرنے میں ناکام رہے' وجہ خواہ کوئی بھی ہو تو اس میں دوسروں کا کیا قصور؟ اگر وہ اپنے حافظہ کی کمزوری کے باعث یاد نہیں کر سکا تو اسے اپنے حافظہ پر نوحہ کناں ہونا چاہیے نہ کہ دوسروں کے نسب ناموں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی جرات کرنی چاہیے اور نہ ہی انہیں من گھڑت روایتیں اور افسانے کہنا چاہیے۔ دراصل ''واٹ'' نے اپنی ایک دوپشتوں کے نام کو یاد رکھنے کا بہانہ بنایا ہے اور حقیقت کو بیان کرنا گول کر گئے ہیں وہ یہ ہے کہ واٹ کے معاشرہ کی زبوں حالی اور اخلاقی گراوٹ جس میں شرم وحیا نام کی کوئی شے نہیں' عزت لٹنے کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا اور دن رات جنسی اختلاط کی آزادی کے سبب اکثریت نہیں جانتی کہ اپنے نسب کو کس سے منسوب کرے۔ بایں سبب وہ اپنے نسب ناموں کو یاد نہیں کرتے حالانکہ اس کے برعکس زمانہ جہالت میں لوگ اس قدر غیرت مند تھے' اگرچہ یہ ان کا زعم خویش تھا اور وہ اسے بہت بڑا گناہ نہیں سمجھتے تھے اور اپنی لڑکیوں کو قبر میں زندہ دفن کر دیتے تھے کیونکہ کسی کے ہاں جانے سے یا بیاہنے سے اپنے نام کو بٹہ لگنا تصور کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی ناموری کو جتانے کے لیے اپنی روایات کو یاد رکھتے تھے جن میں شجرہ کو یاد کرنے کی ایک روایت چلی آ رہی تھی۔ زندہ قومیں اور باغیرت سپوت اپنے نسب کو بیان کرنے سے نہیں کتراتے بلکہ اپنے نسب کے متعلق دریافت کر کے اپنے معاشرہ میں گردن تان کر چلتے ہیں مغربی معاشرہ میں جنسی اختلاط کی آزادی سے ان کے ہاں خاندانی نظام کا تاروپود بکھر چکا ہے۔ وہ نکاح پر زنا کو ترجیح دیتے ہیں حیوانات کی طرح نسبت پدری سے آزاد بلکہ محروم ہیں۔ اکثریت کو اپنے باپ کا نام ہی معلوم نہیں، اسی لیے پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات میں صرف ماں کا نام پوچھا جاتا ہے اور ان کا نسب ماں سے چلتا ہے جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: ''بے شک تمہیں قیامت کے دن تمہارے اپنے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا''۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے نسوانیت کے تقدس کی ردائے عصمت کو تار تار کر کے اسلام مخالفین نے اسے مساوات اور آزادی کے پرفریب نعرے میں ایک کھلونا بنا رکھا ہے۔ وہ صبح سے شام تک کام میں جوتی رہتی ہے۔ ایک مصری ادیب ''لطفی منفلوطی'' نے ایک نہایت اخلاق سے معمور معنی خیز جملہ لکھا: مغربی سماج کہتا ہے، جس سے محبت ہو جائے اسی سے شادی کرو اور اسلام کہتا ہے، جس سے شادی ہو جائے اسی سے محبت کرو یعنی عورت کی عفت و پاکدامنی اور حیا شوہر کی اور مرد کی محبت عورت کی امانت ہے۔ جنس نازک کی محبت، ضمیر اور آزادی کو خرید کر اسے بازاری جنس اور شمع محفل بنا چھوڑا ہے۔ اس اخلاقی گراوٹ کے باوجود اسلام مخالف پھر بھی عورت کی آزادی کے داعی

ہیں جنہوں نے اس کی آزادی، اس کے مقام اور اس کی قدر و قیمت کو مٹی میں ملا دیا ہے۔

سوم: کوئی من چلا کہہ دے کہ نسب ناموں کی اتنی پشتوں کے ناموں کو حفظ کرنا محال ہے تو اسے جاننا چاہیے کہ حفظ اور تحریر ایسے دو اہم اور معتبر ذرائع ہیں جن سے ماضی وحال کے ریکارڈ کو محفوظ بنایا جاتا ہے۔ نسب ناموں سے متعلق دونوں اہم ذریعے موجود ہیں جن سے من گھڑت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حفظ پر اعتراض کرنے والوں کے لیے یہ معتبر سند پیش کی جاتی ہے کہ موجودہ زمانے میں بے شمار طلباء دنیا بھر میں موجود ہیں جنہیں پورے کا پورا قرآن مجید یاد اور حفظ ہے۔ تو کیا نسب نامہ کی ساٹھ یا ستر پشتوں کو یاد رکھنا جوئے شیر بہالانا ہے؟ جبکہ قرآن مجید جیسی عظیم وضخیم کتاب کو حفظ کرنے کے مقابلہ میں نسب نامہ کی ساٹھ ستر پشتوں کو یاد کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عرب اور ہمارے اسلاف حافظہ کی قوت سے مالا مال تھے اور انہوں نے اس سے خوب کام لیا۔ اس سلسلے میں چند ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام اعظمؒ کی ''کتاب الاوسط'' ایک رات میں حفظ کر لی تھی۔ (اسلام کے محافظ۔۱۶۴) امام بخاری کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ اندلس کے ایک نابینا ادیب کو اغانی کی بیس جلدیں نوک زبان تھیں۔ امام ابوزرعہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ میں نے دس لاکھ احادیث اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابوزرعہ کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

(۱) واٹ کا کہنا کہ عربوں کو اپنے انساب کو یاد کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ سرسید کہتے ہیں جس طرح کہ پرانی قوموں سکندنیوں اور سسٹک کے گڑگیٹ ہوتے تھے اسی طرح عرب کی قوموں میں بھی ہوتی تھی جن کا لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کو ان کے نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا۔

(۲) اپنی برتری جتانے اور دوسروں کے نسب پر کڑی نظر رکھتے تاکہ کوئی شخص کسی کے نسب میں اپنا شمار نہ کر لے کے لیے نسب کو یاد رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

(۳) پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنا نسب کنانہ اور عدنان تک یاد تھا آپ کے عمل کی پیروی کرتے ہوئے نسب کا یاد کرنا اور محفوظ رکھنا سنت نبوی کی اتباع ہے۔ یہ تو مسلمانوں کے لیے ہے دوسروں کو اس سے کیا غرض۔

(۴) عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ کے کم از کم باپ کا نام لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ حافظ عینی لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا نسب بھی ایک دو پشت تک یاد رکھنا فرض ہے۔ (ترجمان السنہ۔۳۔۵۹۸۔۵۹۹)

اہم نکتہ: سر ولیم میور کہتا ہے کہ یہ روایت معد اور ارمیا نبی کی صحیح معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ آنحضرت ﷺ اور عدنان میں اٹھارہ پشتیں ہیں اور نسلوں کے صحیح حساب سے عدنان کی پیدائش ۱۳۰ق۔م سے پہلے کی نہیں ہوسکتی حالانکہ بخت نصر کے حملوں کا زمانہ ۵۷۰ق۔م میں پایا جاتا ہے۔

جواب: سر ولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے میں شبہ پڑا ہے۔ عدنان بھی دو ہیں اور معد بھی دو ہیں ایک وہ

ہیں جو برخیا کا تب الوحی کے شجرہ میں ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو الجراد کے نسب نامہ میں ہیں۔ پس وہ روایت نسبت پہلے معد بن عدنان کی ہے۔ سر ولیم میور نے دوسرے معد بن عدنان کی نسبت وہ روایت تصور کی ہے۔ عک بلاشبہ معد کا بھائی تھا مگر اس سے پہلے معد کا' نہ کہ دوسرے معد کا' جیسا کہ ولیم میور نے تصور کیا ہے۔ عرب نے ضلع حضر موت میں جو قلعہ قوم عاد کا از نام حسن الغراب تھا اور جس میں سے ایک کتبہ نکلا' جس میں ہودؑ پیغمبر کا ذکر ہے اور اس میں عک کا بھی نام ہے۔ یہ عک اسی پہلے معد کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ (خطبات احمدیہ۔ ۳۴۶)

اعتراض نمبر ۸

''واٹ'' کہتا ہے کہ قرآن مجید کی وہ آیات جو آنحضرت ﷺ کا حضرت ابراہیمؑ سے تعلق ثابت کرتی ہیں وہ مدنی دور کی ہیں۔ مکہ مکرمہ میں قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوا' وہ اس سلسلے میں خاموش ہے۔ اس نے بہت سے مفروضے گھڑے ہیں۔ درج ذیل عبارت ملاحظہ کیجیے۔

قرآن مجید میں یہودیوں کے خلاف جو باتیں ہیں' ان میں دین ابراہیمؑ کے تصور کو خاص اہمیت حاصل ہے' یہ ایک ایسا تصور ہے جو مکی قرآن میں نظر نہیں آتا' اس لیے یہ بات فرض کی جاسکتی ہے کہ یہ تصور عربوں کی قبل از روایات پر مبنی نہیں ہے۔ مکی دور میں پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰؑ کو محمد ﷺ کو پیش رو کے طور پر حضرت ابراہیمؑ کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ بہت سے پیغمبروں میں سے ہیں اور جس قوم میں وہ مبعوث ہوئے تھے اس کا ذکر نہیں ہے' البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے جن کے پاس پہلے کبھی کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے کعبہ کے ساتھ تعلق کا بھی کوئی ذکر نہیں' خیال یہ ہے کہ پہلے مسلمانوں کو علم نہ تھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کا حضرت ابراہیمؑ سے کیا تعلق تھا؟ اور وہ اس بات کو بھی نہیں جانتے تھے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کا عربوں سے کیا تعلق ہے؟ مدینہ میں چند یہودیوں کے ساتھ روابط کی وجہ سے ان کو ان چیزوں کا علم ہوا۔ (ضیاالنبی۔ ۷۔ ۱۷۳)

جواب: اس عبارت میں پانچ الزام لگائے گئے ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

اول: قرآن مجید میں یہود کے خلاف باتوں میں دین ابراہیمؑ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ تصور مکی دور کے قرآن میں نظر نہیں آتا۔

دوم: اور یہ تصور عربوں کی قدیم روایات پر مبنی نہیں ہے۔

سوم: مکی دور میں پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰؑ کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے پیش رو تھے اور حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ حیثیت کے حامل تھے۔

چہارم: حضرت ابراہیمؑ جس قوم میں مبعوث ہوئے اس کا ذکر نہیں' البتہ یہ کہا جاسکتا ہے آپ عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے' جن کے پاس پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا۔

پنجم: حضرت ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کا کعبہ سے تعلق کا کوئی ذکر نہیں ملتا' نیز مسلمان بھی حضرت ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کے تعلق سے بے خبر تھے اور وہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ عربوں کا حضرت اسمٰعیلؑ سے کیا تعلق ہے اور یہ انھیں مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ روابط سے ان چیزوں کا علم ہوا۔

جواب: اول: قرآن مجید کا اسلوب منفرد ہے اور اسے قرآن مجید کا اعجاز کہا جاتا ہے اور یہی اعجاز قرآن مجید کو کلام الٰہی اور رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی طرف سے نازل کردہ ثابت کرتا ہے اور یہ دلیل قاطع ہے مثلاً کام کا اظہار بعد میں ہوتا ہے اور اعلان پہلے کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اپنی قوم کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔ "قَالَ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا"

ترجمہ "وہ (عیسیٰؑ) بولا میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے کتاب دی گئی ہے اور مجھے نبی بنایا گیا ہے"۔

حضرت عیسیٰؑ پنگھوڑے میں ہیں اور فرماتے ہیں کہ "مجھے کتاب دی گئی ہے" حالانکہ اس وقت آپ کو کتاب عطا نہیں کی گئی تھی۔ چالیس برس بعد آپ کو مقدس کتاب عطا ہوئی وہ ذات بے ہمتا علیم وخبیر ہے اسے علم ہے کہ کس چیز کو پہلے یا بعد بیان کرنا ہے اور کس موقع پر اس کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جو حیثیت حاصل ہے، مکی دور کے قرآن میں یہ تصور نظر نہیں آتا تو اس میں کوئی حرج نہیں' مدنی سورتوں میں تو موجود ہے جسے واٹ بھی تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مدنی سورتوں میں یہود کی خلاف باتیں مذکور ہیں' تو یہ سو فیصد درست ہے کیونکہ مکہ میں یہودی نہیں تھے۔ مکہ میں مشرکین بستے تھے اور مدینہ یہودیوں کا گڑھ تھا' وہیں پر یہودیوں نے مسلمانوں کی مخالفت کی اور جو جو کیا اس کا اظہار مدنی سورتوں میں ہونا چاہیے تھا اور جو مسلمانوں کو یہودیوں سے برتاؤ کرنے کا حکم تھا اس کا ذکر بھی مدنی سورتوں میں بیان ہونا چاہیے تھا۔ اگر مکی سورتوں میں یہ تصور نظر نہ آئے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ ان کو مدنی سورتوں میں تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے جس سے سارا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور ان کے کرتوتوں سے سب واقف ہو جاتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ مدنی سورتیں جن میں یہودیوں کے متعلق بیان ہوا' ان کے رویوں کو مکی اور مدنی سورتوں کی تفریق بیان کرنے سے مانع نہیں ہے۔ (دوم) حضرت ابراہیمؑ کو حضرت موسیٰؑ سے کم حیثیت دینے کا یہ مطلب ہے کہ واٹ مسلمانوں کو حضرت ابراہیمؑ سے جو نسبی رشتہ ہے' اس سے عربوں کو لاعلم کہنا چاہتا ہے حالانکہ عرب ان کی اولاد ہیں اور وہ بھلا کیسے ابراہیمؑ کو اہمیت نہ دیتے ہوں گے۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ باپ اولاد کے رشتہ کو بیک جنبش قلم رد کرتا ہے۔ عام آدمی کو اس کے باپ سے رشتہ کے علم نہ ہونے کا نہیں کہہ سکتے مگر یہ صالحین پر گھناونا و بے بنیاد اور تاریخی حوالوں سے غلط الزام لگاتا ہے۔ مسلمان تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور اچھی بری تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی"۔ نیز مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی انبیاء کی فضیلت کو بھی مانتے

ہیں ارشاد خداوندی ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (البقرہ ۲۵۳، پارہ ۳) ترجمہ "یہ سب رسول ہم نے فضلیت دی ہے بعض کو بعض پر۔" مسلمان اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ پیغمبروں میں فرق نہیں کرتے۔ "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ"۔ (البقرہ ۱۳۶، پارہ ۱) ترجمہ "نہیں ہم تفریق کرتے درمیان کسی کے ان میں سے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں"

دوم: یہ تصور عربوں کی قبل از اسلام روایات پر مبنی نہیں ہے' یہ درست نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس جو روایات تھیں' وہ عرب روایات تھیں، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خانہ خدا ان کے آباو اجداد حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے تعمیر کیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قربانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو پیش کیا تھا۔ وہ اس سے بھی باخبر تھے کہ حج کی تمام عبادتیں' صفا و مروہ کی سعی ہو یا طواف حضرت ابراہیمؑ نے متعارف کروائی تھیں۔ سرسید کہتے ہیں کہ روایات نہایت معتبر ذریعہ سے ہمارے زمانہ تک پہنچی ہیں۔ وہ ایسی روایتیں ہیں کہ جن کو تمام قوم نے بلا تامل مان لیا ہے۔ پھر ہم کس طرح کسی طرف دار عیسائی کے محض بے دلیل بیانات کو صحیح اور معتبر تصور کر سکتے ہیں۔" کعبہ کے اندر دیواروں پر روغنی تصویریں بنائی گئی تھیں ان تصویروں میں حضرت ابراہیمؑ کی تصویر کے علاوہ بی بی مریمؑ کی اپنے بچے عیسیٰؑ کے ساتھ تصویر بھی تھی۔ کعبہ میں ابراہیمؑ کی تصویر اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ قبل از اسلام بھی مکہ کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کو جانتے تھے اور ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ (محمد رسول اللہ۔ ۲۷۔ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

سوم: ابتدا میں مسلمان حضرت موسیٰؑ کو حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ مستشرق دور کی کوڑی لایا ہے یعنی وہ کہنا یہ چاہ رہا ہے کہ مسلمان حضرت موسیٰؑ کو حضرت ابراہیمؑ کی نسبت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو حضرت ابراہیمؑ سے اپنے نسبی رشتہ کا علم نہ تھا اور نہ وہ فطری طور پر حضرت ابراہیمؑ کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یہ غلط ہے کیونکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ"۔ "ترجمہ "نہیں ہم تفریق کرتے درمیان کسی کے ان میں سے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

چہارم: حضرت ابراہیمؑ پیغمبروں میں سے تھے اور جس قوم کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس کا ذکر نہیں ملتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عربوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے' جن کے پاس کوئی نبی نہیں آیا تھا ۔ ہاں یہ درست ہے کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ عرب قوم کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ ان کو جس قوم کے لیے بھیجا گیا' اس کا ذکر نہیں ملتا' اس پر تاریخ گواہ ہے کہ وہ اپنی قوم جو بابل میں مقیم تھی' کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ وہ بت پرست قوم تھی۔ آپ نے اس قوم کو توحید کا پیغام سنایا مگر کوشش بسیار کے باوجود وہ بتوں کی پوجا سے باز نہ آئی۔ انہوں نے بت پرستی سے منع فرمایا تو وہ برا مان گئے' جس کی پاداش میں ان کو نار نمرود میں کود جانا پڑا آپ توحید کی خاطر آتش نمرودی میں کود

پڑے آپ آگ میں صحیح سلامت رہے۔آگ آپ کا بال بیکا نہ کر سکی۔ان حالات میں آپ نے اپنے ملک کو خیر باد کہا اور توحید کا پیغام دوسری قوموں کو پہنچانے میں مصروف ہو گئے وہ اسی سلسلے میں عرب میں تشریف لائے۔واٹ کا یہ کہنا کہ عربوں کے پاس کبھی کوئی نبی نہیں آیا تھا اور اس پر بعض قرآن مجید کی آیات سے استدلال کرتا ہے مثلاً ''لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ'' (یسین ۶، پارہ ۲۲) ترجمہ ''تا کہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو نہیں ڈرایا گیا' اس لیے وہ غافل ہیں''۔

سورہ السجدہ میں ہے ترجمہ: بلکہ وہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے تا کہ آپ ڈرائیں اس قوم کو' نہیں آیا جن کے پاس کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے تا کہ وہ ہدایت پائیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے علاوہ حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ عرب اقوام کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ان میں حضرت ہودؑ قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے جو حضر موت کے شمال میں واقع ہے۔ان کی قوم نے کہا'' قالوا یا هود ما جئتنا ببينه وما نحن ۔۔۔۔ مومنين '' (ھود ۵۳، پارہ ۱۲) ترجمہ بولے اے ہود! تم کوئی دلیل لے کر ہمارے پاس نہیں آئے اور ہم خالی تمہارے کہنے سے اپنے خداؤں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور نہ تیری بات پر یقین لائیں گے۔(حیات محمد۔۸۸)

حضرت صالحؑ حجر نامی علاقہ کی قوم کی طرف آئے' یہ علاقہ حجاز اور شام کے درمیان خلیج عقبہ کے اس کنارے پر واقع ہے جو مدین سے ملحق ''حجر'' کنان سے مشہور ہے۔حضرت صالحؑ کے بعد حضرت شعیبؑ مدین کے پہاڑی علاقوں کے باشندوں کے لیے مبعوث ہوئے۔انہوں نے ان لوگوں کو توحید کی تبلیغ کی مگر انہوں نے سنی ان سنی کر دی اور اپنے پیش رووں عاد و ثمود قوموں کی طرح عذاب الٰہی کا لقمہ بن گئے۔

کئی انبیائے کرامؑ عرب قوموں کی طرف آئے' ان کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے کا ہے۔جب ان پر تورات نازل ہوئی۔اس طویل عرصہ میں عربوں کے ہاں کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا تھا۔وہ الہامی روشنی سے محروم ہو چکے تھے جو انہیں حضرت اسمٰعیلؑ کے طفیل عطا ہوئی تھی۔یہ بھی یاد رہے کہ ان آیات سے یہ مطلب نکالنا جن اقوام پر عرب کا لفظ صادق آتا ہے' ان کے پاس آنحضرت ﷺ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں آیا تھا جہالت و گمراہی ہے اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی ہے۔(ضیا النبی ۷۔۱۷۸) اس مستشرق نے قرآنی آیات سے استدلال تو کیا مگر وہ قرآنی آیات کیوں نظر نہ آئیں' جن میں حضرت اسمٰعیلؑ کی نبوت و رسالت کا ذکر ہے۔ارشاد ربانی ہے'' وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝ (مریم ۵۴، پارہ ۱۶) ترجمہ: اور ذکر کر کتاب میں اسمٰعیلؑ کا' وہ وعدہ کا سچا تھا اور وہ رسول' نبی تھا'' یہ متفق امر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ عربوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

پنجم: ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا کعبہ سے تعلق کا ذکر نہیں ملتا۔وہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ عربوں

کا حضرت اسمٰعیلؑ سے کیا تعلق تھا؟ اور حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے آپس کے تعلق سے بے خبر تھے اور خانہ کعبہ سے ان دو پیغمبروں کے تعلق کا کوئی حال معلوم نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کے تمام باشندے سامی الاصل ہیں، سام بن نوح کی اولاد ہیں۔ عرب کو مورخین نے تین جماعتوں میں تقسیم کیا ہے ان میں سے ایک جماعت سام بن نوح کے فرزند قحطان کی اولاد ہے' یہ یمن کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے نکل کر عرب بائدہ کی بربادی کے بعد عرب میں پھیل گئے۔ اس کی شاخیں بنی جرہم' بنی یعرب' بنی لخم' بنی غسان اور بنی کندہ ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے بنی جرہم کے سردار مضاض کی بیٹی سے شادی کی اور نابط اور قیدار انہی کے بطن سے تھے' جنہوں نے خوب شہرت پائی۔ وہ عربوں کے جد امجد ہیں۔ مسلمان عرب بھی انہی میں سے تھے انہیں عربوں اور حضرت اسمٰعیلؑ سے تعلق کی پوری پوری معلومات تھیں۔ عرب جو حافظہ میں بے مثال تھے' ان کے تعلق کو یاد نہ رکھ سکے بعید از قیاس ہے۔ ایک گھر خدا کے واسطے بنایا اور بیت اللہ اس کا نام رکھا جسے کعبہ کہتے ہیں۔ اگر ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰؑ) جس نے مقام گبون بیابان میں خدا کا گھر بنایا اور وہ کون تھا (یعنی داؤدؑ) جس سے خرمنگاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا تھا اور پتھر اور لکڑی ولوہا اور پیتل اس کے بنانے کو جمع کیا گیا۔ اور وہ کون تھا (یعنی سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمنگاہ وارنان یبوسی نہایت عالیشان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام دیا۔ پس کعبہ کی بنا کو اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا' نہایت تعجب کی بات ہے۔ یہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے تعمیر کردہ خانہ خدا اور حج کی عبادتوں کو بجالاتے تھے اور جانتے تھے کہ یہ عبادتیں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل بیت نے متعارف کروائیں اور وہ کرتے چلے آرہے تھے اور حضرت اسمٰعیلؑ عربوں کو بطور نشانی عطا کیا۔ اس سے بڑھ کر اور تعلق کیا ہوسکتا ہے؟ ۔ یہ سب کچھ مسلمان جانتے تھے۔ رہا خانہ کعبہ سے ان دو پیغمبروں کا تعلق مستشرق واٹ کو اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اتنا بھولا ہے کہ خود تو قرآنی آیات سے استدلال کرتا ہے اور جن آیات میں خانہ کعبہ کا ذکر کیا گیا ہے ان سے ناآشنائی ظاہر کرتا ہے۔ اسے پچھلے صفحات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اس فرمان خداوندی پر اکتفا کیا جاتا ہے ارشاد ربانی ہے۔ "رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُـقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ﴿۳۷﴾ (ابراہیم ۳۷، پارہ ۱۳)

ترجمہ: اے ہمارے رب میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کھیتی باڑی نہیں' تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں' اے ہمارے رب! یہ اس لیے ہے کہ وہ نماز قائم کریں' پس کردے لوگوں کے دلوں میں کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں سے تا کہ وہ

(تیرا) شکرادا کریں''۔خانہ کعبہ کی تعمیر کرنے والے اور حضرت ابراہیمؑ اپنے اہل بیت کو عرب میں بسانے والے اور لوگوں کو ان کی طرف مائل ہونے کی دعا کرنے والے کا خانہ کعبہ سے تعلق کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے؟۔

مذکورہ تمام باتوں کا علم یہودیوں سے رابطہ کے بعد ہوا۔

اول:اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں اور یہود کی تعلیمات مختلف ہیں تو پھر مسلمانوں نے یہودیوں کے رابطہ سے کس قسم کی معلومات حاصل کیں۔مستشرق جانتے ہوئے انجان بن جاتا ہے جبکہ اسے خبر ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں۔حضرت اسمٰعیلؑ لونڈی سے پیدا ہوئے۔(نعوذ باللہ) جبکہ مسلمان اس بیان کا رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت ہاجرہ شہزادی تھیں اور حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹے فرزند ہیں اور ہمارے محبوب پیغمبر ہیں۔صاحب ضیا النبی بحوالہ عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں''ان (حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہ ایک شہزادی تھیں جن کی رگوں میں شاہی خون گردش کرتا تھا۔وہ مصر کے اس فرعون کی بیٹی تھیں جو حاکم وقت تھا یہ خاتون نیکی اور پارسائی کا نمونہ تھیں۔

دوم: یہودیوں نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیوی اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا جب کہ مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیا تھا۔

سوم: یہودی کہتے ہیں کہ قربانی اسحٰقؑ کی ہوئی تھی لیکن مسلمان کہتے ہیں کہ قربانی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پہلوٹے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی منیٰ کی وادی میں دی جو حضرت اسمٰعیلؑ کا مسکن تھا۔تو کیسے مستشرق کی بات کو مان لیا جائے کہ مسلمانوں کو ان تمام چیزوں کا علم یہودیوں کے ساتھ روابط اور ان کے بتانے سے ہوا؟ مسلمانوں اور یہود کی دینی تعلیمات میں بہت بُعد ہے۔اگر دونوں کی دینی تعلیمات ایک طرح ہی کی ہوتیں یعنی جو مسلمان کہتے وہی یہودی بھی کرتے اور کہتے' تو کہا جا سکتا تھا کہ یہودیوں کے بتانے اور ان کے ساتھ روابط رکھنے کے سبب سب باتوں کا علم ہوا لیکن یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے اور معاملہ سرے سے ہی مختلف ہے۔ان دونوں کی تعلیمات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ مفروضہ بے بنیاد ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو عرب میں آباد کیا۔ان کے فرزند کے عربوں کے ساتھ تعلق تھے۔۔ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ دونوں پیغمبروں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور حج کی رسومات متعارف کرائیں۔وہ خانہ کعبہ کے متولی اور پاسبان تھے۔یہود اور مسلمانوں کی تعلیمات میں فرق تھا تو پھر بھلا یہودیوں کے رابطہ سے عربوں کو حضرت ابراہیمؑ کے تعلق کی معلومات ان سے کیسے حاصل ہو سکتی تھیں۔ برگزیدہ انبیاء جو انسانیت کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں۔ان کے خلاف زہر چکانی کرنا جہاں بڑی جرات ہے وہاں اپنے مقدر کو خاک میں ملانے کے مترادف ہے۔

اعتراض نمبر ۹

حضرت ابراہیمؑ سامی النسل نہیں تھے۔؟

جواب: عرب قوم کو سامی اقوام یا بنو سام کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے اور علمائے انساب کا اس معاملہ میں اختلاف ہے کہ یہ نسلی تقسیم (Racial) ہے یا لسانی (Linguistic) (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے ۔۲۲)۔ نسلی نظریہ قدیم علماء اور مورخین یہ مانتے ہیں کہ عرب سام کی اولاد ہیں۔ سام حضرت نوحؑ کے فرزند

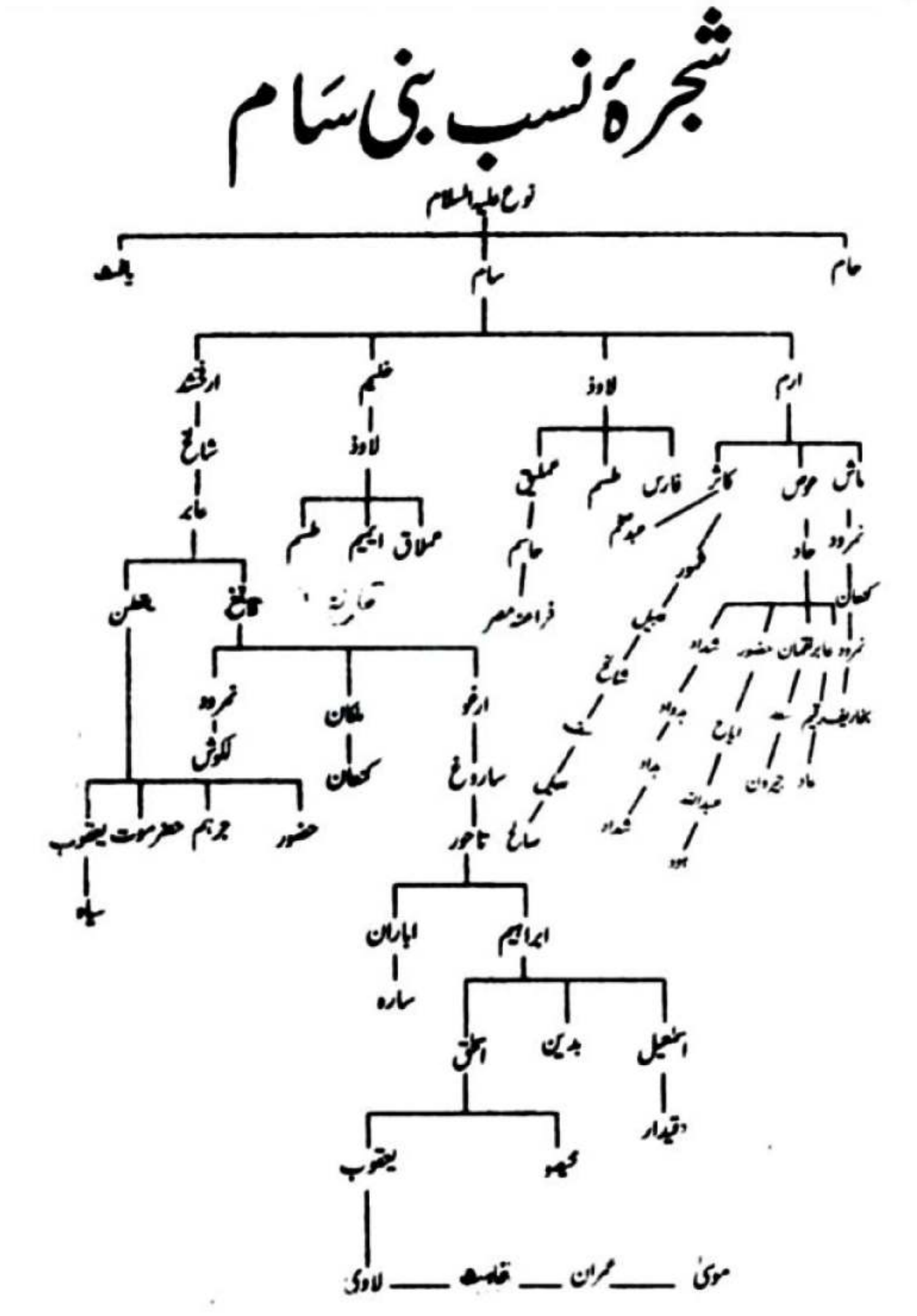

تھے۔ اس نسلی نظریہ کے مطابق حضرت نوحؑ کے تین فرزندوں سام حام اور یافث سے انسانی نسل چلی۔

لسانی نظریہ: جدید علماء کہتے ہیں کہ عرب کے لوگوں کو سامی اس لیے کہتے ہیں کہ سامی زبان بولتے تھے۔ ماہر لسانیات کے مطابق سامی زبانوں کے خاندان میں عربی سب سے جدید اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس خاندان کی مشہور زبانیں، آشوری، بیبلونی، آرامی، عبرانی، عربی، حبشی۔ عرب جزیرہ نمائے سامی لوگوں کا اصل وطن تھا اور اس میں سب سے پہلے جنوبی عرب کا ساحلی علاقہ۔ وہ کنعان' بابل' حبشہ اور مصر کے ملکوں میں گئے جہاں عظیم تمدنوں کی بنیاد ڈالی۔ ان کی چار ہجرتوں میں پہلی ہجرت اڑھائی ہزار سال قبل مسیح میں ہوئی اور یہ لوگ مصر' فنیقیا' بابل اور سریا تک پھیل گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بھی سامی نسل سے تھا اور جن اقوام میں وہ تبلیغ کرتے تھے' ان سب کا تعلق اسی نسل سے تھا۔ آپ سیریا' فلسطین' مصر سے ہوتے ہوئے عرب میں پہنچے۔

امم سامیہ کی قدیم زبان آرامی تھی اور یہی حضرت ابراہیمؑ کی تھی۔ بائدہ' ثمود اور دیگر اقوام سامیہ کی زبان بھی آرامی تھی۔ کتبات بھی اسی زبان میں لکھے ہوئے ملتے ہیں اور ماہر لسانیات اس زبان کو ابتدائی عربی گردانتے ہیں۔ سامی زبانوں کو سمجھنے کے لیے دیئے گئے خاکہ کو نگاہ میں رکھنا چاہئے۔

سامی زبانوں کا حلقہ

بابلی   شامی   سریانی

کلدانی   آرامی   عبرانی   فنیقی

آرامی

آرامی   ثمودی   مدیانی   نبطی   عدیانی   سبائی   حمیری   حبشی

امم سامیہ کی زبانیں مذکرہ خاکہ میں دکھائی گئی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عرب قوم سامی قوم ہے جو حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی اولاد ہے اس نسلی اعتبار سے وہ سامی کہلائے لہٰذا لسانی نظریہ درست نہیں ہے نیز امم سامیہ کی قدیم زبان آرامی ہے سامی نہیں ہے۔ جبکہ وہ نسلی اعتبار سے سامی کہلاتے ہیں نہ کہ لسانی اعتبار سے۔

اہم نکتہ: بعض کہتے ہیں کہ ابراہیمؑ کی آمد سے قبل مکہ کی وادی کے نواح میں بنی جرہم کا جو قبیلہ آباد تھا۔ وہ قبیلہ قحطانی تھا اور اس کا حضرت ابراہیمؑ سے کوئی نسلی تعلق نہیں تھا۔ مگر یہ قیاس درست نہیں ہے۔ قبیلہ بنو جرہم اور حضرت ابراہیمؑ دونوں ایک ہی نسل امم سامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کے نسلی رشتہ کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کے شجرہ نسب کا مطالعہ فرمائیں۔

اعتراض نمبر۱۰

حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؓ کا مقام و مرتبہ گھٹانے کے لیے آپ کو لونڈی زادہ اور آپ کی والدہ کو لونڈی کہا۔'' (نعوذ باللہ)

جن لوگوں کے گھر میں ہو کوئی حوا کی بیٹی
تہمت کسی مریم پہ لگایا نہیں کرتے

یہود و نصاریٰ حضرت اسمٰعیلؑ و حضرت اسحٰقؑ کو حضرت ابراہیمؑ کے فرزند جانتے ہیں۔ جس طرح یہودی حضرت اسحٰقؑ کی اولاد حضرت ابراہیمؑ کے نسبی رشتہ پر فخر کر سکتی ہے اسی طرح حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کو بھی حضرت ابراہیمؑ کے نسبی رشتہ پر فخر کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہود و نصاریٰ کو اولاد اسمٰعیلؑ کے اس فخر سے چڑ ہے اور عداوت ہے اور خدا واسطے کا بیر ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے کہ یہ بیماری یہود و نصاریٰ کو پل بھر چین لینے نہیں دیتی انہیں گھن لگ گیا ہے اور لا متناہی غم کھا رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے الزامات کا رخ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کی طرف موڑ دیا' حضرت ابراہیمؑ کی ذات پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان پر اعتراض کرنے سے ان پر بھی زد پڑتی تھی' جس سے ان کی خاندانی عزت و عظمت اور وقار خاک بوس ہو جاتا کیونکہ یہودی بھی حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ لونڈی ہیں اور اسمٰعیلؑ لونڈی زادہ ہیں۔ (نعوذ باللہ) بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح حضرت محمد ﷺ کو بھی اس الزام سے منسوب کیا حضرت ہاجرہ اور حضرت سائرہ کی شان تورات کے درج ذیل اقتباس کو غور سے پڑھیے تو معلوم ہو جائے گی۔

خدا نے دردو غم کو سنا	ہاجرہ اور سارہ کے	۱۶۔۱۱
کتاب پیدائش		۱۸۔۱۴
خدا نے نام رکھا ہاجرہؓ اور سارہؓ کے		۱۶۔۱۱
اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کا		۱۹۔۱۷
خدا نے برکت دی	ہاجرہؓ اور سارہؓ کے بیٹوں کو	۲۰۔۱۷،۱۹۔۱۷
خدا ساتھ تھا	اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے	۲۶۔۲۴،۲۱۔۲۰
قوموں اور بادشاہوں کا باپ ہوگا اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ		۱۷۔۱۶،۲۵۔۱۶

کتاب مقدس میں دونوں فرزندوں کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ دونوں کو عزت و شرف حاصل ہے مگر یہود و نصاریٰ کا آپ کی شان کو گھٹانے سے کچھ نہیں ہوگا کیونکہ ''وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے''

نیز ارشاد ربانی ہے ''وتعز من تشاء و تذل من تشاء'' عزت و شرف کا مالک وہی ذات بے ہمتا ہے۔ کسی کے بس میں نہیں کہ کسی کی عزت کم کر سکے اور اس کے کھاتے میں ذلت ڈال دے۔

اس اعتراض کو وزنی اور صحیح ثابت کرنے کے لیے دعویٰ میں کتاب پیدائش۔۲۱۔آیات۔۱۰۔۹ پیش کیں ان آیات کا ترجمہ یہ ہے

''سارہ دیکھ رہی تھی کہ ہاجرہ کا بیٹا جسے اس نے ابراہیمؑ سے جنم دیا تھا' ٹھٹھے مارتا ہے' تب اس نے ابراہیمؑ سے کہنا شروع کیا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو کیونکہ ایک لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحٰقؑ کے ساتھ وارث نہیں بن سکتا۔(ضیا النبی۔۷۔۱۸۴)

اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں' کوئی وزنی دلیل موجود نہیں بلکہ آئے روز یہ مشاہدہ میں آتا ہے کہ ایک سوتن دوسری سوتن کو غصہ میں کیا کیا کہہ دیتی ہے اور کیسی کیسی جلی کٹی سناتی ہے۔ جب کہ وہ باتیں اپنی برتری کے لیے کی جاتی ہیں' وہ پائی نہیں جاتیں۔ اس طرح اگر سارہ نے غصہ میں یہ الفاظ اپنی سوتن کو کہے تو اس سے بھلا کب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصل میں لونڈی تھی۔

۲: بائبل میں حضرت ہاجرہ کے آزاد خاتون ہونے اور لونڈی نہ ہونے پر بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسرائیلی قانون میں لونڈی کی اولاد کبھی جائداد کی وارث نہیں بن پاتی۔ اگر وہ لونڈی ہوتیں تو حضرت سارہ کو یہ خدشہ نہ ہوتا اور یہ بات ذہن میں نہ کھٹکتی کہ ہاجرہ کا بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوگا۔

۳: کتاب پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۰ میں ہے ''اس لیے سارہ نے ابراہیمؑ کو کہنا شروع کر دیا کہ اس کنیز اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو کیونکہ اس کنیز کا بیٹا میرے بیٹے اسحٰقؑ کے ساتھ وراثت کا حصہ دار نہیں ہوسکتا ہے''۔ نیز بائبل میں خادمہ کے الفاظ بی بی ہاجرہ کے لیے آئے ہیں' لونڈی کے نہیں ضیا النبی۔۷۔۱۸۵ پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ سارہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی لیکن ان کی ایک مصری خادمہ تھی' جس کا نام ہاجرہؑ تھا۔ کتاب پیدائش باب ۵۔۱۲ کے الفاظ یہ ہیں۔ ترجمہ: یہ تاریخ ہے اسمٰعیلؑ بن ابراہیمؑ کی جنھیں ہاجرہ مصریہ' سارہ کی خادمہ نے جنم دیا تھا۔

۴: سینٹ پال کے ایک خط جو انہوں نے گلتیون کو لکھا اس کے باب چار آیت نمبر ۲۲ میں بھی اس نے حضرت ہاجرہ کو خادمہ کہا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔'' For example it is written that Abraham acquired two sons, one by the serventand one by the free woman''

ترجمہ: مثال کے طور پر لکھا ہے کہ ابراہیمؑ کو دو بیٹے عطا ہوئے، ایک خادمہ کے بطن سے اور دوسرا آزاد عورت کے بطن سے''۔ .

مذکورہ دونوں عبارتوں میں خادمہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں کسی قسم کا حرج نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ فرعون نے اپنی پیاری بیٹی کو حضرت سارہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا ''میری بیٹی کا اس گھر میں خادمہ ہوکر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہوکر رہنے سے بہتر ہے۔'' فرعون نے اپنی بیٹی انھیں سپرد کر کے اعزاز اور بڑی سعادت سمجھا۔ یہ اعزاز کسی بخت آور کے نصیبوں میں ہوسکتا ہے کہ شوہر نبی 'بیٹا نبی اور اپنی سوتن کی کوکھ سے پیدا ہونے والے ان کے فرزند اسمٰعیلؑ کا بھائی اسحٰقؑ نبی ہو۔نبیوں کے گھرانے کی خادمہ کی قسمت پر رشک آتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ۔۔۔۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۴: صحیح بخاری کتاب الٰہیہ میں ہے'' حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا! ابراہیمؑ وسارہؑ ہجرت کر گئے تھے۔وہاں سارہؑ کو ہاجرہؑ ہبہ میں ملیں اور سارہؑ نے ابراہیمؑ سے آکر کہا کہ خدا نے کافر کو ذلیل کیا اور ہم کو ایک لڑکی خدمت کے لیے دی''۔(تفہیم البخاری۔۵۔۱۹۹) محمد سلیمان سلمان (رحمت اللعالمین۔۲۔۴۵) کہتے ہیں کہ ابن سیرین' حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں ''فاخذہ متھا ھاجر'' کے الفاظ بیان کیے ہیں۔

۵: عبرانی زبان میں لونڈی اور غلام کے لیے جو مختلف الفاظ موجود ہیں' کیا ان سے حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت ہوتا ہے کہ نہیں؟۔

(الف) شیلوث حرب۔۔وہ لونڈی یا غلام جو جنگ میں بطور غنیمت حاصل ہو۔

(ب) مقنت کسف۔۔وہ لونڈی یا غلام جو زر خرید ہو۔

(ج) یلید بایث۔۔وہ لونڈی یا غلام جو لونڈی اور غلام سے پیدا ہوں۔

اوپر ذکر کیے گیے تینوں الفاظ میں کوئی لفظ بھی حضرت ہاجرہ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ کو ''امتی'' کہا'' یہ عبرانی لفظ ہے اور عربی زبان میں اَمَۃَ کا معانی ہے جس کا ترجمہ لونڈی بھی ہوسکتا ہے'اس میں حرج نہیں اگر سارہ نے قدرے رنج کی بنیاد پر کہہ دیا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ واقعی لونڈی تھیں اور اسے حقیقی معنوں کا جامہ پہنایا جائے۔سوتنیں ایسے الفاظ کہہ دیتی ہیں جن کا حقیقت سے دور کا واسطہ تک نہیں ہوتا۔

٦: لونڈی ہونا بھی کوئی جرم نہیں اور نہ ہی گناہ ہے۔ان سے عظیم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔حضرت یعقوبؑ کی بیوی مسمات ''لیاہ'' کی لونڈی زلفہ تھیں جن کے بطن سے حضرت یعقوبؑ کے ''جد'' اور آشر پیدا ہوئے۔حضرت یعقوبؑ کی بیوی راحیل کی باندی کا نام ''بلہہ'' ہے اس سے حضرت یعقوبؑ کے '' دان'' اور ''نفتالی'' دو فرزند ہوئے۔ یہ چاروں فرزند ان بارہ فرزندوں میں سے ہیں جن کو حضرت

یعقوبؑ ، موسیٰؑ ، داؤدؑ اور مسیحؑ نے وقتاً فوقتاً برکتیں دیں۔ تورات میں ان چاروں کو باقی آٹھ کے مقابلہ میں کم تر نہیں کہا گیا۔ نہ ہی لونڈی کی اولاد کہا گیا ہے۔

۷: حضرت یعقوبؑ کی بیویاں ان کے ماموں کی بیٹیاں ''لیاہ'' اور ''راحیل'' ہیں۔ ان کا آپس میں یوں مکالمہ ہوتا ہے جس میں اپنے لونڈی ہونے کا اقرار کرتی ہیں۔ راحیل اور لیاہ نے جواب میں کہا کہ ہنوز ہمارے باپ کے گھر میں کچھ ہمارا حصہ ہے یا میراث ہے۔ کیا ہم اس کے آگے بے گانہ نہیں ٹھہریں کہ اس نے تو ہمیں بیچ ڈالا اور ہمارا مال بھی کھا بیٹھا۔ (رحمت اللعالمین ۔۲۔ ۴۷) یہ وہی خواتین ہیں جن کے موسیٰؑ اور داؤدؑ فرزندان ہیں۔ یہ دونوں خود کو زرخرید ہونے کا اعتراف کرتی ہیں۔ اہل کتاب کو اپنے گھر کی خبر لینی چاہیے۔ اپنی لاٹھی اپنی چارپائی کے نیچے تو پھیر لیں، اپنے گھر کی خبر نہیں تو اوروں سے کیا لینا دینا' یا برتری کے زعم میں لام کاف بکنا فائدہ مند نہیں ہے۔ نیز حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کے بارے میں غلط بیانی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا نہ ہی الزام دھرنے کا کوئی جواز بنتا ہے۔ چلو اگر مستشرقین خود کو محققین سمجھتے ہیں تو ماخذ اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرنا انہیں زیب نہیں دیتا۔ یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ ہمارا مقصود انبیاء کے تقابل سے قطعاً نہیں اور نہ ایک کو دوسرے سے برتر گردانتا ہے۔ جب کہ ہمارے لیے تمام انبیاء معزز و محترم ہیں اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ''۔ (البقرہ ۱۳۶، پارہ ۱)

۸: حضرت یوسفؑ جنہیں مدیانیوں نے فوطیفار کے ہاتھ بیچا تھا۔ کتاب پیدائش کے باب ۳۹ آیت ۷ میں ہے کہ اس کے بعد میں یوں ہوا کہ اس کے آقا کی جورو کی آنکھ یوسفؑ پر لگی' پھر باب مذکور کی آیات ۲۰۔۱۹ دیکھیں ''جب اس کے آقا نے ایسی باتیں جو اس کے جورو نے اس سے کہیں کہ تیرے غلام نے مجھ سے یوں کیا تو اس کا غضب اس پر بھڑکا اور یوسفؑ کے آقا نے اس کو پکڑا''۔ یوسفؑ اور فوطیفار کو غلام کہا گیا ہے۔ ان الفاظ کے کہنے سے واقعی حضرت یوسفؑ غلام نہیں ٹھہرے۔ تو یہ بھی درست ہے کہ حضرت سارہؑ کے ساتھ رہنے والی بی بی ہاجرہؑ بھی فی الواقعہ لونڈی نہیں بن گئی تھیں۔

اہم نکتہ: عربی زبان میں ''ولید'' اور ''جاریہ'' اور ''اَمَۃ'' کے الفاظ دختر اور لونڈی دونوں کے لیے بولے اور استعمال کیے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام لونڈیوں اور لڑکیوں کو انہی الفاظ سے مخاطب کرتا ہے جو لونڈیوں اور دختروں کے لیے اصل لغت میں وضع ہوئے ہیں۔ اس لیے کسی ایسے لفظ کو اگر حضرت ہاجرہ کے لیے استعمال ہوا دیکھیں تو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے حضرت ہاجرہ کا فی الواقع لونڈی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ صحیح بخاری کے الفاظ جو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے صادر ہوئے' انہیں یاد رکھنا چاہیے اور وہ الفاظ فاخذ متھا'' کے ہیں۔ خدمت کرنے سے کوئی کسی کا غلام نہیں بن جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ حضرت انس بن مالکؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی۔ لیکن کوئی شخص ان کو

غلام نہیں کہتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی محبت میں چور ہو اور کہہ دے کہ میں تو آقا کا غلام ہوں۔ اور جس کو یہ سعادت یعنی آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی غلامی مل جائے تو پھر اور کیا چاہیے۔

تیری چوکھٹ پہ جھکی جس کی جبیں
ہو گیا اس کے جہاں زیرِ نگیں

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دادا جان کا اصل نام شیبہ تھا لیکن وہ ساری عمر اپنے چچا مطلب کی شکر گزاری میں خود کو عبد المطلب ہی کہلاتے رہے، حتیٰ کہ لقب ان کے نام پر غالب آ گیا اور اسی نام سے شہرت دوام پائی۔ کوئی مورخ اور عالم انھیں مطلب کا غلام نہیں کہتا نہ سمجھتا ہے۔ ہاں البتہ عربی کے بہت بڑے عالم مارگولیس شائد جن کی عقل پر جھاڑو پھر گئی ہے جو انھیں مطلب کا غلام ہی کہتا اور سمجھتا ہے۔ واہ بھئی واہ! یہ اس کی علمیت اور عربی دانی کی عظمت کا نقطہ کمال ہے تو پھر اس کی طرف سے دھرے گئے الزامات بھی ایسے عالمانہ قسم کے ہوں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ظہور سے قبل یہودی اپنے کاموں کی مطلب برآری کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واسطہ سے دعائیں مانگتے تھے اور اس نبی کی آمد کے منتظر تھے۔ جب وہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اولادِ اسحٰقؑ سے نہیں تھے اور وہ حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے تھے۔

اعتراض نمبر ١١

بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ نبوت خانوادہ اسحٰقؑ میں بند ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ (نعوذ باللہ) پیغمبر نہیں ہیں۔

جواب: یہود کے سر پر دھن سوار ہے کہ وہ کسی کو بزعم خویش اپنے سے برتر تو کجا برابر بھی نہیں سمجھتے اور نہ خاطر میں لاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی برتر اور چہیتی مخلوق ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی قوم میں نبوت ہو نہیں سکتی، اس وجہ سے انہوں نے جناب اسمٰعیلؑ کی نبوت سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ جناب اسمٰعیلؑ کی اولاد سے ہونے والے آخری نبی کو بھی پیغمبر تسلیم نہیں کرتے حالانکہ ان کی مقدس اور الہامی کتب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی علامات اور ایک عنقریب نبی آنے والے کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔ قرآن مجید نے حضرت اسمٰعیلؑ و حضرت اسحٰقؑ دونوں کی نبوت کی گواہی دی۔ ارشاد ربانی ہے "وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ ترجمہ: اور ہم نے (ابراہیمؑ) کو اسحٰقؑ کی بشارت دی جو صالح نبیوں میں سے ہے" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ○" ترجمہ: "اور ذکر کیجیے کتاب میں اسمٰعیلؑ کو، بے شک وہ وعدہ کے سچے تھے اور رسول (اور) نبی تھے"۔ (مریم ٥٤، پارہ ١٦)

قرآن مجید نے الہامی اور سچی کتاب ہونے کا دعویٰ کیا'' ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ '' اور آج تک اس دعویٰ کی کوئی تردید نہ کر سکا۔ اب قرآن مجید کی شہادت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے فرزندان نبی ہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تو رسول بھی ہیں۔ اب ایک یعنی حضرت اسحٰقؑ کو نبی ماننا مذکورہ آیت کے تحت اسی وقت درست ہوسکتا ہے جبکہ حضرت اسمٰعیلؑ کو بھی نبی و رسول مانا جائے۔ مسلمان تمام انبیاء کو مانتے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ دونوں کو پیغمبر ماننا مسلمانوں کے عقیدہ کا جز لاینفک ہے۔ وہ دونوں کو پیغمبر مانتے ہیں۔ اس کے برخلاف مخالف ایک کو پیغمبر مانتے ہیں دوسرے کو نہیں۔ یہ دوغلا پن ہے اور قرآن مجید کے فرمان کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ واذکر فی الکتاب ۔۔۔ رسولا نبیا '' کے تحت محمد کرم شاہ (ضیا القرآن۔۳۔۸۸) لکھتے ہیں بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ نبوت خاندان اسحٰقؑ میں بند ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ پیغمبر نہیں ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا مذکور آیت میں ذکر فرما کر ان کے زعم باطل کی تردید کی گئی ہے۔ حضرت اسحٰقؑ کو صرف نبی کہا گیا ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ کو رسول و نبی دونوں صفتوں سے موصوف کیا گیا ہے جس سے ان کے علو مرتبت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی صفات کمال میں سے صادق الوعد ہونے کی صفت خصوصی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ خدا اور اس کے بندوں کے ساتھ جو وعدہ بھی کیا انہوں نے پورا کیا۔ سب سے اہم وعدہ وہ تھا جو انہوںؑ نے اپنے والد ماجد سے کیا تھا۔ ''يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ '' یعنی مجھے ذبح کرنے کا جو حکم تمہیں بارگاہ خداوندی سے ملا ہے' اس کی تعمیل کیجیے۔ میں اپنے ذبح ہونے پر کسی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کروں گا اور دنیا جانتی ہے کہ اس مرد پاک باز نے اس وعدہ کو کس صدق و استقامت سے پورا کیا'' قرآن مجید نے مستشرقین کے نظریہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ پیغمبر نہیں' کا رد کر کے اس کی چولیں ہلا دی ہیں لیکن مستشرقین نہ مانوں'' کی رٹ لگاتے رہیں تو ہماری بلا سے اور انہیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا بلکہ پتھر سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔ دانشمند جانتے ہیں کہ سر ٹکرانے سے سر کا ہی نقصان ہوتا ہے' پتھر کا نہیں۔

اہم نکتہ: ایک فحش روایت بیان کی جاتی ہے کہ نضر کی والدہ برہ بنت اد بن طابخہ سے ان کے باپ کنانہ نے اپنے والد خزیمہ کی وفات کے بعد اس سے شادی کر لی تھی جس سے نضر پیدا ہوئے تھے جیسا کہ جاہلیت میں اہل عرب کا رواج تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کا بڑا بیٹا اس زوجہ کا مالک بن جاتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النساء ۲۲، پارہ ۴) ترجمہ: اور نہ نکاح کرو جن سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا مگر جو ہو چکا (اس سے پہلے سو وہ معاف ہے) مگر یہ فحش خطاء ہے۔ ابو عثمان الجاحظ لکھتے ہیں'' خزیمہ کے انتقال کے بعد کنانہ نے اپنے باپ کی بیوہ کو اپنی زوجیت میں

لے لیا۔ مگر وہ جلد ہی مر گئی اس سے نہ بیٹا ہوا اور نہ ہی بیٹی۔ پھر انہوں نے اس کے بھائی کی بیٹی سے نکاح کر لیا۔ اس کا نام برہ بنت مُر بن اد بن طابخہ تھا اس سے نضر پیدا ہوا۔ جب لوگوں نے سنا کہ کنانہ نے اپنے باپ کی بیوہ کو زوجیت میں لے لیا ہے تو بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کیونکہ دونوں بیویوں کے نام ایک جیسے تھے اور نسب بھی قریب تھا۔ اہل علم ونسب میں سے ہمارے مشائخ کا یہی موقف ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتے ہیں کہ آپ ﷺ کے نسب پاک میں ناپسندیدہ نکاح کا داغ لگائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''ابتدا سے لے کر انتہا تک میں اسلامی نکاح کو مطابق ایک پشت سے دوسری پشت میں منتقل ہوتا رہا''۔ جس شخص نے اس موقف کے علاوہ اور نقطہ نظر اپنایا' اس نے غلطی کی ہے۔ اس حدیث پاک میں شک کیا۔ ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے آپ ﷺ کے نسب پاک کو ہر قسم کے عیوب سے پاک رکھا۔ علامہ دمیری نے جاحظ کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے ''اس کے اس بیان سے مجھے جاحظ کی کامیابی کی امید نظر آتی ہے کہ اس کی خطاؤں سے پردہ پوشی کی جائے۔'' حافظ شامی لکھتے ہیں '' یہ حق بیانی ان نفائس میں سے ہے جن کی طرف قصد کیا جاتا ہے۔ اس سے سینوں کو ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے۔ ان کا غیض وغضب ختم ہوتا ہے۔ شک ختم ہو جاتا ہے اور اس کا شر بجھ جاتا ہے''۔

علامہ ماوردی نے اپنی تصنیف لطیف اعلام النبوۃ میں لکھا ہے ''جب میں نے حضور ﷺ کے نسب پاک میں غور وفکر کیا تو مجھے اس نسب پاک کی طہارت کا یقین ہو گیا۔ مجھے یقین کامل ہو گیا کہ آپ ﷺ کے نسب پاک میں ایک شخص بھی ردی نہیں بلکہ سارے قائد اور سردار تھے۔ نسب پاک کی طہارت اور پاکیزگی نبوت کی شروط میں سے ہے'' (السیرۃ النبویہ زینی دحلان۔ ۱۔ ۲۴۔ ۲۵)

قصی بن کلاب

ان کا اصل نام زید ہے۔ یہ ابھی ماں کی گود میں تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے ماں کے ہاں پرورش پائی۔ ان کی ماں نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد دوسرا نکاح ربیعہ بن خرام الخذری سے کر لیا تھا۔ زہرہ ان کے بڑے بھائی تھے ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ قصی کی آواز کو باپ کی آواز کے مشابہ پا کر انہوں نے اسے بھائی تسلیم کر لیا اور جائداد کا حصہ بھی دے دیا۔ قصی کو قصی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ وطن سے دور جا پڑے تھے۔ انہیں مجمع اس لیے کہتے ہیں کہ انہوں نے قبائل قریش کو پھر مکہ میں جمع کیا اور فراہم کر لیا تھا آپ ﷺ کے آباء کرام میں قصی پانچویں' کنانہ چودھویں اور عدنان اکیسویں پشت میں ہیں۔

اہم نکتہ: ڈاکٹر ربانی (سیرت طیبہ۔ ۴۲) لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے الوثائق السیاسیہ کے آخر اور زبید احمد نے عدد العرب میں قصی کے تین بیٹوں کا ذکر کیا ہے لیکن طبقات ابن سعد میں چار لڑکوں اور دو لڑکیوں کا ذکر ہے۔ لڑکوں میں عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ اور عبد قصی اور لڑکیوں میں ایک کا نام تخمر اور

دوسری کا برہ تھا۔ نا معلوم مذکور الصدر حضرات نے ابن سعد کی روایت سے کیوں اختلاف کیا۔ عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ قصی کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے چاروں لڑکوں میں سے دو کے نام اپنے معبودوں کے نام پر رکھے باقی دو میں سے ایک کو گھر سے (عبدالدار) اور دوسرے کو اپنے سے (عبد قصی) منسوب کیا۔

قصی نے مکہ میں ۴۲۰ یا ۴۴۰ عیسوی میں چھوٹی سی ریاست قائم کی ۔اس کے مختلف شعبے تھے جو بعثت نبوی کے وقت چلتے چلتے چودہ شعبے رہ گئے تھے۔ وہ مختلف قبائل میں تقسیم تھے۔ عقاب' بنی امیہ' قبہ اور رعنہ بنی مخزوم' سفارت بنی عدی' ندوہ بنی عبدالدار' مشورہ بنی اسد' اشناک بنی تمیم' حکومت بنی سہم' سقایہ اور عمارہ بنی ہاشم' رفادہ بنی نوفل' سدانہ بنی عبدالدار' ایسار بنی جمع اور موالا المجرہ بنی سہم کے پاس تھے (تاریخ اسلام شاہ معین الدین۔ اول ص۔ ۵)۔ قصی کی چھ اولادیں تھیں۔ عبدالدار' عبدلمناف' عبدالعزیٰ' عبد قصی' تخمر 'مورہ ۔قصی نے مرتے وقت تمام مناصب عبدالدار کے سپرد کیے۔ قصی کے بعد قریش کی سیادت عبدالمناف نے حاصل کر لی۔ عبدالمناف تک تو نزاع پیدا نہ ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چار بیٹوں (ہاشم' عبدشمس' مطلب اور نوفل) میں سے ہاشم نے اپنے بھائیوں کو عبدالدار سے حرم کے مناصب لینے پر آمادہ کیا۔ عبدلدار کمزور تھا جبکہ ہاشم ذہانت' سیادت اور مالی لحاظ سے مضبوط تھا۔ عبدالدار نے یہ منصب دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے دونوں طرف سے جنگی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ یکا یک دونوں جانب سے صلح کا مطالبہ ہوا' اور شرط یہ ٹھہری کہ بنی عبدالمناف کے ذمہ سقایہ اور رفادہ کر دیا جائے اور حجابہ' لواء اور ندوہ بدستور عبدالدار کے پاس رہیں۔ دونوں فریقین نے اس فیصلہ کو قبول کیا' جنگ ہوتے ہوتے ٹل گئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام آیا تو آپ نے فرمایا ''جاہلیت میں جو معاہدہ ہوا تھا' اسلام نے اس کے استحکام ہی کو بڑھایا ہے''۔

اعتراض نمبر ۱۲

غیر مسلم مورخین قُصّی کی کامیابی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور لکھا کرتے ہیں کہ قصی نے حکومت کو جمہوریت کے اصول پر قائم کیا تھا''۔ اور نبی مکرم ﷺ کی تعلیمات اسی اصول کی شرح ہیں

جواب: مکہ میں منظّم ترین شہری مملکت تھی جسے حضور ﷺ کے جد امجد قصی بن کلاب نے مکہ پر قبضہ کر کے سن ۴۴۰ء میں قائم کی تھی وہ بہت جلد ایک مقبول حکمران بن گیا انہوں نے اطراف و اکناف میں منتشر اپنی قوم کو بلا کر مکہ مکرمہ میں آباد کیا اور اہل مکہ جن چیزوں کے مالک تھے انہیں ان کا مالک رکھا اور جو خدمتیں ان کے سپرد تھیں ان پر انہیں قائم و برقرار رہنے دیا چنانچہ بنی صفوان, بنی عدوان, بنی مناۃ اور بنی مرہ بن عوف جن خدمات پر فائز تھے, اسی پر قائم رہے اور اس کا سبب یہ تھا کہ قصی ان لوگوں کی خدمتوں پر قائم رہنے کو دین ہی میں شامل سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک ان لوگوں کا ان کے عہدوں سے

معزول کرنا جائز نہ تھا یہاں تک کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان سب امور کو باطل اور نیست ونابود کر دیا۔ تمام قوم قصی کی اطاعت کرتی تھی ابن سعد کے بقول ’’جس طرح مذہب کی پیروی کی جاتی ہے اہل مکہ اسی طرح قصی کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ خانہ کعبہ کی خدمات مثل حجابہ، سقایہ، رفادہ، ندوہ اور قیادہ اور لواء ان کے پاس تھیں انہوں نے مکہ کی بلندی کی جانب اپنی سکونت رکھی اور مکہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر قبیلہ کے لیے سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ قریش اپنے گھروں میں حرم کے درخت کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ قصی کو معلوم ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے گھر کے درخت پر کلہاڑا چلایا ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ شادی بیاہ میں اپنوں یا غیروں میں کوئی تنازعہ کھڑا ہوتا تو قصی سے مشورہ لیا جاتا اور جنگ کی صورت میں وہ اپنے ہاتھ سے جھنڈا تیار کر دیتے تھے۔ قریش کی جب کوئی لڑکی بالغ ہوتی تو قصی کے مکان میں لا کر اس کی پہلی اوڑھنی پھاڑ دیتے تھے اور نئی اوڑھنی پہنا کر گھر لے جاتے تھے۔ قصہ مختصر قصی کے اقوال وافعال ان کی حیات اور ممات کے بعد ان کی قوم کے اندر قوانین مذہب کے جاری تھے۔ انہوں نے ایک عالی شان مکان بنایا جس کا نام دار الندوہ رکھا اس کا ایک دروازہ خانہ کعبہ کی طرف تھا۔ اس مکان میں تمام امور کے فیصلے ہوتے تھے ہجرت کے وقت کفار نے اسی مکان میں حضور ﷺ کو ٹھکانے لگانے کے لیے ایک میٹنگ بلائی تھی۔ قصی نے مملکت کے نظم ونسق کو بہترین رکھنے کے لیے کئی محکمے قائم کیے اور یہ محکمے دس قبائل میں تقسیم کیے گئے تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب قصی نے اپنے عہدہ اپنے بیٹوں میں تقسیم کیے۔ قصی پر کہولت و بڑھاپے کے سائے منڈلا رہے تھے اور ان کے قویٰ کمزور اور مضمحل ہو گئے اس وقت اپنے فرزند اکبر عبدالدار سے کہا ’’اے میرے فرزند! میں تجھ کو قوم کا سردار بناتا ہوں بغیر تیرے دروازے کھولے‘ کوئی شخص کعبہ میں داخل نہ ہو سکے اور تو ہی قریش کے لیے ہر جنگ کے لیے علم تیار کرے گا اور مکہ کا ہر شخص تیرے ہی پانی پلانے سے زم زم کا پانی پیے گا اور حاجیوں میں سے ہر ایک تیرا ہی کھانا کھائے گا اور قریش کوئی کام تیرے مشورہ کے بغیر نہیں کرے گا ہر ایک فیصلہ تیرے ہی مکان میں ہوا کرے گا‘‘۔ پھر قصی نے بیت اللہ شریف کی تمام خدمتیں (عہدے) حجابہ‘ لواء ندوہ‘ سقایہ‘ رفادہ اور قیادہ وغیرہ سب اپنے فرزند عبدالدار کو سونپ دیں اور باقی پانچ فرزندوں کو محروم کر دیا۔ بعض میں قصی کے دوسرے بیٹے عبدمناف کے فرزندوں میں عبدالدار کے بیٹوں سے لڑ کر دو عہدے حاصل کیے لیکن اس کے برعکس تاریخ مکہ کے ازرقی کا بیان ہے کہ قصی نے اپنے چھ عہدوں میں سے تین عبدالدار کو اور تین عبدمناف کو دیئے اور باقی بیٹے چھوٹے

تھے یا نااہل تھے اس لیے ان کو کچھ نہیں دیا عبدالدار کو حجابہ' لوا اور ندوہ جب کہ عبد مناف کو سقایہ' رفادہ اور قیادہ کے عہدے دیئے پھر یہ عہدے قصی کے دونوں فرزندوں کے خاندانوں میں چلتے رہے جیسے کہ دوسرے چلتے رہے۔ قصی کی تقسیم دونوں صورتوں میں درست نہیں خواہ اس سارے عہدے اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو دیئے یا اپنے دونوں بیٹوں عبدالدار اور عبد مناف نے برابر برابر تقسیم کیے ہوں۔ اول صورت میں پانچ بیٹے اور دوسری صورت میں چار بیٹے عہدوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

عبدِ مناف نے اپنی موت کے وقت سقایہ اور رفادہ کے عہدے اپنے چھوٹے بیٹے ہاشم کو دیئے اور قیادہ کا اہم عہدہ بڑے بیٹے عبد شمس کو۔ عبد شمس نے اپنے بیٹے امیہ کو جانشین بنایا۔ امیہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا حرب اور حرب کے بعد ان کے بڑے بیٹے ابوسفیان کو منتقل ہوا۔ دوسری طرف رفادہ اور سقایہ کے عہدوں کی منتقلی اتنی سیدھی نہیں رہی تھی۔ ہاشم کے انتقال کے وقت ان کے تمام بیٹے چھوٹے تھے اس لیے سقایہ ان کے بھائی مطلب کو ملا اور رفادہ نوفل کو پھر رفادہ پہلے تو نوفل کے پاس رہا اس کے بعد رفادہ اور ندوہ دونوں بنو اسد کے حکیم بن حزام نے خرید لیے۔

سقایہ مطلب سے ان کے بھتیجے اور ہاشم کے فرزند عبدالمطلب کو ملا ان کے بعد ان کے فرزند زبیر پھر زبیر سے ان کے بھائی ابو طالب پھر ان سے ان کے چھوٹے بھائی عباس کو ملا پھر یہ اسی خاندان میں چلتا رہا۔ یہ درست ہے کہ قصی نے مکہ میں حکومت قائم کی اور ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لیے سترہ محکمے بنائے جو چلتے چلتے بعثت نبوی کے وقت چودہ محکمے رہ گئے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ انہوں نے قبائل کو مکہ میں جمع کیا اور خانہ کعبہ کے اردگرد عمارتیں بنانے کی تجویز پیش کی۔ لیکن مذکور اعتراض سے غیر مسلم یہ مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی تعلیمات کو انہی اصول کی شرح ٹھہرائیں جو کسی طرح بھی درست نہیں نیز تاریخی حقائق اس کا رد کرتے ہیں۔ اور یہ دلیل لاتے ہیں کہ قصی نے ترکہ کی تقسیم اپنی اولاد میں نامنصفانہ طریق سے کی اور تمام مناصب عبدالدار کو سونپ دیئے۔ عبدالدار کی ناز برداری کرتے ہوئے دوسرے فرزندوں کو اس کی غلامی میں چھوڑ دیا تھا' اسی بناء پر اس کی اولاد میں مخالفت بڑھی گویا قصی تاہنوز جمہوریت یا ایثار سے بہت دور تھا۔'' (رحمت اللعالمین۔۲۔۶۲۔۶۱)

لیکن نقوش رسول نمبر۲۔ص۱۸۰ پر ہے کہ عبدالدار شہر مکہ کے بانی اول قصی کے فرزند اکبر اور عبدالمناف کے برادر اکبر تھے ہمارے مأخذ میں عام طور پر یہ بیان ملتا ہے کہ قصی نے اپنی زندگی میں اپنے سارے مناصب فرزند اکبر عبدالدار کو دے دیئے تھے اور باقی فرزندوں کو محروم کر دیا تھا۔ قصی کے

بعد یہی مناصب بنائے مخاصمت بنے اور عبد مناف اور عبد الدار کے فرزندوں کے درمیان تصادم کی نوبت آ گئی لیکن معاملہ صلح سے سلجھ گیا اور دونوں خاندانوں میں مناصب کی تقسیم ہو گئی۔ اور اس کے بعد یہ کہنا کہ عبد الدار کی سماجی اور اقتصادی حیثیت نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ یہ بیان یک طرفہ ہے اور تاریخ مکہ کے مصنف ازرقی کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قصی نے اپنے چھ مناصب برابر برابر اپنے دونوں فرزند عبد الدار اور عبد مناف میں تقسیم کر دیئے تھے جو ان خاندانوں میں چلتے رہے بنو عبد الدار کی سماجی اور مذہبی برتری سے کوئی مورخ انکار نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اب بھی کعبہ کے متولی اور کلید بردار تھے جو مذہبی لحاظ سے سب سے بڑا عہدہ تھا البتہ ان کی عددی طاقت کم ہو جانے اور اقتصادی ثروت نہ ہونے کے سبب وہ عبد مناف کے ہم پلہ نہیں رہے تھے اور قریشی بطون کی دوسری صف میں آ گئے تھے اور ''واٹ'' کا خیال کہ وہ بعثت نبوی کے وقت مکہ کے معاملات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اس حد تک تو یہ صحیح ہے کہ ان کی پرانی حیثیت برقرار نہیں رہی تھی لیکن اب بھی مکہ کی سیاست و سماج میں نمایاں مقام کے حامل تھے اور واٹ کا کہنا کہ وہ مکہ کے معاملات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، غلط ہے مصنف رحمت اللعالمین نے لکھا کہ مناصب کی ناہموار تقسیم سے ان خاندانوں میں رقابت اور دشمنی چلتی رہی۔

درج ذیل عہدے مختلف قبائل میں تقسیم تھے

نمبر شمار	منصب	منصب دار	خاندان	دوسرے خاندان میں منتقلی	منصب کی کفیت
۱	حجابہ	عثمان بن طلحہ	بنو عبد الدار		کعبہ کی تولیت اور کلید کعبہ ان کے پاس رہتی تھی
۲	ندوہ	حکیم بن حزام	بنو عبد الدار		بنو اسد قومی مجلس دار الندوۃ کی تولیت
۳	لواء	عامر بن ہاشم	بنو عبد الدار		جنگ و امن میں پرچم اٹھائے رکھنے کا عہدہ
۴	رفادہ	حارث بن عامر	بنو نوفل		کعبہ کے حاجیوں و زائرین کا انتظام
۵	سقایہ	عباس بن عبد المطلب	بنو ہاشم		حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام
۶	مشورہ	یزید بن ربیعہ	بنو اسد		قومی مشورہ کا انتظام و مجلسِ صدارت
۷	دیت	ابو بکر بن قحافہ	بنو تمیم		قصاص و دیت و جرمانے کا فیصلہ
۸	قیادہ	ابو سفیان بن حرب	بنو امیہ		قریشی افواج کا قائد

۹	قبہ	ولید بن مغیرہ	بنو مخزوم	جنگ میں شاہسوار، فوج کے خیموں کا انتظام
۱۰	سفارت ومنافرہ	عمر بن خطاب	بنو عدی	قبائل سے معاملہ طے کرنا اور سفارت کاری
۱۱	ازلام و ایسارہ	صفوان بن امیہ	بنو جمح	فال کے تیر اور فال نکالنے کے متولی
۱۲	اموال المجرہ	حارث بن قیس	بنو سہم	کعبہ میں بتوں کے چڑھاوے کے مال کی حفاظت

ان عہدوں کے علاوہ قریش کے اور سردار بھی تھے جن کا سکہ چلتا تھا ان کی مشاورت کے بغیر قومی یا قبائلی کام انجام پذیر نہ ہوسکتا تھا۔ تاریخ کی کتب میں ان کے نام مع خاندانوں کا ذکر موجود ہے۔

غیر مسلم کہتے ہیں کہ قصی نے حکومت کو جمہوریت کے اصول پر قائم کیا تھا، اس سے معترضین یہ مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے تعلیمات کو انہی اصول کی شرح ٹھہرائیں۔ یہ ان کا باطل نظریہ ہے کیونکہ کفار مکہ اس قسم کے کئی دعوے پہلے بھی کر چکے ہیں جیسے انہوں نے کبھی ورقہ بن نوفل، قس بن ساعدہ، نسطورا راہب سے سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے کا کہا۔ کفار نے ایک عجمی شخص کو بھی استاد کا درجہ دے ڈالا جس کا رد قرآن مجید میں ہے "لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ○ (النحل ۱۰۳، پارہ ۱۴)" اور کبھی کہا کہ ان تعلیمات سے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ دین اسلام یہودیت وعیسائیت اور مانی مذہب سے ماخوذ ہے لیکن آپ ﷺ نے لوگوں کو وہی کچھ تعلیم کیا جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے آپ ﷺ پر نازل ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات سر بہ سر منزل من اللہ ہیں وہ نہ کسی سے حاصل شدہ ہیں اور نہ از خود اختراع کی ہوئی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے "ومَا ینطق ۔۔۔۔ یوحیٰ" اور نبی مکرم کا دین اسلام اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے ارشاد خداوندی ہے اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَام"۔۔۔ (۱۹۔۳) البتہ اگر کسی واقعہ سے متعلق حکم موجود نہیں اور اس کا ذکر دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ میں موجود ہو تو آپ اس پر عمل پیرا ہوتے تھے اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ حکم بھی آسمانی کتب سے ملتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ارشاد ربانی ہے "اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ط۔ (۶۔۹۰)" "ترجمہ وہ لوگ (پیغمبر) ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے اس لیے (اے محمد ﷺ) آپ بھی ان کی موافقت کریں"۔ ڈاکٹر حمید اللہ (خطبات بہاول پور۔ ص۔ ۹۳) رقم طراز ہیں کہ تاریخی

نقطہ نظر سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے زمانے سے لے کر پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے تک اپنے اقتدا کے معنی اصل لغت میں شخص ثانی کا شخص اول سے موافقت کرنا ہے۔آیت بالا پر جو کوئی شخص سرسری نظر ڈالے گا۔ وہ سمجھے گا کہ حضور ﷺ کو کسی دوسرے شخص کے پیرو ہونے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ معنی اہل اسلام کے اس مسلمہ اعتقاد کے خلاف ہیں کہ حضور ﷺ امام الانبیاء ہیں۔پیغمبروں کے ذریعے جو پیغام بھیجے ہیں وہ بھی خدائی احکام ہیں اور وہ بھی ویسے ہی قابل تعظیم ہیں جیسے پیغمبر اسلام پر نازل شدہ قوانین۔"لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ قف (۲۔۲۸۵) سب پیغمبر مساوی رتبہ رکھتے ہیں بحیثیت (پیغمبر کے) تو حکم دیا جاتا ہے کہ سابقہ پیغمبروں کے قوانین بھی واجب التعمیل ہیں اور پیغمبر اسلام ﷺ کو اس پر عمل کرنا چاہیے لیکن ظاہر ہے کہ اس حکم کے ساتھ کچھ شرطیں ہوں گی۔لہٰذا مستشرقین کے ایسے جیسے اعتراضات باطل اور لغو ہیں۔ایک شرط یہ ہے کہ انبیاء کی شریعت میں قرآن مجید نے منسوخ یا ترمیم یا تبدیلی نہ کی ہو اور دوسری یہ کہ ان کا ہم تک پہنچنا قابل اعتماد وسائل سے ہوا ہو۔قرآن مجید نے جب کسی قانون سابقہ کو منسوخ نہیں کیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ برقرار ہے۔جب وہ برقرار ہے تو ہمارا قانون ہے جو ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے خدا کا بنایا ہوا قانون ہے اور ہمارے لیے واجب التعمیل ہے چنانچہ تورات میں شادی شدہ لوگوں کے زنا سے متعلق صراحت سے ذکر ہے کہ ان کو رجم کیا جائے لیکن غیر شادی شدہ لوگوں سے زنا کے متعلق تورات میں حکم ہے کہ ان کو صرف مالی جرمانہ کیا جائے اور کچھ نہیں۔اس قانون کو قرآن مجید نے منسوخ کر دیا کیونکہ صرف جرمانے کی سزا پر اکتفا کرنا بد اخلاقی میں اضافہ کرنا ہے اس کو ایک زیادہ روکنے والی چیز کی ضرورت ہے۔لہٰذا حکم ہوا کہ ایک سو دُرے لگائے جائیں۔جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے ایک سابقہ قانون کے ایک جز کو سکوت کے ذریعے برقرار رکھا اور دوسرے حصے کو صراحت کے ساتھ منسوخ کر دیا تو دو اسلامی قانون ہوئے اور دونوں پر عمل واجب ہے۔سابقہ انبیاء کی شریعت مسلمانوں پر واجب التعمیل ہے دو شرطوں کے ساتھ جو پیچھے بیان ہوئیں یعنی ایک تو ان میں ترمیم یا تبدیلی یا منسوخی قرآن مجید نے نہ کی ہو اور دوم یہ کہ ان کا ہم تک پہنچنا قابل اعتماد وسائل سے ہوا ہو۔قصی کی جو مخالفین بڑھا چڑھا کر جمہوریت کی باتیں کرتے ہیں اور ان کو آپ ﷺ کی تعلیمات کے اصول سمجھتے ہیں محض غلط ہے۔مثال کے طور پر یہ مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دیوان قائم ہوا اور دیوان کا کام یہ تھا کہ سرکاری خزانے سے سپاہیوں کو تنخواہ دی جاتی تھی اس شرط پر کہ وہ چوبیس گھنٹے تیار رہیں یعنی جب حکومت بلائے تو

وہ اسی وقت تمام مصروفیات بالائے طاق رکھ کر چلے آئیں۔ یہ نظام حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہے اور کہتے ہیں کہ یہ دیوان حضرت عمرؓ نے قائم کیا تھا لیکن حیرت یہ ہے کہ اس کا آغاز عہد نبوی میں ہو چکا تھا۔ امام محمدؒ کی ''السیر الکبیر'' میں ہے کہ آپ ﷺ کے عہد میں ایک کاتب کے ذمہ تھا کہ وہ ان بالغ لوگوں کو فہرست میں ڈالیں جو نہ صرف جنگ کے قابل ہیں بلکہ اس پر آمادہ ہیں کہ جب انہیں بلایا جائے فوراً فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ ایسے لوگوں کو بیت المال سے وظیفہ ملتا تھا یہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کے قائم کردہ نظام کو ترقی دی۔ ان کے زمانے میں حکومت کے ہاں روپے پیسے کی ریل پیل تھی لہٰذا وظائف زیادہ دیئے جانے لگے حتی کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں غیر مسلموں کو بھی وظائف دیئے جاتے تھے مختصر یہ کہ دیوان خود آپ ﷺ نے قائم فرمایا تھا۔

مدینہ میں آپ ﷺ نے باقاعدہ اور منظم حکومت کی داغ بیل ڈالی اگرچہ وہ ابتدائیہ تھا مثلاً پہلی وحی میں لفظ اقرا تھا (یعنی پڑھو) اس کے بعد نبی مکرم ﷺ کی ساری عمر امت کے لکھنے پڑھنے اور دینی واخلاقی تعلیم کو رائج کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ مدینہ میں پہلے مسجد کی تعمیر عمل میں آئی بعد ازاں اس مسجد کے اندر ''صفہ'' ایک حصہ تھا جو تعلیم کے لیے مخصوص تھا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ پہلی اقامتی یونیورسٹی تھی جو آپ ﷺ نے قائم فرمائی یہ دن کے وقت تعلیم گاہ کا کام دیتی اور رات کے وقت بے خانماں لوگوں کے لیے بورڈنگ کا کام دیتی تھی۔ مقامی لوگ پڑھ کر گھروں کو لوٹ جاتے مگر بے خانماں لوگ وہیں رہائش پذیر رہتے اور ان کے کھانے کا انتظام بھی موجود تھا۔ ان بے پڑھے لوگوں کے لیے وہاں پڑھانے کے لیے معلم بھی تھے جس طرح ایک صاحب کو اس بات پر مامور کیا گیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں کیونکہ وہ بہت خوش نویس تھے۔ ایک شخص نے بارگاہ نبوی میں عرض کیا؛ یا رسول اللہ! میں نے ایک شخص کو قرآن کی تعلیم دی ہے اور اس نے اظہار تشکر کے طور پر مجھے ایک کمان دی ہے کہ اللہ کی راہ میں اس سے جہاد کروں، کیا میں اسے لے سکتا ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''دوزخ کی آگ کی کمان ہے'' چنانچہ وہ دوڑے ہوئے گئے اور کمان شاگرد کو واپس کر دی حالانکہ معلم نے وضاحت کی تھی کہ میرا شاگرد چاہتا ہے کہ اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ایک شبہ یہ ہے کہ تم تعلیم کا معاوضہ لینا چاہتے ہو۔ ابتدائی انتظام ہے اور آنے والوں کے لیے ترقی اور آگے بڑھانے کی ازحد زیادہ گنجائش ہے۔ گویا ہر قسم کے شعبہ زندگی سے متعلق ہدایات اور آپ ﷺ کا عمل مشعل راہ ہے اور ہر ایک شعبہ میں ترقی کی گنجائش باقی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ ﷺ کے عہد ہمایوں میں کسی شعبہ کی بنیاد نہ رکھی گئی ہو۔ بلکہ ایسا کہنا مخالفوں کی الزام تراشی ہے۔

محمد اسلم ملک کے مضمون مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ (ن ۔۲۔۳۔۴۰۳) میں ہے کہ کتب تاریخ گواہی دیتی ہیں کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لیے ان عہدوں کا قیام اور دیگر انتظامات قصی کے اپنے ذہن رسا کی پیداوار ہیں۔قصی کی بے پایاں عسکری اور انتظامی صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں مگر محولا بالا بیان کی صداقت کو تسلیم کرنے سے پہلے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔قصی شام سے حجاز آیا اس وقت اس کے خاندان میں قبائلی طرز حکومت تھا۔شام ایک تہذیبی لحاظ سے ترقی یافتہ تھا۔مزید برآں قصی نے مکہ فتح کرنے کے لیے شام سے عسکری امداد بھی دی تھی اور قصی کی تعلیم و تربیت بھی شام کے متمدن ملک میں ہوئی تھی دوسری طرف مکہ کی حکومت کے لیے بہت سی چیزیں شامی طرز حکومت سے اخذ کی گئی ہوں۔قصی کے عہد میں شام اور حجاز کے تعلقات سمجھنے کے لیے حدود ملک شام میں ملنے والے اس کتبہ کا ذکر کرنا بجا ہوگا۔اس کتبہ پر قصی مالک کا نام درج ہے۔یہ نام عدنانی الاصل ہے شام میں یہ نام مروج نہیں رہا جس پر مورخین نے امکان ظاہر کیا ہے کہ یہ قصی رئیس قریش کے نام کا کتبہ ہے۔شام سے اکتفا کرنے کے علاوہ مکہ کی روایات سے بھی بہت سی چیزیں قصی نے مستعار لیں مثلاً قصی سے قبل مشترکہ قسم کی حکومت مکہ میں قائم تھی اور مختلف خاندانوں کو مختلف عہدے سپرد کیے گئے تھے۔حجاز اور شام کے امتزاج سے قصی نے ایسا نظم و نسق قائم کیا کہ بہت جلد اس کے خاندان قریش کو پورے عرب میں ایک اہمیت حاصل ہوگئی اور مکہ کے شہر کو مشرق اوسط میں مرکزیت حاصل ہوئی۔اس بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قصی نے شام اور مکہ کی حکومتوں کے امتزاج سے عہدے اور دیگر انتظامات کیے اس کی حکومتی اور دوسرے انتظامات مستعار شدہ ہیں تو پھر ان کے اصولوں کو آپ ﷺ کی تعلیمات کی شرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اعتراض نمبر ۱۳

''آج (دشمنان مکہ) یہ طعنہ دیتے ہیں کہ مکہ کے ان قبائلی باشندوں کے کردار سے بدویت زائل نہ ہوسکی، دوسرے اہل تاریخ یوں نکتہ چینی کرتے ہیں کہ کم از کم قصی بن کلاب کی سیادت و سرداری ۴۴۰ عیسوی تک اپنے بدوی مزاج کو بدل نہ سکی۔''

جواب: ہیکل کہتا ہے کہ عقل یہ تسلیم نہیں کرتی کہ روئے زمین پر واقع وہ بستی، وہ آبادی، وہ شہر جسے بیت اللہ کہلانے کا انفرادی اعزاز حاصل ہے۔وہ شہر جسے قبیلہ جرہم کا مسکن بننا نصیب ہوا، وہ قبیلہ جرہم جسے حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ جیسی عظیم الشان ہستی کا سسرال ہونے کا شرف حاصل ہوا۔وہ شہر جو صدیوں سے یمن، حیرہ، شام اور نجد سے آنے والے تاجروں کی مسافری آرام گاہ رہا ہوا ایسا شہر جو ساحل قلزم کے

قریب ہو یعنی ایسا شہر جو مدتوں سے اپنی متمدن قوموں کا مرجع رہا ہو کیا وہ مدنیت سے نا آشنا رہ سکتا ہے؟ ممکن ہے کہ تعمیر کعبہ کے زمانہ میں مکہ کا تمدن جاذب نظر نہ تھا کہ وہ اس دور کے دو معروف قبائل عمالقہ اور جرہم کی توجہ کے قابل ہو سکتا' لیکن حضرت اسمٰعیلؑ نے اس مقام کو اپنی اقامت کا شرف بخشا اور بعد میں جناب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ دونوں نے مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو پھر ان دو صفات کی برکتوں نے اس بستی کو اولاد آدم کے لیے مستقل بسیرا بننے کی انتہائی قابل رشک صلاحیت بخش دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف سے قبائل قافلہ در قافلہ آتے گئے اور یہاں بستے گئے اور پھر یہ بستی ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل ہو گئی۔۔۔۔ یہ دلائل اپنی جگہ ٹھوس' بھاری اور وزنی سہی مگر ان میں سب سے زیادہ مضبوط ترین دلیل یہ ہے کہ جس شہر کا نام حضرت ابراہیمؑ نے خود تجویز کیا ہو اور جس کی فلاح و بہبود کے لیے خدا کے اس برگزیدہ رسول نے اس میں سدا امن اور دوسروں کے لیے مامن ہونے کی دعائیں کی ہوں اور وہ دعائیں شرف قبول سے سرفراز ہو چکی ہوں' تو کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ شہر قصی بن کلاب کے دور سن ۴۴۰ سے پہلے تمدن کا گہوارہ نہ بن چکا ہو جبکہ اس شہر میں حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار سال قبل حضرت ابراہیمؑ نے اپنے گرامی قدر فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو لا کر آباد کیا۔'' (حیات محمد۔۹۰)

تقریباً چار ہزار سال پہلے (ق۔م) پروو ط نے یمن ملک کو تمام دنیا کے ملکوں سے زیادہ زرخیز لکھا ہے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ مارب، جو زمانہ قدیم میں سبائے تورات کا قائم مقام تھا بڑے بڑے عالی شان قصر تھے جن کی محرابیں سنہری اور ان کے اندر طلائی اور نقرئی ظروف اور بیش بہا پلنگ سونے اور چاندی کے موجود تھے۔

السٹر ابوار تمید درس کے قول کو نقل کرتا ہے کہ مارب ایک عجیب وغریب شہر تھا، شاہی قصروں کی چھتیں سونے اور ہاتھی دانت اور بیش بہا موتیوں سے مرصع تھیں اور حجروں کا اسباب نہایت باریک تر شا ہوا اور پاکیزہ تھا۔ ارا قسطین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکانات مصریوں کے مکانات سے مشابہ تھے اور ان میں لکڑی کا کام بھی مثل مصری مکانوں میں تھا۔

عرب کے کل مورخین یمن کی تعریف میں یک زبان ہیں۔ حوالی مارب کے بیان میں مسعودی لکھتا ہے کہ ہر طرف خوبصورت عمارتیں، سایہ دار درخت، بڑی نہریں اور آبشاریں نظر آتی تھیں۔ اس ملک کی وسعت اس قدر تھی کہ اس کے طول و عرض کو ایک اچھا سوار ایک ماہ کی مدت میں قطع کرتا تھا۔۔۔۔ کثرت سے راستوں کے دورویہ درخت تھے ان کا سایہ کبھی ختم نہ ہوتا، رعایا کو ملک سے ہر قسم کا لطف زندگی حاصل

تھا۔ زمین سیر حاصل، ہوا صاف آسمان شفاف، پانی کے چشمے بکثرت، حکومت عالی شان، سلطنت مستقیم اور قوی، ملک میں نہایت ترقی، یہ وہ نعمتیں تھیں جن سے یمن کا چین و آرام ضرب المثل ہو گیا تھا۔ یہاں کے باشندوں کی عالی حوصلگی اور ان کا فطرتی اخلاق اور ہر ایک وارد و صادر کے ساتھ ان کی مہمان نوازی مشہور زمانہ تھی ملک کی یہ اقبال مندی اس وقت تک قائم رہی جب تک مرضی باری تعالیٰ تھی جس بادشاہ نے مقابلہ کیا وہ زیر ہوا، جس ظالم نے خودکشی کی شکست پائی۔ کل اقطولن زیر حکومت تھے اور کل اقام ان کی طابع فرمان، غرض یمن کا ملک سرتاج عالم تھا۔ یمن کی اس وادی کا باعث عرم مارب معلوم ہوتا ہے مورخین عرب کہتے ہیں کہ اس بند کو بلقیس نے بنایا تھا جو حضرت سلیمانؑ کے سامنے آئی تھی۔ یہ بند ایک لمبی گھاٹی کے قریب بنایا گیا تھا، چاروں طرف سے پہاڑوں کا پانی آ کر اس گھاٹی میں سے ندی کی طرح بہتا تھا اور بند نے اس پانی کو روک کر ایک بڑا تالاب سا بنا دیا تھا جس سے تمام ملک میں آب پاشی کا نظام جاری تھا۔

قدیم زمانہ میں جغرافیائی اور طبعی اعتبار سے ملک عرب چار حصوں میں منقسم تھا۔ عرب عراق اور عرب شام اس میں شامل نہیں تھے۔

۱۔ تہامہ ۲۔ نجد ۳۔ حجاز ۴۔ یمن

عرب کا مغربی حصہ پست اور گرم ہے اس لیے اسے تہامہ کہتے ہیں۔ مشرقی حصہ کی سطح بلند ہے اس لیے نجد (بلند) کہلاتا ہے۔ تہامہ اور نجد کے درمیان میں پہاڑ بھی شامل ہیں۔ حجاز یعنی درمیانی حصہ ہے۔

نجد: یہ وسط کا سرسبز شاداب اور عمدہ ترین والا سطح مرتفع ہے تین اطراف سے بے آب و گیاہ صحراؤں سے گھرا ہوا تھا۔ وادیوں اور پہاڑوں کے درمیان زراعت ہوتی ہے۔ چراگاہیں بکثرت ہیں۔ یہاں کے گھوڑے اونٹ خوبصورت ہیں پھولوں کی بہتات ہے۔ قدیم عہد میں یا کندہ خاندان کی حکومت تھی جس کا آخر بادشاہ الامراء القیس تھا۔

حجاز: جابجا ریت کے ٹیلے ہیں مگر کہیں یہ سرسبز بھی ہیں۔ ریگستانی علاقوں میں قدرتی چشمے ہیں جن سے نخلستان آباد ہیں اور ساحلی علاقہ سرسبز اور آباد ہے۔ باغ کھیتیاں اور کہیں جنگل بھی ہیں حجاز کے بڑے ساحلی شہر پر بندرگاہ جدہ ہے۔

یمن میں صنعاء، عدن، جرش، حضر موت، بلاد الاحقاف اور حجاز میں مدینہ، مکہ، طائف اور ینبوع اور نجد میں یمامہ، فید شمالی عرب میں دومۃ الجندل، وادی خیبر وادی القریٰ مذکورہ شہروں کے علاوہ دیگر شہروں میں لوگ متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ جھونپڑیوں کی بجائے محلوں میں رہتے تھے۔ اس زمانہ میں کئی محل ضرب

المثل تھے مثلاً خوانق اور سدیر۔ عورتیں فرش زمین پر نہیں چلتی تھیں بلکہ قالینوں پر چلتی تھیں۔ گھر اچھے اور ان کی آرائش اعلیٰ اور عمدہ تھی۔ مخملی گدے، تکیے، پھولدار پردے مسہریاں اور دروازوں پر نقش ونگار اگرچہ عرب میں کافی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے اور ایک کثیر تعداد تہذیب کے حامل ہی نہ تھے بلکہ دیگر ممالک کے مہذب اور متمدن لوگوں کی ہم سری اور برتری کے دعویدار تھے۔ (خاتم النبیین: ۳۳)

یمن کی ترقی کا یہ حال تھا کہ وہاں کے حکمرانوں نے تمام ایران کو فتح کر لیا۔ عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار کی موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجہ کا تمدن تھا۔ مولانا شبلی تھیاچر کے آرٹیکل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جنوبی عربستان میں جہاں حضرت موسیٰؑ سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا اور قلعوں اور پناہ گاہوں کے آثار موجود ہیں۔ صناعا کے قریب ایک قلعہ تھا جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ بلحاظ مجموعی عرب تہذیب وتمدن سے خالی نہیں تھا۔ آجکل بھی دیکھیں تو وہ ممالک جو تہذیب وتمدن کا گڑھ سمجھے جاتے ہیں وہاں کی دیہی آبادی میں وہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں جو شہری علاقوں کو دستیاب ہوتی ہیں۔ لہٰذا دیہی آبادی یا دور کی رہائش گاہوں میں چند چیزوں کے نہ ہونے سے کسی ملک کو تہذیب وتمدن سے خالی اور عاری سمجھنا درست نہیں ہے۔

اعتراض نمبر۱۴

بنو ہاشم کا قبیلہ دوسرے قریش قبائل کے ہم پلہ نہ تھا۔ ''واٹ'' قریش کے مختلف قبائل کی عسکری اور سماجی حیثیت کے لیے ایک پیمانہ وضع کرتا ہے جو بہت عجیب ہے۔ جنگ احد میں شریک عورتیں کفار کے ساتھ میدان جنگ میں گئیں اس سے اندازہ لگاتا ہے کہ قریش کا کونسا قبیلہ زیادہ طاقت ور تھا اور اس قبیلے کا سردار کون تھا؟ مستشرق واٹ کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے واقدی نے ان عورتوں کی جو فہرست دی ہے جن کو قریش مکہ احد کی مہم میں لشکر کے ساتھ لے گئے تھے۔ دو کے علاوہ یہ سب عورتیں قبائل کے سرداروں کی بیویاں تھیں۔ یہ درست ہے کہ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ دونوں دو دو بیویاں ساتھ لے گئے تھے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے دھڑوں کے سردار تھے، بظاہر عکرمہ بن ابوجہل ابھی صفوان کا ہم پلہ نہ تھا۔

۲۔ مزید واٹ بنو ہاشم کے افراد کو غریب اور دوسرے درجہ کا شہری ثابت کرنے کے لیے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے بارے میں یوں کہتا ہے۔ اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے ''ایک چھوٹے پیمانے کا بنک کار ہونے اور حاجیوں کو پانی پلانے کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس میں شک نہیں کہ مکہ

کے معاملات میں عباس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ وہاں پرسکون زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔'' (ضیاء النبی۔ ۷۔ ۱۹۹)

جواب: بنو ہاشم عربوں کی قابل فخر چیزوں میں کسی سے کم نہ تھے۔ وہ سرمایہ دار ہی نہ تھے بلکہ سخاوت میں دھنی تھے۔ جرات و بہادری کا یہ عالم کہ بنو ہاشم کے بہادر جوان حضرت حمزہؓ کی کمان ابوجہل کا سر پھاڑ دیتی ہے اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ابوجہل نے روک دیا۔

عربوں میں رواج تھا کہ جنگ میں بھی حفظ مراتب کا خیال رکھتے تھے جنگ میں مبارزت طلبی کرتے تھے اس جوان سے جنگ کرتے جوان کا ہم پلہ ہوتا۔ عبیدہؓ، حمزہؓ اور علیؓ جب شیبہ، عتبہ اور ولید کے مقابل آئے تو عتبہ نے پوچھا کہ تم کون کون ہو کیونکہ انہوں نے چہرے ڈھانپے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو عتبہ بولا! تم واقعی ہمارے مد مقابل آنے کے قابل ہو۔ عتبہ، شیبہ اور ولید تو بنو ہاشم کو اپنا ہم پلہ سمجھتے ہیں مگر ''واٹ'' جن کا پلہ بھاری سمجھتا ہے وہ تو بنو ہاشم کو اپنا ہم پلہ سمجھتے ہیں لیکن نہ جانے واٹ کو بنو ہاشم کا دوسرے قبائل کا ہم پلہ ہونا نظر کیوں نہیں آتا؟

ہجرت کے موقع پر کسی ایک قبیلہ کو جرات نہ ہوئی کہ پیغمبر کے مقابلہ میں آتا پھر انہوں نے قبائل کے ایک ایک جوان کو شرکت کے لیے لیا اور در نبوت پر نبی مکرم ﷺ کے باہر آنے کے منتظر رہے۔ تمام قبائل کا یہ متفقہ فیصلہ تھا اس لیے کہ کوئی بھی قبیلہ تنہا و یکہ بنو ہاشم قبیلہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا پھر بھی مستشرق واٹ بنو ہاشم کو دیگر قبائل کے ہم پلہ نہ سمجھیں تو ان کی ہٹ دھرمی اور نفرت کا نتیجہ ہے۔

ابوسفیان نے قیصر روم کے دربار میں نبی مکرم ﷺ کے خاندان کی سیادت و قیادت کی تعریف کی تھی وہ تو ابوجہل بھی اقرار کرتا ہے۔ مشرکین مکہ چھپ چھپ کر قرآن مجید کی آیات کی تلاوت سنتے تھے جن میں ابوجہل بھی ہوتا تھا۔ اخنس بن شریک نے ابوجہل سے پوچھا: اے ابوالحکم! تم نے محمد ﷺ کی زبان سے جو کچھ سنا اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ابوجہل نے کہا، میں نے خاک سنا۔ ہمارا اور عبد المناف کا جھگڑا اس بات پر تھا کہ سردار کون ہے؟ اس شرف کے حصول کے لیے انہوں نے اپنا دسترخوان وسیع کیا اور ہر غریب مسکین کو کھانا کھلایا اور ہم نے بھی ان سے بازی لے جانے میں دسترخوان کو بڑھایا اور ہر غریب مسکین کی ضیافت کا انتظام کیا۔ انہوں نے لوگوں کے بوجھ اٹھائے، ہم نے بھی بوجھ اٹھائے، انہوں نے فیاضی سے مانگنے والوں کی جھولیاں بھر دیں اور ہم نے بھی ان سے سبقت لے جانے میں اپنی سخاوت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور جب ہم مقابلے کے دو گھوڑوں کی مانند ہو گئے تو انہوں نے اچانک اعلان کر دیا کہ ہم

میں سے ایک شخص کو نبوت ملی ہے اور اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے' ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے تھے؟ بخدا ہم تو اس پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔(ضیاء النبی۔ ۷۔ ۲۰۶)

ابوجہل کی رائے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ میں شرف وعزت کا معیار سخاوت جرات غریبوں کی مدد اور مسکینوں کی جھولیاں بھرنا وغیرہ تھا۔ (۲) بنو ہاشم کسی بھی میدان میں دیگر قبائل سے پیچھے نہ تھے بلکہ ابوجہل تو بنو ہاشم کے ہم پلہ بننے کی کوشش میں سرگردان نظر آتا ہے اور وہی کرتا رہا جو بنی ہاشم کرتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت بنو ہاشم کے قبیلہ کو عطا کی تو دیگر قبائل کی برابری نہ رہی اور ان تمام قبائل سے یہ قبیلہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے بازی لے گیا۔ مستشرق نے یہ فرض کر کے کیوں تسلیم کر لیا ہے کہ بنو ہاشم ایک کمزور قبیلہ تھا اور اس کے مقابل میں بنو مخزوم وغیرہ طاقت ور تھے۔؟ سچ تو یہ ہے کہ بنو ہاشم تمام قبائل پر فوقیت رکھتا تھا۔ قصی کے بعد قریش میں کوئی سردار نہیں ہوا جسے ہاشم اور عبدالمطلب کا ہم پلہ ٹھہرایا جائے۔ واٹ کی بوکھلاہٹ کا عالم یہ ہے کہ اپنے بیان کی خود تردید کرتا ہے۔''اعلیٰ طبقہ کی اصطلاحیں مکی معاشرہ پر منطبق نہیں ہوسکتیں یا کم از کم اس معاشرہ کے ان عناصر کے لیے موزوں نہیں جو زیادہ تر ہمارا موضوع بحث ہیں۔ مرکز کے قریش اور مضافات کے قریش میں نمایاں فرق تھا لیکن وہ تمام لوگ جن کا مصادر میں ذکر ہے تقریباً وہ تمام مرکز کے قریش سے تعلق رکھتے تھے خواہ ان کا تعلق محمد ﷺ کے دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے' وہاں غریب وامیر' اعلیٰ وادنیٰ کا کوئی امتیاز نہ تھا جس کو اس امتیاز کے قرار دیا جاسکے جو' ایک مسلم اور ایک کافر میں تھا۔ مرکز قریش کے تمام قبائل ایک نسل سے تھے۔(ضیاء النبی۔ ۷۔ ۲۰۷)

حضرت ہاشم بڑے رتبہ ومقام کے حامل تھے۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے قیصر' غسان کے شہزادوں اور نجاشی کے حدود سلطنت میں قریش کے تجارتی مال کو ٹیکس سے مستثنیٰ کرایا تھا۔ عرب میں راستے غیر محفوظ تھے جس وجہ سے انہوں نے قبائل کا دورہ کر کے تجارتی قافلوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ یہ وہی ہیں جو حجاج کرام کی بڑی فیاضی اور دریا دلی سے خدمت کرتے تھے۔ چرمی حوضوں میں پانی بھر کر سبیل لگواتے۔ یہ وہی ہیں جن کے ہاں عبدالمطلب پیدا ہوئے' ان کا اصل نام شیبہ تھا۔ کعبہ کے متولی ہونے کے سبب ہاشم کی پورا عرب عزت کرتا تھا۔ واٹ کو ہم پلہ ہونے کا کونسا معیار درکار ہے اس کے ہمنوا مشرکین مکہ ہم پلہ تو کیا بنو ہاشم کی برابری کے مقابل پورا نہ اترنے کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر نہ جانے واٹ کو یہ تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے۔

اعتراض نمبر ۱۴ کا دوسرا جز

مزید واٹ بنو ہاشم کے افراد کو غریب اور دوسرے درجہ کا شہری ثابت کرنے کے لیے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے بارے میں یوں کہتا ہے۔(اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے)"ایک چھوٹے پیمانے کا بنک کار ہونے اور حاجیوں کو پانی پلانے کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس میں شک نہیں کہ مکہ کے معاملات میں عباس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ وہاں پرسکون زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔"(ضیاالنبی۔۷۔۱۹۹)

اول تو یہ ہے کہ کسی ایک فرد کی کمزوری سارے قبیلہ کی کمزوری سمجھنا عقلمندی نہیں۔جس طرح ابو طالب کی مالی حالت قدرے کمزور تھی پھر بھی اس کو سنبھالا دینے کے لیے قبیلہ کے لوگ چپ سادھ کے بیٹھے نہیں تھے بلکہ ایک دن محسن انسانیت ﷺ اپنے چچا عباس کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ ابو طالب کے بچوں کی کفالت کا ذمہ ہم اٹھائیں۔آپ کے چچا نے اس بات پر اتفاق کیا اور ابو طالب کے ہاں گئے' انھیں اپنا مقصد بتایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے بچوں کا بوجھ آپ سے کچھ ہلکا کریں۔ابو طالب نے جواب دیا کہ عقیل میرے پاس رہنے دو، باقی جو چاہو کر لو۔آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کی اور عباسؓ نے جعفرؓ کی کفالت کا بیڑا اٹھایا۔حضرت علیؓ اعلان نبوت تک زیر کفالت رہے جب کہ حضرت جعفرؓ اس وقت تک کفالت میں رہے جب تک ان کو کفالت کی حاجت نہ رہی۔(امیر المومنین حضرت علی۔۵۰)

آپ ﷺ نے ابو طالب کی مالی کمزوری کے باعث ان کی اعانت فرمائی بلکہ کفالت کا وہ قرض اتار دیا جو آپ ﷺ کے چچا نے آپ ﷺ کی کفالت کی تھی۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے"میں نے ہر ایک کا احسان اتار دیا ہے سوائے ابوبکر صدیقؓ کے احسان کے' ان کا احسان میرے ذمہ باقی ہے"۔(تاریخ الخلفاء)

۲: حضرت عباسؓ زمانہ جاہلیت میں بھی بہت بڑے رئیس تھے۔سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عباسؓ بن عبدالمطلب تمام قریش سے زیادہ سخی ہیں اور صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔یہ وہی عباس ہیں جنھوں نے اپنے دو بھائیوں ابو طالب اور حارث کے بیٹوں عقیل اور نوفل کا فدیہ اپنے مال سے ادا کر کے آزاد کروایا تھا جو جنگ بدر میں قیدی ہوئے تھے۔ہر فرد کا فدیہ ستر اوقیہ تھا، ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے، اس طرح رقم ۵۶۰۰ درہم بنتی ہے۔ابو طالب کے بعد حضرت عباس آب زمزم کے متولی مقرر ہوئے اور مسجد حرام کی تعمیر بھی آپ کے ذمہ تھی۔نشیلہ بنت خباب بن کلاب وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے کعبۃ اللہ پر ریشمی پردے لٹکائے اور مختلف اقسام کے قیمتی کپڑوں سے پردے بنا کر بیت اللہ کو مزین کیا، وہ سیدنا عباس کی والدہ ماجدہ تھیں(تفہیم البخاری۔۵۔۲۵۶)

۳: مستشرقین کو تو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ عباس زمانہ جاہلیت میں سودی کاروبار کرتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا'' جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیئے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے فرد عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں''۔قابل غور بات یہ ہے کہ کیا سود رقم ادھار دیئے بغیر حاصل ہوسکتا ہے؟اس کا جواب منفی میں ہے۔اگر رقم دے کر سود لیا جاتا ہے تو ان کے پاس اتنی وافر رقم موجود تھی جو اپنے اخراجات نکال کے باقی رقم افراد کو سود پر دیتے تھے۔

۴:عکاظ کے بازار میں لاکھوں کا کاروبار ہوتا تھا،جس میں قریش کے نامور اپنا کاروبار کرتے تھے۔بنی مخزوم والوں میں ولید بن مغیرہ اور ہشام بڑے سرمایہ کار بن چکے تھے۔بنوامیہ کے ابوسفیان بن حرب اور عفان بن ابوالعاص کے ہاں دولت کی خوب ریل پیل تھی۔عبدشمس کے عتبہ وشیبہ لکھ پتی تھے۔بنی تیم کے ابوقحافہ اوران کے بیٹے ابوبکر کا کاروبار بھی کسی سے کم نہ تھا،اسی بازار میں حکیم بن حزام کی دکان بھی تھی۔چچاؤں میں حمزہؓ،عباسؓ اور ابولہب بھی لکھ پتی بن چکے تھے۔دولت ان پر ہُن کی طرح برس رہی تھی۔(اعلان نبوت سے پہلے۔۵۰۰)

نہ جانے واٹ کس بنیاد پر عباس کو چھوٹا بنک کار کہتے ہیں؟نیز یہ کہا کہ مکہ کے معاملات میں ان کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی اگر چہ وہ حاجیوں کو پانی پلانے کے منصب پر فائز تھے۔کیا اسے یہ خبر نہیں کہ دورونزدیک سے آنے والے حاجیوں سے جان پہچان اور عزت تھی۔حرم کی سیادت کے سبب مشہور تھے۔حرم کے متولی ہونے کا اعزاز انہی کو حاصل تھا اسی وجہ سے پورے عرب میں ان کی عزت وشہرت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔واٹ کا یہ کہنا کہ وہ پرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے تھے تو واٹ کو بتانا چاہیے کہ کون سے عوامل ان کی زندگی کو بے سکون بنائے ہوئے تھے؟مالی بدحالی تھی یا مکہ اور اس کے مضافات میں مخالفوں نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا یا ان کے اپنے خاندان والوں سے عہدوں پر یا دیگر کچھ سماجی اختلاف تھے،جس کی وجہ سے ان کی زندگی اجیرن بنی ہوئی تھی۔ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور واٹ مفروضوں کی آڑ میں الزامات دھرے جاتا ہے جن کا کوئی جواز نہیں بنتا ہے۔

حضرت عبدالمطلب

انکا نام عامر اور لقب شیبہ تھا۔اپنے والد کے انتقال کے بعد ننھیال کے ہاں مدینہ میں رہے۔ان کے چچا مطلب انھیں مکہ لائے اور بیٹوں سے بڑھ کر نازونعم سے ان کی پرورش کی۔اس احسان کے سبب وہ بھی ساری عمر''عبدالمطلب''یعنی مطلب کا غلام کہلاتے رہے۔یہ وہ عظیم ہستی ہیں جنھوں نے چاہ زمزم کو جسے عمرو بن حرث جرہمی نے بند کر دیا تھا،نکالا۔وہ شریف النفس اور عبادت گزار تھے۔غار حرا میں کھانا پانی ساتھ لے جاتے اور کئی دن تک خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔رمضان میں اکثر وہاں اعتکاف

کیا کرتے تھے۔ مکہ والوں پر جب کبھی کوئی آفت آتی تو اہل مکہ عبدالمطلب کو لے کر پہاڑ پر چڑھ جاتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے وسیلہ سے دعا مانگتے جو قبول ہو جاتی تھی۔

عبدالمطلب کی عام نصیحت یہ ہوتی تھی ''ظلم و بغاوت نہ کرو اور مکارم اخلاق حاصل کرو'' لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کرتے اور چور کا ہاتھ کاٹ ڈالتے تھے۔ آپ کعبہ کے متولی تھے۔ آپ کے زمانہ میں اصحاب فیل کا واقعہ پیش آیا۔ ۱۲۰ برس کی عمر میں وفات پائی (سیرت المصطفیٰ جان رحمت۔ ا۔ ۳۱)

اصحاب فیل کا قصہ

پیارے رسول ﷺ کی پیدائش سے پچاس رات یا پچپن دن پہلے یمن کا گورنر ابرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر بیت اللہ کو ڈھانے کے لیے حملہ آور ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے یمن کے دارالخلافہ صنعاء میں ایک شاندار گرجا گھر بنایا۔ اگرچہ گرجا کی عمارت کی تزئین میں اپنی صلاحیتیں وقف کر کے نمونہ روزگار بنا دیا لیکن تمام خوبیوں کے باوجود اس میں دعائے خلیل ''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا'' شامل نہ ہو سکی اور خالق کائنات کی ضمانت امن ''وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِناً'' اس گرجا گھر کو حاصل نہ ہو سکی اور حجر اسود جو عطائے الٰہی تھا اس کی زینت نہ بن سکا۔

بخال و خط چوں بتاں حسن خود بیارآیند
ولی بناز و کرشمہ بیار مانہ رسند
ہزار سرو بہ بستاں کشد قد موزوں
ولی براہ و روش با نگار ما نہ رسند

اس کی خواہش تھی کہ عرب کے لوگ بجائے خانہ کعبہ کے یمن میں آ کر اس گرجا گھر کا حج کیا کریں۔ مکہ والوں کو یہ بھنک پڑی تو قبیلہ کنانہ کے ایک شخص نے وہاں جا کر گرجا گھر میں پاخانہ کر دیا۔ ابرہہ کو یہ خبر ملی تو جل بھن کر کباب ہو گیا۔ اس نے مکہ پر چڑھائی کر دی۔ لشکریوں نے مکہ والوں کے اونٹ اور دوسرے مویشی ہتھیا لیے، اس میں دو سو یا ایک روایت کے مطابق چار سو اونٹ آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے تھے۔ عبدالمطلب کو ابرہہ کی لشکرکشی کا بڑا دکھ ہوا۔ وہ ابرہہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس نے تخت شاہی سے اتر کر آپ کا استقبال کیا اور اپنے برابر بٹھایا اور پوچھا۔۔ کیسے آئے ہو؟ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ میرے اونٹ تمھارے لشکری بھگا لائے ہیں۔ وہ مجھے واپس دیئے جائیں۔ ابرہہ نے کہا! میں تو تمہارے کعبہ کو ڈھانے آیا ہوں اور اس بارے میں تم نے کچھ نہیں کہا۔ عبدالمطلب نے کہا مجھے تو اپنے اونٹوں کی فکر ہے، کعبہ میرا گھر نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا گھر ہے۔ وہ خود اپنے گھر کو بچا لے گا، مجھے کعبہ کی ذرا فکر نہیں ہے۔

اعتراض نمبر ۱۵

بعض کہتے ہیں کہ حضرت عبد المطلب نے ابرہہ سے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر کعبہ کو بچانے کی فکر دامن گیر نہ ہوئی اور تقدیر کے حوالے کر دیا۔ ابرہہ نے پوچھا! اے حضرت عبد المطلب ! کیا تمہاری نگاہ میں کعبہ کے مقابلہ میں اونٹوں کی اہمیت زیادہ ہے کیونکہ تمہیں اتنا تو ضرور معلوم ہو چکا ہو گا کہ میں کعبہ کو گرانے آیا ہوں اس لیے تمہیں اولاً اس کے بچاؤ کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ عبد المطلب نے جواب دیا ''میں بلاشبہ اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے جو اس گھر کا بچاؤ کرے گا، ابرہہ نے جواباً کہا بیت اللہ کو کوئی نہیں بچا سکتا، آپؐ کے دادا جان نے جواب دیا اب تم جانو اور تمھارا کام۔ حضرت عبد المطلب کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اپنی خیر منائی، اپنے اونٹ لیے اور کعبہ کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ گویا ابرہہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

جواب: خانہ کعبہ عربوں کی نگاہ میں دنیا کی عزیز ترین متاع ہے۔ ان کی جان جاتی ہے تو جائے لیکن اس پر آنچ نہیں آنے دیتے، وہ زبان سے بھی اور ہاتھ سے بھی دوسروں کو سمجھانا جانتے ہیں۔ جوان کے سامنے آجائے اس سے کنی نہیں کتراتے بلکہ اڑ جاتے ہیں اور لڑ پڑتے ہیں۔ آپؐ کے دادا جان نے ابرہہ کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیا، وہ یوں کہ ان کے دو جملوں کا مطلب یہ ہے جسے سمجھنے میں بھی اسے غلط فہمی ہوئی۔ ابرہہ میں اونٹوں کا مالک ہوں، مجھے ان کا اتنا خیال ہے کہ میں بلا جھجک تیرے پاس چلا آیا۔ اس گھر کا بھی ایک مالک ہے۔ کیا اسے اس کی حرمت کا پاس نہ ہوگا؟ کعبہ کے بچاؤ سے انہوں نے دستبرداری نہیں کی بلکہ یہ معاملہ اس گھر کے مالک یعنی خدا کے سپرد کر دیا۔ اس بات سے عبد المطلب کے اللہ تعالیٰ پر یقین اور کامل ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔ اس پختہ یقین کا مظہر یہ جملہ ہے کہ اس کا بھی ایک مالک ہے، اسے اپنے بیت کا پاس ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کعبہ کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر پائے گا، اس کا ایک دو دن میں لگ پتا جائے گا۔ ابرہہ کا کہنا کہ مجھ سے کوئی بچا نہ سکے گا؟ اس پر عبد المطلب نے فرمایا اب تو جانے اور تیرا کام۔ یعنی جو تو نے ٹھان رکھی ہے وہ کر کے دیکھ پھر دیکھتے ہیں اس گھر کا مالک تیرے ساتھ کیا کرتا ہے۔ اب تمام معاملہ تمھارے ہاتھ میں ہے کہ حملہ کیے بغیر واپسی کی راہ لیتا ہے یا حملہ کرتا ہے اور اگر حملہ کرنے کا سوچا ہے تو یہ تیرا کام ہے، اس کا انجام تو دیکھ لے گا۔

بعض کہتے ہیں کہ عبد المطلب نے محسوس کیا کہ عرب ابرہہ کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے ابرہہ کے لشکر کے سامنے نہ آیا جائے؟

یہ درست بات نہیں بلکہ آپ نے عربوں کا خون بہانے سے گریز کیا کیونکہ عربوں کا مزاج نہایت تندو تیز ہے، ان کا کچھ بچے نہ بچے وہ اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹتے اور لڑنے مرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اس کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ خواجہ عبدالمطلب نے صرف اور صرف خدا کی ذات پر اعتبار کیا اور عربوں کو فوج کا سامنا کرنے سے باز رکھا۔ اس بات کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے ''جب حضرت عبدالمطلب اپنے اونٹ واپس لے آئے تو چند آدمیوں کے ہمراہ خانہ کعبہ کے دروازہ کا حلقہ پکڑ کر دعا کی ''اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما، ایسا نہ ہو کہ کل کو ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر پر غالب آ جائے، مگر ہمارے قبلہ کو ان پر چھوڑنے لگا ہے، تو حکم کر جو چاہتا ہے''۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ آپ کے دادا جان کی دعا رنگ لائی۔ جو کہا جو مانگا سب ملا اور ابرہہ کا لشکر تباہ و برباد ہو گیا اور رہتی دنیا تک کے لیے نشانِ عبرت بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجے جو منہ اور پنجوں میں کنکر لیے ہوئے تھے۔ بس کیا تھا، جس کے وہ کنکر لگتے وہ ڈھیر ہو جاتا۔ جیسے کسی نے کہا ہے۔

اگر محفوظ رکھنا چاہے اپنے گھر کو دشمن سے
ابابیلوں کے لشکر میں وہ کنکر بانٹ دیتا ہے

اہم نکتہ: مولانا مودودی کہتے ہیں کہ ساٹھ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرنا اور آس پاس کے عرب قبائل کے بس کا روگ نہ تھا، وہ تو غزوہ احزاب میں بڑی مشکل سے دس بارہ ہزار کے قریب فوج جمع کر سکے تھے۔ مولانا صاحب کو سہو ہوا ہے۔ قابلِ غور بات ہے کہ پہلے غزوہ بدر میں ۳۱۳ کے مقابلہ میں ایک ہزار، غزوہ احد میں ۷۰۰ کے مقابلہ میں تین ہزار سے زائد اور غزوہ خندق میں تین ہزار کے مقابلہ میں دس یا بارہ ہزار فوج تھی۔ بظاہر کفار کی تعداد اور افرادی قوت کے حساب سے مسلمانوں کا لشکرِ کفار سے لڑنا بہت مشکل تھا لیکن جب رحمت خداوندی شامل حال ہو اور ایمانی جذبہ بھی عروج پر ہو تو پھر تعداد آڑے نہیں آتی۔ اور جو تعداد کا بھروسا رکھتے ہیں انہیں کثیر تعداد کے باوجود فتح نصیب نہیں ہوتی۔

(۲) ابن اسحٰق نے کہا جب تبع نے یمن کی طرف کوچ کا قصد کیا تو اس نے ارادہ کیا کہ رکن اسود کا پتھر اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جائے۔ خویلد بنی اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی کے ہاں قریشی اکٹھے ہوئے اور انہوں نے خویلد سے کہا کہ اگر وہ ہمارا پتھر لے گیا تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟ اس نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ قریش نے کہا: کہ تبع چاہتا ہے کہ حجر اسود کو اپنے علاقہ میں لے جائے۔ خویلد نے کہا: ہمارے لیے تو اس سے موت بہتر ہے پھر اس نے تلوار نکالی، وہ باہر نکلا اور دیگر قریشی بھی اپنی تلواریں سونت کر اس کے ہمراہ نکل

کھڑے ہوئے اور تبع کے پاس گئے اور اس سے پوچھا: اے تبع! رکن اسود کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: میرا ارادہ ہے کہ میں اسے اپنی قوم کے پاس لے جاؤں۔ قریش نے جواب دیا: موت تو اس کے قریب تر ہے پھر وہ وہاں سے چل کر رکن اسود کے پاس کھڑے ہو گئے اور تبع کو اس کے ارداہ سے باز رکھا۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے، پھر تبع نے اپنے لشکریوں کے ہمراہ یمن کا رخ کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ یہ وہی عرب ہیں جن کے بارے میں مولانا صاحب کہتے ہیں کہ ابرہہ کے لشکر سے جنگ کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

اہم نکتہ: سورہ فیل میں طیراً ابابیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اردو زبان میں ابابیل ایک پرندے کو کہتے ہیں جس کی چونچ سیاہ اور سینہ سفید ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ابرہہ کی فوج پر ابابیلوں سے پتھر پھینکوائے گئے تھے جنہوں نے ابرہہ کی فوج کا بھرکس نکال دیا جیسا کہ عبدالمصطفیٰ اعظمی (سیرت مصطفیٰ۔۳۳) نے ''ابابیلوں کا حملہ'' عنوان کے تحت لکھا ہے ''اس حال میں قہر الٰہی ابابیلوں کی شکل میں نمودار ہوا''۔ لیکن عربی زبان کی لغت میں ابابیل کے معنی متفرق گروہ جو پے در پے مختلف سمتوں سے آئیں۔ عکرمہ اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بحر احمر کی طرف سے آئے تھے۔ سعید بن جبیر اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے نہ بعد میں۔ اس عربی لفظ ابابیل کو اردو کے ابابیل (پرندے) سمجھ لیا گیا ہے اور اس قدر عام استعمال ہونے لگا ہے کہ اسے غلطی سمجھا ہی نہیں جاتا میں نے پیچھے جان بوجھ کر ایک شعر لکھا ہے۔ وہ یہ ہے۔

اگر محفوظ رکھنا چاہے اپنے گھر کو دشمن سے
ابابیلوں کے لشکر میں وہ کنکر بانٹ دیتا ہے

تا کہ اس غلطی کو منظر عام پر لایا جائے اور قاری کو سمجھنے میں آسانی ہو جبکہ اس کا استعمال قصہ اصحاب فیل سے جوڑنا کہ یہی اردو والا ابابیل ہے بالکل غلط ہے۔

اعتراض نمبر ۱۶

منٹگمری واٹ کہتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر میں طاعون کی وبا پھیلی جس نے سب کا صفایا کر دیا۔

(۲) بعض دیگر علماء کہتے ہیں محمد بن اسحٰق عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ چیچک کا مرض تھا جو آناً فاناً پھیلا جو ابرہہ سمیت سارا لشکر تباہ ہو گیا۔

(۳) ابن سعد کہتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر میں چیچک پھوٹ پڑی تھی۔

۴۔ ابرہہ کا لشکر آفات سماوی کی نظر ہو گیا۔

جو لوگ چیچک، طاعون کا کرشمہ قرار دیتے ہیں ان کے اس خیال کی تائید سورہ فیل سے نہیں ہوتی، اس سورہ میں ایسا کوئی لفظ نہیں آیا جس کے معانی چیچک اور طاعون کے لیے جائیں۔ مستشرقین بات کا بتنگڑ بنانے میں بہت طاق ہیں۔ کہیں سے کچھ ملا تو اس میں اپنی طرف سے مرچ مصالحہ لگا کر اس طرح پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا اعتراض سچا ثابت ہو جائے۔ واٹ کہتا ہے کہ لشکر میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی جس نے لشکر کا صفایا کر دیا۔ یہ اس کی اپنی یا مستعار شدہ اختراع ہے کیونکہ طاعون ایسی بیماری ہے کہ شہروں کے شہر اور بستیوں کی بستیاں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے جس سے شہر اور بستیاں اجاڑ ہو جاتی ہیں کوئی قسمت والا ہی اس سے بچ پاتا ہے پھر یہ وبا پھیلتی ہے' ایک جگہ ڈیرے ڈالے نہیں رہتی جنگل کی آگ کی طرح ادھر اُدھر پھیلتی جاتی ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ یہ وبا پھوٹی اور ابرہہ اور اس کے لشکر کا صفایا کر گئی لیکن مکہ اور اس کے مضافات میں ایک فرد کو اس وبا سے کوئی نقصان نہ ہوا حتّٰی کہ ایک فرد بھی ہلاک نہ ہوا۔

۲۔ چیچک اور طاعون کی وبا پھیلی جس سے لشکر ہلاک ہوا' اس کا رد درج ذیل روایات سے بھی ہوتا ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کنکری گرتی اسے سخت کھجلی لاحق ہو جاتی اور کھجاتے ہی جلد پھٹ جاتی اور گوشت جھڑنے لگتا۔ ابن عباس کی ایک اور روایت میں ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔'' چیچک اور نہ ہی طاعون کی وبا پھوٹی بلکہ یہ تو کنکروں کے لگنے سے کھجلی ہوتی' جلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا' یا گوشت اور خون کے بہنے سے ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ مسلم مورخین اور مستشرقین کو اس بات سے غلط فہمی ہوئی ہو کہ اس سال پہلی بار عرب میں خسرہ اور چیچک کی وبا پھوٹی اور پہلی مرتبہ کچھ پودے دیکھے گئے۔ ابن ہشام لکھتا ہے ''ابن اسحٰق نے کہا' مجھ سے یعقوب بن عتبہ نے بیان کیا کہ ان سے کسی نے کہا کہ سرزمین عرب میں خسرہ اور چیچک اسی سال پہلی بار نظر آئی اور اس سال سے پہلے عرب میں بدمزہ اور ناگوار پودے اسپند' اندرائن اور آک قسم کے نہیں دیکھے گئے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ابرہہ کے حملہ کے وقت وبا پھوٹی اور پودے دیکھنے میں آئے بلکہ اسی سال کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر کے بعد اسی سال میں یہ وبا پھوٹی ہو گی' یا رلوگوں نے اسے اصحاب فیل کے قصہ سے جوڑ دیا جبکہ اصحاب فیل کا واقعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز ہے۔ اور دشمنان خدا کے لیے سخت عذاب ہے۔

اعتراض نمبر ۱۷

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ o اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ o وَّ اَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ o تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ o فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ o ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ در جھنڈ بھیج دیئے' جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے پھر ان کا

حال یہ کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھس۔ (القریش، پارہ ۳۰)

جواب: اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جن علماء نے پرندوں اور سنگریزوں کا فی نفسہ انکار کیا گیا وہ غلطی پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد طائر سے فقط تیز ہوا (آندھی) ہے اور حجارہ سے مراد مٹی کے ذرات ہیں جن میں چیچک کے جراثیم تھے لیکن یہ معنی لغت عربی سے مطابقت نہیں رکھتے یعنی لغت میں ابابیل کے معنی ہے ''پرندوں کے متفرق گروہ''۔ مجازی معنوں میں بھی اس کا استعمال بعید از قیاس ہے اور یہ ہرگز درست نہیں کہ ان کو اس طرح کے مجازی معنوں میں لیا جائے جب کہ اللہ تعالیٰ ان کے استعمال پر قدرت رکھتا ہے اسی طرح مٹی کے ذرات کو عربی لغت میں کہیں بھی ((پتھر کے کنکر) پختہ مٹی نہیں کہا گیا ہے۔ یعنی وہ مٹی جو آگ میں پکائی گئی ہو یعنی پختہ اینٹیں۔ دوسری طرف جب چیچک کے جراثیم ہوا میں پھیل گئے تو پھر صرف ابرہہ کا لشکر ہی کیونکر ہلاک ہوا، تمام عرب ان جراثیم سے کیوں نہ ہلاک ہوئے؟۔

واقعہ فیل رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کے ساتھ رونما ہوا پس جب حضور ﷺ پر سورہ فیل نازل ہوئی تو اس وقت ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان میں سے بعض رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے۔ اگر وہ حقیقی پتھر نہ تھے تو ان لوگوں نے اس سورت کی تکذیب کیوں نہ کی اور علی الاعلان محمد ﷺ کو طعن و تشنیع کا نشانہ کیوں نہ بنایا؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سورت فیل نازل ہوئی عربوں نے اسے قبول کیا کیوں کہ بلاشبہ یہ بات مبنی بر حقیقت تھی اور ان میں مشہور و معروف بھی تھی اس لیے کسی ایک نے بھی اس کا انکار نہیں کیا۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ طیراً در حقیقت طیور ہی تھے جو عرب میں معروف تھے اور یہ فضائی حملہ وقت سے پہلے اس جہان میں واقعہ ہوا۔ کسی انسان نے اپنے انسان بھائی پر انتقام لینے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ اللہ قہار نے اس کو تیار کیا تھا تا کہ ظلم و عدوان کا سر کچل دے۔ (سید المرسلین: ۴۲)

ابرہہ کی مذمت میں شعراء نے شعر کہے، نفیل بن حبیب کہتا ہے (ترجمہ: اے روبینہ! ہماری طرف سے سلام و تحیہ ہو اور صبح دم تم سے آنکھ ٹھنڈی ہوں، جب میں پرندوں کو دیکھا تو اللہ کی تعریف کی اور پتھروں سے خائف تھا جو ہم پر گرائے جا رہے تھے)۔ امیہ بن ابی صلت کہتا ہے

ہمارے پروردگار کی آیات و علامات روشن ہیں اور اس پر کوئی کافر اور ناشکر گزار ہی اعتراض کر سکتا ہے، مغمس مقام پر اس نے ہاتھی کو روک دیا وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتا تھا گویا اس کے پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔

عبداللہ بن قیس اپنے طویل قصیدے میں واقعہ فیل، پرندوں اور پتھروں کے متعلق کہتا ہے (ترجمہ: اس نکٹے نے بیت اللہ کے خلاف تدبیر کی بھی جو ہاتھی لایا وہ پلٹ گیا اور اس کا لشکر شکست خوردہ تھا ان پر پرندے پتھر لے کر ظاہر ہوئے گویا کہ وہ (ابرہہ) سنگسار رہوا

اہم نکتہ: مولانا فراحی سورت فیل کی آیت میں ترمیھم کا فاعل اہل مکہ اور دوسرے اہل عرب کو

قرار دیتے ہیں جو الـم تـر کے مخاطب ہیں اور پرندوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ سنگ ریزے نہیں پھینک رہے تھے بلکہ اس لیے آئے تھے کہ اصحاب فیل کی لاشوں کو کھائیں۔ اس تاویل کے لیے جو دلائل دیئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالمطلب کا ابرہہ کے پاس جا کر کعبہ کی بجائے اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرنا کسی طرح باور کرنے کے قابل بات نہیں اور یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں کہ قریش کے لوگوں اور دوسرے عربوں میں جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے' حملہ آور فوج کا کوئی مقابلہ نہ کیا ہو اور کعبہ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہاڑوں میں جا چھپے ہوں۔ اس لیے صورت واقعہ دراصل یہ ہے کہ عربوں نے ابرہہ کے لشکر کو پتھر مارے اور اللہ تعالیٰ نے پتھراو کرنے والی طوفانی ہوا کو بھیج کر اس لشکر کا بھرکس نکال دیا' پھر پرندے ان لوگوں کی لاشیں کھانے کے لیے بھیجے گئے۔ مولانا فراحی جیسے بھی تاویل کریں' قرآن پاک سے یہ مفہوم واضح نہیں ہوتا' محض خیال کی شعبدہ بازی ہے نیز تاویل کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ تاویل میں لفظ کا وہی معنیٰ لیا جائے گا جو اس لفظ کے معنی میں سے ایک ہو یا کم از کم وہ لفظ اس معنی میں استعمال ہو۔ اگر تاویل میں اس لفظ کا ایسا معنی مراد لیا جائے جس کا معنوی طور پر اس لفظ سے کوئی تعلق نہ ہو تو ایسی تاویل باطل ہوگی۔ مثلاً فصل لربک والنحر '' اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے۔ اب نحر کے عربی میں کئی معنی ہیں' قربانی کرنا' ایسے افعال بجالانا جو نماز سے متعلق ہوں جیسے تحویل قبلہ وغیرہ' رفاع یدین کرنا' دوسجدوں کے درمیان اس طرح بیٹھنا کہ سینہ ظاہر ہو وغیرہ وغیرہ' امام رازی کہتے ہیں کہ کوئی اس مقام پر کسی اور دلیل کی بناء پر قربانی کرنا نہیں بلکہ دوسجدوں کے درمیان بیٹھنا یا دعا سے پہلے ہاتھ بلند کرنا ہے تو دیگر مباحث اپنی جگہ' اس کی یہ تاویل اس لحاظ سے بہر حال درست ہوگی کہ اس نے اس لفظ کا مرجوح معنی مراد لیا ہے لیکن اگر وہ یہ معنی مراد لے کہ دشمن کے گھر کو مسمار کردو تو یہ تاویل باطل ہو گی کیونکہ اس تاویل کا اس لفظ سے معنوی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے لہذا چیچک طاعون اور گدھوں کے جھنڈ مراد لینا باطل تاویلات ہیں۔ ابن عباسؓ کی روایات ایسی تاویلات کا رد کرتی ہیں جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

(۳) یہ بات بھی محل نظر ہے کہ مولانا فراحی کو اس تاویل کی کیوں ضرورت پیش آئی کہ اصحاب فیل کو گدھ کھانے آئے تھے؟ یہ بات قرآن کریم کے اسلوب کے خلاف ہے کیونکہ قرآن مجید میں کئی اقوام کا ذکر ہے جن پر عذاب الٰہی نازل ہوا لیکن یہ کہیں ذکر نہیں کہ عذاب نازل ہونے کے بعد افراد کی لاشوں کو گدھ ہڑپ کر گئے یا کوئی اور جانور۔ اس کے جواب میں مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ اصحاب فیل بھس بن کر رہ گئے اور اس کے بعد پرندے انہی کی لاشیں کھانے کو آئے تو کلام کی ترتیب یوں ہونی چاہیے تھی ترمیھم بحجارۃ من سجیل فجعلھم کعصف مأ کول و ارسل علیھم طیرًا ابابیل۔ تم ان کو پکی ہوئی مٹی کے پتھر مار رہے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے کھائے ہوئے بھس جیسا کر دیا

اور اللہ نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیج دیئے۔ لیکن ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے جھنڈ بھیجنے کا ذکر فرمایا پھر اس کے بعد ترميهم بحجارة من سجيل' جوان کو مٹی کے پکے ہوئے پتھر مار رہے تھے' فرمایا ہے اور آخر میں کہا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو کھائے ہوئے بھس جیسا کر دیا۔ (تفہم القرآن ۔ ۶ ۔ ۴۷۲) نہ جانے مولانا فراحی نے پرندوں کے جھنڈوں سے انکار کیوں کیا جنہوں نے دشمن کا صفایا کر دیا؟۔ ہر شے خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔" اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ "لٰہذا وہ پرندوں سے جو چاہے خدمت لے سکتا ہے' اس کے حکم سے پتھر کے پیٹ سے اونٹنی برآمد ہوئی' تنور سے پانی کا طوفان امڈ آیا' عصا اژدھا کا روپ دھار لیتا ہے اور دریا نے حضرت موسیٰؑ اور اس کے لشکر کو راستہ دے دیا اور فرعونیوں کے لیے ہلاکت کا باعث بنا' تو کیا ابرہہ اور اس کے لشکر کا پرندوں سے تباہ کروانا اس کی قدرت کاملہ سے بعید ہے؟۔ اس عبرت ناک واقعہ کا اثر کئی سالوں تک رہا اور قریش اس قدر متاثر ہوئے کہ کئی سال انہوں نے معبود حقیقی کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ حضرت ام ہانی اور حضرت زبیرؓ بن العوام کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" قریش نے دس سال اور بروایت بعض سات سال تک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ (تفہیم القرآن ۔ ۶ ۔ ۴۶۸) مولانا مودودی' مولانا فراحی کے اس بیان کو کہ قریش کے لوگوں اور دوسرے عربوں نے جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے' حملہ آور فوج کا مقابلہ نہ کیا اور کعبہ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہاڑوں میں جا چھپے' کہتے ہیں کہ تمام معتبر روایات کی رو سے ابرہہ کا لشکر محرم میں آیا تھا جبکہ حجاج واپس جا چکے تھے۔ (تو پھر وہ حملہ آور فوج سے کیسے لڑتے) مزید مولانا مودودی کہتے ہیں کہ ساٹھ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کرنا قریش اور آس پاس کے عرب قبائل کے بس میں نہ تھا وہ تو غزوہ احزاب میں بڑی تیاریوں کے بعد دس ہزار یا بارہ ہزار کے قریب فوج جمع کر سکے تھے۔ پھر بھلا وہ ساٹھ ہزار فوج کا مقابلہ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتے تھے؟

اعتراض نمبر ۱۸

اگر یہ کہا جائے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اصحاب فیل سے کعبہ کو محفوظ رکھا گیا ہے حالانکہ اس وقت اسلام کا ظہور نہ ہوا تھا' اور حجاج' قرامطہ اور پتلی ٹانگوں والے حبشی سے کعبہ کی حفاظت نہ ہو سکی

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ہاتھیوں کو کعبہ سے روکنے میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کا اعلان اور مستحکم برہان مطلوب تھا کہ بصیرت سے معلوم ہونے والے دلائل سے پہلے بصر سے مشاہدہ کیے جانے کے دلائل سے آپ کی حجت کی تاکید ہے۔ (واللہ اعلم' ورسولہ اعلم) اب رہا کہ بے حرمتی کرنے والوں کو فی الفور سزا کیوں نہ ملی تو اس جواب یہ ہے کہ انہوں نے بے حرمتی شرعی احکام اور قواعد کے مقرر ہونے کے بعد کی ہے اور جب سب کو بداہتاً معلوم ہو چکا تھا کہ اللہ کے دین میں مکہ و کعبہ محترم ہیں اور ہر مومن کو یقین ہے کہ انہوں نے حرم میں بہت الحاد کیا ہے اور یہ بہت بڑے ملحد اور کافر ہیں اس لیے ان کو

فوراً سزا نہیں دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی سزا کو روز قیامت کے لیے موخر کر دیا جیسا نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے حتیٰ کہ جب اس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو پھر اس کو مہلت نہیں دیتا' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ ''ولا تحسبن اللہ ۔۔۔ فیہ الابصار (ابراہیم ۴۲، پارہ ۱۳) ''ظالموں کے کاموں سے اللہ کو ہرگز غافل گمان نہ کرو' وہ انہیں صرف اس دن کے لیے ڈھیل دے رہا ہے جس دن آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی''۔

پیش گوئی: خانہ کعبہ کی چابی عثمان بن طلحہ سے آنحضرت ﷺ نے طلب کی تھی' اس نے انکار کیا' آپ ﷺ نے فرمایا: ایک دن یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جس کو چاہوں گا' دوں گا۔'' فتح مکہ کے موقع پر چابی عثمان سے لی گئی اور آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھی۔ یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی عثمان مسلمان ہوگیا تو آپ ﷺ نے عثمان کو بلایا عثمان قریب گیا تو آپ ﷺ نے وہی کلید کعبہ اس کے ہاتھ پر رکھ دی' فرمایا: لے سنبھال اسے' اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ چابی تیرے گھرانے میں رہے گی اور کوئی ظالم ہی اس کو تمہارے خاندان سے چھیننے کی کوشش کرے گا۔'' یزید کے دور میں ایسا ہوا آپ کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اس لحاظ سے ابرہہ کے لشکر کی تباہی ہونا تھی اور حجاج اور قرامطہ وغیرہ کو ڈھیل دینا تھی۔

اہم نکتہ: تاریخی کتب میں ہے کہ ابرہہ کا سارا لشکر ہلاک ہو گیا مگر حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے اصحاب الفیل کے ہاتھی بان اور ہاتھی کو سدھانے اور سکھانے والے دونوں شخصوں کو اپنی زندگی میں مکہ میں دیکھا تھا' دونوں اندھے ہوگئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے۔ مکہ کی گلیوں میں وہ لوگوں سے کھانا مانگتے پھرتے تھے۔ (اردو ترجمہ دلائل النبوہ۔ا۔۱۸۱)

اگر یہ خبر صحیح ہو تو یہ توجیح کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کی عبرت کے لیے زندہ رکھ چھوڑا ہوگا۔

اعتراض نمبر ۱۹

ایک جدید مصنف کہتا ہے کہ ''اگر ابرہہ مکہ فتح کر لیتا تو پورا جزیرہ نمائے عرب مسیحی بازنطینی پرچم تلے آجاتا' صلیب کعبہ کی چھت پر آویزاں ہوتی اور شائد آنحضرت (ﷺ) ایک پادری یا راہب کی زندگی گزار کر چلے جاتے''۔ (نقوش رسول نمبر۔۱۱۔۴۹۷۔حاشیہ)

جواب:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مذکورہ اعتراض میں جس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ خواہش کبھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔ قصہ اصحاب الفیل ۱۴۳۶ سال قبل وقوع پذیر ہوا تھا اور کہا جاتا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ' اس

واقعہ کا بار دیگر واقع ہونا ممکن ہی نہیں۔ اس واقعہ کو سوا چودہ سو سال بیت گئے اور اب کوئی اس زمانہ میں آس لگا بیٹھے کہ ایسے ہوتا اور ایسے نہ ہوتا' تو یہ ایک مجذوب کی بڑ اور دیوانے کا خواب ہے۔ سوائے پچھتائے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا بلکہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق ہے۔ یہ اسلام دشمنی ہے۔ اور یہ کہنا کہ آنحضرت ﷺ ایک پادری یا راہب کی زندگی گزار کر چلے جاتے' یہ مصنف کی نادانی ہے اور اس کے عقل پر جھاڑو پھر گیا ہے۔ یہودی کافروں پر فتح حاصل کرنے کے لیے آپ ﷺ کے وسیلہ سے دعا طلب کرتے تھے' ارشاد ربانی ''وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۔۔۔ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ'' ترجمہ: یہ لوگ نبی کے آنے سے قبل کافروں پر فتح آپ کے ذریعہ سے پانے کی آرزوئیں کرتے' جب نبی ظاہر ہوا اور انہوں نے پہچان لیا تب اس کے منکر ہو گئے' پس اللہ کی لعنت منکروں پر۔''

وہ عنقریب نبی آنے کے منتظر تھے۔ حضرت عیسیٰؑ آپ ﷺ کی آمد کی بشارت دے چکے تھے بارگاہ خداوندی سے نبی مکرم ﷺ کے مبعوث ہونے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور آپ ﷺ کی اس دنیا میں آپ کی تشریف آوری ہوئی' اب اگر کوئی کہہ دے کہ وہ پادری کی زندگی بسر کر کے چلے جاتے تو ایسا ممکن ہی نہیں۔ آج کا مصنف سوا چودہ سال پہلے کے اپنے بزرگوں کی بات نہیں مانتا جن کا عقیدہ تھا کہ عنقریب ایک نبی آنے والا ہے اور اس بات کا ذکر نہیں کرتے تھے کہ وہ راہب کی زندگی گزار کر چلے جائیں گے۔ تو یہ اپنے بزرگوں کی نافرمانی کر رہا ہے۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا تو واقعہ فیل متعدد واقعات میں سے ایک تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے فضل و نعمت میں شمار فرمایا۔ حبشیوں کی حکومت کو ان پر سے دور فرمایا کہ قریش کے زمانہ کو اقبال اور ان کو بقائے دراز حاصل ہو۔

(۲) قصہ اصحاب الفیل میں پیارے رسول ﷺ کی دو طرح سے کرامت ظاہر ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اصحاب الفیل غالب آتے تو وہ آنحضرت ﷺ کی قوم کو قید کر لیتے اور غلام بنا لیتے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کو ہلاک کر دیا تاکہ اس کے سبب پاک حمل و طفولیت میں اسیری و غلامی کی پرچھائی تک نہ پڑے۔ دوسرے یہ کہ اصحاب الفیل اہل کتاب تھے جن کا دین قریش کے دین سے بہتر تھا کیونکہ وہ بت پرست تھے مگر یہ آنحضرت ﷺ کے وجود باجود کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی حرمت قائم رکھنے کے لیے قریش کو' باوجود بت پرست ہونے کے اہل کتاب پر فتح دی۔ یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کا پیش خیمہ تھا کیونکہ آپ کے دین میں اسی بیت اللہ کی تعظیم' اس کے حج اور اسی کی طرف نماز کا حکم ہوا۔ (سیرت رسول عربی ۔ ۱۹) لہٰذا مصنف کا اعتراض بے بنیاد ہے۔ انہیں تو اللہ کی طرف سے رسول مبعوث ہونا تھا، (اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ) جو منشاء الٰہی تھا تو وہ کیسے ایک راہب یا پادری کی زندگی گزار کر چلے جاتے۔؟ سچ ہے ''چاند پر خاک نہیں پڑتی''۔

اعتراض نمبر ۲۰

''اس صدمے نے خواجہ عبدالمطلب پر اور بھی سخت اثر ڈالا کیونکہ عبدالمطلب کے بیٹے اپنے باپ کے وقار کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اور انہوں نے بعض ان عہدوں سے دست برداری اختیار کر لی تھی جن پر ان کے والد فائز تھے اس طرح نسبتاً پست معیار زندگی پر قانع ہو گئے تھے۔'' (سر ولیم میور۔ ۷۔ ۱۹۸)

جواب: دراصل واقعہ یہ ہے کہ ابو طالب سقایہ کے منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے حاجیوں کے خرچ کے لیے اپنے بھائی عباس سے دس ہزار روپے لیے۔ جب اگلا سال آیا تو انہوں نے اپنے بھائی سے چودہ ہزار روپے اس شرط پر لیے کہ ادائیگی نہ کر سکنے کی صورت میں وہ سقایا کا منصب رقم کی ادائیگی نہ کرنے پر اپنے بھائی عباسؓ کو دے دے گا وہ ادھار واپس نہ کر سکے اور اپنا منصب عباسؓ کے سپرد کر دیا وہ منصب ان کے پاس رہا' پھر ان کے فرزند عبداللہ کے پاس چلا گیا۔ (السیرۃ النبویہ۔ ج۔ ۱۰۶) سر ولیم میور اپنے اعتراض میں عبدالمطلب کے بیٹوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے وقار کو برقرار نہ رکھ سکے اور بعض عہدوں سے انہوں نے دست برداری اختیار کر لی۔ بات ایک بیٹے کی تھی یعنی ابو طالب نے رضامندی سے اپنا منصب اپنے بھائی کے حوالے کیا اور ولیم نے بیٹوں کا نام لے دیا جو کسی طرح بھی درست نہیں۔ بات ایک کی تھی مگر لپیٹ میں سب بیٹوں کو لے لیا' عجب لن ترانی کرتا ہے۔

عرب اپنی ناموس و ناموری کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے اپنے نام کو بٹہ لگانا ان کے مزاج کے شایان شان نہ تھا اگر وہ اپنے عہدے چھوڑتے تو ان کے لیے مکہ میں سر اٹھا کر چلنا ممکن ہی نہ رہتا کیونکہ وہ معمولی معمولی باتوں پر جھگڑ پڑتے اور سال ہا سال تک یہ جنگی سلسلہ شروع ہو کر جاری رہتا تو بھلا کب وہ اپنے عہدوں سے دست برداری کر سکتے تھے۔ جان تو جا سکتی تھی مگر آن پر آنچ نہیں آ سکتی تھی۔ یہ عہدے نہایت اعزاز اور وقار کے حامل تھے ان سے دست برداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سر ولیم میور پر قرض ہے کہ وہ بتائیں کہ ابو طالب کے سوا آپ کے کون کون سے فرزندوں نے عہدے چھوڑے' ؟ اور کن کن عہدوں سے مستعفی ہوئے؟ اور یہ دلیل بھی نہایت کمزور ہے کہ باپ کے وقار کو برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے بیٹوں نے عہدے چھوڑ دیئے' بھلا اس عقل مند سے کوئی پوچھے کہ باپ کے ورثہ میں سے ملے مناصب کو چھوڑنے سے باپ کے وقار کو چار چاند لگ رہے ہیں یا باپ کے لیے بدنامی کا باعث بن رہے ہیں اس میں ان کی جگ ہنسائی ہے جو عربوں کے مزاج کے بالکل خلاف ہے وہ لڑ کر مر سکتے ہیں مگر اپنے وقار کو ٹھیس لگنے نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ سر ولیم میور نے یہ نہیں بتایا کہ اس بات کا حوالہ کون سی کتاب میں ہے جبکہ حوالہ کے بغیر کوئی بھی بات مستند نہیں مانی جاتی۔ یہ درست ہے کہ ابو طالب نے اپنے منصبی فرائض پورے نہ کرنے سے اپنا عہدہ اپنے بھائی کے حوالے کر دیا اس میں کوئی حرج نہیں' بصورت دیگر اس میں کوئی سنگینی پیدا ہوتی اور پھر یہ عہدہ بنو ہاشم ہی کے پاس رہا کسی اور خاندان میں منتقل نہیں ہوا۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت ہاشم نے اپنے بھائیوں (عبدالشمس' مطلب' نوفل) کو عبدالدار کو حرم کے مناصب لینے پر آمادہ کیا تھا' چونکہ ہاشم سیاست' ذہانت اور باعتبار مالی ان سے مضبوط تھے۔ عبدالدار نے مناصب واپس کرنے سے انکار کیا' جس پر دونوں طرف سے جنگی تیاریاں شروع ہوئیں۔ آخر اس شرط پر صلح قرار پائی کہ بنی عبد مناف کو سقایہ اور رفادہ کے عہدے دے دیئے جائیں اور حجابہ' لواء اور ندوہ بدستور عبدالدار کے پاس رہیں۔ یہ بات فریقین نے مان لی' جنگ ٹل گئی' اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام آیا تو آپ نے فرمایا'' جاہلیت میں جو معاہدہ تھا' اسلام نے اس کے استحکام کو بڑھایا ہے۔'' یہ منصب عبدالمطلب اور ان کی اولاد ہی میں رہے۔ اگر کسی مجبوری اور ضرورت کے سبب ایسا ہوتا ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ عہدہ بنو ہاشم میں ہی رہتا ہے یا کسی اور قبیلہ کے پاس چلا جاتا ہے وہ عہدہ بنو ہاشم کے خاندان میں ہی رہا دست برداری نہیں کی تھی۔ عبدالمطلب کے آباؤ اجداد نے مناصب واپس لینے کے لیے اپنی تلواریں سونت لیں اور ان کی اولاد ان عہدوں سے دست برداری کر لیں، ناممکن ہے۔ یہ مستشرق کی بھول ہے اور محض الزام تراشی ہے۔

صبح سعادت

تاریخ عالم میں وہ دن عظمت والا دن ہے جس دن آپ ﷺ پیدا ہوئے۔ آپ ﷺ کی ولادت با سعادت ۲۰ اپریل ۵۷۱ء ہوئی کائنات کے داغ دار چہرے اور بگڑے نظاموں کو سنوارنے والا تشریف لایا۔

ربیع الاول امیدوں کی دنیا ساتھ لے آیا
دعاؤں کی قبولیت کو ہاتھوں ہاتھ لے آیا
خلیل اللہ نے جس کے لیے حق سے دعائیں کی
ذبیح اللہ نے وقت ذبح جس کی التجائیں کیں
مبارک ہو کہ ختم المرسلین تشریف لے آئے
جناب رحمۃ اللعالمینؐ تشریف لے آئے

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت محمدﷺ کی ولادت، بچپن اور معجزات

اعتراض نمبر ۲۱

شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں سال پیدائش کے موضوع پر حسب ذیل تبصرہ پایا جاتا ہے۔

''سال پیدائش ۵۷۰ء مشتبہ ہے کیونکہ روایات ان کی پیدائش عام الفیل بتاتی ہیں اور ابرہہ کا مکہ پر حملہ اس سال سے قبل ہوا ہوگا۔

(۲) ''لیمن'' نے تاریخ پیدائش میں بہت سے شبہات اس بناء پر پیدا کرنے کوشش کی ہے کہ مدینہ میں آ کر آنحضرت ﷺ نے جس فعالیت کا ثبوت دیا وہ کسی معمر اور پچاس سال سے زیادہ عمر والی شخصیت سے متوقع نہیں ہوسکتی، اس وقت عمر بیس یا تیس سال ہونی چاہیے۔'' (اسلام۔پیغمبر اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۲۸۱)

جواب: انسائیکلو پیڈیا کے مولفین سن ۵۷۰ء سے قبل اور لیمن فعالیت کی بنیاد پر بوقت ہجرت آپ ﷺ کی عمر بیس یا تیس سال کے لگ بھگ قیاس کرتے ہیں۔ یہ ان کی پرانی طرز اور انوکھی منطق ہے کہ تاریخی مصادر کو چھوڑ کر طبع زاد اور اختراعی و وضعی مفروضوں پر بنیاد رکھتے ہیں جبکہ مفروضہ کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

کوئی حیدر سلیم اس سے یہ پوچھے
کہ پھونکوں سے کبھی سورج بجھا ہے

آپ ﷺ کی زندگی دو ادوار پر مشتمل ہے، اول مکی دوم مدنی۔ مکی زندگی ترپن سال اور مدنی زندگی دس سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیمن کے بقول آپ ﷺ کی عمر بوقت ہجرت بیس یا تیس سال ہونا چاہیے تھی اس حساب سے مکی زندگی کے ۳۳ یا ۲۳ سال کو یہ مستشرق بیک جنبش قلم، قلم زد کر دیتا ہے جبکہ تاریخ نے ان سالوں پر محیط واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی سے مدت العمر واقعات مختصر بیان کرتے ہیں تاکہ مستشرق کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا شافی جواب دیا جاسکے۔

۱۔ ولادت مبارک	۲۲ اپریل سن ۵۷۱ء	۱۳۔۳ نبوی ۴۳ سال کی عمر	مرد و خواتین کا اسلام لانا
۲۔ ایک ہفتہ بعد	عقیقہ۔نام رکھا	۱۴۔۵ نبوی ۴۵	ہجرت حبشہ
۳۔ چار سال تک رہے	حلیمہ سعدیہ کی گود میں	۱۵۔۶ نبوی ۴۶	حضرت حمزہ و عمر کا اسلام لانا
۴۔ ۵ سال کی عمر میں	ماں کی گود میں	۱۶۔۷۔۔۴۷	مقاطعہ قریش

۵۔ ۶۔۔۔۔	والدہ کا انتقال	۱۷۔۱۰۔۔۵۰	ابو طالب وخدیجہ کا انتقال
۶۔ ۸۔۔۔۔۔	دادا کا انتقال	۱۸۔۱۱۔۔۵۱	مدینہ کے افراد کا ایمان لانا
۷۔ ۱۲۔۔۔۔۔	شام کا سفر	۱۹۔۔۱۲۔۔۵۲	مدینہ کے بارہ آدمی ایمان لائے
۸۔ ۲۵۔۔۔۔۔	خدیجہ سے شادی	۲۰۔۔۱۳۔۔۵۲۔۔	مدینہ کے ۲۷ آدمی ایمان لائے
۹۔ ۳۰۔۔۔۔	الامین کا خطاب	۲۱ ۔۔ا سن ھ ۔۵۴	ہجرت مدینہ
۱۰۔ ۳۵۔۔۔۔۔	حکم مقرر ہوئے	۲۲۔۔۲۔۔۵۵	غزوہ بدر
۱۱۔ ۳۷۔۔۔۔	غار حرا میں	۲۳۔۳۔۔۵۶	غزوہ احد
۱۲۔ ۴۰۔۔۔۔	نزول وحی	۲۴۔ ۴۔۔۔۵۷	قراء کی شہادت
۲۵۔ ۵ھ۔۵۸	غزوہ خندق	۲۶۔ ۶۔۔۔۵۹	صلح حدیبیہ
۲۷۔ ۷۔۔۶۰	فتح خیبر	۲۸۔ ۸۔۔۔۶۱	فتح مکہ
۲۹۔ ۹۔۔۶۲	تبوک	۳۰۔ ۱۰۔۔۔۶۳	خطبہ حجۃ الوداع
۳۱۔ ۱۱۔۔۶۳	وصال		

(نقوش۔۲۔۴۶۔۴۷)

مذکورہ فہرست سے ہجرت مدینہ سے قبل کے واقعات یعنی مکی زندگی کے ترپین سال کا یکسر انکار کر کے اپنے مقصد کو پورا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔لیمن کے مفروضہ پر اسوہ حسنہ کے ہر لمحہ، ہر پل، ہر دن، ہر ہفتہ اور ہر ماہ وسال کے بے نظیر و بے مثال سچے اور سچے واقعات کو چھوڑا نہیں جا سکتا نیز اس کی دلیل کمزور ہے جبکہ وہ کہتا ہے کہ ''ابرہہ کا حملہ ۵۷۰ء سے قبل ہوا ہوگا'' اس شک کی قطعاً گنجائش نہیں، البتہ بات بنتی جب ابرہہ کے حملے کا سن بتا دیتا حالانکہ وہ کہیں ظاہر نہیں کرتا بلکہ ابرہہ کا مکہ پر حملہ پیدائش سے قبل ہوا ہوگا، کہہ کر بات گول کر جاتا ہے۔نیز غیر معین سن کو بنیاد بنا کر فرضی سن کے سہارے تمام تاریخی واقعات سے انکار کرتا ہے جو تاریخ سے ناانصافی ہے۔ایک اور پہلو سے لیمن کے الزام کا رد کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

اول

	عمر شریف بوقت ہجرت	ہجرت اور بعثت کا درمیانی عرصہ	بوقت بعثت عمر مبارک
تاریخی مآخذ	۵۳ سال	۱۳ سال	۴۰ سال
لیمن مفروضہ	۲۰۔۳۰ سال	۱۳ سال	۷ سال یا ۱۷ سال

دوم

	بعثت کے وقت عمر مبارک	مدت بعثت اور نکاح اول	عمر مبارک بوقت نکاح
تاریخی مآخذ	۴۰ سال	۱۵ سال	۲۵ سال
لیمن مفروضہ	۷ یا ۱۷ سال	۱۵ سال	۸ سال یا ۲ سال

لیمن کے مطابق پہلے جدول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعثت نبوی کے وقت آپ کی عمر ۷ سال یا ۱۷ سال تھی دوسرے جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی آپ ﷺ سے شادی آٹھ سال قبل از ولادت یا دو برس کی عمر میں قرار پائی۔ ذرا سوچیے! کوئی ذی شعور اور عقل منداس جھوٹ کو سچ مان سکتا ہے کہ شادی ولادت سے پہلے ہوئی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ عقل پر جھاڑو پھر جاتا ہے تو ایسی ہی فضول باتیں زبان سے نکلتی ہیں ۔ سچی بات ہے جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے، نیز ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ان گنت جھوٹ بولے جائیں پھر بھی جھوٹ، جھوٹ ہی رہتا ہے۔ حضرت خدیجہ کی عمر شادی کے وقت چالیس برس تھی اور جناب رسول اللہ ﷺ کی عمر پچیس سال تھی۔ مستشرقین ان دونوں ہستیوں کی عمروں سے اتفاق نہیں کرتے جبکہ تاریخی حقائق ان مستشرقین کے مفروضوں کا بطلان کرتے ہیں جیسا کہ پیچھے جدول سے ظاہر کیا گیا ہے

اعتراض نمبر ۲۱ کا دوسرا جز

آپ ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں لیمن کا ایک اور اعتراض دیکھیے، کہتا ہے کہ مدینہ آکر آنحضرت (ﷺ) نے جس فعالیت کا ثبوت دیا وہ کسی معمر اور پچاس سال سے زیادہ عمر والی شخصیت سے متوقع نہیں ہوسکتی، اس وقت عمر بیس یا تیس سال ہونی چاہیے۔''

جواب: نظریہ فعالیت سے ذہن میں کئی سوال اٹھتے ہیں کہ کیا پچاس سال کا آدمی فعال نہیں رہتا؟ کیا اس عمر میں کام کرنے سے بندہ عاجز و بے بس ہوکر رہ جاتا ہے؟ کیا یہ نظریہ فعالیت کا کلیہ صرف آپ ﷺ کی ذات کے لیے مخصوص ہے؟ اگر ایسا نہیں تو اس عمر کے اور لوگ بھی فعال رہے یا نہیں؟ اگر اور لوگ بھی اس عمر میں فعال رہے ہوں تو آپ ﷺ کا اس عمر میں فعال ہونا کیوں محال نظر آتا ہے؟ آئیے سب سے پہلے تاریخ کے آئینہ میں چند دیگر افراد کی فعالیت کی مثالیں پیش کرتے ہیں تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی

کا پانی ہو جائے۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے چند وفادار جان نثاروں سے شروع کرتے ہیں۔

(۱) حضرت صدیق اکبرؓ سے آپ ﷺ دو سال دو ماہ عمر میں بڑے تھے۔ ابوبکر نے گیارہ ہجری میں ساٹھ سال نو ماہ بیس دن کی عمر میں خلافت کی باگ ڈور سنبھالی اور تیرہ ہجری تک خلافت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ شام، روم، اور عراق سے جنگیں بھی ہوئیں اور ان جنگوں سے متعلق تمام معاملات کو بخوبی نبھایا اور اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقہ سے بروئے کار لاتے رہے، بالآخر تیرہ ہجری میں تریسٹھ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔

(۲) حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت، جس کے معترف اپنوں کے بجز پرائے بھی ہیں۔ ایران و روم کی حکومتوں کے نام و نشان مٹ گئے۔ ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ ایرانیوں نے سترہ سالہ یزدگرد کو بادشاہ بنایا اور جنگی تیاریوں میں دن رات ایک کر کے جت گئے، جس کے نتیجہ میں جنگ قادسیہ ہوئی جس میں حضرت عمرؓ نے شرکت کرنا چاہی لیکن صحابہ کرام کے مشورہ سے جنگ میں حصہ لینے سے باز رہے، اس وقت آپ کی عمر اکیاون سال یا باون سال تھی عیسائیوں نے مطالبہ کیا کہ خلیفہ خود تشریف لا کر معاہدہ کریں، آپ اپنے خادم کے ہمراہ سولہ ہجری کو ۵۴ یا ۵۵ سال کی عمر میں ایک سواری لیے بیت المقدس روانہ ہوتے ہیں۔ اس سواری پر باری باری خادم و مخدوم سوار ہوتے ہیں خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے وقت آپ کی عمر ۵۲ سال ۵ ماہ اور ۲۶ دن تھی مدت خلافت دس سال چھ ماہ نو دن ہے۔ آپ نے تریسٹھ سال پانچ دن کی عمر پائی۔ مدت العمر فرائض انجام دیتے رہے حتی کہ آپ فجر کی نماز پڑھانے آتے ہیں کہ فیروز نامی ایک پارسی غلام جس کی کنیت ابولولو تھی، چھ وار کرتا ہے، وار بڑے سخت تھے جس سے آپؓ جانبر نہ ہو سکے اور ۲۳ ہجری میں دارالبقا کو سدھار جاتے ہیں۔ "ان للہ و انا الیہ راجعون"۔

(۳) حضرت عثمان غنیؓ کی ولادت عام الفیل کے چھ سال بعد ہوئی آپ کی خلافت کا دورانیہ ۲۳ ہجری تا ۳۵ ہجری ہے۔ آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ آپ کی عمر میں ۸۰، ۸۲، ۸۹، ۹۰ سال تاریخ کے اقوال ہیں بہر حال اس پر اتفاق ہے کہ آپؓ کی شہادت ۳۵ ہجری میں ہوئی اور اخیر وقت تک کام میں مصروف رہے۔ طویل عمر پائی اور فعال رہے۔

(۴) حضرت علیؓ نے ۳۵ ہجری تا ۴۰ ہجری خلافت کے عہدہ پر فائز رہے۔ تاریخ الخلفاء کے مطابق آپ کی عمر ۵۷، ۵۸، ۶۳، اور ۶۴ سال ہے۔ فرائض کی انجام دہی کا یہ عالم کہ فجر کی نماز پڑھانے جاتے ہیں کہ دشمن نے حملہ کیا، آخر کار معبود حقیقی سے جا ملے مدت العمر کام نمٹاتے رہے۔ ذرا یہ بھی سن لیں۔

۱۔ آئن سٹائن ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۰ء تک اپنے کام میں مصروف رہا اور ۱۹۴۳ء میں ۶۴ سال کی عمر میں چل بسا گویا ۶۱ سال تک فعال رہا

۲۔کوپرنیکس ۱۴۷۳ء کو پولینڈ میں پیدا ہوا۔ ۶۷ سال کی عمر تک لیکچرز دیئے اور ۱۵۴۵ء کو ۷۲ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ ۶۷ سال تک فعال رہا۔

۳۔کارل مارکس: جرمنی کے قصبہ ٹرائز میں پیدا ہوا۔۱۸۳۵ء میں بون اور بون سے برلن یونیورسٹی منتقل ہوا پھر ورجینیا یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی۔۱۸۴۷ء میں پہلی کتاب ''افلاس فلسفہ شائع کی۔ ۱۸۶۷ء میں ایک اور کتاب ورس سیٹپال شائع کی اور ۱۸۸۳ء میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

۴۔جارج واشنگٹن ورجینیا میں پیدا ہوا۔۱۷۷۵ء فوج میں رہا۔۱۷۷۴ء میں براعظمی کانفرنس کا رکن بنا اور ۱۷۷۵ء میں دوسری براعظمی کانفرنس کا سپہ سالار بن گیا۔۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۷ء تک دوسرا دور صدارت مکمل کیا آخر ۱۷۹۹ء میں ۶۷ سال کی عمر پا کر فوت ہو گیا۔وہ موت سے پہلے دو سال تک فعال رہا۔(سو بڑے آدمی)

طوالت کے پیش نظر چند شخصیات کا ذکر کرنا کافی سمجھا ہے جبکہ تاریخ ایسے افراد سے بھری پڑی ہے جن کی فعالیت سے لیمن کا نظریہ فعالیت چکنا چور ہو جاتا ہے۔ یہ نظریہ لیمن کی اپنی اختراع ہے۔

عہد حاضر کی دنیا میں سرکاری ملازم کی مدت ملازمت ساٹھ سال ہے اور کئی ممالک میں ججز کی مدت ملازمت ۶۵ سال اور اس سے بھی زیادہ ہے۔بعض سرکاری افسران (ریٹائرڈ) کو دوبارہ مختلف عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے جبکہ وہ اپنی مدت ملازمت پوری کر چکے ہوتے ہیں' اگر وہ فعال نہ رہتے تو کیونکر انہیں کلیدی عہدوں پر فائز کیا جاتا؟ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ ملازمین غیر فعال ہو کر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں جبکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے قابل اور فعال نہیں ہیں؟ کیا اس سے قوم و ملک کے پیسے کا ضیاع نہیں ہوتا؟ کیا ان کی جگہ دوسرے ملازمین کا تقرر نہ ہونے کی صورت میں بے روزگاری کا عفریت قوم و ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرتا ہے؟ مدت ملازمت مقرر کر کے پھر بھی دوبارہ انہی ریٹائرڈ ملازمین کو تعینات کر کے کوئی ملک یا قوم اپنے نقصان سے کیونکر غافل ہے اور اپنی نااہلی سے ہونے والے نقصان کا سد باب کرنے کی بجائے ضیاع کا باعث بن رہی ہے' آخر کیوں؟ کیا فعالیت کی افادیت سے دنیا کے ممالک ناآشنا ہیں اور صرف لیمن ہی کو اس کا احساس اور علم ہے؟ نہیں نہیں بلکہ اس عمر والا آدمی فعال رہتا ہے اور اپنے کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ ہمارے ملک پاکستان میں ۲۰۱۳ کے الیکشن کے لیے عارضی وزیر اعظم مقرر کیا گیا جس کی عمر ۸۵ سال کے لگ بھگ تھی۔تحریک انصاف کے چیرمین عمران خان پچیس اکتوبر سن ۱۹۵۲ کو پیدا ہوئے اور ۱۸ اگست ۲۰۱۸ء کو وزیر اعظم پاکستان کا حلف اٹھایا ان کی تیسری شادی سن ۲۰۱۷ء کے آخر میں ہوئی یعنی شادی کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔

تاریخی شواہد اور روزمرہ کے مشاہدات و واقعات لیمن کے نظریہ فعالیت کارد کرتے ہیں۔آج کی دنیا میں اس نظریہ کا بطلان نظر آ رہا ہے' عملی طور پر رد ہو رہا ہے نیز ملک و قوم کی خوش حالی کے لیے اس عمر کے افراد

کی موجودگی مفید اور نہایت کارآمد ہے۔ ''جان پورٹ'' کہتا ہے ''آپ ﷺ کی شکل شاہانہ تھی' خط وخال باقاعدہ اور دل پسند تھے' آنکھیں سیاہ اور منور تھیں' بینی ذرا اٹھی ہوئی' دہن خوبصورت تھا' دانت موتی کی طرح چمکتے تھے' رخسار سرخ تھے' آپ کی صحت بہت اچھی تھی' آپ کا تبسم دلآویز' شیریں اور دل کش تھا'' (ن۔۴۔۵۳۰) لیمن کو بھی آپ ﷺ کی صحت وتوانائی میں شک نہیں' وہ آپ ﷺ کی آخری عمر جو تاریخ بتاتی ہے کہ فلاں فلاں کام انجام دیئے بلکہ تادم آخر کام انجام دیتے رہے۔ اس پراسے اعتراض ہے کہ اس عمر کے پیٹے میں ایسے کام کرنا ممکن نہیں جو آپ ﷺ نے کیے کیونکہ اس عمر میں آدمی فعال نہیں رہتا۔

آخری دس سالوں میں حضور ﷺ نے کفار مکہ کے ہاتھوں جسمانی اور ذہنی اذیتیں اٹھائی تھیں، ان کا اثر آپ ﷺ کے اعصاب پر ہوا ہوگا کیونکہ انسانی فطرت ہے کہ کچھ عرصہ کی مزاحمت کے بعد قویٰ مضمحل اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اعلان نبوت کے وقت آپ ﷺ کے بڑھاپے کا آغاز تھا مگر آپ ﷺ نے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا پھر بھی ان حوادث سے ان کی استقامت میں کوئی فرق نہ پڑا۔ کیا تبلیغ دین کی سرگرمیوں میں ٹھہراؤ یا کمی واقع ہوئی وغیرہ۔ ان باتوں کا جواب حضرت حباب بن الارت کے ایک واقعہ میں موجود ہے۔ جب کفار کی ایذا رسانی سے سخت تنگ آ گئے تو انہوں نے بارگاہ نبوی میں عرض کی یا رسول اللہ! آپ ﷺ کفار مکہ کے خلاف بددعا کیوں نہیں کرتے کہ ہمیں بھی سکھ کا سانس نصیب ہو۔ سنا تو حضور ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ فرمایا: خباب گھبرا گئے ہو، راہ حق میں ایسی ابتلاوں کا پیش آنا داخل معمول ہے، تم سے پہلے لوگوں کو جرم حق پرستی کی ایسی ایسی اذیت ناک سزائیں دی گئیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے ،کئی ایسے تھے جنہیں آرے سے چیر دیا گیا مگر انہوں نے اف نہ کی، خدا کارساز ہے وہ دن دور نہیں جب ہم اپنی مساعی میں کامیاب ہونگے اور شتر سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے خدا کے سوا اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ آپ ﷺ اپنے آخری ایام زندگی تک صحت مند اور توانا رہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آپ ﷺ نے تیس جنگوں میں حصہ لیا' وفود سے ملاقاتیں کیں' بادشاہوں کو مکتوبات لکھے' ریاست مدینہ کو معاشی' معاشرتی' اخلاقی' سیاسی' دینی و مذہبی لحاظ سے مستحکم کیا حتیٰ کہ نمازوں کی امامت انتقال سے تین دن قبل تک فرمائی۔ صلوٰ علیہ وآلہ' قارئین کرام کے علمی ذوق کے پیش نظر ایک نقشہ پیش خدمت کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ (ربیع الاول ۱۱ھ۔ ۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ)

تاریخ پیدائش	تاریخ وفات	کل عمر	مدت خلافت	عمر بوقت خلافت
عام الفیل کے دوسال بعد	۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ	۶۳ سال	۱۰_۲_۲	۲۵_۹_۶۰

حضرت عمرؓ (۲۲ جمادی الاول ۱۳ھ۔ ۲۶ ذالحج ۲۳ھ)

تاریخ پیدائش	تاریخ وفات	کل عمر	مدت خلافت	عمر بوقت خلافت

۴۰ برس قبل ہجرت نبوی	یکم محرم سن ۲۴ھ	۶۳_۰_۵	۱۰_۷_۴	۵۲_۵_۲۶

حضرت عثمانؓ (۴ محرم ۲۴ھ ۔۔ ۱۸ ذوالحج ۳۵ھ)

تاریخ پیدائش	تاریخ وفات	کل عمر	مدت خلافت	عمر بوقت خلافت
۶ برس بعد عام الفیل	۱۸ ذوالحج ۳۵ھ	۸۲_۰_۰	۱۱_۱۱_۱۴	۷۰_۰_۱۶

حضرت علیؑ (۲۵ ذوالحج ۳۵ھ ۔۔ ۱۷ رمضان ۴۰ھ)

تاریخ پیدائش	تاریخ وفات	کل عمر	مدت خلافت	عمر بوقت خلافت
۵ برس قبل بعثت نبوی	۱۷ رمضان ۴۰ھ	۵۷_۰_۰	۴_۸_۲۲	۵۳_۲_۳

امام حسنؓ (ربیع الاول ۴۱ھ ۔۔۔ رمضان ۴۱ھ)

تاریخ پیدائش	تاریخ وفات	کل عمر	مدت خلافت	عمر بوقت خلافت
۱۵ رمضان ۳ھ	۵ ربیع الاول ۵۰ھ	۴۸_۰_۰	۰_۶_۱۰	۴۸_۰_۰

کل مدت خلافت ۰۔۰۔۳۰ سال

نقشہ کی اہمیت ۔۔ یہ حدیث حضرت سفینہؓ سے مروی ہے ''رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تیس سال تک خلافت منہاج نبوت پر رہے گی' اس کے بعد پھر خلافت نہیں ہوگی بلکہ ملک گیری ہو جائے گی۔'' یعنی خلافت صدیقی دو سال رہی اس کے بعد خلافت فاروقی ۱۰ سال چھ ماہ رہی' گیارہ سال خلافت عثمانی' چھ سال خلافت علی اور چھ ماہ خلافت حسن کی۔ یہ خلافت کا دورانیہ تیس سال بنتا ہے جس کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے اس کے بعد پھر ملک گیری مطمح نظر ہو گیا اور رشد و ہدایت کا وہ دور ختم ہوا جس کو خلافت نبوت کہا جاتا ہے۔ حضرت ام حبیبہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب سورہ ''اذا جاء نصر اللہ والفتح'' نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت عیسیٰؑ بن مریم نے اپنی امت میں چالیس سال گزارے اور میرے بیس سال پورے ہو چکے ہیں اور میں اس سال میں فوت ہو جاؤں گا' پس سیدہ فاطمہؓ رونے لگی تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے اہل بیت میں سے سب سے پہلے تم مجھ سے ملو گی' پھر وہ مسکرانے لگیں۔ (تبیان القرآن،۱۲۔۱۰۲۰)

صاحب ترجمان السنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ارداہ کے بغیر خیال اس طرف منتقل ہوا کہ خلافت منہاج النبوۃ کی مدت کل تیس سال ہونے میں شاید حکمت یہ ہے کہ بحکم حدیث چونکہ ہر تاریخی نبی کی عمر پہلے نبی سے نصف ہوتی چلی آئی ہے اور چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی عمر نزول سے پہلے اور بعد کی عمر ملا کر ایک سو بیس سال ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری عمر ساٹھ سال ہوگی چنانچہ بحذف کسر آپ ﷺ کی عمر یہی ہوئی' اس حساب سے اگر آپ کے بعد نبوت باقی ہوتی اور کوئی نبی آنا مقدر ہوتا تو اس کی عمر آپ کی عمر سے نصف ہونی چاہیے تھی' وہ تیس سال ہی ہے' چونکہ یہاں نبوت اب ختم ہو چکی ہے اس لیے خلافت

نبوت علی منہاج النبوۃ کی عمر تیس سال مقدر ہوئی۔ واللہ الحمد'' (ترجمان السنہ۔۴۔۲۷۶)

اعتراض نمبر ۲۲

کیا اسلامی نظام صرف تیس سال قائم رہا، اتنے مستحکم اور ہمہ گیر تحفظات کی موجودگی میں اسلام کا فقید المثال نظام عدل و مساوات خلافت راشدہ کی تیس سالہ مدت کے بعد برقرار نہ رہ سکا۔

جواب: یہ محض مغالطہ آرائی ہے البتہ سیاسی نظام کی حد تک ہوسکتا ہے اور وہ بھی جزوی طور پر درست ہوسکتا ہے۔ اسلام کے نظام کے ایک جز سیاسی میں زوال آنے سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام کا پورا نظام برقرار و قائم نہ رہا۔ وہ کون سی بنیاد پر نا قابل عمل ٹھہرا؟ حالانکہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی مسلسل اسلامی تعلیمات کے ماتحت رہی ہے۔ ان کی اخلاقی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، ثقافتی اور عدالتی زندگی بھی اسلام کے قانون کے مطابق چلتی رہی۔ یہ عمل قابل غور ہے کہ ان کی سیاسی زندگی اسلام کے تابع رہی ہے۔ اسلام کا مذہب اور سیاست دو الگ چیزیں نہیں ہیں کیونکہ سیاست ہو دین سے الگ تو چنگیزی بن جاتی ہے، سے مسلمان خوب آشنا تھے۔ یہ امر بھی نہایت قابل غور ہے کہ مذہب اور سیاست کی کبھی بھی اس طرح جدا راہیں نہیں رہی ہیں جیسے یورپ میں چرچ اور سیاست جدا ہوئے۔ چرچ کی بالادستی ختم ہوئی تو مذہب کو اجتماعی زندگی سے مکمل خارج کر کے اسے انفرادی زندگی تک محدود کر دیا گیا۔ عیسائیت میں سیاست اور مذہب دو جداگانہ میدان ابتدا ہی سے چلے آتے ہیں۔ یہ جداگانہ حیثیت اس دور کے حالات کی پیداوار ہے جب عیسائیت اپنا پرچار رومن ایمپائر میں کر رہی تھی۔ روم معاشرہ مضبوط و مستحکم تھا۔ عیسائیت میں وہ قوت اور دم خم نہ تھا کہ اس معاشرے کے مدمقابل آتی اور للکارتی جبکہ حکومت کی گرفت مضبوط تھی، اس سے ٹکر لینے کی بجائے اس کے دباؤ سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے باحیثیت عقیدہ یہ اعلان کیا کہ سیاست اور معاشرتی قدروں سے اسے کوئی لینا دینا نہیں اور عیسائی دعوت تو محض روحانی تسکین کا ایک نفع بخش ذریعہ ہے۔ دوسری طرف جب عیسائیت نے مضبوط پنجے گاڑھ دیے تو رومن معاشرے کا اقتدار چھین لیا لیکن اسلام اس قسم کی سودا بازی نہیں کرتا ہے اور اس کا کوئی عقیدہ مصلحت کیشی کا دعوے دار نہ تھا۔ ہم مصلحت وقت کے قائل نہیں ہیں۔ اپنا معاشرہ خود تشکیل دیا اور اس کی تعمیر و ترقی غیر کی منت کش نہ تھی۔

نو آبادیاتی جنگ سے قبل اسلامی تاریخ میں ہمیں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جہاں کسی بادشاہ نے اسلامی تعلیمات کو یکسر معطل کر کے خود کوئی اپنا قانون وضع کیا اور نافذ کیا۔ یہ درست ہے کہ بادشاہوں نے قانون شریعت کی خلاف ورزی کی لیکن اس سے لاتعلقی کبھی نہیں کی۔ ان کی ریاستوں میں شریعت کا قانون تھا اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے امور میں عدالتی فیصلے اس کے مطابق ہوتے تھے۔ سارے بادشاہ ایسے نہ تھے جبکہ کئی بہت نیک اور پرہیزگار بھی تھے۔ وہ بیت المال سے اپنے گزارے کے مطابق لیتے تھے اور بیت

المال کو ذاتی خزانہ سمجھتے تھے نہ ہی اپنی شاہ خرچیوں کے لیے خزانہ سے رقم لے کر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ ان مسلمان حکمرانوں کا موازنہ خلافت راشدہ سے کریں تو ہماری نگاہوں میں یہ جچتے نہیں ہیں لیکن بلاشبہ یہ درست ہے کہ ان مسلمان بادشاہوں کو غیر مسلم بادشاہوں کے معیار پر جانچا جائے تو یہ کہیں بہتر ہیں۔ ان کا موازنہ ہم عصر بادشاہوں اور ان کے نظام سلطنت سے کیا جائے تو وہ بہت بہتر ہے۔ البتہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ تیس سال بعد امت مسلمہ اپنے معیار کو خلافت راشدہ کی سطح تک برقرار نہ رکھ سکی جہاں تک امراء و سلاطین کی کارگزاریوں کا تعلق ہے، ان سے مسلمان اس قدر بے تعلق رہے کہ ان کے نام تک ان کو یاد نہیں، اگر تھے بھی تو وہ یادداشت سے محو ہو گئے اس کے باوجود مسلمانوں نے خلفائے راشدین، صحابہ کرامؓ، امام اربعہ اور دیگر اکابرین علماء سے واقف ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان شخصیات کا تعلق شریعت اسلامی سے تھا اور یہ ورثہ مسلمانوں میں منتقل کرتے رہے جس سے ان کی وابستگی رہی۔ ان کی بدولت اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ پکا اور مضبوط رہا اور کبھی بھی ٹوٹنے نہ پایا، جس سے عصری مسائل اور زندگی کے سارے معاملات میں رہنمائی ملتی رہی اور اسلام آگے بڑھتا ہی رہا اور ان شاء اللہ بڑھتا ہی رہے گا۔

اعتراض نمبر ۲۳

بعض مورخین کو شکایت ہے کہ اگر چہ آنحضرت ﷺ وہ واحد نبی ہیں جو تاریخ کے پورے روشن دور میں تشریف لائے مگر ان کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ (حطی) ''مستشرقین مغرب کا انداز فکر''

جواب: بیرون عرب تاریخی دور کتنا ہی روشن اور تابناک کیوں نہ ہو مگر عرب کو تاریخی اعتبار سے قبل از اسلام تاریکی کے دور سے محو نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور میں عرب کی کوئی تاریخی کتاب نہیں پائی جاتی بلکہ عرب کا تاریخی دور آنحضرت ﷺ کے طفیل تاریخ میں نمودار ہوا نیز تاریخ کے دائرہ کار میں کیا کچھ تھا؟ صرف بادشاہوں یا بڑے لوگوں کے واقعات کو لکھا جاتا تھا اور آج بھی تاریخ کا یہی مزاج ہے کہ کئی موضوعات میں تو وسعت پیدا ہوئی مگر غیر اہم واقعات کو تاریخ محفوظ نہیں کرتی اور پھر تاریخ لکھنے کا رواج نہ تھا۔ تو ان حالات میں تاریخی واقعات نایاب ہونے کی شکایت کرنے سے کیا حاصل۔؟ ایک سوال یہ ہے کہ تاریخ سے کیا مراد ہے؟ تاریخ کیسے مرتب ہوتی ہے؟ کن واقعات اور کن لوگوں کا تذکرہ تاریخ کے اوراق کی زینت بنتا ہے؟

تاریخی واقعات ماضی کی یادداشت ہی ہیں جس میں اس دور کے اہم واقعات درج ہوتے ہیں اور مورخ کے نقطہ نظر کے پابند ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ان افراد کا ذکر ہوتا ہے جن کے بغیر واقعہ نا مکمل رہ جاتا ہو نیز تاریخ اہم افراد کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے اس اعتبار سے کہا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے کیا کیا؟ کب کیا؟ کیسے کیا؟ تو ان کا کارنامہ اللہ کا دیا ہوا دین اسلام ہے اور کب اور کیسے کی مکمل تاریخ موجود ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے اور ذہن نشین ہونی چاہیے کہ تاریخ کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ

جب تک کوئی شخصیت اپنے برگ و بار کے ساتھ قد آور شجر نہ بن جائے تب تک وہ شخصیت تاریخ میں جگہ نہیں پا سکتی' اسی قانون کے پیش نظر اگر کسی ہستی کے پیدائش' بچپن کے حالات اور واقعات واضح نہیں ہوتے لیکن جب وہ تاریخی شخصیت بنتی ہے تو اس عظیم ہستی کے تذکرے کے بغیر مورخ تاریخ مرتب کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ اس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس ہستی کے بارے میں ماضی کے واقعات یاد ہوتے ہیں وہ اپنی یاداشت وحافظہ کی بنیاد پر بیان کرتے ہیں تو یہی واقعات تاریخ کا جز و بنتے ہیں لیکن کوئی ایسی وجہ نہ ہو جو ان کی شہادت کو نا قابل اعتبار اور نا قابل قبول بنا دے۔ یہ ایک ایسا فار مولا ہے جس کے اشارات قرآن مجید سے بھی ملتے ہیں مثلاً سورہ الفیل میں فرمایا گیا ہے' کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ حالانکہ یہ واقعہ آپ کی بعثت سے چالیس سال پہلے ہوا تھا تو جو واقعہ آپ کی پیدائش سے پہلے رونما ہوا ہو اس کے لیے یہ کہا جائے کہ آپ نے نہیں دیکھا تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے اور اس واقعہ میں یہ اشارہ ہے کہ پرندوں کے کنکریاں پھینکنے کا واقعہ تواتر سے ثابت تھا اور اس کا علم عرب میں ہر کس و ناکس کو ہو چکا تھا اور اس کا علم ایسا ہی یقینی تھا جیسا کہ کسی چیز کو دیکھ کر علم ہوتا ہے پس کیا آپ نے نہیں دیکھا' یہ اس معنی میں ہے' کیا آپ نے نہیں جانا' لیکن چونکہ اس کا علم مشاہدہ کی طرح یقینی تھا اس لیے فرمایا کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ (تبیان القرآن۔۱۲۔۹۸۱) اگر یہ کہا جائے کہ نبی مکرم ﷺ کو الم ترکیف کیسے فرمایا حالانکہ یہ واقعہ بعثت سے کافی عرصہ پہلے رونما ہوا تھا۔۔۔۔۔۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دیکھنے سے مراد علم اور یاد دلانا ہے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اصحاب الفیل کے قصہ کی خبر متواتر ہے لہٰذا جو علم اس خبر سے حاصل ہوگا وہ ''علم ضروری'' ہوگا اور وہ علم اپنی قوت کے دیکھنے کے مساوی ہوگا۔ (سیرت محمد یہ ترجمہ مواہب الدنیہ۔۷۰) مولانا مودودی بھی الم ترکیف کے متعلق کہتے ہیں کہ دیکھنے کا لفظ استعمال کیا گیا جبکہ مکہ اور مکہ کے اطراف واکناف اور عرب کے وسیع علاقہ میں مکہ سے یمن تک ابھی بہت سارے لوگ زندہ تھے' جنہوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جبکہ اس واقعہ کو ۴۰ یا ۴۵ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور سارا عرب اس کی متواتر خبریں دیکھنے والوں سے سن چکا تھا۔ یہ واقعہ لوگوں کے لیے آنکھوں دیکھے واقعہ کی طرح یقینی تھا۔'' دنیا کی ہر تاریخ میں اور ہر تاریخ کے اجزائے ترتیبی یہی عوامی شہادتیں اور بیانات ہوتے ہیں' تو پھر آپ کی ذات پر الزام کیسا۔؟

''لامنس'' کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی کے حالات محض افسانہ ہیں۔ مذکورہ بیانات اس مستشرق کے الزام کو رد کرتے ہیں۔ ان مستشرقین کی غرض ایسے الزامات دھرنے سے یہ ہوتی ہے کہ ثابت کیا جائے کہ دیگر انبیاء کے حالات زندگی کی طرح جن پر دبیز پردے پڑے ہیں اور بہت کم حالات

کا پتہ چلتا ہے، جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ بھی نہایت مختصر ہوتا ہے بلکہ کہیں کہیں ابہام کی گھٹائیں چھائی ہوتی ہیں، ثابت کرنا ہوتا ہے۔ جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کا ہر باب سورج کی طرح تاباں اور روشن نظر آتا ہے۔ ہر پل، ہر لمحہ، حضر یا سفر، امن یا سکون اور غزوات و سریہ کے واقعات پوری آب و تاب سے روشن ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ جو جو اور جس جس لمحے کر دکھایا۔

صدیاں بیتیں پھر بھی آپ کی زندگی میں انسانیت کے لیے ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

اقوام عالم میں آپ ﷺ سے قبل جتنے بھی دین کے پیشوا یا بانیان مذہب و ملت اور انبیاء کرامؑ گزرے ہیں ان کے تاریخی تعارف کے متعلق ان کی ولادت سے لے کر اب تک یقینی طور پر اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں جو بائبل میں ان کے متعلق مختصر تذکرہ درج ہے اور وہ عدم محفوظیت اور تحریفات کی وجہ سے ان کی عظمت شان کے خلاف ہے مثلاً حضرت نوحؑ کے متعلق کتاب پیدائش باب ۱۹، آیت نمبر ۲۱ میں ہے ''نوحؑ نے شراب پی اور ننگا ہو گیا'' اور حضرت لوطؑ کے متعلق کتاب پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰ تا اختتام باب میں مذکور ہے ''لوطؑ نے شراب پی اور اپنی صاحبزادیوں سے ہم بستر ہوا۔ وہ حاملہ ہوئیں اور ان سے اولاد پیدا ہوئی۔ نعوذ باللہ۔ انجیل متی باب چھبیس میں ہے کہ یہودا حواری نے تیس روپے رشوت لے کر مسیحؑ کو گرفتار کرایا'' اس کے برخلاف حضور ﷺ کی ذات وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخ میں تعارف کے اعتبار سے یکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیات مسیحؑ کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں لیکن ان تیس سالوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو انہوں نے نبوت سے پہلے گزارے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور آئندہ مزید انکشافات متوقع ہیں، تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے، کتنی قریب ہے اور کتنی دور، کتنی ممکن ہے کتنی ناممکن! ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ ہم ان کی والدہ ماجدہ کے بارے میں ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان کے ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے میں اور اس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسند نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پا کر یک دم خدائی مشن کے حامد بن گئے؟ بہر حال کتنے ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں اکثر کے ذہنوں سے ٹکراتے ہیں مگر وہ بس سوالات ہیں، جواب کے بغیر! البتہ محمد ﷺ کے بارے میں صورت یکساں مختلف ہے۔ یہاں ہمارے پاس اندھیروں کی بجائے تاریخ کی روشنی ہے۔ ہم محمد ﷺ کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا لوتھر اور ملٹن کے بارے میں۔ یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس، تخمینِ ظنی، ماورائے فطرت روایات اور افسانوی وضعوں سے آلودہ ہونے کی بجائے حقائق سے آراستہ ہے اور ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل

حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے کو دجل وفریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو۔ یہاں ہر چیز دن کی پوری روشنی میں جگمگا رہی ہے۔اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت کے بہت پرت ہیں اوران میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے تاہم محمد ﷺ کی زندگی کے متعلق ہر چیز جانتے ہیں۔ان کی جوانی،ان کی اٹھان،ان کے تعلقات ان کی عادات ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحہ ،ذہنی سفراءاورارتقاء وغیرہ۔ نیز ان کی داخلی باطنی زندگی کے متعلق بھی،اور یہ کہ جب اعلان نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسے مکمل کتاب پاتے ہیں جو اپنی ابتدا،اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ ممتاز ومنفرد ہے اوراب تک ایسی کوئی معقول ومستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے(باسورتھ اسمتھ ،ن۔۱۱۔۵۴۲)

(۲)جب قرآن نے ایک اصول دے دیا کہ خبر متواتر یقینی ہوتی ہے تو ان واقعات کو افسانہ کہنا دیوانے کا خواب اور مجذوب کی بڑ ہے۔ نیز قرآن مجید سے ایک اوراشارہ بھی ملتا ہے۔’’ آپ ﷺ کی زندگی میں مومنوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔‘‘ جب آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنا مقصود ٹھہرا تو پھر یہ کس منہ سے کہتے ہیں کہ کم حالات کا پتہ چلتا ہے یا ابتدائی حالات افسانہ ہیں کیونکہ نامکمل اسوہ کی پیروی نہیں کی جا سکتی اوراللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زندگی مومنوں کے لیے نمونہ بنادی‘ تو اس سے انکار کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس اسوہ کی پیروی کرنے سے انکاری اور بے زار ہیں۔متعصب مستشرقین کا آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی کے حالات وواقعات سے لاعلمی جہالت اورنادانی ہے جبکہ مکی دور کے روشن اور درخشاں واقعات جیسے جنگ فجار‘ حلف الفضول حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں قیام‘ شام کا تجارتی سفر‘ دادا جان اور ابوطالب کی کفالت‘ نکاح مبارک‘ حجر اسود کا نصب کرنے کا معاملہ وغیرہ تاریخی اوراق کی زینت ہیں جنہیں تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ان واقعات کو تاریخ سے محو نہیں کیا جا سکتا بلکہ مستشرقین اپنے تعصب پر ایسی آراء دیتے دیتے مٹ گئے اورمٹ جائیں گے۔لامنس کے الزام کے بارے میں مستشرقین کی رائے پیش کرتے ہیں۔لامنس کا الزام’’ مکی دور کے حالات محض افسانہ ہیں‘‘ واٹ کے نزدیک یہ نقطہ نظر بھی انتہا پسندانہ ہے کہ مکی دور کے سارے واقعات مشکوک یا غیر ثابت شدہ ہیں۔‘‘ایک اورجگہ واٹ‘ لامنس پر سخت تنقید کرتا ہے کہ وہ ذاتی رجحانات اور مفروضوں پر ساری عمارت کھڑی کر دیتا ہے واٹ نے لامنس کے اس انداز کو’’ مصادر سے کھلواڑ کرنے‘‘ سے تعبیر کیا ہے‘‘۔ نولدیکے نے جب لامنس کی تحقیقات پر اپنے خیالات کا اظہار اپنی کتاب Die Tradition Uber Das leben Muhammeds میں کیا تو واٹ نے یہ تبصرہ کیا کہ لامنس کے بہت سے غلو پسند خیالات میں ترمیم ہونی چاہیے۔‘‘(علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔۱۰۲)ان کے ہمنوا عالموں کا

لامنس کے بارے میں جب ایسی آراء ہیں کہ غلو پسند ہے' مفروضوں اور ذاتی رجحانات پر ساری عمارت کھڑی کر دیتا ہے تو ہمیں اس کے مفروضات سے کیا لینا دینا البتہ اس کے غلط الزامات سے پیدا کردہ شکوک کو رفع کرنا ضروری تھا اس لیے بیان کر دیا ورنہ اس کے ساتھی مستشرقین نے اس کی انتہا پسندانہ علمیت کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ دوسری طرف خود واٹ بھی ان غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے جیسے اس نے آنحضرت ﷺ کی ولادت اور حضرت خدیجہ سے آپ ﷺ کی شادی کے درمیانی عرصہ میں جو اہم واقعات پیش کرتا ہے ان کا جائزہ یوں لیتا ہے۔ ''شادی سے پہلے ان واقعات سے محمد ﷺ کی زندگی پوری طرح متاثر رہی' ایک مورخ کے نقطہ نظر سے چند باتیں غور طلب ہیں' اس کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسی روایتیں موجود ہیں جن کی نوعیت فقہی ہے لیکن ایک مورخ کے نزدیک وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ان میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں جن کو محمد ﷺ کی زندگی کے مختلف ادوار سے منسوب کیا جا سکتا ہے البتہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے پرہیزگار مسلمانوں کے لیے یہ روایتیں محمد ﷺ کے مقصد کو پورا کرتی ہیں' اس طرح ان کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے' وہ نبی کی زندگی کے شایان شان ایک ضمیمہ ہو سکتی ہیں' وہ عقیدت مندی کی پیداوار ہیں' بہرکیف اس جگہ ہم ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق زیادہ مشہور واقعات کو ہی بیان کریں گے۔'' واٹ نے ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق دو فرشتوں (شق صدر) اور بحیرہ راہب کے واقعات کو ذکر کیا ہے اور یہ تنقید کی ہے کہ نبی (ﷺ) کی پیدائش اور شادی کے درمیان ایک چوتھائی صدی کے عرصہ میں جو واقعات پیش آئے 'ان کے لیے قاری کو ٹھوس بنیادیں نہیں ملتیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ بحیرا راہب کا واقعہ اگر محل نظر ہے اور تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو دونوں فرشتوں کے ذریعہ شق صدر کے واقعہ کا کیوں انکار کیا ہے؟ حالانکہ ابن ہشام' ابن سعد اور بلاذری جیسے سیرت نگاروں اور مورخین کے علاوہ امام مسلم اور امام احمد جیسے محدثین نے بھی اس کو نقل کیا ہے' مزید برآں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس واقعہ کا تعلق غیبی سرچشمہ سے ہے جس کے بعد نبی کی ذات تاریخ کے عقلی تجربہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ (علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔۹۱) واٹ نے حضور ﷺ کا سال پیدائش ۵۷۰ء لکھا ہے' وجہ اختلاف نہیں لکھی' بغیر وجہ اختلاف اور حوالہ کے یوں ہی لکھ دینا معتبر نہیں ہوتا۔

اعتراض نمبر ۲۴

ڈاکٹر منظور ممتاز (انسان کامل و نبی مکمل۔۸) لکھتا ہے'' کہ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن ان واقعات کا پایہ ثبوت تک پہنچنا از حد مشکل ہے کہ ایک طرف تو ایوان کسریٰ کے کنگروں کے گرنے کی تاریخ و وقت کسی تحریر سے ثابت ہو اور (۲) ادھر اس یتیم بچہ کا اسی تاریخ اور اسی وقت پیدا ہونا بھی تحریراً ثابت ہو سکے جو ممکنات میں اس لیے نہیں کہ عبدالمطلب کے پیدائشی یتیم پوتے کا پیدا ہونا اس وقت ایسا عظیم واقعہ نہ

تھا جسے مکہ کے معدودے چند پڑھے لکھے لوگ تحریر کرتے' (۳) حالانکہ مکہ کے لوگ کاغذ کے استعمال سے آشنا نہ تھے' (۴) بادشاہوں کی اولاد کی تاریخ پیدائش کو بھی تحریر سے ثابت کرنا ناممکن سی بات ہے تو پھر مکہ کے ایک خاندان میں پیدائشی یتیم کی تاریخ ولادت کا تحریری ثبوت کہاں میسر آ سکتا ہے''؟

جواب: آپ کی ولادت باسعادت ۲۱ اپریل ۵۷۰ء بوقت صبح عرب کے شہر مکہ میں ہوئی۔

روایات سے نبی مکرم ﷺ کی ولادت کے متعلق کچھ عجائبات کا ثبوت ملتا ہے مثلاً حضرت آمنہؓ کا دیکھنا کہ ان سے ایک نور جدا ہوا، اس شب میں ایوان کسریٰ کے کنگرے گر پڑے گویا آپ کی تاریخ ولادت ایوان کسریٰ کے کنگروں کے گرنے کی تاریخ ہوئی نیز تاریخ اس سلسلہ میں خاموش ہے کہ ایوان کے کنگرے قبل یا بعد از ولادت گرے لہٰذا ثابت ہوا کہ کنگروں کے گرنے کی تاریخ اور وقت آپ کی ولادت کی تاریخ اور وقت ہی ہے۔ کیونکہ آپ کی تاریخ ولادت کی شہادت ماخذ اور مصادر دیتے ہیں اور محل کے کنگروں کا گرنا آپ ﷺ کی ولادت کے موقع پر ہوا لہٰذا آپ کی ولادت کی تاریخ و وقت کنگروں کے گرنے کی تاریخ اور وقت ہے۔ رہی یہ بات کہ ولادت کی تاریخ تحریری طور پر ثابت کرنا از حد مشکل ہے تو اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تحریری تاریخ پیدائش ثابت کرنا ناممکن نہیں اور جس کو ماخذوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے جن کا درجہ نہایت قوی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی ولادت سے قبل کی صدیوں پر محیط تاریخی ریکارڈ پہلی اقوام کے حالات کا پتہ دیتا ہے جس طرح آپ کی ولادت سے قبل نصف صدی سے کم واقعہ اصحاب الفیل لوگوں کے حافظہ میں تھا۔ عرب کا حافظہ بلا کا تھا بلکہ امام زہری کا بیان لوگ نقل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں ''بقیع کی طرف گزرتا ہوں تو اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہوں' اس اندیشہ سے کہ ان میں کوئی فحش بات داخل نہ ہو جائے کیونکہ قسم خدا کی میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی داخل نہیں ہوئی جسے میں بھول گیا ہوں (تدوین حدیث از مناظر احسن گیلانی۔۴۳)۔ کسی چیز کو ریکارڈ اور محفوظ کرنے کے طریقے حافظہ' تحریر اور عمل کے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی موجودہ کتابی شکل جو آج ہمارے ہاں موجود ہے کتابت اور حافظہ کے دو طریقوں سے محفوظ کیا گیا ہے عرب حافظہ میں قوی تھے اور بلا کی یادداشت رکھتے تھے تو وہ لوگ آپ کی پیدائش کو محفوظ کرنے سے کیونکر غافل رہے ہوں گے؟ اگر تحریری ثبوت میسر نہیں تو ان حفاظ کے واسطہ سے آپ کی تاریخ ولادت محفوظ ہوگئی اور بعد ازاں ضبط تحریر میں لائی گئی تو اس میں کون سی اچنبھے کی بات ہے؟ ان حفاظ کے ذریعے خبر متواتر ملتی ہے جو کسی واقعہ سے یا قصہ سے متعلق ہوتی ہے اور اس خبر کا علم حقیقت میں دیکھنے کے برابر ہوتا ہے جیسے قصہ اصحاب الفیل' آپ ﷺ کی تشریف آوری کی متواتر خبریں یہود و نصاریٰ کے علماء کی زبان زد تھیں۔ آپ کی آمد کی بشارت ''وَمبشر برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد'' (الصّف۔۲۶۔۶۱) حضرت عیسیٰؑ نے دی اور قرآن

نے تصدیق فرما دی۔ آپ ﷺ کی پیدائش مبارک سے قبل راہبوں کا عربوں کو مطلع کرنا اور ولادت ہونے پر چیخ اٹھنا کہ وہ آج پیدا ہو گیا جس کی آمد کے وہ منتظر تھے' نیز یہ بھی کہہ اٹھے کہ بنی اسرائیل سے نبوت جاتی رہی' اس قدر شہرت و مشہوری اور متواتر خبروں سے فرار ممکن نہیں۔

عبدالمطلب کے پیدائشی یتیم پوتے کا پیدا ہونا اس وقت عظیم واقعہ نہ تھا جسے مکہ کے معدودے چند پڑھے لکھے لوگ تحریر کرتے جبکہ مکہ کے لوگ کاغذ کے استعمال سے آشنا نہ تھے''۔

جواب: یہ بات درست نہیں کیونکہ قبل از ولادت آپ کے عظیم ہونے کی پیش گوئیاں سابقہ آسمانی کتب میں موجود تھیں۔ یہود و نصاریٰ کے علماء ایک نبی کی آمد کے منتظر تھے' انہیں صدیوں سے انتظار تھا اور انہوں نے آپ ﷺ کی دنیا میں تشریف لانے کی خبریں خوب پھیلائیں آپ ﷺ کی شہرت ولادت سے قبل اطراف و اکناف میں پھیل چکی تھی بایں سبب آنے والے نبی کے نام پر لوگوں نے اپنے بچوں کے نام رکھے' شائد کہ یہی بچہ وہ الصادق اور الامین ہو مگر اسے ہی بنانا تھا جس کا انتخاب خدائے لم یزل کی طرف سے ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ کی ولادت پر یہود و نصاریٰ کے علماء اور راہب پکار اٹھے' وہ آ گیا' وہ آ گیا جس کا انتظار تھا۔ ولادت سے پہلے اور بعد جسے اتنی شہرت ملی لوگوں میں اس کی آمد کے چرچے رہے تو پھر ڈاکٹر صاحب کا کہنا کہ عبدالمطلب کا پیدا ہونا عظیم واقعہ نہ تھا' یہ کہنے میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی جسارت کی ہے۔ دادا جان کا اپنے پوتے کا نام محمد ﷺ رکھنا از خود ایک عظیم واقعہ ہے تبھی تو قریش نے پوچھا تھا کہ اس نومولود کا نام محمد ﷺ کیوں رکھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ اللہ آسمان میں اور اللہ کی مخلوق زمین میں اس بچے کی تعریف کے گن گائے۔ صلوا علیہ وآلہ وسلم

اہم نکتہ: اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیش گوئی جس کی تصدیق قرآن مجید نے کی اور دیگر کتب آسمانی میں آپ سے متعلق پیش گوئیاں موجود ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلے کی پیش گوئیاں ہیں اور ولادت کے وقت کسے معلوم کہ ان پیش گوئیوں کا مصداق یہی دریتیم ہے؟ لیکن اس بات سے انکار کیسے ممکن ہے ''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مکہ میں ایک یہودی تجارت کرتا تھا جس رات آنحضرت ﷺ کی ولادت ہوئی' اس یہودی نے پوچھا ''اے گروہ قریش کیا تم لوگوں میں آج کی رات کوئی مولود پیدا ہوا ہے؟ قریش نے کہا کہ ہمیں اس کا علم نہیں۔'' اس نے کہا۔۔ آج کی رات اس آخری امت کا نبی پیدا ہوا ہے۔ قریش یہ سن کر یہودی کو ساتھ لے کر آپ کی والدہ ماجدہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ کے بیٹے کو دیکھنے آئے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہؓ نے انہیں آپ ﷺ کو دکھایا۔ قریشیوں نے آپ ﷺ کی پشت مبارک سے کپڑا ہٹایا تو یہودی اس علامت نبوت کو دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑا اس نے کہا اللہ کی قسم آج سے نبوت بنی اسرائیل سے چلی گئی۔

عبدالمطلب اپنے گھر سے نکلے اور عیصی کے پاس آ کر اسے آواز دی۔ اس نے مکان پر سے عبدالمطب کو دیکھا اور کہنے لگا خدا کرے تم ہی اس مولود کے باپ ہوں میں جس مولود کی تم لوگوں سے باتیں کیا کرتا تھا' وہ آج یعنی دوشنبہ کو پیدا ہوگیا' وہ دوشنبہ کے دن نبی ہوگا اور دوشنبہ کے دن وفات پائے گا۔عبدالمطلب نے کہا آج کی رات صبح کے وقت ایک مولود میرے ہاں پیدا ہوا ہے۔ عیصی نے پوچھا تم نے اس کا کیا نام رکھا ہے؟ عبدالمطلب نے کہا: محمد ﷺ۔ عیصی نے کہا اے اہل بیت اللہ۔۔ میں واللہ یہ تمنا کرتا تھا کہ یہ مولود تم لوگوں میں پیدا ہو۔۔ تین خصلتوں کے باعث کہ وہ خصلتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ وہی مولود ہے جو ان تین خصلتوں پر آیا ہے۔

اول: اس مولود کا ستارا آج کی رات طلوع ہوا۔۔

دوم: وہ آج کے دن پیدا ہوا ہے یعنی سوموار۔

سوم: اس کا نام محمد ﷺ۔ ایک ایک پل یہود و نصاری کے علماء نبی مکرم کی تعریفیں کر رہے ہیں یہودی جسے دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر رہا ہے کیا یہ خبر دانگ عالم میں پھیلی نہ ہوگی اور ڈاکٹر صاحب ہیں کہ انہیں یہ واقعہ عظیم ہی نہیں لگتا اور روایات سے اعراض کرتے ہیں۔ مکہ کے معدودے چند لوگ پڑھے لکھے تھے اور اہل مکہ کاغذ کے استعمال سے ناآشنا تھے۔'' سب سے پہلے زمانہ جاہلیت کو سمجھ لینا ضروری ہے' اس کا ترجمہ و مفہوم کہ عرب کے چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہ تھے۔ مستشرقین کے یہ دونوں نظریے غلط اور حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ عربی زبان اور قرآن مجید کے عام محاوروں سے ناآشنائی ہے اور ان کے خلاف ہے' یہ ترجمہ و مفہوم سمجھنا عربی لٹریچر سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ لکھنے پڑھنے کے سلسلہ میں عرب کا بھی یہی حال تھا جو عموماً اس زمانہ میں ہے۔ اگر کامل متمدن ممالک نہیں تو نیم متمدن ممالک کا حال یہی ہے۔ جس طرح قدیم زمانہ میں تقریباً ہر ملک اور قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا اور عام کو اس سے چنداں تعلق نہ تھا جس طرح ہزار ہا کوششوں کے باوجود ترقی یافتہ دنیا میں آج بھی شرح خواندگی کم ہے ہمارے اپنے ملک پاکستان کی شرح خوندگی ۵۲ فیصد ہے اور باقی ناخواندہ۔ عربوں کی ایک خاص تعداد یا معدودے چند پڑھے لکھے لوگوں کی تھی' ایسا نہیں کہ گنتی کے چند لوگ پڑھے لکھے تھے جنہیں انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کہ ہمارے کچھ کرم فرماؤں نے ان کی تعداد سترہ تک لکھ دی ہے' توجہ فرمائیے! مدرسوں کے سلسلے میں کسے یقین آ سکتا ہے کہ اس زمانہ جاہلیت میں وہاں نہ صرف تعلیمی درس گاہیں بلکہ ایسی درس گاہیں تھیں جن میں مخلوط تعلیم تھی۔ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں بیان کیا ہے کہ مکہ کے قریب رہنے والے قبیلہ ہذیل کی ضرب المثل فاحشہ ظلمہ جب بچی تھی' وہ ایک مدرسہ میں جاتی تھی اور اس کا دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتوں میں قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرتی' اس دلچسپ

واقعہ سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ قریش کے رشتہ دار قبیلہ ہذیل میں ایسے مدرسے تھے جو چاہے کتنی ابتدائی نوعیت کے ہی کیوں نہ ہوں' ان میں لڑکیاں اور لڑکے اکٹھے تعلیم پاتے تھے (ن۔۴۔۱۱۶)

ف: زمانہ جاہلیت میں مدرسے تھے۔ (۲) عوام میں اپنے بچے بچیوں کو تعلیم دلوانے کا رواج تھا۔ (۳) مخلوط تعلیم تھی۔ (۴) سامان نوشت وخواند میسر تھا تو ان مدارس کی موجودگی میں یہ کیسے مان لیا جائے کہ جہاں لڑکیاں لڑکے تعلیم حاصل کرتے ہیں اس وقت مکہ کے معدودے چند لوگ پڑھے لکھے تھے؟ کیا درس گاہیں تو تھیں اور بچے تعلیم حاصل کرنے نہیں جاتے تھے؟ کیا اساتذہ موجود نہ تھے؟ یا عوام میں بچوں کو تعلیمی زیور سے آراستہ کرنے کا شوق نہ تھا؟ یا سامان نوشت وخواند نہ تھا؟ جب تعلیم کے حصول میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی تو یہ کہہ دینا کہ چند لوگ تعلیم یافتہ تھے' درست نہیں۔ ڈاکٹر محمد عجان الخطیب کے حوالہ سے (صاحب ضیا النبی۔۷۔۱۱۰۔۱۰۹) لکھتے ہیں ''علمی تحقیق اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے کہ عرب کے لوگ اسلام سے پہلے لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور وہ اپنی اجتماعی زندگی کے اہم واقعات پتھروں پر لکھ دیتے تھے۔۔۔ مزید کہتے ہیں کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مدارس موجود تھے جن میں بچے کتابت' شاعری اور عربی تاریخ سیکھتے تھے اور ان مدارس کے بڑے با اثر معلم ہوتے تھے جیسے ابوسفیان بن امیہ وغیرہ'' اور جو شخص کتابت' تیراندازی اور تیراکی میں ماہر ہوتا اسے ''کامل'' کا لقب عطا کرتے تھے'' عکاظ کے میلے میں شاعر' خطیب' مقرر' ادیب شرکت کرتے تھے گویا عرب میں عربی زبان کو ایک تحریری زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔

فرض کریں یہ مان لیا جائے کہ عرب کاغذ کے استعمال سے نا آشنا تھے' تو اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت کو ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا جبکہ اس وقت نوشت کے سامان میں کئی چیزیں میسر تھیں مثلاً جانوروں کی ہموار ہڈیاں' چمڑے کی باریک جھلیاں اور ہموار پتھروں کی تختیاں (جسے آج کل سلیٹیں کہتے ہیں) اور ہموار لکڑی کی تختیاں' جو آج کل بھی استعمال میں ہیں یا دھات کے ٹکڑوں پر' اندراج کیا گیا ہوگا یا حفظ کر لیا گیا ہوگا۔ ہجرت کے موقع پر گرفتار کرنے کے لیے سراقہ بن مالک آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا تعاقب کرتے ہوئے نزدیک آ پہنچتا ہے۔ گھوڑا زمین میں دھنس جاتا ہے تین بار اسی طرح ہوا آخر وہ اپنا اردادہ ترک کر دیتا ہے اور بارگاہ نبوی میں درخواست کرتا ہے کہ امان نامہ عطا فرمائیں۔ امان نامہ لکھ کر دے دیا جاتا ہے۔ ذرا سوچیں! جس چیز پر یہ امان نامہ لکھا گیا تھا وہ چمڑے کی جھلی تھی اب یہ بات غلط ثابت ہوئی ہے کہ لہذا کاغذ کے نہ ملنے سے تاریخ ولادت کی تحریر سے انکار ممکن نہیں کیونکہ کسی بھی میسر لکھنے والی چیز پر تاریخ پیدائش لکھی جا سکتی تھی۔ محض کاغذ کی نایابی اور نا آشنائی کے بہانہ سے انکار کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ کاغذ لکھنے کے لیے میسر نہیں تو نا سہی' کوئی حرج نہیں کیونکہ دوسری چیزیں نوشت کے لیے دستیاب ہیں۔ حرج تو تب ہوتا کہ لکھنے کے لیے کوئی چیز

بھی نہ ملتی۔ ہر دور میں مختلف اشیاءِ نوشت موجود تھیں جیسے قدیم زمانہ کے کتبے جو دھات سے بنے ہوتے تھے آج کل دریافت ہو رہے ہیں اور ان پر لکھی عبارات سے بہت انکشافات ہو رہے ہیں۔ اہل عرب کے سبع معلقات اور مقاطعہ قریش کعبہ میں آویزاں تھے غسان اور حبشہ کے شہزادوں سے تجارتی تحریری معاہدات تھے۔ ورقہ بن نوفل نے توریت کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا۔ یہ سب تحریری ثبوت ہیں جو کسی چیز پر آخر کار لکھے گئے تھے۔ آپ کے دادا جان خواجہ عبدالمطلب بن ہاشم نوشت و خواند سے آشنا تھے ابن الندیم کہتا ہے مامون الرشید کے کتب خانہ میں خواجہ عبدالمطلب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک دستاویز تھی یہ چمڑے پر لکھی ہوئی تھی اس کے الفاظ یہ تھے میں عبدالمطلب بن ہاشم مکہ کا رہنے والا ہوں میں نے فلاں بن فلاں ذات حمیری ساکن صنعا کو چاندی کے ایک ہزار درہم قرض دیئے ہیں یہ اس پر واجب الادا ہیں جب طلب کیے جائیں گے وہ ادا کرے گا اللہ اور اس کے فرشتے اس پر گواہ ہیں''۔ (سیرت اعلان نبوت سے پہلے۔ ۲۲۶)

اب جہاں تک کاغذ سے نا آشنائی کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں عرض ہے کہ تسائی لون نے شہنشاہ ہوتی کو ۱۰۵ء کے قریب کاغذ کے نمونے پیش کیے تھے۔ تسائی کی ایجاد سے پہلے مغرب میں چرمی کاغذ استعمال ہوتا تھا اور مصری یونانی پیپرس نے چمڑے کے کاغذ کی جگہ لے لی۔ ۷۵۱ء میں عربوں نے چینی لوگوں سے کاغذ کا ہنر سیکھا اور تھوڑے عرصہ میں ثمرقند اور بغداد میں کاغذ تیار ہونے لگا گویا ولادت مبارک اور عربوں کا کاغذ کے ہنر کو سیکھنے کی درمیانی مدت میں کاغذ نہ سہی تو کچھ نہ کچھ اور کوئی نہ کوئی سامان نوشت موجود تھا۔ تسائی کا ۱۰۵ء میں کاغذ کے نمونے ہوتی شہنشاہ کو دکھانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاغذ ایجاد ہو چکا تھا لیکن شاید پوری دنیا میں ابھی نہ پہنچا ہو اور رفتہ رفتہ کاغذ دنیا میں پہنچنے لگا۔ عربوں میں کتابت کے رواج کے متعلق ڈاکٹر فواد سزگین اپنی کتاب ''مقدمہ تاریخ تدوین حدیث'' میں رقم طراز ہے ''اسلام سے قبل ایک صدی کے بعض شعراء کی روایت سے ہمیں کم از کم یہ پتہ چلتا ہے کہ دواوین سے روایت ان کے یہاں ایک رائج طریقہ تھا اور شعراء کو تو لکھنے کی عادت بھی تھی۔ زہیر بن ابی سلمہ جیسے شعراء خود اپنے قصائد کی تنقیح کیا کرتے تھے۔ یہ نظریہ کہ جاہلی شاعری کا سارا ذخیرہ زبانی روایت پر مبنی ہے دور جدید کی ہی تخلیق ہے اس طرح یہ بھی ایک غلط خیال ہے کہ حدیث کی روایت محض زبانی ہوتی رہی بلکہ صدر اسلام میں نصوص مدونہ کو روایت کرنے کا رواج دور جاہلیت کی عادت پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ بادشاہوں کی اولاد کی تاریخ پیدائش کو بھی تحریر سے ثابت کرنا ناممکن سی بات ہے تو پھر مکہ کی ایک خاندان میں پیدائشی یتیم کی تاریخ ولادت کا تحریری ثبوت کہاں سے میسر آسکتا ہے؟۔

جواب: اس عبارت میں آپ پر بادشاہوں کی اولاد کو فوقیت دی گئی ہے (نعوذ باللہ) تحریری تاریخ پیدائش کا فارمولا وضعی ہے وہ اس طرح کہ بادشاہوں کی اولاد کی تاریخ ولادت کا تحریری ثبوت نا

ممکن ہے تو مکہ کے ایک خاندان کے پیدائشی یتیم کا تحریری ریکارڈ کیسے میسر آ سکتا ہے؟ خواہ کوئی ہوا گر اس کی تاریخ پیدائش کا تحریری ثبوت نہیں ملتا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دوسرے شخص کی تاریخ پیدائش بھی تحریری طور پر نہیں مل سکتی ۔ یہ فارمولا سرے سے غلط اور وضعی ہے کاغذ کی ایجاد ۱۰۵ ء میں ہوئی ۔آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ۵۷۱ ء میں ہوئی گویا ۴۶۶ سال پہلے کاغذ موجود تھا جسے استعمال میں لایا جاتا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ سرداروں اور عظام کا گھرانہ ہے۔حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں ۔ صحیح مسلم میں ہے ''واثلہ بن اسقع سے روایت ہے۔آپ نے فرمایا'' اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے فرزندوں میں سے کنانہ کو اور کنانہ سے قریش کو اور بنی ہاشم کو قریش سے برگزیدہ کیا اور مجھ کو بنی ہاشم سے برگزیدہ کیا'' ۔آپ ﷺ اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور اسی خاندان سے آپ ﷺ آخری پیغمبر ہیں ۔ان کے خاندان کے عظام کے حالات مختصر لکھتے ہیں ۔مکہ حضرت اسمعیلؑ کے فرزند نابت کعبہ کے متولی ہوے' ان کے بعد مضاض بن عمرو جرہمی متولی ہوے یہ مضاض نابت بن اسمٰعیلؑ کی اولاد کے نانا ہیں' بقول ڈاکٹر حمید اللہ' کچھ دیر کے لیے حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد اور بنو جرہم میں مشترکہ کنٹرول رہا ہو' بعد ازاں بنو جرہم جلاوطن ہوئے تو غیشان جو بنو خزاعہ میں سے تھے' کعبہ کے متولی ہوے۔ یہاں تک کہ ان کا آخری جانشین حلیل بن حبشہ بن سلول ہوا۔قصی نے اس کی بیٹی جبی سے شادی کر لی' ان کے چار فرزند عبدالدار' عبدلمناف' عبدالعزیٰ اور عبداء ہوے۔قصی کے مال اولاد میں ترقی ہوئی' ادھر ان کے خسر حلیل وفات پا گئے تو انہوں نے کہا کہ کعبہ کی تولیت کے ہم زیادہ مستحق ہیں نہ کہ بنی بکر اور بنی خزاعہ' حتٰی کہ تولیت قصی کو مل گئی ۔ وہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی حکومت پر مسلط ہو گئے' انہوں نے تمام اطراف سے قوم کو بلا کر مکہ میں آباد کیا اور اہل مکہ جن چیزوں کے مالک تھے' انہیں ان کا مالک ہی رکھا قصی نے نظم و نسق حکومت چلانے کے لیے کئی محکمے بنا کر قریش کے دس خاندانوں میں بانٹ دیے لیکن خانہ کعبہ کی کل خدمات مثل حجابہ' سقایہ' رفادہ' ندوہ اور لواء اور قیادہ ان کے تصرف میں رہیں ۔ کیا یہ گھرانہ سرداروں کا گھرانہ نہ تھا؟ آپ کے دادا نے حبشہ اور غسان کے بادشاہوں سے تجارتی معاہدے کیے' جس سے عربوں کے مال کو لٹنے کا کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہا۔کعبہ کی تولیت کے سبب پورے عرب میں ہاشمی گھرانے کی عزت کی جاتی تھی ۔ نہ جانے یہ تاریخی حقائق ڈاکٹر صاحب کی نظر سے کیوں دور رہے ۔؟ ولادت سے قبل آپ کی آمد ﷺ کی پیش گوئی حضرت عیسٰیؑ نے کی

(۲) ان سابقہ الہامی کتب میں آپ کی علامات موجود تھیں

(۳) آپ کے وسیلہ سے (قبل از ولادت) یہودی فتح پانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا طلب کرتے تھے

(۴) یہود ونصاریٰ کے علماء اور راہبوں نے آپ کی آمد کے چرچے اطراف واکناف میں کیے۔ خبریں دیں کہ ایک نبی عنقریب آنے والا ہے۔

(۵) یہودی پکار اٹھتا ہے اے گروہ قریش! کیا تم لوگوں میں آج کی رات کوئی مولود پیدا ہوا ہے' انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے' اس نے کہا اس امت کا آخری نبی پیدا ہوا ہے' اس کے دونوں شانوں کے درمیان ایک علامت ہے۔ قریش یہ سن کر یہودی کو ساتھ لیے بی بی حضرت آمنہؓ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تیرے فرزند کو دیکھنے آئے ہیں۔ بی بی آمنہؓ نے آپ ﷺ کو انہیں دکھایا' قریشیوں نے پشت مبارک سے کپڑا ہٹایا تو یہودی اس نبوت کی علامت کو دیکھ کر بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس نے کہا! اللہ کی قسم آج سے بنی اسرائیل سے نبوت چلی گئی۔ (مواہب لدنیہ۔۹۱) عیصی نامی یہودی راہب نے بھی آپ کے دادا جان کو آپ ﷺ کے نبی ہونے کا بتایا نیز علامات بھی بتائیں۔ قبل از ولادت پیش گوئیاں' پیدا ہونے پر راہبوں کا اعتراف کرنا کہ آج ''احمد ﷺ'' کا وہ ستارہ جس کے ساتھ آج کی رات وہ پیدا ہوئے ہیں، طلوع ہو گیا ہے۔'' ایسی باتیں بادشاہوں کی اولاد کے متعلق بھی کہیں ملتی ہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

بعض کا یہ لکھنا تعجب خیز ہے کہ اس واقعہ کو دروغ گو راویوں نے یہاں تک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن سال تاریخ اور وقت' تمام کا حال معلوم تھا حالانکہ ولادت نبوی سے قبل علماء یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط وخال معلوم تھا بلکہ پرانے گھرانوں' دیروں اور کنیسوں میں ایسی مخفی کتب موجود تھیں جن میں آپ کا تمام حلیہ لکھا ہوا تھا اور اگلے لوگ ان کو بہت چھپا چھپا کر رکھا کرتے تھے بلکہ بعض دیروں میں آپ کی تصویر تک موجود تھی۔ تورات وانجیل میں آنحضرت ﷺ کے متعلق بعض پیش گوئیاں حقیقت میں موجود تھیں اور وہ آج بھی ہیں لیکن وہ استعارات وکنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں' ان کو ضعیف اور موضوع روایتوں میں صاف صاف آپ کے مرتبہ ومقام کی تخصیص وتعین کے ساتھ پھیلایا گیا ہے۔ (ترجمان السنہ۔۴۔۵۵) اس پر قرآن مجید کی شہادت موجود ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (الانعام ۲۰، پارہ ۷) ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اسی طرح ہمارے اس پیغمبر ﷺ کو بھی پہچانتے ہیں''۔ تفاسیر میں منقول ہے کہ ''جب کسی نصرانی سے مسلمان ہونے کے بعد یہ سوال کیا گیا کہ کیا تم کو آنحضرت ﷺ سے فی الواقع اولاد کی سی ہی معرفت حاصل تھی' تو اس نے کہا' بلکہ اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر کیونکہ اپنی اولاد کا تعین تو صرف عورت (اس کی والدہ) کے بیان پر ہوتا ہے جس کی دیانت اور صداقت میں شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے' لیکن آنحضرت ﷺ کی معرفت تو ہم کو ان صحف سماویہ کے ذریعہ

سے حاصل تھی جس میں شک وتردد کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

آپ کے اس سابق تعارف کی بناء پر کتب سیرت وتاریخ سے اہل کتاب کا آپ کے لیے منتظر رہنا بلکہ پیدائش کے بعد ایک معین وقت پر تلاش کے لیے نکل کھڑا ہونا بھی ثابت ہے اور آپ کے اسی تعارف کی وجہ سے ظہور قدسی سے قبل اہل کتاب میں بڑی گرما گرمی سے آپ کا چرچا تھا بلکہ ایک دوسرے سے مقابلہ کے وقت آپ کے ساتھ مل کر دوسروں کو جنگ کی دھمکیاں دینا ثابت ہیں۔ اگر یہ تعارف غیر معمولی اور اتنا عام نہ تھا تو تمام اہل مدینہ ہمہ وقت آپ کے ظہور کے انتظار میں آسمان کی طرف نظریں کیوں لگائے بیٹھا تھا۔ ہر اس ہستی کے انتظار میں بے تاب رہنا' اس کی آمد کی بشارتیں دینا اور صحف سماویہ میں درج علامتیں اور صفات اس قدر واضح ہوں تو بھلا وہ لوگ تاریخی ریکارڈ رکھنے میں کیونکر غفلت برت سکتے تھے۔ وہ تو ایسے محبوب کی ہر ادا کو ہر پل اور ہر گھڑی یاد کر کے سعادت دارین کے مستحق بنتے تھے۔ مذکور تاریخی حقائق کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں سوائے اس کے کہ آدمی کی اپنی غرض پوری نہ ہو سکے اور وہ ہر شے کو تج دے اور اپنے موقف پر ڈٹا رہے اور اپنی انا کو تسکین باہم پہنچاتا رہے تو وہ گویا آنکھیں رکھنے کے باوجود اپنی اغراض میں اندھا ہوتا ہے کسی نے خوب کہا ہے۔

اپنی غرض میں آنکھوں والا
اکثر اندھا ہوتا ہے

آپ ﷺ کے دادا جان آپ کی پیدائش کے وقت طواف کعبہ میں مصروف تھے۔ سیدہ آمنہؓ نے اپنے لخت جگر کی ولادت کی اطلاع بھیجی۔ یہ خوشخبری سنتے ہی آپ گھر چلے آئے۔ خواجہ عبدالمطلب اپنے پوتے کو اٹھائے' سینے سے لگائے' اللہ کے گھر تشریف لائے اور یہ دعا مانگی۔ "اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے یہ پاکیزہ جسم وجان فرزند عطا کیا۔ (۲) جو جھولے میں بچوں کا سردار ہے اور میں اسے بیت اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں (۳) جب تک یہ بولیں' باتیں کریں اور اس کی زبان کھلے' دشمنوں کا کوئی شر اسے ضرر نہ پہنچا سکے اور حاسدوں کی آنکھ سے خداوند دوجہاں اسے محفوظ ومامون رکھے" (خاتم النبیین۔ حکیم محمود احمد ظفر۔ ۱۱۰)۔

اعتراض نمبر ۲۵

آگے بڑھنے سے پہلے اس اعتراض کو لیتے ہیں کہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت آمنہؓ نے اپنے فرزند عالی مقام کی ولادت کی اطلاع ان کے دادا جان کو کیوں دی۔

۲۔ سرولیم میور ایک اور الزام دھر دیتا ہے، وہ کہتا ہے "مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت آمنہؓ نے حضرت عبدالمطلب سے کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا کہ اس لڑکے کا نام "احمد" رکھنا" خطبات احمدیہ۔ ۴۳۸

جواب: خاندان کے بزرگوں کو نومولود بچے کی ولادت کی اطلاع دینا خوش آئند فعل ہے۔ خبر دینے

میں کوئی حرج نہیں۔حرج اور نقص والی بات تو یہ تھی کہ دادا جان کو پوتے کی ولادت کی اطلاع نہ دی جاتی ' ولادت کی اطلاع دیکر ثابت کر دیا کہ ختمی المرتبت کی والدہ کو سسرال نے تنہا چھوڑ نہیں دیا تھا بلکہ خاندان کے سردار کی نگہداشت میں تھیں اور وہ ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے معاون و مددگار تھے۔

(۲) عرب قبائل کی شان اور بلندی کا ایک عنصر افرادی قوت بھی تھی۔عرب معاشرہ میں اولاد نرینہ باعث افتخار تھی۔قبیلہ کی افرادی قوت سے دوسرے قبائل پر دھاک بیٹھتی تھی۔اس خبر کو سنتے ہی دادا جان خوش ہوئے ہوں گے۔

(۳) نیز آپ ﷺ کے دادا جان کو اطلاع دینا اس لیے بھی ضروری تھا کہ آپ کے فرزند حضرت عبداللہ سیدنا محمد ﷺ کی ولادت سے قبل دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔دادا جان کو اپنے فرزند عبداللہ کی نشانی اس عظیم نومولود بچہ کی صورت میں ملی جس سے آپ کو قلبی اطمینان ہوا ہوگا۔(۴) آپ کی ولادت کی خبر دینا اس لیے بھی ضروری تھا کہ عبدالمطلب قریش اور اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔آپ ہی نومولود کے کفیل تھے جب تک وہ زندہ رہے انہوں نے یہ ذمہ داری سنبھالے رکھی بلکہ نبھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ برکہ سے مروی ہے' میں نبی مکرم کی تربیت پر مامور تھی۔آپ کا بہت خیال رکھتی تھی ۔ایک روز آپ سے غافل ہوگئی۔اس اثناء میں عبدالمطلب کو اپنے سر پر کھڑے دیکھا اور ان میں یوں باتیں ہوئیں۔عبدالمطلب :اے برکہ!

برکہ: لبیک (میں حاضر ہوں)۔

عبدالمطلب: جانتی ہو میں نے اپنے بچے کو کہاں پایا؟

برکہ: مجھے علم نہیں ہے۔

عبدالمطلب: میں نے اسے بیری کے درخت کے قریب بچوں کے ساتھ پایا ہے۔میرے بچے سے غافل نہ رہا کرو۔کیونکہ اہل کتاب خیال کرتے ہیں کہ یہ اس امت کے نبی ہیں اور میں ان کو اہل کتاب سے مامون نہیں سمجھتا۔(سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔۷۷)

کعب بن مالکؓ جب غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے تو ان سے صحابہ کرام کی بول چال نہ رہی۔ وہ اکیلا رہ گیا کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا حتیٰ کہ بارگاہ نبوی سے اپنی بی بی سے علیحدہ رہنے کا حکم بھی مل گیا۔باوجود کشادگی اس پر زمین تنگ ہوگئی اور وہ سمجھا کہ اب کوئی بچاؤ اور معافی کا راستہ نہیں سوائے بارگاہ الٰہی سے معافی مانگنے کے۔کعب کہتے ہیں ''خدا کی قسم !اللہ نے اس سے بڑھ کر کوئی احسان نہیں کیا بعد اسلام کے جو اتنا بڑا ہو میرے نزدیک کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سچ بول دیا۔جھوٹ نہیں بولا ورنہ تباہ ہو جاتا جب پچاس دن گزرے تو ایک شخص کی آواز سنی' کہہ رہا تھا اے! کعب خوش ہو جا یہ سن کر میں سجدہ

شکر میں گر گیا پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو خبر دی کہ اللہ نے کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھیوں سمیت سب کو معاف کر دیا۔ یہ ایک طویل احادیث ہے جس کا ایک ٹکڑا متعلقہ اعتراض کے مطابق لکھ دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ شکر کسی خوش خبری پر بجالانا مستحب ہے۔ خوش خبری دینا اور مبارک بادی دینا اور خوشی کا اظہار کرنا ایسے موقعوں پر کار ثواب ہے۔ اور خوشیوں میں دوسروں کو شامل کرنا خوش آئند ہے۔

اعتراض کا دوسرا جز

جواب: سرسید اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ سرولیم میور نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے۔ اگر تورات مقدس کی یہ آیات "اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے؟ اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسمٰعیلؑ رکھنا"۔ (بحوالہ کتاب پیدائش۔۱۱۔۱۶) نیز یہ آیت کہ "اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارہ تیری بی بی کے بے شک ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسحٰقؑ رکھنا" اور نیز انجیل کی یہ آیت "اور اس کے (یعنی مریم کے) ایک بیٹا پیدا ہوگا اور تجھ کو (یوسف کو) چاہیے کہ اس کا نام عیسیٰؑ رکھے کیونکہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دے گا"۔ یہ صحیح ہے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو کس بنا پر وہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتے نے کہا کہ جو لڑکا پیدا ہونے والا تھا" احمدؐ ﷺ: اس کا نام رکھنے کو کہا تھا۔ اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت یہ ہے کہ عہد عتیق میں آنحضرت ﷺ کی بشارت محمد ﷺ کے نام سے آئی ہے اور انجیل میں احمد ﷺ کے نام سے ہے۔ اس لیے ان بشارات کے پورا ہونے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت آمنہؓ کو احمد ﷺ کا نام بتا دیا جائے کیونکہ یہ ایک ایسا نام تھا جس کو اہل عرب کبھی نہیں یا شاذ و نادر رکھتے تھے۔ سرولیم میور کو الزام لگانے کی فکر پڑی ہے اور وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس الزام سے ان کی مقدس کتاب پر حرف آتا ہے اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ وہ (ولیم میور) اپنی مقدس کتاب کو بھی نہیں مانتا تو اس کے پلے کیا رہ جائے گا۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ اس نام مقدس نے ان کی کتب مقدسہ کی بشارتوں کی تصدیق کر دی۔

اعتراض نمبر ۲۶

حضرت آمنہؓ رویا میں فرشتوں کو دیکھ کر ڈر گئیں اور عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق لوہے کے ٹکڑوں کو گلے میں لٹکایا یا بازوؤں پر بطور عمل باندھا۔ نیز فرشتوں سے ڈرنے کو اسپرنگر نے بی بی آمنہ کو مصروع قرار دیا۔ (خطبات احمدیہ۔۴۴۰)

جواب: جناب کرم شاہ بھیروی (ضیاء النبی۔۷۔۱۸۷) لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی "جیوش انسائکلو پیڈیا کے حوالے سے حضرت ہاجرہؓ کے بارے میں یہودی علماء کی آراء نقل

کرتے ہوئے فرماتے ہیں (ترجمہ:''یہودیوں نے بادل نخواستہ جو اعتراضات کیے ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے۔ بی بی ہاجرہ کو اس تقویٰ اور پارسائی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں متعارف تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ حضرت ہاجرہؓ مقدس فرشتہ کو دیکھ کر بھی نہیں گھبراتی تھیں۔ ایسی شخصیات کا فرشتوں کو دیکھنا کوئی تعجب خیز بات نہیں اور ان سے ڈرنا بھی ان کے لیے محال ہے۔ فرض کریں کہ آپ کی والدہ ماجدہ ڈر گئیں تو یہ معاملہ تو خواب کا ہے، خواب میں ڈر جانے میں کوئی حرج نہیں اس کے ساتھ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ مستشرقین نے یہ تو تسلیم کیا کہ بی بی پاک نے فرشتہ کو دیکھا، انھیں تو چاہیے تھا کہ دشمنی کے سبب سرے سے بی بی کا فرشتہ کو دیکھنے سے بھی انکار کر دیتے۔ مگر دشمن بھی کبھی کبھی سچی بات کہہ دیتا ہے یا بغیر سوچے سمجھے سچی بات زبان پر آ جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ فرشتوں کو دیکھنا انبیاء علیھم السلام کی والدات پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ فرشتوں کو دیکھ کر ڈر جانا اور گلے میں یا بازووں پر بطور عمل تعویذ باندھنا تسلیم کریں تو یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا ہے کہ سیدہ آمنہؓ کو صرع کی بیماری تھی۔ اسپرنگر کا اس واقعہ سے بی بی کو مصروع بنانا اس مستشرق کے تعصب کا نتیجہ ہے ورنہ وہ اس ضمن میں حضرت سارہؓ اور حضرت مریمؑ نے فرشتوں کا دیکھا تھا' انہیں بھی مصروع قرار دیتا مگر انہیں اس بیماری سے محفوظ سمجھتا ہے۔ واہ رے واہ! مستشرقین کی دوغلا پالیسیاں! سیدہ آمنہ فرماتی ہیں کہ گلے یا بازووں پر لوہے کے ٹکڑے لٹکانے کے لیے مجھ سے بوڑھی عورتوں نے کہا' میں نے حمل کے دوران ایسا ہی کیا مگر چند روز بعد دیکھا تو لوہے کی چیزیں کہیں گر پڑی تھیں پھر میں نے کچھ نہ باندھا۔ (رحمت اللعالمین۔۲۔۹۴) اس وقت کے رواج کے مطابق ایسا کرنا درست ہوتا ہوگا جیسے یہ بھی رواج تھا کہ اگر بچہ رات کو پیدا ہوتا تو اس پر بڑی ہانڈی الٹ دی جاتی تاکہ صبح ہونے سے پہلے بچہ پر کسی کی نظر نہ پڑے۔۔۔ یہ ٹونا مروج تھا' جان دو عالم ﷺ کی ولادت ہوئی تو آپ پر بھی ہانڈی الٹ یا اوندھی کر دی گئی۔۔۔ جب دیکھا تو ہانڈی شق ہو کر دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ جان دو عالم ﷺ کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ (سید الوریٰ۔۱۔ ۹۴) حضرت آمنہؓ کو جس غیبی ہستی نے حمل کے وقت یہ خوشخبری دی تھی کہ آپ سید الانام کے ساتھ حاملہ ہو گئی ہیں۔ وہی ہستی ایک بار پھر نمودار ہوئی اور یہ ہدایت دی کہ جب بچے کی ولادت ہو تو آپ یوں کہیے۔ ''میں اسے ہر حاسد کے شر سے خدائے واحدہ لاشریک کی پناہ میں دیتی ہوں' پھر اس کا نام محمد ﷺ رکھیے۔ (حوالہ بالا۔۸۱۔۸۰) ابن سعد حسن بن جراح زید بن اسلم سے راوی ہیں کہ حضرت آمنہؓ نے حلیمہؓ سعدیہؓ سے فرمایا''مجھ سے خواب میں کہا گیا کہ عنقریب تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہوگا' ان کا نام احمد رکھنا وہ تمام عالم کے سردار ہیں۔''(سیرت مصطفیٰ جان رحمت۔۱۔۴۷۰)۔

اعتراض نمبر ۲۷

آپ ﷺ کو دادا جان خانہ کعبہ لے گئے' وہاں رب العزت کے حضور مناجات کی۔ پیارے نومولود کی پاکیزہ جان کے عطایا پر رب کا شکرادا کیا۔ دشمن سے کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے اور حاسدوں کی آنکھ سے خدا وند بچائے رکھے وغیرہ وغیرہ۔ مستشرق کو ان دعائیہ کلمات پر اعتراض ہے۔ وہ (سر ولیم میور) کہتا ہے کہ" آنحضرت ﷺ کے دادا کی دعا کا مضمون صریحاً مسلمانی طرز کا ہے' اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ کعبہ میں عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی' صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے"۔

جواب: ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کے دادا جان نے جو دعا مانگی تھی وہ مسلمانی طرز کی دعا ہے۔ یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بزرگوں میں خدا پرستی معدوم نہیں ہوئی تھی' وہ خدا پرست تھے' ایک خدا کو ماننے والے اور برائیوں سے بچنے والے تھے اور دین ابراہیمی پر چلتے تھے۔ اس بات کا ایک اور ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ آپ کے دادا جان نے آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خالص خدا پرستوں کے طریقہ پر رکھا گیا تھا۔

۲۔ جب یمن کے گورنر ابرہہ نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کی ٹھانی وہ چڑھ دوڑا اور لشکریوں نے حضرت عبدالمطلب اور دوسرے قریش کے لوگوں کے مویشی ہتھیا لیے جن میں حضرت عبدالمطلب کے دو سو یا تین سو اونٹ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ابرہہ سے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا' تو اس نے کہا: کہ تجھے اونٹوں کی فکر ہے مگر خانہ خدا' جسے میں ڈھانے آیا ہوں' ذرا برابر فکر نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے' وہ اسے بچائے گا۔ خواجہ عبدالمطلب کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل ایمان اور یقین تھا۔ کعبہ کے دروازہ کا حلقہ پکڑ کر دعا کی "اے اللہ! بندہ اپنے گھر کو بچایا کرتا ہے' تو بھی اپنا گھر بچا' ایسا نہ ہو کہ کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر پر غالب آ جائے' اگر قبلہ کو ان پر چھوڑتا ہے تو حکم کر جو تو چاہتا ہے۔ اے! اللہ مجھے تیرے سوا کسی سے امید نہیں۔" اس دعا میں بھی خواجہ عبدالمطلب نے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا ہے' اسی سے مدد چاہی ہے' اسی سے امید لگائے رہے اور کسی چھوٹے بڑے بت کے سامنے جا کر دعا طلب نہیں کی' بلا شبہ وہ موحد تھے اور ان کی یہ دعا بھی مسلمانی طرز کی ہونی چاہیے تھی۔ نہ جانے اس پر سر ولیم میور نے کیوں چپ سادھ لی ہے اور اس پر سیخ پا نہیں ہوتا اور نہ ہی الزام لگاتا ہے' گویا اس کی دشمنی کا محور اور مرکز آپ ﷺ کی ذات ہے جس پر ولیم میور کو بہت دکھ ہے۔ یہ بھی سن لیں: ابن الندیم کہتا ہے "مامون الرشید کے کتب خانہ میں عبدالمطلب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک دستاویز تھی۔ یہ چمڑے پر لکھی ہوئی تھی' اس کے الفاظ یہ تھے۔ میں عبدالمطلب بن ہاشم مکہ کا رہنے والا ہوں' میں نے فلاں بن فلاں' ذات حمیری ساکن صنعاء کو چاندی کے ایک ہزار دراہم

قرض دیئے تھے' یہ اس پر واجب الادا ہیں' جب طلب کئے جائیں گے' وہ ادا کرے گا اللہ اور اس کے فرشتے اس پر گواہ ہیں''(اعلان نبوت سے پہلے۔۲۲۶)اس تحریر میں بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی گواہی درج ہے۔ یہ توحید پرستی کا جیتا جاگتا اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ مسلمان اللہ اور اس کے فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں اس تحریر اور دعا کے مضمون سے صریحاً ثابت ہے کہ آپ خدا پرست تھے جس کی بناء پر ان کی دعاؤں اور تحریروں میں توحید پرستی کا عنصر شامل اور غالب ہے۔ خواہ مخواہ ولیم مسلمانوں پر الزام دھر دیتا ہے کہ یہ ان کی بنائی ہوئی بات ہے یہ محض باطل ہے اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔

نور کی برسات

آپ ﷺ کی ولادت سے سیدہ آمنہؓ کا گھر بقعہ نور بن گیا۔ عثمان بن العاصؓ کی والدہ فاطمہؓ کہتی ہیں کہ میں شب ولادت سیدہ آمنہؓ کے پاس تھی' میں نے گھر میں جس طرف بھی نظر دوڑائی مجھے نور ہی نور نظر آیا۔ صاحب سید الوریٰ بحوالہ علامہ زرقانی بیان کرتے ہیں کہ شفاء بنت عوفؓ جو شب ولادت سیدہ آمنہؓ کے پاس تھیں' کہتی ہیں''میرے لیے مشرق ومغرب روشن ہو گئے۔'' یہ تمام انوار زمین پر دیکھے گئے جب کہ آسمان سے بھی نور کی برسات ہو رہی تھی۔ اس منظر کو فاطمہؓ یوں بیان کرتی ہیں''میں نے ستاروں کو دیکھا کہ وہ جھکے پڑتے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا کہ مجھ پر گر پڑیں گے''۔ مزید بحوالہ طبقات ابن سعد اور البدایہ والنہایہ لکھتے ہیں کہ خود سیدہ آمنہؓ فرماتی ہیں جب وہ مجھ سے منفصل ہوا تو اس کیساتھ ایک ایسا نور ظاہر ہوا' جس سے مشرق ومغرب روشن ہو گئے۔'' پھر با حوالہ زرقانی' سیرت حلبیہ اور سیرت ابن ہشام لکھتے ہیں''میں نے اس ولادت کی رات کو ایسا نور دیکھا جس کی وجہ سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ اور میں نے انھیں دیکھ لیا۔''

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین وآسمان منور ہو گئے۔ انوار کی برسات کا منظر بی بی آمنہؓ، فاطمہؓ اور شفاء کے علاوہ کسی اور کو کیوں نظر نہیں آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ صرف مخصوص لوگوں کو دکھانا چاہے وہ تمام چیزیں حقیقتاً موجود ہونے کے باوجود عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ غزوہ بدر میں مومنین کی امداد کے لیے فرشتے نازل ہوئے۔ ارشاد ربانی ہے '' یمددکم ربکم بخمسته الاف من الملائکته'' تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری امداد فرمائے گا۔ یہ فرشتے نبی مکرم ﷺ اور چند صحابہ کو نظر آئے، ان کے علاوہ نہ انھیں مشرکین نے دیکھا اور نہ ہی باقی صحابہ کرامؓ نے۔

اعتراض نمبر ۲۸

آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے نور کا مشاہدہ کیا یا اس قسم کی ولادت باسعادت عجائبات کا ظہور ہوا

تھا، دیکھا لیکن وہ لوگ جن کا طبعی میلان معتزلہ کی جانب ہے یا ان کے دماغوں پر جدید تحقیقات کی وحشت طاری ہو چکی ہے، انکار کرتے ہیں اور تاویلات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ عرباض بن ساریہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاتم النبیین تھا اور آدمؑ ابھی آب وگل کی حالت میں تھے یعنی ان کا پتلا تیار نہ ہوا تھا اور اے لوگو! میں تم کو اس کی ابتدا بتا تا ہوں، میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت کا مصداق ہوں اور اپنی والدہ کے اس خواب کی تعبیر ہوں جو انھوں نے دیکھا تھا (جب آپ ﷺ پیدا ہوئے تو آپکی والدہ نے ایک نور دیکھا جس کی روشنی سے شام کے محلات جگمگا اٹھے اور اسی طرح دیگر انبیاء کی والدات بھی دیکھا کرتی ہیں) (ترجمان السنہ۔۴۔۱۱۴۔ ۱۱۵ بحوالہ مسند احمد، طبرانی، مستدرک) اس کے بارے بدر عالم میرٹھی کہتے ہیں۔۔۔ان واقعات کو بیان کرنے والا آپ کی والدہ ماجدہؓ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے اور چالیس سال تک اس کے ناقل پورے ضبط اور اتقان کے ساتھ کہاں مل سکتے ہیں، مگر اس پر تعجب آتا ہے کہ اس واقعہ کو بھی محدثین نے ایسی اسانید کے ساتھ پیش کیا جو ان کے نزدیک معتبر تھیں۔۔۔حدیث مذکور سے ایک جدید بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ نظارہ نہ صرف آپ ﷺ کی والدہؓ کو نظر آیا بلکہ اس میں دیگر انبیاء کی والدات بھی شامل ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہر نبی کی شخصیت معمولی نہیں ہوتی لہٰذا ان کی والدات پر اگر کچھ عجائبات ظاہر ہوں اور وہ نظارہ کر لیں تو کوئی عجیب بات نہیں بلکہ ان کا نظارہ نہ کرنا عجیب بات ہے آج بھی نیک بخت اور بخت آور بچوں کی ولادت پر اس قسم کے واقعات سنتے ہیں اور ان کا یقین کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مشاہدہ کرنے والا ان کی والدہ یا چند عورتیں ہوتی ہیں اور کوئی نہیں ہوتا اور اس موقع پر سند کا مطالبہ اور وہ بھی بخاری کی شرط کا مطالبہ کرنا غیر معقول تصور کیا جاتا ہے۔۔۔مزید کہتے ہیں کہ معنوی معجزات پر زور دینے والے ان معجزات کی عقیدت سے ناشناسی کے جرم کے مرتکب ہی نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر انکار یا تاویل معجزات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم نے بہت سارے معجزات کی حیثیت سے گرا کر ایک طرف مادی عقول کو اسلام کے قریب کر دیا ہے اور دوسری طرف علمی واخلاقی معجزات کا پایہ نظروں میں بلند کر دیا ہے، حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ مادی دنیا کے لیے ایسے معجزات چیلنج ہوتے ہیں اور کمزور طبائع اس سے عاجز آکر ہاتھ پیر مارتی ہیں کہ کوئی سہارا مل سکے۔ کسی رسم کا خاتمہ کرنا، ایک ملک کو برباد کر دینا، اس طرح کے واقعات کو ماننا مادی عقول کے لیے مشکل نہیں مگر ایسے معجزات کا ماننا اس لیے بھی محل نظر آتا ہے کہ اس کے ساتھ نبوت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ جن عجائبات کا ہر ممتاز شخصیت کی ولادت پر ثابت ہونا مسلمات سے رہا ہے، اس سرتاج عالم ﷺ کی ولادت میں کون سا ایسا واقعہ تھا جو رونما ہوا؟ کیا الفاظ دیگر اس کا حاصل صرف انکار کرنا ہی نہیں؟ یہاں طفل تسلی

کے لیے یہ کہہ دینا کہ وہ واقعات یہاں بھی ضرور ہوئے ہوں گے مگر ان کا ثبوت ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ مخالفین کے نزدیک اس کی حیثیت صرف خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہے اور جب وہ میلاد خوانوں کی من گھڑت ہی ٹھہریں تو پھر مسلمانوں کے لیے ان میں جاذبیت کیا ہے؟ ایسے ماننے والوں کی دوغلی پالیسی کا حال سنیئے ۔ایک روایت میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے خندق کھودنے کا حکم دیا تو کھودنے والوں کے سامنے ایک سخت چٹان نکل آئی جس کو وہ توڑ نہ سکے وہاں آپ تشریف لے گئے اور کدال خود ہاتھ میں لیا اور اپنی چادر مبارک خندق کے کنارے رکھ کر ایک ضرب لگائی اور یہ کلمات کہے ''وتمت کلمہ ربک صدق وعدہ'' آپ کا ضرب لگانا تھا کہ چٹان کا ایک تہائی پتھر ٹوٹ کر گر گیا، اس وقت سلمانؓ فارسی کھڑے دیکھ رہے تھے ۔وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ضرب کے ساتھ بجلی کی سی چمک نظر آئی جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ۔اس کو پھر دوسری ضرب لگائی اور وہی کلمات پڑھے تو تہائی چٹان اور ٹوٹ گئی اور آپ کی ضرب کے ساتھ پھر ایک چمک پیدا ہوئی جسے سلمانؓ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تیسری بار وہی کلمات پڑھ کر آپ ﷺ نے ضرب لگائی تو اس کا بقیہ حصہ ٹوٹ گیا، اس کے بعد آپ ﷺ اپنی چادر لے کر خندق سے باہر تشریف لائے اور بیٹھ گئے ۔سلمانؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے دیکھا تھا جب آپ پتھر پر ضرب لگاتے تھے تو بجلی کی سی ایک چمک نکلتی تھی، آپ نے فرمایا سلمانؓ کیا تم نے یہ دیکھا تھا؟ انھوں نے عرض کی جی ہاں ۔اس خدا پاک کی قسم! جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے ۔آپ ﷺ نے فرمایا! جب میں نے پہلی ضرب لگائی تھی تو میرے اللہ نے کسریٰ کی سلطنت اور اردگرد کی سب بستیاں میرے سامنے کر دیں ۔ یہاں تک کہ میں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حاضرین نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! ان ملکوں کو فتح کرنے والے کون لوگ ہوں گے؟ ۔ یا رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمارے لیے فتح کرا دے اور ان کی بستیاں ہماری غنیمت بنا دے اور ہمارے ہاتھوں ان کو تباہ و برباد کر دے ۔آپ نے اس بات پر دعا فرما دی، پھر جب دوسری ضرب لگائی تھی تو قیصر کی سلطنت اور اس کے اردگرد کے شہر سامنے کیے گیے، یہاں تک کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمارے سامنے فتح کرا دے اور ہماری غنیمت بنا دے اور ہمارے ہاتھوں ان کو برباد کر دے، آپ ﷺ نے اس کے لیے بھی دعا فرما دی، پھر میں نے تیسری بار ضرب لگائی تو حبشہ کی سلطنت میرے سامنے کی گئی اور جو اس کے اردگرد بستیاں تھیں، یہاں تک کہ میں نے ان کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے بعد آپ نے فرمایا جب تک اہل حبشہ تم سے کچھ نہ کہیں تو تم بھی ان سے کچھ نہ کہنا اور اسی طرح جب تک وہ خاموش رہیں تم بھی خاموش رہنا۔ (ترجمان السنہ۔۳۔۲۴۵)

بدر عالم کی تقریر: تعجب ہے کہ ایک ایک معجزہ پر عقل کی ترازو لگانے والوں نے اس واقعہ کو بلا چون و چرا تسلیم کرلیا، یہاں بھی یہ کہنا ممکن نہ تھا کہ صحابہ کی ضربوں سے چٹان کمزور پڑ چکی تھی پھر آپ نے ضرب لگائی تو چٹان ٹوٹ گئی۔ اور کثیباً اھیلُ کہنا صرف ایک عرفی مبالغہ ہو مگر صحابہ کرام کے مزاج شناس اور حدیثوں پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس واقعہ کی پوری سرگزشت از اول تا آخر خرق عادت تھی، یہاں احتمال کے گھوڑے دوڑانا صرف ایک وہمی شخص کا کام ہی ہوسکتا ہے۔ اب اس کے ساتھ آئندہ واقعہ کی پوری تفصیل ملا کر یہ اندازہ کر لیجیے کہ آپ ﷺ کے معجزانہ افعال کو کوشش کر کے تمام واقعات میں شامل کرتے رہنا کتنا بڑا ظلم ہے۔۔۔۔ معجزات کو پھیکا کرنے والے شاعر یہاں یہ لکھ دیں کہ پتھر کے اوپر لوہے کی ضرب سے چمک پیدا ہونا روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے، اس میں اعجاز کیا ہے؟ لیکن سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے پوچھو جنہوں نے نا معلوم کتنی بار خندقیں دیکھی ہوں گی اور پتھروں سے چنگاریاں بھی نکلتی دیکھی ہوں گی، مگر وہ اس چمک کو دیکھ کر متحیر ہوتے رہے۔ آخر کار اس عجیب چمک کا راز آنحضرت ﷺ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے اور جب آپ نے وہ تفصیلات جو مسلمانوں کے خواب و خیال میں نہ تھیں، بتائیں تو یہ واضح ہوگیا کہ آپ کی ایک ایک ضرب میں مادی دنیا کے لیے کتنے بڑے بڑے انقلابات پنہاں تھے۔ اگر مسلمان یہاں سوال نہ کرتے تو معجزہ کے شوقین بھی شاید اس کو ایک معجزہ ہی سمجھتے لیکن اب معلوم ہوا کہ آپ کی ضرب ایک چٹان کے تودہ خاک بن جانے کا معجزہ ہی نہ تھا بلکہ قیاس و گمان سے بالاتر واقعات کی عظیم الشان پیش گوئیوں کے علاوہ ان کی آنکھوں سے دیکھ لینے کے معجزات بھی شامل تھے۔ سبحان اللہ! نبی و رسول بھی بشر ہوتے ہیں لیکن قدرت ان کے ساتھ ایسے کرشمے بھی ظاہر کرتی ہے، جن میں سے ہر کرشمہ مادی دنیا کو شکست دینے کے واسطے کافی ہوتا ہے، اسی کا نام معجزہ ہے۔ حیرت یہ ہے کہ معجزہ مادی طاقت کی شکست کا ثبوت ہوتا ہے اور معجزہ کی حقیقت سے نا آشنا اسے جر ثقل لگا کر مادہ ہی کی سرپرستی میں رکھنا چاہتے ہیں (تقریر ختم ہوئی۔۳۔۲۴۷۔۲۴۵)

آپ ﷺ نے چٹان پر ضرب لگانے سے پیدا ہونے والی چمک سے ان تمام مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بچے کی پیدائش کے وقت جو نور دیکھا جس کی روشنی میں شام کے محلات روشن ہوگئے اور اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھا تھا، تو اس کو تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے اور کون سا امر مانع ہے؟ ان حسی معجزات کو معنوی معجزات کی بھینٹ چڑھا کر پیش کرنا تاریخ اسلامی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کی بہت بڑی جسارت ہے نیز سر ولیم میور نے جس طرح حدیث بیان کی ہے وہ اس طرح نہیں۔ حافظ ابن حجر نے مذکورہ مواہب لدنیہ کی حدیث ''جس وقت آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو جنم دیا تھا تو ایسا نور نکلا دیکھا جس سے ملک شام کے محلات روشن ہوگئے اور آپ ﷺ کی

والدہ ماجدہؓ نے ان کو دیکھا۔(صاحب سیرت الحمدیہ شرح مواہب الدنیا۔ا۔۸۸) نے اس کے بارے کہا ہے کہ اس حدیث کو ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے اور اس حدیث کی روایت ابونعیم عطا بن یسار سے اور انھوں نے ام سلمیٰؓ سے اور انھوں نے حضرت آمنہؓ سے روایت کی ہے۔''

اعتراض نمبر ۲۹

آنحضرت ﷺ کی ولادت کی نسبت عجیب سی روایتیں مشہور ہیں کہ ولادت کی رات کو کسریٰ کے محل میں زلزلہ آیا اور اس سے محل کے چودہ کنگرے گر پڑے، فارس کا آتش کدہ بجھ گیا جس میں سالہا سال سے برابر آگ جلتی آ رہی تھی وہاں کے موبدوں نے عجیب عجیب خواب دیکھے اور چشمہ ساوہ دفعتاً خشک ہو گیا مگر ان روایتوں کی معتبری کی قابل اعتماد سندیں نہیں ہیں اور نہ ہی مذہبی روایتیں سمجھی جا سکتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے رونق پائی اور مسلمانوں کو فتوحات نمایاں حاصل ہوتی گئیں اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی اور وہاں کے آتشکدے برباد ہوئے اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ ڈال دیا ان واقعات کو جو بعد میں وقوع میں آئے شاعروں نے اپنے شاعرانہ خیالات میں آنحضرت ﷺ کی ولادت سے منسوب کیا کہ گویا ان کا پیدا ہونا ہی فارس کے آتش کدوں کا بجھنا اور کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑنا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعرانہ خیال بطور روایت کے مروج ہونے لگے اور عین روز ولادت ہی سے منسوب کر دئے گئے۔ پس ان روایتوں کو مذہبی روایتیں تصور کرنا ان لوگوں کی غلط فہمی ہے جو مسلمانوں کی مذہبی روایتوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں (خطبات احمدیہ۔۲۳۰)

جواب: آنحضرت ﷺ کی ولادت پر محیر العقول واقعات رونما ہوئے وہ حسی واقعات تھے۔ اسنادی لحاظ سے جس کی اسناد تاریخی واقعات کے لیے ہو سکتی ہیں اس سے زیادہ قوی و مضبوط اسانید بہ اعتراف محدثین ان کے لیے بھی موجود ہیں پھر محض ایک غلط بنیاد پر ان کو قبول نہ کرنا درست نہیں بلکہ ان کے متعلق زیادہ تر یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کی اسناد اعلیٰ درجہ کی نہیں ہیں مگر تاویلات سے معنوی پیرایہ میں بیان کرنا زیادتی ہے۔ مثلاً آپ کے زمانہ میں بت پرستی کا استحصال ہو گیا، کسریٰ و قیصر کی سلطنتیں تباہ ہو گئیں، ایران کی آتش پرستی کا خاتمہ ہو گیا، شام کا ملک فتح ہو گیا۔ اسی طرح کا اظہار مولانا شبلی نعمانی نے سیرت النبی میں کیا ہے کہ ''ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدہ فارس بجھ گیا، دریا ساوہ خشک ہو گیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر، آذر کدہ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازہ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے (سیرت النبی۔۱۱۳) گویا ان

واقعات کو معجزہ اس طرح بنایا گیا کہ جب آپ کی ولادت ہوئی تو کعبہ کے تمام بت سرنگوں ہو گئے۔ ایوان کسریٰ کے کنگرے گر پڑے۔ آتش کدہ فارس بجھ گیا، نہر ساوہ خشک ہوئی ایک نور چمکا جس سے شام کے محلات روشن نظر آنے لگے، اب سوچیے! کہ محض زور قلم کے بل بوتے پر صرف اپنی بے معنی قیاس آرائی پر لکھ دینا کہ واقعات تو یہ تھے مگر راویوں نے ان کو خود بخود معجزہ بنا لیا کیا یہ شرعاً اخلاقاً درست ہے؟ یہاں راویوں پر صرف وضع کی تہمت نہیں بلکہ ان کے سر اس حماقت کا الزام بھی ہے کہ جو واقعات آپ ﷺ کے عہد کے بعد ہوئے تھے انہوں نے ان کو آپ ﷺ کے زمانہ ولادت سے بنا ڈالا (ترجمان السنہ۔۴۔۳۲)

نہ جانے کس وہم میں مبتلا ہو کر حسی معجزات کو معنوی معجزات بنا ڈالتے ہیں۔ حالانکہ کفار نے آنحضرت ﷺ سے معجزات طلب کیے گویا وہ حسی معجزات کو تسلیم کرتے تھے ارشاد ربانی ہے ترجمہ ''اہل کتاب تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تو ان پر لکھی ہوئی کتاب آسمان سے اتار لا'' سورہ انبیاء میں ہے ''اس کو چاہیے کہ ہم کو کوئی ایسا معجزہ دکھائے جیسے پہلے رسولوں نے دکھائے'' مگر آج کے روشن خیال منکرین حسی معجزات کو مادی عقل پر پرکھ کر اور مادی عقل کے قریب ہونے کے لیے انکار کر دیتے ہیں کاش یہ لوگ کفار کے مطالبات معجزہ سے ہی سبق حاصل کرتے مگر اس سے بھی نہ جانے گریز کیوں؟

یہ شاعروں کے گھڑے ہوئے قصے نہیں ہیں۔ شوق و محبت کی وارفتگی کے افسانے نہیں ہیں نہ بعد میں ان واقعات کو عید میلاد سے نسبت دے دی گئی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسریٰ کے ایوان کے چودہ کنگرے گرنے سے کسریٰ پریشان ہو گیا، اس واقعہ کو چھپانے کی کوشش کی مگر حقیقت چھپائے کب چھپ سکتی ہے؟ پھر اپنے وزیروں مشیروں کی میٹنگ طلب کی اور محل کے متعلق جو پیش آیا کہہ دیا، اسی اجتماع میں کسریٰ کو یہ خبریں بھی موصول ہوئیں کہ ہزار سالہ روشن آگ بجھ چکی ہے۔ دریائے ساوہ خشک ہو گیا ہے۔ اور وادی سماوہ کا پانی رک گیا ہے۔ اسی مجلس میں موجود بڑے پجاری موبذان نے اپنا رات کا خواب سنا کر سونے پر سہاگہ کا کام کر دیا یعنی رہی سہی کسر نکال دی۔ خواب کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے غسان سے بڑا عالم بلوانے کی سکیم پاس ہوئی۔ غسان کے حاکم نے عبدالمسیح ایک بڑے عالم کو بھیجا، وہ تاویل کرنے میں ناکام رہا، البتہ رہنمائی کی کہ شام میں میرے ماموں سطیح رہتے ہیں وہ اس کا حل بتائیں گے۔ لہذا عبدالمسیح کو شام بھیجا گیا۔ سطیح نے موبذان کا خواب بتایا، پھر قیصر و کسریٰ کے چودہ کنگرے گرنے کی توجیہہ بھی بیان کی ان میں چودہ بادشاہ اور ملکائیں ہوں گی اور جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ بہر حال ہو کر رہے گا۔ ہزاروں سالہ آگ کا بجھنا، دریا کا پانی خشک ہونا، صاحب الھِرَاوَۃَ کے ظہور کی علامات ہیں۔ جب یہ علامات ظاہر ہوں تو سمجھ لینا کہ ایرانی حکومت کا خاتمہ قریب ہے۔

اعتراض نمبر ۳۰

آنحضرت ﷺ کی ولادت کے متعلق معجزات حال کے مسلمانوں کے نزدیک بہت پسندیدہ مضامین ہیں۔ (سر ولیم میور۔ خطبات احمدیہ۔ ۴۳۳)

جواب: اولاً تو آنحضرت ﷺ کی زندگی کے متعلق تمام کے تمام مضامین پسندیدہ ہیں اگر ان میں کوئی نا قابل یقین امر واقع نہ ہو۔ خواہ وہ مضامین آپ کی معاشی و معاشرتی دینی و روحانی، سیاسی یا اخلاقی ہوں تمام تر پسندیدہ ہیں اور وہ اس قدر پسندیدہ کیوں نہ ہوں کہ رب اللعالمین نے آپ کی زندگی کو انسانیت کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"

دوم: آپ کی ولادت کے متعلق حال کے مسلمانوں کے لیے ہی پسندیدہ مضامین نہیں ہیں بلکہ ماضی کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ معجزات پسندیدہ تھے۔ ولیم میور اس کی وجہ نہیں بتاتا کہ حال کے مسلمانوں کے لیے پسندیدہ ہیں اور ماضی کے مسلمانوں کے لیے نہیں تھے کیونکہ اعتراض میں اس نے حال کی قید لگائی ہے؟ اور شاید وہ یہ کہنا چاہتا ہو کہ ماضی کے مسلمانوں کے لیے یہ معجزات اتنے قابل توجہ نہ تھے جتنے حال کے لوگوں کے لیے معتبر ہیں۔ اس کا سبب بھی نہیں بتاتا اور ڈکار لیے بغیر ہضم کر جاتا ہے۔ بغیر تحقیق اور دلیل صرف نا معتبر اور موضوع روایات کو بیان کرنے سے طرف دار عیسائی ولیم میور کی بات قابل قبول نہیں ہو سکتی، محض اس کی خواہش کو روایات کے نامعتبر، موضوع یا غیر معتبر ہونے کو معیار نہیں بنایا جا سکتا، اگر وہ مانتا ہے کہ ماضی کے مسلمانوں کے لیے معجزات قابل التفات نہ تھے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ روایات جو ولیم بیان کرتا ہے وہ درست نہیں ہیں کیونکہ وہ بھی ماضی کے مسلمانوں کی روایت کردہ ہیں۔ اس مستشرق کو آنحضرت ﷺ کے معجزات سے کیوں چڑ ہے؟ جب کہ وہ جانتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مادرزاد اندھوں کو بینائی عطا کرتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ کوڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہیں تو کوڑھ دور ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مردوں کو باذن اللہ زندہ کرتے ہیں اور نومولود عیسیٰؑ پنگھوڑے میں بولتے ہیں اور قوم کو اپنی والدہ ماجدہ پر دھرے الزامات کا جواب دیتے ہیں۔ "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے" یہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات ان کی پیدائش سے متعلق ہیں ان پر ولیم میور اعتراض کیوں نہیں کرتا؟ انھیں ماضی و حال کے لوگوں کے لیے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی قید کیوں نہیں لگاتا؟۔ پس اس سے قطع نظر مسلمانوں کے لیے تمام انبیاء پر ایمان لانا واجب ہے اور مسلمان تمام نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں آپ ﷺ میں اور ان میں فرق نہیں کرتے۔ ہر نبی کے ہر فعل کو مسلمان پسندیدہ سمجھتے اور مانتے ہیں اور یہی مسلمان کے ایمان کی علامت ہے۔ پیارے آقا ﷺ کی شان میں ارشاد ربانی ہے وما اتکم ۔۔۔۔ فانتھو" یہ فرما کر انبیاء کی ہر شے، ہر عمل، ہر فعل کو پسندیدہ بنا دیا ہے تو پھر کیوں یہ مسلمانوں کے

نزدیک معجزات ولادت سے متعلق ہوں یا کسی اور واقعہ سے، پسندیدہ مضامین نہ ہوں؟''

اعتراض نمبر ۳۱

کیا آپ نے معجزہ عطا ہونے کا انکار کیا تھا؟

کیونکہ بعض مستشرقین استدلال میں آیات قرآنی کو لاتے ہیں جن میں کفار نے آنحضرت ﷺ سے معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا، آپ نے وہ معجزات نہ دکھائے جس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ ﷺ نے معجزہ عطا ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کیا اور جو معجزات آپ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں صحیح نہیں ہو سکتے۔ سورہ رعد کی آیت وَيَقُوْلُ الَّذِيْ ـــ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، ''ترجمہ'' اور کافر کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئی کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے، آپ تو ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ہادی ہیں'' اس پر آنحضرت ﷺ پر لگائے گئے الزام کا رد فرمایا جارہا ہے کہ آپ ﷺ تو انھیں ڈرانے والے ہیں ان کی باتوں پر توجہ کی ضرورت نہیں اس آیت میں معجزہ کی آپ ﷺ سے نفی نہیں کی گئی ہے۔

۲: سورہ الانعام آیت ۳۷ میں ارشاد ربانی ہے ''وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ ـــ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' ''اور بولے کیوں نہ اتاری ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے، آپ فرمایئے بے شک اللہ تعالیٰ قادر ہے اس بات پر کہ اتارے کوئی نشانی لیکن اکثر ان میں کچھ نہیں جانتے''

اس میں بھی مستشرقین کے اعتراض کا جواب ہے کہ معجزات اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں اس کے لیے مشکل نہیں کہ اپنے حبیب ﷺ سے جب چاہے معجزہ رونما فرمادے اور صریحاً بتا دیا کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے کوئی معجزہ دکھا نہیں سکتا۔ ارشاد خداوندی ہے ''وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ'' ''اور کسی رسول کی مجال نہیں کہ وہ لے آتا کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر۔'' اِنَّمَا الْاٰيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ (الانعام ۱۰۹، پارہ ۷) ترجمہ آیتیں تو خدا کے پاس ہیں''۔ تمام رسولوں کے لیے یہ ایک اصول دے دیا ہے آپ ﷺ پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے۔ باقی تمام رسولوں کے معجزات کا ذکر باقی رہ گیا ہے لیکن ان کا دیکھنا ناممکن ہے جب کہ قرآن ماضی، حال اور مستقبل کا معجزہ ہے جو اپنی تاثیر رکھتا ہے، دکھا چکا ہے' دکھا رہا ہے اور دکھاتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل اور رہتی دنیا تک کے لیے قرآن ایک معجزہ ہے جس کا اپنا چیلنج ہے کہ اس جیسی ایک سورہ یا ایک آیت ہی لے آؤ۔ یہ چیلنج آج تک موجود اور برقرار ہے اور کوئی اس کی نظیر نہیں لا سکا۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ ـــــــ يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ۔'' کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنے جی سے بنا دیا ہے تو کہہ دے کہ وہ دس ہی سورتیں لے آئیں اور اپنی مدد کے لیے جس کو چاہیں بلا لیں اگر وہ سچے ہیں'' سورہ البقرہ میں ہے'' اور اگر تم کو اس میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک ہی سورۃ

لے آؤ اور خدا کے سوا اپنے تمام گواہوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو‘‘

اعتراض نمبر ۳۲

نصاریٰ کا اعتراض ہے ’’معجزوں کا اکثر قرآن میں ذکر پایا جاتا ہے مگر کوئی ایسی آیت نظر نہیں آتی جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت محمد ﷺ نے معجزے دکھائے ہیں بلکہ بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں معجزے نہ دکھانے کا سبب درج ہے اور بعض ایسی بھی ہیں جن میں وہ صاف ظاہر ہوتی ہیں جن میں معجزے دکھانے کو نہیں بھیجا گیا۔ سورہ عنکبوت میں ہے ’’وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ ۔۔۔اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ‘‘‘‘ اور کہتے ہیں اگر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی ہم پر نازل ہوگی تو ہم ایمان لائیں گے پس (اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں خدا کے پاس ہیں میں تو ایک ڈرانے والا ہوں‘‘ پھر بنی اسرائیل میں ہے ’’وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ ۔۔۔الْاَوَّلُوْنَ‘‘ (کوئی چیز ہمیں مانع نہیں ہوئی کہ تجھے معجزوں کے ساتھ بھیجیں مگر یہ کہ اگلے پیغمبروں کو جو ہم نے معجزے دے کر بھیجا تھا تو انہی لوگوں نے جھٹلایا)۔

عیسائی لوگ مسلمانوں پر اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں جنہیں سر پر چھت اٹھانے کی عادت ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کی نسبت جو کچھ اناجیل اربعہ میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ متی باب ۱۱۔آیت ۳۸۔۳۹ میں ہے کہ بعض فقیہوں اور فریسیوں نے مسیحؑ سے ایک نشان طلب کیا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا ’’اس زمانہ کے بد اور حرام کار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں، یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائے کیونکہ جیسا یونسؑ تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہے ویسا ہی ابن آدم (محمد ﷺ) تین دن زمین کے اندر (یعنی غار) میں رہے گا۔ اسی طرح متی باب ۱۶۔آیت ۱۔۴ میں ہے کہ فریسوں اور صدوقیوں نے آزمائش کے لیے حضرت مسیح سے آسمانی نشانی طلب کی مگر یہاں بھی انہوں نے وہی جواب دیا کہ یونس نبیؑ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان دکھایا نہیں جائے گا۔ اگر بنظر غور دیکھیں تو یہ جواب بھی قابل اعتبار نہیں کیونکہ سوال تو آسمانی نشان کا تھا اور جواب میں زمینی نشان کا وعدہ ہوا۔ سوال از آسماں جواب از ریسماں۔ باوجود اس کے انجیل میں مسیحؑ سے بہت سے معجزے منسوب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ پانچ روٹیوں سے چار ہزار کو کھلایا (باب ۱۴۔آیت ۱۵۔۲۱) اور سریا پر اپنے پاؤں سے چلے (باب ۱۴۔آیت ۱۵) پھر اندھوں کو بینا کر دیا (باب ۲۵۔آیت ۳۴۔۳۵) یہاں یونس نبیؑ کے نشان کا کوئی ذکر نہیں بایں ہمہ اس انجیل میں بھی اندھے کو چنگا کرنا، چار ہزار کو سات روٹیوں سے سیر کرنا، کوڑھی کو چنگا کرنا وغیرہ معجزات مسیحؑ کی طرف منسوب ہیں۔ یوحنا باب ۴۔آیت ۳۵ میں ہے کہ یہودیوں نے مسیحؑ سے کہا ’’پس تو کون سا نشان دکھاتا ہے تاکہ ہم دیکھ کر تجھ پر ایمان لائیں‘‘۔ یہاں بھی مسیحؑ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا لیکن انجیل میں بہت سے معجزے حضرت عیسیٰؑ سے منسوب ہیں (حیات محمد ۲۳۶)۔

اللہ تعالیٰ خود اس کی وضاحت فرماتا ہے ''ہم کو نہیں روکا نشانیاں بھیجنے سے کسی شے نے مگر یہ کہ جھٹلایا ان کو اگلوں نے اور ہم نے دی ثمود کو اونٹنی سوجھانے کو پھر اس کا حق نہ مانگا اور ہم نہیں بھیجتے نشانیاں مگر ڈرانے کو۔'' اس قسم کی نشانیاں ہم نے پہلی امتوں کو طلب کرنے پر عطا کیں مگر وہ ایمان نہ لائے اور ہلاک ہو گئے۔ اگر معجزہ دیکھنے پر کوئی قوم ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان پر عذاب نازل کرتے ہیں اسی طرح اگر کفار بھی آپ ﷺ سے نشانیاں طلب کریں اور آپ ﷺ کی دعا عطا کی جائیں تو یہ لوگ بھی انکار کریں گے، تکذیب کریں گے تو عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہریں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اس امت کو عذاب سے محفوظ فرمایا، لہٰذا وہ آیات (نشانیاں) عطا نہیں کی ہیں (سورہ عنکبوت ع ۵) ''اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر کچھ نشانیاں اس کے رب سے تو کہہ نشانیاں تو ہیں اختیار میں اللہ کے اور میں تو سنا دینے والا ہوں کھول کر کیا ان کو اس نے نہیں اتاری تجھ پر کتاب کہ ان پر پڑھی جاتی ہے، بے شک اس میں بڑی رحمت ہے اور سمجھانا ان لوگوں کو جو مانتے ہیں۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ نشانیاں اتریں پہلی امتوں پر، انہوں نے تکذیب کی اور لقمۂ عذاب بن گئیں اور تم پر اتریں نشانیاں جن میں حکمت یہی ہے۔ ان آیات میں معجزات کی نفی نہیں پائی جاتی بلکہ ان معجزات کے نہ ملنے کی وجہ بیان ہوئی ہے جو کفار محض عناد کے سبب طلب کرتے تھے۔ لہٰذا عیسائیوں کا یہ کہنا کہ قرآن میں کوئی آیت نظر نہیں آتی جس سے ثابت ہو کہ آپ ﷺ نے معجزے دکھائے صرف عناد پر مبنی ہے وہ یوں کہ قرآن جو زندہ معجزہ ہے ہر زمان و مکان میں موجود رہے گا اور انسانیت کے ساتھ رہے گا، یہی کافی ہے۔ لیکن وہ معجزے نہیں دکھائے، کی رٹ لگا کر بڑا بول بولتے ہیں ''سورہ کہف۔ ع۔ امیں ہے'' کیا بڑی بات ہو کر نکلتی ہے ان کے منہ سے سب جھوٹ ہے جو کہتے ہیں''۔

معجزہ کیا ہے اور اس سے انکار کیوں:؟ مستشرقین کو معجزہ سے چڑ ہے وہ اس کے منکر ہیں لیکن مسیحؑ کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں مگر آنحضرت ﷺ سے منسوب معجزات کو نہیں مانتے یہ ان کے تعصب کا نتیجہ ہے۔

انسان ہمیشہ سے اپنے تجربات و مشاہدات پر یقین کرنے کا عادی اور مشتاق رہا ہے اور صرف عقل کے بل بوتے پر کسی بات پر یقین کرتا رہا ہے جو اس کے مشاہدات کا نتیجہ ہے اس لیے رسولوں کے غیبیات پر یقین کرنے کے لیے وہ کسی حتمی طریقہ کا خواہاں رہتا ہے اور اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اس سے قبل کوئی ایسا طریقہ موجود نہیں ہے بایں سبب وہ انبیاء کی دعوت پر فوری لبیک کہنے میں بیزاری محسوس کرتا ہے اس سے معذوری و بیزاری کے رفع کے لیے ضروری ہے کہ انبیاء ایک ایسے جدید طریقہ استدلال سے آغاز کریں جو عالم غیبیات پر ایمان لانے کے لیے نہایت موثر ہو اور انسانی ذہن اور فطرت اسے آسانی سے سمجھ کر مطمئن ہو سکے اور وہ ان کی فطرت کے مطابق وہ دلائل پیش کریں جن کا

تعلق مشاہدات سے ہوا نہی کا نام معجزات وخوارق عادات ہے اشیاء کے خواص وتاثیر کا اصول جو انسان نے اپنے ذہن میں بٹھا رکھا ہے اسے سمجھتا ہے کہ وہ باطل تھا تو اب اس کے لیے ایک بالاتر طاقت تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا اور مانتا ہے جو خدا مادہ کا خالق ہے اور اس کے خاص کا بھی مالک ہے اور چونکہ ایک مشاہدہ دوسرے مشاہدہ کی تکذیب کر سکتا ہے اس لیے وہ یقین کی اس حالت میں آجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جس طرح مادہ کے یہ خواص مادہ کی جانب سے مخفی رکھے گئے ہیں اسی طرح اس کی قدرت سے سلب بھی ہو سکتے ہیں جس سے رفتہ رفتہ غیبیات پر یقین لانے کی طرف میلان پیدا ہونے لگتا ہے۔

معجزہ کے لیے قرآن مجید میں لفظ آیت آیا ہے آیت کے معنی علامت اور نشانی ہے تو اب آسانی پیدا ہوگئی کہ جس طرح ہر شے کی شناخت کے لیے نشانی یا چند علامات ہوتی ہیں جس سے وہ شے جلد اور آسانی کے ساتھ پہچان لی جاتی ہے اسی طرح انبیاء کے ساتھ بھی کچھ ایسی علامات اور نشانیاں ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر ان کی نبوت ورسالت کا یقین حاصل ہوتا ہے لہٰذا ان ہی کا نام آیات نبوت ودلائل نبوت ہے۔ اور یہ علامتیں اللہ کی طرف سے مبعوث ہونے کا ثبوت ہوتی ہیں اس لیے قرآن مجید میں ان کا نام برہان بھی رکھا ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ کے لیے ارشاد ہوتا ہے۔ ''فذلک برھانن من ربک''۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ علامت ونشانی جس چیز کے لیے مقرر ہے اس کے درمیان (یعنی شے اور علامت) کوئی خصوصیت ہونی چاہیے تا کہ اس علامت سے فوراً دوسری چیز کا یقین حاصل ہو سکے جس طرح شے اور علامت میں ایک محکم ربط موجود ہے کہ ایک کے وجود سے دوسرے پر استدلال کرنا معقول سمجھا جاتا ہے اسی طرح نبوت ورسالت اور ان کی علامات میں ایک خاص ربط ہوتا ہے یہ ایک غیبی حقیقت ہے اس لیے جو چیز اس کی علامت کی حیثیت سے مقرر کی جائے اس کو بھی عالم غیب سے تعلق ہونا چاہیے لہٰذا قدرت انبیاء کے ساتھ کچھ ایسی علامات مقرر کر دیتی ہے جن کو فطرت نظام عادی (نوامیس طبیعہ) سے خارج دیکھ کر ایک دم چونک اٹھتی ہے اور ان کے اسباب وعلل کی جستجو میں پڑ جاتی ہے اور جب ان کو اسباب عادیہ سے خارج دیکھتی ہے تو اس میں کسی غیبی طاقت کے اقرار کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اسی کو معجزات کہتے ہیں اگر یہ بھی ظاہری اسباب کے مطابق ہوں تو وہ پیغمبر اور خدا کے درمیان رابطہ کی دلیل کیونکر بن سکتے ہیں؟ کفار ان کو دیکھ کر آج نہیں تو کل یہ کہہ سکتے ہیں یہ تو فلاں سبب سے تھے اس لیے انبیاء سے جس قدر معجزات صادر ہوتے ہیں یہ سب ان کی قدرت سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت سے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔ ''انما الآیات عنداللہ''۔ بے شک نشانیاں اللہ کی طرف سے ہیں۔

اہم نکتہ: جس قدر اسباب وعلل کا پھیلاؤ ہے وہ سب عالم کے لیے ہے' خالق عالمین کے لیے نہیں کیونکہ خود عالم اسباب اس کی مخلوق ہے اس لیے غلطی یہاں یہ لگی کہ انسان نے دنیا میں آ کر اپنے

ماحول میں ایسا مقرر نظام پایا اور اسے بے تغیر و تبدل پایا تو اس کا نام نظامِ فطرت رکھ دیا اور یہ حد کر دی کہ خالق کے حق میں بھی اسے بے تغیر و تبدل ٹھہرا دیا جب کہ نظامِ فطرت نظامِ قدرت سے بالاتر نہیں بلکہ خود قدرت ہی نے نظامِ فطرت بنایا ہے یعنی اشیاء کی فطرت میں جو نظام چل رہا ہے' وہی چلا رہا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سارے کا سارا نظام' نظامِ قدرت کے ماتحت ہے گویا فطرت ہر وقت قدرت کی محتاج ہے جس طرح عالم میں اشیاء مخلوق ہیں اسی طرح ان کی فطرت بھی خالق کی مخلوق ہے آگ اکثر جلاتی ہے تو بے شک یہ اس کی فطرت ہے مگر اس میں جلانے کی فطرت خالق نے پیدا فرمائی ہے یہ آگ کی فطرت کا کوئی طبعی اقتضا نہ تھا اس لیے جب یہ ہے تو اگر وہ چاہے تو آگ کی خاصیت کو بدل بھی سکتا ہے وہ جلانے والی آگ کو ٹھنڈا بھی کر سکتا ہے یہی نہیں بلکہ سلامتی والی بنا دیتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے "قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ"

یہاں پر ایک معجزہ اور اس کی تاویلات کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ معجزہ کی حقیقت مزید نکھر کر سامنے آ جائے۔ اگر عمل تنویم کے تجربات میں تھوڑی سی قیاسی وسعت پیدا کر لی جائے تو شق قمر وغیرہ تقریباً ہر قسم کے خوارق کی توجیح ہو سکتی ہے کیونکہ اس عمل کا دارومدار تمام تر عامل کی قوت اثر آفرینی اور معمول کی اثر پذیری پر ہے" یہ درست نہیں کیونکہ عمل سحر کی طرح معجزہ کے مقابل کی چیز نہیں۔ معجزہ میں صاحب معجزہ کی قوت اثر آفرینی کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ (۲) چاند کے مختلف اجزا جس کیمیائی جذب و اتصال کی قوت سے آپس میں پیوستہ ہیں اس میں صرف اس حصہ قوت کو جو چاند کے نصفین میں واجب اتصال ہے تھوڑی دیر کے لیے اللہ تعالیٰ حذف یا سلب کرے جس سے شق قمر کا معجزہ ظاہر ہو سکتا ہے" اس کے جواب کا حاصل یہ رہا کہ شق القمر قدرت خداوندی سے ظاہر ہوا اب یہاں جذب اتصال اور کیمیائی اصطلاح استعمال کرنے سے اس خرق عادت کا حل نہیں ہوتا یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ انگلی کے اشارہ سے اس قوت اتصال کا سلب ہو جانا کیا عادتاً ہے اگر نہیں تو پھر یہ خرق عادت ہی تو ہے۔ (۳) شق القمر اہل مکہ کی طلب پر ایک آیت الٰہی تھی یعنی ان منکروں کو ان کی خواہش کے مطابق ایک نشانی دکھائی گئی۔ احادیث میں ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا خواہ وہ اصل چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں یا خدا تعالیٰ نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا کہ ان کو چاند دو ٹکڑے نظر آیا"۔ جو خدا انسانی آنکھوں میں خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے وہ خدا چاند میں بھی خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے پھر چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نشانی اہل مکہ کو دکھانی تھی اور ان کے لیے یہ آیت نبوت تھی اس لیے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور روایت کی حاجت نہ تھی۔" چاند دو ٹکڑے ہوا نظر آیا خواہ چاند دو ٹکڑے ہوا یا نہیں اسے نظر بندی کہا جا سکتا ہے اور یہ نظر بندی تصرف نہیں؟ لیکن کیا انبیاء کے معجزات میں اس قسم کی نظر بندی کا احتمال جائز ہے اور اگر جائز ہو تو دین کا

نظام درہم برہم ہو جائے گا نیز ان کے لیے ایسا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسا عمل کر دکھائیں اور خارج میں اس کا وجود بھی نہ ہو۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ امور جو قدرت ان کی صداقت کے لیے نشانی قرار دے۔ اگر اہل مکہ کی آنکھوں پر تصرف ہوا تو اس معجزہ کی صحت کے لیے انہوں نے باہر والوں کی شہادت کو معیار بنایا کیونکہ تصرف حاضرین پر ہو گا غائبین پر نہیں جب قافلے والوں نے شق القمر کی گواہی دی تو اس معجزہ کے صحیح ہونے پر یقین کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ دوسرے معجزات کو بھی برحق ایسی تحقیق سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مستشرقین لاکھ ہاتھ پاؤں ماریں وہ اسے نادرست ثابت نہیں کر سکتے اور نہ اسے غلط کہہ سکتے ہیں' اگر کہتے ہیں تو یہ محض ان کے تعصب کا نتیجہ ہے یا دوسروں کے لیے شک و شبہ پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اور بس۔

شق القمر آثار قیامت سے ہے۔

حاضرین کے علاوہ غیر حاضرین نے بھی چاند کو دو ٹکڑوں میں بٹا دیکھا۔ قرآن مجید میں اس معجزہ کا ذکر ہے۔ بعض نام نہاد مسلمان حضرات قوانین فطرت سے ضرورت سے زیادہ ہی مرعوب ہیں اور اس کو آثار قیامت میں شامل کرتے ہیں۔ کیونکہ آیت میں ہے ''اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ'' (قریب آ گئی ساعت اور پھٹ گیا چاند) (القمر۱، پارہ ۲۷)

لیکن ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کفار نے اس کو جادو سمجھا اور آیت میں الفاظ مندرجہ ذیل کے بعد ہی اس چیز کا ذکر فرمایا گیا ہے۔'' و ان یر و ایتہ لیعر ضوا یقولوا سحر مستمر'' (القمر۲، پارہ ۲۷) (اگر یہ کفار معجزہ دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو سحر مستمر ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوئے' اور کونسی چیز تھی جس کو منکرین اسلام نے جادو خیال کیا۔ سحر مستمر یعنی وہ جادو جو دائمی ہو۔ کفار حضور ﷺ کے تمام معجزات کو جادو سمجھتے تھے۔ اگر یہ فقط قیامت کا ذکر ہوتا تو کفار کے لیے سحر اور سحر مستمر کے ذکر کا کیا موقع تھا؟ کفار نے چاند کے دو ٹکڑے ہوئے دیکھے اگر انہوں نے اسے نظر بندی سمجھا تو یہ بات تو حقیقت ہے کہ کسی نے وہ بات کر دکھائی جو کوئی اور شخص نہیں کر سکتا حسین آفندی کے بقول ''فرض کر لیجیے کہ محمد ﷺ نے حاضرین کی نظر بندی کر دی یہاں تک کہ انہوں نے اس امر کا مشاہدہ کیا کہ چاند شق ہو گیا، تو کیا آپ کی قدرت میں یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ آپ ان مسافروں کی بھی نظر بندی کر دیتے ہیں جن میں سے ہر فریق جدا جدا مقام پر تھا نیز کفار کا سوال یہ تھا کہ چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیں۔ آپ ﷺ نے چاند دو ٹکڑے کر دکھایا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ چاند دو ٹکڑے کیا نہیں مگر ان کی نظر بندی کر دی جس سے چاند انہیں دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا نظر آیا۔ یہ بات بالکل سوال کے خلاف ہے کیونکہ سوال میں ہے چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھائیں تو اب سوال کے جواب میں چاند کے دو ٹکڑوں میں

تقسیم کرنا ہے اگر ایسا نہیں اور سوال کے خلاف جواب ہے تو یہ دھوکہ ہے جو کار نبوت کے بالکل خلاف ہے جبکہ نبوت سرتاپا امانت و دیانت کی حامل ہوتی ہے۔لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ سوال گندم جواب چنا دیا جائے۔

اعتراض ۳۴

''ولیم میور آنحضرت ﷺ کے مختون پیدا ہونے کو اختراعی روایات میں شامل کر کے بعید از قیاس اور خلافِ قانون قرار دیتا ہے''۔ (خطبات احمدیہ ص ۴۳۵)

جواب: روزمرہ کے مشاہدات شاہد ہیں کہ ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں جن میں علامت تذکیر و تانیث دونوں موجود ہوتی ہیں۔ایسے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں جو مختون (ختنہ شدہ) ہوتے ہیں۔یہ نظامِ قدرت ہے۔قدرت کی شہ کار صنعت گری میں ایسے واقعات کا وقوع میں آنا کوئی عجیب بات نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی اسی صفت کو ولیم میور اختراعی روایات کا نام دیتا ہے لیکن دنیا میں دیگر مختون پیدا ہونے والے بچوں کے بارے میں کیا کہے گا؟ بعض نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کا ختنہ اس وقت کیا گیا جس وقت آپ حلیمہ سعدیہ کے ہاں پرورش پا رہے تھے اور جس وقت جبرائیل نے شقِ صدر کیا اور آپ کا قلب مبارک پاک صاف کیا تھا تو آپ ﷺ کا ختنہ بھی کیا تھا۔اس کو ابنِ نعیم، دمیاطی، مغلطائی اور طبرانی سے اوسط میں اور ابو نعیم نے ابو بکرہ کی حدیث سے روایت کیا ہے جب کہ امام ذہبی نے اسے حدیث منکر کہا ہے۔ابن عساکر کی روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایسے حال میں پیدا ہوئے کہ آپ ناف بریدہ اور ختنہ کیے ہوئے تھے۔امام حاکم نے مستدرک میں کہا ہے کہ یہ متواتر احادیث وارد ہوئی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ختنہ کیے ہوئے پیدا ہوئے۔مگر امام ذہبی نے حاکم کا یہ قول رد کیا ہے کہ یہ حدیث (شیخین کے بغیر) متواتر نہیں اس لیے اس میں حجت معلوم نہیں ہوتی۔۔حاکم کی متواتر سے مراد سند کے اس طریق سے نہیں جو آئمہ کے نزدیک اصطلاح حدیث میں ہے۔امام حاکم کے نزدیک ان احادیث کے تواتر سے مراد یہ ہے کہ ان روایات کی شہرت بھی ہے اور سیرت کی کتب میں کثرت بھی۔(حاشیہ سیرت محمدیہ ترجمہ مواہب لدنیہ۔۹۳)

صاحب ترجمان السنہ ج ۴ ص ۱۳۲ پر لکھتے ہیں'' ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کے اس واقعہ کے لیے صحیحین کے درجہ کی اسناد کہاں میسر آسکتی ہیں اس قسم کے واقعات ہمیشہ شہرت کی بنا پر مقبول و منقول ہوا کرتے ہیں۔کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے پیدائشی مختون ہونے کی شہرت اس درجہ ہے کہ آپ ﷺ کی امت میں جو بچہ صفت (مختون) پیدا ہوتا ہے اس کو''رسولیہ'' کہا جاتا ہے۔یہ زمانہ جاہلیت کا واقعہ ہے لیکن محدثین کے ہاں کچھ متون احادیث بھی ایسے ہیں کہ جو صرف شہرت کی بنیاد پر نقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔مثال کے طور پر ابو الدرداؓ صحابی سے روایت ہے کہ''جو شخص دین کے معاملات کی چالیس احادیث

زبانی یاد کرے گا اللہ تعالیٰ روزِ محشر اس کو فقیہہ اٹھائے گا اور میں اس کی گواہی دوں گا اور اس کی شفاعت کروں گا"۔ یہ حدیث بیہقی نے روایت کی ہے پھر اس درجہ مشہور ہوئی کہ محدثین نے اس حدیث کے تحت "اربعین" یعنی چہل حدیث کے عنوان سے مستقل تالیفات فرمائی ہیں جن میں چالیس چالیس حدیثیں جمع کی گئی ہیں تا کہ اگر کسی کو اس فضلیت کے حاصل کرنے کا شوق ہو تو وہ ان کے ذریعہ سہولت حاصل کر سکے۔ اس کے بعد بڑے بڑے علماء نے ان مصنفات کی شروح لکھیں لیکن امام احمد اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں "لوگوں میں اس حدیث کی شہرت تو بہت ہے مگر اس کی کوئی سند صحت کے درجہ کی نہیں ہے" ایک ضعیف حدیث علماء نے اس قابل سمجھی کہ اس پر تصانیف اور ان کی شروح لکھی گیئں تو آپ کے مختون ہونے کے واقعہ کو نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے؟۔ اور صفت کو کسی نے فضائل میں شمار کیا تو اسے جھوٹ کا مرتکب کیوں جانا جاتا ہے؟ حالاں کہ آئے دن اس دنیا میں مختون بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں جو ایک تصدیقی امر ہے۔

سیرت محمدیہ مترجم مواہب لدنیہ میں ہے کہ ابن درید کی وشاح میں ابن الکلبی کے حوالے سے روایت ہے کہ حضرت آدمؑ مختون پیدا ہوئے ان کے بعد بارہ انبیاء مختون پیدا ہوئے۔

۱۔ حضرت شیثؑ (۲) حضرت موسیٰؑ (۳) حضرت ادریسؑ (۴) حضرت سلیمانؑ (۴) حضرت نوحؑ (۵) حضرت سامؑ (۶) حضرت یحیٰؑ (۷) حضرت ہودؑ (۸) حضرت یوسفؑ (۹) حضرت شعیبؑ (۱۰) حضرت لوطؑ (۱۱) حضرت صالحؑ (۱۲) حضرت محمد ﷺ

"آئے دن عام لوگوں میں مختون بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں جنھیں "رسولیہ" کہا جاتا ہے۔ انبیاء کی شان تو وری الوریٰ ہے ان کا مختون پیدا ہونا منشائے ایزدی ہے تو اس میں چوں وچراں کیسی اور کیوں؟ حقیقت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جنھوں نے اس واقعہ کو فضائل کے باب میں شمار کیا ان کی نظر صرف آپ ﷺ کے مختون پیدا ہونے پر نہیں ہے بلکہ اسی کے ساتھ دوسرا لفظ "مسرورا" بھی موجود ہے" یعنی ناف بریدہ" غالباً ان دوصفتوں کا بچہ ابھی تک کوئی سننے میں نہیں آیا۔ مفصل روایات میں موجود ہے کہ اس وقت بھی یہ صورت تعجب سے دیکھی گئی تھی اس واقعہ کو آیات نبوت یعنی فضائل میں شمار کرنے پر اصرار نہیں لیکن بے وجہ اس کو فضائل کی فہرست سے خارج کرنے پر زور دینے سے بھی انکار ضرور ہے" (ترجمان السنہ ج۴ص۱۳۴)

مہر نبوت

اعتراض نمبر ۳۴

سر ولیم میور کہتا ہے "صفیہ سے نقل ہے کہ آنخضرت (ﷺ) کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں مرقوم تھی تمام مستند حدیثیں بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک سیاہ غدود تھا اور اس پر بال تھے۔

خود آنحضرت ﷺ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ میری رسالت کی مہر ہے اور نہ کبھی اس کو اپنی رسالت کے برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جس طرح حضرت موسیٰؑ نے اپنے ید بیضا کو ثبوت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہر چیز کی حرمت و تعظیم کی جاتی تھی اور اسی خیال سے بعض لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی پشت کے غدود کو عام زبان سے بولنا بے ادبی و گستاخی خیال کر کے استعارتاً اس مہر نبوت کے معزز اور گرامی نام سے موسوم کیا'' (خطبات احمدیہ ص ۴۳۶)

سرسید کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے اور جمیع علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے پس کیا ایک عیسائی عالم کو یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ مسلمانوں پر ان کے نبی کی رسالت کے ثبوت میں ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا الزام لگائے جس سے وہ خود انکار محض کرتے ہیں۔

جواب: مہر نبوت سے متعلق چند روایات:۔

رسول اللہ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان خاتم نبوت سے مہر لگائی گئی اور خاتم شریف سے مشک کی بو مہکتی تھی اور خاتم نبوت کبوتر کے انڈے کی طرح تھی۔۔ (بخاری)

مہر نبوت پر بال جمع تھے گویا وہ سیاہ مسّے تھے۔ (مسلم شریف) مسّوں سے تشبیہ صرف رنگ سے ہے نہ کہ مہر نبوت کی صورت میں۔

مہر نبوت دائیں شانہ کی نرم ہڈی یا غضروف کے پاس تھی۔ (ابو نعیم)

مہر نبوت شانہ مبارک کے پاس بال جمع تھے۔ (صحیح حاکم)

مہر نبوت غدود کی طرح تھی۔ (بیہقی)

مہر نبوت گوشت کا ابھرا ہوا ٹکڑا تھا۔ (شمائل ترمذی)

مہر نبوت گوشت کی گولی کی طرح تھی۔ (ابن عساکر)

مہر نبوت چمک دار نور تھا۔ (مولد شریف از ابن عائذ)

مہر نبوت کبوتر کے غدرہ کی مانند تھی۔ (سیرت ابن ابی عاصم)

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ خاتم نبوت سے متعلق روایتیں معانی میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور متفرق طور پر متفق ہیں کہ ''خاتم (مہر) نبوت رسول کریم کے جسم مبارک پر ابھری ہوئی کبوتر کے انڈے اور حجلہ کی گھنڈی کے برابر تھی''

اب ولیم میور کے اعتراض کا جائزہ لیتے ہیں۔ اول آنحضرت ﷺ کی مہر ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں مرقوم تھی۔ تمام مستند حدیثوں میں بالاتفاق بیان ہے کہ وہ ایک غدود تھا اور اس پر بال تھے'' سر

سید کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ مہر نبوت پر حرف لکھے ہوئے تھے، جمیع علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا پس ایک عیسائی عالم کو یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ مسلمانوں پر ان کے نبی کی رسالت کے ثبوت میں ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا الزام لگائے جس سے وہ خود انکار محض کرتے ہوں (خطبات احمدیہ۔۴۳۶)

اس کا جواب یہ ہے کہ ''اگر کمزور روایتوں سے تحریر کا پتہ چلتا ہے تو اس سے انکار کی جرات ممکن نہیں جب خود مہر نبوت کی شکل کے متعلق راویوں کے مختلف بیانات اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے موجود ہیں اور ان میں یہ بھی موجود ہے کہ اس پر کچھ رواں بھی تھے۔ اگر روئیں کے خطوط سے کسی کے ذہن میں کوئی خاص لفظ بنتا نظر آ گیا ہے اور اس نے اپنے اس قیمتی مشاہدہ کے مطابق اس طرح اس کو نقل کر دیا ہے تو اس کا کیا قصور ہے؟ آج بھی ہر شخص ریل کے کھٹکوں میں اپنے اپنے خیال کے مطابق مختلف الفاظ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی نظروں میں ان خطوط سے کوئی خاص لفظ پیدا ہو گیا یا بن گیا تو اس کو احتمال کے درجہ میں کیوں نہ رہنے دیا جائے جب کہ اس کے خلاف بھی ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے'' (ترجمان السنہ ۱۳۴)

۲؛ ولیم کا یہ کہنا کہ دو مستند حدیثوں میں بالاتفاق بیان ہے کہ وہ ایک سیاہ غدود تھا اور اس پر بال تھے'' اس کے جواب میں مسلم شریف کی حدیث ملاحظہ کیجیے۔ مسلم شریف میں ہے ''مہر نبوت پر خال جمع تھے گویا وہ سیاہ مَسّے تھے'' مَسّوں کی رنگ سے تشبیہ ہے نہ کہ مہر نبوت کی صورت میں۔ نیز بالوں کا رنگ سیاہ تھا نہ کہ مہر نبوت کا رنگ سیاہ تھا۔ ولیم میور کا بیان درست نہیں کہ ایک سیاہ غدود تھا،

۳؛ ولیم میور کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مہر نبوت کے برحق ہونے کا ثبوت میں پیش نہیں کیا جیسے حضرت موسیٰؑ نے اپنی رسالت کے برحق ہونے کے ثبوت کے طور پر لوگوں کے سامنے ید بیضا پیش کیا تھا۔

ج؛ مہر کو نبوت کے برحق ہونے کے ثبوت میں پیش نہیں کیا؟ کیا کئی صحابہ نے مہر نبوت یا نبوت کے برحق ہونے کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے بیانات کی کہیں آنحضرت ﷺ نے نفی فرمائی؟ کہیں نہیں تو میور کو تسلیم کرنا چاہیے کیوں کہ یہ وہ اصحاب ہیں جن سے قرآن ہم تک پہنچا ہے۔ یہ وہی قرآن ہے جو آج بھی وہی ہے اور اس وقت بھی تھا۔ اور ولیم میور بھی قرآن کی حقانیت کا یقین رکھتا ہے۔ آپ ﷺ امین تھے۔ انھوں نے جو پہنچایا برحق تھا۔ لہٰذا مہر کی حقیقت بتائی وہ بھی برحق ہوئی۔ نبوت کے برحق ہونے میں گواہی دی وہ بھی برحق ثابت ہوئی۔

شام کے تجارتی سفر میں مشہور نصرانی راہب نسطورا کے گرجے کے پاس قافلے نے پڑاؤ کیا۔ اس قافلہ میں آنحضرت ﷺ بھی تھے۔ آپ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے۔ میسرہ غلام جو اس

سفر میں خدیجہ نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔اس کی راہب سے آشنائی تھی۔میسرہ راہب کے پاس گیا تو اس نے پوچھ لیا کہ درخت کے نیچے بیٹھنے والا شخص کون ہے؟

میسرہ؛ خاندان قریش کا ایک فرد ہے۔

راہب: کیا اس کی آنکھوں میں سرخی ہے؟

میسرہ: ہاں! ہمہ وقت

راہب بولا: وہ بلا شبہ وہی ہیں ۔۔۔۔آخری نبی جس کی خبر مسیحؑ ابن مریم نے دی تھی کہ ایک دن اس درخت کے نیچے ایک نبی آ کر بیٹھیں گے۔کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب وہ نبی نبوت سے سرفراز ہوں گے'' بعدازاں نسطورا خود آپ کے پاس آیا قدم بوسی کی اور مہر نبوت کو چوما اور کہا'' اَشْهَدُ وَاَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ النَّبِی الْاُمِیّ الَّذِی بَشَّرَ بِہٖ عِیْسٰی''

''ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں وہ نبی امی جس کی بشارت عیسیٰؑ دے کر گئے تھے (سید الوری ج ۱ ص ۱۵۰)

راہب نے مہر کو چوما اور گواہی دی کہ آپ (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔راہب تو مہر نبوت کو مانتا تھا اور چومتا ہے مگر ولیم میور اپنے تعصّبات کی بنیاد پر طرح طرح کے شکوک پیدا کرتا ہے نہ اپنوں کی مانتا ہے نہ دوسروں کی۔

دوم: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی کیوں کہ آپ ﷺ خاتم النبیین تھے۔(ابواب المناقب جلد دوم ص ۳۵۸ ترمذی شریف)

سوم: صاحب ترجمان السنہ جلد نمبر ۱ ص ۳۹۴ پر لکھتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی اس معنوی خصوصیت کو بھی حسّی شکل میں ظاہر کر دیا گیا تھا۔کتب سابقہ میں بھی مہر نبوت آپ کی ایک علامت بتلائی گئی تھی اس لیے طالبان حق نے منجملہ اور علامات کے آپ کی مہر نبوت کو بھی تلاش کیا ہے۔اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاتم النبیین ﷺ آپ کا شاعرانہ لقب نہیں تھا بلکہ مہر نبوت کی وجہ سے کہ آپ آخری نبی ہیں آپ کو اسی لیے خاتم النبیین کہا جاتا ہے۔

چہارم: ولیم میور کا یہ کہنا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہر چیز کی حرمت و تعظیم کی جاتی تھی اور اسی خیال سے بعض لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی پشت کے غدود کو عام نام سے بولنا بے ادبی اور گستاخی خیال کر کے استعارتاً اسی کو مہر نبوت کے معزز اور گرامی نام سے موسوم کیا''۔

الہامی کتب سابقہ میں مہر نبوت کی علامت آخری نبی مکرم ﷺ کی بیان ہوئی ہے۔دوم نسطورا راہب نے مہر نبوت کو چوما گویا تعظیم کی حد کر دی اس کے ساتھ دلیل میں یہ کہا کہ اس نبی کی آمد کی خبر مسیح

ابن مریم دے کر گئے تھے۔ راہب کا بیان اور عمل مستشرق ولیم میور کے باطل الزامات کا رد کرتا ہے اپنے پادری کی تعظیم کرنے سے سبق سیکھ لیتا تو ایسی باتیں نہ کرتا۔

امام حاکم نے مستدرک میں ابن منیہ سے روایت کی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا مگر ایسے حال میں کہ اس کے دائیں ہاتھ میں نبوت کا خال مہر نبوت کی علامتیں ہوتی تھیں۔ مگر ہمارے نبی کریم مبعوث کیے گئے تو آپ کی نبوت کا خال مہر نبوت آپ کے دونوں شانوں کے درمیان تھی" اس صورت میں مہر نبوت آپ کے دونوں شانوں کے درمیان دل کے مقابل لگائی جانی اس صفت سے ہوگی جس کے ساتھ آپ کو سارے نبیوں سے اختصاص ہے (سیرت محمدیہ ترجمہ مواہب لدنیہ ج اول ص ۱۱۴۔۱۱۵)

مستشرق کا یہ کہنا کہ آپ کی ہر چیز کی عزت و تعظیم کی جاتی تھی۔ یہ درست ہے کہ مومن لوگوں کو اپنی کامیابی اور فلاح کے لیے آپ کی عزت و تکریم کے لیے خود خالق حقیقی حکم فرماتا ہے "فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ (الاعراف ۱۵۷، پارہ ۹)

(ترجمہ) جو لوگ ایمان لائے ان (نبی ﷺ) پر اور جنہوں نے ان کی تعظیم کی اور جذبہ احترام کے ساتھ ان کی مدد کی اور پیروی کی اور جو ان پر نازل ہوا، وہ بھی فلاح پانے والے ہیں۔

اعتراض نمبر ۳۵

درج ذیل حدیث کے بارے سرسید (خطبات احمدیہ ص ۴۳۷) پر کہتے ہیں کہ اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے وہ کیا چیز تھی اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اس زمانہ کے مسلمان جو آنحضرت ﷺ کے اصحاب تھے اس کو کیا سمجھتے تھے پس سر ولیم میور صاحب نے اس کو جو عجائبات اسلام کہا ہے محض بے جا ہے"

مہر نبوت کو مرض خیال کرنا کیسا ہے؟

ابو رمثہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ہمراہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے آپ کی پشت پر مہر نبوت دیکھی تو عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ فرمایئے تو میں اس کا علاج کر دوں کیوں کہ میں طبیب ہوں۔ آپ نے فرمایا تم تو رفیق ہو، طبیب حقیقی تو دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے آپ کے بازو مبارک کی جانب سیب کی طرح ابھری ہوئی ایک چیز دیکھی (یعنی مہر نبوت) تو میرے والد نے عرض کیا کہ میں طبیب ہوں ارشاد ہو تو میں اس کا علاج کر دوں؟ آپ نے فرمایا اس کا طبیب تو وہی ہے جس نے اس کو پیدا فرمایا ہے (رواہ احمد واخرجہ صاحب المشکوٰۃ فی باب القصاص)

جواب؛ سرسید کا بیان درست نہیں۔ وہ یوں کہ لوگوں کے خیال میں ایک شخص کو مرض ہے لیکن وہ بیماری اور مرض اس وقت تک مرض نہیں ہوتا جب کہ خود مرض میں مبتلا شخص نہ کہے۔ وہ مریض اس کی از

خود تصدیق نہ کرے کیونکہ مرض سے اسے تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے کسی نہ کسی معالج کی ضرورت ہوتی ہے۔اس حدیث سے کہیں ادنیٰ اشارہ بھی اس باب میں نہیں ملتا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہو کہ مجھے یہ مرض لاحق ہے۔ پھر یہ بھی کہ آپ ﷺ نے علاج کا رد فرمایا اور ابی رمشہ کے والد کے کہنے پر علاج کی طرف رغبت نہیں فرمائی نیز مدت العمر کسی موقعہ پر بھی آپ ﷺ نے اس مرض کے علاج کی خواہش نہیں فرمائی۔مہر نبوت پر مرض کے اس گمان کرنے والے کے جواب میں کسی ادنیٰ ناگواری کی بجائے آپ ﷺ نے اس سے ایسے بصیرت افروز کلمات فرمائے کہ خود اس طبیب کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ سمجھ گیا کہ اضافی بہی خواہی کی حد تک بہت سے بہت ظاہری دوری اور رفاقت تک ہوسکتی ہے۔اس لیے اس کی حیثیت بھی ایک رفیق کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔شفاو مرض کا اصل رشتہ و تعلق خدا تعالیٰ کے ہی دست قدرت میں ہے۔اس لیے طبیب کا اصل لقب پانے کے لیے اس کی ذات پاک موزوں اور برحق ہے۔وہ بھلا طبیب ہونے کا کیا دعویٰ کر سکتا ہے جس کو مرض وشفا کا منبع کے درمیان تمیز نہ ہو۔

عرفی نظر میں گو کسی انسان کو طبیب کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن آپ ﷺ نے تنبیہ فرمائی کہ ایک مومن کے قلب میں توحید کا نقش ایسا گہرا ہونا چاہیے کہ اس کی نظر میں ایک قابل سے قابل طبیب کی حیثیت بھی ایک ضعیف رفیق کی رہ جائے۔اور طبیب کا لقب صرف اس کی ذات کے ساتھ مخصوص نظر آئے جو شفاو مرض کا سرچشمہ ہے(ترجمان السنہ جلد دوم ۳۸۸۔۳۸۷)

نکتہ: کیا آپ ﷺ علاج کی مخالفت کرتے تھے اور کبھی کسی عارضہ میں مبتلا ہوئے ہوں اور علاج نہیں کرواتے تھے؟

نہیں، ہر موقعہ پر مرض کے مطابق علاج کرواتے تھے۔ جنگ احد میں عقبہ کے پتھر سے دانت ٹوٹا، ابن قیمہ کے پتھر سے نبی مکرم ﷺ کی پیشانی اور ابن ہشام کے پتھر سے آپ کا بازو زخمی ہوا۔ پیشانی کا خون تھمتا نہیں تھا۔آپ کی لخت جگر بیٹی حضرت فاطمہؓ نے پیشانی کو پانی سے دھویا پھر چٹائی جلا کر راکھ زخموں میں بھردی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے تکلیف کے پیش نظر پچھنے لگوائے۔ حضرت انسؓ بن مالک سے کسی نے پوچھا! پچھنے لگانے کی اجرت حلال ہے یا حرام؟ انھوں نے کہا ابوطیبہ (نافع یا میسرہ) نے آنحضرت ﷺ کے پچھنی لگائی آپ نے اس کو اجرت میں دو صاع کھجور دیئے اور اس کے مالکوں سے (بنو حارثہ) سفارش کی، انھوں نے اس کا محصول کم کردیا اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا تمھارے علاجوں میں پچھنی لگانا عمدہ ہے اور عمدہ دوا عود ہندی ہے اور آپ نے فرمایا حلق کی بیماری میں، بچوں کو ان کا تالو دبا کر تکلیف نہ دو، قسط لگاؤ اس سے ورم جاتا رہے گا۔(بخاری۔۳،۳۱۴)

لہٰذا مہر نبوت نعوذ باللہ کوئی بیماری یا مرض ہوتا تو آپ ﷺ اس کے علاج کی طرف رجوع

فرماتے مگر ایسا نہیں ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو اس کا علم تھا کہ یہ مرض نہیں، تو دوسرے کا مرض گمان کرنا درست نہیں اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے ابی رمثہ کے والد کو مرض کہنے پر نا گواری ظاہر نہیں فرمائی کیوں جب کہ مرض نہ تھا؟ بتقاضہ رحمت اللعالمینی تھا، آپ ﷺ سے یہی توقع ہو سکتی تھی کہ اس کی دل آزاری نہیں فرمائی نیز طبیب ورفیق کے فرق کو واضح فرما کر توحید کے اسرار و رموز بھی واضح فرمادیئے صلّوعلی الحبیب!

یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی بیماری لاحق ہونے پر علاج کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بیمار ہوئے تو آپ نے ان سے کہا کہ انھیں ملی ڈاکٹر الحارث بن کلاوہ کو بلانا چاہیے۔

دودھ پلائی والی پہلی خاتون: صاحب مدارج النبوت (مدارج نبوہ۔۳۳) رقم طراز ہیں کہ ''سب سے پہلے جس نے حضور کو دودھ پلایا وہ ابولہب کی باندی ثویبہ تھی۔ جس شب حضور کی ولادت ہوئی ثویبہ نے ابولہب (آپ کے چچا) کو بشارت پہنچائی کہ تمھارے بھائی حضرت عبداللہ کے گھر فرزند پیدا ہوا ہے۔ ابولہب نے اس مژدہ پر اس کو آزاد کر کے حکم دیا کہ جاؤ دودھ پلاؤ''

اہم نکتہ؛ جن سیرت نگاروں نے صاحب مدارج النبوت کے حوالے سے واقعہ لکھا ہے تو وہ اسی طرح لکھا ہے جس طرح اوپر بیان ہوا ہے جیسے سیرت مصطفیٰ از عبدالمصطفے اعظمی نے ص ۴۷ پر ''دودھ پینے کا زمانہ'' عنوان کے تحت لکھا ہے۔ مگر میری نظر میں اور جتنی سیرت کی کتب آئیں میں نے یہی پڑھا کہ سب سے پہلے جس کا آپ ﷺ نے دودھ نوش فرمایا وہ آپ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ مثال کے طور پر حکیم محمود احمد ظفر (سیرت خاتم النبیین۔۱۲۳) لکھتے ہیں بحوالہ طبقات ابن سعد، زرقانی، عیون الاثر، نہایہ الادب اور تاریخ اسلام ذہبی'' کہ ابتدا میں چار روز (اور بعض روایات میں سات روز) آپ کی والدہ سیدہ آمنہؓ نے آپ کو دودھ پلایا۔ اس کے بعد ثویبہ نے جو ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی تھی نے دودھ پلایا۔ آپ کے چچا ابولہب کو جب ثویبہ نے آپ کی ولادت کی خوش خبری سنائی اور بتایا کہ تمھارے مرحوم بھائی عبداللہ کے گھر خدا نے فرزند عطا فرمایا ہے تو اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ پھولے نہ سمایا اور اسی وقت لونڈی کو آزاد کر دیا۔ دراصل بات یوں ہے کہ آپ ؐ کو والدہ ماجدہ کے بعد سب سے پہلے جس نے دُودھ پلایا وہ ثویبہ تھی۔

اہم نکتہ: صاحب اصح السیر نے ص ۶ پر لکھا ہے کہ ابولہب نے ہجرت کے بعد آزاد کر دیا تھا یہ درست نہیں ہے کیونکہ مذکور واقعہ سے اس کا رد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اوپر کے واقعہ کی تصدیق حضرت عباسؓ کے خواب سے بھی ہوتی ہے۔ ایک اور روایت میں عباس کے خواب کے حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابولہب نے آپ ﷺ کی ولادت کی خوش خبری سن کر ثویبہ کو آزاد کیا تھا۔ لہٰذا صاحب اصح السیر کو بھی سہو

ہوا ہے۔ یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ثویبہ کو جو محمد ﷺ کی ولادت کا مژدہ سن کر آزاد کیا تھا، اس کی وجہ سے دوشنبہ (پیر) کو عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ (خاتم النبیین ص ۱۲۳ بحوالہ فتح الباری، البدایہ و النہایہ، جامع الاصل تاریخ اسلام ذہبی) لہٰذا ثویبہ کو ابولہب نے اپنے بھتیجے حضرت محمد ﷺ کی ولادت پر آزاد کیا تھا نہ کہ ہجرت کے بعد۔

رسم عقیقہ اور نام رکھنا: بچہ پیدا ہونے کے شکریہ میں جو جانور ذبح کیا جاتا ہے اس کو عقیقہ کہتے ہیں۔ آنحضرت کے دادا نے ساتویں دن اونٹ ذبح کر کے قریش کو دعوت پر بلایا۔ قریش دعوت میں چلے آئے۔ اس موقع پر اور باتوں کے علاوہ چند غیر معمولی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ دعوت پر کسی نے پوچھ ہی لیا کہ کیا آج شراب نہیں چلے گی؟ آپ کے دادا جان نے نفی میں جواب دیا کہ آج یہاں شراب نہیں چلے گی کیوں کہ ابن عبداللہ کی ولادت سے شراب ہم پر حرام ہوگئی ہے (اعلان نبوت ۳۳۳) اس کے بعد پھر یہ مطالبہ کرنے کی کسی میں ہمت نہ رہی۔ دوسری یہ چیز کہ رسم عقیقہ اور اسم گرامی رکھنے کے وقت آپ کے والد ماجد موجود نہ تھے۔ وہ پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے اور آپ ﷺ کے دادا نے یہ رسمیں بخوبی سرانجام دیں۔ سوم۔ دادا نے نام محمد ﷺ رکھا۔ یہ سن کر قریش سے رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھے کہ اس نام نامی میں کیا خوبی ہے کہ آپ نے تمام اپنے بزرگوں کے نام نامی نظر انداز کر دیئے ہیں؟ فرمایا "اس توقع پر کہ ارض و سما دونوں جگہوں میں میرے فرزند کی تعریف کی جائے"۔

تاریک حرف کوئی نہیں اس کے نام میں
یہ وہ نام ہے جس کا ستارہ بھی روشنی

اہم نکتہ: آپ سے پہلے اس نام کے اور بچے بھی تھے جن کے والدین نے اپنے بچوں کے نام اس آس و امید پر رکھے کہ انھوں نے سن رکھا تھا کہ عنقریب نبی آنے والا ہے جس کا نام "محمد" ہے، شاید وہ یہی ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی کہ ہر شخص جس کا نام محمد ہے وہ نبوت کا دعویٰ کرے یا اس کو کوئی اس کے ساتھ پکارے یا اس پر کوئی سبب ظاہر ہو جائے جس سے کوئی آپ ﷺ کے بارے میں شک کر سکے یہاں تک کہ یہ دونوں نام آپ ﷺ کے خوب تحقیق والے ثابت ہو گئے اور کوئی ان دونوں ناموں میں نزاع نہ کر سکا" (الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ ۔ ۲۰۶) آنحضرت کے وہ دونوں نام "محمد اور احمد" ﷺ ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ جسمانی اعضاء میں کمی یا بیشی ہو تو اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔ شق صدر میں آپ ﷺ کے جسم اطہر سے خون کا لوتھڑا نکال کر باہر پھینک دیا تھا اور ختنہ کے ٹکڑے کا نہ ہونا بھی عیب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کامل انسان پیدا فرمایا اور یہ لوتھڑا بھی منجملہ اجزائے انسان میں سے تھا اسے پیدا کر کے تخلیق انسان کی تکمیل ہوئی اس کے بعد نکال لیا گیا اس میں آپ ﷺ

کی تعظیم وتکریم ہوئی اگر آپ ﷺ میں وہ لوتھڑا نہ ہوتا تو ایک طرف آپ ﷺ کے اجزائے انسانی میں کمی ہوتی اور یہ نقص ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ میں کوئی نقص وعیب گوارا نہیں اور اسے پھر نکالا نہ جاتا تو آپ ﷺ کی تکریم وعظمت شان کا اظہار نہ ہوتا۔ مشہور روایات میں ہے کہ حضور ﷺ مختون پیدا ہوئے اور ختنہ کے ٹکڑے کا نہ ہونا بھی تو اجزائے انسانی کی کمی کا موجب ہے لیکن وہ تو عظمت شان سمجھا گیا اور اس کے نہ ہونے میں بھی یہی عظمت وکرامت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ختنہ کے ٹکڑے کے ہونے میں کاٹتے وقت ستر کھولنا ضروری تھا اور یہ عیب دیگر کے علاوہ تنزہات نبوت کے خلاف تھا اور آپ ﷺ کو بھی ستر کا کھلنا سخت ناگوار تھا (جیسے کعبہ کی تعمیر کے قصہ سے عیاں ہے) اور سب کو معلوم ہے کہ ختنہ کا ٹکڑا کا نہ ہونا عظمت شان سمجھا جاتا ہے (اور شیطانی ٹکڑا پیدا کرنا اضافہ حسن وکمال ہے جیسے ناخنوں کا ہونا پھر انہیں کاٹنا حسن میں اضافہ کا موجب ہے اگر وہ پیدائشی نہ ہو تو عیب ہے۔

اعتراض نمبر ۳۶

(۱) دادا کو القاء اور حضرت بی بی آمنہؓ کو خواب میں بتایا گیا کہ اس بچے کا نام محمد ﷺ رکھنا، ایسا کیوں کیا گیا؟ جب کہ اس نام کے اور بھی افراد پیدا ہوئے نہ القاء ہوا نہ خواب میں مطلع کیا گیا؟

(۲) کوئی یہ کہے کہ دادا جان کو القاء ہی کافی تھا بی بی کو خواب میں فرشتہ کو نام بتانے کی کیا ضرورت تھی یا اگر بی بی نے خبر دی تھی تو دادا کو القاء کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

۳۔ کوئی یہ کہے کہ ایک روایت میں ہے کہ دادا کو نام رکھنے کے بارے القاء کیا گیا اور ایک روایت میں ہے کہ والدہ کو خواب میں فرشتہ نے بتایا اور حضرت عبدالمطلب نے اعلان کیا کہ میں نے اس بچے کا نام محمد ﷺ رکھا ہے اس موقعہ پر اپنے القاء اور بی بی کے خواب کا تذکرہ نہیں کیا صرف یہ قریش کے سامنے کہا کہ میں نے محمد ﷺ نام رکھا ہے' کیوں؟

جواب؛ القاء اور خواب کی حکمت یہ تھی کہ آپ سے پہلے والدین نے اپنے بچوں کے نام خود رکھے اس امید پر کہ انھیں شوق حصولِ نبوت تھا۔ یہاں باری تعالیٰ خود آپ ﷺ کے دادا جان کو القاء اور ماں کو خواب میں فرشتہ سے خبر دے رہا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ نومولود کوئی عام بچہ نہیں یہ وہی ہے جس کی دنیا منتظر تھی۔ یہ وہی ہے جس کے وسیلہ سے یہود دعائیں مانگتے تھے اور اپنی مرادیں برلاتے تھے۔

پہلا فرق آپ کا نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جب کہ پہلوں کا نام ان کے والدین کی طرف سے تھا دوم؛ القاء اور خواب سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ یہ بچہ ہے جس کے لیے تخلیق کائنات ہوئی وہ یہی ہیں۔ یہ وہی ہیں جس کی خاطر دوسرے لوگوں نے نام رکھے۔

سوم؛ آنحضرت ﷺ کے دادا نے القاء ہونے کے سبب آپ کا نام محمد ﷺ رکھا اور بی بی حضرت

آمنہؓ نے خواب میں فرشتہ کو دیکھا جس نے کہا کہ اس نومولود کا نام احمد رکھنا، اس بات میں صداقت کا ایک نہایت تسلی بخش ثبوت یہ ہے کہ عہد عتیق میں آنحضرت ﷺ کی بشارت محمد ﷺ کے نام سے آئی ہے اور انجیل مقدس میں ''احمد'' ﷺ کے نام سے، اس لیے ان کی بشارت کو پورا ہونے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت آمنہ کو بذریعہ فرشتہ ''احمد'' کا نام اور دادا کو بذریعہ القاء ''محمد'' ﷺ کا نام بتا دیا جائے، یہ دونوں نام نامی اور اسم گرامی آپ ہی کے ہیں۔ حضور نور ہیں، محمود ہیں، محمد ہیں اور یہی آخرالزماں نبی ہیں جس کی خبر زمانہ قدیم سے متواتر چلی آرہی تھی کہ عنقریب ایک نبی آنے والا ہے۔

ان روایات میں تعارض نظر نہیں آتا ہے اور یہ شوشہ چھوڑا کہ صرف ایک ہستی کو ہی نام رکھنے کی اطلاع دے دی جاتی، کافی تھا۔ ان ہستیوں کو پیدائش سے قبل آگاہ کر دیا گیا تھا جب کہ آپ کی آمد کی خبریں زبان زد عام تھیں کہ ایک نبی عنقریب تشریف لانے والے ہیں۔ ان ہستیوں کو بتانا آپ کے مرتبہ و مقام کی بلندی سے آگاہ کرنا تھا جس کی سربلندی اور سرفرازی کی تعریف آپ کے دادا نے یوں بیان فرمائی ''میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ اللہ آسمان میں اور اللہ کی مخلوق زمین میں اس بچے کی تعریف کے گن گائے'' (زرقانی شرح موطاء جلد ۱ص ۱۷۱)۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے محبوب کی شان میں عنقریب فرمانے والا تھا ''ورفعنا لک ذکرک'' لہٰذا ان بزرگ ہستیوں کو القاء اور خواب میں خبر دینا آپ کی بلند و بالا شان کا اظہار ہے کہ خاندان کی دو مقتدر شخصیات کو بتایا گیا یہ تاکیدی پہلو تھا۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دادا نے اپنے القاء اور بی بی کے خواب کا تذکرہ بھری محفل میں نام کا اعلان کرتے وقت نہیں کیا۔ یہ بھی دادا کی تعریف کے الفاظ سے اشارہ ملتا ہے کہ آپ نے بات وہ کہہ دی یعنی فرشتے نے کہا کہ بچے کا نام محمد ﷺ رکھنا، یعنی جس کی تعریف کی جائے اور دادا جان بھی یہی اعلان کر رہے ہیں کہ میں نے یہ نام محمد اس لیے رکھا ہے کہ ارض و سماء دونوں جگہوں پر میرے فرزند کی تعریف کریں۔ گویا آپ کا نام محمد رکھنا القاء اور خواب کا نتیجہ ہی ہوا۔

ایک نکتہ؛ اس نام کے اور بچے بھی موجود تھے مگر قریش نے آپ ﷺ کا یہ نام رکھنے پر پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ ﷺ نے تمام اپنے بزرگوں کے نام نظرانداز کر دیے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نام کے بچے عرب میں موجود تھے لیکن آنحضرت ﷺ کے خاندان میں آپ ﷺ سے پہلے یہ کسی کا نام نہ تھا۔ اسی وجہ سے قریش نے استفسار کیا۔ ورنہ دوسرے بچوں کے ناموں پر کوئی اعتراض نہیں کیا تو قریش یہ نام رکھنے کے بارے میں نہ پوچھتے؟ صرف اس لیے پوچھا کہ یہ نام خاندان بنو ہاشم کی روایات سے ہٹ کر رکھا گیا تھا۔

اعتراض نمبر ۳۷

''کتب قدیم میں آپ کا نام مذکور نہ تھا''۔

جواب: پہلی آسمانی کتب بالعموم اور توریت و انجیل میں بالخصوص آپ کا نام نامی اسم گرامی مع اوصاف کے مذکور تھا۔ توریت و انجیل میں آپ کے صفاتی نام کے ذکر کی تصدیق قرآن مجید نے کر دی، ارشاد ربانی ہے۔

''اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ'' (اعراف ۱۵۷، پارہ ۹)''

ترجمہ؛ وہ لوگ جو نبی کی پیروی کرتے ہیں وہ توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

سورہ الانعام میں ہے'' اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ '' ترجمہ؛ جن لوگوں کو کتاب دی ہم نے وہ آپ کو پہچانتے ہیں جس طرح پہچانتے ہیں اپنی اولاد کو'

تفاسیر میں منقول ہے کہ'' جب کسی نصرانی سے مسلمان ہونے کے بعد سوال کیا گیا کہ کیا آنحضرت ﷺ کی معرفت فی الواقع اولاد کی سی معرفت ہے تو انھوں نے کہا بلکہ اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر کیوں کہ اپنی اولاد کا یقین تو ہم کو صرف ایک عورت سے یعنی اس کی والدہ کے بیان پر ہوتا ہے جس کی دیانت وصداقت میں شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی معرفت تو ہم کو ان صحف سماویہ کے ذریعہ حاصل تھی جس میں شک وشبہ اور تردید کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی'' (ترجمان السنہ ۵۴۔۴)

تورات کی گواہی: سرسید [خطبات احمدیہ ۳۸۴۔۳۸۳] پیش گوئی لکھتے ہیں'' میرا دوست نورانی، گندم گوں، ہزاروں میں سردار، اس کا سر ہیرے سا چمک دار، اس کی زلفیں مثل زاغ کے کالی ہیں، اس کی آنکھیں جیسے پانی کے کنڈل پر کبوتر، دودھ میں ڈھلی ہوئی نگینہ کی مانند جڑی ہیں، اس کے رخسار ایسے ہیں جیسے ٹٹی پر خوشبودار بیل چھائی ہوئی اور چھلکے پر خوشبو رگڑی ہوئی، اس کے ہونٹ پھول کی پنکھڑیاں جن سے خوشبو ٹپکتی ہے اس کی پنڈلیاں ہیں جیسے سنگ مرمر کے ستون، سونے کی بیٹھکی پر جڑے ہوئے، اس کے ہاتھ سونے سے ڈھلے ہوئے اور جواہر سے جڑے ہوئے، اس کا پیٹ جیسے ہاتھی دانت کی تختی جواہر سے لپٹی ہوئی، اس کا چہرہ مانند مہتاب کے، جوان مانند صنوبر کے، اس کا گلا نہایت شیریں اور وہ بالکل محمد ﷺ ہیں۔ یہ ہے میرا دوست اور میرا محبوب اے بیٹیو! یروشلم کی (یہی پیش گوئی کچھ کم الفاظ میں نقوش رسول نمبر ج ۴ ص ۴۷۲ بحوالہ غزل الغزلات باب ۱۵ اور ۱۰ تا ۱۶ درج ہے)۔ اس پیش گوئی میں آنحضرت ﷺ کا ذاتی نام نامی کا تذکرہ ہے۔ اگر محمد کے معنی لیں تو وہ بھی تعریف کیے گئے، کے ہیں ورنہ وہ صاف صاف نام تو ہے ہی، گویا اولاً اس نام میں معنوی تعریف کی گئی اور محمد کے معانی ''ستودہ'' کے کیے گئے نیز نت نئے تراجم میں اس

مقام کی ترمیم، تحریف و تغیر مختلف انداز میں جاری ہے۔ جب کہ اصل عبرانی اور قدیم ترجموں میں اصل نام نامی موجود ہے۔ نت نئی تبدیلیوں کی بجائے ان حضرات نے یہ غنیمت جانا کہ اس لفظ کو حرف مکرر کی طرح مٹا دیا جائے (نعوذ باللہ) بشارت عہد عتیق مطبوعہ ۱۸۷۰ میں ہے "مرا محبوب سرخ و سفید ہے، دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈا کی طرح کھڑا ہے، وہ خوبی میں رشک سرو ہے، اس کا منہ شیریں ہے، ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ اے یروشلم کے بیٹیو! یہ میرا پیارا، میرا جانی ہے۔ (نقوش رسول نمبر ج ۴۔ ص ۴۴۲)

اس عبارت میں جا بہ جا تغیر و تبدیلی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ آپ کے نام مبارک کو حذف کر کے اس جگہ سراپا عشق انگیز ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ یہ ترجمہ بھی آپ کے صادق ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ دس ہزار آدمیوں میں جھنڈے کی طرح کھڑے ہونا حضور کی ذات اقدس پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔ تاریخ نے اس حقیقت کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے اور بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے دن دس ہزار اسلامی فوج آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔

اہم نکتہ؛ پیش گوئی جو سرسید نے خطبات احمدیہ میں تحریر کی جو اوپر بیان کی گئی ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس کے عربی ترجمہ میں لفظ "محمدیم" آتا ہے۔ یہ نام محمد ﷺ کی جگہ محمدیم کیوں آیا؟ سرسید جواب دیتے ہیں کہ "عبرانی زبان میں "ے" اور "م" علامت جمع کی ہے اور جب کوئی بڑی قدر کا شخص اور عظیم الشان ہوتا ہے تو اس کے اسم کو بھی جمع بنا لیتے ہیں۔ جیسا کہ خدا کا نام "الوہ" ہے اس کی جمع الوہیم بنالی ہے اور اسی طرح بعل جو ایک بت کا نام ہے جس کو کفار بہت عظیم الشان سمجھتے تھے اس کی جمع بعلیم بنالی تھی۔۔۔ اس طرح اس مقام پر بھی حضرت سلیمانؑ نے بہ سبب ذی قدر الشان ہونے کے اپنے محبوب کے اس نام کو بھی صیغہ جمع کی صورت بیان کیا ہے اور سچ ہے کہ محمد ﷺ سے زیادہ مستحق کون شخص محمدیم کہلانے کا ہو سکتا ہے"۔

انجیل مقدس کی بشارت؛ اول: لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ مرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار (تسلی دینے والا) تمھارے پاس نہ آسکے گا لیکن اگر جاؤں تو تمھارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور سچائی اور عدالت کے بارے قصوروار ٹھہرائے گا" (نقوش رسول نمبر جلد ۴ ص ۴۴۴ بحوالہ انجیل یوحنا)

دوم؛ حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں "اگر تم مجھے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور اپنے باپ سے درخواست کروں گا وہ تمھیں تسلی دینے والا (فارقلیط کا ترجمہ) بخشے گا کہ ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے (حوالہ بالا)

سوم: اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تا کہ چپ ہو جائے، تو تم یقین کرو، اس کے بعد میں تم سے باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے"۔

چہارم؛ "لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی

طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کچھ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔''

زبور مقدس کی بشارت؛ ۱: حضرت سیدنا داؤدؑ ایک آنے والے نبی کا مشتاقانہ ذکر کرتے ہیں اور اس کی توصیف فرماتے ہیں ۲: تو حسن میں بنی آدم میں کہیں زیادہ ہے۔ تیرے ہونٹوں میں لطف بٹایا گیا ہے۔ اس لیے تجھے ابد تک مبارک رکھا گیا'' ۳: ''اے پہلوان اپنی تلوار کو، جو تیری حشمت اور بزرگواری ہے، حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا'' ۔۴: ''اور اپنی بزرگواری سے سوار ہو، اور ملائمت وصداقت کے واسطے اقبال مندی سے آگے بڑھ۔ ترا داہنا ہاتھ تجھ کو مہیب کام سکھلا دے گا'' ۵: ''تیرے تیر تیز ہیں۔ لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں، تیرے بادشاہ کے دشمنوں کے دل سلگ جاتے ہیں'' ۶: تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے'' ۷: تیرے سارے لباس سے مرادعود کی خوشبو آتی ہے''۔ ۸: بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں'' ۹: ''تیرے بیٹے تیرے باپ دادوں کے قائم مقام ہوں گے تو انھیں تمام زمین کے سردار مقرر کرے گا'' ۱۰ ''میں ساری پشتوں کو ترا نام یاد دلاؤں گا۔ پس سارے لوگ ابدالآباد تیری ستائش کریں گے''

یہ بشارت کس قدر صاف اور حرفاً حرفاً سرورِ عالم ﷺ پر صادق ہے۔ حضرت داؤدؑ کے بعد ایسا کون نبی دنیا میں آیا جو باطنی فضل وکمال کے ساتھ ظاہری حسن و جمال میں بھی یکتائے زمانہ ویگانہ عالم ہو اور حشمت وشوکت، حکومت وسلطنت اور تیر وتلوار کا بھی مالک ہوا ہو بجز محمد عربی ﷺ اور کوئی نہیں۔

سبحان اللہ! کس خلوص اور جوش ومحبت کے ساتھ حضرت داؤدؑ نے حضور انور کے حسن وجمال، جاہ وجلال، غزوات وفتوحات اور عظمت وجلالت کو بیان فرمایا ہے جس منہ سے حضرت داؤدؑ نے اس محبوب کی یہ تعریف کی اس دہن مبارک کے قربان اور مبارک لب ودہن سے یہ مدح وثنا فرمائی اس لب ودہن کے صدقے!

نہ من برآں گل و عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

اب ان سے پوچھتے ہیں:

۱: کیا یہ قدیم آسمانی کتب کی بشارتیں نہیں ہیں۔ جن میں کہیں تو آپ کا ذاتی نام نامی اور کہیں آپ کے صفاتی نام مذکور ہیں۔

۲: پیش گوئیوں میں آپ کا نام نامی کو ترجمہ لکھ کر تحریف کی اور کہیں آپ کے اسم گرامی کو حرف مکرر کی طرح مٹا دیا (نعوذ باللہ) ایسا کیوں کیا؟

۳: کیا تبدیلی وتغیر اور تحریف معنوی وغیرہ اس بات کی علامت نہیں کہ آپ کا نام نامی تو کتب سماویہ میں تھا جسے بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی؟

۴: جب اس سے بھی جی نہ بھرا تو آپ کے نام نامی کو حذف کر دیا گیا کہ مسلمان اس بشارت کے حوالے سے ثابت نہ کر سکیں کہ صحف آسمانی میں آپ کا نام مذکور ہے بتائیں نا ایسا ہی ہے نا؟ بار بار تبدیلیوں سے کیا غرض ہے؟

۵: سچ ہے کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے ان لوگوں نے جتنی بار اس طرح کی تبدیلیاں کیں اس تبدیل شدہ عبارت سے پھر بھی آپ کی ذات مبارک مراد ہوتی ہے لیکن کج فہم باز نہیں آتے اور ٹیڑھے ہی رہتے ہیں۔

رہا ٹیڑھا مثالِ نیش کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

ہندومت کی کتب؛ عقیدہ اوتار ہندومت کے ان مشہور اصولوں میں شامل ہے جو دین اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہے اس تصور کے مطابق ذات الٰہی زمانی وقفوں کے بعد لباس بشری اختیار کر کے انسانوں کی اصلاح کے لیے روئے زمین پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس عقیدے کو عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت مسیح اور الوہیت مسیح کی طرح ایک طرف رکھ دیا جائے تو آخری اوتار۔۔۔ کلکی اوتار۔۔۔ سے متعلق ان کی بیان کردہ تمام علامات کا مصداق صرف اور صرف پیغمبر اسلام ﷺ ہیں۔ ڈاکٹر وید پرکاش نے اپنی کتاب ''کلکی اوتار اور نبی کریم'' میں اس دعوے کو ٹھوس دلائل سے ثابت کیا ہے۔ سنسکرت زبان اور ویدوں کے ماہرین ڈاکٹر گوندکوی راج، پروفیسر ڈاکٹر گوپال چند، کشور شرما، شری رام بھون مشرا، شری اندر شکلا اور ڈاکٹر رام سہائے مصرا شاستری نے اس تحقیق کی توثیق کی ہے۔ بقول مصنف مندرجہ ذیل حقائق ناقابل انکار ہیں۔

۱: کلکی اوتار کے والد کا نام وشنو بھگت (خدا کا غلام) اور والدہ کا نام ''سومتی'' (امن، سکون وقرار) ہر دو الفاظ کا ترجمہ بالترتیب ''عبداللہ اور آمنہ'' بنتا ہے جو کہ پیغمبر اسلام کے والدین ہیں۔

۲: کلکی اوتار کی بنیادی خوراک کھجور اور زیتون پر مشتمل ہوگی اور وہ انتہائی دیانتدار اور سچے انسان کی حیثیت سے شہرت حاصل کرے گا گویا یہ سیرت النبی کی مبادیات ہیں۔

۳: کلکی اوتار کی پیدائش ایک جزیرے میں ہوگی۔ اس سے مراد جزیرہ نمائے عرب ہے۔

۴: ویدوں اور مقدس کتابوں کے مطابق کلکی اوتار کو خدا اپنے پیغام رساں (فرشتے) کے ذریعے تعلیم دے گا اور یہ عمل ایک گھپا (غار) میں انجام پائے گا۔ اشارہ جبریل امین اور غار حرا کی طرف ہے۔

۵: خدا اس اوتار کو انتہائی برق رفتار گھوڑا سواری کے لیے دے گا جس پر وہ دنیا کا سفر کرے گا۔ اشارہ سفر معراج کی سواری براق کی طرف ہے۔

۶: خدا اپنے اوتار کو غیب سے معجزاتی طور پر امداد پہنچائے گا۔ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف

سے غیبی امداد کی جانب اشارہ ہے۔
۷: یہ اوتار زبردست شہسوار اور ماہر شمشیر زن ہوگا۔غزوات نبوی میں پیغمبر اسلام ﷺ نے جو بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے ایک زمانہ اس کا گواہ ہے۔ پروفیسر محمد اکرم طاہر (محمد رسول ﷺ۔ ۲۷) لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر پنڈت وید پرکاش نے بجا طور پر کہا ہے۔ اب جب کہ گھوڑوں اور تلواروں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ان کی جگہ گولہ بارود اور میزائلوں نے لے لی ہے تو ہندو اپنے گھوڑا اسوار اور شمشیر زن اوتار کا انتظار کیسے کر رہے ہیں اس لیے انھیں پیغمبر اسلام کو اپنا اوتار تسلیم کر لینا چاہیے (حوالہ بالا۔ ص ۴۷) برسبیل تذکرہ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ غیر سامی اور سامی مذہب کا بہ نظر عمیق مطالعہ کیا جائے تو صرف توحید ہی نہیں بلکہ سب سے آخری نبی و ہادی ﷺ کے بارے میں ایسی بشارتیں اور نشانیاں ملیں گی جو صرف اور صرف پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پر ہی صادق آتی ہیں۔ گویا بجلیاں برسے ہوئے بادل میں خوابیدہ ہیں۔ (محمد رسول اللہ۔ ۲۷)

اعتراض نمبر ۳۸

سر ولیم میور کہتا ہے کہ لفظ ''احمد'' انجیل یوحنا کے کسی قدیم عربی ترجمہ میں بجائے لفظ ''تسلی دہندہ'' کے براہ غلطی واقع ہوا ہوگا یا آنحضرت ﷺ کے وقت کسی جاہل یا خود غرض راہب کی جعلسازی سے، بجائے یونانی لفظ پریکلیطوس کر دیا گیا'' (خطبات احمدیہ۔ ۴۳۹)

جواب: سرسید کہتے ہیں کہ سر ولیم میور صاحب نے یہ بات اس لیے بیان کی ہے کہ پہلے یونانی لفظ پریکلیوٹوس کا ترجمہ احمد ''تسلی دہندہ'' ہے اور دوسرے یونانی لفظ پریکلیوٹوس کا ترجمہ ''احمد'' تسلی دہندہ ہے مگر مسلمانوں نے ان یونانی لفظوں کو معرب کر کے فارقلیط بنا لیا ہے۔ اور اس سبب سے کہ مسلمان فارقلیط کا ترجمہ ''احمد'' کرتے ہیں، ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے یونانی لفظ پریکلیوٹوس کو معرب کر کے فارقلیط کیا ہے۔

انجیل یوحنا (باب ۱۷۔۱۶) میں یہ بشارت ہے '' تاہم میں تم سے سچ کہتا ہوں یہ بھلا ہے تمھارے لیے کہ یہاں سے چلا جاؤں گا کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو پریکلیطاس تمھارے پاس نہ آوے گا'' بالفعل جو انجیل کے نسخے موجود ہیں ان میں لفظ پریکلیطاس اسی املا سے لکھا ہوا ہے جس طرح کہ ہم نے لکھا ہے مگر ہم مسلمان یہ یقین نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ یونانی لفظ بولا تھا کیوں کہ ان کی زبان عبرانی تھی جس میں کالڈیہ یعنی خالدیہ کی زبان کے لفظ ملے ہوئے تھے۔ عبرانی و خالدی زبانیں ایک ہیں پس ہم مسلمانوں کا یقین ہے کہ حضرت عیسی نے اس مقام پر۔۔۔۔ فارقلیط کا لفظ فرمایا تھا جیسا کہ بشپ مارش صاحب کی بھی رائے ہے مگر جب انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئیں تب اس جگہ

یونانی لفظ لکھا گیا بایں ہمہ ابتدا میں اس لفظ کا ترجمہ پریکلیطاس نہیں کیا گیا جس کے معنی تسلی دینے والے کے بیان کیے جاتے ہیں بلکہ اس کا ترجمہ پریکلیو طاس کیا گیا جو ٹھیک فارقلیط کے لفظ کا ترجمہ ہے اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں ٹھیک ٹھیک لفظ ''احمد'' ہوا ہے۔ بلا شبہ اس بات کا ثبوت کہ یہ لفظ پریکلیو طاس ترجمہ ہوا تھا اور پریکلیطاس نہیں تھا۔۔۔مزید سرسید لکھتے ہیں ''اول تو مسلمانوں کو انجیل کے کسی ایسے ترجمہ کی عربی کی جو آنحضرت ﷺ کے وقت سے پہلے یا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں موجود ہو مطلق اطلاع نہیں دیتے نہ ہمارے اگلے بزرگوں نے اس کا کچھ ذکر کیا ہے اور نہ ایسے تراجم کا کچھ ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ عرب میں حضرت متی کی اصلی انجیل جو عبرانی زبان میں تھی اور اب معدوم ہے البتہ پائی جاتی تھی اور اس کا ذکر ہمارے ہاں کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے مگر یوحنا کی انجیل کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ باقی رہی بات کہ کسی خود غرض راہب نے جعلسازی کی ہو اس پر ہم یقین نہیں کر سکتے' کیوں کہ اگر کسی خود غرض راہب کے اس لفظ میں جعل کرنے کا ہم یقین کریں گے جیسا کہ سر ولیم میور نے فرمایا ہے تو ہمیں مجبوراً اس بات کا یقین کرنا پڑے گا کہ بعض دین دار راہبوں نے آنحضرت ﷺ کی بشارتیں چھپانے کو بھی انجیل مقدس میں تحریفیں کی ہیں جیسا کہ عموماً مسلمان یقین کرتے ہیں مگر ہم کو ایسی بدگمانیوں پر تحقیق سے باز رہنا چاہیے بلکہ استقلال سے تفتیش کرنی چاہیے کہ اگلے عالموں نے اس پر کیا بحث کی ہے اور فیلالجی یعنی علم مطابقت لسان جو اس زمانہ میں نہایت ترقی پر ہے اس سے کیا ثابت ہوتا ہے (خطبات احمدیہ ص ۳۸۸)

مزید اس کی تحقیق میں ہیگنس گاڈفری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''مسلمان بیان کرتے آئے ہیں اور اب بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰؑ نے محمد رسول اللہ ﷺ کی دی ہے جس طرح اشعیا نے کیخسرو کی پیش گوئی کی تھی اور دونوں پیش گوئیوں میں دونوں کا نام بتادیا گیا تھا''۔۔۔۔مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے آنحضرت ﷺ کا نام لیا تھا وہ اس لفظ سے نہیں لیا جو لفظ اب انجیل میں موجود ہے بلکہ وہ لفظ پریکلیو طاس تھا جس کے معنی بزبان عربی ''احمد'' کے ہیں اور ابتداء انجیل میں بھی یہی لفظ تھا مگر سچ کو چھپانے کے لیے اس کی تحریف کر دی گئی تھی اور عیسائی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی کتب موجودہ میں بہت سی تحریفیں یا اختلافات قرات ہیں اور مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عبارت کے چھپانے کے لیے تمام قلمی نسخے غارت کر دیے گئے۔ قلمی نسخوں کے غارت ہو جانے کا انکار نہیں ہو سکتا اور یہ وہ بات ہے جس کی نسبت جواب باصواب دینا مشکل ہے اور قدیمی نسخوں کی نسبت تو یہ ہے کہ چھٹی صدی کے قبل کا کوئی بھی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کا بیان ہے کہ یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ عیسائی اگر مناسب سمجھتے تو نہایت عمدہ قلمی نسخوں کو محفوظ رکھ سکتے تھے جس طرح کہ انھوں نے بہت سے ولیوں کی لاشوں کو نہایت آسانی سے محفوظ رکھا ہے چنانچہ یوحنا اور مریم اور پطرس اور پولس وغیرہ کی

لاشیں ہر روز اٹلی میں نظر آتی ہیں۔ پس مسلمان ضرور بالضرور عیسائیوں سے کہیں گے کہ اس غلط ترجمہ کو چھپانے کے لیے کل قلمی نسخے غارت کر دیے یا ان میں جھوٹ ملا دیا گیا اور اگر ایسا نہ تھا تو وہ غارت کیوں کر دیے گئے؟ اور عیسائیوں کو ان کا جواب باصواب دینے میں بہت کچھ دقت ہو گی کیوں کہ قلمی نسخوں کے غارت ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ موجود نہیں ہیں"۔

مزید سر سید خطبات احمدیہ صفحہ ۳۹۴ پر رقم طراز ہیں کہ "ہم مسلمانوں کی بحث پریکلیطاس پر جواب یونانی انجیل میں ہے یا لفظ پریکلیوطاس پر جو اصلی نسخوں میں تھا، منحصر نہیں ہے کیوں کہ یہ انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی زبان نہیں تھی پس انھوں نے جو لفظ فرمایا تھا وہ عبرانی یا خالدی زبان کا تھا جو دونوں زبانیں ایک ہیں پس ہم مسلمان کہتے ہیں کہ لفظ فارقلیط تھا۔ یونانی انجیلیوں میں اس کی بجائے جو لفظ ہے فارقلیط کا ترجمہ ہے، ہم مسلمان کہتے ہیں کہ اس کا ترجمہ یونانی میں پریکلیوطاس کیا گیا تھا جو درحقیقت صحیح ترجمہ ہے۔۔۔۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، پریکلیطاس نہیں ہے بلکہ پریکلیوطاس ہے اور اس کا ہمیشہ ترجمہ رہا ہے یا چلا آتا ہے تو مسلمان کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ غلط ہے کیوں کہ فارقلیط کا ترجمہ پریکلیطاس نہیں ہے بلکہ پریکلیوطاس ہے اور اس کا فیصلہ عبرانی و خالدی زبان کی لغت کی تحقیق پر ہر وقت ہو سکتا ہے۔ اصل میں وہ پریکلیوطاس ہے بمعنی "احمد" نہ کہ پریکلیطاس بمعنی "تسلی دہندہ"

مسیح کی پیشین گوئی: لیکن وہ فارقلیط روح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمھیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو کچھ میں نے تمھیں کہی ہیں، تمھیں یاد دلائے گا۔ ایک عالم نے اس موضوع پر بصیرت افروز نکات اٹھائے ہیں۔ ان کے نزدیک

۱: اصل بشارت میں لفظ احمد (ﷺ) موجود تھا جیسا کہ انجیل برناباس میں اب بھی موجود ہے۔

۲: جب انجیل کا ترجمہ عبرانی زبان سے عربی زبان میں ہوا تو یونانیوں نے اپنی عادت کی بنا پر کہ وہ ترجمہ کرتے وقت ناموں کا ترجمہ بھی کر دیا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کے نام مبارک (احمد) کا ترجمہ بھی پریکلیوطاس سے کر دیا۔

۳: جب یونانی نسخہ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا تو پریکلیوطاس کا معرب فارقلیط کر لیا گیا۔

۴: ایک عرصہ تک اردو، فارسی اور عربی نسخوں میں فارقلیط کا لفظ رہا۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ روح القدس سے کیا گیا اور مسیحین روح القدس کے لفظ کو بطور تفسیر خطوط وحدانی میں لکھتے رہے۔ رفتہ رفتہ فارقلیط کا لفظ حذف کر دیا گیا۔ پھر کسی نے فارقلیط کی جگہ "روح القدس" اور کسی نے "روحِ حق" اور کسی نے "مددگار اور تسلی دہندہ" کا لفظ رکھ دیا اور فارقلیط نسخوں سے بالکل حذف کر دیا۔

۵: ان تحریفات و تغیرات کے باوجود پھر بھی مدعا حاصل ہے اس لیے کہ بشارت میں فارقلیط کے جو

اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں (محمد رسول اللہ ص ۷۴ حاشیہ)

گاڈفری ہیگنس کے حوالہ سے سرسید خطبات احمدیہ میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی دلیل کو بابت ترجمہ لفظ پریکلیوطاس کی بجائے پریکلیطاس کے اس طرز تحریر سے بہت مدد ملتی ہے جو سینٹ جیروم نے انجیل کے لیٹن ترجمہ میں اختیار کی ہے یعنی اس ترجمہ میں لیٹن زبان میں پریکلیوطاس لکھا تھا پریکلیوطاس کی جگہ، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس کتاب سے سینٹ جیروم نے لیٹن میں ترجمہ کیا اس میں لفظ پریکلیطاس تھا نہ کہ پریکلیطاس۔

معانی پر اعتراض: لفظ پریکلیطاس کے معنی پر پادریوں میں بہت اختلاف ہے۔ چنانچہ مشہور عالم ’’مائی کیلس‘‘ کہتا ہے کہ ارنسٹائی نے بہت مناسب کہا ہے کہ اس کے معنی حامی کے ہیں نہ کہ تشفی دہندہ کے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں تحقیق خیال کرتا ہوں کہ پریکلیطاس یا تو روح القدس کو کہتے ہیں یا معلم یا مالک کو یعنی بتانے والا خدا کی سچائی اور میں اسی کی رائے سے درباب صحیح نہ ہونے ترجمہ کی مطابقت کرتا ہوں گو میں اس کو ڈاکٹر یعنی عالم متبحر کا لقب نہیں دیتا بلکہ مانیٹر یعنی معلم کا لقب دیتا ہوں اس لیے کہ وہ جو معنی اس نے لفظ مذکور کے لکھے ہیں بہتیروں نے اختیار کیے ہیں البتہ اس کے اثبات کا جو طرز اس نے اختیار کیا ہے وہ عجیب ہے۔۔۔ اس رائے کے بارے گاڈفری ہیگنز کہتا ہے کہ ’’اگر تسلیم کیا جائے کہ یہ لفظ وہی ہے جو اس زمانہ کے عیسائی کہتے ہیں اور اصل کے معنی بھی روح القدس ہی کے ہوں تو مسلمان عیسائیوں کو کہیں گے کہ تم کہتے ہو کہ انجیل میں بشارت ہے کہ روح القدس آئے گی یہ درست ہے کہ روح القدس آئی مگر محمد رسول اللہ میں آئی جن کو روح القدس سے الہام ہوتا تھا، پس تمھاری پیچیدہ عبارت کے یہی صحیح معنی ہیں اور یہی معنی درستی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔‘‘

لفظ کی املاء سے غلطی ہوتی ہے: ’’پریکلیوطاس‘‘ بمعنی عربی زبان ’’احمد‘‘ اور پریکلیطاس بمعنی تسلی دہندہ۔ اول الذکر لفظ کے دس حروف ہیں اور موخر الذکر کے نو ہیں۔ گویا پہلے لفظ میں ’’وٗ‘‘ زیادہ ہے جو دوسرے لفظ میں نہیں ہے صرف ’’وٗ‘‘ کے اضافہ سے جہاں املاء بدل گئی اسی طرح معنی بھی بدل گئے۔ مثلاً اسم بمعنی نام ’’اثم‘‘ بمعنی گناہ ہے وغیرہ۔ گویا حروف تہجی کی کمی بیشی یا حروف کی شکل بدلنے سے املاء اور معنی بدل جاتے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت یہ مرحلہ نہایت چھان پھٹک کر کے طے کرنا ہوتا ہے۔ اگر بے احتیاطی برتی جائے تو بُعد پیدا ہوتا ہے جو خطرناک ثابت ہوتا ہے جیسے

ہم دُعا لکھتے رہے اور وہ دَغا پڑھتے رہے
ایک نکتے نے ہمیں محرم سے مجرم کر دیا

بدھ کی پیشین گوئی:

بھکشو: گوتم بدھ سے بوقت مرگ ایک بھکشو نے پوچھا؛ تمھارے بعد دنیا میں کون تعلیم دے گا؟

گوتم بدھ: میں پہلا بدھ نہیں جو زمین پر آیا ہوں ۔۔۔۔ میری طرح ایک مکمل نظریہ حیات کا پرچار کرنے والا آئے گا۔

بھکشو: اس کو کس طرح پہچانیں گے؟

گوتم بدھ: ''مترییا'' کے نام سے موسوم ہوگا۔

مترییا سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی دوستی، خیر خواہی، رحم والا، محبت والا، ہمدردی والا مخلوق کی خیر خواہی کرنے والا۔ یہ تمام اوصاف آپ ﷺ ہی کے ہیں۔ رحمت والے لقب کی گواہی قرآن مجید نے دی ''وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ'' ۔ دوسری بات کہ مکمل نظریہ حیات کا پرچار کرے گا۔ دین اسلام آپ پر مکمل ہوا۔ آپ کے بعد نہ کوئی نبی اور نہ کوئی دین۔۔ ارشاد ربانی ہے ''الیوم اکملت لکم۔۔۔۔۔

ترجمہ؛ آج ہم نے آپ کے لیے دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت آپ پر تمام کر دی اور آپ کے لیے دین اسلام کو پسند کیا''

آپ ﷺ کے وجود باجود پر نبوت کا خاتمہ کر دیا ارشاد ربانی ہے ''وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ'' (الاحزاب ۵)

اتھر وید کی گواہی: ''اے لوگو! بڑے زور وشور سے سنو! مہامت لوگوں میں ظاہر ہوگا۔ ہم ہجرت کرنے والوں کو ساٹھ ہزار نوے دشمنوں سے پناہ دیں گے۔ اس نے مامح رشی کو سینکڑوں سونے کے سکے، دس حلقے، تین سو عربی گھوڑے اور دس ہزار گائیں دیں'' (نقوش رسول نمبر ا اص ۲۷۲)

تشریح: نبی کریم ﷺ ہجرت فرمائیں گے۔ دس حلقے سے مراد عشرہ مبشرہ اصحاب ۔ دس ہزار گائیں سے مراد دس ہزار صحابہ جو فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے۔ تین سو گھوڑے سے مراد اصحاب بدر ہیں۔ مہامت اور مامح رشی سے مراد نبی محتشم ہیں۔

''Dictionary of phrase and fable,, کے صفحہ ۵۴ میں مہامٹ کی یوں وضاحت ملتی ہے۔

"Mahmat or Muhammad according to deutch means the predicted Mossiah"

اہم نکتہ: سرسید فرماتے ہیں ''اکثر عیسائی خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس بشارت کو انجیل برنباس سے اخذ کیا ہے اور جارج سیل صاحب نے بھی ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں یہی خیال کیا ہے بلکہ انھوں نے لکھا

ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی "یاتی من بعدی اسمہ احمد" اسی انجیل سے اخذ کی گئی ہے۔ اور شاید آخیر زمانہ کے ایک آدھ کچے مسلمان اور جاہل مولوی نے کہیں سن سنا کے کہ بربناس کی انجیل میں بھی یہ مطلب آیا ہے شاید اس کا حوالہ دے دیا ہو مگر قدیم عالموں اور بڑے بڑے محققوں نے اس بشارت کی بابت برنباس کی انجیل خواہ وہ صحیح ہو یا غلط نام تک نہیں لیا، جارج سیل صاحب کی غلطی ہے جو وہ ایسا کہتے ہیں" (خطبات احمدیہ ۳۹۵)

اعتراض نمبر ۳۹

مستشرقین نے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے نام نامی پر اعتراض کیا کہ یہ ان کا نام نہیں تھا (نعوذ باللہ) بل کہ ماہومت (Mahomet) تھا۔ بعض نے "Baphomet" اور بافم "bafum" کہا۔ بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں اور خباثتوں کے ساتھ ماہونڈ "Mahound" یعنی بقول مستشرقین "شہزادہ تاریکی" (نعوذ باللہ) کا نام تجویز کیا (نقوش رسول نمبر ۱۱ ص ۵۳۲)

جواب: یہ نام کیا تھے؟ ماہومٹ ایک بت تھا جس کی پرستش ہوتی تھی۔ آرڈ ریکس نے ایک مناجات لکھی جس میں فلسطینی خواتین دعا کناں ہیں "Praise be Mohomet our God"

sound the glad timberls and offer him vietims that our terrible enemies may be over come and perished

ترجمہ: سر بلندی ہو ہمارے خداوند ماہومٹ کی، خوشی کی جھانجریں بجاؤ اور اس کو قربانی دو تا کہ ہمارے خوفناک دشمن مغلوب اور تباہ ہو جائیں (مستشرقین مغرب کا انداز فکر ۱۸۸)

مہامت: اتھروید کی پیش گوئی جو پہلے گذر چکی ہے، میں بیان ہوا ہے۔ یہ آنحضرت کا نام ہے اور "Dictionary of phrase and fable" کے صفحہ ۵۴ پر مہامت کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں۔ " Mahamat or Muhammad according to deutch, means the predicted Messiah........."

ماہونڈ: "Mahound" حقارت کا نام مہامت کا، ایک مسلم اور ایک شمالی افریقہ کے عرب کا جیسا "Dictionary of phrase and fable" میں ہے۔

1; Name of contempt for Mahamet, A Muslim, a moor

2; In scotland it is used to mean devil.

سکاٹ لینڈ میں اس کے معنی شیطان کے ہیں جو استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس حقارت کے نام کو بعض نے تاریکی کا شہزادہ کے معنی پہنائے ہیں۔

بافم: " Baf or bafum an imagionary idol symbol, which the templars were said to employ in their mystreious rites(Dictionary of phrase and fable)

2: The word is a corruption of Mahomet

ایک تصوراتی بت یا علامت جس کے لیے عیسائی دینی فوج داروں کے لیے کہا گیا تھا کہ اپنے پر اسرار رسومات میں استعمال کریں'' ماہومٹ کے لیے بدعنوانی کا لفظ (نعوذ باللہ)۔ جرمنی کے مستشرقین فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے وصال کے بعد اس کتاب (قرآن) میں تحریف وتغیر ہو گیا جن امور میں تصحیف ہوئی، ایک ان میں نبی کا نام بھی ہے جو اصل میں یا قثام تھا جو آخر میں محمد ﷺ بن گیا جس کا ثبوت ''ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد'' جو محمد کی بجائے اس کا نام ہے جس کا نشان انجیل نے اس مفہوم میں دیا ہے کہ وہ نبی عیسیٰؑ کے بعد آئے گا (حیات محمد ۳۶) یہ اضافہ آپ کی وفات کے بعد کیا گیا تا کہ آپ ﷺ کی رسالت پر سابقہ کتب مقدسہ (تورات وانجیل) سے دلیل لائی جا سکے۔ بیہقی جواباً لکھتے ہیں'' کاش! تحقیق کے دعوے دار مستشرقین قرآن پر الزام لگانے سے پہلے یہ غور کر لیتے کہ آپ کی تصدیق رسالت پر ان کے وہ موجود مقدس صحیفے تورات وانجیل بھی گواہی دیتے ہیں۔ صحائف کو یہ حضرات بھی غیر محرف مانتے ہیں۔ اگر وہ انصاف سے عاری نہ ہوتے تو قرآن کو بھی تورات وانجیل کی طرح تحریف سے پاک سمجھتے ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر قرآن اضافات والحاقات سے ملوث ہے تو تورات وانجیل کا دامن بھی تبدیلیوں سے پاک نہیں۔ اس لیے مستشرقین کا موجودہ تورات وانجیل کو اس بارے میں قرآن کا مبنیٰ قرار دینا یقیناً جھوٹ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام نے قرآن میں اس آیت کا اضافہ کیا'' یاتی من بعدی اسمہ احمد'' (حوالہ بالا ۳۸) لہٰذا جب تحریف ثابت نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ آپ کا نام محمد ﷺ بعد میں '' یاقثام '' سے محمد ﷺ بن گیا۔ ان کا دعویٰ غلط ہے۔ وہ اس طرح بھی کہ صحابہ کرام نے عیسائیوں کے ساتھ دوسرے ملکوں کو بھی اپنا مطیع وفرماں بردار بنانے میں وقت کی طنابیں اپنے ہاتھ میں کھینچ لیں۔ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عیسائی ملکوں پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار علمی طور پر مستشرقین کے اس الزام کا بہترین رد ہے (حوالہ بالا ۳۸)

یاد رہے کہ ایسے فرضی ناموں کا مروج ہونا حروب صلیبیہ کے بعد کا ہے۔ مغرب کے شعراء، افسانہ اور ڈرامہ نویسوں نے برضا ورغبت اور خوشی خوشی مقبول نام کے طور پر اپنایا ہے۔ مایوئن، ماہونڈیا، ماہوند کے الفاظ میں افراط وتفریط کے ذریعے کئی شکلیں دے کر اور کئی نام وضع کر لیے مثلاً " Mahon, Mahmoon, Mahown, Mahovne, Maeon, Mahmet, Mavomet"

وغیرہ اور کئی الفاظ ماہومٹ سے مشتق ہیں جیسے " Mowmery; Mammetry"
ماہومٹ سے مشتق ناموں کی تعداد ۱۸ سے زائد ہے۔(دی آکسفورڈ ڈکشنری)۔ ماہوئنڈ سے مشتق کی تعداد ۱۷ ہے (حوالہ بالا)۔ چھ الفاظ اور بھی پائے جاتے ہیں یہ سارے کل ملا کر اکتالیس (۴۱) بنتے ہیں۔ ایسے گھڑے گئے ناموں سے مسلمانوں، اسلام اور پیغمبر ﷺ کی شان گھٹانا مقصود تھا ورنہ ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص ان ناموں کی افراط وتفریط سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کے متعلق نام گھڑے اور وضع کیے گئے ہیں۔ وہ ذات جو انسانیت کے لیے خیر خواہ، ہمدرد اور مونس اعظم ہے، ان سے یہ محض منافرت ہے اور ان کے یہ نام ہو سکتے ہیں؟

قرون وسطیٰ میں یورپ کا تاریک عہد آتا ہے اس وقت جہالت و بربریت نے وہاں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اس دور میں آپ ﷺ کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا، آپ ﷺ کے نام کو مہامٹ Mahamet اور پھر اس کو بگاڑ کر Mamet کیا۔ یورپ میں آپ ﷺ کے لیے یہ نام استعمال ہوتا تھا۔ فرانس کی قومی نظم رولینڈ اس کی مثال ہے اس لفظ کا رواج عام تھا اس کا اسم صفت محامیٹری یا مامیٹری یعنی بت پرستی استعمال ہونے لگا۔ بت کے علاوہ وہ مامیٹ Mammet گڑیوں کے لیے بھی مستعمل تھا۔ شیکسپیر میں وھننگ مممٹیز "Whming Mammats " کا محاورہ استعمال ہوا ہے یہ لفظ احمق اور گالی کے لیے بولا جاتا تھا اور انگریزی لفظ ٹرمیگنٹ "Termagant "، فرانسیسی نظم رولینڈ میں یہ ایک ایسے بت کے لیے استعمال ہوا ہے جس کی مسلمان پرستش کرتے تھے۔ شیکسپیر کے الفاظ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی کیا اہمیت اور استعمال کیسا تھا؟۔ وہ لکھتا ہے۔

" I could have fellaivhipt for over doing, it out hered , hered"

''مسٹر سار'' کہتا ہے کہ '' قرون وسطیٰ میں جب کہ تمام یورپ میں جہل کی موجیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ عربستان کے ایک شہر سے نیر تاباں کا ظہور ہوا جس نے اپنی ضیاباریوں سے علم و ہنر اور ہدایت کے چمکتے نوری دریا بہا دیے۔ اسی کا فیض اور طفیل ہے کہ یورپ کو عربوں کے توسط سے یونانیوں کے علوم اور فلسفے نصیب ہوئے''۔

(ف) قرون وسطیٰ میں جہالت یورپ میں ڈیرے ڈالے ہوئی تھی تو پھر وہاں ایسے نازیبا نام کے گھڑے جانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ۲: آپ کے طفیل علم کی روشنی ملی اور یونانی علوم سے یورپ کو آگاہی حاصل ہوئی تو ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ جس کے کرم سے ظلمت وتاریکی کے دبیز سائے چھٹ جائیں، انسانیت سے قتل وغارت، ظلم وزیادتی، دھوکہ اور فریب، حسد وبغض اور دشمنی وعداوت

کے ہولناک اور مہیب سائے ہٹ جائیں اور سب میں برابری و مساوات قائم کرے، امیر وغریب کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرے اور وہ جو سسکتی، گرتی پڑتی، بھوکی مرتی اور محروم انسانیت کو سہارا دے، سب کو جینے کا حق عطا کرے وہ جو کمزوروں، لاچاروں، بیواؤں، یتیموں، بے کسوں اور بے بسوں کو زندگی گزارنے کا حق بخشے اور زبوں حال انسانیت کو تسلی و تشفی کا سامان مہیا کرے اور وہ جس کے فیض سے نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی راہ پائیں اور زمانہ کے امام اور رہنما بن جائیں تو اسے ان مکروہ ناموں سے پکارنا درست ہوسکتا ہے؟ یہ آج کی بات نہیں مدتوں پہلے ان کے آباؤ اجداد یعنی کفار نے یہی راگ الاپا تھا یعنی کفار ایسے الفاظ بگاڑ کر پکارتے تھے جن میں سے بے ادبی ہوتی تھی توہین کا پہلو نکلتا تھا تو باری تعالیٰ نے اس لفظ سے پکارنے کی ممانعت فرمادی۔ قرآن مجید میں ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ" (البقرہ ۱۰۴، پارہ ۱)

ترجمہ: اے لوگو! راعنا نہ کہو اور یوں کہو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی بغور سنیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

حضرت سعد بن معاذؓ نے دشمنان اسلام کی زبان سے یہ کلمہ سنا تو انھوں نے فرمایا اے دشمنان خدا تم پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں نے اب کسی کی زبان سے یہ کلمہ سنا تو اس کی گردن اڑا دوں گا (کنز الایمان سورہ بقرہ ص ۲۹۔۱۰۴)

بابو جگل کشور کھنہ۔۔۔صرف ملک عرب پر ہی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احسانات نہیں بلکہ آپ کا فیض تعلیم وہدایت دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا۔ غلامی کے خلاف سب سے پہلی آواز آپ نے بلند کی۔ سود قطعاً حرام کر کے سرمایہ داری کی جڑ پر کلہاڑا مار کر کاٹ دیا۔۔۔آپ نے غلاموں کے بارے ایسے احکام جاری کیے کہ ان کے حقوق بھائیوں کے برابر کر دیے۔ آپ نے عورتوں اور استریوں کے درجہ کو بلند کیا۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پرزور طریقہ سے توہمات کے خلاف جہاد کیا اور نہ صرف اپنے پیروکاروں کے اندر اس کی بیخ کنی کی بلکہ دنیا کو ایک ایسی روشنی عطا کی کہ توہمات کے بھیانک چہرے اور اس کی ہیئت کے خدوخال سب کو نظر آنے لگے" (نقوش رسول نمبر جلد ۴ ص ۴۵۰)

تعصب کی انتہا: مخالفین کو جب کوئی شے نہ سوجھے اور تعصب کی کالی عینک آنکھوں پر لگی ہو۔ تحقیق کسی اور شے پر نہ ہوسکے تو تعصب کے تیروں کی بوچھاڑ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کر دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں عہد نامہ قدیم کی کتاب دانیال بڑی کام آئی۔ داعی اسلام سے تعصب ونفرت کا یہ عالم کہ دانیال نے خواب میں چار درندے دیکھے ان میں چوتھا درندہ ہولناک اور زبردست تھا اس کے دس سینگ تھے۔ پھر ایک چھوٹا سینگ نکلا جس نے تین سینگ اکھاڑ پھینکے۔۔۔ چھوٹے سینگ کے بارے تحریر ہوا کہ وہ دس بادشاہوں

کے بعد گیارھواں بادشاہ ہوگا جو تین بادشاہوں کو زیر کرے گا۔حق تعالیٰ کے مقدسوں کو تنگ کرے گا اور شریعت کو بدلنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ایک دور، دو دور اور آدھا دور اس کے حوالے کیے جائیں گے۔تب عدالت قائم ہوگی اور سلطنت اس سے لے لی جائے گی ،اس خواب کی تعبیر مغرب کو اسلام کی شکل میں نظر آئی۔چوتھے درندے کے اعداد(۶۶۶) بنتے تھے جو اسم گرامی کا حسب ذیل املاء کر کے پورے کیے گئے۔

MAOMETHS; M=40, A=1, O=70, M=40, E=5, T=300, H=10, S=200= 40+1+70+40+5+300+10+200................666

سینٹ جان کی نظر میں رومی شہنشاہ اللہ سے درندہ بلکہ دانیال کے خواب کا درندہ (The Beast) بن گیا تھا۔اس نے لکھا ’’جو سمجھ رکھتا ہے وہ اس درندے کے عدد گن لے وہ آدمی کا عدد ہے اور اس کا عدد(۶۶۶) ہے۔(مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔۲۰۱۔۲۰۰) علمائے مسیحی اس امر پر متفق ہیں کہ اس درندے سے مراد قیصر روم ہے۔مگر یہ کہ گھوم گھما کر بات اسلام دشمنی پر آ کے ختم ہوتی ہے۔

دشمنی ورثے میں ملی: مستشرقین اپنے اسلاف کی راہ پر گامزن ہیں۔اسی مذہب پر عمل پیرا ہیں جو ان کے باپ دادا کا تھا۔اس سے یعنی مذہب سے کنارہ کشی اتنی محال کہ روح کا نکلنا تو آسان ہے لیکن مذہب کا چھوٹنا از بس مشکل ہے۔اس راہ کو چھوڑنا کٹھن اور دشوار کام ہے۔ ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

پرائے تو پرائے سہی مگر اپنوں نے تو حد کر دی یعنی چھوٹے میاں تو چھوٹے ہوں بڑے میاں سبحان اللہ! بہت کم آیات ہیں جن میں نبی مکرم ﷺ کے معاصرین میں سے کسی کا نام آیا ہو جن میں آیا ہے ان میں سے ایک آیت یہ نازل ہوئی جس میں صراحت ہے کہ ابولہب اور اس کی بیوی کا مقدر دوزخ ہے۔ان آیات کو ام جمیل (ابولہب کی بیوی) نے سنا تو وہ پتھر کا ایک موسل لیے نبی اکرم ﷺ کی تلاش میں مسجد حرام پہنچی۔آپ ﷺ وہاں ابوبکرؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، وہ ابوبکرؓ کے پاس آ کھڑی ہوئی اور ان سے بولی ’’کہاں ہے تمہارا ساتھی؟ وہ جانتے تھے کہ اس کی مراد حضور ﷺ سے ہے۔مگر وہ یعنی ابوبکرؓ ہکا بکا ہو گئے تھے کہ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔وہ بولی ’’میں نے سنا ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے اور با خدا، اگر وہ مجھے مل گیا ہوتا تو میں اس موسل سے اس کے منہ کا بھرکس بنا دیتی، پھر بولی ’’میں بھی شاعرہ ہوں‘‘۔اور اس نے ایک نظم آنحضرت ﷺ کے بارے میں سنا دی۔(ترجمہ) ہم مذمم کے نا فرمان ہیں، جو احکام وہ دیتا ہے اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اور اسی کے دین سے نفرت کرتے ہیں ۔جب وہ جا چکی تو ابوبکرؓ نے نبی مکرم ﷺ سے دریافت کیا ’’اس نے آپ ﷺ کو نہیں دیکھا۔آپ ﷺ

نے فرمایا ”اس نے مجھ کو نہیں دیکھا، خدا نے اس کی آنکھوں کی روشنی (عارضی طور پر) لے لی کہ وہ مجھے دیکھ سکے“۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی انھیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کے لیڈر یعنی کفار کو خیال آیا کہ ہم کہتے تو محمد ﷺ ہیں اور کرتے ان کی برائی ہیں۔ اس خیال کی انگیخت سے ان بے ہدایت اور بد بخت لوگوں نے آپ کا نام مذمم رکھا اور اس نام سے پکارنے لگے۔ اہل ایمان کے لیے یہ نہایت دکھ کی بات تھی انھیں بات شاق گزری تو جان کائنات نبی معظم ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کی۔ آپ نے تبسم فرمایا اور کہا کہ جس کو وہ مذمم کہتے ہیں اور جس کی وہ برائی کرتے ہیں وہ کوئی اور ہوگا۔ مجھے تو میرے رب نے محمد ﷺ بنایا ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا: کیا آپ لوگ حیرت نہیں کرتے اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ قریش سے گالی کو اور لعنت کو کیسے پھیر دیتے ہیں (میرے مخالف) مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور مذمم کو لعنت کرتے ہیں اور جب کہ میں وہ نہیں ہوں بلکہ میں تو محمد ہوں“ (اردو ترجمہ دلائل نبوت۔ جلد اول ص ۱۹۳) سبحان اللہ سبحان اللہ۔ گفتار کے ہر بول میں حکمت کا جہاں آباد ہے۔

خدا کے بعد بزرگی اسی کو شایاں ہے
احد کو چھوڑ کے احمد سے بڑھ کے نام نہیں
(شمیم یزدانی)

ف: مجھے تو میرے رب نے محمد ﷺ بنایا ہے اب کوئی لاکھ برا چاہے، کچھ بنانا چاہے بنا نہ سکے گا کیوں کہ۔۔۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اور آپ کو محمد ﷺ بنانے والی ذات ان اللہ علی کل شی قدیر ہے۔

۲؛ صحابہ کرام کو تسلی دی اور ان کے دلوں میں عقیدہ توحید کو اور بھی راسخ کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ تعلیم بھی دی کہ ایسے الزامات سے حقیقت نہیں بدلتی بلکہ حقیقت کے سامنے الزامات اور باطل اعتراضات دم توڑ دیتے ہیں۔

۳؛ صحابہ کرام کی ڈھارس بندھائی جس قدر بھی امتحان ہو گھبرانا نہیں چاہیے۔ ہمت وجرات سے کام لینا چاہیے کیوں کہ سلطنت دس مرتبہ ہاری جائے تو گیارھویں مرتبہ واپس آسکتی ہے، مگر ہمت ایک بار ہی ہار دی جائے تو اکثر واپس نہیں آتی۔ اس تسلی وتشفی اور ڈھارس بندھانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ شدائد وتکالیف میں صحابہ کرام پختہ عزم رہے اور جان کی پروا کیے بغیر ہمیشہ سینہ سپر رہے۔

ماہوما؛ Mahoma کونتری نے ماہوما کا لفظ استعمال کیا ہے اس لفظ کا استعمال ہسپانوی

مصنفین میں عام ہے مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں پر اس کا خاص اثر واقع ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ''محمد'' ہی کی تحریف شدہ شکل ہے۔ یہی مصنف ایک اور اصطلاح ریجا تیر (REGATEAR) بتاتا ہے اس کے معنی بھاؤ کم کرنے کے ہیں جسے عام طور پر تجارتی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، مصنف نے یہ اصطلاح ان مواقع کے لیے استعمال کی ہے جب محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور آہ وزاری کرتے تھے اور اس کی دعا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر عبادت اور واجبات کے بار کو کم کر دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مستشرقین میں ایسی موروثی عصبیت کی روح اب تک باقی ہے۔ (علوم اسلامیہ اور مستشرقین ۳۱۲۔۳۱۱)

المختصر ڈاکٹر جواد علی کے الفاظ میں کہ مستشرقین نے سیرت پر اپنے مطالعات میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور اس کے واقعات اور حقایق میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی بے پناہ کوشش کی ہے اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ شائد رسول اللہ کی ذات گرامی تک میں شک کر بیٹھتے کیوں کہ آپ کے اسم گرامی میں تو خیر انھوں نے شک کرنے کی کوشش کی ہے۔ (حوالہ بالا)

اسم محمد سے مطابقت: اسم محمد ﷺ سے ضرب اور ربط کے ساتھ مرسلون کے عدد تین سو تیرہ نکلتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

محمد: م ح م م د یعنی محمد میں تین میم آتے ہیں۔ درمیانی میم مشدد ہے جو دو مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔ اب ان حروف کو مرکب لفظوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً ''م'' کو میم اور ''د'' کو دال۔ تو اب صورت یوں ہوگی۔

میم ح میم میم دال

م ی م ح م ی م م ی م دال

اعداد: ۴۰+۱۰+۴۰+۸+۴۰+۱۰+۴۰+۴۰+۱۰+۴۰+۴+۱+۳۰=۳۱۳

اصحاب بدر کی تعداد ۳۱۳ تھی اور مرسلین کی تعداد بھی ۳۱۳ ہے۔

اب اگر ۳۱۳ کا مجموعہ یعنی ہر عدد کو ایک عدد مان کر جمع کریں یعنی ۳+۱+۳، تو ۷ بنتے ہیں۔

قرآن کریم کی سورہ فاتحہ کی آیات سات، کائنات کے بالائی حصے میں آسمان سات، آسمان کے طبقات سات، جنتیں سات، زیر فلک زمینیں سات، سمندر، براعظم سات، ہفتے کے ایام سات، عجائبات کائنات سات، جہنم کے دروازے سات (کائنات در کائنات ص ۳۹۔۴۶)

قرآن کریم کی عربی زبان کے حروف تہجی میں ۱۴ حروف منقوط اور ۱۴ غیر منقوط بھی سات کی تکرار ہیں۔ حروف مرکبات سے کچھ سورتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ حروف مرکبات کی حامل سورتوں میں فاتحہ اور ۳۰ ویں پارے، الماعون کی آیات سات سات اور سورہ الحاقہ وانشقاق کی آیات کا حاصل کردہ عدد بھی سات ہے۔ حروف مقطعات والی چھ سورتیں جو 'الم' سے شروع ہوتی ہیں ان میں دو سورتوں کے حروف

مقطعات کا عدد سات ہے۔اسی طرح ''الم'' سے شروع ہونے والی جملہ آیات کا حاصل عدد سات ''حم'' سے شروع ہونے والی سورتوں کی تعداد سات اور ان کی مجموعی آیات کا مجموعی عدد بھی سات ہے۔سورہ رعد، ابراھیم، قصص، لقمان، ص اور ن میں سے ہر دو آیات کا حاصل عدد سات اور ان کی مجموعی آیات کا حاصل عدد بھی سات ہے، جب کہ سورہ یونس اور اعراف کی مجموعی آیات کا عدد ۱۴ ہے جو سات کا حسن تکرار ہے۔قرآن کی تلاوت کے سجدے سات، قرآن کی منازل سات اور قرآن مجید نے وہ ستارے جو سورج اور زمین کے نظام شمسی میں پائے جاتے ہیں اس کے لیے قرآن نے ''کل فی فلک'' کا سات حرفی جملہ استعمال کیا ہے اور اس جملہ کو الٹی ترتیب سے لکھیں تو پھر بھی کل فی فلک، رہتا ہے۔عرف عام میں محمد ﷺ کے اعداد ۹۲ بنتے ہیں۔۹+ ۲ =۱۱، گیارہ ستارے یوسف کو سجدہ کرتے ہیں۔عجب نہیں کہ ان گیارہ سیاروں کا انسان کے ہاتھوں مسخر ہونا طے کر دیا ہو۔کیا خبر کہ اس ''احسن القصص'' میں یہ رمز و کنایہ ہو کہ یہ سیارے حضرت یوسفؑ کی اولاد میں پیدا ہونے والے لوگوں کی کوشش و سعی سے انسان کے لیے مسخر ہوں گے۔(کائنات در کائنات ص ۵۰)

بابا گرونانک ایک رباعی میں فرماتے ہیں کہ محمد ﷺ کا جلوہ ہر شے میں نظر آتا ہے۔رباعی یہ ہے
ہر عدد کو چوگن کر لو دو کو اس میں دو بڑھائے۔۔۔پورے جوڑ کو پنج گن کر لو بیس سے اس میں بھاگ لگائے باقی بچے کو نو گن کر لو دو کو اس میں دو بڑھائے۔۔۔گرونانک یوں کہے ہر شے میں محمدؐ کو پائے ۔

ظفر: محمد ﷺ=م ح م د ظ+ف+ر ۴۰+۸+۴۰+۴=۹۲

۹۰۰+۸۰ +۲۰۰=۱۱۸۰ = ۹۲

x۴ x۴ ۴۷۲۰ = ۳۶۸+ ۲ +۲

۴۷۲۲ = ۳۷۰ x ۵×۵

۲۳۶۱۰ ۱۶۵۰

÷ ۲۰ ÷ ۲۰ =۱۱۸ باقی ۱۰= ۸۲ باقی ۱۰

x۱۱۸=۱۱۸۰ x۹=۹۰

x ۹= ۹۰

+۰=۱۱۸۰+۲+۲= ۹۲=۹۲

مذکورہ دو مثالوں کے چوتھے مقام پر (۱۰) ہی باقی بچتا ہے۔

۲۔اب (۱۰) کو جس شے کے کل اعداد کے بائیں جانب والے ایک یا دو یا تین وغیرہ ہندسوں سے ضرب دیں اور دائیں جانب والے ہندسہ کو جمع کریں تو اس سے اس شے کے کل اعداد برآمد ہوں

گے جس طرح اوپر کی مثالوں سے ہر ایک کے نام کے کل اعداد ہی برآمد ہوتے ہیں۔(۳) اگر تمام نام کے اعداد ۹۲ ہی برآمد ہوتے تو درست ہوتا مگر یہاں صورت مختلف ہے لہذا رباعی میں کسی طرح سے غلطی پائی جاتی ہے نہ جانے وہ غلطی کیسے درآئی۔اب ہمارے خیال میں رباعی کا تیسرا مصرعہ یوں ہو" باقی بچے سے اک گھٹاؤ دو اس میں دو بڑھائے تو نتیجہ درست برآمد ہوتا ہے مثلاً زید کے کل عدد ۲۱ ہیں اب ۱۰ میں سے ایک کم کریں باقی ۹ جبکہ ۲ آنا چاہیے، ۹ کے ساتھ ایک بڑھائیں تو ۹۱ جبکہ ۲۱ آتا ہے اس صورت میں صرف اور صرف آپ ﷺ کی ذات مبارک کا جلوہ ہر شے میں نظر آتا ہے۔

اعتراض نمبر ۴۰

مارگولیس کہتا ہے کہ" محمد ﷺ کا نام ابرہہ کے فیل محمود کی مناسبت سے رکھا گیا"(نقوش رسول نمبر جلد ۱۱ ص ۴۸۹)

اعتراض کا رد کرنے سے پہلے آنحضرت کا نام محمد ﷺ رکھنے کے پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ آنحضرت کی ولادت باسعادت کے بعد عرب کے دستور کے مطابق ساتویں دن آپ کے دادا حضرت عبد المطلب نے عقیقہ کی رسم میں قریش کو مدعو کیا۔اپنے پوتے کا نام" محمد" ﷺ رکھا۔قریش نے پوچھا یہ نام کیوں رکھا ہے؟ اس پر آپ کے دادا جان نے کہا: میں نے یہ نام اس لیے رکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں اور اللہ پاک کی مخلوق زمین میں اس نومولود کی تعریف کے گن گائے۔

آپ ﷺ سے قبل محمد نام کے کئی افراد تھے جن کا نام محمد اس امید پر رکھا گیا تھا کہ لوگوں نے سن رکھا تھا کہ اس نام کا ایک نبی عنقریب آنے والا ہے۔اس سعادت کے حصول کے لیے اپنے بچوں کے نام رکھے کہ شاید وہ آخری پیغمبر ہوں۔قاضی عیاضؒ نے کیا خوب کہا کہ" اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی کہ ہر شخص جس کا نام محمد ہے وہ نبوت کا دعویٰ کرے یا اس کو کوئی اس کے ساتھ پکارے یا اس پر کوئی سبب ظاہر ہو جائے جس سے کوئی آپ کے بارے میں شک کر سکے یہاں تک کہ دونوں نام (محمد ﷺ، احمد ﷺ) آپ کے لیے خوب متحقق ثابت ہو گئے اور کوئی ان دونوں ناموں میں نزاع نہ کر سکا (الشفاء۔ج ا ص ۲۰۶)

قاضی عیاض نے مزید کہا کہ سرکار دو عالم وجود میں آئے اور محمد ہونے سے قبل احمد تھے۔آپ ﷺ کا نام نامی کتب سابقہ میں مذکور تھا۔چنانچہ مسیحؑ نے اسی نام سے آپ کو یاد کیا ہے۔(خاتم النبیین ص۔۱۲۱)

یہ بات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ کئی سیرت نگاروں نے تین، پانچ اور پندرہ افراد کے نام تحریر کیے ہیں جن کا نام محمد رکھا گیا۔امام سہیلی نے تین افراد کے نام لکھے ہیں۔

۱: محمد بن سفیان بن مجاشع (فرزوق شاعر کا دادا) ۲: محمد بن احیحہ بن الجلاح الاوسی بن الجلاح ۳: محمد بن حمران بن الجعفی۔۔۔۔قاضی عیاض نے سات نام تحریر کیے ہیں تین مذکورہ نام ہیں باقی کے یہ ہیں

ا: محمد بن مسلمہ انصاری ۲: محمد بن براء البکری ۳: محمد بن خزاعی اسلمی اور ساتواں نام کوئی بتائے، کہا گیا ہے کہ جس کا نام محمد رکھا گیا وہ محمد بن سفیان ہے اور اہل یمن کہتے ہیں کہ محمد بن یحمد قبیلہ ازد) کا ہے۔

اب مارگولیس سے پوچھتے ہیں کہ عرب میں آپ کے نام گرامی سے قبل چند افراد کا نام محمد رکھا گیا، انھوں نے کس نسبت سے یہ نام رکھا؟ اگر عرب میں آپ ہی کا نام رکھا گیا ہوتا اور اس سے قبل اس نام کا کوئی فرد نہ ہوتا تو تسلیم کیا جاتا کہ فیل کی نسبت سے رکھا گیا ہے لیکن یہاں صورت مختلف ہے۔ تو کیوں کر صرف آنحضرت ﷺ کے نام کو فیل کی نسبت سے رکھنے کا مستشرق الزام دھرتا ہے؟ اس نام کے دوسرے افراد کے بارے میں ایسی بات کیوں نہیں کی اور ان کے نام رکھنے کو کسی جانور کے نام سے نسبت دینے کو کیوں نازک طبع نے گوارا نہ کیا؟ کیا ان سے کوئی خاصی محبت تھی یا ڈر تھا؟

دوم: تاریخ بتاتی ہے کہ جب یمن کے گورنر ابرہہ نے خانہ کعبہ کو گرانے کی غرض سے مکہ پر لشکر کشی کی اس کے ساتھ ہاتھیوں کی ایک عظیم الخلقت نوع تھی جو اب ناپید ہو چکی ہے۔ انگریزی میں اس نسل کا نام "MAMATT" تھا۔ عربوں نے معرب کر کے اسے محمود بنا لیا" رحمت اللعالمین ج اول ص ۱۱۵

غور کیجیے کہ ہاتھیوں کی اس نسل کو مامٹ کہتے ہیں نہ کہ ابرہہ کے صرف ایک ہاتھی کو، مگر مارگولیس ابرہہ کے ہاتھی کا نام بتاتا ہے۔ یہ تو ہوئی ناوہی بات کہ عقل پر جھاڑو پھر گیا ہے تبھی اس مستشرق کو کل اور جز کے فرق کا بھی پتہ نہیں، اس نوع کے ہاتھیوں کی پوری نسل یعنی کل نسل کو مامٹ کہتے ہیں نہ کہ صرف ایک ہاتھی (جز) کو مامٹ کہتے ہیں۔ اس سے بھی مارگولیس کی غلطی ظاہر ہوتی ہے جس سے اس کا الزام باطل ٹھہرا۔

اہم نکتہ؛ مترجم سیرت ابن ہشام (۱۔۸۰) لکھتا ہے کہ ممکن ہے ابرہہ کے ہاتھی کا نام یہی ہو لیکن عام خیال یہ ہے وہ ہاتھی اس اعلیٰ قسم میں سے تھا جسے عموماً میمتھ کہتے ہیں۔ یہ نسل اب مفقود ہو گئی ہے۔ نہ جانے میمتھ کس زبان کا لفظ ہے مگر میمتھ اور محمد میں چنداں بُعد نہیں"۔ اس رائے میں غلطیاں موجود ہیں۔ ا: ممکن ہے کہ ابرہہ کے ہاتھی کا نام یہی ہو، یہ فرض کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ مفروضوں سے بات نہیں بنتی اور مفروضوں سے تاریخی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ۲: مارگولیس کی بات کو دہرایا ہے اور کہتا ہے کہ ابرہہ کے ہاتھی کا نام یہ تھا پھر کہتا ہے کہ وہ ہاتھی اس اعلیٰ قسم سے تھا جسے میمتھ کہتے ہیں۔ یہ تضاد ہے اور اجتماع ضدین ناممکن ہے۔ اور مترجم گومگو کی کیفیت سے دوچار ہے۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ شائد اسے سہو ہوا ہے۔ نہ جانے میمتھ کس زبان کا لفظ ہے۔ ۳: مگر میمتھ اور محمد میں چنداں بُعد نہیں"۔

جب اس لفظ سے متعلق خبر نہیں کہ کس زبان کا لفظ ہے تو اس کے معنی بھی نامعلوم ہوئے۔ جب کہ آنحضرت ﷺ کے نام نامی کے معنی موجود ہیں۔ زبان کا علم ہے۔ صرف لفظ کی ادائیگی میں کچھ یکسانیت پائی جاتی ہو تو "چنداں بُعد نہیں" کا فارمولا اپنا کر اسے لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح میمتھ اور

محمد کا معاملہ ہے۔ نیز آپ سے قبل چند افراد کا نام بھی محمد تھا ان کے لیے یہ فارمولا کا اطلاق کیوں نہ کیا گیا ؟ لفظ موجود ہے زباں نامعلوم ہے۔ معنی کا بھی علم نہیں تو اس وضع کردہ لفظ کو کسی دوسرے لفظ کے ساتھ ملا کر کہا جائے کہ ''چنداں بُعد نہیں'' تو وہ لفظ اصل لفظ سے کسی طرح کا جوڑ نہیں رکھتا۔ ایسے گھڑے گئے الفاظ سے ان کی وضعی صورت چھپ نہیں سکتی۔

لفظ	زبان	معنی	نتیجہ
محمدؐ	عربی	تعریف کیا گیا	اصل لفظ با معنی
میمتھ	نامعلوم	نامعلوم	وضع کردہ بے معنی

اصل لفظ کو وضعی لفظ سے کیا نسبت؟ زبان اور معنی نامعلوم ہوں تو لہجہ میں تھوڑا فرق ہی کیوں نہ ہو وہ اصل لفظ کے برابر، کھاتے میں نہیں آتا۔ ''چنداں بُعد نہیں'' کے فارمولے کا اطلاق مشروط ہوتا ہے جبکہ یہاں پر وہ شرائط مفقود ہیں۔

اعتراض نمبر ۴۱

اسپرنگر کا خیال ہے کہ نبی کا نام قرآن کی چار سورتوں ''آل عمران''، ''احزاب''، ''محمد''، ''فتح'' میں وارد ہوا ہے۔ یہ ساری سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے ''محمد'' کا لفظ رسول کے نام کے طور پر مستعمل نہیں تھا، ۲: انجیل کے مطالعہ کرنے ۳: اور مسیحوں سے روابط قائم کرنے کے بعد ہی انھوں نے اپنے لیے اس نام کا انتخاب کیا''۔ (علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔۸۰)

جواب: آپ کا نام نامی جن مدنی سورتوں کی آیات میں آیا ہے وہ آیات درج کی جاتی ہیں۔

اول: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران ۱۴۴، پارہ ۴) ''اور محمد صرف ایک پیغمبر ہیں۔ آپ سے پہلے بھی پیغمبر گزر چکے ہیں''

دوم: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب ۴۰، پارہ ۲۲) ''نہیں ہیں محمد باپ تمھارے مردوں میں سے کسی کے اور لیکن اللہ کے رسول و خاتم النبیین ہیں''

سوم: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (محمد ۲، پارہ ۲۶) ''جو لوگ ایمان لائے اس پر جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی حق بھی ہے ان کے رب کی طرف سے''

چہارم: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۲۹، پارہ ۲۶) ''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں نہایت سخت ہیں کفار پر اور بہت مہربان آپس میں''

اب آتے ہیں اس پرنگر کے اعتراض کی طرف۔ جان دو عالم ﷺ کی خصوصیات و امتیازات ایسے ہیں جن کا لحاظ بارگاہ رب العزت میں روا رکھا گیا ہے وہ اس طرح کہ قرآن کریم میں جن پیغمبروں کا ذکر آتا ہے ان کو نام سے خطاب کیا گیا ہے۔ جیسے یا آدمؑ، یا ابراھیمؑ، یا موسیٰؑ، یا داؤدؑ، یا عیسیٰؑ، لیکن آنحضرت کو کسی بھی مقام پر نام لے کر خطاب نہیں کیا گیا بلکہ یا یھا النبی، یا ایھا الرسول کے الفاظ سے مخاطب فرمایا اور امت کو آپ کی رسالت پر ایمان لانے کی تنبیہ کی کہ ان کو نام سے نہ پکارا جائے جیسا کہ تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ ارشاد ربانی ہے۔ ''لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَیۡنَکُمۡ کَدُعَآءِ بَعۡضِکُمۡ بَعۡضًا'' (النور۶۳، پارہ۱۸)

''رسول کے پکارے کو ایسا نہ ٹھہرالو جیسا کہ ایک دوسرے کو پکارتے ہو''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آداب صرف مدنی دور ہی کے لیے تھے اور مکی دور کے لیے نہیں تھے یا مکی اور مدنی دونوں ادوار میں بھی ان کا لحاظ رکھا جاتا تھا اس لیے آپ ﷺ کو نام کی بجائے یا یھا الرسول، یا یھا النبی کے القابات سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ تو نام بطور رسول مستعمل نہیں ہے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن آیات میں آپ کا نام نامی آیا ہے وہ بطور خطاب نہیں آیا۔ وہ کسی ایسی غرض کے لیے آیا ہے جس کے بغیر اس آیت مبارکہ کے حکم سے وہ غرض ومقصد پورا نہیں ہوسکتا تھا اور اس کے بغیر بات پوری اور مکمل نہیں ہو پاتی تھی۔ (نقوش رسول نمبر ج اول ص ۱۲)۔ گویا بات کے پورا کرنے اور واضح کرنے کی غرض سے آپ کا نام آتا ہے کیوں کہ بات کے نامکمل ہونے سے کئی شکوک وشبہات متوقع ہو سکتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے شکوک کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کرنا ضروری تھا تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

دوم: اس الزام میں ایک چھپی سازش یہ بھی ہے کہ بعض مستشرقین قرآن کریم کو مطالعہ سیرت کے لیے ایک بنیادی مرجع قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے ان کا مقصد ومنشاء ان تمام واقعات کو رد کرنا ہوتا ہے جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ مگر ہے تو سہی لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ ذکر مکی سورتوں میں ہونا چاہیے تھا نہ کہ مدنی سورتوں میں یا ان کا ذکر مدنی سورتوں میں ہوتا نہ کہ مکی سورتوں میں یا سرے سے وہ واقعات جنھیں قرآن کریم بیان نہیں کرتا اور ان سے رسول کریم ﷺ کی عزت وعظمت کی ضوفشانیاں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہیں انہیں مستشرقین اپنے مطلب ومفاد کی رو میں بہہ کر بے دریغ ان واقعات کا انکار کردیتے ہیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی اسپرنگر کا الزام ہے۔ حالانکہ رؤف ورحیم رب نے انسانیت کے لیے پیغمبر ﷺ کی زندگی کو نمونہ قرار دیا ہے، لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔۔۔ ''بے شک تمھارے لیے

اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے" اگر چہ اس آیت مبارکہ کا شان نزول غزوہ خندق سے ہے لیکن یہ آیت مبارکہ عموم پر دلالت کرتی ہے۔ پیر کرم شاہ بھیروی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "یہ آیت اپنے الفاظ کے اعتبار سے عام ہے لیکن اسے زندگی کے کسی ایک شعبہ سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا لیکن جس موقع پر اس کا نزول ہوا اس نے اس کو چار چاند لگا دیئے" (ضیاالقرآن جلد ۴ ص ۳۲)

آپ ﷺ کی زندگی نمونہ ہے مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی، نمونہ ہے آج بھی اور کل بھی اور رہتی دنیا تک کی انسانیت کے لیے نمونہ ہے۔ آپ مکی زندگی میں رسول تھے اور مدنی زندگی میں بھی رسول تھے

سوم: ہجرت سے پہلے محمد ﷺ کا لفظ رسول کے لیے مستعمل نہ تھا، سے اسپرنگر کہنا یہ چاہتا ہے کہ مکی زندگی میں آپ منصب رسالت پر فائز نہ تھے۔ یہ منصب مدنی دور میں ملا۔ وہ کیوں بھول جاتا ہے کہ وحی کا آغاز مکہ میں واقع غار حرا سے ہوا جب آپ ﷺ کا سن چالیس تھا۔ آپ ﷺ غار حرا میں خلوت نشین تھے کہ دفعتاً ایک وجود اس غار میں نمودار ہوا اور آپ کو سلام کیا (خاتم النبیین ص ۴-۶)۔ اس وجود نے تین بار پکڑ کر دبایا اور تیسری مرتبہ یہ کہا کہ پڑھو! اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ، خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ، اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ، عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ۔ (العلق ۱-۵، پارہ ۳۰)

روایات کے مطابق تین سال تک خفیہ پرچار کرتے رہے۔ اس کے بعد حکم ملا کہ اب علی الاعلان اسلام کی دعوت دیں "فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشركين وانذر عشيرتك الاقربين واخفض جناحك لمن تبعك من المومنين وقل انى انا النذير المبين " آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اس کا صاف صاف اعلان کر دیجیے اور مشرکین کی پروا نہ کیجیے اور سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کو (کفر و شرک سے) ڈرائیے اور جو ایمان لا کر آپ کا اتباع کریں ان کے ساتھ شفقت اور نرمی کا معاملہ کیجیے اور آپ یہ اعلان کر دیجیے کہ واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

اس حکم کی تعمیل میں آپ کوہ صفا پر چڑھ گئے اور عرب کے قبائل کے نام لے لے کر پکارا۔ جب لوگ پہاڑی کے دامن میں جمع میں ہو گئے تو آپ نے یہ سوال کیا "اگر میں یہ کہوں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کے عقب میں ہے، یہاں دشمن کی فوج ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ آور ہونے والی ہے تو کیا تم سب لوگ میری اس بات کی تصدیق کرو گے" سب نے بیک زبان کہا "بے شک! کیوں کہ ہمارا تجربہ ہے کہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ جب اپنی سچائی کی تصدیق کروالی تو پھر فرمایا" عذاب خداوندی کا لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ قبل اس کے عذاب خداوندی کا یہ لشکر تم پر حملہ آور ہو، میں تمھیں آگاہ کر رہا ہوں" پھر آپ نے اپنی نبوت اور توحید خداوندی کو موضوع بنایا گویا مکی زندگی میں کار ہائے نبوت و رسالت انجام دیتے رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے خفیہ اور پھر علی الاعلان دعوت توحید دی اور اپنی نبوت

کا اعلان فرمایا تو کیا آپ کا نام اس وقت محمد ہی تھا نا۔ وہی محمد جس کے نام کے ساتھ رسول کا لفظ مستعمل مدینہ میں مانتے ہو۔ وہی تو ہے جس نے مکہ میں اور اس کے اطراف و اکناف میں اپنی رسالت کا ڈنکا بجایا۔ ہاں مدینہ میں لفظ رسول کو محمد کے ساتھ مستعمل اس لیے مانتے ہو کہ قرآن مجید کی مدنی سورتوں میں موجود ہے اور مکی دور میں اس بات سے اس لیے منکر ہو کہ مکی سورتوں میں محمد ﷺ کے ساتھ رسول کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ تمھارے باپ دادا (کفار) بھی اعلان نبوت کو برا بھلا کہتے گھروں کو لوٹ نہیں گئے تھے۔ وہ بھی آپ کو رسول ماننے سے انکاری تھے اور آج کے مستشرقین بھی اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ حالانکہ کوہ صفا جو مکہ میں واقع ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے توحید کا اعلان ہی تو کیا تھا۔ اب اگر مکی سورتوں میں یا ہجرت سے پہلے محمد ﷺ کا لفظ رسول کے نام کے طور پر مکی سورتوں میں مستعمل نہیں تھا تو کوئی عجیب بات نہیں۔ کیوں کہ آپ ﷺ نے اپنی زبان اقدس سے کوہ صفا پر رسالت کا اعلان فرما دیا۔ قرآن کی آیات مکی میں محمد ﷺ کے لفظ کے ساتھ رسول کا لفظ ہو یا اپنی زبان اقدس سے رسالت کا اعلان فرمائیں ایک ہی بات ہے۔ کیونکہ رسالت کا اعلان کرنے والے محمد ﷺ ہی تو تھے یہی اعلان تھا جس پر کفار برہم ہو کر اپنے گھروں کو لوٹے تھے اس کے دو سبب ہیں۔ ۱: قرآن پاک کا نزول آپ کے قلب اطہر پر ہوا اور قرآن مومنین کو آپ ﷺ کی زبان اقدس سے ملا۔ ۲: نفسانی خواہشات سے نہیں بلکہ زبان سے وہی نکلتا ہے جس کی وحی کی جاتی ہے ''وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِلَّا وَحیٌ یُّوحیٰ'' تو ہر دو طریق سے آپ ختم الرسل ہیں۔ آپ مکی زندگی میں بھی رسول تھے اور مدنی زندگی میں بھی۔ یہ مستشرقین بے چارے تو مکی اور مدنی ادوار کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں جب کہ آپ ﷺ ازل سے نبی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کے لیے نبوت کب واجب ہوئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس وقت جب آدمؑ روح اور جسم کے درمیان تھے یعنی جیسے ہر کام کا فیصلہ ہو چکا ہے اس طرح میری نبوت کا فیصلہ بھی ازل سے ہو چکا تھا جب کہ آدمؑ کے جسم میں روح نہیں پھونکی گئی تھی،، (ترمذی ابواب المناقب حدیث ۱۴۶۷ ج دوم ص ۳۵۰)

واقعہ یوں ہے کہ رشتہ داروں کو دعوت توحید دینے کے بعد باقی ماندہ قریشی افراد کو دعوت حق دینے کے لیے صفا کی پہاڑی پر چڑھ گیا اور بلند آواز سے پکارا ''یا معشر قریش، یا معشر قریش! لوگوں کی سماعتوں سے یہ آواز ٹکرائی تو سب آپ ﷺ کی جانب دوڑے چلے آئے اور بولے 'مَا لَکَ یا محمدؐ'' (اے محمد ﷺ! کیا بات ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔۔۔۔ اگر میں تم لوگوں سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے سے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم یقین کرو گے؟'' ہاں کیوں نہیں؟ سب نے بیک آواز کہا ''ہم نے آپ کو بار بار آزمایا ہے اور ہمیشہ سچا پایا'' ہے۔ آپ ﷺ قریش کی تمام شاخوں کے لوگوں کو نام بانام مخاطب کرنے لگے پھر فرمایا ''میں اللہ کے شدید عذاب سے ڈرانے والا ہوں، اے قوم

قریش! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے خاندان والوں کو اس عذاب سے ڈراؤں، یاد رکھو! جب تک تم لا الہ الا اللہ نہ پڑھو گے میں تمہارے لیے نہ دنیا کے کسی فائدے کا مالک ہوں نہ آخرت کا۔" ابو لہب بول اٹھا! تو ہلاک ہو جائے کیا یہی کچھ سنانے کے لیے بلایا تھا۔ اوپر کی عبارت میں مالک یا محمد؟ نہایت قابل غور الفاظ ہیں کفار نے محمد ﷺ کا نام لیا ہے وہ جانتے تھے کہ یہی رسول ہے جن کا نام محمد ﷺ اور آپ نے ہی دعوت توحید اور مژدہ رسالت کا اپنی مقدس زبان سے اعلان فرمایا جس پر کفار ناراض ہو کر گھروں کو لوٹ گئے۔

الزام کا دوسرا جز: اس الزام کے دوسرے جز کہ "انجیل کے مطالعہ کے بعد انھوں نے اپنے لیے اس نام کا انتخاب کیا، کا جائزہ لیتے ہیں۔ اسپرنگر اور اس کے ہم نواؤں کے لیے چیلنج ہے کہ وہ اس بات کا جواب دیں، اس سوال کا مدلل جواب دیں کہ نبی مکرم ﷺ نے اگر انجیل کی پیش گوئی پڑھنے کے بعد اپنے لیے محمد (ﷺ) کا نام منتخب فرمایا تھا تو کیا انجیل میں صراحت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کا نام موجود ہے۔ جب آپ کا نام انجیل میں پایا ہی نہیں جاتا تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسپرنگر انجیل مقدس کا حوالہ دے کر غلط بیانی کر رہا ہے، اور اپنی مقدس کتاب کی تکذیب کر رہا ہے اور انجیل مقدس کی تحریف کا مرتکب ہو رہا ہے۔ جب انھیں اپنی مقدس کتاب کا پاس نہیں تو پھر دوسری کتب سماویہ کی عزت و تکریم کیونکر کر سکتے ہیں؟۔ ان کے ایک اور عالم کی ہرزہ سرائی سنیئے۔ برٹرینڈ رسل جب عیسائیت کی بڑی شد و مد سے مخالفت کر رہے تھے تو کسی مسلمان نے اسے خط لکھا کہ اے دانشور زمانہ! آخر تم نے قرآن نہیں پڑھا جو اتنی بائبل پر تنقید کی ہے۔ اس نے جواب دیا۔

" ALL GOSPEL TRUTH IS A LIKE, WHY SHOULD I?"

گویا اپنی دشمنی کی بنیاد پر اپنے دین کی بیخ کنی کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ سچے دین اسلام کو بھی نشانہ تنقید بناتے ہیں۔

دوم: ارشاد ربانی ہے۔ "وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ"

"اے رسول قرآن سے پہلے تو تم نہ کسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے اور نہ تمھارے دست راست نے کبھی کوئی خط کھینچا تھا تب تو یہ بطلان والے شک بھی کر سکتے"

لفظ امی سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ طرز و طریق خواندگی میں اہل دنیا سے بالاتر تھے۔ نیز مذکورہ آیت نے صراحت کر دی کہ قرآن سے پہلے کسی کتاب کو نہ پڑھا اور نہ ہاتھ سے خط کھینچا یعنی لکھنا پڑھنا آپ نہیں جانتے تھے۔ اُمی ہونا حضور ﷺ کا معجزہ ہے۔ اب آپ ﷺ کے متعلق کہنا کہ انجیل سے

پڑھ کر آپ نے اپنا نام انتخاب کیا محض باطل ہے۔ کیوں کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں تو انجیل کو کیسے پڑھ لیا، اسے کہتے ہیں مجذوب کی بڑ اور دیوانے کا خواب!

الزام کا تیسرا جز

کہ مسیحوں کے ساتھ روابط قائم ہونے کے بعد ہی انھوں نے اپنے نام کا انتخاب کیا، یہ سراسر غلط ہے کیونکہ عیسائی خود گمراہ اور گم کردہ راہ ہیں۔ انھوں نے دین مسیح میں تحریف کی، اب وہ دین اپنی اصل حالت میں نہیں ہے بلکہ وہ انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس صورت میں مسیحوں سے رابطہ قائم کرنا فضول اور بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات مختلف ہیں (تحریف شدہ عیسائیت دین مراد ہے)۔ اسلام میں پیشہ ور مذہبی طبقہ اور چرچ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ رہبانیت اور چرچ دونوں کا تقاضائے سلامتی یہ ہے کہ اسلام کے مذہبی اثر ورسوخ کا سدباب ہو۔ اسلام توحید کا علمبردار ہے اور اسلام میں تثلیث کی حیثیت پرکاہ کی بھی نہیں۔ اسلام نے پیغام توحید دے کر مسیحؑ کو انسان اور اللہ تعالیٰ کا پیغمبر کہا۔ تین صدی قبل مسیح افلاطون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ الوہیت کے تین اجزا ہیں۔ علت اولیٰ دوم حکمت کلام سوم روح کائنات۔ اس افلاطونی نظریہ کے دوسرے جز کلام یا لوگس کو مسیحؑ سے متصف کیا گیا۔ یوحنا انجیل کی ابتداء اسی کلام سے ہوتی ہے اور یسوع کو کلام قرار دیتی ہے لیکن اگر یسوع اور روح القدس کی الوہیت سے انکار کریں تو عیسائی نہیں رہتے اور اگر اقرار کرتے ہیں تو موحد نہیں رہتے (مستشرقین کا انداز فکر ۲۲۶)

توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید سے وہ ثابت یہ کرتے ہیں کہ یسوع اور روح القدس ایک ہی ذات کے مظہر ہیں اور اسی کے جز ہیں، اسی ایک سے تین ہوئے اور ان تینوں سے ایک ہوئے۔

عیسائی مسیح کی وفات کو مانتے ہیں جب کہ اسلام اس کا رد کرتا ہے۔ رہبانیت کے قائل ہیں لیکن اسلام میں لا رہبانیت فی الاسلام کی ہدایت ہے۔ عبادات بھی مختلف ہیں تو ان کے ساتھ روابط قائم کرنے سے بھلا اس نام کا انتخاب کیونکر ممکن ہے؟ انھیں اپنے دین سے کچھ غرض نہیں۔ اپنے مفاد اور غرض کی اجارہ داری ہے۔ اپنے اغراض کی خاطر دین بھی بدل دیتے ہیں۔ حد تو یہ کہ جنھیں ایک اور تین کے فرق کا علم نہیں تو دوسروں کے لیے وہ کیسے راہبر و راہنما بن سکتے ہیں اور دوسرے بھی انھیں کب راہنما تسلیم کر سکتے ہیں۔

سوم: جناب ختمی المرتبت کی دنیا میں تشریف آوری سے ۵۷۱ سال قبل اور آپ ﷺ کی بعثت سے ۶۱۱ سال قبل مسیحؑ نے بشارت دی جس کا ذکر قرآن کریم کی سورت ''الصّف'' میں ان الفاظ کے ساتھ ہے ''یاتی من بعدی اسمہ احمد'' جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام احمد ہے۔ اب ہجرت سے پہلے محمد کا لفظ رسول کے نام کے طور پر مستعمل نہیں تھا یا مسیحوں سے روابط قائم کرنے پر اس نام کا انتخاب کیا گیا، مذکورہ

آیت کی روشنی میں باطل ٹھہرا کیوں کہ صدیوں پہلے مسیحؑ نے آپ کا نام نامی ''احمد'' کی بشارت دی۔ نیز آپ کے نام نامی کا ذکر مدنی سورتوں میں ہو یا مکی سورتوں میں فرق ندارد اور مسیحؑ اسلام کے بعد آنے والے نبی آپ ﷺ ہی ہیں۔

نکتہ: اب اگر کوئی کہہ دے کہ حضرت عیسیٰؑ کی بشارت جو قرآن میں موجود ہے، میں پیغمبر کا نام ''احمد ﷺ'' ہے جو حضرت مسیحؑ کے بعد آئیں گے تو کیا ''احمد ﷺ'' و ''محمد ﷺ'' اسی پیغمبر آخر الزماں کے دو نام ہیں یا یہ الگ الگ دو پیغمبر ہیں جن میں ایک نام ''احمد ﷺ'' اور دوسرے کا ''محمد ﷺ''۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت مبارکہ میں لفظ ''بعدی'' آیا ہے۔ یعنی حضرت مسیحؑ کے بعد وہ پیغمبر جس کا نام احمد ﷺ ہے وہ آئے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد کون نبی آیا؟ اس کا نام کیا تھا؟ وہ کس علاقہ سے تھا وغیرہ وغیرہ۔۔ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مسیحؑ کے بعد سوائے آپ ﷺ کے کوئی اور نبی دنیا میں تشریف نہیں لایا۔ ثابت ہوا وہ نبی آیا جس کا نام ''احمد ﷺ'' اور محمد ﷺ ہے۔ اس بات کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کے دادا نے رسم عقیقہ میں قریش کی دعوت کی اور اپنے محبوب بیٹے کا نام محمد ﷺ رکھا۔ اسی نام کے بارے میں قریش پوچھ بیٹھے کہ یہ نام آپ نے کیونکر رکھا ہے۔ اس بات کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ مکہ کی پہاڑی کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے قبائل کو بلا کر توحید کا پیغام سنایا اور اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ اعلان کرنے والا وہی احمد ﷺ تھا جس کا نام نامی ''محمد ﷺ'' بھی ہے۔ یہ دونوں نام آپ ہی کے ہیں۔ دو الگ الگ پیغمبروں کے نام نہیں ہیں۔ اعلان رسالت سن کر کفار چیں بجبیں ہو کر گھروں کو لوٹ گئے وہ آپ ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ آج بھی مستشرقین کسی نہ کسی طرح آپ کی رسالت میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ بھی کفار کی طرح منکر رسالت ہیں۔ یہ محض ان کی دشمنی اسلام کا نتیجہ ہے۔ ہم مسلمان یہ کہتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔

خلاف پیغمبر کسے راہ گزید

ترجمہ: پیغمبر کے خلاف جس نے کوئی راستہ اختیار کیا

کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

وہ منزل تک ہرگز نہیں پہنچ سکے گا

محالست سعدیؔ کہ راہ صفا

اے سعدی! راہ صفا پر پہنچنا

تو آں رفت جز پئے مصطفیٰ

اتباع رسول کے بغیر محال ہے

اسم مبارک آسمان پر: روزنامہ زمیندار ''لاہور'' اور دیگر اسلامی اخباروں میں پڑھا تھا کہ ۵ شعبان سن ۱۳۲۵ھ بمطابق ۸ فروری ۱۹۲۷ء کو مغرب کے بعد آسمان پر ستارے اس طرح اکٹھے ہو گئے کہ حضور انور ﷺ کا مبارک نام لکھا ہوا نظر آیا۔ سینکڑوں آدمیوں نے مختلف مقامات پر' الہ آباد' جبل پور' سکھر وغیرہ میں یہ نظارہ آدھ گھنٹے تک دیکھا اور نامہ نگاروں کی تحریریں نہایت آب و تاب کے ساتھ اسلامی اخباروں میں شائع ہوئیں۔

اسم اقدس کے اس اعجاز کا چرچا مدت تک ہمارے ملک میں رہا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم میں مندرجہ ذیل شعر کا یہ مصرع کہا تھا۔

ستارا کو وہ قلم مستعار دیتے ہیں

مولوی اشرف علی تھانوی کی کتاب ''اسلام اور عقلیات'' میں یہ الفاظ درج ہیں ''راقم نے بعض مقامات سے اس کی تصدیق کرائی اور چھیالیس آدمیوں کے نام' ولدیت' سکونت' دستخط و نشان انگوٹھا راقم کے پاس موجود ہیں جن میں بہت سے ہندو بھی ہیں (ن۔۹۔۳۶۵)

نام نامی اسم گرامی کے بارے مستشرقین کے الزامات

الف: پیٹرسن ایک سیاح تھا اس کے شرمناک الزامات جنھیں ضبط تحریر میں لانے کو جی نہیں چاہتا لیکن حقیقت کے اظہار کے لیے ضروری ہے۔ سینے پر پتھر رکھ کر اور دل و دماغ کو قابو میں لا کر بیان کرنا پڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اعتراض نمبر ۴۲

یہ اطرارپ (ITRARIP) میں ۵۷۲ء میں پیدا ہوا اس کا باپ کٹڑ اور والدہ توہم پرست یہودن تھی، ایسے جوڑے سے ایسا ہی خدا پرست شیطان پیدا ہو سکتا تھا جیسا کہ۔۔۔نعوذ باللہ۔

ب: مولد: پیٹرسن نے اطرارپ کو مولد قرار دیا تو راجرز وِنڈسور نے صوبہ خراسان کا باشندہ بتلایا۔ ''رومن دی ماہومت کے مصنف نے انھیں ایدوم کے ایک کسان کا فرزند تحریر کیا۔

ج؛ پیٹرسن کہتا ہے ''پستہ قد، گنجے سر، بدہیئت تھے، بدکرداروں میں پائی جانے والی تمام شیطانی صفات کے حامل، چورپن اور بے حد عیاش (نعوذ باللہ) (م۔م۔ک۔ا۔ف۔ص۔۱۹۳)

جواب؛ الف: آپ ﷺ کی جائے ولادت اطرارپ (غالباً یثرب) نہیں تھی اور نہ ہی آپ خراسان کے باشندے تھے۔ حضرت کعبؓ نے ذکر کیا ہے کہ پہلی کتب میں مذکور ہے۔ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی جائے پیدائش مکہ میں ہوگی۔ مقام ہجرت (یثرب) مدینہ ہوگا اور دارالحکومت ملک

شام ہوگا۔اور آپ کے شام میں بیت المقدس کی طرف اسراء میں بھی یہی حکمت کارفرما ہے۔جیسا کہ ابراھیمؑ نے بھی اس سے پہلے شام کی طرف ہجرت کی اور حضرت عیسیٰؑ بھی یہیں اتریں گے اور محشر کا میدان بھی یہی سرزمین ہوگی (ا۔ن۔پ۔۱۵۰)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کہتے ہیں کہ کعب نے قدیم زمانہ کی کتابوں کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔محمد ﷺ کی ولادت مکہ میں اور ہجرت مدینہ کو ہوئی شام کی طرف آپ کا ملک ہے۔اسی نسبت معراج کی شب آپ کو مملکت شام کی جانب بیت المقدس تک لے جایا گیا (حوالہ بالا۔۱۶۲۔۱۶۱) کتب سیّر میں مکہ جائے ولادت ہے۔

آپ کے والد ماجد ایک شریف زادہ کی طرح امانت و دیانت،صداقت وشرافت جیسی خوبیوں کے مالک تھے۔خوبصورت اتنے کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے۔خوب سیرت اتنے کہ بڑے بڑے خاندان حضرت عبداللہؓ کو اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔پاکیزگی اخلاق کی بلندی ایسی کہ کافروں نے بھی آپ کی شان کو تسلیم کیا (ا۔ن۔پ۔ص۱۱۴)۔ان صفات کا مالک کٹڑ ہوسکتا ہے؟ وہ وہمی نہیں تھے۔یہی نہیں ذرا سنیئے کہ آپ کے والد اپنے والد عبدالمطلب کے ہمراہ جارہے تھے ورقہ بن نوفل کی بہن نے کہا ’’جس قدر اونٹ تمھاری طرف سے ذبح کیے گئے ہیں،اسی قدر تمھاری نذر کرتی ہوں،تم مجھ سے شادی کرلو۔انہوں نے جواب دیا میں اپنے والد کا مطیع اور فرماں بردار ہوں۔ان کی خواہش کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتا (حوالہ بالا۔۱۲۰۔۱۲۱)۔وہمی ہوتے تو یوں دوٹوک فیصلہ نہ کرتے۔آپ نہ وہمی نہ کٹڑ نہ حرص والے بلکہ فرماں بردار تھے (س) آپ کی والدہ ماجدہ قریش کی سب عورتوں میں نسبت اور فضیلت میں افضل تھیں۔آپ کی والدہ برہ بنت عبدالعزی بن عثمان بن عبدالدار بن قصی تھیں اور آمنہ کی نانی ام حبیب بنت اسد بنت عبدالعزی بن قصی تھیں اور ام حبیب کی والدہ برہ بنت عوف بن عدی بن کعب بن غالب بن فھر تھیں۔پیٹر کو اتنی خبر نہیں کہ حضرت آمنہؓ عصمت وعفت اور پاکبازی میں یکتا تھیں۔جنھیں غیبی فرشتہ نے بیٹے کی بشارت دی تھی۔اس دور میں کسی نے وہم پرست نہیں کہا تو اب کیسے مان لیں کہ وہ وہم پرست تھے۔بلکہ ان کی شان میں جن لوگوں نے توہین آمیز باتیں کہیں تو خود اللہ تعالیٰ نے ان شانئک ھو الابتر کہہ کر محبوب کی شان کو اجاگر کردیا۔

پیٹر کو اتنی بھی خبر نہیں کہ نبی محتشم ﷺ کا مولد مکہ میں ہے وہ اطرارپ بتاتا ہے اسی بنا پر اس نے ختمی المرتبت کی والدہ کو یہودن کہہ دیا اس لیے کہ یہود مدینہ میں آباد تھے۔آپ کا شجرہ نسب تو قریش کے معزز خاندان سے تھا۔ایسا نہ تھا جیسے پیٹر کہتا ہے۔۔۔۔دوسرا مستشرق ایدوم کے ایک کسان کا فرزند بتاتا ہے۔پیغمبر کی دشمنی اور عداوت میں باؤلا ہوا جاتا ہے ان کے باپ کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔زراعت

نہیں کرتے تھے نیز نہ آپ کسان تھے اور نہ کسان کے بیٹے۔ حضرت عبداللہؓ تجارت کے لیے شام گئے۔ واپسی پر بیمار ہوئے اور راہی ملک عدم ہوئے۔ سارے الزامات بے بنیاد ہیں۔ پیٹر نے جو حلیہ بیان کیا ہے نہایت دل خراش اور جگر سوز ہے نیز تاریخی حقائق کے خلاف ہے جس سے اس کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں رہتی، تمام حلیہ باطل بیان کیا گیا ہے اس کی تردید میں ایک مستشرق کی رائے بیان کرتے ہیں جان ڈیون پورٹ کہتا ہے ''آپ کی شکل شاہانہ تھی، خط وخال باقاعدہ و دل پسند تھے آنکھیں سیاہ اور منور تھیں بینی ذرا اٹھی ہوئی تھی۔ دہن خوبصورت تھا۔ دانت موتی کی طرح چمکتے تھے رخسار سرخ تھے۔ آپ کی صحت نہایت اچھی تھی آپ کا تبسم دل آویز، شیریں ودلکش آواز تھی (ایڈورڈ گبن کی رائے) آنحضرت ﷺ حسن میں شہرہ آفاق تھے اور یہ نعمت صرف انھیں بری معلوم ہوتی ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا نہیں ہوئی۔ لوگ آنحضرت ﷺ کی شاہانہ شکل، نورانی آنکھیں، خوش نما تبسم، بکھری زلفیں دیکھ دیکھ کر تعریف کرتے تھے (ن۔۔۵۳۰) اب ایک صحابی کی زبانی سنئے وہ سب سے بڑا حلیہ بتانے والے ہند بن ابی ہالہ کہتے ہیں۔۔۔ ان کا منہ یاقوتوں سے بھرا ہوا صندوقچہ تھا۔ ان کا چہرہ چودھویں کے چاند سے زیادہ حسین تھا۔ آپ کے حلیہ نگار چھ اشخاص تھے۔ پانچ ہاشم قبیلہ کے اور ایک نامعلوم غیر ہاشمی تھے (ن۔۶۱۔۵۸) اس نے یہ حلیہ کسی اور شخص سے لیا ہے یا از خود گھڑا ہے، مذکورہ حلیہ نگار اشخاص سے نہیں لیا ہے جبکہ مذکور حلیہ نگار معتبر ہیں لہٰذا پیٹر کا بیان کردہ حلیہ ونسب بالکل باطل ہے۔

رضاعت

ابتداء میں چار روز اور بعض روایات میں سات روز آتا ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ سیدہ آمنہؓ نے آپ ﷺ کو سب سے پہلے دودھ پلایا بعد ازاں ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا وہ اس طرح کہ ثویبہ نے ابولہب کو آنحضرت ﷺ کی ولادت کی خوشخبری سنائی اور یہ بھی کہا کہ مرحوم بھائی عبداللہ کے گھر خدا نے فرزندار جمند عطا فرمایا ہے اس خوشی میں ابولہب نے اسے آزاد کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آٹھ دن آپ ﷺ اپنی والدہ ماجدہ کے پاس رہے، اس دوران دو تین دن ثویبہ اور چار پانچ دن آپ ﷺ کی والدہ نے دودھ پلایا۔

عربوں میں یہ رسم چلی آتی تھی کہ اپنے نومولود بچوں کو آٹھویں روز ایک صحرائی عورت کے سپرد کر دیا جاتا تھا جو اسے دودھ پلاتی' ہر طرح سے خیال رکھتی اور نہایت اچھے طریقے سے پرورش کا فرض انجام دیتی تھی۔ صحرائی ماں کے آغوش میں دے دینے کی کئی اسباب ہیں چند ایک یہ ہیں۔ (۱) عربوں کو اور خصوصی طور پر قریش کو اپنی زبان سے والہانہ محبت تھی وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جا سکتا تھا جو فصیح نہ ہوتا۔ اس فصاحت کی غرض سے صحرائی ماحول نہایت احسن تھا کیونکہ شہر کی زبان میں کئی زبانوں کے الفاظ کی

آمیزش ہو جاتی ہے۔ مکہ شہر کا بھی یہی حال تھا کہ دور دراز سے لوگ یہاں خانہ کعبہ کی زیارت کو آتے جاتے تھے۔ کئی روز یہاں قیام کرتے اسی طرح کچھ لوگ تجارتی مقاصد کے لیے آتے تھے اور یہاں کے لوگوں سے بات چیت ہوتی تھی جس سے شہری زبان خالص نہ تھی بلکہ مخلوط عربی زبان تھی۔ اس سبب سے قریش نے کچھ دیہاتی قبائل کا انتخاب کر رکھا تھا جن کی زبان خالص، ٹکسالی فصیح زبان مانی جاتی تھی ان کے ہاں اپنے نومولود بچوں کو بھیجتے تھے جس سے ان بچوں کے اذہان پر شروع ہی سے ٹکسالی عربی زبان کے الفاظ نقش ہوتے جاتے تھے اس طرح سے گویا فصاحت ان کی گھٹی میں پڑ جاتی، اس بات کی تصدیق آپ ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے۔ امام سہیلی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ میں اس لیے فصیح ہوں کہ قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں (سیرت النبی ۔۱۱۴) ایک موقعہ پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''میں تم میں سب سے زیادہ شستہ اور صحیح زبان بولنے والا ہوں، میں قریشی ہوں اور قبیلہ سعد بن بکر میں، میں نے دودھ پیا ہے۔ (جو فصاحت زبان میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔)

(۲) عرب اپنے شیر خوار بچوں کو دیہات میں بھیجتے تاکہ بچوں کو صاف شفاف آب و ہوا میسر آئے اور ان کی خوب نشو ونما ہو اور اصل عربی تمدن سے واقف ہو کر تہذیب و تمدن کا پیکر بنیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ''معد بن عدنان کی ہیئت کو اختیار کرو اور شدائد و مصائب پر صبر کرو اور موٹا پہنو یعنی عیش و عشرت میں نہ پڑو''۔

(۳) قریش میں خوشحالی تھی اس خوشحالی اور برتری کے سبب ایک تکلف یہ تھا کہ خواتین (بیگمات) اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ دوسری خاندانی عورتوں یا باندیوں سے دودھ پلواتی تھیں۔

اعتراض نمبر ۴۳

بعض کہتے ہیں کہ قریش اور دیگر عرب کے امراء کے ہاں رواج تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے والیوں کے سپرد کرتے تھے تاکہ ان کی بیویاں ان کی خدمت کے لیے فراغت پا سکیں۔!! نیز بچوں کو صحرائی زندگی کی مشقتوں کا خوگر بنایا جائے۔

اس پر علماء کی طرف سے پہلا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کی وفات کے بعد سیدہ آمنہؓ کو یہ حاجت نہ رہی کہ بچے سے فراغت پا کر اپنے شوہر نامدار کی خدمت کریں اور یہ بدیہی امر ہے دراصل بات یہ ہے کہ قریش میں خوشحالی تھی اس خوشحالی اور برتری کے زعم کا ایک تکلف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ دوسری خاندانی عورتوں یا باندیوں سے دودھ پلوایا کرتی تھیں اس جدید دور میں بھی امراء اور روساء کی بیگمات اپنے بچوں کی دودھ پلائی اور ان کی پرورش اور تربیت کے لیے اناؤں کے سپرد کرتی ہیں دایہ کے نہ آنے تک کنیزیں دودھ پلایا کرتی تھیں۔

باندیوں کا بلند مقام: عرب لونڈیوں سے دودھ پلانا عار سمجھتے تھے ابتداء میں ایسا ہو سکتا ہے کہ عرب عورتوں سے دودھ پلانا ناپسند خیال کرتے ہوں تا کہ بچے پر ناخوشگوار اثرات مرتب نہ ہوں غلامی کی پرچھائیاں نہ پڑیں اوران کی سوچ آزاد ہو آنحضرت ﷺ نے غیر عورت کا دودھ پی کر عربوں پر واضح کر دیا کہ لونڈیوں کا بھی ایک مقام ہے اوران کا دودھ پینا کسی طرح معیوب نہیں ہے حدیث شریف میں آتا ہے " زہری نے کہا مجھے عروہ نے خبر دی کہ ابو سلمہ کی بیٹی زینب نے انہیں خبر دی کہ ام المومنین ام حبیبہؓ بنت ابو سفیان نے بیان کیا کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ﷺ آپ میری بہن' ابوسفیان کی بیٹی سے نکاح کر لیں' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ چاہتی ہو؟ میں نے عرض کی جی ہاں! اب بھی تو میں آپ کی اکیلی بیوی نہیں ہوں' میں چاہتی ہوں کہ جو کوئی خیر اور بھلائی میں میرے ساتھ شریک ہو وہ میری بہن ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا وہ میرے لیے حلال نہیں ہے۔ میں نے کہا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ ابو سلمہ کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کیا ام سلمہ کی بیٹی زینب سے؟ جی ہاں! سید عالم ﷺ نے فرمایا اگر وہ میری ربیبہ نہ ہوتی جب بھی میرے لیے حلال نہ تھی کیونکہ وہ میرے رضائی بھائی کی بیٹی ہے مجھے اور ابو سلمہ کو ثویبہ نے دودھ پلایا ہے مجھ پر اپنی بیٹیاں اور بہنیں پیش نہ کرو۔" (تفہیم البخاری۔ ج۔۸۔۴۵۶۔۴۵۷) غلاموں اور باندیوں کو بلند مقام عطا کیا۔ ثویبہ کا دودھ پی کر اس رشتہ کا ہمیشہ پاس رکھا اور رہتی دنیا کے لیے اپنے اس عمل کو نمونہ کے طور پر پیش کیا نیز ثابت کر دیا کہ باندیوں سے دودھ پلانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اعتراض نمبر ۴۴

بعض کہتے ہیں کہ آٹھ دن کے بچے کو مشقتوں کا عادی بنانے کے لیے یہ عمر موزوں نہیں ہے۔

جواب: عربوں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دیہاتی عورتوں کے پاس رضاعت و پرورش و تربیت کے لیے بھیجتے تھے تا کہ ان کی جسمانی ہڈیوں اور اعصاب میں پختگی آئے اور کھلی ہوا اور صاف فضاء میں تندرست و توانا ہونے کا موقع ملے صحرا میں مشقتوں کا خوگر بنے تا کہ حوادثات زمانہ اور زمانہ کی سختیوں اور مصیبتوں میں کمال صبر و استقامت سے کام لے اور کبھی ہمت ہارنے کی نوبت نہ آئے۔ ماہرین حیاتیات کہتے ہیں کہ بچہ پر توارث کے اثرات حمل کے زمانہ سے مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں تو پھر آٹھ روز کی عمر کے بچے پر مختلف قسم کے اثرات کیونکر مرتب نہیں ہو سکتے؟ آپ ﷺ نے تو نہ صرف رضاعت کا زمانہ گزارا بلکہ چار سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک صحرائی گرم جھلستی ہواوں کو اپنے جسم مبارک سے چھونے کا اعزاز بخشا اور سردی کی شدت کو برداشت کیا حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے اے مسلمانو! معد کا تن و توش پیدا کرو مشقت طلبی کو اپنا شعار اور اپنے جسم و اعصاب کو سخت بناؤ۔

سر ولیم میور رطب اللسان ہے کہ " محمد ﷺ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی اور ان کے اخلاق

آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے جن کی وجہ سے ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اس وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی۔'' (سیرت النبی۔۱۱۴)

مارٹن لنگس کہتے ہیں'' ریگزار میں آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ پہنائی فضا کا وہ مالک ومختار ہے اور چونکہ وہ مالک ومختار ہے اس لیے ایک معنی میں زمانے کے تسلط سے اس کو مفر حاصل ہے پہنائی فضا اس کے زیر نگین ہے اور وہ بندہ شب وروز سے آزاد ہے۔ خیمہ برہم کر کے اپنے جتنے گزرے ہوئے کل تھے سب کو وہ مرگ آشنا حقیقت بنا دیتا ہے۔۔۔ اور آنے والا کل اگر اس کے کب اور کہاں کو ابھی باقی لانا ہے تو اس کی ہلاکت آفرینی کم ہی لگتی ہے۔ اس کے برخلاف شہر کا باشندہ ایک قیدی ہوتا ہے اور ایک جگہ پابہ گل ہو کر رہنا۔۔۔ امروز فردا۔۔۔ زمانے کا ہدف بننا ہے زمانہ سب چیزوں کو تباہ کر دیتا ہے۔۔۔ شہر بد اطواری کا اڈا ہوتے ہیں' کاہلی اور سستی اور ان کی دیواروں کے سائے میں دبک کر بیٹھی رہتی ہے۔ اس تاک میں کہ انسان کی چستی اور پھرتی' حزم اور احتیاط اور بیدار مغزی دھار کو کند کر دے۔ وہاں ہر شے روبہ زوال رہتی ہے حتیٰ کہ انسان کی متاع گراں بہا اس کی زبان بھی۔ کم ہی عرب خواندگی کی استعداد رکھتے تھے لیکن حسن کلام ایک ایسی خوبی تھی جس کو سب عرب والدین اپنے بچوں میں دیکھنے کے خواہش مند تھے کسی آدمی کی قدر وقیمت کا پیمانہ اس کی فصاحت اور طاقت لسان ہوتی تھی اور فصاحت کا تاج شاعری تھی۔ خاندان میں کسی شاعر کا پایا جانا فی الواقع سرمایہ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ (حیات سرور کائنات۔۶۹)

حلیمہ سعدیہؓ کی آغوش میں: دستور کے مطابق بنی سعد کی عورتیں شیر خوار بچوں کو رضاعت پر لینے کے لیے مکہ مکرمہ میں ہر سال آیا کرتی تھیں اس سال بھی سعد قبیلہ کی دس عورتیں مکہ آئیں۔ حلیمہ سعدیہ اپنی سواری کی کمزوری اور لاغری کی وجہ سے دیر سے پہنچی سب کو ایک ایک بچہ مل گیا صرف آپ رہ گئیں دوسری طرف سرکار دوعالم ﷺ بچ گئے جنہیں کسی دایہ نے نہ لیا کیونکہ وہ یتیم تھا اور انہیں یتیم بچے کے خاندان سے زیادہ انعام واکرام ملنے کی امید نہ تھی بالآخر سید المرسلین ﷺ کو حلیمہ سعدیہؓ نے گود میں لے لیا۔

رضاعت کی کہانی حلیمہ سعدیہؓ کی زبانی: حضرت حلیمہؓ فرماتی ہیں میں بنی سعد کی عورتوں کے ہمراہ دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں مکہ کو چلی۔ اس سال عرب میں بہت سخت قحط پڑا ہوا تھا' میری گود میں ایک بچہ تھا مگر فقر وفاقہ کی وجہ سے میری چھاتیوں میں اتنا دودھ نہ تھا جو اس کو کافی ہو سکے۔ رات بھر وہ بچہ بھوک سے روتا بلبلاتا اور تڑپتا رہتا تھا اور ہم اس کی دل جوئی اور دلداری کے لیے تمام رات جاگ کر گزارتے تھے۔ ایک اونٹنی بھی ہمارے پاس تھی مگر اس کے تھنوں میں بھی دودھ نہ تھا۔ مکہ مکرمہ کے سفر میں جس دراز گوش پر سوار تھی' وہ بھی اس قدر لاغر کہ قافلہ والوں کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا۔ میرے ہمراہی بھی اس سے تنگ آ چکے تھے۔ بڑی مشکلوں سے یہ سفر طے ہوا۔ جب یہ قافلہ مکہ مکرمہ پہنچا تو جو

عورت رسول اللہ ﷺ کو دیکھتی اور یہ سنتی کہ یہ بچہ یتیم ہے تو کوئی عورت آپ کو لینے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی کیونکہ بچے کے یتیم ہونے کے سبب زیادہ انعام ملنے کی امید نہیں تھی۔۔۔حضرت حلیمہ سعدیہؓ کو کوئی بچہ نہ ملا' ہوسکتا ہے دودھ کی کمی کے باعث کسی نے انہیں اپنا بچہ دینا گوارا نہ کیا۔تب حلیمہ سعدیہؓ نے اپنے شوہر حارث بن عبدالعزی سے کہا کہ یہ تو اچھا نہیں کہ میں خالی ہاتھ لوٹ جاؤں' اس سے بہتر یہی ہے کہ میں اس یتیم ہی کو لے لوں' شوہر نے ہاں کر دی اور حلیمہ سعدیہؓ اس درِیتیم کو لے آئیں۔آپ ﷺ کو دودھ پلانے بیٹھیں تو حلیمہ کے پستان مبارک میں دودھ اس قدر اترا کہ آپ ﷺ اور ان کے رضاعی بھائی عبداللہ نے سیر ہو کر پیا۔ حارث اونٹنی کے پاس گئے' اس کے تھن بھی دودھ سے بھرے تھے حالانکہ اس سے قبل تھنوں میں دودھ کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔انہوں نے اسے دوہا اور انہوں نے بھی نوش کیا اور میں نے بھی پیا اور ہم خوب سیر ہو گئے اور خیر و برکت کے ساتھ اس رات چین کی نیند سوئے چونکہ اس سے پہلے بھوک و پریشانی میں نیند نہیں آتی تھی۔۔حلیمہؓ فرماتی ہیں کہ تین راتیں ہم مکہ میں ٹھہرے رہے ۔۔اس کے بعد لوگوں نے ایک دوسرے کو رخصت کیا اور مجھے بھی سیدہ آمنہؓ نے رخصت کیا۔میں اپنی دراز گوش پر حضور ﷺ کو اپنی گود میں لے کر سوار ہوئی۔میری دراز گوش خوب چست ہو گئی اور اپنی گردن اوپر تان کر چلنے لگی۔۔۔پھر قبیلہ کے جانوروں کے آگے آگے دوڑنے لگی لوگ اس کی تیز رفتاری پر تعجب کرنے لگے۔عورتوں نے مجھ سے کہا اے بنت ذوئب۔۔کیا یہ وہی جانور ہے جس پر سوار ہو کر ہمارے ساتھ آئی تھی اور جو تمھارا بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا اور سیدھا چل نہیں سکتا تھا؟ میں نے جواب دیا: خدا کی قسم! یہ وہی جانور ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اس فرزند کی برکت سے اسے قوی و توانا کر دیا ہے' اس پر انہوں نے کہا خدا کی قسم! اس کی بڑی شان ہے۔۔۔آخر بنی سعد کی بستی میں پہنچ گئے۔الغرض دو سال کا عرصہ ہو گیا اور میں نے (حلیمہ) نے آپ کا دودھ چھڑا دیا۔۔۔اور دستور کے مطابق ہم آپ ﷺ کو ان کی والدہ ماجدہ کے پاس لائے انہوں نے ہمیں انعام سے نوازا۔

دستور کے مطابق اب ہمیں آپ ﷺ کو اپنے پاس رکھنے کا حق نہیں تھا کیا حسن اتفاق ہے کہ کبھی آپ ﷺ کو لینے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن آپ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔عجیب اتفاق ہے کہ اس سال مکہ معظّمہ میں وبا کی بیماری پھیلی ہوئی تھی ہم نے اس بیماری کا ذکر کر کے سیدہ آمنہؓ کو رضا مند کر لیا اور پھر ایک بار آپ ﷺ کو اپنے گھر لے آئی۔آپ یہاں دو یا تین سال تک رہے۔یہ عرصہ پہلے دو سال سے الگ ہے۔۔۔

نکتہ: حلیمہ سعدیہؓ کی چھاتیوں میں دودھ کی اس قدر کمی تھی کہ ان کے شیر خوار بچہ عبداللہ کے لیے بھی دودھ ناکافی تھا وہ روتا تڑپتا رہتا اور باپ اور والدہ بچے کی دل جوئی کے لیے رات بھر سو نہ سکتے تھے۔

جگ رتوں میں کٹ رہی تھی ان حالات میں کسی خاتون نے حلیمہ کو اپنا بچہ رضاعت کے لیے دینا گوارا نہ کیا ہو گا سوال یہ ہے کہ حلیمہ سعدیہؓ جانتی تھی کہ اس کی چھاتیوں میں دودھ کی کمی ہے اور اس کے اپنے بچے کا گزارا نہیں ہو پاتا تو پھر کون اسے بچہ رضاعت کے لیے دے گا پھر بھی مکہ کو دوسری عورتوں کے ہمراہ چلی آئی۔ کیا شے اسے کشاں کشاں لائی؟ یہ قدرت کاملہ کی معجز نمائی تھی کہ حلیمہ کے خیال میں انگیخت ہوئی کہ جائے تو سہی' قسمت آزمائے تو سہی' شائد کوئی بچہ مل جائے۔ ادھر ایک بچہ حلیمہ کی قسمت جگانے اور سنوارنے کا منتظر ہے غالب خیال یہی ہے کہ بایں سبب اس بچہ نے کسی دائی کو قبول نہ فرمایا ایسا نہیں کہ دائیوں نے یہ کہہ کر کہ اس گھر سے ملنے کی کوئی امید نہیں' گود میں لینے سے انکار کر دیا، حلیمہؓ کے مقدر کا ستارہ روشن ہوا اور دو جہاں کے مختار ﷺ ان کی آغوش میں آ گئے۔ صاحب سیرت سید الوریٰ (۱۔۱۰۸) لکھتے ہیں کہ چند دنوں کے جگر گوشہ کو ایک دور دراز بسنے والی اجنبی عورت کے حوالے کر دینا اور سالوں تک اس کی جدائی برداشت کرنا ماں باپ کے لیے کتنا کٹھن اور صبر آزما کام ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ محض زبان کو اپنی اصلی اور فطری حالت پر برقرار رکھنے کے لیے اتنی بڑی قربانی دیتے تھے۔'' جی ہاں وہ شخص قوم کا سردار مانا جاتا تھا جو فصیح ہوتا لہٰذا اس ڈگری کے حصول کے لیے جدائی برداشت کرنا عربوں کا معمول بن چکا تھا اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی کچھ کم نہ تھے جن کی بنیاد پر عرب اپنے بچوں کو صحرائی عورتوں کی آغوش میں دے دیتے تھے لیکن ان میں سے زبان کا عنصر نہایت اہمیت کا حامل ہے آج کل بھی لوگ اپنے بچوں کا سمندر پار کے ملکوں میں تعلیم کے حصول کے لیے بھیجتے ہیں' فرق صرف صغیر سنی اور کبیر سنی کا ہے لیکن کم سنی ہو یا کبیر سنی ہر دو صورتوں میں جدائی کا مسئلہ تو موجود ہے۔ اسے تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

عربوں میں یہ رسم مدتوں جاری رہی یہاں تک کہ ولی عہد شہزادہ بہرام گور، کو بچپن میں مدائن کے شاہی دارالخلافہ میں رکھنے کی بجائے اس کی تربیت و پرورش کے لیے حیرہ بھیج دیا تھا۔ (محمد رسول اللہ۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ص ۱۸۹) ولید بن عبدالملک حرم شاہی میں پلا اور صحرائی تربیت سے محروم رہا' اس کا اثر یہ ہوا کہ ولید ہی بنو امیہ خاندان کا ایک فرد تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔ (سیرت النبی۔۱۱۴) یہ جدائی کے لمحات والدین کے لیے ضرور کٹھن اور صبر آزما تھے مگر اسی کا نتیجہ ہے کہ عربوں نے اپنی زبان کو خالص رکھا اور محفوظ بنایا۔ ۱۵۳۵ سال گزر چکے ہیں اس کے باوجود پہلے کی عربی نثر ہو یا شاعری' آج کی شاعری و نثر سے مختلف نہیں ہے۔ چاہے وہ ذخیرہ الفاظ ہوں' گرائمر ہو یا الفاظ کی ساخت و بناوٹ یا صوتی آہنگ ہو۔

معجزہ یا اتفاق: '' مصنف سیرت النبی (اعلان نبوت سے پہلے۔۱۷۹) پر رقم طراز ہیں ابن سعد یحیٰ بن یزید سعدی کہتے ہیں کہ بنو سعد کی دس عورتیں شیر خوار بچوں کی تلاش میں مکہ مکرمہ آئیں۔ سب دائیوں کو بچے مل گئے صرف حلیمہ سعدیہؓ رہ گئیں جو دیر سے مکہ پہنچیں دوسری طرف تمام دائیوں نے سیدہ

آمنہؓ کے دریتیم کو نہ لیا اور یہ نو مولود بچہ بچ گیا۔ایک طرف ایک دایہ اور دوسری طرف ایک بچہ بچ رہا ہے ۔دس عورتیں تھیں اور دس بچے نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔آپ ﷺ کا وہ سخی گھرانہ ہے جس کے در سے کوئی خالی نہیں لوٹتا لہٰذا آپ کے در سے حلیمہ سعدیہؓ کا خالی لوٹنا اللہ تعالیٰ کو گوارہ نہ ہوا اور آپ ﷺ کی شان کے شایاں نہ سمجھا گویا آپ ﷺ حلیمہؓ کے منتظر تھے اور ان کو ایسی رضاعی ماں کا شرف بخشا۔اس طرح سب کی جھولی میں ایک ایک بچہ آیا اور کوئی بھی محروم نہ رہی اسے اتفاق کہیے یا معجزہ!لیکن میرے خیال میں یہ برابر حساب معجزہ سے کم نہیں کہ دائیوں کی تعداد بھی دس اور بچوں کی تعداد بھی دس۔ظہور اسلام سے پہلے لوگ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں کے قعرِ مذلت میں ڈوبے ہوئے تھے گردش ایام کے گزرتے ادوار میں سائنسی تحقیقات نے سربستہ راز ہائے کائنات سے پردہ اٹھایا تب لوگوں کو کئی دیگر معلومات کے علاوہ علت تحریم سے آگاہی اور آشنائی ہوئی۔خون میں یورک ایسڈ ہوتا ہے یہ تیزابی مادہ خطرناک حد تک زہریلا اثر رکھتا ہے خون مختلف قسم کے جراثیم، بیکٹیریا اور زہریلے مادہ کی منتقلی کا باعث بنتا ہے۔گوشت سے جس حد تک خون کا اخراج ہو جائے اتنا ہی وہ صحت کے لیے کارآمد اور مفید ہوتا ہے۔یہ وجہ ہے کہ اسلامی ذبیحہ کا طریقہ بہتر ہے جس سے صحت انسانی مضر اثرات سے بچ پاتی ہے کیونکہ زہریلا مادہ خون کے بہنے سے خارج ہو جاتا ہے اور خون نالیوں میں جم نہیں پاتا۔نیز یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ غذاؤں کا انسانی جسم اور انسانی اخلاق پر گہرا اثر پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے بچے کو احمق اور فاحشہ عورتوں سے دودھ نہ پلواؤ کیونکہ دودھ بچے کے جسم اور اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس رہنما اصول اور عالی شان فرمان کے تحت علماء کرام کہتے ہیں کہ جیسے منشیات کے عادی ایڈز اور ٹی بی جیسے موذی امراض کے مریض کا خون کسی دوسرے مریض کو منتقل نہیں کیا جاتا اسی طرح انتقال خون کرتے ہوئے حتی المقدور فاسق وفاجر کے خون سے پرہیز لازم ہے۔(۲) حلیمہ سعدیہؓ کی گود کو کسی اور بچے سے محفوظ رکھا' میں اسے اتفاق نہیں کہتا بلکہ یہ منشاء خداوندی تھا اور اپنے محبوب کے لیے حلیمہ سعدیہؓ کی آغوش کا انتخاب فرمایا:امام سہیلی لکھتے ہیں کہ سیدہ حلمیہؓ اپنے قبیلے میں عالی حوصلہ مند اور صاحب کرم مانی جاتی تھیں ان کی بلندی فطرت کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں اپنے رسول ﷺ کی رضاعت کے لیے اس طرح منتخب فرمایا جس طرح آپ ﷺ کی ولدات کے لیے شریف ترین اصلاب اور پاکیزہ ترین ارحام کو منتخب فرمایا تھا اور دودھ پلانا بھی نسب ہی کا حکم رکھتا ہے کیونکہ یہ طبائع میں تبدیلی پیدا کرنے کا موجب ہے ۔آخر وہ پھر پھرا کر اسی در پر لوٹ آتی ہے جس در سے کبھی کوئی منگتا خالی نہیں جاتا۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

اعتراض نمبر ۴۵

اتفاق سے ان (حلیمہ سعدیہؓ) کو کوئی بچہ ہاتھ نہ آیا' آنحضرت ﷺ کی والدہؓ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی لیکن خالی ہاتھ بھی نہیں جا سکتی تھی اس لیے سیدہ آمنہؓ کی درخواست قبول کر لی۔ (سیرت النبی۔ا۔۱۱۵)

بعض سیرت نگار کہتے ہیں کہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ آنحضرت ﷺ کو اس لیے دودھ پلانے کے لیے نہیں لے جانا چاہتی تھی کہ یہاں سے مجھے کیا ملے گا۔ (سیرت اعلان نبوت سے پہلے۔ص ۲۸۶)

جواب: اس میں شک نہیں کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا آپ ان کی وفات کے بعد پیدا ہوئے لیکن آنحضرت ﷺ کے کفیل مشفق دادا جان جو قریش کے سردار تھے' زندہ تھے اور آپ ﷺ کے کفیل تھے۔ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کی دادی حضرت فاطمہ بنت عمرو سے نکاح کیا تو بڑی کوہان والی ایک سو ناقہ اور دس اوقیہ سونا مہر میں دیا۔ (اوقیہ۔ ایک سو تولہ بنتا ہے)۔ کوئی اسے پہلے کا واقعہ کہے تو قریب کی بات یہ ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو اپنی منت پورا کرنے کے لیے قربان کرنا چاہا تو خاندان آڑے آیا اور عبداللہ کو قربان کرنے میں دخیل ہوئے۔ کرتے کراتے سو اونٹوں کے فدیہ پر قرعہ نکلا' آپ نے سو اونٹ خدا کے نام پر قربان کیے۔ آپ کی ولادت کے پچاس یا پچپن روز پہلے ابرہہ نے کعبہ کو ڈھانے کی غرض سے مکہ پر لشکر کشی کی۔ اسود بن مقصود حبشی ان چوپایوں کو ہنکا کر لے گیا جو میدان تہامہ میں چر رہے تھے ان میں حضرت عبدالمطلب کے ایک سو اور بعض روایات میں دو سو اونٹ تھے اور بعض کتب میں چار سو اونٹ کا ذکر بھی ملتا ہے اگر سو اونٹ ہی ہوں تو آپ کی امارت کا منہ بولتا ثبوت ہے اس کی دلیل یہ دی جا سکتی ہے کہ ہجرت کے موقع پر آنحضرت ﷺ کی تلاش میں سو اونٹوں کا انعام مقرر کیا گیا تھا اور یہ انعام قریش نے مل کر مقرر کر رکھا تھا جب کہ دوسری طرف فرد واحد آپ کے دادا جان کے پاس کئی سو اونٹ تھے آپ کی گم شدگی ہوئی تو جب مل گئے تو پھر آپ کے دادا نے ایک ہزار ناقہ اور ایک سو رطل تصدق کیا یتیم بچے کو باقی اناؤں نے نہ لیا اور حلیمہ بھی یتیم بچے کو لینے کے لیے تیار نہ تھی کہ ایسے بچے کی رضاعت سے کیا ملے گا؟ یہ سب یار لوگوں کی رنگین بیانیاں اور وضع کردہ کہانیاں ہیں آپ کا دادا کفیل ہو اور اتنا امیر ہو تو پھر بھلا کوئی دائی اس بچے کو آغوش میں لینے کو تیار نہ ہو کیوں؟ نیز اس بے بنیاد الزام کی قلعی اس مکالمہ سے کھل جاتی ہے جو سیدہ آمنہؓ اور حلیمہ سعدیہؓ کے درمیان ہوا۔

سیدہ آمنہؓ: یہ ٹھیک ہے بچے کی شرافت و نجابت میں کوئی شبہ نہیں لیکن شائد تم نے سن لیا ہو محمد ﷺ یتیم پیدا ہوئے ہیں۔

حلیمہ سعدیہ: میں سن چکی ہوں شہر بھر میں اس کا چرچا ہے کہ محمد ﷺ یتیم پیدا ہوئے ہیں لیکن ان

کے دادا جان قریش کے سرداراوران کے چچا مکہ کے امیر ترین شخص ہیں اور میں نے لونڈی کی خبر سن لی ہے جو ننھے بچے کی ولادت کی خوشی میں ان کے چچا ابولہب نے آزاد کر دی ہے۔

سیدہ آمنہؓ: تم نے غلط نہیں سنا سردار عبدالمطلب کو اپنے پوتے سے بڑی محبت ہے اوران کے بیٹے حارث نے بھی میری دل جوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔سب ہی مہربان ہیں سب نے میرا غم بانٹا ہے لیکن سعدیہ میں چاہتی ہوں کہ میرا بچہ اپنی زندگی کا پہلا قدم صرف اپنے باپ کے سہارے پر اٹھائے جب کہ اس کا باپ اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔حلیمہ کی آنکھیں کھل گئیں اور یہ کہ یتیم بچے کی رضاعت سے کچھ نہ ملے گا لیکن معاملہ اس کے الٹ پایا۔دادا جان نے اپنے پوتے کی دایہ کو بہت کچھ دیا۔ ان کے چچا نے درہم دیئے اور سیدہ آمنہؓ نے بہترین پارچات کے جوڑے عطا کیے حتیٰ کہ اپنی انگوٹھی بھی اپنے پیارے لختِ جگر کے صدقے میں سعدیہؓ کو بخش دی۔اتنے انعام واکرام سے حلیمہ سعدیہؓ حیران رہ گئی کہ سوچتی کچھ تھی دیکھا کچھ اور ہے۔سنا کچھ اور تھا، ہوا کچھ اور ہے۔

تمام کھوکھلی باتوں سے اٹھ گیا پردہ
ذرا سی دیر لگی آئینہ دکھانے میں

ذرا آپ کے والد ماجد کے ورثہ کا ذکر بھی ہو جائے تا کہ مفلوک الحالی اور غربت (جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے) کا علم ہو جائے۔

(۱) مکان : یہ محلّہ زقاق المولد میں واقع تھا۔شعب بنی ہاشم میں تھا اس مکان میں آپ کی ولادت مبارک ہوئی یہ مکہ میں سرائے ابو یوسف کے نام سے مشہور تھا۔جب آنحضرت ﷺ بنی سعد سے واپس آئے تو اسی مکان میں اپنی والدہ ماجدہؓ کے ہمراہ رہنے لگے۔

(۲) ترکہ میں چاندی اور تلوار کا ذکر بھی ملتا ہے۔

(۳) ایک دوکان خیاطی کی تھی جس میں کپڑا بکتا اور سلتا تھا۔

(۴) آپ ﷺ کے والد ماجد تجارتی سامان لے گئے واپسی پر بیمار ہوئے اور وفات پائی اور ابواء کے مقام پر دفن ہوئے اس سامان میں نقد وجنس وغیرہ چھوڑی۔

(۵) حضرت عبداللہؓ نے ترکہ میں پانچ اونٹ، بکریوں کا ریوڑ اور برکہ یعنی حضرت ام ایمن بطور کنیز چھوڑا تھا۔بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ شقران عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے غلام تھے آپ نے ان سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔اسی سلسلے میں ابن شیبہ لکھتے ہیں کہ مجھ سے زید بن اخزم نے کہا کہ انہوں نے عبداللہ بن داؤد سے سنا تھا کہ شقران آنحضرت ﷺ کو اپنے والد ماجد کی میراث میں ملے تھے۔(سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔۲۹۰) حضرت عبداللہ کی وفات کے بعد سیدہ آمنہؓ نے مرثیہ لکھا

جس کے ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے ''اب اگر چہ انہیں موت اور حوادث نے ہم سے چھین لیا ہے تاہم زندگی بھر وہ بے حد سخی اور انتہائی رحمدل تھے اس سے آپ کی مالی حالت کا پتہ چلتا ہے اور آپ کے والد کی عسرت کے متعلق بتائی جانے والی کہانیاں درست نہیں ہیں۔

مختصر یہ کہ ابراہیم سیالکوٹی امام سہیلی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ بنی سعد کی شریف اور اپنی قوم کی باعزت خواتین میں سے تھیں حضرت حلیمہؓ کی ذاتی خصوصیات بہت سی تھیں مثلاً غریب ہونے کے باوجود ان میں حرص و طمع نہ تھا اور قناعت پسند اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔'' ایسی صفات کی حامل خاتون سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ انہوں نے کہا ہو کہ یہاں سے مجھے کیا ملے گا اس لیے دودھ پلائی کے لیے لے جانا نہیں چاہتی تھیں۔ نیز مکہ کے قریب قبیلہ ہوازن کے لوگ آباد تھے تو کیا انہوں نے ہاشمی گھرانے کی امارت کی شہرت نہیں سن رکھی تھی؟ ان کی مہمان نوازی کے چرچے نہیں سنے تھے؟ ان کے روم و غسان کے شہزادوں سے تعلق تھے اور ان کے ساتھ تجارتی معاہدے کیے تھے جس سے ان کے مال تجارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تا تھا، سے بے خبر تھے؟ نیز خانہ خدا کے متولی ہونے کے سبب پورے عرب میں ان کی عزت کی جاتی تھی بڑے نازک مواقع پر ان کے مشوروں پر عمل کیا جاتا تھا جیسے ابرہہ کی مکہ پر لشکر کشی کے وقت آپ کے دادا جان نے اہل مکہ سے کہا کہ پہاڑوں پر چڑھ جائیں اور ابرہہ سے لڑنا نہیں چاہیے تو اہل مکہ نے من وعن اس بات کو تسلیم کیا' تو کیا اس قبیلہ کے لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے بعد ساتویں روز اہل مکہ کو بلا کر دعوت دی تو کیا اس کی خبر نہ ہوئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ دودھ پلانے کے لیے بچوں کو لینے والی خواتین میں سے کوئی خالی ہاتھ نہ جائے۔ قدرت خدا کی دیکھئے! کہ حلیمہ سعدؓیہ کو کوئی بچہ نہ ملا صرف حضور ہی بچ گئے بلکہ ایک روایت میں ہے کہ حلیمہ سعدؓیہ کو کسی نے بچہ اس کے دودھ کی کمی کی وجہ سے دینا گوارا نہ کیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ باقی دائیوں نے کہا ہو کہ یتیم بچے کے گھر سے کیا ملے گا؟ یہاں سے ہمیں کیا ملے گا؟ آپ کو لینے کے لیے تیار نہ ہوئیں جبکہ یہ بات نہیں ایک دائی جس کا نام حلیمہ ہے اسے کسی نے بچہ نہ دیا تو اب اس محروم دائی کی محرومی دور کرنے کے لیے اور خالی ہاتھ نہ لوٹنے کی وجہ سے آپ ﷺ بچ رہے اور باقی دائیوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہلوا دیا تا کہ وہ سخی جس کے آباؤ اجداد کے دروازہ سے کوئی سائل خالی نہیں لوٹتا' کیسے ہو سکتا ہے کہ حلیمہ سعدیہؓ آغوش میں بچہ لیے بغیر گھر چلی جاتی۔ یہی آپ کی رحمت اللعالمینی کا تقاضا ہے کہ آپ کے شہر سے کوئی بھی دایہ خالی نہ لوٹی یہ اعجاز بھی دیکھیے کہ دودھ کی کمی رحمت کی زیادتی کا باعث بن گئی اور سعدیہ کی قسمت کا ستارا ثریا سے زیادہ بلند اور چاند سے زیادہ روشن ہو گیا۔

میرا محبوب نبیؐ ایسا کشادہ دل ہے
ذرّہ مانگے جو اسے شمس و قمر دیتا ہے

حلیمہؓ فرماتی ہیں کہ شیر خوار بچوں کے لیے مکہ آنے والی عورتوں میں سوائے میرے ہر ایک نے محمد ﷺ کو لینے سے انکار کر دیا کہ آپ ﷺ کے والد فوت ہو چکے ہیں اور آپ ﷺ یتیم ہیں۔ صحرائی پرندوں اور وحشی جانوروں میں رضاعت کی ذمہ داری سنبھالنے کی بات ہو رہی تھی کہ غیب سے یہ ندا آئی' اے جمیع مخلوقات! اللہ تعالیٰ نے اپنی سابق حکمت قدیمہ میں یہ لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ کا نبی حلیمہ حلیم کا شیر خوار ہو'' (سیرت محمدیہ ترجمہ مواہب لدنیہ۔ ج ۱۔۱۰۳) ایک بدیہی ثبوت ہے کہ حق تعالیٰ نے اسے اپنے رسول کی رضاعت کے لیے اس طرح منتخب فرمایا تھا جس طرح آپ ﷺ کی ولادت کے شریف ترین اصلاب اور پاکیزہ ترین ارحام کو منتخب فرمایا تھا۔ (خاتم النبین۔ص ۱۲۶)

اعتراض نمبر ۴۶

the fact that muhammad was a posthumous child may of course have been part of reason for sending to a wet nurse (watt)

ترجمہ: ''یہ حقیقت ہے کہ محمد ﷺ یتیم پیدا ہوئے آپ کو مرضعہ کے سپرد کرنے کے مختلف اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے۔ (واٹ)

جواب: یہ درست ہے کہ آپ ﷺ اپنے باپ کے انتقال کے بعد یتیم پیدا ہوئے۔ عرب کے دستور کے مطابق اس دریتیم کو حلیمہ سعدیہؓ نامی دایہ کے سپرد کیا گیا۔ عرب کے دستور اور رسم و رواج کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے''واٹ'' نے یہ الزام لگایا کہ مرضعہ کے سپرد کرنا بچے کی یتیمی اور غربت کا سبب تھا حالانکہ غریب لوگ مرضعات کی اجرت ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنے بچوں کو ان کے سپرد نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہی لوگ اپنے بچوں کو رضاعی ماؤں کے حوالے کرتے تھے جو رضاعت کے اخراجات کو برداشت کرنے کی استطاعت رکھتے تھے اور رضاعی مائیں بھی ان بچوں کو گودی لینے میں ترجیح دیتی تھیں جن کے خاندان سے کافی داد و دہش کی توقع ہوتی تھی اگر یتیمی اور خراب مالی و معاشی حالات کے سبب بچہ دایہ کے سپرد کیا جاتا تھا تو اس دشواری سے بچنے کے لیے بچے کو اس کا خاندان اپنے ہاں رکھ کر پرورش اچھے طریقے سے کرسکتا تھا۔ اگر وہ خاندان اپنے بچے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا تو دایہ کی اجرت کو کیسے ادا کرسکتا تھا جب کہ اجرت دایہ کی ادا نہ کر سکنے کی صورت میں خود خاندان بچے کی پرورش بخوبی کرسکتا ہے یا کیا مرضعہ اجرت کے بغیر دودھ پلاتی تھی؟ ایسا بھی نہیں ہے جب کہ وہ تو اپنی کمزور مالی و معاشی حالت کو سنبھالا دینے کے لیے دودھ پلاتی تھی کیا اس مستشرق کو آپ کی یتیمی تو نظر آئی مگر دریتیم کے کفیل' قریش کے سردار اور رئیس خواجہ عبدالمطلب کی امارت کی بھنک کانوں میں نہ پڑی جس نے عقیقہ پر اونٹ ذبح کر

کے قریش کی ضیافت کی ۔ یہ وہی کفیل ہیں جس نے آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کی وفات کے بعد کفالت کا ذمہ لیا تھا تو کیا وہ رضاعت کی اجرت ادا کرنے سے قاصر تھا؟ وہ مہربان دادا جو آپ کے پل پل کی خبر رکھتے اور اس کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے' ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا سب کچھ ہو اور کفیل بھی آپ ہوں تو کیسے مان لیں کہ یتیمی کی وجہ سے مرضعہ کے سپرد کیا تھا یہ واٹ کی خام خیالی' دیوانے کا خواب اور مجذوب کی بڑ ہے۔

اعتراض نمبر ۴۷

قبیلہ ابو ذوئیب کی ایک عورت دودھ پلائے گی' اس کے شوہر کا نام حارث ہوگا' سیدہ آمنہؓ کو خواب میں بتا دیا تھا جب وہ بچے کو لے کر چلی تو دفعتاً اس کی اونٹنی اور خود حلیمہؓ کے دودھ میں اضافہ ہو گیا تھا اس کا سفید گدھا تیز رفتار ہو گیا' اس کے مویشی فربہ ہو گئے اور کثرت سے دودھ دینے لگے یہ باتیں بجز حلیمہؓ سعدیہ کے کسی اور کا بیان نہیں' اس لیے یہ معتبر روایتیں نہیں ہیں۔

جواب: ایسے واقعات کا وقوع ناممکن نہیں۔ کتاب پیدائش میں ہے ''لابان نے اس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھہر جا کیونکہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے۔ یہ بھی کتاب پیدائش باب ۳۰' آیت ۳۰ میں ہے ''یعقوبؑ نے کہا کہ میرے پاس تیرے آنے سے پہلے بہت تھوڑا سا پانی تھا اور اب وہ کثیر ہو گیا ہے اور جب سے میں آیا ہوں اللہ نے تجھ کو برکت دی ہے' اسی طرح کتاب پیدائش باب ۳۰ ورس ۳۶۔۴۲ کے مضمون میں ہے کہ لابان کے مویشی کو حضرت یعقوبؑ کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو اگر حلیمہؓ کے مویشیوں میں برکت دی پھر اس کے اپنے دودھ میں اور مویشیوں کے دودھ میں اللہ تعالیٰ نے برکت دے دی تو کونسی انہونی بات ہو گئی۔ (۲) برگزیدہ ہستیوں کو سچے خواب آتے ہیں' ان خوابوں کی حقیقت وہی نکلتی ہے جیسے خواب میں دیکھا ہوتا ہے۔ آپ نے سعدیہ اور اس خاوند کے متعلق بتا دیا یہ اس رویا صادق کی وجہ سے تھا اس میں بھی کوئی غیر یقینی کیفیت نہیں ہے۔ یہ الزام بھی تعجب خیز ہے کہ سوائے حلیمہ کے ان باتوں کا کسی کو علم نہ تھا۔ یہ بھی درست نہیں کیونکہ بنو سعد کی دائیوں کا واپسی پر پوچھنا کہ یہ وہی سواری ہے تو حلیمہؓ نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ یہ سب کچھ اس سوار کی برکت سے ہے۔ حلیمہ کو ان کے شوہر کو پھر قحط میں ان کے مویشیوں کی بہتر حالت سے پورے قبیلہ کو پتہ چل گیا تھا۔ ہاں سب جان گئے تھے بلکہ رضاعی ماں نے آپ کی آمد سے برکت کا مژدہ سب کو سنا دیا یہاں تک کہ حلیمہؓ کے مویشیوں کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اپنے مویشیوں کو اسی جگہ بھیجتے تھے جہاں حلیمہؓ کے مویشی چرتے تھے (خطبات احمدیہ۔۴۴۰) حلیمہؓ کے مویشی لوٹتے تو سیر ہو کر آتے جبکہ دوسروں کے حسب سابق بھوکے واپس آتے کیا اس بات کی دھوم پورے قبیلہ میں نہیں تھی

؟سب قبیلہ والے جان گئے تھے کہ یہ ساری برکتیں اس نومولود کے دم قدم سے ہیں۔

رزق یوں قاسمِ اشیاء کے کرم سے پایا
مجھ کو کھنچنا نہ پڑا خون پسینے کے لیے
(عباس تابش)

اعتراض نمبر ۴۸

منٹگمری واٹ کہتا ہے کہ بچوں کو مرضعات کے حوالے کرنے کے عمل پر معاشرہ کے بعض حلقوں کی طرف سے تنقید بھی کی جاتی تھی اور سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۳۳ کے ایک ٹکڑا کو دلیل بناتا ہے اور کہتا ہے کہ آیت کا یہ حصہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر تم اپنے بچوں کو مرضعہ کے حوالے کرنا چاہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ''لا جناح علیکم'' سے اشارہ ملتا ہے کہ بعض حلقوں کی طرف سے رضاعت کے عمل پر تنقید کی جاتی تھی اور محمد ﷺ کو اس بات کا احساس تھا۔اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

Apart of the verse mentioned (2.233) asserts that if you want to give your children out to the nurse (la junaha alaykum) and this suggests that the practice have been exercise in some quarters and that muhammad may have been sensitive about it .

جواب:عربوں میں رضاعت کی رسم قدیم زمانہ سے چلی آرہی تھی عرب کے معزز گھرانے اپنے بچوں کو رضاعت کے لیے دیہاتی قبائل کی دائیوں کے پاس بھیج دیتے تھے جس کے مختلف اسباب تھے جو پیچھے ذکر کیے گئے ہیں ۔ چونکہ اسلام سے قبل رضاعت کی رسم جاری تھی اسلام کے ظہور سے یہ مسئلہ سامنے آیا کہ زمانہ جاہلیت سے جاری رسم کو جائز قرار دے کر جاری رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے اس پر بحث وتنقید ہوتی ہو گی اور اس بحث وتنقید میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ زمانہ قبل از اسلام کی کسی رسم کو برقرار رکھنے یا رد کرنے کے لیے بحث ہونی چاہیے تھی اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اسلام نے اس کے متعلق دوٹوک فیصلہ دے دیا تاکہ کوئی شبہ نہ رہے۔قرآن مجید میں ہے۔''وان اردتم ان تسترضعوآ اولادکم فلا جناح علیکم اذا سلمتم ما اتیتم بالمعروف'' (ترجمہ)''اگر تم چاہو کہ دودھ پلواو (دایہ) سے اپنی اولاد کو پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے۔''

اب ''واٹ'' کے علمی تبحر کی حد ہے کہ اس نے غور نہیں کیا کہ جس آیت سے استدلال کر رہا ہے اسی میں اس کے اعتراض کا رد موجود ہے۔اس آیت مبارکہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ رضاعت میں کوئی

گناہ نہیں ہے تو مستشرق کو الزام لگانے کا کوئی حق نہیں اس کے باوجود الزام دھرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا اگر ایمان نہیں رکھتا تو قرآن کریم کی آیات سے استدلال کا جواز نہیں بنتا کیونکہ اپنے مفاد کی خاطر استدلال تو قرآن کریم سے کرے مگر اس کا رد اگر قرآن سے بتایا جائے تو نہ مانے یہ ہٹ دھرمی تعصب اور دوغلا پالیسی ہے جو ایک غیر جانب دار مورخ کو زیب نہیں دیتی اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ محض مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی سوچی سمجھی سازش ہے اور ادھر اُدھر کی بے دلیل باتیں ہیں شائد وہ سمجھتا ہے کہ ادھر اُدھر کی باتیں کر کے مسلمانوں کو پھسلا دوں گا لیکن تو جانتا نہیں مرے مالک مکان کو۔۔۔اے دوست! کوئی چیز ادھر کی اُدھر نہ ہو

اعتراض نمبر ۴۹

عربوں کے نزدیک یہ فعل (رضاعت کا) ناپسندیدہ تھا یہ ایک مجبوری تھی (واٹ)۔

۲۔بعض کہتے ہیں کہ مرضعات دودھ پلائی کا معاوضہ نہیں لیتی تھیں' اس اجرت کو عار سمجھتی تھیں۔ مختلف قباء؛ کی خواتین خاص خاص موسموں میں آیا کرتی تھیں تا کہ متمول لوگوں کے بچوں کو لے جائیں ان کو دودھ پلائیں اور جب مدت رضاعت ختم ہو تو ان کے والدین انہیں گراں قدر عطیات وانعامات دے کر شاد کام کریں وہ اس وقت بھی مقررہ اجرت پر دودھ پلانا عار سمجھتی تھیں ان کے ہاں مقولہ تھا ''الحرہ لاتاکل من ثریھا'' (آزاد عورت اپنے پستانوں کے ذریعے نہیں کماتی) نبی اکرم کا گھرانہ۔۳۷۵

امام سہلی بھی کہتے ہیں کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام خیال نہیں کیا جاتا تھا اس بناء پر عرب میں مثل ہے ''الحرۃ لاتاکل ثریھا'' اس بناء پر امام سہلی نے اس کی یہ توجیح کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا اور مجبوراً حضرت حلیمہؓ اور ان کے قبیلہ میں یہ خدمت گوارا کی تھی۔

جواب: ''واٹ'' کا اس فعل کو مجبوری سے تعبیر کرنے کا اشارہ غربت کی طرف ہے یعنی یہ مستشرق ثابت کرنا چاہتا ہے کہ غربت کی مجبوری آڑے تھی جس وجہ سے عرب اپنے بچوں کو مرضعات کے سپرد کرتے تھے عقل پر جھاڑو پھر جائے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا اسے یہ خبر نہیں کہ خواہ بچہ غریب خاندان ہی کا کیوں نہ ہو اور اس کی ماں زندہ ہو وہ کبھی اور کسی صورت میں بھی یا بوجہ غربت وغیرہ رضاعی ماں کے سپرد نہیں کرتی وہ اپنے لعل کو اپنے سینے سے لگا کر بلائیں لیتی ہے اسے پال پوس کر اپنی ذمہ داری نبھاتی ہے۔اگر غربت کے سبب بچے کو دایہ کے سپرد کیا جائے تو دایہ کو دودھ پلائی کی بھی اجرت ادا کرنا پڑتی ہے جس سے غریب خاندان کی غربت بجائے کم ہونے کے رضاعت کے اضافی خرچہ سے بڑھتی ہے نہ جانے واٹ کو اس عہد کی روایات سے خوف اور چڑ کیوں ہے؟ اور آپ کے متعلق یہ رائے قائم کرنا سرے سے غلط ہے کیونکہ آپ ﷺ کی امارت بدیہی ثبوت ہے نیز اس دور کے رسم ورواج کے مطابق

دیگر امراء کے بچوں کی طرح آپ کو بھی دیہاتی مرضعہ کے حوالے کیا گیا۔ واٹ کہیں ایسا تو نہیں سمجھ بیٹھا کہ مرضعہ کے سپرد کرنے سے اس خاندان کی غربت ختم ہو سکے گی کیونکہ دایہ نہ صرف بچے کی رضاعت کا بوجھ اٹھائے گی بلکہ بچے کے خاندان کی مالی اعانت کر کے ان کی مفلوک الحالی دور کرے گی عقل کے اندھو! وہ مرضعہ تو رضاعت پر اجرت لیتی ہے' انعام واکرام وصول کرتی ہے اسے کیا پڑی کہ بجائے لینے کی دینے پڑ جائیں' پر عمل کرے قبل از اسلام کہیں کوئی اس فعل کو ناپسند کرتا ہو تو اس کی بلا سے لیکن دین اسلام نے رضاعت کے عمل کی اجازت دے کر اس نظریہ کو ہمیشہ کے لیے خاک بوس کر دیا۔ عربوں کے نزدیک یہ فعل ناپسندیدہ ہوتا تو کبھی دیہاتی عورتیں ہر سال مکہ مکرمہ نہ آتیں اور نہ ہی عرب اپنے بچوں کو مرضعات کے حوالے کرتے بلکہ یہاں تو معاملہ بھی الٹ ہے کہ عرب تو انہیں اجرت کے علاوہ انعام و اکرام بھی دیتے تھے اب آپ خود فیصلہ کر لیں۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

۲: اوپر کی عبارت میں مختلف قبائل کی خواتین خاص خاص موسموں میں مکہ آیا کرتی تھیں اور امام سہیلیؒ کہتے ہیں کہ اس سال قحط پڑا جس کی مجبوری تھی اور قبیلہ کی عورتوں نے یہ خدمت گوارا کر لی یہ بیان ایک دوسرے کی ضد ہیں نیز تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ مکہ میں ہر سال صحرائی عورتیں رضاعت کے لیے آیا کرتی تھیں۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا بلکہ یہ خیال اہل شہر کے امرا کے ساتھ مخصوص تھا۔ جیسے لونڈیوں سے دودھ پلانے کو ناپسند خیال کیا جاتا تھا اسی طرح امرا بھی دودھ پلائی کو عیب سمجھتے ہوں اور یہ مقولہ ان کے غرور و تکبر کا آئینہ دار ہو اور عہد جاہلیت کی باقیات میں سے ہو جس کو اسلام نے رد کر دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرف مکرر کی طرح مٹا دیا۔ ارشاد ربانی ہے" و ان ارد تم ان تستر ضعوا اولاد کم فلاح جناح علیکم ازا سلمتم مآ اتیتم بالمعروف " (البقرہ ۲۳۳، پارہ۲) ترجمہ: اگر تم چاہو کہ دودھ پلواو (دایہ سے) اپنی اولاد کو پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر و جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے۔"

جہاں تک مقررہ اجرت پر دودھ پلانے کو عار سمجھا جاتا تھا جس کا رد قرآن پاک نے کر دیا اور اس کی وضاحت بھی قرآن کریم کی مذکور آیت میں ہے۔ "جب کہ تم ادا کرو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقے سے۔" دودھ پلائی کو عار سمجھنے کا نظریہ پیوند خاک ہو گیا۔ زمانہ جاہلیت میں اگر عورتیں اجرت کی بجائے عطیات اور انعامات وصول کرتی تھیں اور مقررہ و متعین اجرت نہیں لیتی تھیں تو قابل غور بات یہ ہے کہ ایک تو قرآن کریم کی آیت کے خلاف ہے دوسرا یہ کہ اگر مرضعات بچوں کو دودھ پلائی کے لیے نہ

لے جاتیں تو کیا بچوں کے والدین انہیں انعام واکرام سے نوازتے ؟ ہرگز نہیں! مذکور عبارت سے ثابت ہے کہ خواتین ۔۔ متمول لوگوں کے بچوں کو لے جاتیں اوران کو دودھ پلاتیں اور جب مدت رضاعت ختم ہوتی تو ان کے والدین کے ہاں لے آتیں وہ انہیں گراں قدر انعامات دے کر شاد کام کرتے گویا رضاعت کے بدلے میں انعامات ملتے تھے۔ وہ انہی انعامات کی خاطر بچوں کی رضاعت کا بیڑا اٹھاتی تھیں گویا یہ انعامات بھی اجرت کی ایک شکل ہیں۔ مثلاً کوئی حکومت کسی کو ٹیکس وصول کرنے پر لگا دے اور ٹیکس وصولی کے افسر کو ٹیکس کے ساتھ لوگ تحفے بھی دیں تو یہ تحائف اس افسر کے نہیں ہیں بلکہ وہ بھی حکومت کی ملکیت ہیں ٹیکس افسر کو مقرر کرنے کے بغیر ملتے تو تحائف جائز تھے اوراس کے وہ اپنے تھے لیکن یہ تو ٹیکس کی وصولی کی صورت میں مل رہے ہیں جو کہ جائز نہیں اسی طرح انعامات دودھ پلائی کے بغیر ملتے تو اجرت نہ کہتے جبکہ یہ دودھ پلائی کا معاوضہ ہے البتہ اگر اجرت کے ساتھ تحفے تحائف اور انعامات والدین دے دیتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ انہوں نے اجرت بھی دی اوراس کے علاوہ اپنے لخت جگر کی خوشی میں تحفے بھی دیئے، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ خواتین گراں قدر عطیات بھی قبول نہ کرتیں اور بچوں کو خوشی خوشی اور برضا ورغبت بغیر اجرت کے دودھ پلاتیں جبکہ ایسا نہیں ہے لہٰذا رضاعت کے بدلے میں عطیات ہاتھ لگے تو عطیات بدلہ ہیں رضاعت کی اجرت کا اس طرح سے عطیات اور اجرت لینے میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔؟ اگر اجرت کے علاوہ والدین بخوشی اپنے لاڈلے کی خاطر تحائف دے دیتے ہیں تو یہ احسن اقدام ہے۔

اعتراض نمبر ۵۰

بعض علماء کا کہنا ہے کہ دنیا کی کسی تاریخ میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ کسی نبی کو اس کی ماں کے علاوہ دودھ کسی اور نے پلایا ہو۔ حضرت نوحؑ سے عیسیٰؑ تک کے حالات دیکھ لیں تو ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی جس سے آنحضرت ﷺ کو حلیمہ سعدیہؓ کے دودھ پلانے کی تائید کے طور پر پیش کیا جا سکے اور ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے مشیت ایزدی کو اس امر پر اصرار تھا کہ وہ نبی کو اس کی ماں ہی کا دودھ پلائے۔۔ حضرت موسیٰؑ کو نہایت کٹھن حالات میں بھی اپنی ماں کا دودھ پلایا گیا تو سابق انبیاء کے طریقے سے ہٹ کر آنحضرت ﷺ کو ان کی اپنی ماں کے علاوہ دوسری ماؤں کا دودھ پلوایا گیا' یہ کیونکر تسلیم کیا جائے؟ خصوصاً اس صورت میں کہ مفردات امام راغب میں یہ روایت موجود ہے کہ دودھ پینے سے وہ رشتہ ناجائز ہو جاتا ہے جو نسب سے جائز ہوتا ہے ایسی صورت میں جبکہ ماں موجود تھی' صحت مند تھی اور رضاعت کے بعد تک زندہ رہیں تو یہی بات حقیقت کے قریب ہے کہ حضرت آمنہؓ نے دودھ پلایا اور ثویبہ وحلیمہؓ نے آنحضرت ﷺ کی پرورش کی' اس نقطہ نظر کے حامی علماء اپنے موقف کی تائید میں بیسویں پارے کے چوتھے رکوع

کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝ (القصص ۱۲ پارہ ۲۰)

جب قرآن پاک سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ان کی اپنی ماں کے علاوہ کسی کے بھی دودھ پلانے سے بچانے کا اتنا اہتمام کیا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس ہستی کا موسیٰ بھی رشک کریں انہیں بعض ایسی عورتیں مثلاً ثویبہ دودھ پلائیں جن کا اسلام بھی واضح نہیں"۔ (نبی اکرم کا گھرانہ۔۳۸۵۔۳۸۴)

جواب: یہ ضروری نہیں کہ ایک پیغمبر کے لیے اتنا اہتمام ہو کہ غیر عورت سے دودھ نہ پلوایا جائے اور یہ سب پیغمبروں کے لیے قانون بن جائے۔ اس کا انحصار مشیت ایزدی اور قدرت کی کاری گری پر ہے مثلاً حضرت آدمؑ کو بن ماں باپ پیدا فرمایا' حضرت عیسیٰؑ کو بن باپ کے پیدا فرمایا اور باقی مخلوق کو مرد و زن کے جوڑے سے پیدا فرمایا تو یہ کہا جائے کہ آدمؑ بن ماں باپ اور عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تو دوسرے پیغمبروں کے لیے ایسا اہتمام کیوں نہ کیا گیا؟ نہیں نہیں' اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے وہ ان اللہ علی کل شی قدیر ہے۔ علماء کرام اور عام آدمی بھی اس بات سے باخبر ہے کہ آگ کا کام جلانا ہے اور جو شے اس کی زد میں آجائے جلا کے راکھ کر ڈالتی ہے اس کا کام ٹھنڈک پہنچانا یا گلزار ہو جانا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے نار گلزار بن گئی۔ ارشاد ربانی ہے "قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ"۔ جب آتش نمرود پیغمبر پر گلزار بن گئی ٹھنڈک اور سلامتی والی بن گئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ خالق حقیقی جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے یہ مالک حقیقی کی مرضی ومنشاء ہے کہ وہ اپنے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو اپنی والدہ سے دودھ پلوائے اور اپنے حبیب ﷺ کو اپنی والدہ کے علاوہ دوسری عورتوں کا دودھ پلوائے۔

(۲) دودھ پینے سے وہ رشتہ ناجائز ہو جاتا ہے جو نسب سے جائز ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حرمت کی تین قسمیں ہیں اول حرمت نسب دوم حرمت رضاعت سوم حرمت مصاہرت۔ اول حرمت نسب میں جن عورتوں سے نکاح حرام ہے وہ یہ ہیں

(۱) ماں (اس میں دادی' نانی اور اس کے اوپر کے سب شامل ہیں) (۲) بیٹی: (اس کی پوتی' نواسی اور اس کے نیچے تک سب داخل ہیں)

(۳): بہن (سگی دو بہنیں یا سوتیلی) (۴): پھوپھی (۵) خالہ (۶) بھتیجی (۷) بھانجی وغیرہ۔

دوم: حرمت رضاعت جو رضاعت کے سبب رشتے حرام ہیں وہ سارے رشتے رضاعت سے حرام ہیں جو نسب سے حرام ہیں۔ ارشاد نبوی ہے "یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب"

سوم: حرمت مصاہرت: حرمت مصاہرت سے بعض رشتے ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جن کے ساتھ اس وقت تک نکاح حرام ہے جب تک بیوی نکاح میں ہے۔

پہلی قسم: بیوی کی ماں یعنی ساس دوم اس بیوی کی بیٹی (بیوی جس سے صحبت ہو چکی ہو) اگر صحبت سے پہلے بیوی کو طلاق دے دے تو اس کی بیٹی سے نکاح جائز ہے اور بیٹوں کی بیویاں ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہیں۔ یہی حکم نواسوں اور پوتوں کی بیویوں کا ہے۔

دوسری قسم: بیوی کی بہن یعنی دو بہنوں کو اکٹھا کرنا حرام ہے ارشاد ربانی ہے "وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ" (النسا ۲۳، پارہ ۴) (اور دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے مگر جو گزر چکا سو وہ معاف ہے)۔ پھوپھی خالہ اور بھتیجی بھانجی میں (جب تک بیوی نکاح میں ہے اس وقت تک ان سے نکاح درست نہیں بصورت دیگر درست ہے متبنیٰ کی بیوی سے نکاح کرنا درست ہے کیونکہ وہ ہماری پشت سے نہیں ارشاد ربانی ہے" وحلائل ابناء لکم الذین من اصلابکم " اب سوال یہ ہے کہ حرمت مصاہرت سے کچھ رشتے حرام ہو جاتے ہیں (کچھ وقتی طور پر اور کچھ ہمیشہ کے لیے) ان رشتوں کی حرمت سے بچنے کے لیے کیا مصاہرت کو ترک کر دیا جائے جب کہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے یعنی چند رشتوں کی حرمت کی بناء پر مصاہرت قائم کرنے کو ترک نہیں کیا جا سکتا اسی طرح رضاعت کی بنیاد پر حرام ہونے والے رشتوں کی آڑ میں رضاعت کو ناجائز سمجھنا دین اسلام کے خلاف ہے اور فرمان خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔" وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ"۔ (البقرہ ۲۳۳، پارہ ۲) (۱۴) اور اگر تم چاہو کہ دودھ پلواؤ اپنی اولاد کو پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جب تم ادا کر و جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے معروف طریقے سے۔"

تحریم کی وضاحت: ارشاد ربانی ہے یا یھا النبی لم تحرم ما احل لك "ترجمہ: اے نبی تم اپنے لیے کیوں ممنوع قرار دیتے ہو اس چیز کو جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال کی ہے۔" آپ نے ایک ماہ کے لیے ایلا فرمایا اور اپنے آپ کو ایک ماہ کے لیے اپنی بیویوں کے پاس جانے سے روک لیا تھا اس امتناع کو تحریم کہا گیا ہے۔ خود حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں "الی رسول اللہ ﷺ و حرم فامر فی الایلاء بکفارة وقیل له فی التحریم لم تحرم " (ترجمہ) رسول اللہ نے ایلا کیا تھا اور تحریم کی تھی تو ایلا کے بارے میں آپ کو کفارے کے لیے کہا گیا اور تحریم کے سلسلے میں کہا گیا "لم تحرم" اسی طرح قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کی رضاعت کے لیے تحریم کا لفظ استعمال ہوا ہے" و حرمنا علیه المراضع " اور حرام کر دی ہم نے موسیٰؑ پر دودھ پلانے والیاں) یہاں حرمنا کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے موسیٰؑ کے لیے دودھ پلانے والیوں کا دودھ شرعی طور پر حرام کر دیا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی والدہ کے آنے تک باقی

عورتوں کا دودھ پینے سے حضرت موسیٰ کو روک دیا تھا۔ ایلا میں بھی یہی صورت تھی اور اسی صورت امتناع کو تحریم سے تعبیر کیا گیا۔ تحریم کا مطلب واضح ہونے کے بعد اب اعتراض کرنے والوں کے اعتراض جس کا القصص کی آیت نمبر۱۲ سے استدلال کیا ہے' کو لیتے ہیں آیت کا ترجمہ یہ ہے''اور ہم نے پہلے ہی سب دائیاں اس پر حرام کر دی تھیں تو بولی کیا میں تمہیں بتا دوں ایسے گھر والے کہ تمھارے اس بچہ کو پال دیں اور وہ اس کے خیر خواہ ہیں۔''اس آیت میں اس اعتراض کا جواب مضمر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی آمد تک سب دائیوں سے دودھ پینے کو روک دیا تھا اور وہ کوئی شرعی عذر نہیں تھا اور یہ حکم نہیں ہے کہ سب پیغمبروں کے لیے دوسری دودھ پلانے والیوں کے دودھ کو حرام کر دیا جائے اور جب یہ حکم حضرت موسیٰ کے لیے ہے تو باقی پیغمبروں پر اس کا اطلاق درست نہیں۔ ہاں اگر کوئی یہ کہہ دے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ کو دوسری عورتوں کے دودھ پلانے سے روک دیا تھا تو آپ کے لیے ایسا کیوں نہ کیا گیا؟

اس کا جواب معترضین کی خدمت میں یہ ہے کہ ایک تو خاص حکم کو عام بنانا زیادتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں تضاد نہیں ہے۔ لیکن اس آیت مبارکہ کو جو معترضین بطور دعویٰ پیش کر رہے ہیں، قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ کے متضاد ہے۔'' وان تسترضعوا اولادکم فلا جناح علیکم اذاسعمتم ما اتیتم بالمعروف'' (البقرہ۲۳۳، پارہ۲)''اور اگر تم چاہو کہ دودھ پلواؤ (دایہ سے) اپنا اولاد کو پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقے سے''۔ اس سے بدیہی ثابت ہوا کہ رضاعت جائز ہے نیز آیات میں تضاد باقی نہ رہا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ارشاد خداوندی ہے ہے وما اتکم ۔۔۔(۱۵) اس آیت کی روشنی میں کہ اور رسول جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں رک جاؤ۔ اس کے ساتھ ملا کر یہ حدیث پڑھیے''میں تم میں سب سے زیادہ صحیح بولنے والا ہوں، میں قریشی ہوں اور قبیلہ بنوسعد بن بکر میں، میں نے دودھ پیا ہے''۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے بنوسعد میں دودھ پیا ہے۔ اس کو مان لینا چاہیے اسے تسلیم کرنا چاہیے اگر ایسا نہیں کرتے تو اس فرمان نبوی اور مذکور آیت مبارکہ کا خلاف ہوتا ہے۔ آیت مبارکہ اور حدیث پاک میں تضاد نہیں ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رضاعت جائز ہے۔

نکتہ:: حضرت موسیٰؑ کو تمام دائیوں کے دودھ پینے سے روک دیا تھا۔ یہ صرف آپ کی والدہ کی آمد تک روکا گیا تھا اور نہ ہی یہ کوئی شرعی عذر تھا بلکہ والدہ موسیٰؑ کے ساتھ کیے گئے وعدہ کی تکمیل تھی کہ بچہ اسے واپس لٹا دیا جائے گا۔ قدرت خدا کی دیکھئے کہ دوبارہ بچہ اس کی اپنی ماں کی گود میں دے دیا گیا۔ یہ قدرت کی معجز نمائیاں ہیں۔

المختصر رضاعت پر اٹھائے گئے اعتراضات بے بنیاد ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اوران اعتراضات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

اعتراض نمبر ۵۱

۱۔خانہ بدوش رضاعی والدہ کے ساتھ زندگی نہایت سادہ ہوتی تھی قبیلہ مختلف موسم مختلف مقامات پر گزارتا تھا(پیغمبر اسلام۔۵۲)

۲۔حلیمہ سعدؓیہ کا قبیلہ خانہ بدوش تھا جو سال کے مختلف حصوں میں مختلف مقام پر خیمہ زنی کرتا تھا۔(ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

۳۔باڈلے اس موقع پر یوں لکھتا ہے۔کہ''رسول اللہ ﷺ بنو سعد کی چراگاہوں کی طرف لے جائے گئے اوراوائل عمر میں ہی صحرا نورد ہو گئے'' پانچ سال تک ان ہی بدووں کے سیاہ خیمے میں رہے' آپ ﷺ صحرا نشینوں کے ساتھ سرسبز وشاداب چراگاہوں کی تلاش میں دن رات گھومتے تھے اس عرصہ میں شاید ہی چند روز سے زیادہ آپ نے کہیں قیام کیا ہو۔آندھی بگولے اور جھلستی ہوا میں آپ اپنے چہرہ کو ایک کپڑے سے ڈھانپ لیتے''۔(۱۶)

جواب:رحیم دہلوی لکھتے ہیں''حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے خانہ بدوش ہونے کی بات غلط ہے کیونکہ مکہ کے سرداراور روساءاپنے بچوں کوموسم کی سختیاں جھیلنے کے لیے خانہ بدوشوں کے حوالے تو نہیں کرتے ہوں گے جن کا کسی ایک جگہ ٹھکانہ ہی نہ ہو۔دراصل حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی نگری جس علاقہ میں ہے اسے ضیبات کہتے ہیں اوران کی خاص بستی کا نام شخط ہے'شخط ایک چھوٹی مگر سرسبز وشاداب بستی ہے جو بہت خوبصورت' سادہ اور پرکشش ہے'ابھی تک یہاں اس قبیلے کے لوگ رہتے ہیں' یہ سارا قبیلہ بنی سعد کہلاتا ہے'' رحیم دہلوی پروفیسر فلپ ہٹی کی کتاب''تاریخ عرب'' کے حوالے سے لکھتے ہیں''اس میں کہیں کہیں نخلستان بھی ہیں' یہاں بعض اوقات سردیوں میں اس قدر مینہ برستا ہے کہ زمین پر سبزے کی چادر بچھ جاتی ہے۔'اور بدوؤں کے اونٹوں' بھیڑ' بکریوں کو حقیقت کا مزہ آجاتا ہے''۔

باڈلے اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا یہ کہنا ہے''حضرت حلیمہ سعدؓیہ کا خاندان خانہ بدوش تھا اور حضور ان کے ساتھ پھرتے رہے''۔ان حضرات کی تصوراتی کہانی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔(سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔۱۷۹۔۱۸۰۔۱۸۱)

مستشرقین کی دشمنی تو پرانی ہے وہ ایسی کہانیاں گھڑتے رہتے ہیں۔بعض دفعہ اپنے (مسلمان) بھی ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں جو بے سروپا ہوتی ہیں' گویا

وہ جن میں پھول ہونا چاہیے تھا
انہیں ہاتھوں میں پتھر آگیا ہے

شاید ڈاکٹر صاحب کی یہی تحقیق ہو جس کا مذکورہ اعتراض میں ذکر کیا گیا ہے اور یہ ممکن ہے کہ ان کو سہو ہوا ہو۔ (واللہ اعلم)

برکات کا نزول: عرب اپنے بچوں کو خانہ بدوشوں کے ہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈیرے لگانے کے لیے نہیں بھیجا کرتے تھے بلکہ وہ تو اپنے بچوں کو ماہر لسان، فصیح دیکھنا چاہتے تھے اس کی تصدیق ماخذ کرتے ہیں۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ نے نومولود بچے کو گود میں لیا۔ برکات کا نزول شروع ہو گیا ہے۔ خود سعدیہؓ کے دودھ میں اضافہ ہوا جو ایک اس کے بچہ کو نا کافی تھا اور رورو کر راتیں آنکھوں میں کاٹتا تھا۔ جانوروں کے دودھ میں زیادتی ہوئی، رزق میں کمی نہ رہی، اونٹ بکریوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ ہر چیز میں برکتیں آ گئیں ہوں حتیٰ کہ ان کی ساتھی عورتوں نے '' (حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا) تمہیں بہت مبارک بچہ ملا ہے'' کہنا شروع کر دیا۔ سعدیہؓ اپنے قبیلہ میں رفیع الشان ہو گئیں۔ حلیمہ سعدیہؓ سید لولاک کی حیثیت کو جان گئیں کہ وہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔

حضرت حلیمہؓ کی لوری: حضرت حلیمہ سعدیہؓ ننھے لاڈلے، پیارے، من موہنے سوہنے کو لوریاں دیتیں وہ لوری جو سنا کر دل بہلایا اور کھیلایا کرتی تھیں اس کا مفہوم یہ ہے۔

اے میرے رب جب تو نے محمد ﷺ کو ہمیں دیا ہے تو آپ ﷺ کو باقی رکھ یعنی زندگی دے اور عمر کو پہنچا اور آپ کے مراتب اعلیٰ کر اور آپ ﷺ کے دشمن جو باطل باتیں اور باطل خیال کریں، ان کو مٹا دے۔

آپ کی رضاعی بہن: حضرت شیماؓ کا اصل نام حذافہؓ تھا اور شیماؓ کے نام سے مشہور تھیں۔ وہ حلیمہ سعدیہ کی بڑی بیٹی تھیں۔ جب سے حلیمہ سعدیہؓ ہادی عالم ﷺ کو اپنے گھر لے گئیں تب سے اللہ تعالیٰ نے نعمتوں اور برکتوں سے آپ کے گھر کو بھر دیا۔ پرورش میں حلیمہؓ کی بڑی بیٹی شیما بھی برابر کی شریک تھی وہ انہیں کھلاتا اور کھیلایا کرتی تھیں۔ اور لوریاں دیا کرتی تھیں۔ اس لوری کا ذکر مسعود مفتی، منصور احمد بٹ محمد بن المجل الازدی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس لوری کا ذکر کتاب الترقیص میں کیا گیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے'' ہمارے پروردگا! ہمارے بھائی محمد ﷺ کو تو سلامت رکھ، یہاں تک کہ ہم ان کو جوان اور بالغ دیکھ لیں، اور پھر ان کو سید و سردار قوم پائیں، ان کے ساتھ دشمنی وحسد رکھنے والوں کو ذلیل کر، اور ان کو ایسی عزت دے جو ابد الآباد تک قائم رہے لیکن اس لوری پر ڈاکٹر حمید اللہ کو اعتراض ہے۔ (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔۲۱۸)

اعتراض نمبر ۵۲

وہ کہتا ہے کہ اس لوری کے مندرجات عام بچوں پر صادق نہیں ہوتے، خاص محمد ﷺ سے مخصوص

معلوم ہوتے ہیں اور ایک جاہل بدوی نو عمر لڑکی سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی' وہ اپنے گھر میں مروجہ لوریاں ہی سنا سکتی تھی۔

جواب: ڈاکٹر صاحب کی یہ تاویل کہ لوری آنحضرت ﷺ سے مخصوص لگتی ہے درست نہیں حالانکہ وہ کیوں بھول گئے کہ ہر بہن کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بھائی پلے بڑھے اور جوان ہو کر اپنی جوانی کی بہاریں دیکھے اور دشمنوں کے حسد سے بچا رہے اور بڑا آدمی بنے وغیرہ۔ اور یہ بھی ڈاکٹر صاحب کا کہنا درست نہیں ہے کہ ایک جاہل بدوی نو عمر لڑکی سے گھر کی مروجہ لوریوں کے علاوہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ جواباً عرض ہے کہ نہ تو یہ بچہ معمولی تھا اور نہ ہی بچے کی پرورش اور خدمت کرنے والے عام لوگ تھے۔ جنہیں ڈاکٹر صاحب جاہل بدوی قرار دے دیتا ہے کیونکہ دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ بنو ہوازن شاہد عالم کے ساتھ بنو قیس عیلان' مضر میں جمع ہوتا ہے دراصل الیاس مضر کے بیٹے ہیں اور الیاس کے ایک بیٹے قیس عیلان تک حضرت حلیمہ سعدؓیہ کا شجرہ جا ملتا ہے لہٰذا اس شجرہ سے نسبت ایک بیش بہا اعزاز و اکرام ہے۔ (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ ۱۷۸) بنو سعد قبیلہ زبان کی فصاحت اور بلاغت میں یکتا تھا اس لحاظ سے شیماؓ کی لوری مروجہ لوریوں سے ہٹ کر بھی ہو تب بھی یہ ممکن ہے کہ بچے سے متعلق ایسی ہی لوری ہونا چاہیے تھی۔

حضرت شیماؓ حضور ﷺ کو لوریاں دیتے ہوئے یہ بھی کہا کرتی تھیں ''میرے اس بھائی کو میری ماں نے نہیں جنا' اور نہ ہی میرے باپ اور چچا کے نسب سے ہیں' اے اللہ! انہیں نیند آجائے جو میری نیند ہے'' یہ حضرت شیماؓ کی انتہائے محبت ہے کہ وہ کہتی ہیں وہ میری نیند لے لے اور سو جائے اور سکھ کی نیند سے شاد کام ہو۔ ہر بہن کا خواب اور ارمان ہوتا ہے کہ اس کا بھائی جوانی کا سکھ دیکھیں' عمر دراز ہو' بڑی عزت والا ہو' قوم کا سردار ہو اور دشمنوں کے شر اور مفسدوں کے حسد سے بچا رہے بلکہ اس کے دشمن ذلیل و خوار ہوں لوری کا یہی مفہوم ہے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس پر اعتراض کیا جائے کہ ایک جاہل بدوی لڑکی سے ایسی لوری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ابو عروہ الازدی جب یہ لوری پڑھتے تو کہتے'' اللہ تعالیٰ نے حضرت شیماؓ کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا''۔ وہ شیماؓ جس کے دہن مبارک سے نکلے دعائیہ کلمات کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا شرف بخشا، ان پر ایسا اعتراض لگانا درست نہیں۔ حلیمہ سعدؓیہ کی لوری کا مفہوم بھی تقریباً اس لوری کا سا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے حلیمہ سعدؓیہ کی لوری پر الزام نہ دھرا کیوں؟ کھلانے کھیلانے اور دیگر خدمات کے صلے میں حضور ﷺ نے وہ عزت و رتبہ عطا کیا جس پر دل سے قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ واہ رے! حضرت شیماؓ تیرے مقدر کے صدقے کہ تجھے آنحضرت ﷺ نے ''ماں'' کہہ کر فرمایا کیونکہ حضرت شیماؓ نے آپ کو گود میں لیا تھا'' (حوالہ بالا۔ ۲۱۹) اور یہ بھی اعزاز

بخشا کہ غزوہ حنین میں قیدی بن کر آئی تو آپ اپنی رضاعی بہن کے لیے کھڑے ہو گئے' ان کے لیے چادر مبارک بچھا دی اور نہایت توقیر وعزت سے انہیں چادر پر بٹھایا نیز اس غزوہ حنین میں چھ ہزار قیدی بھی رہا کر دیئے اور مال بھی واپس کر دیا جس کی قیمت پچاس کروڑ درہم تھی۔ آج کے دور میں بہن بھائیوں بلکہ والدین اور اولاد کی محبتیں ناپید ہوتی جا رہی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر تعظیم کرنے کی توفیق دے اور اپنے ہر رشتہ سے پیار و محبت رکھیں۔

رضاعی ماؤں پر ایک بحث

حضرت برکہ (ام ایمن) علامہ جلال الدین سیوطی الخصائص الصغری میں ام ایمن کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضور کو دودھ پلایا۔ (۲) میاں محمد صدیقی نے سیرت حلبیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ دودھ پلانے والیوں میں ام ایمن کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ (۳) عبدالمصطفیٰ محمد اشرف نے لکھا کہ عبدالحق محدث دہلوی' شبلی نعمانی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتب اس بارے میں خاموش ہیں آخر میں عجیب بات لکھی ہے کہ بہرحال ہم نے ام ایمن کا نام لکھ دیا ہے کہ اگر وہ واقعی اس شرف کی حامل ہے تو ہم کسی کا حق کیوں ماریں؟ مخالف آراء اور تحقیق سیرت نگاری کے حوالے سے اہل ایمان کو قلم نہایت محتاط طریقے سے استعمال کرنا چاہیے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی کیا سے کیا کچھ بنا دیتی ہے نیز ایک شخص کی بے احتیاطی ایک راستہ فراہم کرتی ہے اور دیگر حضرات بغیر سوچے سمجھے اور تحقیق و تفتیش کیے بغیر اچک لیتے ہیں اور بغیر کسی سند اور معتبر حوالہ کے لکھتے اور بیان کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اوپر میاں محمد صدیقی نے سیرت حلبیہ کے حوالے سے لکھا کہ دودھ پلانے والیوں میں ام ایمن کا نام بھی لیا جاتا ہے جبکہ حلبی نے تردید والی بات کی ہے جسے میاں صدیقی گول کر گئے ہیں۔

عمر رضا کہالہ مشہور ماہر انساب نے مستدرک حاکم' الاصابہ از ابن حجر' تہذیب التہذیب از ابن حجر' الاستیعاب از ابن عبدالبر التہذیب از ذہبی اور المجتنی از ابن جوزی کے حوالہ سے حضرت برکہ بنت ثعلبہ کا ذکر کیا ہے اس ذکر میں انہیں پرورش اور خدمت کرنے والی کہا گیا ہے۔

عبدالمصطفیٰ محمد اشرف لکھتے ہیں کہ جتنی کتب حدیث اور سیر و تاریخ میری نظروں سے گزری ہیں کسی کتاب میں یہ نہیں ہے کہ ام ایمن نے سید اعظم ﷺ کو دودھ پلانے کا شرف حاصل کیا ہو۔ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ ام ایمن آنحضرت ﷺ کی دودھ پلائی تو تھی نہیں لیکن کھلائی ضرور تھی۔ مفتی مسعود اور منصور احمد (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے ۔۱۸۶) لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ برکہ ام ایمن بعد میں بنیں جب حضور ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے یہ لڑکی تھیں جب آپ ﷺ کی عمر چھ سال تھی اور یثرب سے واپسی پر حضرت آمنہؓ راستے میں ابواء کے مقام پر وفات پا

گئیں تو حضرت برکہ آنحضرت ﷺ کو لے کر مکہ مکرمہ پہنچی اس وقت بھی ام ایمن نہیں تھیں ۔ حضرت خدیجہؓ کی شادی کے موقع پر انہیں آزاد کیا گیا اور ان کا نکاح حضرت عبید بن زید سے ہوا ان کے ہاں بچہ ایمن پیدا ہوا اس سے وہ ام ایمن بنیں ۔۔۔۔ سیرت نگار جو حضرت برکہ کو نبی کل جہاں ﷺ کی رضاعی ماں لکھ رہے ہیں' آپ خود سوچیں کہ جب تک کوئی عورت کسی بچے کی ماں نہ ہو وہ اپنے بچے یا کسی اور بچے کو دودھ کیسے پلا سکتی ہے اور سید الصادقین ﷺ جس ہستی سے محبت کرتا رہے انہیں ماں کہتا ہے' یہ میری ماں کے بعد میری ماں ہے اس مقدس ہستی کے سلسلے میں اتنی بے احتیاطی سے گفتگو کرنا کسی سیرت نگار کو زیب نہیں دیتا۔ عرب میں ایک رواج تھا کہ عرب خواتین کی جب شادی ہو کر پہلے بچے کی ولادت نہیں ہو جاتی تھی ان کا نام وہی رہتا لیکن بچے کی ولادت کے بعد نام بدل دیا جاتا پھر اکثر ایسا ہوتا کہ تمام عمر پہلے نام کو بھلا دیا جاتا اور پہلے نام کو پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی مثلاً پہلے بچے ایمن کی ولادت ہوئی تو ان کے اصل نام برکہ سے ام ایمنؓ ہو گئیں اور پھر ساری عمر ام ایمنؓ ہی رہیں ۔

عواتک کا بیان

محمد میاں صدیقی سیرت حلبیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں'' عاتکہ نامی تین لڑکیاں بنی سلیم سے تھیں سیرت حلبیہ میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ وہ تینوں کنواری تھیں ۔

اسد الغابہ میں حضرت سبابہ بن عاصم کے حوالے سے ہے'' میں عواتک کا بیٹا ہوں سیرت حلبیہ میں لکھا ہے میں بنی سلیم کی عواتک کا بیٹا ہوں ۔ کیا عجیب بات نہیں کہ ایک ہی قبیلہ کی تین عورتوں نے آنحضرت ﷺ کو دودھ پلایا اور سب کا نام عاتکہ تھا ۔ اگر ایسا تھا تو سیرت کی تمام کتب ان کی رضاعت کے ذکر سے خاموش کیوں ہیں؟ اگر ذکر ہے تو ان میں بھی صرف رضاعت کے حوالے سے یہ فقرہ ملتا ہے'' انہوں نے دودھ پلایا'' ۔ حضرت حلیمہؓ کا ذکر تو ہر کتاب میں ملتا ہے ۔ ثویبہ کا بھی کہیں کہیں تذکرہ ملتا ہے لیکن عاتکہ نامی ان تین خواتین کا ذکر نہیں ملتا ۔ (۲) خود سراپا رحمت ﷺ نے اپنی رضاعی ماؤں کے ذکر میں انہیں کیوں نہ یاد فرمایا اور اگر عاتکہ نامی تین خواتین جو ایک ہی قبیلہ سے تھیں اور تاجدار مدینہ کو دودھ پلایا تھا تو ان کے قبیلہ کا اس حوالے سے بطور خاص ذکر کیوں نہیں ملتا ؟ (۳) عمر رضا کحالہ کی کتاب'' اعلام النسافی عالم العرب و الاسلام'' میں عرب کی بارہ عاتکہ نامی خواتین کا ذکر موجود ہے جن کے نام یہ ہیں ۔ ۱ ۔ عاتکہ بنت الحسن بن احمد بن احمد العطار ۔ ۲ ۔ عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل القریشہ ۔ ۳ ۔ عاتکہ بنت شہدہ ۔ ۴ ۔ عاتکہ بنت عبد المطلب ۔ ۵ ۔ عاتکہ بنت عبد الملک بن الحارث المخز ومیہ ۔ ۶ ۔ عاتکہ العتوبہ ۔ ۷ ۔ عاتکہ بنت عمرو بن یزید الاسدی ۔ ۸ ۔ عاتکہ بنت الفرات بن معاویہ البکائی ۔ ۹ ۔ عاتکہ بنت مروان ۔ ۱۰ ۔ عاتکہ بنت معاویہ بنت ابی سفیان ۔ ۱۱ ۔ عاتکہ بنت نعیم بن عبد اللہ العدویہ ۔ ۱۲ ۔ عاتکہ بنت یزید بن یزید

عمر رضا کحالہ کی کتاب میں بعض عواتک کا ذکر نہیں ملا لیکن دیگر کتب میں عاتکاؤں کے نام ملے ہیں ۔۱۔ عاتکہ بنت سعید بن زید ۔۲۔ عاتکہ بنت عبداللہ بن نصلہ ۔۳۔ عاتکہ بنت امیہ بن حارث بن اسعد ۔۴۔ عاتکہ بنت عبداللہ بن معاویہ ۔۵۔ عاتکہ بنت عوف ۔۶۔ عاتکہ بنت وہب ۔۷۔ عاتکہ بنت ولید بن مغیرہ ۔۸۔ عاتکہ بنت عامر کنانیہ ۔۹۔ عاتکہ بنت احنف بن القمہ ۔۱۰۔ عاتکہ بنت خالد بن منقز بن ربیعہ ۔ ۱۱۔ عاتکہ بنت عبداللہ بن عنکشہ بن عامر ۔۱۲۔ عاتکہ بنت امیہ بن ابی صلت ثقفی ۔ عمر رضا کحالہ کی ایک دوسری کتاب ''معجم قبائل العرب القدیمہ والحدیثہ'' میں بھی بنوسلیم کی خواتین کا ذکر موجود ہے مگر اس میں بھی رضاعی ماؤں کا ذکر کہیں نہیں ملتا (۴) (نقوش جلد نمبر ۲۔ ۵۹۷) میں قبیلہ بنوسلیم کے متعلق کچھ معلومات ہیں بنوسلیم کے مکہ سے قدیمی اور قریبی تعلقات تھے ۔ رسول اللہ ﷺ کے اسلاف کی تیسری سے چھٹی نسل تک آپ کی تین دادیاں جن کا ایک ہی نام عاتکہ تھا اور بنوسلیم سے تعلق رکھتی تھیں : ۔۔ یعنی اس قبیلہ کی تین رضاعی ماؤں کا کہیں وجود نہ تھا ۔

السیرت النبویہ دحلان ۔۵۰ میں ہے کہ بنی سلیم سے عواتک میں پہلی عاتکہ بنت ہلال (عبد مناف کی والدہ)، عاتکہ بن الاوقص (ہاشم کی والدہ) عاتکہ (لوی بن غالب کی والدہ) اور عاتکہ بنت مرہ بن ہلال (وہب کی والدہ) ۔ اب یہ بات تو عیاں ہوگئی کہ دراصل عاتکہ نامی خواتین نبی الامی کی دادیاں تھیں ۔۔۔۔ صادق الامین کا فرمان ہے انا ابن العواتک میں عاتکہ نامی خواتین کا بیٹا ہوں ۔۔۔ یہی سرورکون ومکان کے اس فرمان سے جدات مراد ہیں ۔۔ وہ جدات یہ ہیں ۔۱۔ آنحضرت ﷺ کے جدامجد عبد مناف کی والدہ جو قصی کی بیوی عاتکہ بنت فالج بن ذکوان ۔۲۔ عبد مناف کی بیوی عاتکہ بنت مرہ بن ہلال بن فالج بن ذکوان بن ثعلبہ بن بثہ بن سلیم بن منصور ۔۳۔ حضرت آمنہ کی دادی عاتکہ بنت الاوقص بن مرہ بن ہلال بن بالح بن ذکوان بن سلیم ۔ یہی وہ تین دادیاں ہیں جن کا ذکر آنحضرت ﷺ کی محولہ بالا حدیث پاک میں ہے ۔ (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے ۔ ۱۸۷ تا ۱۹۰) اس میں تحقیق نہ کرنے کی بجائے لوگ کہانی گھڑ لیتے ہیں جیسے بنوسلیم کی تین خواتین نے آپ کو دودھ پلایا کسی نے کنواری لڑکیاں لکھ دیا اور کسی نے اسے معجزہ قرار دینے کی کوشش کی وغیرہ ۔ اللہ تعالیٰ صحیح بولنے، سمجھنے اور لکھنے کی توفیق بخشے آمین ۔ !محض بے تحقیق سابقہ کتب سے ایسی باتیں اچک لیں تو بے انتہا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں پھر وہ چلتی رہتی پھر اگر کوئی ان پر تحقیق کر کے اصل واقعہ کو بیان کرے تو اسے نہ صرف مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے بلکہ اس کی تحقیق سے انکار کر دیتے ہیں ۔

ام فروہ ۔ میاں محمد صدیقی نے اپنی کتاب میں لکھا ''تین لڑکیاں قبیلہ بنی سلیم کی تھیں جن میں سے ایک کا نام عاتکہ تھا، ایک خاتون کا نام ام فروہ تھا، ام ایمن کا نام بھی لیا جاتا ہے'' اعلام النساء'' میں ام فروہ کے نام کی دو خواتین ہیں ۔ ام فروہ قاسم بن غنام کی دادی اور ام فروہ بنت ابوقحافہ (صدیق اکبر کی بہن)

حضرت جعفر صادق کی والدہ کا نام بھی ام فروہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے حضرت قاسم کی بیٹی ہیں۔ ابن سعد نے قاسم بن غنام کی دادی ام فروہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اسلام لائیں اور نبی ﷺ کی بیعت کی اور آپ سے روایت کی۔ (حوالہ بالا۔۱۹۲۔۱۹۱)۔

خولہ بنت المنذر ر: دودھ پلانے والیوں میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے بحوالہ حلبیؒ مفتی مسعود لکھتے ہیں شائد خولہ بنت المنذر ر دو ہوں' ایک سید کائنات ﷺ کو دودھ پلانے والی اور دوسری حضرت ابراہیمؑ کی رضاعی والدہ۔ اعلام النساء میں خولہ بنت المنذر ر کا ذکر تک نہیں ملتا اگر چہ ایک خولہ سید الصادقین کی خادمہ تھیں۔ طالب ہاشمی نے خولہ نامی چند خواتین کا ذکر کیا ہے۔ (۱) ایک خولہ تو بنی سلیم کی بھی ہیں (۲) حضرت اوس بن صامت کی بیوی کا نام خولہ تھا (۳) حضرت حمزہؓ کی بیوی کا نام بھی خولہ بنت قیس ہے (۴) ایک خولہ بنت عامر انصاریہ ہیں لیکن ان سب کے والد کا نام المنذر ر نہیں ہے۔ طالب ہاشمی ام بردہ خولہ انصاریہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں ان کے والد کا نام منذر بن زید انصاری اور بعض میں زید انصاری آیا ہے۔ ان کا نکاح براء بن اوس انصاری سے ہوا' ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے نخلستان کا ایک قطعہ مرحمت فرمایا تھا لیکن صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ بن محمد ﷺ کو دودھ پلانے کی سعادت حضرت ام سیف کو نصیب ہوئی۔ قاضی عیاض نے لکھا کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں لیکن علامہ شبلی نے لکھا کہ قاضی عیاض کی تاویل اگر چہ کچھ مستبعد نہیں مگر ام بردہ کے شوہر براء ابن اوس ابوسیف کی کنیت سے مشہور ہیں۔ (حوالا بالا۔۱۹۲)

بنی سعد کی ایک عورت: مخبر صادق ﷺ کی رضاعت کے سلسلے میں لکھا جاتا ہے کہ حلیمہ سعدیہؓ کے علاوہ بنی سعد کی ایک عورت نے بھی شفیع امم کو دودھ پلایا تھا' بنی سعد کی اس عورت نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو بھی دودھ پلایا تھا۔ صفی الرحمٰن مبارک پوری زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۹ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاہ عرب وعجم کے چچا حضرت حمزہ کو دودھ پلانے کے لیے بنی سعد کی ایک عورت کے سپرد کیا گیا تو اس عورت نے ایک دن جان دو عالم ﷺ کو دودھ پلا دیا' ان دنوں آپ حضرت حلیمہ سعدؓیہ کے پاس تھے اس طرح حضرت حمزہ اور سید عالم ﷺ آپس میں دوہرے رضاعی بھائی بن گئے یعنی ایک ثویبہ اور دوسری بنی سعد کی اس عورت کی نسبت سے۔ اب کچھ سیرت نگاروں نے اس عورت کا نام بھی تخلیق کیا "اس عورت کا نام سعدیہ تھا"۔ بنی سعد کی اس گمنام خاتون یا سعدیہ نام کی خاتون کے بارے جو معلومات فراہم ہوتی ہیں ان سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس میں کچھ حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں مرشد حق کے بارے میں افسانہ طرازیوں سے محفوظ رکھے۔ (حوالہ بالا۔۱۹۳)

فاطماؤں کا ذکر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ' امام سہیلی کے حوالے سے لکھتے ہیں "یہ فرمان رسول اللہ ﷺ

سے منسوب ہے کہ میں عاتکاؤں کا بیٹا ہوں جب کہ ایک دوسری روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں قبیلہ سلیم کی عاتکاؤں اور فاطماؤں کا بیٹا ہوں۔ (پیغمبر اسلام۔۷۷۔۴) عاتکاؤں کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے اب رہا فاطماؤں کا ذکر' تو وہ خواتین یہ ہیں (۱) عبدالمطلب کی بیوی فاطمہ بنت عمر بن عائذ بن عمران بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ (۲) کلاب کی بیوی فاطمہ بنت سعد بن سہل (حیر) بن عوف بن عامر (۳) ابوطالب (والد علی) کی بیوی فاطمہ بنت اسعد بن ہاشم۔ (ان کی لحد میں آنحضرت ﷺ لیٹ گئے تھے۔ (رحمۃ اللعالمین۔ص۔۲۶۔۲۵) المختصر بلا تحقیق اور بے احتیاطی سے غلطیاں تاریخ کے اوراق میں در آتی ہیں پھر وہ متاخرین اڑا لیتے ہیں اور نقل در نقل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی غلطیوں کو مستشرقین جو سید عالم ﷺ کے ازلی وابدی دشمن ہیں خوب نمک مرچ لگاتے ہیں اور بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں جبکہ روشن خیال طبقہ ان کی معاونت میں پہلے سے تیار ہوتا ہے لہذا سیرت کے ہر ہر موضوع کو نہایت حزم واحتیاط سے لینا چاہیے ہم اپنوں سے بدگمان نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے تحقیق پر توجہ نہ دی ہو یا سہو ہوا ہو۔ مواہب لدنیہ میں صاف لکھا ہے کہ آپ ﷺ کو آپ کی والدہ بی بی آمنہؓ، ثویبہ اور حلیمہ سعدیہؓ نے دودھ پلایا۔

صبح کا نور ہے ان آنکھوں میں
کیسے ہم ان سے بدگماں ہوتے

اہم نکتہ: ایک قول کے مطابق آپ ﷺ نے اپنے نسب میں موجود فواطم کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ عمومیت کا تذکرہ کیا جن میں فاطمہ ام اسد بن ہاشم' فاطمہ بنت اسد (والدہ علی) اوران کی والدہ فاطمہ' یہ ان فواطم کے علاوہ ہیں جن کے متعلق حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایک ریشم کا ٹکڑا عطا کر کے فرمایا ''یہ ان تینوں فواطم میں تقسیم کردو'' وہ آپ کی لخت جگر فاطمہؓ، فاطمہ بنت حمزہؓ اور فاطمہؓ بنت اسد تھیں۔ آپ کی فواطم کی جدات میں ام عمرو بن عائذ' فاطمہ بنت عبداللہ بن رزام' فاطمہ بنت حارث اور فاطمہ بنت نظر بن عوف' عبدمناف کی نانی بھی شامل ہیں (السیرۃ النبویہ زینی دحلان۔۱۔۵۱)

شقِ صدر

دوسال کے بعد حلیمہ سعدیہؓ آنحضرت ﷺ کو مکہ میں آپ کی والدہؓ کے پاس لے آئیں۔ جی نہیں چاہتا تھا لیکن رضاعت کی مدت ختم ہونے پر بچہ کو رضاعی ماں کے ہاں رہنے کا استحقاق نہیں رہتا ہے' اس لیے رنجیدہ خاطر رسول عربی ﷺ کو سیدہ آمنہؓ کے پاس لے آئیں۔ اتفاق یہ ہے کہ ان دنوں مکہ میں وبا پھوٹی ہوئی تھی اس وجہ سے حلیمہ سعدیہؓ دوبارہ آنحضرت ﷺ کو اپنے صحرائی گھر میں لے آتی ہے اور پھر سے گھر کی سب رونقیں اور خوشیاں لوٹ آتی ہیں۔ آپ اپنے بہن بھائیوں کے ہمراہ بکریاں چرانے

تشریف لے جاتے تھے ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ دو شخص نہایت خوش لباس اور خوبصورت تھے آئے وہ محمد ﷺ کو اٹھا کر الگ لے گئے اور آپ کا سینہ چاک کر دیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی آپ کا رضاعی بھائی دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا اور کہا کہ دو سفید لباس میں ملبوس آدمی آئے ہیں اور ہمارے قریشی بھائی کو زمین پر لٹا کر اس کا شکم چاک کر دیا ہے اور اب کوس رہے ہیں۔ اس دردناک واقعہ کو سنتے ہی حلیمہ سعدؓیہ اور اس کا شوہر پریشان خاطر چلے آئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو آپ خوش ہیں اور مسکرا رہے ہیں البتہ چہرے پر خوف کے آثار تھے سیدہ حلیمہؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود آپ ﷺ کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا پھر آپ کے رضاعی باپ حارث نے آپ کو سینے سے لگایا اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا! اے بیٹا کیا ہوا؟ آپ ﷺ نے جواباً فرمایا کہ دو آدمی سفید لباس زیب تن کیے میرے پاس آئے اور مجھ کو لٹا کر میرا شکم چاک کیا اور میرے سینے سے کوئی سیاہ چیز نکال کر پھینک دی پھر میرے شکم کو درست کر کے چلے گئے' نہ جانے انہیں کس چیز کی تلاش تھی لیکن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی بلکہ ٹھنڈک ہی محسوس ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے۔ ابن ہشام (ج۔ا۔ص۔۱۸۶) لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق نے کہا کہ ثور بن یزید نے بعض اہل علم سے روایت بیان کی ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ روایت خالد بن معدان الکلاعی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہؓ نے آپ سے عرض کی' اے اللہ کے رسول! اپنے کچھ حالات بیان فرمائیے۔ فرمایا: اچھا! میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا اور حضرت عیسٰیؑ کی بشارت ہوں جب میں اپنی ماں کے بطن میں آیا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس سے سرزمین شام کے محل ان پر روشن ہو گئے بنو سعد بن بکر کے قبیلے میں دودھ پیا اور پرورش پائی میں اپنے گھروں کے پیچھے اپنے ایک بھائی کے ساتھ تھا اور ہم اپنی بکریوں کے بچے چرا رہے تھے کہ دو شخص سفید کپڑے پہنے ہوئے میرے پاس برف کا بھرا ہوا سونے کا ایک طشت لے کر آئے۔ انہوں نے مجھے پکڑا اور پیٹ چاک کیا میرا دل نکالا اور اسے بھی چاک کیا اور اس میں سے ایک کالا گوشت کا ٹکڑا نکال کر پھینک دیا پھر انہوں نے میرے دل اور پیٹ کو اس برف سے اتنا دھویا کہ اسے پاک کر دیا۔ فرمایا پھر ان میں سے ایک ساتھی نے دوسرے سے کہا کہ انہیں ان کی امت کے دس شخصوں کی مقابل تولو اس نے مجھے ان کے ساتھ تولا تو میں ان سے وزن میں بڑھ گیا اور پھر اس نے ان کی امت کے سو شخصوں سے تولا جب اس نے مجھے ان کے ساتھ تولا' ان سے بھی میرا وزن بڑھ گیا پھر اس نے کہا ان کی امت کے ہزار افراد کے ساتھ تولو اس نے مجھے ایک ہزار کے ساتھ تولا تو جب بھی میرا وزن بڑھ گیا (یہ دیکھ کر) اس نے کہا کہ انہیں چھوڑ دو' اللہ کی قسم! اگر تم انہیں ان کی (پوری) امت کے مقابل بھی تولو گے تو یہ بڑھ جائیں گے۔

اعتراض نمبر۵۳

یہ کہا جاتا ہے کہ شق صدر متعدد بار ثابت ہے لیکن صحیحین میں دومرتبہ مذکور ہے اور جمہور محدثین کا یہی مختار قول ہے مگر بعض کی رائے یہ ہے کہ بعض محدثین اس واقعہ کو ایک ہی واقعہ سمجھتے ہیں یعنی وہ صغیرسنی میں جب آپ حلیمہؓ کے ہاں پرورش پا رہے تھے اور معراج کے موقع پر شق صدر کے واقعہ کو راویوں کا سہو سمجھتے ہیں۔(ترجمان السنہ۔ج ۴۔ص ۷۰)

جواب: ایک ہی نوع کا معجزہ متعدد بار روایات میں موجود ہے تو کسی دلیل کے بغیر اسے ایک ہی واقعہ قرار دینا پھر ایک نوع کے کئی افراد بھی ثابت ہوں تو دلیل کے بغیر دوسرے مقامات میں حزم کے ساتھ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ معجزہ صرف ایک بار ظہور پذیر ہوا نہ کہ متعدد بار'اس کی مثال حافظ ابن حجر کی ہے کہ وہ ایک ہی نوع کے چند معجزات پر یہ حکم نہیں لگاتے کہ سب واقعات در حقیقت ایک ہی واقعہ ہیں۔(حوالہ بالا۔۶۷) نیز وہ ان روایات میں تطبیق بھی کرتے ہیں۔معترضین کا مدعا و منشاء یہ ہے کہ آپ کے دور میں طفولیت کی روایات کو مسلم شریف میں ہونے کے باوجود اپنی رائے سے مجروح کردیں اور صحیحین میں دو بار یہ واقعہ نقل ہوا اسے ایک واقعہ قرار دے دیں اور واقعہ معراج کو بعض محدثین کے اختلاف سے کمزور بنا دیا جائے اور شق صدر کا واقعہ جو دور طفولیت میں پیش آیا اسے خود مجروح کرنے کی کوشش کی جائے اس حساب سے جو ایک واقعہ بچ جائے وہ بھی زیر بحث آنے سے مشکوک ہو جائے' اس کا پھر جوڑ ایک تاویل سے کیا جائے کہ ہمارے نزدیک صحیح اصطلاح شرح صدر ہے جس کے معنی سینہ کھولنے کے ہیں اور عرب کے کلام میں اس مقصود بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کردینا ہوتا ہے قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔

اپنوں کی بات بھی سن لیں سرسید (خطبات احمدیہ۔۲۹۹۔۲۹۸) پر الم نشرح لک صدرک'' آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ آیت شق صدر سے علاقہ رکھتی ہے۔۔۔اس آیت میں چیر پھاڑ کا کوئی ذکر نہیں اور اس اصلی معنی اور اصطلاحی معنی جیسے اکثر مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے اس کی کشادگی کے ہیں' جو دل اور سینہ میں عقلی اور روحانی وسعت سے عرفان الٰہی اور وحی کے منبع ہونے کے لیے کی تھی۔حوالہ بالا ۷۰ پر صاحب ترجمان السنہ لکھتے ہیں رب شرح لی صدری۔۔انبیاءؑ جو کچھ جانتے اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیم الٰہی' القائے ربانی اور فہم ملکوتی ہوتا ہے اسی کا نام علم لدنی ہے جس کا ثبوت سب انبیاء میں ملتا ہے چونکہ معراج ہجرت کا اعلان اور اسلام کے مستقبل کا عنوان تھا جس کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم کی طاقت عطا کی جانے والی تھی اس لیے شرح صدر کے لیے یہی مناسب واقعہ تھا۔

اعتراض نمبر ۵۴

صحیح مسلم کی روایت میں ایسے معنوی وجود بھی ہیں جن کی تائید کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی مثلاً شق صدر کی یہ کیفیت کسی طرح بھی ہو مگر اس کا تعلق بہر حال روحانی تھا۔۔۔ بایں ہمہ اس روایت میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کے سینہ مبارک پر زخم کے ٹانکے کے نشان مجھ کو نظر آتے تھے۔۔ علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ کی شکل وشمائیل کا ایک ایک حرف، جسم اطہر کا ایک ایک خط وخال کی کیفیت صحابہؓ نے بیان کی ہے مگر کسی نے سینہ مبارک کے ان ٹانکوں کا ہم تک نام نہیں لیا ایسی حالت واقعے کی یہ صورت کیونکر تسلیم ہو سکتی ہے؟

جواب: صحیح مسلم کی روایت سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں۔(۱) اس روایت سے شق صدر کا واقعہ دور طفولیت کا ثابت ہوتا ہے (۲) شق صدر جسمانی ہے روحانی نہیں (۳) اس واقعہ کا تعلق عالم روحانی سے نہیں، لفظ شق اس کے خلاف ہے (۴) حضرت انسؓ عینی شاہد ہے یہی ثبوت کافی تھا لیکن صحابہ کرامؓ نے بیان نہ کیا اور اس عینی شاہد کو تسلیم نہ کیا گیا حالانکہ ان نشانات کو مجمع عام میں دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور دس سال تک آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہنے والے حضرت انسؓ کو نہ جانے کتنی بار مشاہدہ کی سعادت نصیب ہوئی ہو گی۔ اس طرح صحابی کے نام جھوٹ کی تہمت مڈھ دینا گھناونی حرکت اور گستاخی ہے اور پھر یہ فرمان رسول ﷺ ہے کہ جس نے میرے بارے غلط بات مجھ سے منسوب کی اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے،۔(نعوذ باللہ) صحابی رسول ایسی بات آپ ﷺ سے منسوب کر سکتا ہے جو امر واقع نہ ہو۔(۵) اگر حضرت انسؓ کے مساعد کوئی شہادت نہیں تو کیا ان کے واضح بیان کے خلاف کوئی شہادت اس کی تردید یا تشکیک پر موجود ہے اس کا جواب نفی میں ہو تو گویا ایک جانثار صحابی کی تکذیب کی ہمت کیونکر کی جائے (۶) جہاں تک شق کو اصلی کی بجائے اصطلاحی معنوں میں بدل لیا ہے کہ شق صدر، شرح صدر ہے۔ حدیث میں شرح صدر کا لفظ نہیں ہے، شق صدر کا لفظ ہے پھر عینی شاہد جس نے سینہ مبارک پر سلے ہوئے نشانات کا مشاہدہ کیا، ان اوامر کے ہوتے ہوئے اس واقعہ کو اصطلاحی معنوں اور تاویلات کی بھینٹ چڑھا کر انکار کرنے سے کیا فائدہ؟ اس حدیث پاک کو بیان کرتے ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جبرائیل رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اس وقت آپ بچوں میں کھیل رہے تھے، انہوں نے آپ کو چت لٹا دیا اور قلب مبارک چیر کر اس میں سے جمے ہوئے خون کا ایک ٹکڑا نکال دیا اور کہا کہ آپ میں یہ تھا شیطان کا حصہ جس کو میں نے نکال کر پھینک دیا ہے۔ پھر آپ ﷺ کے قلب مبارک کو زم زم کے پانی سے ایک سونے کے طشت میں ڈال کر دھویا، پھر اس کو سی دیا اور اپنی جگہ رکھ دیا۔ بچے آپ کی دودھ پلائی ماں کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور اطلاع دی کہ محمد رسول اللہ ﷺ قتل کر دیئے گئے ہیں

۔لوگ آپ کو دیکھنے نکلے تو آپ کا رنگ فق ہوا تھا حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ اس سلائی کا نشان آپ ﷺ کے سینہ مبارک میں دیکھا کرتا تھا۔'' (ترجمان السنہ۔۴۔۷۴)

فرشتہ کی آمد' آپ کو چت لٹانا' سینہ چاک کرنا' جما ہوا خون نکالنا اور اسے شیطانی حصہ کہنا' قلب کو آب زم زم سے دھونا' سینہ کو سینا اور قلب مبارک کو اپنی جگہ رکھنا' بچوں کا حلیمہ سعدیؓ کو اطلاع دینا' آپ کے قتل کا بتانا (نعوذ باللہ) لوگوں کا دوڑتے ہوئے آنا' آپ کا رنگ فق ہونا ٹانکوں کے نشانات کو دیکھنا' ہر ہر لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ''شق صدر'' ہے شق صدر کی گواہی ہر فقرہ دے رہا ہے اس پر علم لدنی کہنے والے یا شق صدر کو شرح صدر بیان کرنے والے ان تفصیلات کے ہوتے ہوئے بھی اپنے موقف پر کیوں مصر ہیں؟ اپنے موقف پر ڈٹے رہنے میں علمی ناانصافی اور تاریخ اسلام کے باب میں ایک نئی چیز کو داخل کرنے کی جرات اور زیادتی ہے۔علم لدنی میں تو سب انبیاء شریک ہیں حضرت خضرؑ بھی شریک ہیں جیسا کہ ''واعلمنہ من لدنا علما'' سے ظاہر ہے حالانکہ ان کی نبوت میں اختلاف ہے تو کیا دیگر انبیاء کے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش آیا؟ اس کا جواب نفی میں ہے تو آپ کے اس واقعہ کو کیوں تسلیم نہ کیا جائے؟ قابل غور بات تو یہی ہے کہ علم لدنی میں سب انبیاء شریک ہیں کہیں دیگر انبیاء کی سیرتوں میں ان واقعات کی اس طرح کی تفصیلات ملتی ہیں جس طرح آپ ﷺ کی سیرت کے متعلق پائی جاتی ہیں تو پھر ان تاویلات سے واقعہ ہذا کو چیستان بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

اعتراض نمبر ۵۵

مذکورہ مسلم شریف کی حدیث پر فن حدیث کے لحاظ سے یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ اس واقعہ کا راوی ''حماد بن مسلمہ'' ہے جس کو آخری عمر میں سوء حفظ طاری ہو گیا تھا اور اس کی یہ روایت اسی زمانے کی قرار دیتے ہیں۔

جواب: مذکور حدیث کو امام مسلمؒ اپنی کتاب مسلم شریف میں بیان کرتے ہیں لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ ایسی تہمت امام مسلمؒ کے سر تھوپ دی جائے وہ تو امام ہیں جبکہ عام محدثین کو بھی اس قسم کے روایوں کی روایت کی خبر ہے کہ وہ روایات جو سوء حفظ سے پہلے کی ہیں اور وہ روایات جو سوء حفظ کے بعد کی ہیں ۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو یہ علم شیوخ وتلامذہ پر غور کرنے سے حاصل ہوتا ہے کہ کس راوی نے کس شیخ سے اس زمانہ میں شاگردی کی' جس شاگرد نے سوء حفظ سے پہلے کی روایت اخذ کی وہ معتبر سمجھی جاتی ہے جبکہ سوء حفظ کے زمانہ کی روایات محل نظر ہوتی ہیں۔امام مسلم کا اس حدیث کو نقل کرنا ثابت کرتا ہے کہ یہ سوء حفظ سے پہلے کی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ امام فن کی شہادت پیش کی جائے۔

امام بیہقی: کہتے ہیں کہ حماد بن مسلمہ مسلمانوں کے آئمہ ہیں لیکن آخر عمر میں ان کا حافظہ جاتا رہا تھا

اس لیے امام بخاری نے ان کو بالکل ترک کر دیا لیکن امام مسلم نے وہ حدیثیں اپنی صحیح کے لیے نکال لیں جوانہوں نے ثابت سے اپنے سوء حفظ سے پہلے روایت کی تھیں اوراس کے سوا جو حدیثیں انہوں نے ثابت سے روایت کی ہیں جن کی تعداد بارہ حدیثوں تک نہیں جا پہنچتی' وہ صرف شواہد میں روایت کی ہیں اصول میں نہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ ثابت کے شاگردوں میں سب سے قابل اعتماد شخص حماد بن مسلمہ ہے۔

ابن مدینی: کہتے ہیں جو شخص بھی حماد بن مسلمہ میں کلام کرے اس کو دین میں قابل تہمت سمجھو وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اصحاب ثابت میں سب سے زیادہ قابل اعتماد حماد بن مسلمہ سلیمان پھر حماد بن زید اور یہ سب روایات صحیح ہیں۔ (ترجمان السنہ۔۴۔۷۷۔۷۶)۔حماد بن مسلمہ کی روایت پر سوء حفظ کا حکم لگانا اہل فن کی تصریح کے خلاف ہے وہ ایسے اشخاص کے حافظہ کے اول وآخر کو جانتے سمجھتے ہیں اور امام مسلم جیسا محدث بھلا کب اس بات سے باخبر نہیں ہوگا؟۔ رہا امام بخاری کا کہ انہوں نے ان سے (حماد) حدیث روایت نہیں کی تو یہ ان کی شان احتیاط ہے (۲) شرائط اگر امام بخاری نے اپنی کتاب میں خاص مقرر کر لی ہیں تو اس سے یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ اب جو راوی ان کی کتاب میں نہیں آیا' اس میں نقص ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہے ورنہ تو پھر صحیح مسلم کی ایک حماد بن مسلمہ کی روایت ہی نہیں بلکہ وہ تمام روایات جو امام بخاری کی شرائط پر نہیں ہیں تو ہمیں چھوڑ دینی پڑیں گی۔لہٰذا آنحضرت ﷺ کی اس ممتاز ومنفرد صفت جو حیثیت میں شق صدر کی مذکور ہوئیں' سے انکار کرنا جائز ومناسب نہیں۔اس سے انکار شق صدر کی تحقیق نہیں بلکہ ایک ثابت شدہ حدیث میں مذکور واقعہ کی تحریف کے مترادف ہے۔آپ ﷺ کی شان تو' ورفعنا لک ذکرک ہے۔ (حوالہ بالا)

بر زمیں کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

اعتراض نمبر ۵۶

شق صدر سے متعلق روایتیں ایسی ہیں کہ ان کی باہمی تطبیق نہیں ہو سکتی اور اس لیے وہ سب کی سب نامعتبر ہیں۔ (خطبات احمدیہ۔۴۰۲)

جواب: سرسید کی نظر سے ابن حجر کی تطبیق کی تحقیق نہیں گزری اگر وہ مطالعہ کر لیتے تو امید ہے کہ وہ تطبیق نہ ہونے کو زیر بحث نہ لاتے۔معترضین نے اتنا تو تسلیم کیا کہ "چار موقعوں کو (شق صدر کے) حافظ ابن حجر نے جو ہر اختلاف روایت ایک نیا واقعہ تسلیم کر کے مختلف روایتوں میں تطبیق کی کوشش کرتے ہیں' تسلیم کیا ہے۔" علمائے حق نے اس قسم کی تشکیکات کا صدیوں پہلے رد کر دیا تھا چنانچہ ملا علی قاری نے شرح مشکوۃ میں اس

حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ حدیث اور اس طرح کی (مافوق العادۃ) دیگر حدیثوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیے اور مجازی معنوں پر محمول کر کے تاویل نہیں کرنی چاہیے' کیونکہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ تو قادر مطلق کے کرشمے ہیں جن کے بارے میں ایک تصدیق شدہ سچے نے خبر دی ہے پھر تاویل کی کیا حاجت؟ (سید الوری۔ ج ا۔ ص ۱۲۵۔ حاشیہ)

اعتراض نمبر ۵۷

سید سلیمان ندوی نے ایک اور اعتراض بھی داغ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہ بات ہر شخص کو کھٹک سکتی ہے کہ سینہ مبارک کا آلودگیوں سے پاک و
صاف ہو کر منور ہو جانا' ایک دفعہ ہو سکتا ہے پھر دوبارہ پاکی و طہارت کا محتاج نہیں ہو سکتا''۔ (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ ۳۵۰)

جواب: معترضین کے دلوں میں یہ بات سب سے پہلے کھٹکنی چاہیے تھی کہ آلودگی کا یہ حصہ جو شق صدر کے بعد سینہ چاک کر کے الگ کیا گیا اگر شروع ہی سے پیدا نہ کیا جاتا' تو پھر اس شق صدر کی ضرورت ہی نہ پڑتی لیکن قدرت کا منشاء یہی تھا کہ اپنی خصوصی تربیت کا اظہار کرے' یہ پرورش و تربیت تدریج کا متقاضی ہے اس لیے اللہ تعالی قدم قدم پر یہ ظاہر فرما دے کہ محمد ﷺ کی پرورش کسی اور کی نگرانی میں ہو رہی ہے یعنی محمد ﷺ کی پرورش اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ والد کا سایہ اٹھ گیا' والدہ اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئیں' دادا جان بھی آٹھ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے چچا اور رفیقہ حیات بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ یہ تمام رفاقتیں رفتہ رفتہ اٹھ گئیں آخر اس کی ذات کا ساتھ رہ گیا جو رب العالمین ہے۔ وہ انبیاء و رسل کو تنہا نہیں چھوڑتا۔

(۲) نور محمدی سالہا سال سے ارحام مقدسہ سے گزرتا ہوا آ رہا تھا اب وہ گھڑی آ پہنچی کہ اس نور کا ظہور ہوا' وہ نور رسیدہ آمنہؓ کے بطن مبارک سے جلوہ گر ہوا' اس لیے یہ ممکن اور مناسب نہیں تھا کہ وہ قالب انسانی کے خواص سے بالکل خالی ہوتا' اس کے باوجود مشیت ایزدی تھی کہ آپ تمام دوسرے ابشار سے علیحدہ و ممتاز رہیں۔ اس کے لیے مقدس فرشتہ جبرائیل آتا ہے اور وہ مقدس پانی لے کر صاف کرتا ہے' آپ کے جسد مبارک میں یہ حصہ بھی نہ رکھا جاتا تو ہو سکتا ہے کہ عالم اسباب کے تحت جب یہ قالب مبارک اسی صورت میں منتقل ہوتا آ رہا تھا جس طرح عام انسانی قالبوں کا انتقال ہوتا ہے تو ان خواص و صفات سے علیحدہ رہنا کیسے ممکن تھا؟

(۳) آپ ﷺ کی ولادت نوع انسانی کے دستور کے مطابق ہوئی اس لیے اس شیطانی حصہ کا ہونا ضروری تھا جو عہد طفولیت میں ہوئی جس کو نکال کر پھینک دیا گیا اور ایمان و حکمت سے بھرے سونے

کا طشت آپ کے قلب مبارک میں ڈال دیا گیا اور وہ بھی آب زم زم سے دھو کر روح القدس جیسے مقدس فرشتے کے ہاتھوں سے۔

(۴) ہمارے نزدیک قدرت کی یہ حکمت بہت زیادہ قابل غور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ' دونوں ولادتوں میں جس فرشتہ کا تعلق ہے وہ جبرائیلؑ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اسرائیلی سلسلے کے آخری نبی کی تخلیق ہی ملکی تھی اور سب سے آخری نبی کی تخلیق گو بشری تھی مگر تطہیر ملکی تھی۔ دونوں مقامات میں صبغ اللہ الذی انفس کل شیء کا نظارہ ایک سے ایک بڑھ کر تھا لیکن یہ بحث کہ عالم بشر کی تکمیل کی صورت ان دونوں میں کون سی کامل تر تھی اس کا کچھ فیصلہ ہر دو رسولوں کی بعثت کے آثار کی طرف نظر کرنے سے ہو سکتا ہے نیز حضرت عیسیٰؑ کے دور اول میں گو ملکیت کے عجیب سے عجیب تر نظارے دنیا نے دیکھے اور رسولوں کے لیے بشریت کا مظاہرہ بھی کتنا ضروری ہوتا ہے: اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزول کے بعد اور ان کی بشریت کے نظارے بھی جب تک دنیا اسی شد و مد کے ساتھ دیکھ نہ لے اس وقت تک مسیحؑ کی وفات نہ ہوگی۔ آخر وہ بھی اس جگہ آکر مدفون ہوں گے جہاں آنحضرت ﷺ ان سے پہلے مدفون ہیں۔۔ پھر ان انبیاء کی عظمت کا حال یہ ہے کہ یہ وہ معصوم ہیں جن کی فطرت کو اور طرح سے معصوم بنایا جا رہا ہے تا کہ گناہ کا صدور تو درکنار اس میں کسی ادنیٰ سی معصومیت کی طرف میلان بھی نہ رہے۔ اس لیے یہ وہ معصوم ہیں جو گناہ کرنا جانتے بھی نہیں اب اندازہ کیجئے کہ تطہیر کی اساس میں اس طرح عصمت کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے تو اس تطہیر کی عظمت کا کیا حال ہوگا۔ (ترجمان السنہ۔ ج ۳ ص ۳۶۸۔۳۷۰)

اعتراض نمبر ۵۸

واٹ نے ابن اسحٰق کی روایات کے مطابق دو فرشتوں (شق صدر) اور بحیرہ راہب کے واقعات کا ذکر کیا ہے اور یہ تنقید کی ہے کہ نبی کی پیدائش اور شادی کے درمیان ایک چوتھائی صدی کے عرصہ میں جو واقعات پیش آئے ان کے لیے ایک قاری کو ٹھوس بنیادیں نہیں ملتیں۔

جواب: پیدائش اور شادی کے درمیان عرصہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے انکار کر رہا ہے جس میں یہ ایک محیر العقول واقعہ شق صدر بھی ہے۔ اگر راہب کا واقعہ محل نظر ہے اور تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو دونوں فرشتوں کے ذریعے شق صدر کے واقعہ کو کیوں نہیں مانا جاتا حالانکہ ابن ہشام' ابن سعد اور بلاذری جیسے سیرت نگاروں اور مورخین کے علاوہ امام مسلم اور امام احمد جیسے محدثین نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ مزید برآں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس واقعہ کا تعلق غیبی سرچشمہ سے ہے' جس کے بعد نبی کی ذات تاریخ کے عقلی تجزیہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ پیدائش اور شادی کے درمیان ایک چوتھائی صدی کے واقعات پیش آئے ان کے لیے ایک قاری کو ٹھوس بنیادیں نہیں ملتیں۔

اس کا جواب اعتراض نمبر۲۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اعتراضات: معتزلہ نے شق صدر کی احادیث پر اعتراضات کیے ہیں ان کا کہنا ہے کہ شق صدر کی روایات کا تعلق آپ کے بچپن سے ہے اور معجزات ہیں' اس وقت آپ نے اعلان نبوت نہیں فرمایا تھا تو اعلان نبوت سے پہلے معجزات کیسے؟

جواب: اعلان نبوت سے پہلے جو خلاف عادت امور ظاہر ہوں' ان کو ارہاص کہتے ہیں یہ بکثرت انبیاء سے ثابت ہیں۔

(۲) قلب کو دھونے سے لازم آتا ہے کہ اس میں گناہ ہے یا میل ہو' نیز دھویا جسم کو جاتا ہے جبکہ گناہ اور میل از قبیل معانی ہیں۔ جواب: دھونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کے گناہ ہیں بلکہ زم زم کے پانی کو برکت پہچانے کے لیے آپ کے قلب اطہر کو دھویا گیا۔

(۳) آپ کے قلب سے جما ہوا خون نکالا گیا اس کے متعلق حدیث میں ہے کہ آپ کے قلب میں شیطان کا حصہ ہے یہ آپ کی شان کے لائق نہیں۔؟ ۔۔جواب: اس جمے ہوئے خون سے مراد وہ چیز ہے جو ہر انسان کے قلب میں ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان گناہوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور عبادات ترک کر دیتا ہے۔ جب آپ ﷺ کے قلب سے اس چیز کو زائل کر دیا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ ہمیشہ اطاعت اور عبادت کرتے رہیں گے اور گناہوں سے مجتنب رہیں گے اور اس سے آپ ﷺ کے قلب میں فرشتوں کے لیے یہ علامت ہو جائے گی کہ آپ گناہوں سے معصوم ہیں اور اللہ تعالیٰ مالک ہے' وہ اپنی مخلوق پر جو چاہتا ہے' وہ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے' وہ حکم کر دیتا ہے۔

(۴): حافظ بدرالدین عینی اور حافظ شہاب الدین عسقلانی لکھتے ہیں ''اس حدیث میں مذکور ہے کہ اس طشت میں ایمان اور حکمت تھے اس پر اعتراض ہے کہ ایمان اور حکمت از قبیل معانی ہیں وہ طشت میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ جواب: ایمان اور حکمت کے معانی کو جسم کی شکل دے دی گئی تھی' جس طرح اعمال کا وزن بروز محشر کیا جائے گا۔

(۵) اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سونے کا استعمال مردوں کے لیے حرام ہے تو سونے کے طشت چہ معنی دارد؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سونے کی تحریم سے پہلے کا واقعہ ہے اور یہ تحریم دنیا کے احوال کے ساتھ مخصوص ہے اور معراج کے غالب احوال کا تعلق آخرت سے ہے کیونکہ اکثر احوال کا تعلق غیب سے ہے۔ (تبیان القرآن۔ج ۱۲۔ص ۸۵۳)

شق صدر کے واقعہ سے حضرت حلیمہؓ کے شوہر کو اندیشہ ہوا کہ واقعی کوئی بچے کو گزند نہ پہنچ جائے چنانچہ اپنی بی بی سے کہا کہ اس بچے کے سبب برکات بے انداز سمیٹی ہیں اور فلاں گھرانہ ہم سے حسد رکھتا

ہے اور بچے کے ساتھ جو کچھ ہوا ان کا ہی کیا ہوا لگتا ہے تو بہتر ہے یہ امانت ان کے ورثاء کے حوالے کر دی جائے۔ عرصہ پانچ سال کا بیت چکا تھا آخر کار حلیمہ سعدیہؓ اپنے سوہنے من موہنے کو با دل نخواستہ سیدہ آمنہؓ کے پاس لے آئیں۔

سیدہ آمنہؓ کی وفات

سیدہ آمنہؓ اپنے شوہر کی وفات کے بعد ان کی قبر کی زیارت کے لیے نہیں جا سکی تھی۔ اب انہیں موقع ہاتھ لگا تو اپنے لخت جگر کو جن کی عمر چھ سال کے لگ بھگ تھی اور ام ایمن کو ساتھ لیے شوہر کے مزار پر حاضری دینے کے لیے سوئے مدینہ روانہ ہوئیں۔ ایک ماہ قیام کرنے کے بعد واپسی کا راستہ لیا۔ قدرت خدا کی دیکھیے کہ راستے میں بیمار ہوئیں اور ابواء کے مقام پر پہنچیں تو ان کا آخری وقت قریب آ گیا اور وفات پا گئیں ابواء کے مقام پر دفن کر کے ام ایمن سید الصادقین ﷺ کو لے کر مکہ آئیں اور عبدالمطلب کو اس واقعہ سے آگاہ کیا آپ کو بہت دکھ ہوا' ولادت سے پہلے باپ چل بسا اور اب والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں اس حال میں یتیم پوتے کو سینے سے لگا کر رو پڑے انہوں نے آپ ﷺ کو اپنی کفالت میں لے لیا اور والدین کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

اہم نکتہ: بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سیدہ آمنہؓ مدینہ میں اپنے رشتے داروں کو ملنے گئی تھیں یہ بعید از قیاس ہے کیونکہ سیدہ آمنہ کی اپنی ذاتی رشتہ داری نہ تھی۔ اگر یہ بات کہی جاتی کہ سیدہ آمنہؓ اپنے سسرال کے رشتہ داروں سے اپنے نور نظر کی شناسائی کے لیے تشریف لے گئی تھیں تو بجا ہوتا کیونکہ وہ سسرالی رشتہ دار تھے اور سسرال کی ننھیال بہت دور کی رشتہ داری کی بات ہے اور علامہ شبلی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک بعض مورخین کا یہ بیان درست ہے کہ حضرت آمنہؓ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے گئی تھیں جو مدینہ میں مدفون تھے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آمنہ بی بیؓ اپنے شوہر کے مزار پر حاضری دینے کی غرض سے مدینہ گئیں۔ یہ بات دل کو لگتی ہے اور عقل اس کی تائید کرتی ہے کہ انہیں اپنے شوہر کی وفات کے بعد ان کے مزار پر جانے کا موقع نہیں ملا تھا اور زیارت نہ کر سکی تھیں اس غرض سے آمنہ بی بیؓ مدینہ گئی تھیں۔

قدرت کی معجز نمائی: حضرت عبداللہ تجارت کی غرض سے اپنا سامان تجارت لے کر شام گئے راستے میں بیمار ہوئے' مدینہ میں ٹھہر گئے لیکن مرض میں افاقہ نہ ہوا، اور اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بیماری سے شفایاب نہ ہو سکے اور وفات پا گئے۔ حضرت عبدالمطلب نے اپنے بیٹے حارث کو بھائی عبداللہ کی خبر گیری کے لیے بھیجا مگر قدرت کو دو بھائیوں کی ملاقات منظور نہ تھی اور حارث اس وقت پہنچے جب عبداللہ اس دار فانی کو چھوڑ چکے تھے۔ آپ ﷺ کی والدہؓ بھی مدینہ منورہ سے واپسی پر بیمار ہوئیں صحت یاب نہ ہو سکیں اور ابواء کے مقام پر انتقال کر گئیں۔ حضرت عبداللہ بھی راستے میں بیمار ہوئے اور مدینہ

میں موت کو گلے لگا لیا ادھر حضرت آمنہؓ بھی راستے میں بیمار ہوئیں اور چل بسیں۔

روایات واضح نہیں ہیں: بنوسعد سے آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا گویا چھ سال کی عمر میں آپ اپنی والدہ کے ہمراہ مدینہ منورہ گئے۔ یہ بات واضح نہیں کہ اس سفر کا مشورہ حضرت عبدالمطلب کا تھا یا سیدہ آمنہؓ نے اپنے تیئں فیصلہ کیا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خواجہ عبدالمطلب نے خود ہی سیدہ آمنہ کو بیوگی کا غم ہلکا کرنے کے لیے کہا ہو کہ وہ مدینہ گھوم پھر آئیں اور وہاں ہمارے رشتے داروں سے اپنے گوشہ جگر کو روشناس کرائیں اور اپنے شوہر کے مزار پر حاضری بھی دیں۔

اعتراض نمبر ۵۹

اس میں شک نہیں کہ آپ کی والدہ اور آپ ﷺ کے دادا کی ننھیال کے درمیان محبت کا رشتہ موجود تھا جن کے خاندان میں آپ ان کی (سیدہ آمنہؓ) وفات تک رہے تھے۔اس وقت آپ کی عمر چھ سال کی تھی۔(واٹ)(ضیاالنبی۔۷۔۲۲۱)

(۲) مدینہ میں قیام کے دوران آپ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہتے، مکان کی چھت پر بیٹھے پرندوں کو اڑاتے تھے۔حدیبیہ سے مدینہ جاتے ہوئے آپ ﷺ والد کی قبر پر رو پڑے ان سب باتوں پر سر ولیم میور کو اعتراض ہے۔

جواب: ''واٹ'' آپ ﷺ کے بچپن کے واقعات جیسے عقیقہ' نام رکھنا' رضاعت' دو سال بعد حلیمہؓ کا لے آنا اور دوبارہ صحرائی گھر میں لے جانا اور پھر پانچ سال کی عمر میں سیدہ آمنہؓ کے سپرد کرنا' کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے اور چھ سال تک کا عرصہ اپنی والدہ کے ہمراہ ننھیال میں گزارا لکھتا ہے۔ایسے تاریخی واقعات جن کی تائید ماخذ کرتے ہیں لیکن واٹ ان کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔اس سے وہ ایک اور خواہش پوری کرنا چاہ رہا ہے وہ یہ کہ دودھیال کے ہاں بچے کی پرورش نہ ہوسکتی تھی اس لیے والدہ اپنے ننھے منے لعل کو دادا کی ننھیال میں لے آئی' جہاں ان کی پرورش ہوئی ددھیال بچے کا خرچہ اٹھا نہ سکتے تھے۔مستشرق دور کی کوڑی لایا ہے لیکن وہ جانتا ضرور ہے مگر بے خبر بنا ہوا ہے اسے علم ہے کہ پیدائش ہی سے کفالت کی ذمہ داری آپ کے دادا جان نے لے لی تھی۔حلیمہ سعدیہؓ کو رضاعت کا انعام واکرام دیا' عقیقہ کیا' نام رکھا وغیرہ یہ سب کچھ مکہ میں ہوا اور آپ کے دادا جان نے یہ سارے کام سرانجام دیئے۔(۲) اگر ان کا خرچہ ددھیال نہیں اٹھا سکتے تھے تو آمنہ بی بیؓ اپنے نومولود کو مکہ واپس نہ لاتیں اور کبھی واپسی کا نہ سوچتیں۔آپ ﷺ چار سال اور بعض روایات میں پانچ سال تک اپنی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں رہے لیکن واٹ اس مدت کو بھی ننھیال کی نذر کر دیتا ہے جبکہ ولادت سے لے کر وفات والدہ تک کے تمام واقعات کو نظر انداز کر کے ''حطی'' اور ''لامنس'' کا ہمنوا بن جاتا ہے۔حطی کہتا ہے کہ حضور ﷺ

کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا اور لامنس لکھتا ہے کہ آپ ﷺ کی مکی زندگی کے حالات افسانہ ہیں۔ واٹ ان سے دو قدم آگے بڑھ گیا اور چھ سال تک کے واقعات کو اس دلیل سے بیک جنبش قلم قلمزد کر رہا ہے کہ والدہ کی وفات تک دادا کے ننھیال میں رہے۔ یہ سراسر ماخذ کے خلاف ہے اور واٹ کی ہرزہ سرائی ہے حالانکہ اس مستشرق کو یہ بھی خبر ہے کہ آپ کی والدہ آپ ﷺ کی عمر کے چھٹے سال مدینہ گئیں۔ وہاں ایک ماہ تک قیام کیا' بعدازاں واپسی پر بیمار ہوئیں اور اس دنیا سے چل بسیں اور ابواء کے مقام پر دفن ہوئیں اور ننھے لعل کو ام ایمن مکہ لائیں اور دادا کے سپرد کیا اور دادا جان نے اپنی وفات تک ان کی کفالت کی اور ان کی وفات کے بعد ابوطالب نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ واٹ کی یہ سوچ اور تحقیق کے صدقے جائیے کہ چھ سال تک کے واقعات تسلیم نہیں کرتا گویا اسے چھ سال اور ایک ماہ کے فرق کا پتہ نہیں۔ ایک ماہ کے قیام کو چھ سال کا قیام بنا ڈالا واہ رے واٹ تیرے علمی تبحر کی لہراں بہراں' ایک کو بہتر (۷۲) بنا دے اور بہتر کو ایک بنا دے اسے سب توفیق ہے لیکن وہ اتنا بھولا نہیں وہ تو صرف شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے اور دشمنی کی بھڑاس ایسے بے بنیاد الزامات اور مفروضات کے بل بوتے پر نکالتا ہے۔ ع اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ یعنی ڈاکٹر محمد حمید اللہ ننھیال میں دو سال قیام کا لکھتا ہے شکر ہے کہ وہ مذکور واقعات کو تسلیم کرتا ہے اور وہ صرف یہ کہتا ہے کہ چھ سال کی عمر میں آپ کی والدہ مدینہ گئیں وہاں دو سال قیام کیا گویا آپ ﷺ وہاں آٹھ سال کی عمر تک رہے۔ یہ درست نہیں کیونکہ چھ سال کی عمر میں اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے اپنے لخت جگر اور ام ایمن کے ہمراہ مدینہ تشریف لے گئیں' ایک ماہ قیام کے بعد واپسی کی راہ لی راستے میں بیمار ہوئیں اور انتقال کر گئیں۔ ابواء کے مقام پر دفن ہوئیں۔ ام ایمنؓ آپ ﷺ کو مکہ لے آئیں اور سرکار دو عالم ﷺ کو دادا کے سپرد کیا انہوں نے اپنی وفات تک اپنے پوتے کی کفالت کی۔ دادا کی وفات کے وقت آپ کی عمر آٹھ سال تھی گویا ڈاکٹر صاحب جو دو سال کو عرصہ مدینہ میں قیام کا لکھتا ہے وہ دو سال کا عرصہ آپ ﷺ اپنے دادا کی کفالت میں رہے۔ ڈاکٹر صاحب دادا کی کفالت کے دو سال کو شمار نہیں کرتے۔ یہ ان کی بھول ہے کیونکہ تاریخی ماخذ اس کے خلاف اور اس کا رد کرتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۵۹ کا دوسرا جز

مدینہ میں قیام کے دوران آپ بچیوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہتے' مکان کی چھت پر بیٹھے پرندوں کو اڑاتے تھے۔ حدیبیہ سے مدینہ جاتے ہوئے آپ ﷺ والد کی قبر پر رو پڑے' ان سب باتوں پر سر ولیم میور کو اعتراض ہے۔

جواب: آپ فرمایا کرتے تھے یہاں ایک لڑکی انیسہ رہتی تھی جو ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور

بنی عدی بن النجار کی باولی (کنواں) میں خوب تیرنا سیکھ لیا تھا۔ اس قلعہ کے اوپر ایک پرندہ آ کر بیٹھا کرتا تھا اور بچے اسے اڑایا کرتے تھے اور میری ماں اس گھر میں یہاں بیٹھا کرتی تھی۔ بچپن میں بچے بچیوں کے ساتھ مل کر کھیلتے تھے۔ اس سے ایک قوم کی ثقافت کا اظہار ہوتا ہے نیز بچوں کا اس عمر میں کھیل میں شریک ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

(۲) مکان پر بیٹھے پرندہ کو اڑانے میں کوئی مضائقہ نہیں، نہ جانے ولیم کو اس میں کیا خرابی نظر آئی اور اس کی وجہ بھی نہ بتا کر، بات گول کر جاتا ہے جبکہ ڈاکٹر حمید اللہ بحوالہ ابن سعد بتاتا ہے ''خاص طور پر انیسہ نامی لڑکی کے ساتھ قلعہ بند مینار کے قرب و جوار میں جو کہ اس خاندان کی ملکیت تھا اور یہ مینار کی چوٹی پر بیٹھنے والے ایک پرندہ کو وہاں سے اڑایا کرتے تھے کیونکہ وہ وہاں بسیرا کرنا چاہتا تھا اور یہ ان کی تفریح کی جگہ تھی''۔ یہ بات دل کو بھاتی ہے مگر شائد ولیم میور کا خیال ہو کہ عربوں میں پرندوں کو منحوس سمجھا جاتا تھا جیسے اگر پرندہ کسی کے دائیں جانب اڑتا ہے تو وہ اس سے برا شگون لیتا اور سفر تک موقوف کر کے گھر واپس لوٹ آتا۔ اسلام نے اس عمل کو باطل قرار دیا اور کہا کہ ناکامی اور کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ''قل کل من عند اللہ'' آپ فرما دیجئے کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ نیز ولیم کو ان بچوں پر ایسا الزام لگانے کا جواز نہیں بنتا جو جاہلیت کی تعلیمات سے بے خبر ہیں اور ابھی ان خام تصورات سے آزاد ہیں۔ اگر پرندوں کو اڑانا بچوں کی تفریح میں حائل ہونے کے سبب نہیں تھا اور انہیں محض ہلاک کرنے کے درپے ہونا تھا یا منحوس سمجھ کر اڑانا مقصود تھا تو یہ کسی صورت جائز نہیں کیونکہ بقول ڈاکٹر حمید اللہ وہ وہاں بسیرا کرنا چاہتے تھے اور یہ بچوں کی تفریح کی جگہ تھی۔ بچوں کی تفریح میں حائل ہونے کی وجہ سے پرندوں کو اڑایا جاتا تھا اور ان کی ہلاکت مقصود نہ تھی اور اس کے سوا کوئی وجہ نہیں تھی۔

(۳) آپ نے وہاں تالاب میں تیرنا سیکھ لیا تھا۔ عرب تین اوصاف کے حامل شخص کو کامل کہتے تھے جن میں ایک وصف تیراکی بھی تھا۔ ڈاکٹر محمد عجان الخطیب بتاتا ہے ''جو شخص کتابت، تیراندازی اور تیراکی کا ماہر ہوتا عرب اسے کامل کا لقب دیتے تھے۔ (ضیا النبی۔ ۷، ۱۱۰)۔ تیراکی کا فن سیکھ جانا بچوں کی فطرت کے عین موافق ہے۔ نہ جانے ولیم کو یہ فن کانٹے کی طرح کیوں کھٹکتا ہے۔؟

(۴) ولیم میور کہتا ہے کہ آپ ﷺ مدینہ سے حدیبیہ جاتے ہوئے اپنی والدہ کی قبر پر روئے اور اپنی والدہ کے لیے بخشش کی دعا مانگی۔ والدہ کی قبر انور پر حاضری دی یہ ان کا عمل اپنی والدہ سے محبت کا اظہار ہے۔ نیز یہ بھی ایک فطری عمل ہے کہ والدہ مرحومہ کی یاد آئے اور آنسو چھلک پڑیں قبر پر حاضری دینے سے اور آنکھوں کا اشک بار ہو جانے میں کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ قبروں پر حاضری دینے سے موت یاد آتی ہے۔ خدائے واحد پر یقین کامل ہو جاتا ہے اور اس ذات سے رشتہ مستحکم ہونے کا ذریعہ ہے کہ آخر اسی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس طرح

سے موت، خوف خدا اور آخرت پر ایمان میں پختگی آجاتی ہے فوت شدگان کے حق میں مغفرت کی دعا مانگنا باعث نجات ہے لیکن وہ معاشرہ جس میں زندوں کو بھی کونے لگا دیا جاتا ہے یعنی جو بوڑھے ہو جاتے ہیں ان کو اولڈ ہاؤس بھیج دیتے ہیں۔ وہ وہیں مرکھپ جاتے ہیں اور ان کی قبر کا بھی کوئی نام ونشان نہیں ملتا انہیں اپنے اسلاف کی قبروں کا اتا پتا نہیں تو وہ حاضری کہاں دیں اور ان کی آنکھیں کیونکر اشک بار ہوں؟۔ انسان کے جسم میں دل ہے وہ پتھر کا ٹکڑا نہیں اور جو رنج وغم میں نہ پسیجے وہ دل نہیں پتھر ہے۔ غالب نے خوب کہا: دل ہے نہ کہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔ رونے سے شدت غم کم ہوتی ہے غم کا بار ہلکا ہوتا ہے۔

شدتِ غم سے جو روتا ہے اسے رونے دو
اس طرح پہلوئے آرام نکل آتا ہے

اعتراض نمبر ۶۰

علم نفسیات ہمیں زندگی کے ابتدائی دور یا تین سالوں کے دردناک تجربات کی اہمیت بیان کرتا ہے کہ باپ کے نہ ہونے سے محمد ﷺ کے دل میں احساس محرومی نے جنم لیا ہوگا اور لڑکپن کے تجربات نے اس احساس کو تقویت دی ہوگی۔'' واٹ'' (ضیا النبی۔ ۷۔ ۲۲۲)

جواب: آپ ﷺ کی ولادت کی خبر دادا جان کو پہنچی تو وہ گھر آتے ہیں اور ننھے پیارے نومولود کو اٹھا کر حصول برکت کے لیے کعبہ لے جاتے ہیں وہاں عطائے خداوندی کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ان کو بیٹے عبداللہ کی نشانی سے نوازا۔ بڑے طمطراق سے عقیقہ کرتے ہیں اور مرضعہ کو بہت انعام دیتے ہیں۔ آپ کے چچا زبیرؓ انہیں گودی میں اٹھائے پھرتے ہیں۔ وہی حضرت زبیرؓ ہیں جنھوں نے ابو طالب سے درخواست کی کہ تجارتی سفر میں برکت کے لیے میرے بھتیجے کو میرے ساتھ کر دیں۔ اس بچے کے سرپرست، خیر خواہ ہیں، غریبوں، حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہوں تو بھلا آپ سے کیونکر بے اعتنائی برتیں گے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو پھر احساس محرومی کیسا! احساس محرومی تو ان بچوں کو دامن گیر ہوتا ہے جن کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ ہو، ادھر یہ حال کہ برکتوں کے لیے آپ ﷺ کو اپنے ساتھ تجارتی سفر میں لے جانے کے خواہاں ہیں۔ یہ درست ہے کہ آپ ﷺ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، ماں داغ مفارقت دے گئیں۔ بڑے صدمے ہیں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ لیکن سرپرستوں نے ایسا پیار دیا جس سے احساس محرومی کی ایک پرچھائی بھی آپ تک نہ پہنچ پائی۔ دادا جان، جس کو عزیز رکھتا ہے، چچا گودی میں اٹھائے لوریاں دیتا ہے اور کوئی چچا آپ کی ولادت کی خوشی میں اپنی لونڈی کو آزاد کرتا ہے اور آپ ﷺ کی تائیاں اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں (حضرت زبیر اور حضرت ابو طالب کی ازواج) آپ ﷺ نے فاطمہ بن اسد کو ماں کہا اور یہ فرمایا'' وہ خود بھوکا رہتیں مگر مجھے کھانا کھلاتیں۔'' آپ ﷺ کی زندگی

میں کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا جس سے آپ ﷺ میں احساس محرومی پیدا ہوا ہو' کسی ایک واقعہ کی نشان دہی کی جاتی تا کہ الزام میں جان پڑتی مگر انہیں کیا خبر وہ تو محض الزام دھرتے ہیں انہیں دلیل سے غرض نہیں۔ کوئی یہ کہہ دے کہ لڑکپن کا زمانہ خوشحالی کا نہ تھا لیکن یہ بھی درست نہیں کیونکہ کہیں بھی کوئی ادنیٰ سا واقعہ ایسا پیش نہیں آیا جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ ﷺ کا یہ زمانہ خوشحال نہ تھا۔ محرومی کے احساسات نہیں بلکہ' آپ ﷺ میں خودداری' حریت' شجاعت اور صبر و استقلال کے احساسات کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ احساس محرومی کا طعنہ دینے والوں کے لیے یہ کھلا چیلنج ہے اور جواب دیں کہ آپ ﷺ نے اپنا تعارف دادا جان سے نسبت جوڑ کر کیوں کرایا؟۔ ''انا النبی لا کذب۔ انا ابن عبدالمطلب'' یہ آپ نے سرپرستوں کو اعزاز بخشا حضرت حمزہؓ نے کمان مار کر ابوجہل کا سر پھاڑ دیا اگر ایسا نہ کیا جاتا اور بدلہ نہ لیا جاتا تو بجا طور پر کوئی منچلا طعن کرتا' اگر آج اس کا باپ حضرت عبداللہ زندہ ہوتا تو ابوجہل کو یہ جرات نہ ہوتی' اگر اس سے بدلہ نہ لیا جاتا تو ہوسکتا ہے آپ ﷺ از خود کہتے کہ کاش میرا باپ زندہ ہوتا تو بدلہ لیتا لیکن تاریخ خاموش ہے بلکہ سرپرستوں نے ہر موقعہ پر آپ کا خیال رکھا اور اپنی اولاد سے عزیز رکھا نیز کل کو ہادی عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کا مژدہ سنانے والے تھے کہ ''لا تقنطوا من رحمۃ اللہ'' (اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہوں) تو وہ از خود کیسے اللہ سے ناامید اور احساس محرومی کا شکار ہو سکتے تھے۔

اعتراض نمبر ۶۱

آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ پر الزام دھرا کہ وہ مومنہ نہ تھیں۔ (نعوذ باللہ)

جواب: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی حدیث کا ایک ٹکڑا یہ ہے ''پھر میں نے ان کے استغفار کی اجازت طلب کی تو مجھے اس کی اجازت نہیں دی اور یہ آیت نازل ہوئی''۔ ''ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی من بعد ما تبین لھم انھم اصحب الجحیم (سورۃ توبہ۔۱۱۳) ترجمہ: ''نبی اور ایمان والوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں خواہ وہ ان کے قرابت دار ہوں جبکہ ان پر ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ (مشرکین) دوزخی ہیں۔'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ نبی ﷺ کی والدہ ماجدہ مشرکہ تھیں۔ اس آیت کے شان نزول کے متعلق صحیح مسلم و بخاری کی حدیث آگے آرہی ہے۔ رہی یہ روایت تو اس کی سند ضعیف ہے اس کی سند میں ابن جریج مدلس ہے اور ابوایوب بن ہانی ضعیف ہے۔

امام ذہبی نے بھی اس پر تعجب کیا ہے اور کہا ہے کہ ایوب ہانی ضعیف ہے اور ابن حجر نے کہا کہ ابن معین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ صحیح حدیث یہ ہے ''حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی پھر آپ روئے اور جو لوگ آپ کے گرد تھے' وہ بھی روئے' پھر آپ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت چاہی تو میرے رب نے

مجھے اجازت دے دی، پھر میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی اجازت طلب کی تو مجھے اجازت نہ دی، پس تم قبروں کی زیارت کرو، یہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں"۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو سیدہ آمنہؓ کی قبر پر کھڑے ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر آپ مشرکہ (نعوذ باللہ) ہوتیں تو یہ اجازت نہ دی جاتی کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔ " ولا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ" (ترجمہ) آپ ﷺ کفار میں سے کسی کی نماز جنازہ پڑھیں نہ ان میں سے کسی کی قبر پر کھڑے ہوں" (التوبہ ۸۴، پارہ ۱۰) اب سوال یہ ہے کہ استغفار کی اجازت کیوں نہ ملی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر معصوم کے لیے استغفار کرنا موہم معصیت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کے لیے استغفار کیا جائے کیونکہ اس سے لوگوں میں یہ وہم پیدا ہوتا کہ آپ ﷺ کی والدہ نے ناجائز کام کیے تھے اس لیے ان کے لیے مغفرت طلب کرنے کی ضرورت تھی (تبیان القرآن۔ ج ۵۔ ۲۷۳)

دوم: آپ کے والدین کریمین نے بعثت سے پہلے زمانہ فترت میں وفات پائی، فترت کے زمانہ میں فوت شدگان پر عذاب نہیں ہے۔ ارشاد خداوندی ہے" و ما کنا معذبین حتی نبعث رسولا" (بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۵) ترجمہ: اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ ایک رسول بھیج نہ لیں۔" اہل کلام اور اہل اصول سے اشاعرہ نے اور شافعیہ سے فقہا نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ " جو شخص ایسے حال میں فوت ہو گیا کہ اس کو نبوت کی دعوت نہیں پہنچی، تو وہ ناجی فوت ہوا"۔ (سیرت محمدیہ اردو ترجمہ مواہب لدینہ۔ ج۔ اص ۱۲۱)

یہ سوال نہ کیا جائے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ شرک پر فوت ہوئی ہوں اور آپ ﷺ اس کے لیے استغفار کی اجازت چاہتے ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ہی آپ ﷺ کو مشرکین کے لیے استغفار سے منع کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" ما کان لنبی والذین امنوا ان یستغفر و اللمشرکین ۔(التوبہ ۱۱۳، پارہ ۱۰) (نبی اور مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں) یہ آیت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی اور والدہ کی قبر کی زیارت آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ یا فتح مکہ کے بعد کی ہے۔

علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے والدین کریمین اہل فترت میں سے تھے اور اہل فترت نجات یافتہ ہیں ارشاد ربانی ہے" و ما کنا معذبین حتی نبعث رسولا " (بنی اسرائیل ۱۵، پارہ ۱۵) ترجمہ: ہم اس وقت تک عذاب نہیں دینے والے جب تک کہ رسول کو نہ بھیج دیں) سورہ طہٰ میں ہے (ترجمہ) "اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے عذاب سے ہلاک کر دیتے تو وہ ضرور کہتے کہ اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجا تا کہ ہم ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے تیری بات کی پیروی کر لیتے۔" سورہ شعراء (۲۰۹۔ ۲۰۸) میں ہے۔ وما اھلکنا من قریۃ الا لھا منذرون ہ ذکری وما کنا ظالمین ہ (ترجمہ) ہم نے جس بستی کو ہلاک کیا تو پہلے اس بستی میں اپنے عذاب سے ڈرانے والوں کو بھیجا اور ہم ظالم نہیں ہیں (کے بغیر بتائے کے عذاب نال کر

دیں) علامہ صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سلسلہ نسب میں تمام آباء اور امہات مومن ہیں اور ان میں سے کسی کا خاتمہ کفر اور شرک پر ہوا۔ نہ ان میں سے کوئی کسی بدکاری میں ملوث رہا اور رسول کا نور ہمیشہ اصلاب طاہرین سے ارحام طاہرات میں منتقل ہوتا رہا۔ حدیث شریف میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا "میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا ہوں خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کے تمام آباء وامہات طیب وطاہر اور مومن تھے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں واثلہ بن اسقع سے روایت کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیمؑ سے حضرت اسماعیلؑ کو پسند فرمالیا اور اولاد اسماعیلؑ سے بنو کنانہ کو پسند فرمالیا اور بنو کنانہ سے قریش کو پسند فرمالیا اور بنو قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے پسند فرما لیا۔" آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ طاہرہ اور مومنہ تھیں۔ آپ پر لگایا گیا الزام باطل ہے۔

اعتراض نمبر ۶۲

سر ولیم میور کہتا ہے یہ بات یعنی ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں، پیغمبر صاحب ﷺ کے احکامات کی سختی اور شدت کی، ان لوگوں کے حق میں جو دین سے جہالت کی حالت میں مرے ہوں، ایک عجیب مثال ہے۔" (ولیم میور۔ خطبات احمدیہ۔ ۴۴۵۔۴۴۶)

جواب: سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت ﷺ کا اپنی والدہ کی قبر پر تشریف لے جانے اور بخشش کی دعا مانگنے کا ذکر کیا ہے پھر مذکورہ بالا اعتراض کر دیا اس کے جواب میں سرسید لکھتے ہیں "ہم اس روایت کی صحت اور غیر صحت کی بحث کو چھوڑ کر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور انبیاء سابقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مر گئے ہوں کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے، بلکہ زندہ آدمیوں کے لیے بت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی واحدنیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لیے ایک نہایت کارآمد اور عمدہ ذریعہ ہے۔ پس وہ شخص ایسا کرے، اس پر سختی کا الزام نہیں ہوسکتا۔ مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ بالا امر کے سبب آنحضرت ﷺ کے احکامات پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے تو رحیم عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے واسطے جو کو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں مگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کا انکار کرتے ہوں، کون سا نرم فیاضانہ اور ترحم آمیز سلوک کیا گیا ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امید پوری نہیں ہوئی، ہمارے خلاف توقع رحیم مذہب عیسائی میں غیر معتقدین کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت احکامات معلوم ہوئے۔ اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اتھسنین خطبہ کو جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں بروز ہائے معین پڑھا جاتا ہے اور تمام اہل کلیسا کی منظوری سے منظور ہوا، ان سب عقائد کے

بیان کرنے کے بعد ان کا ماننا ہر شخص پر خواہ نخواہ فرض ہے بالتصریح لکھا گیا ہے کہ یہ عیسوی عقیدہ ہے' جس پر بدوں اعتقاد رکھنے کے کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا' پس جبکہ رحیم عیسائی مذہب کے بموجب ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے اور اس لیے لکھی گئی دعائے مغفرت بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے تو عیسوی مذہب کو اس باب میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے''۔؟

اعتراض نمبر ۶۳

''آنحضرت ﷺ نے اپنی رضاعی بہن الشیما کے کندھے پر دانت گاڑھ دیے تھے اس پر ولیم میور کو اعتراض ہے۔''

جواب: ایک روز آپ ﷺ کی بڑی رضاعی بہن الشیماؓ اٹھا کر آپ کو جا رہی تھی۔ راستہ میں آپ ﷺ کو اتنا گدگدایا جس سے آپ کو کوفت ہوئی اور اپنی رضاعی بہن کے کندھے پر دانت گاڑ دیے جس سے ان مٹ نشان پڑ گئے۔ اس واقعہ کے ۵۵ سال بعد بوڑھی شیما کو اسلامی فوج کے دستے نے پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کیونکہ بنی سعد قبیلہ نے بنو ہوازن و ثقیف کی جنگ میں مدد کی اور شانہ بشانہ لڑے۔ دانتوں کے گاڑنے والا حضرت شیماؓ نے یاد دلایا اور آپ کو وہ واقعہ یاد آ گیا اور فطرت کے عین مطابق آپ نے رضاعی بہن سے وہی سلوک کیا جو ایک مشفق بھائی کو بہن سے کرنا چاہیے تھا۔ (ن۔۲۔۵۱۸)

آپ نے ان کے قبیلہ کے کم از کم چھ ہزار قیدی بھی رہا کر دیئے اور اپنی رضاعی بہن کو اونٹ' بکریاں' تین غلام اور ایک لونڈی عطا کر کے رخصت کیا۔ بڑے بڑے اور گہرے زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور اپنا نشان تک نہیں چھوڑتے لیکن ننھے آنحضرت ﷺ نے دانت اپنی بہن کے کندھے میں گاڑ دیئے اور ان سے پڑنے والے نشانات مدت العمر باقی رہے۔ یہ نشانات آپ کی شناخت کا باعث بنے' قبیلے کے قیدیوں کی رہائی کا سبب بنے بلکہ پورے قبیلہ کے لوگ رہائی پا گئے۔ آپ بھی اسلام لائیں اور پورا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا۔

نیشنلائزیشن کا خاتمہ: آپ ﷺ نے فرمایا سچی بات بہت پیاری ہوتی ہے اور مجھے سچی بات بہت محبوب ہے میں آپ لوگوں کا انتظار کرتا رہا ہوں' آپ کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے مال غنیمت تقسیم کر دیا اور قیدی بھی تقسیم کر دیئے اب یہ میرے پاس ہیں اور نہ میرے اختیار میں' کہ حکم کر کے سب کو واپس کر دوں اب آپ دو میں سے ایک بات منظور کر لیجئے۔ تم مال واپس لینا چاہتے ہو یا قیدی جو غلام بن چکے ہیں ان کو واپس لینا چاہتے ہو؟ ہوازن کے وفد نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک خاندانی شرف کے برابر کوئی چیز نہیں' ہم اپنے قیدیوں کو واپس لینا چاہتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب ظہر کی نماز پڑھ لوں تو تم لوگ اٹھ کر کہنا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو مومنین کی جانب سے سفارشی بناتے ہیں اور مومنین کو

رسول اللہ ﷺ کی جانب سے سفارشی بناتے ہیں کہ آپ ہمارے قیدی ہمیں واپس کر دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ ظہر کی نماز پڑھ چکے تو ان لوگوں نے یہی کیا۔ جواب میں آپ ﷺ نے مسلمانوں سے یوں فرمایا تمہارے یہ بھائی اہل ہوازن تائب ہو کر آئے ہیں' میں نے ان سے طے کیا ہے کہ ان کو صرف ان کے قیدی واپس مل سکیں گے۔ اب جو صاحب خوشی سے واپس کر دے تو بہت بہتر ہے لیکن جو اس کا عوض لینا چاہیں' تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جیسے ہی آئندہ ایسا موقع ہوگا کہ ہمارے پاس قبضہ میں غلام آئیں تو ان کا عوض چکا دوں گا۔ چنانچہ میں اپنا اور بنو عبد المطلب کا حصہ تمہیں دیتا ہوں۔'' آپ ﷺ کی اس رائے پر مجمع سے آواز بلند ہوئی ''ہم اس کے لیے بڑی خوشی سے تیار ہیں یعنی بلا شرط ان قیدیوں کو جواب ہمارے غلام ہیں' آزاد کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے رشتہ داروں میں چلے جائیں''۔ اس سے اسلام میں انفرادی ملکیت کا احترام بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی امیر یا خلیفہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا آرڈیننس جاری کرے جس سے انفرادی ملکیت ختم ہوتی ہے۔ نیشنلائزیشن کا اسلام میں کوئی جواز نہیں۔ بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدی لوٹا دیئے اور آنحضرت ﷺ نے سارے قیدیوں کو ایک ایک قبطی چادر بھی مرحمت فرمائی۔ (خاتم النبین۔ ص۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰)

حضرت عبد المطلب کی کفالت

اعتراض نمبر ۶۴

کفار اسلام نہ قبول کرنے کا بہانہ بناتے تھے کہ وہ دین آباء پر قائم ہیں۔ آبائی روایات کا علمبردار ہونے اور مذہبی صداقت کا مخالف ہونے کی وجہ سے آباو اجداد پر قرآن حکیم جو حملے کرتا ہے، ممکن ہے ان حملوں کے پیچھے محمد ﷺ کی وہ لاشعوری تلخی کارفرما ہو جو ان کے دل میں اس وجہ سے پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے آباء نے بچپن میں انھیں بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا'' (ضیا النبی ۷/۴۱۲)

(۲) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بہت کچھ ہوتے ہوئے عبد المطلب نے اپنے پوتے کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا اور حضور ﷺ پر خرچ نہ کرتے تھے۔ (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ ۲۸۸)

۳۔ سرولیم میور کہتا ہے کہ جب ''آنحضرت (ﷺ) دادا کے جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گئے تو لوگوں نے ان کو روتے دیکھا۔''

۴۔ مارگولیس کو دادا (عبد المطلب) اپنے پوتے (محمد ﷺ) پر مہربان نظر نہیں آتا۔ (سیرت النبی)

جواب: ''واٹ'' جانتا ہے کہ آپ ﷺ کے والد کا انتقال آپ ﷺ کی پیدائش سے چند ہفتے پہلے ہو گیا تھا۔ دادا جان نے نہایت ذمہ داری سے آپ کی نگہداشت کی، مرتے دم تک کسی کمی کا احساس تک

نہ ہونے دیا۔ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے کفالت کی ذمہ داری سنبھالی اور کفار کی دشمنی حد سے بڑھی تو پہاڑ جیسی مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور آپ کا ساتھ کسی موڑ پر بھی نہ چھوڑا۔ یہی وہ چچا ہیں جس نے نکاح کا خطبہ پڑھا، مقاطعہ قریش میں اڑھائی سال تک مصائب کے طوفان کا مقابلہ کیا اور اپنے بھتیجے کی طرف ہر آنے والے دکھ کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔آپ کا چچا زبیرؓ انھیں گود میں لیے لوریاں دیتا نظر آتا ہے۔آپ ﷺ کو بچپن میں کسی ایسے تجربہ سے گزرنا نہیں پڑا تھا جس کی وجہ سے آپ کے لاشعور میں آباء کی نفرت جنم لیتی ہو۔آپ وہ دین لائے جس نے والدین کو اُف تک نہ کہو کا درس دیا، بڑوں کی عزت کرنے کی تلقین کی، بھلا وہ ذات رحمت العالمین اپنے آباء سے کیسے نفرت کر سکتی ہے؟ ہاں مگر ان کی مخالفت محض مذہبی بنیاد پر تھی کہ وہ بت پرستی چھوڑ دیں کیونکہ بت بیکار ہیں، نہ سنتے ہیں نہ بولتے، نہ کچھ کرنے کی سکت رکھتے ہیں حتّٰی کہ ناک پر بیٹھی مکھی کو اڑا نہیں سکتے۔دنیا نے دیکھا کہ جب اللہ کے لیے تلوار لہراتی ہے۔میدان جنگ میں آمنا سامنا ہوتا ہے تو پھر کوئی قریب سے قریب تر رشتہ دار جو دین کا مخالف ہو، تلوار کی زد میں آجائے تو بچتا نہیں ہے۔ایک مرتبہ ابو بکرؓ کے بیٹے نے کہا کہ ابا جی آپ میری تلوار کی زد میں تھے مگر میں نے باپ سمجھ کر تلوار نہ چلائی، ابو بکر نے جواب میں فرمایا اگر تو میری تلوار کی زد میں ہوتا تو کبھی نہ بچتا۔ جنگ بدر میں قریبی رشتہ دار آمنے سامنے تھے اور کٹ رہے تھے۔رشتوں کا پاس تک نہ تھا۔خیال تھا تو اللہ اور اس کے رسول کا اور اللہ کے دیے دین کا۔۔آپ ﷺ کے آباء نے سوائے ابولہب کے ہر موڑ پر آپ کا ساتھ دیا۔ساتھ دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ان کے آباء کا احترام ہمیشہ کیا اور ان کی معاونت کو اعلیٰ الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا جیسے آپ نے اپنے دادا جان کے بارے میں فرمایا" انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب " بھلا دادا آپ کا ساتھ نہ دیتے۔چھوڑ دیتے تو کیا کوئی ایسے حالات میں اس کی محبت و معاونت کو اس طرح بیان کرتا؟

آپ نے پیغام توحید کی تبلیغ کی جس سے کفار بھڑک اٹھے۔وہ اپنے گمراہ آباء کے مذہب سے قطعاً کنارہ کش نہیں ہو سکتے تھے، جس پر انھوں نے رسول مقبول ﷺ کی مخالفت شروع کر دی۔قرآن کریم اس باطل مذہب کی مذمت کرتا ہے۔قرآن کریم کی اس برملا تردید پر کفار سیخ پا ہو گئے۔یہ حقیقت ہے کہ طرز کہن پر ڈٹ جانا اور نئی سچی طرز کو اپنانا نہایت کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہی بات ان کے قلوب و اذہان میں سرایت کر چکی تھی اور مستشرق کا یہ کہنا کہ قرآن کریم کے تابڑ توڑ مذمتی حملوں کے پیچھے آپ ﷺ کی سوچ کار فرما ہے۔مستشرق اس بات سے ظاہر کرتا ہے کہ قرآن کریم

آپ کی تصنیف ہے (نعوذ باللہ) اوران کے مذہب کی مخالفت آپ ﷺ کے افکار کی مرہون منت ہے۔ جب کہ یہ محض باطل ہے۔وہ اس طرح جیسے حضرت عیسیٰؑ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاری اسی طرح نبی مکرم پر بھی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔اگر مسیحؑ کی کتاب مقدس کو مانتے ہیں تو قرآن کریم کو بھی الہامی کتاب تسلیم کرنے میں کیا مجبوری اورکون سا امر مانع ہے۔ایک کو مانتے ہو، دوسری کو کیوں نہیں مانتے ؟

دوم: آپ کے ارشادات کا ذخیرہ بطور احادیث محفوظ ہے۔کلام الٰہی اور آپ کے کلام (ذخیرہ حدیث) میں واضح فرق ہے جب کہ ایک ہی زبان اقدس سے یہ دونوں چشمے ہدایت کے پھوٹتے ہیں۔ان ہدایت کے چشموں میں واضح فرق سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم آپ کی تصنیف نہیں ہے۔الہامی کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اوراس کی حفاظت کا ذمہ بھی اپنے ذمہ لیا ہے۔ارشادخداوندی ہے

''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ''(ترجمہ) ''بے شک ہم نے اتارا ہے یہ قرآن اور بے شک ہم خود اس کے نگہبان ہیں'' ()

اعتراض ۶۴ کا دوسرا جز

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بہت کچھ ہوتے ہوئے عبدالمطلب نے اپنے پوتے کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا اور حضور پر خرچ نہ کرتے تھے (سیرت اعلان نبوت سے پہلے۔۲۸۸)

۲ جب آنحضرت ﷺ دادا کے جنازے کے ہمراہ قبرستان حجر میں گئے تو لوگوں نے ان کو روتے دیکھا۔(خطبات احمدیہ۔۴۳۲)

۳۔ مارگولیس کو آپ ﷺ کے دادا (عبدالمطلب) اپنے پوتے محمد ﷺ پر مہربان نظر نہیں آتے۔ (سیرت النبی۔ج۔ا۔۱۱۶)

جواب: آپ کے دادا کی امارت کو اوپر کے اعتراض میں تسلیم کیا گیا ہے۔وہ اس فقرہ ''کہ بہت کچھ ہوتے ہوئے'' سے مترشح ہوتا ہے۔اور یہ ہے بھی حقیقت اور تاریخ اس کی گواہی میں پیش پیش ہے۔ماخذ اس بات کی پرزور تائید کرتے ہیں۔آپ نے عقیقہ کیا اور ضیافت کا انتظام نہایت دریادلی سے کیا۔مرضعہ کو انعام واکرام سے نوازا، اپنے بیٹے عبداللہ کے لیے سو اونٹوں کی قربانی دی، آپ ﷺ کی گم شدگی کے بعد بازیابی پر ہزار ناقہ اور ایک سو رطل سونا تصدق کیا اوراس موقعہ پر گائے اور بکریاں ذبح کر کے بڑی دعوت کا انتظام کیا۔کیا یہی باتیں ہیں جو اپنے ننھے منے پیارے پوتے کو بے یارومددگار چھوڑنے کی؟ کیا یہی باتیں ہیں کہ آپ ﷺ پر کچھ خرچ نہ کیا؟ بلکہ مستشرقین کے لیے چیلنج ہے کہ بتائیں کس لمحہ آپ کو بے یارومددگار چھوڑا؟ یہ بھی بتائیں کہ کس وقت دادا جان نے آپ پر خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیا تھا اور کیوں؟ یہ بھی ان کے لیے چیلنج ہے اوراس کا جواب ان کے ذمہ قرض ہے کہ بتائیں

آپ پر خرچ نہ کرتے اور بے یار و مددگار چھوڑ دینے سے ددھیال کے ننھیال کے ساتھ تعلقات خوشگوار نہ رہے ہوں اور نزاع پیدا ہوا ہو؟ ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ ﷺ کے دادا کی ننھیال کا مسلح دستہ ہی تھا جو قبا سے مدینہ لے آیا جب آپ ﷺ ہجرت کر کے قبا میں پہنچے تھے۔ وہ باہم شیر و شکر تھے۔ ان حضرات کا اعتراض محض باطل ہے۔

عبدالمطلب کی کفالت: سیدہ آمنہ کی وفات کے بعد حضرت عبدالمطلب نے اپنے پوتے کو کفالت میں لیا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر چھ سال تین ماہ تھی۔ دادا جان نے مرتے وقت اپنے بیٹے ابوطالب کو آپ کی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ آخر حضرت عبدالمطلب انتقال کر گئے۔ اس وقت آپ کی عمر آٹھ سال تھی۔ جنازہ اٹھایا گیا تو آپ ﷺ جنازہ کے ساتھ روتے جاتے تھے۔ عبدالمطلب آپؐ کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کھانا آتا تو عبدالمطلب فرماتے میرے بیٹے کو لاؤ۔ آپ ﷺ آتے تو انھیں بٹھاتے اور عمدہ عمدہ کھانے ان کے سامنے رکھتے اور کھانے کے لیے اصرار کرتے۔

اعتراض ۶۴ کا تیسرا جز

سر ولیم میور کہتا ہے کہ جب ''آنحضرت (دادا) کے جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گئے تو لوگوں نے ان کو روتے دیکھا''۔

جواب: مستشرق کو آپ کے رونے پر بھی اعتراض ہے۔ آپ کے دادا جان آپ سے بہت پیار کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کی غیر موجودگی میں کھانا نہیں کھاتے تھے (پیغمبر اسلام ۵۷ بحوالہ ابن سعد) تو ایسے محسن کی وفات پر آنسو بہانے میں تعجب نہیں، تعجب اس پر ہوتا اگر آپ کی آنکھیں اس صدمہ پر اشکبار نہ ہوتیں۔ ''رنج کے وقت دل کا ملائم ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا ٹپ ٹپ بہنا، خدائے رحیم نے انسان کے دل کی تسلّی اور اس کے رنج کو ہلکا کرنے اور غم کی تسکین کا ذریعہ بنایا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ نے بھی اس فطرت کی پیروی کی تھی جو خدا نے انسان میں رکھی ہے'' (خطبات احمدیہ۔۴۳۲)

صاحب ترجمان السنہ لکھتے ہیں کہ ''آپ ﷺ نے ہم کو یہ ہدایت کی کہ انسان کو جامع سمجھنا چاہیے جس میں قدرت کی جامعیت کا جلوہ کارفرما نظر آئے۔ اس میں اپنے محل پر شدت وقہر بھی ہو اور رحمت و کرم بھی'' اگر آپ اپنے دادا جان کے انتقال پر غمگین نہ ہوتے۔ آنکھوں سے آنسو نہ بہتے تو وہ دل پتھر ہے اس میں قدرت کی بے پناہ شفقت و رحمت کا ایک ذرہ بھر اثر نہیں۔ یہ فرشتہ کی صفت ہے کہ درد کی بے چینی و بے قراری سے نا آشنا ہو، بشری تقاضا یہ ہے اس کے دل پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں اس کی آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑی بن جائیں یا بے نور ہو جائیں'' وابیضت عیناہ من الحزن ھُو کظیم'' (حوالہ بالا۔۲۔۸۲)

مگر وہ ان صبر آزما حالات میں بھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے اور اپنے عجز و ضعف کا اس

طرح برملا اظہار کرے اور اعتراف کر کے خاموش ہو جائے ''اے ابراھیمؑ تمھاری جدائی سے ہمارا دل بے شبہ بہت دردمند ہے'' خوشی وغم کا اظہار انسانی فطرت اور شان رضا و تسلیم کے منافی نہیں ہے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ ابو یوسف لوہار کے گھر گئے۔ حضرت ابراھیم بن محمد ﷺ کی دودھ پلائی کے شوہر تھے۔ آپ نے ابراھیم کو گود میں لیا اور ان کو خوب پیار کیا، دوبارہ اس کے بعد گھر گئے تو دیکھا کہ حضرت ابراھیم دنیا سے سفر کر رہے ہیں یہ دیکھ کر آپؐ کی چشمان مبارک سے آنسو بہنے لگے۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوفؓ بولے یا رسول اللہ! آپ بھی رو رہے ہیں، آپ نے فرمایا: ابن عوف! یہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا اثر ہے، یہ کہہ کر آپ پھر آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا: آنکھیں بے شک بہتی ہیں اور بے شبہ دل بھی غمگین ہے لیکن زبان سے صرف وہ نکلے گا جو اس حالت میں خدا کی خوشنودی کا موجب ہوگا۔ اے ابراھیم! اس میں شبہ نہیں کہ ہم سب تمھاری جدائی میں دردمند ہیں''۔

مُطرّف بن الشّخّیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ مبارک سے گریہ وزاری کی آواز اس طرح گونج رہی تھی جیسے ہانڈی کے جوش مارنے کی آواز۔ دوسری روایت میں ہے کہ رونے کی وجہ سے آپ کے سینہ مبارک میں چکی کی سی آواز آ رہی تھی (ترجمان السنہ۔۳۔۳۵۸)۔ فاطمہ بنت اسد وہ خوش نصیب خاتون ہیں جن کی قبر میں سرور دوجہاں لیٹ گئے اور دعا مانگ کر باہر تشریف لائے تو شدت غم سے آنکھیں نمناک تھیں۔ انتقال کے وقت ان کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا: ''اے میری ماں! خدا آپ پر رحم کرے، آپ میری ماں کے بعد ماں تھیں۔ آپ خود بھوکی رہتیں مجھے کھلاتیں، آپ کو خود لباس کی ضرورت ہوتی مگر وہ مجھے پہناتی تھیں۔ اگر محسن کے احسانات میں آنکھوں سے چار آنسو چھلک پڑیں تو کون سی قیامت آجاتی ہے۔ ہاں یہ تعجب خیز ہے کہ اگر آنسو نہ بہائے جائیں۔ درد سے دل پسیجتا ہے اور بندہ رو پڑتا ہے۔ آپ بھی دادا جان کی وفات پر جنازہ کے ہمراہ جاتے وقت روئے تو کوئی حرج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا اثر ہے۔ اگر آپ نہ روتے تو کہا جاتا کہ مشفق وشفیق دادا کی وفات پر نہ روئے۔ وہ دادا جس نے پوتے کی ناز برداریاں کیں، عقیقہ کیا، ضیافت کی، نام نامی رکھنے کی رسم ادا کی، رضاعت کے لیے حلیمہ کے سپرد کیا اور اسے انعام سے نوازا، گم شدگی پر مال تصدق کیا اور گائے اور بکریاں ذبح کر کے ضیافت کی وغیرہ وغیرہ، یعنی ہر طرح کا خیال رکھا اب بتائیں کہ محسن کی جدائی پر نہ روتے تو کیا خوشیاں مناتے؟ یا کہیں سرور کی محفل سجاتے اور جنازہ کے ساتھ قبرستان میں تشریف نہ لے جاتے؟

کیوں جی ولیم صاحب! شائد تم نے دل کو پتھر کا ٹکڑا سمجھ رکھا ہے، جس پر خوشی وغم کا اثر نہیں ہوتا۔۔نہیں نہیں!

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

کئی موقعوں پر آپ ﷺ نے آنسو بہائے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا، مگر اس مستشرق کو ان مواقع پر الزام لگانے کی نہیں سوجھی، اعتراض نہ کیا اور صرف وفات عبدالمطلب پر آپ کے آنسو بہانے پر کیوں اعتراض ہے،؟ حد تو یہ ہے کہ اسے صرف آنحضرت ﷺ کے رونے پر اعتراض ہے حالانکہ عبدالمطلب نے بڑھاپے میں وفات پائی۔ پھر بھی درد وغم کا صدمہ اس قدر زیادہ تھا کہ مکہ کی مارکیٹ کئی روز تک بند رہی (پیغمبر اسلام۔۴۹)۔خاندان کی خواتین اور دوسری رشتہ دار خواتین نے نہ صرف نوحہ خوانی کی، مرثیے کہے بلکہ غم واندوہ میں دوچار ہو کر انھوں نے اپنے بال کاٹ ڈالے۔ آپ ﷺ نے دادا جان کی وفات پر آنسو بہائے۔ غیر آپ ﷺ کے دادا جان کی وفات سے بے حد غم سے نڈھال ہوں اور آپ ﷺ نہ روتے یہ مناسب نہ تھا حالانکہ ولیم کو زمانہ جہالت کے غم والم کے اظہار کے طریقہ کو مورد الزام ٹھہرانا چاہیے تھا جب کہ وہ درست، مناسب اور جائز طریقہ کو نشانہ تنقید بناتا ہے جو بالکل باطل ہے۔

اعتراض ۶۴ کا چوتھا جز

مارگولیس کو دادا (عبدالمطلب) اپنے پوتے (محمد ﷺ) پر مہربان نظر نہیں آتا۔(سیرت النبی۔ج اول۔ص۱۱۶ حاشیہ)

جواب: دادا جان نے شروع دن سے آپ کی نگہداشت کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ اس قدر شفقت و پیار دیا کہ انھیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ عقیقہ پر ضیافت کا انتظام، نام رکھنا، مرضعہ کے حوالے کرنے پر اسے انعام واکرام سے نوازنا، بنوسعد سے واپسی پر گمشدگی ہوئی۔ آپ کے ملنے پر انعام واکرام کی بارش کردی اور اہل عرب کو دعوت دی۔ اور سنیے، خانہ کعبہ کے سایہ میں آپؐ کے دادا جان کے بیٹھنے کے لیے فرش بچھایا جاتا تھا، کسی کی مجال نہ تھی کہ اس پر عبدالمطلب کے سوا کوئی دوسرا بیٹھے مگر آپؐ بلا روک ٹوک آ بیٹھتے، حاضرین ہٹانا بھی چاہتے تو عبدالمطلب منع کر دیتے اور فرماتے ''میرے اس بیٹے کو چھوڑ دو، بخدا اس کی خاص شان ہوگی۔ ہمام بن ثعلبہ فرماتے ہیں جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو ہمام بھی مدینہ آیا، اس نے اونٹ مسجد کے قریب بٹھا دیا اور پوچھا! ''ایکم ابن عبدالمطلب'' تم میں سے ابن عبدالمطلب کون ہیں؟ آپ کی نسبت والد کی بجائے دادا کی طرف کیوں کی گئی کیونکہ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ عبدالمطلب کی اولاد سے ایک ایسا مرد ظہور کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے گا اور اس کی رحمتوں پر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو ہدایت فرمائے گا، وہی خاتم النبیین ہوگا (مواہب ۱/۱۴۱)

ولیم نے اعتراض کیا کہ آپؐ اپنے دادا کے جنازہ کے ساتھ روتے جاتے تھے، اگر دادا آپ پر مہربان نہ ہوتے تو نہ روتے یا جنازہ میں شریک نہ ہوتے نیز اور کچھ کرتے جس سے ثابت ہوتا کہ دادا واقعی ان پر مہربان نہ تھا۔

قاضی عبدالدائم دائم (سید الوریٰ جلد اول ۱۳۰) بتاتے ہیں کہ ''سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب ، جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر کبھی کھانا نہ کھاتے تھے۔ جب دستر خوان چن دیا جاتا تو عبد المطلب حکم دیتے ''عَلَیَّ بِابنِیِ'' (میرے بیٹے کو میرے پاس لاؤ)۔آپ آتے تو کبھی ان کو پہلو میں بٹھا لیتے ،کبھی ران پر۔عمدہ عمدہ کھانے ان کے سامنے رکھتے اور کھانے پر اصرار کرتے۔ یہ سارے پہلو مہر بانیوں کے ہیں، ناراضیوں، ناخوشیوں اور ناگواریوں کے نہیں ہیں۔مہربانی اور نامہربانی کے فرق کو کوئی نہ سمجھے تو ہماری بلا سے۔

اعتراض نمبر ۶۵

''سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دادا کے لیے دعائے مغفرت طلب نہ کی اور زید بن عمرو بن نوفل کے حق میں دعائے مغفرت فرمائی''

جواب: زید بن نوفل کے بارے میں سید امیر علی "The Spirit Of Islam" کے اردو ترجمہ روح اسلام میں بحوالہ ابن ہشام بیان کرتے ہیں کہ'' زید کے رشتہ دار کے ایک بھائی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زید کے حق میں شفاعت کی درخواست کی، اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے دادا عبدالمطلب کے لیے دعائے مغفرت مانگنے پر راضی نہ تھے کیونکہ انھوں نے موت سے پہلے شرک سے توبہ نہ کی تھی، پھر بھی زید کے لیے دعائے مغفرت فرمائی'' (روح اسلام ۔۹۰ ۔۸۹)

سیرت النبی کامل مرتبہ ابن ہشام ،ترجمہ از مولانا عبدالجلیل صدیقی اور مولانا غلام رسول مہر کے صفحہ ۲۴۹ پر لکھا ہے کہ''ابن اسحٰق نے کہا، مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کا بیٹا سعید بن زید بن عمرو بن نوفل اور عمر بن الخطاب، جو ان کے بھائی تھے۔ دونوں نے رسول اللہ سے عرض کیا: زید بن عمرو بن نوفل کے لیے دعائے مغفرت فرمایئے ،آپؐ نے فرمایا'' نَعَمْ فَاِنَّهٗ یُبْعَثُ اُمَّةً وَّاحِدَةً'' (ہاں!اس کے لیے دعا کی جائے گی کیونکہ وہ واحد امت کی شکل میں زندہ کیا جائے گا، یعنی وہ اپنے عقائد کا ایک ہی فرد ہوگا)

مذکورہ دو عبارتوں میں فرق واضح ہے اور یہ جملہ ''اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے دادا کے لیے دعائے مغفرت مانگنے کے لیے راضی نہ تھے، ابن ہشام سیرت النبی کامل میں نظر نہیں آیا۔

دوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا جان موحد تھے، آپ کی بعثت سے قبل دین ابراھیمی تھا اگرچہ تحریفات کے سبب اصل دین کی روح مسخ ہو چکی تھی پھر بھی لوگ اسی دین کی پیروی کرتے تھے، وہ نکاح بھی دین ابراھیم پر کرتے اور حق مہر بھی اسی دین پر مقرر کرتے۔اس دین کی بنیادی تعلیم توحید تھی۔آپ کے دادا جان توحید پرست تھے۔ایک خدا کو ماننے والے، برائیوں سے بچنے والے اور دین ابراھیمی پر چلنے والے تھے(سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے)۔ پوتے کی پیدائش ہوئی تو انھیں حصول برکت کے لیے اللہ کے

گھر لے آئے اور دعا مانگی، اس دعا میں آپ کی درازی عمر، سردار بننے اور حاسدوں اور دشمنوں سے محفوظ رہنے کی اللہ کے حضور درخواست کی گئی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین کا اظہار دعا تھی، کسی بت کو نہ پکارا اور نہ اس سے التجا کی اور نہ ہی پوتے کے لیے امداد چاہی۔ یہ قطعی دلیل ان کے موحد ہونے پر دال ہے۔

سوم: حضرت عیسیٰؑ کے بعد تقریباً پونے چھ صدیوں کے بعد آخر الزماں نبی ﷺ تشریف لائے۔ ان درمیانی صدیوں میں نبی، اللہ کی طرف سے مبعوث نہیں ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کا دین تحریف ہو چکا تھا۔ اس طرح جب تک کوئی نبی تشریف نہ لائے، اس کی عوام تک تعلیمات نہ پہنچیں تو ان پر مواخذہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بندہ نبی کے اعلان نبوت سے پہلے یہ دنیا چھوڑ جائے تو اس پر بھی مواخذہ نہیں ہوتا۔ نبی کریم کی عمر آٹھ سال کی تھی کہ آپ کے شفیق دادا جان رحلت فرما گئے، اس بارے میں ارشاد ربانی ہے:

"وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا" (ترجمہ) "اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ ایک رسول بھیج نہ لیں"

اللہ تعالیٰ کے نظام عدالت میں پیغمبر ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے، پیغمبر اور اس کا لایا ہوا پیغام ہی بندوں پر خدا کی حجت ہے، یہ حجت جب تک قائم نہ ہو تو بندوں کو عذاب دینا خلاف انصاف ہوگا کیونکہ اس صورت میں وہ یہ عذر پیش کر سکیں گے کہ ہمیں آگاہ نہیں کیا گیا تھا پھر اب ہم پر یہ گرفت کیسی؟ مگر جب یہ حجت قائم ہو جائے تو پھر وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکتے اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے جنھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغام سے منہ موڑا ہو، اسے پا کر پھر انحراف کیا ہو۔ (تفہیم القرآن ۲/۵۰۶)

چہارم: (سیرت محمد یہ ترجمہ مواہب لدنیہ ص ۱۲۵)۔۔ اہل فطرت کی تین اقسام ہیں۔۔۔ ان میں تیسری قسم میں اہل فطرت وہ لوگ بتاتے ہیں جنھوں نے

۱: نہ شرک کیا اور نہ توحید اختیار کی،، ۲: نہ کسی نبی کی شریعت میں داخل ہوئے،، ۳: نہ اپنے نفس کے لیے کوئی شریعت اختراع کی،، ۴: نہ کوئی نیا دین اختراع کیا۔۔۔۔۔ تیسری قسم حقیقتاً وہی اہل فطرت ہیں جو غیر معذب ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے اپنے دادا جان کے لیے دعا کی درخواست نہ کی، اسی طرح آپ کے والدین کریمین کا مسئلہ ہے اور جہاں تک زید کے لیے دعا مانگنے کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے ان کے بیٹے اور ان کے بھائی کی تالیف قلبی فرمائی ہو اور دعا فرمائی۔

پنجم: غیر معصوم کے لیے استغفار یا دعا طلب موہوم معصیت ہوتا ہے۔ اس سے لوگوں میں یہ وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کے دادا جان سے کچھ ایسے کام سرزد ہوئے ہوں گے جو قابل معافی نہ تھے، ناجائز تھے، اس لیے دعا طلب نہ کی۔ حالانکہ وہ موحد تھے، نیک تھے۔ ان سے اس طرح کے کسی کام کی نسبت نہیں کی جا سکتی ہے اس لیے دعا طلب نہ فرمائی۔

کفالت ابو طالب: حضرت عبدالمطلب نے وفات سے پہلے آپ ﷺ کو ابو طالب کی کفالت میں دے دیا تھا اور ابو طالب سے فرمایا: ''کمال شفقت اور غایت محبت سے ان کی کفالت و تربیت کرنا'' ابو طالب مکہ میں معزز شخصیت تھے۔ اہل مکہ، مختلف خاندانوں اور قبائل کے لوگ آپ کی عزت کرتے تھے۔ طبرانی، عمار سے روایت کرتے ہیں ''ابو طالب جب اہل مکہ کے لیے کھانا تیار کرواتے تو اس موقع پر حضور ﷺ بھی تشریف لاتے۔ آپؐ اس وقت تک تشریف فرما نہ ہوتے جب تک نیچے کوئی چیز رکھ نہ لیتے، اس پر ابو طالب کہا کرتے تھے ''میرا بھتیجا بڑا اکرم ہے''۔

پرورش و کفالت کی ذمہ داری کس کو ملی: بعض کے علاوہ تمام اہل سیر اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سعادت ابو طالب کو ملی۔ آپ ﷺ کو ابو طالب کے سپرد کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ دوسرے چچاؤں کے مقابلے میں وہ آپ سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ یہ بھی روایت ہے ''ابو طالب اور زبیر کے درمیان قرعہ اندازی ہوئی تھی۔

اور یہ بھی مروی ہے '' آپ ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا، آپ نے ابو طالب کی کفالت کو پسند فرمایا تھا''۔ ابن قتیبہ کی کتاب کے حاشیہ میں سلام اللہ صدیقی اور شبلی کی کتاب کے حاشیہ میں محمد احسان الحق اور محفل لاہور کے خیر البشر نمبر میں محمد اسلم لکھتے ہیں ''جب تک زبیرؓ زندہ رہے، حضور کی پرورش انھوں نے کی اور ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری ابو طالب کے حصے میں آئی'' سیرت دحلانیہ کے مطابق محققین کے نزدیک یہ روایت مردود ہے کہ زبیرؓ نے پرورش کی اور ان کے بعد ابو طالب کی باری آئی۔ شاہ مصباح الدین شکیل اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں ''اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابو طالب نے آپ ﷺ کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی، اور حضرت زبیرؓ اور ان کی بیوی نے بھی حضورؐ کی نگہداشت میں برابر کا حصہ لیا'' (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ ۲۴۱)

حضرت ابو طالب کی کفالت میں

اعتراض نمبر ۶۶

ابو طالب کے بارے میں سیرت نگار یہی لکھتے ہیں۔ ۱: وہ کثیر العیال تھے۔ ۲: قلیل المال تھے اور ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی'' (سیرت اعلان نبوت سے پہلے)

جواب: مجاہد بن جبر بن ابو الحجاج سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ پر اللہ کا یہ انعام تھا کہ ان کے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا یہ کہ قریش کو سخت قحط سالی پہنچی تھی اور ابو طالب زیادہ عیال دار تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا عباسؓ سے کہا اور وہ بنو ہاشم سے زیادہ آسودہ حال تھے۔ اے عباس! تیرا بھائی ابو طالب

کثیر العیال ہے اور لوگوں کو جو غربت اور قحط سالی لاحق ہوگئی ہے وہ بھی تیرے سامنے ہے۔آپ چلیے ہم ان سے ان کے عیال کا کچھ بوجھ ہلکا کریں۔۔۔اور حضرت علیؑ کو اپنے ساتھ لے لیا اور جعفرؓ کو عباسؓ نے۔(اردو ترجمہ دلائل النبوت جلد دوم ص ۳۷۴)

کثیر العیالی کا تذکرہ اس ضمن میں کیا جاتا ہے کہ آپؐ ان کی سرپرستی میں پرورش پا رہے تھے۔ ایک شیعہ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی بھی کثیر العیالی کے قائل ہیں۔بعض حضرات نے یہ لکھا ''کھانا پورا نہ ہوتا تھا''،بعض نے لکھا'' بچے کھانے پر پل پڑتے تھے اور صرف حضورؐ اس میں شامل نہ ہوتے تھے''،بعض نے لکھا''ابو طالب کے بچوں کی ناک بہتی رہتی اور آنکھوں میں غلیظ مواد جمع رہتا اور اسے صاف کرنے کی باری نہ آتی تھی''،بعض نے کہا''ابو طالب نے اپنے کچھ بچے دوسروں میں بانٹ دیے کیونکہ روٹی پوری نہیں ہوتی تھی''۔جواباً عرض ہے کہ عرب کی ثقافت کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ بچوں کے والدین کو کم بچے ہونے کا طعنہ تو دیا جا سکتا ہے،کثیر العیالی کا طعنہ نہیں دیا جا سکتا۔کثیر العیالی کے لیے تو والدین دعائیں مانگتے نظر آتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا نے کثیر العیالی کی خواہش پوری ہونے پر اس منت کو ادا کرنے کے لیے اپنے بیٹے عبداللہ،جس کے نام قرعہ نکلا تھا،کو قربان کرنے کے لیے چھری اٹھالی تھی اور خاندان کی مزاحمت سے عبداللہؓ کے بدلہ میں سو اونٹ قربان کیے۔

دوم:حضرت عبدالمطلب اور حضرت علیؓ کثیر العیال تھے۔حضرت عبدالمطلب کی چھ بیویاں تھیں جن سے پندرہ بیٹے اور چھ بیٹیاں ہوئیں اور حضرت علیؓ کے چودہ بیٹے اور سترہ بیٹیاں تھیں اور بعض لکھتے ہیں کہ اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں تھیں۔حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ان شخصیات کو کثیر العیال کوئی نہیں گردانتا اور صرف ابو طالب کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔کیوں؟ ہبیرہ بن ابی وہب کے خاندان کے ایک فرد مغیرہ کو کیوں نہیں دیکھتے جو آدھے قاضی قدوہ اور آدھے باوا آدم بنے ہوئے ہیں(والد خالد بن ولید) تیرہ بھائی تھے اسی ولید کے بھائی ہشام کا بیٹا ابو جہل تھا،سخی تھا۔اس کا ہر وقت مہمان خانہ کھلا رہتا تھا۔ہر آنے والے کو کھانے پینے کا اذن عام تھا۔اس کی وفات سے واقعات کو تعین کرتے تھے(حوالہ بالا۔۴۳)۔ وجہ یہ ہے کہ بنو مخزوم کا قبیلہ قریش میں دولت مند،اثر ورسوخ اور عددی قوت کے لحاظ سے ایک مقتدر گھرانہ سمجھا جاتا تھا۔اس گھرانہ کے پاس منصب النسل بھی تھا،لیاقت وصلاحیت میں بھی یکتا تھا۔ولید بن المغیرہ کے تیرہ بھائی تھے۔ان کے والد کو کسی نے کثیر العیالی پر سخت سست نہیں کہا۔انہیں حرف تنقید نہیں بنایا۔ابو طالب کے فرزند عقیل کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے نو میدان کربلا میں شہید ہوئے ان میں مسلم بن عقیل زیادہ مشہور ہیں۔یہ کثیر العیالی سب کو پسند ہے مگر ابو طالب کثیر العیال نہ ہونے کے باوجود بھی لوگوں کی ہرزہ سرائی کا نشانہ بنے ہیں کیوں؟

سوم: یہ ساری کہانی اس دور کی ہے جب آپؐ ابو طالب کے ہاں پرورش پا رہے تھے۔اس وقت کی صورت حال کو دیکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے حضرت علیؓ ۲۹ سال چھوٹے ہیں۔جب آپؐ ابو طالب کی کفالت میں آئے اس وقت آپ ﷺ کی عمر آٹھ سال تھی۔حضرت علیؓ ۲۹ سال اور حضرت عقیل ۹ برس چھوٹے تھے۔چنانچہ جب حضور ابو طالب کی کفالت میں آئے،صرف طالب تھے اور وہ حضور سے عمر میں ایک سال زیادہ تھے۔۲: یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت ام ہانی اور جمانہ اپنے کس بھائی سے کتنی بڑی یا چھوٹی تھیں۔اگر فرض کیا جائے کہ یہ دونوں بہنیں بڑی تھیں تو پھر اس وقت ابو طالب کے تین بچے تھے جب آپؐ ان کے ہاں تھے۔۔اس صورت میں کثیر العیالی سے متعلق بیانات درست نہیں ہیں اور کثیر العیالی کی تہمت قابل یقین نہیں ہے۔بعد ازاں آپ کے ہاں اولاد ہوئی تو سب اولادیں چھ ہیں۔یہ صورت بھی کثرت عیال پر دلالت نہیں کرتی۔یہ تو ایک عام متوسط درجہ خاندان کے افراد کی تعداد ہے۔ایسی روایات محض بغض وعناد کا نتیجہ ہیں ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے۔بلکہ مسلمانوں کے درمیان جھگڑا اور نزاع پیدا کرنا مقصود ہے۔

اعتراض نمبر ٦٦ کا دوسرا جز

’’ابو طالب قلیل المال تھے۔ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی،بات دل کو نہیں لگتی۔وہ یوں کہ ابو طالب کا پیشہ تجارت تھا۔اپنے آباء کے پیشہ کو ہی اپنایا جیسے حضرت عبداللہ بغرض تجارت شام گئے تھے، واپسی پر بیمار ہوئے۔چند دن مدینہ میں رہے،صحت یاب نہ ہو سکے۔آخر اس جہان فانی سے جہان باقی کو کوچ کر گئے۔ان کا سامان تجارت حضرت عبد المطلب کے سپرد کر دیا ہوگا،چونکہ آپؐ ان کی کفالت میں تھے۔اس کے علاوہ شعب ابی طالب کی جائیداد اگر ان کی تھی تو قلیل المالی اور تنگ دستی خواب و خیال بن کر رہ جاتی ہے۔دو پہاڑوں کے درمیان جو گھاٹی یا تنگ میدان ہوتا ہے اسے عربی میں شعب کہتے ہیں۔یہ گھاٹی ابو طالب کو ورثہ میں ملی تھی اور آپ کی ملکیت تھی اور شعب ابی طالب کے نام سے مشہور تھی۔(ضیاالنبی ج ۲ص ۳۸۲)۔ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بقول ابو طالب کی کپڑے کی دکان بھی تھی۔ ابوطالب اپنے دادا اور باپ کی طرح شام اور یمن کے ساتھ بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔وہ دمشق، بصریٰ اور شام کے دوسرے شہروں میں فجار اور ہجر کی کھجوریں اور یمن کے عطر لے جاتے تھے اور ان کے بدلے میں بازنطینی اشیاء لاتے تھے‘‘ (روح اسلام ۔ ۸۵) ابو طالب نے خطبہ نکاح میں کہا کہ وہ (آنحضرت ﷺ) خدیجہ بنت خویلد سے نکاح کرتا ہے اور اپنے مال سے بیس اونٹ مہر مقرر کرتا ہے اور اس کا مستقبل بہت ہی تابناک،عظیم الشان اور جلیل القدر ہے‘‘۔(سیرت مصطفیٰ از عبد المصطفیٰ اعظمی ص ۶۴ بحوالہ زرقانی مواہب)۔ابوطالب کے بارے میں من گھڑت کہانیوں کا سلسلہ چل نکلا۔بعض نے کہا

کہ ابو طالب نہیں، حضرت زبیرؓ کو آپؐ کا کفیل ونگران بنایا تھا۔جس کو تاریخ غلط ثابت کرتی ہے۔تاریخ و سیرت کی کتب کم ازکم اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت عبدالمطلب نے اپنے بعد ابو طالب کو حضورؐ کا نگران بنایا۔نیز محمد احسان الحق نے ابو طالب کی سرپرستی سے انکار کرتے ہوئے لکھا ہے ''ایسے تجارتی کاروانی سفروں میں جب تک حضور کے چچا زبیر زندہ رہے، آپ ان کے ساتھ جاتے رہے'' یہ بھی لکھا ہے کہ ''ابو طالب لنگڑے تھے یا پیدائشی معذور تھے، وہ سرپرستی کیا کرتے یا تجارت کیسے کرتے''۔اگر آپ معذور تھے تو ابو طالب نے کشتی کیسے لڑی۔یا ان کی بجائے کسی اور نے لڑی تھی؟ (سیرت النبی اعلانِ نبوت سے پہلے ص۔۲۵۹)۔یہ محض الزام تراشی ہے، تہمت ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اعتراض نمبر ۶۷

''فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے کہ ابو طالب چونکہ محمد ﷺ کو ذلیل (نعوذ باللہ) رکھتے تھے اس لیے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے'' (سیرت النبی۔شبلی۔۱۔۱۷۷)

۲ سیرت و تاریخ کی عام کتب میں حضرت ابو طالب کی جز معاشی تنگ حالی داستان موجود ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ۸۔۹ یا دس سال کا یتیم بھتیجا بکریاں چرانے پر کیوں مجبور ہوتا، معلوم ہوتا ہے کہ اس دلیل میں منظر احسن گیلانی حاشیہ پر لکھتا ہے ''حضرت ابو طالب نے معاشی مشکلات سے تنگ آکر بالآخر اپنے ایک بیٹے جعفرؓ کو اپنے بھائی عباسؓ اور دوسرے بیٹے علیؓ کو آنحضرت ﷺ کے حوالے کر دیا تھا، گویا ابو طالب کی معاشی تنگی کی بنیاد پر آپ ﷺ کو بکریاں چرانا پڑیں۔'' (النبی الخاتم۔۲۸)

جواب: نسائی شریف میں نصر بن حزن سے روایت ہے کہ ایک بار اونٹوں والے اور بکریوں والے آپس میں فخر کرنے لگے۔تو سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''موسیٰؑ نبی بنا کر بھیجے گئے۔اور وہ بکریوں کو چرانے والے تھے، اور داؤدؑ نبی بنا کر بھیجے گئے، وہ بھی بکریاں چراتے تھے اور میں نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میں نے بھی گھر والوں کی بکریاں مقام اجیاد میں چرایا کرتا تھا'' (امہات المومنین۔۵۳)

بدر عالم میرٹھی کی تقریر: ''بکریاں چرانا ایک بہت معمولی چیز ہے لیکن تاریخ نبوت میں چونکہ اس کو بھی ایک اہمیت حاصل ہے اس لیے آنحضرت ﷺ کی حیات مقدس میں اس کا ثبوت بھی ملنا ضروری تھا۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ بکریاں چرانا نبوت کے ایسے لوازم میں سے ہے کہ ہر چرواہا نبوت کا دعویٰ کر سکتا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو نبی ہوا اس کی زندگی میں یہ جزئی ضرور پیش آئی ہے۔چنانچہ حضرت موسیٰؑ کا بکریاں چرانا قرآن کریم کے اشارات سے ثابت ہوتا ہے۔ارشاد ربانی ہے

''قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ (طٰہٰ ۱۸، پارہ ۱۶)

ترجمہ: حضرت موسیٰ نے کہا کہ یہ میرا عصا ہے، میں ٹیک لگاتا ہوں اس پر اور میں پتے جھاڑتا

ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لیے اور میرے لیے اس میں کئی فائدے بھی ہیں۔

اتنا سب جانتے ہیں کہ طبیعت کو غم کا خوگر بنانے کے لیے مشکل سے شاید کوئی ٹریننگ اس سے زیادہ موثر ہو، حتیٰ کہ فارسی زبان میں ایک مثل بھی بن گئی ہے ''غم نداری بز بخر'' ''غم نہیں رکھتا تو بکری خرید لے''۔ پھر انجیل میں ابھی تک حضرت عیسیٰؑ کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو جگہ جگہ بھیڑوں کے لفظ سے خطاب کیا گیا ہے، گویا ایک گمراہ امت کا نقشہ سمجھنے کے لیے جو کسی ایسے میدان میں نکل گئی ہو، جہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہو پھر چاروں طرف سے ڈاکوؤں، قزاقوں میں گھر گئی ہو، بکریوں کے لیے اس جگہ سے زیادہ کوئی نقشہ نہیں ہوسکتا جو ایک بے آب و گیاہ میدان میں بھیڑیوں کے بیچ جا پھنسا ہو، ظاہر ہے کہ ایک طرف ان کی ناسمجھی، دوسری طرف بھیڑیوں سے ان کی حفاظت کی ذمہ داری، اس پر ان کے بقاوحیات کے لیے ایسے محل میں خورونوش کا انتظام کرنا، کتنی دردسری ہے، کتنی دردمندی ہے اور کتنے نظم وہوشیاری کا محتاج ہوگا۔ اس لیے انبیاء کو انسانوں کے حوالے کرنے سے قبل تھوڑی سی ٹریننگ حیوانات سے شروع کی جاتی ہے' تاکہ وہ ان ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے لیے پہلے سے خوگر ہو جائیں۔ وہ اپنی امت کو محرمات کی چراگاہوں سے نکال اور بچا بچا کر علایق کے میدانوں میں لے جائیں اور جو ان سے بھاگ کر محرمات میں منہ ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کو پکڑ پکڑ کر کھینچ نکالیں۔ (تقریر ختم ہوئی)

انبیاء کا بکریاں چرانا امت کی گلہ بانی کا مقدمہ اور دیباچہ ہوتا ہے۔ بکریوں کو چرانے میں ہر طرف نگاہ ڈالنا ہوتی ہے۔ دوڑنے والی بکریوں کو نظم وضبط میں لانا پھر ان کو درندوں سے بچانا جہاں گلہ باں کے فرائض میں شامل ہے وہاں یہ کام ازبس مشکل ہے۔ اسی طرح امت کا گلہ باں امت کی اصلاح وفلاح اور تطہیر سیرت وکردار کرتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگنے والے افراد کو شریعت کے نظم میں لاتا ہے۔ شیطانی وسوسوں اور نفس کے مہیب درندوں سے بچاتا ہے جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث ہے۔'' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا'' میری مثل اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی۔ جب اس نے اردگرد خوب روشن کر دیا تو پروانے اور یہ کیڑے جو آگ میں گرا کرتے ہیں اس میں گرنے لگے، وہ ہے کہ انھیں روک رہا ہے، یہ ہیں ایسے عاجز کر کہ اس میں گھسے جارہے ہیں۔ اس طرح میں بھی ہوں کہ تمھاری کمر پکڑ پکڑ کر تمھیں دوزخ سے بچا رہا ہوں اور تم ہو کہ اس میں گھسے جارہے ہو، مسلم نے روایت کی اس کے ہم معنی مگر اس کے آخری الفاظ یہ ہیں'' کہ میری اور تمھاری مثل یہ ہے میں تمھاری کمر پکڑے ہوئے (کہہ رہا) ہوں دوزخ سے بچو، دوزخ سے بچو، تم مجھے عاجز کر کے اس میں گھسے جارہے ہو''۔

کہتے ہیں ایک روز ایک لیلا (بھیڑ کا بچہ) ریوڑ سے الگ ہوگیا، اس کی تلاش میں حضرت موسیٰ

دن بھرادھراُدھر دوڑتے رہے، شام کے قریب اسے پکڑ سکے۔ پکڑ کر غصہ میں اسے زودوکوب نہیں کیا، بلکہ الٹا اسے سینہ سے لگالیا اور کہنے لگے یہ تو نے کیا کیا؟ مجھے بھی تھکا دیا اور خود بھی تھک گیا۔ یہ حلم و بردباری اور ماتحتوں کے ساتھ شفقت و محبت ہو تب ہی اتنے عظیم فرائض نبوت انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ (ضیاالقرآن۔۳۔۱۱۲)

آپؐ کا فرمان ہے''کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں''اس حدیث کے تحت مفتی احمد یار نعیمی لکھتے ہیں''بکریاں چرانے سے طبیعت میں حلم و بردباری، محنت کا شوق، ملکی انتظام کی قابلیت اور رعایا پروری کی صفات پیدا ہوتی ہیں''۔بکریاں ہر وقت حفاظت کی حاجت مند ہوتی ہیں اور ان میں انتظام نہیں ہوتا، ہر ایک کا جدھر منہ اٹھا چل دیتی ہیں، جو انھیں سنبھال لے گا وہ ان شاءاللہ رعایا کو سنبھال لے گا۔تبلیغ خوب کرے گا، عام طور پر رعایا کو بکریوں اور بادشاہ کو چرواہے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

دوم:''وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ''(النحل۶، پارہ۱۴) ترجمہ:اور اس میں تمھارے لیے خوبصورتی ہے جب انھیں شام کو واپس لاتے ہو اور جب چرنے کو چھوڑتے ہو (صبح کے وقت)

صاحب تفسیر روح البیان لکھتے ہیں''جانوروں کے چرواہے عموماً جانوروں سے اپنی اوقات (صبح و شام) میں اپنے گھروں کے صحنوں کو مزین کرتے ہیں۔ پھر جانوروں کی عادت ہے کہ وہ آتے جاتے وقت شور مچاتے ہیں بالخصوص بھیڑ بکریاں تو بہت شور کرتی ہیں۔۔اور قاعدہ ہے کہ مالکوں کو ایسے اوقات میں جانوروں کے شور کرنے سے خوشی ہوتی ہے بلکہ اسے وہ اپنی عظمت سمجھتے ہیں اور عوام کی نظروں میں ایسے لوگ معزز و مکرم سمجھے جاتے ہیں اس لیے انھیں عرف عام میں مالدار کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کے صریح بیان سے کہ بکریاں چرانے میں تمھارے لیے خوبصورتی ہے، سے مورخ کا الزام پیوندِ خاک ہو جاتا ہے۔ وہ کام جسے مالک حقیقی حسن و جمال کا حامل قرار دے اسے ذلیل کہنا بے علمی، جہالت اور محض دشمنی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ مقام مرالظہران میں ہم نبی مکرمؐ کے ساتھ تھے۔ فاقہ کش صحابہ ایک جنگل میں پہنچ کر بیریاں (پیلو) توڑ کر کھانے لگے آپؐ نے فرمایا: سیاہ پھل زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ: آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ آپؐ نے فرمایا یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا، عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی بکریاں چرایا کرتے تھے؟ فرمایا: ہاں، کوئی ایسا نبی نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں''۔

ف: ہر نبی نے بکریاں چرائیں،۲: آپ نے بکریاں چرانے کا ذکر فرمایا اور عار نہ سمجھی،۳: صحابی کے پوچھنے پر دوبارہ بکریاں چرانے کی تصدیق فرمائی،۴: کوئی ایسا نبی نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ

چرائیں ہوں، حضرت موسیٰ ؑ بکریاں چرانا قرآن سے ثابت ہوتا ہے تو مورخ حضرت موسیٰ ؑکے بارے میں کیا کہے گا؟ حضرت موسیٰ ؑ نے حضرت شعیب ؑ کی بکریاں چرائیں تو کیا مورخ یہاں بھی اس فارمولا کا اطلاق کرے گا کہ حضرت شعیب ؑ، حضرت موسیٰ ؑ کو ذلیل سمجھتے تھے اس لیے حضرت موسیٰ کو بکریاں چرانا پڑیں۔(نعوذ باللہ)

سوم: کیا مورخ اس بات سے بے خبر ہے کہ آپ کے چچا ابو طالب نے عربوں کی دشمنی مول لی، مگر جان دو عالم ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ نقل کفر کفر نباشد۔ اگر وہ ذلیل سمجھتے ہوتے تو ان کی خاطر عربوں کی دشمنی مول لینے کا کوئی تُک نہ تھا۔ بلکہ ساتھ چھوڑ دیتے۔ کفار کی دشمنی سے بچ جاتے اور دشمنوں کے خطروں اور سازشوں سے بچے رہتے۔ مگر یہ تو وہ چچا ہے کہ ان کی موجودگی میں دشمنوں کی آنکھوں کے آگے تارے چھوٹتے ہیں، قریش کے مقابلہ میں سینہ تان کر کھڑا نظر آتا ہے۔ وفود کو کھرے کھرے جواب دیتا ہے مگر آپ ؐ کی رفاقت کا دم بھرتا رہتا ہے، گریز پا نہیں ہوتا۔ مقاطعہ قریش میں آپ ؐ کے ساتھ برابر کا شریک ہے، صرف یہی نہیں بلکہ ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار ہے۔ وہ چچا جس نے آپ ؐ کا رشتہ مانگا اور یہی وہ چچا ہیں جس نے آپ ؐ کے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ یہ وہی چچا ہیں کہ خطرناک قحط میں سرداران کی بارش کے لیے فرمائش پر اپنے بھتیجے کو لیے خانہ کعبہ جاتے ہیں۔ بھتیجے کی پشت خانہ کعبہ کی دیوار سے لگا کر بٹھا دیتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں۔ دوران دعا آپ ؐ نے انگشت مبارک کو آسمان کی طرف اٹھایا۔ بادل گھر آئے۔ باران رحمت کا نزول ہوا۔ زمینیں سرسبز و شاداب ہو گئیں۔ قحط ختم ہو گیا۔ کال کٹ گیا اور عرب خوش حال ہو گئے۔ ، ایسے اعلیٰ و ارفع مراتب کی حامل ذات کا انھیں علم ہے تو وہ بھلا کیوں۔۔۔ رکھتے ہوں گے جیسا مورخ کہتا ہے۔ شاید کوئی منچلا یہ نہ کہہ دے کہ ابو طالب تو نرمی برتتے تھے البتہ چچی سخت رویہ رکھتی تھی، بنا بریں بکریاں چرانا پڑیں، یہ بات درست نہیں، وہ خاتون، آپ ؐ کی چچی فاطمہ آپ کا ہر طرح خیال رکھتی تھیں۔ ان کا برتاؤ نہایت مشفقانہ تھا۔ آپ نے فرمایا'' وہ خود بھوکا رہتیں اور مجھے کھلاتیں''۔ آپ نے یہ بھی فرمایا'' یہ میری ماں کے بعد ماں ہے'' یہی نہیں اس محسنہ کے احسانات کا بدلہ اچھوتے اور انوکھے انداز میں چکایا، اپنی چچی کی وفات پر ان کی قبر میں لیٹے رہے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعائے مغفرت طلب فرمائی

واہ کیا جود و کرم ہے شہہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

آپ بعد از بعثت کئی بار بکریاں چرانے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں اس کی نوبت کیوں آئی؟ وہ توجیح تو بالکل غلط ہے جو بعض نام نہاد عالم اور سر پھرے غیر مسلم مورخین پیش کرتے ہیں کہ چونکہ ابو طالب یتیم بھتیجے کو ذلیل سمجھتے تھے (نعوذ باللہ) اس لیے آپ سے بکریاں چرانے کا کام لیا۔ جواباً عرض ہے بات

تو سیدھی سی تھی مگر اسے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ دراصل اس زمانہ میں اونٹ بکریاں چرانا معیوب نہ تھا بلکہ یہ مشاغل معمولات حیات تھے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے کہ بچپن میں وہ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتے تھے تو کیا ان پر بھی یہ فتویٰ صادر ہوگا کہ ان کا باپ بھی انہیں ذلیل سمجھتا تھا؟ ہرگز نہیں کیونکہ آجکل بھی زمیں داروں کے لڑکے اپنے مال و مویشی چراتے نظر آتے ہیں دیگر کاموں مثلاً گھاس کاٹنے، ہل جوتنے، پانی پلانے اور فصل کی کٹائی میں اپنے گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ ابو طالب کے گھر کے افراد تھے اگر ان کے حصہ میں یہ کام آیا اور بکریاں چرائیں تو کوئی حرج نہیں ہے نہ جانے غیر کو یہ بات کیوں نہیں بھاتی۔

اعتراض نمبر ۶۸

''سیرت و تاریخ کی عام کتب میں حضرت ابو طالب کی جز معاشی تنگ حالی کی داستان موجود ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو آٹھ نو دس کا یتیم بھتیجا بکریاں چرانے پر کیوں مجبور ہوتا'' معلوم ہوتا ہے کہ اس دلیل میں مناظر احسن گیلانی حاشیہ پر لکھتا ہے'' حضرت ابو طالب نے معاشی مشکلات سے تنگ آکر بالآخر اپنے ایک بیٹے جعفر طیار کو اپنے بھائی عباس اور دوسرے بیٹے حضرت علیؓ کو آنحضرت ﷺ کے حوالے کر دیا تھا، گویا ابو طالب کی معاشی تنگی کی بنیاد پر آپ ﷺ کو بکریاں چرانا پڑیں'' (النبی الخاتم۔ ۲۸)

جواب: اوپر والے اعتراض سے یہ ملتا جلتا اعتراض ہے فرق صرف یہ ہے کہ اوپر کے اعتراض میں مورخ نے اچھا نہ سمجھنے کی بنیاد پر بکریاں چرانا کہہ دیا مگر مناظر نے معاشی تنگی کی بنیاد پر بکریاں چرانے کو موردالزام ٹھہرایا ہے۔ مولانا شبلی (سیرت النبی۔ ۱۱۷) بتاتے ہیں کہ ابو طالب آنحضرت ﷺ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپؐ کے مقابلے میں اپنے بچوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر ساتھ لے کر جاتے۔ (بکریاں چرانا) یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا۔ زمانہ رسالت میں آپؐ اس سادہ اور پرلطیف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے'' کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں''۔ گویا بکریاں چرانا چچا کی ناپسندی یا معاشی تنگی کے سبب نہیں تھا بلکہ دیگر انبیاء کی طرح یہ جزئی ضرور آپ کو پیش آئی ہے۔ پچھلے صفحات میں ابو طالب کی معاشی تنگی اور کثیر العیالی کی مختلف نوع سے تردید کی گئی ہے۔ دوبارہ مختصر عرض ہے کہ آپؐ جب ابو طالب کے ہاں پرورش پا رہے تھے اس وقت آپؐ کی عمر آٹھ سال تھی حضرت علیؓ آپؐ سے ۲۹ سال اور حضرت عقیلؓ آپ سے ۹ برس چھوٹے تھے۔ صرف آپ کا چچازاد طالب عمر میں ایک سال زیادہ تھا۔ ابو طالب کی بیٹیاں ام ہانی اور جمانہ عمر کے کس پیٹے میں تھیں، یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ اگر یہ وقتی طور پر فرض کرلیں کہ وہ بڑی تھیں تو حضورؐ کی پرورش کے دوران ابو طالب کے تین بچے تھے تب بھی معاشی تنگی بوجہ کثرت العیالی نہ تھی۔ ۲: ابو طالب کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔

آپ نے بھی تجارت کی۔ابو طالب اپنے باپ دادا کی طرح شام اور یمن کے ساتھ بڑے خاصے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔وہ دمشق، بصرہ اور شام کے دوسرے حجاز اور ہنجر کی کھجوریں اور یمن کے عطر لے جاتے تھے اور ان کے بدلہ میں بازنطینی اشیاء لاتے تھے(روح اسلام۔۸۵)۔شعب ابی طالب میں جائیداد تھی، وہاں ایک مکان بھی ابو طالب کا تھا جس میں آپ ﷺ حضرت خدیجہ کو بیاہ لائے تھے۔بعدازاں خدیجہؓ کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے(سیرت النبی اعلان سے پہلے ۲۶۸)

ڈاکٹر حمید اللہ کے بقول ابو طالب کی ایک کپڑے کی دکان بھی تھی،ایک روایت میں ہے کہ اس دکان کو چلانے کا انتظام آپ ﷺ کے سپرد تھا۔حضرت عبداللہ کا تجارتی سامان بھی ابو طالب کو ملا ہوگا کیونکہ ان کے ذمہ پرورش تھی۔ان دلائل و براہان میں معترضین کے اعتراض والزامات اپنی وقعت کھو دیتے ہیں ان میں رائی برابر بھی سچائی نہیں دکھتی۔مناظر احسن نے بطور دلیل کہا معاشی تنگی کی بنا پر جعفرؓ کو عباسؓ اور علیؑ کو آنحضرت ﷺ کے سپرد کیا۔یہ بات تسلیم کرنے میں حرج نہیں کہ انسان پر ایک سا وقت نہیں رہتا، ایسا وقت بھی آتا ہے کہ معاشی تنگی ہو جاتی ہے۔لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ معاشی تنگی کا زمانہ آنحضرت ﷺ کی پرورش کے بعد کا زمانہ ہے وہ اس طرح کہ عقیلؓ کو حضرت عباسؓ اور علیؑ کو آنحضرت ﷺ نے کفالت میں لے لیا۔گویا آپ کے زمانہ پرورش میں ابو طالب کی حالت اچھی تھی۔معاشی تنگی کا نشان تک نہ تھا۔نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ آپؐ نے چچا کی معاشی تنگی یا ناپسندی کے سبب بکریاں نہیں چرائیں بلکہ دیگر انبیاء کی طرح آپؐ نے بھی بکریاں چرائیں اور اس کا اظہار آپ کی حیات مقدس میں ضروری تھا۔بعض کا یہ کہنا کہ ابو طالب کی مالی حالت ہمیشہ سقیم رہی درست نہیں لگتا جیسا کہ اوپر کے دلائل سے واضح ہوتا ہے۔

ایمان افروز واقعہ: آپؐ ابو طالب کی بکریاں چرا رہے تھے اور ایک نامور پہلوان رکانہ نامی بھی بکریاں چرا رہا تھا۔آپ اور رکانہ کے درمیان کُشتی کی ٹھن گئی۔کُشتی ایک بکری کے عوض قرار پائی یعنی کُشتی ہارنے والا ایک بکری دے گا۔ تین بار کُشتی کا مقابلہ ہوا، ہر بار رکانہ ہارا۔(حالانکہ وہ پیشہ ور مکہ کا پہلوان تھا۔کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر طاقتور تھا کہ اگر وہ کسی جانور کی کھال پر کھڑا ہو جاتا تو بہت افراد اس کھال کو کھینچ کر اسے وہاں سے ہلا نہیں سکتے تھے حتیٰ کہ کھال پھٹ جاتی تھی۔۔۔محمد رسول اللہ ۸۰) رکانہ حیران ہوا اس کی حیرانی دو سبب سے تھی ایک تو تین بکریاں کھو دیں اور اپنے مالک عبد یزید کو کیا جواب دے گا۔ دوسری وجہ پریشانی کی یہ تھی کہ میں اتنا بڑا قوی پہلوان ہو کے ہار گیا۔آپ نے بکریاں نہ لیں اور رکانہ کو واپس دے دیں۔وہ کہتا ہے کہ جب آپؐ کی نبوت کی شہرت ہوئی تو میں اسلام لایا اس وجہ سے کہ آپؐ نے مجھے پچھاڑا ہے وہ کوئی غیبی طاقت تھی۔

بکریاں چرانا کیسا؟ شبلی نعمانی نے فرانس کے نامور مورخ کی اس رائے کو کہ ''ابو طالب چونکہ محمد ﷺ کو ذلیل رکھتے تھے (نعوذ باللہ) اس لیے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے'' کا رد کیا ہے اور بکریاں چرانے کو عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ قرار دیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں ''عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا۔ بڑے بڑے شرفاء اور امراء کے بچے بکریاں چراتے تھے۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش کے حوالہ سے مفتی مسعود (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ ۲۵۱) لکھتے ہیں کہ ''قریش کے نونہال بڑے ہو کر تجارت کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے عام طور پر گلہ بانی کرتے تھے۔ عبد المقتدر کے بقول ''رسول اللہ ﷺ نے پیغمبران اولوالعزم کی صفت بکریاں چرانے کی یاد تازہ کی''۔ مولانا تقی محمد خاں کہتے ہیں: ''پروردگار نے بکریاں چرانے کی رغبت حضورؐ کے دل میں پیدا کی کہ یہ کام سیاست اور شفقت بر ضعفا امت اور صبر بر مصیبت وغیرہ، امور لوازم نبوت سے نہایت مناسبت رکھتا تھا اور تواضع و فروتنی سکھاتا ہے''

علامہ اسلم جیراج پوری کے حوالے سے لکھتے ہیں ''شرفاء کے لڑکے سادہ اخلاق و عادات اپنے گھر ہی کے بزرگوں سے سیکھتے تھے اور دن بھر ان کا مشغلہ بکریاں چرانا تھا۔ حضور ﷺ بھی اس زمانے میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔ سمجھو تو دراصل یہ دنیا کی گلہ بانی کی ابتداء تھی چنانچہ اکثر انبیاء جو گزرے ہیں، پہلے انھوں نے بکریاں چرائی ہیں''۔

صفی الرحمٰن مبارک پوری کے حوالے سے لکھتے ہیں ''عنفوان شباب میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی کام معین نہ تھا۔ البتہ یہ خبر متواتر ہے کہ آپ بکریاں چراتے تھے'' یہ امر متفق علیہ ہے کہ آپ بکریاں چرایا کرتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اجرت پر اہل مکہ کی بکریاں چراتے تھے یا نہیں؟ ہاں! چراتے تو تھے لیکن وہ کس کی بکریاں چراتے تھے؟ اجرت پر بکریاں چرانے کا ماخذ جو حدیث شریف بخاری میں ہے۔ اس کا معنی یہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی نبی ایسا نہیں مبعوث ہوا جنھوں نے بکریاں نہ چرائی ہوں''۔ دریافت کیا گیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ نے بھی؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں، میں بھی اہل مکہ کی بکریاں قراریط پر چراتا تھا۔ اب قراریط کے معنی میں اختلاف کی بنا پر کئی طرح کی آراء سامنے آتی ہیں۔ قراریط سے ''اجرت پر'' بات جا پہنچی۔ عبد الصمد الازہری نے کہا۔ ''آٹھ سال کی عمر میں پیغمبر اسلام ﷺ کو گلہ بانی کرنا پڑی تاکہ وہ نان جویں، چند کھجوریں، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پہننے کو جوتا مہیا کر سکیں'' ابو الجلال نے کہا، ابو طالب تمام عبد المطلب میں کم آمدنی اور زیادہ خرچ والے تھے۔ اگرچہ وہ آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے، اور آپ سے کوئی مشکل کام نہ لینا چاہتے تھے مگر آٹھ سال کے بچے کی ہمت قابل داد ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے غریب چچا پر اپنا پورا بار ڈالنا پسند نہ کیا، چچا سے باصرار اجازت لے کر روسائے قریش کی بکریاں اجرت پر چرانا شروع کیں۔ ہر بکری کی اجرت پر آپ کو ایک

قیراط چاندی ملا کرتی تھی مگر نہیں معلوم یہ قیراط ماہوار تھی یا سالانہ''۔

مناظر احسن نے تو کمال ہی کر دیا لکھتے ہیں'' ابو طالب بہت غریب تھے، مدت سے ان کی گذران قیراط (سکے) پر تھی جو بکریاں اور اونٹوں کے چرانے کے صلے میں ان کا بھتیجا مکہ والوں سے مزدوری میں پاتا تھا۔ڈاکٹر غفاری اور مولانا مودودی تو دونوں آراء دیتے ہیں لیکن آخر میں یہ لکھتے ہیں'' اجرت پر بکریاں چرانا کوئی عیب نہیں کہ اس سے حضورؐ کا دامن صاف کرنے کے لیے تکلف کیا جائے''۔

بخاری میں کتاب الاجارہ میں آنحضرت کا قول ہے کہ'' میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا'' اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا ہے۔قراریط کے معنی میں اختلاف ہے۔ابن ماجہ کے شیخ سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے۔اس بنا پر ان کے نزدیک یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجرت پر لوگوں کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔لیکن ابراھیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے'' (سیرت النبی۔۱۱۷ حاشیہ) مگر صاحب سید الوریٰ کہتے ہیں ۔۔ ہمارے خیال میں قراریط، قیراط کی جمع ہے۔کیوں کہ مکہ کے آس پاس قراریط نام کی کوئی جگہ نہیں، نہ پہلے نہ اب۔مکہ کے قدیم وجدید جغرافیے اور تاریخیں اس کے ذکر سے یکسر خالی ہیں تو پھر قراریط نام کی کوئی جگہ اختراع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مولانا ابراھیم سیالکوٹی یہ رائے دیتے ہیں '' اس زمانہ میں مکہ میں اس سکہ کا رواج نہ تھا، بلکہ یہ اس مقام کا نام ہے جو مکہ میں اجیاد کے قریب ہے'' لیکن مصری عالم ابو زہرہ نے لکھا ہے کہ قراریط بکریوں کے دودھ کا وہ حصہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطور اجرت لیا کرتے تھے۔(خاتم النبیین۔۱۰۰)

طبقات ابن سعد میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' موسیٰؑ مبعوث ہوئے تو وہ بھیڑ بکریاں چراتے تھے۔میں مبعوث ہوا تو اجیاد میں اپنے لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا'' مگر ہیکل (حیات محمد۔۱۱۴) لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' اللہ تعالیٰ'' نے جس کسی کو نبوت سے سرفراز فرمایا اس نے بکریاں چرائیں۔حضرت موسیٰ اور حضرت داؤدؑ نے یہ کام کیا۔میں بھی اپنے خاندان کی بکریوں کے ریوڑ کی چوپانی مکہ کی اجیاد نامی پہاڑی پر کرتا رہا''۔

مفتی مسعود وغیرہ کہتے ہیں کہ سیرت نگاروں نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق کوئی ایک معنی اختیار کر لیا اس لیے بعض نے بکریاں چرانے سے ابو طالب کی تنگ دستی کو ثابت کرنا چاہا ہے۔غیر مسلموں نے اسے ابو طالب کا ظلم قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور نے بنوسعد کی بکریاں چرائیں تو بھی اور مکہ میں تو بھی، ملازمت یا معاش کی خاطر نہیں۔ کیونکہ جب حضور نے بکریاں چرانے کی بات کی ہے تو دیگر انبیاءؑ کا ذکر کیا ہے۔ مزدوری کا ذکر نہیں فرمایا۔ اگر حضور نے یہ مزدوری ہی کی ہوتی تو آپؐ اس کو مزدور کی عظمت پر محمول فرماتے ،اسے انبیاء اور رُسل کی طرح بکریاں چرانا نہ کہتے ۔جیسا کہ حدیث شریف میں ہے" الکا سب حبیب اللہ '' (ترجمہ) ہاتھ سے روزی کمانے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے۔) نیز بکریاں چرانے کو خوبصورتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوم: اجرت پر بکریاں چرانے والے کو چرواہا کہا جاتا ہے۔ اپنی بکریاں چرانے والے کو ایسا نہیں کہا جاتا، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اس لفظ کا حضور کے لیے استعمال کرنا ممنوع فرمایا ہے۔ یہ خیال بھی درست نہیں چونکہ حدیث اجرت کے بارے میں خاموش ہے۔ ہوسکتا ہے آپ ﷺ کو اگر اجرت ملتی ہو یا نہ ملتی ہو اور حدیث کا مفہوم متبادر یہی ہے کہ حضور ﷺ کو اجر ملتی تھی تو جناب حربی کی کوشش رائگاں گئی اور اگر آخرت نہیں ملتی تھی تو آپ ﷺ سے بیگار کیوں لی جاتی تھی؟ کیا اس لیے کہ آپ ﷺ یتیم تھے اور اس اوہام پرست معاشرے میں یتیم کو نحس سمجھا جاتا تھا۔'' جب حدیث بھی اجرت کے بارے میں خاموش ہے تو اپنے قیاس سے اجرت پر محمول کرنا درست نہیں ہے نیز آپ ﷺ کے چچا کی معاشی حالت بھی ہمیشہ کمزور نہیں رہی تھی ۔ ایک وقت ایسا آیا تھا جب وہ معاشی لحاظ سے کمزور تھے اور ان کی یہ حالت ہمیشہ سقیم نہیں رہی تھی۔

"لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا دین ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اجرت پر حضور کے بکریاں چرانے کی بات کر کے آپ کو چرواہا نہ کہیں، اپنی بکریوں کو چرانا، انھیں گلیوں، بازاروں میں سے گزار کر ان کی خوراک کا انتظام کرنا گھر کے کاموں میں شمار ہوتا ہے اور آنحضرت ﷺ نے بھی یہی کیا۔ (حوالہ بالا۔۲۵۶۔۲۵۵)

یا ایھا الذین امنو الا تقولو راعنا و قولو انظرنا ۔۔عذاب علیم ۝ (ترجمہ)''اے ایمان والوں مت کہا کرو راعنا بلکہ کہو انظرنا اور غور سے سنا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب کی عزت وعظمت کا اس قدر پاس ہے کہ ایسے لفظ کا استعمال بھی ممنوع فرمایا جس میں آپ ﷺ کی گستاخی کا شائبہ ہو۔ یہود کی لغت میں یہی لفظ بددعا کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس کا مطلب تھا'' اِسمَع لَا سَمِعتَ'' یعنی سن خدا کرے تو نہ سنے۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کہنے لگے کہ پہلے ہم ان کو تنہائی میں بددعا دیتے تھے، اب سرعام دعا دینے کا موقع ہاتھ آیا۔ وہ آپ ﷺ

کومخاطب کر کے ''راعنا'' کہتے اور آپس میں ہنستے۔حضرت سعد بن معاذؓ قبیلہ اوس کے سردار تھے، کو یہود کی لغت کا علم تھا، انہوں نے جب یہود سے یہ لفظ نبی ﷺ کے لیے استعمال کرتے سنا تو کہا، اللہ کی لعنت ہو، اگر میں نے یہ لفظ آئندہ سن لیا تو گردن اڑا دوں گا۔

اہل یہود زبان کو موڑ کر ''راعنا'' بولتے جس کا معنی ہے ''اے ہمارے چرواہے'' اس موقع پر آیت مذکورہ نازل ہوئی اور غیر تو غیر مسلمانوں کو بھی حکم ہوا کہ جب کوئی بات سمجھ نہ آئے تو تم ''راعنا'' نہ کہو بلکہ ''انظرنا'' کہو تا کہ غیر کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ صحیح لفظ غلط معنی میں استعمال کرے۔

نبی کو اجرت لینا کیسا: اب سوال یہ ہے کہ نبی اجرت کسی کام کی لے سکتا ہے کہ نہیں؟ خیال رہے کہ انبیاء دین کے تمام امور کی تعلیم دینے، سکھانے پر اجرت نہیں لیتے، دوسرے کاموں پر لیتے ہیں لہذا اجرت پر بکریاں چرانے کی حدیث، قرآن کریم کی اس آیت کے مخالف نہیں ''یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا'' (ترجمہ) اے قوم میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں لیتا (کنزالایمان)۔ یہاں علیہ سے مراد دین کی تبلیغ ہے۔اشعتہ میں شیخ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت بادشاہوں، امیروں میں نہ رکھی بلکہ بکری چرانے اور تواضع پیش کرنے والوں میں رکھی۔ چنانچہ ایوبؑ درزی گری کرتے تھے، حضرت ذکریاؑ بڑھئی پیشہ تھے۔(مشکوۃ جلد۴۔ص۔۳۶۴)

مراۃ المناجیح شرح المصابیح ج۴ص ۳۶۷ بحوالہ احمد ابن ماجہ، روایت ہے کہ حضرت عتبہ بن منذر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ آپ ﷺ نے سورہ طسم پڑھی حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ پر پہنچے، فرمایا موسیٰؑ اپنے نفس کو اپنی پاکدامنی کی حفاظت اور اپنے پیٹ کی روٹی پر آٹھ، نو یا دس سال اجرت پر رہے۔اس حدیث کے تحت مفتی احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں ''حضرت موسیٰؑ کا حضرت شعیبؑ کے ہاں رہنا، آٹھ دس سال بکریاں چرانا، ان کی صاحبزادی صفورا سے ان کا نکاح مذکور ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے محنت مزدوری کرنا اچھا ہے، سوال برا ہے، بڑے سے بڑے شخص کو معمولی محنت سے عار نہیں ہونی چاہیے۔آپ کا یہ فرمان عالیشان ہے کہ ''الکاسب حبیب اللہ'' اپنے ہاتھ سے کمانے والا اللہ کا دوست ہے۔

نکتہ: یاد رہے کہ حضرت موسیٰؑ کا حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرانا بی بی صفورا کا مہر نہ تھا۔ بلکہ نکاح شرط تھی اس لیے آپ نے فرمایا ''ھٰتَیْنِ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ'' القصص (۲۷، پارہ ۲۰) ''اس مہر پر کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو (کنزالایمان)۔تم میری آٹھ سال مزدوری کرو اگر مہر ہوتا تو علیٰ کی بجائے ''ب'' آتی اور آپ اپنے بجائے صفورا کا ذکر فرماتے۔قرآن کریم میں ہے ''اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ'' (النسا۲۴، پارہ ۵) کہ اپنے مالوں کے عوض رزق تلاش کرو، بیویاں اپنے مالوں سے تلاش کرو۔لہذا مذہب حنفی بالکل حق ہے کہ مہر میں مال

دینا پڑے گا۔ خدمت، زوجہ کے والد کی مہر نہیں بن سکتی۔

امام شافعی کہتے ہیں کہ خدمت پر نکاح درست ہے مگر اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ خیال رہے کہ حضرت شعیبؑ نے موسیٰؑ کو آٹھ دس سال بکریاں چرانے کے لیے رکھا مگر مقصود یہ تھا کہ انھیں اپنے پاس رکھ کر کلیم اللہ بننے کے لائق بنایا جائے۔ علامہ اقبال نے بھی ایک شعر میں اس مفہوم کو یوں نظم کیا ہے۔

دمِ عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اس رباعی کا مطلب یہ ہے کہ عارفوں کی صحبت انسانوں کے حق میں نسیم صبح کا حکم رکھتی ہے اسی صحبت کی بدولت دنیا والوں پر انکشاف حقائق ہوتا ہے اور ان کی روحانی تربیت اور آبیاری ہوتی ہے اگر صحبت مرشد کا سلسلہ ختم ہو جائے تو ''باغ معانی'' یک دم ویران ہو جائے بلکہ دنیا میں روحانیت کا بھی فقدان ہو جائے اور اس سلسلہ میں اس کی مثال درکار ہو تو حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا مطالعہ کرلو، انہوں نے چند سال تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں اور اس سلسلہ میں ان کو حضرت موصوف کو صحبت نصیب ہوئی چنانچہ اس فیض صحبت نے ان کو شبانی سے کلیمی کے مرتبہ پر پہنچادیا'' شبانی سے کلیمی دو قدم ہے ''بلاشبہ بہت بلیغ مصرعہ ہے شبانی کے دو معانی ہو سکتے ہیں ایک تو وہ جو اوپر مذکور ہوئے اور دوسرے معانی میں ادنیٰ حالت کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی صحبت مرشد میں وہ تاثیر ہے کہ اس کی بدولت ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی بھی جس کے پاس نہ علم و فضل ہو نہ دنیاوی وجاہت نہ کسی قسم کی لیاقت، وہ بھی اعلیٰ مرتبہ یعنی شرف مکالمت الٰہیہ حاصل کرسکتا ہے۔ (شرح بال جبرائیل۔ ۴۱۷۔۴۱۶۔ از پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

مفتی صاحب، علامہ صاحب اور پروفیسر کو سہو ہوا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جب کہ کسی نبی کو ایسی تعلیم بجز وحی کے کسی اور واسطے نہیں دی گئی جس سے وہ نبی بن جائے۔ نبی کے لیے کسی اور نبی کی تعلیم کا ایسا انتظام نہیں کیا گیا کیونکہ نبوت وہبی ہے، کسبی نہیں۔ اس لیے کسی فرد کی تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ خالق حقیقی جہاں چاہتا ہے اپنی رسالت و نبوت رکھ دیتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے " ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ (جمعہ ۱۴، پارہ ۲۸) ترجمہ: یہ نبوت خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے عطا کرے۔ ایک اور مقام پر ہے۔

''اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ'' (الانعام ۱۲۴، پارہ ۸) ترجمہ: اللہ بہتر جانتا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھے،، انبیاءؑ کی تعلیم بذریعہ وحی ہوتی ہے۔ نبی مکرمؐ نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اس میں سوائے برائی کے اور کچھ نہ تھا۔ برائی پر فخر کرتے تھے۔ چالیس سال کی زندگی میں ہر عیب

،تہذیب وتمدن سے عاری، اخلاقی گراوٹ، جوا، شراب، قتل وغارت، بات بات پہ تلواریں میان سے باہر، لڑکیاں زندہ درگور کرنے الغرض کوئی برائی بھی آپ ﷺ کی پاکدامنی پر ایک ادنیٰ سا دھبا بھی نہ لگا سکی۔ آپ ﷺ الصادق والامین کے القابات سے نوازے گئے، آپ ﷺ کے جانی دشمن، گناہوں میں لتھڑے مگر آپ کے مداح تھے۔ اس دوران بھی کسی سے تعلیم حاصل نہ کی، آپ کی تعلیم کسی شعیب کی مرہون منت نہ تھی کیونکہ الرحمٰن علم القرآن کا فرمان اس کے رد میں موجود ہے۔ لہذا حضرت موسیٰؑ کو کلیم بننے کے لیے کسی شعیبؑ کی ضروت نہیں تھی۔

اہم نکتہ: رافضیوں کا گمان ہے کہ ابوطالب کا نام عمران تھا۔ (السیرت النبویہ۔ ۱۰۶)

جواب: صحیح روایت میں ہے کہ ان کا نام عبدمناف تھا، عمران نہیں تھا۔ اس آیت میں وہ عمران سے مراد ان کی ذات ہی کو لیتے ہیں۔ ''اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران ۲۲، پارہ ۳) ترجمہ: بے شک چن لیا اللہ تعالیٰ نے آدم اور نوح اور ابراھیم کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہاں پر،،

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''یہ ان کی بہت بڑی خطا ہے۔ انھوں نے یہ قول نقل کرنے سے پہلے قرآن مجید میں غور وفکر نہیں کیا۔ اس فرمان کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَافِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا (آل عمران ۳۵، پارہ ۳) ترجمہ: (میرا رب) میں نذر مانتی ہوں تیرے لیے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے۔

قرآن کریم کسی تحریف کرنے والے کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر اپنی مرضی کے مطابق آیتوں کو معانی کا جامہ پہنائے۔ خود قرآن مجید اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے۔ اور یہ خاتون جو عمران کی بیوی ہے جو حضرت مریم کی والدہ ہیں اور عمران آپ کے والد کا نام تھا نہ کہ حضرت ابوطالب کا۔ (نذر ماننے والی خاتون حضرت مریم کی والدہ ہیں)

حضرت محمد ﷺ کا خاندان

اعتراض نمبر ۶۹

مولانا شبلی (سیرت النبی۔ ا۔ ۱۰۹) بتاتے ہیں، مارگولیس کہتا ہے کہ ''یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمد ﷺ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے'' اس الزام کے بعد وہ درج ذیل استدلال پیش کرتا ہے۔

اول: قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا۔ (نعوذ باللہ)

دوم: پیغمبر کے عروج کے زمانہ میں قریش نے آنحضرت (ﷺ) کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے۔

سوم: فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا۔ قرآن کریم کے الفاظ یوں ہیں۔ ''وَقَالُوا لَوۡلَا نُزِّلَ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانُ عَلَىٰ رَجُلٖ مِّنَ ٱلۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيمٍ'' (الزخرف ۳۱، پارہ ۲۵)۔ ترجمہ: اور (کفار) کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ۔ طائف) کے کسی آدمی پر کیوں نہ اترا؟۔

چہارم: رسول اللہ ﷺ کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپؐ نے اس لقب سے انکار کر دیا۔

جواب: یہ استدلال مارگولیس کے اپنے نہیں ہیں اس نے جرمنی کے مستشرق نولدیکے کے نقل کیے ہیں۔ مارگولیس کے مستعار شدہ دلائل و استدلال کا باری باری جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے دیگر مستشرقین کی آراء سے ان کا رد پیش کرتے ہیں، کیونکہ اپنے گھر کی شہادت قوی اور مضبوط ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَشَهِدَ شَاهِدٞ مِّنۡ أَهۡلِهَآ (یوسف، پارہ ۱۲) ترجمہ ''اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی، (۱۲۔۲۶)

استدلال اول: خاندانی شرافت کے بارے میں ڈاکٹر'' واٹ'' کہتا ہے'' محمد ﷺ عرب کے نہایت عمدہ خاندان اور معزز و محترم قوم سے تھے۔ صورت میں شکیل اور طور میں رسیلے اور بے تکلف تھے (ن۔۴۔۴۴۱)۔

ڈاکٹر ایسٹن کہتا ہے'' اے شہر مکہ کے رہنے والے! اور بزرگوں کی نسل سے پیدا ہونے والے، اے آباؤ اجداد کے مجد و شرف کو زندہ کرنے والے، اے سارے جہاں کو غلامی کی ذلت سے نجات دلانے والے، دنیا آپؐ پر فخر کرتی ہے اور خدا کی اس نعمت پر شکر ادا کر رہی ہے، اے ابراھیم خلیلؑ اللہ کی نسل سے، اے وہ کہ جس نے عالم کے لیے اسلام کی نعمت بخشی۔ (ن۔۴۔۴۹۱)۔

قیصر روم نے ابوسفیان سے سید المرسلین ﷺ کے حسب ونسب کے بارے میں پوچھا۔ ابوسفیان نے کہا: حسب ونسب اور خاندانی شرافت میں کوئی رسول اللہ سے بڑھ کر نہیں۔ قیصر روم نے جواباً کہا: یہ بھی ایک علامت ہے، پیغمبر ہمیشہ شریف خاندان سے ہوتے ہیں۔ تمھارے جیسا عقیدہ تو ابوسفیان کا بھی نہیں تھا، حالانکہ قبل از اسلام وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا بدترین دشمن تھا، پھر بھی سچی بات کہے بغیر نہ رہ سکا۔ کاش مارگولیس اپنے ہم نواؤں کی بات مان لیتا لیکن مستشرق مارگولیس تو ابوسفیان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گیا ہے۔

سر ولیم میور کہتا ہے'' وہ پہلے ہی سے اپنے وطن میں عقل و امانت میں رفیع المرتبہ تھے اور قریش

کے بزرگ قبیلہ اور اس کے معزز و ممتاز طبقہ سے تھے''۔
واشنگٹن ارونگ: آپ عرب کے شریف ترین گھرانے کے چشم و چراغ تھے، (ن۔۴۔۵۳۱)
حدیث کی گواہی لے لیں۔ صحیح میں واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ نبی کریم نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے فرزندوں میں سے کنانہ کو برگزیدہ کیا اور بنی ہاشم کو قریش کو برگزیدہ کیا اور مجھ کو بنی ہاشم سے برگزیدہ کیا'' (کتاب الفضائل مسلم شریف ج۶ ص۹)
مارگولیس نے تمام انبیاء کی شان میں گستاخی کی ہے۔ آپ برگزیدہ انبیاء کے خاندان سے ہیں۔ خاندان انبیاء کی اعلیٰ نسبی میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔ آپ کی اعلیٰ نسبی خاندان انبیاء سے ثابت ہے اور آپ ان امجاد انبیاء کے دین کے پیغام بر ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے ''قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (ط) وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (البقرہ ۱۳۵، پارہ ۱) (ترجمہ) اے نبی: فرما دیجئے بلکہ ہم تو ابراھیم کا دین حنیف لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔
استدلال دوم کا رد: میجر آرتھر گلن مورنڈ بتاتا ہے ''حضرت محمدؐ بلاشبہ اپنے عصر مقدس میں ارواح طیبہ میں سے تھے وہ صرف مقتدر اور راہنما ہی نہ تھے۔ بلکہ تخلیق دنیا سے اس وقت تک جتنے صادق سے صادق اور مخلص سے مخلص پیغمبر آئے ان سب سے ممتاز رتبہ کے تھے''۔ (ن۔۴۔۴۵۰) ایسے عظیم و شریف کو ایسی تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ ذی فہم سمجھتے ہیں کہ ایسی تشبیہ یا اس قسم کے دیگر فضول الزامات جو لکھت پڑھت میں نہیں آتے، صرف آپ کی شان گھٹانے کی خاطر گھڑے ہیں، سوائے اس کے کچھ نہیں۔ اس مستشرق کو کیا خبر کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔
استدلال سوم کا رد: وَقَالُوا لَوْ لَا نُزِّلَ۔۔۔۔۔۔۔ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ'' (الزخرف ۳۱، پارہ ۲۵) اس آیت مبارک میں لفظ عظیم ہے۔ دونوں مستشرقین مارگولیس اور نولدیکی عظیم اور شریف کے فرق سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ عظیم اور شریف دو جدا جدا الفاظ ہیں۔ عظیم کا لفظ دولت مند اور اقتدار والے کے لیے آیا ہے۔ ان مستشرقین کو سید الابرار کی شرافت سے نہیں، مال و دولت سے انکار تھا۔ عرب آپ کو صادق والامین کہتے تھے یہ شرافت کے درجہ کمال کے اوصاف ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی شرافت پر سوالیہ نشان نہ تھا، بلکہ دولت پر تھا۔ مولانا شبلی اس ضمن میں رطب اللسان ہیں، '' دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیئے۔ کفار نے آنحضرت ﷺ کو دیوانہ، جادوگر، شاعر، کاہن وغیرہ کہا ان میں سے کون سی بات صحیح ہے۔ یعنی کس کو مانیں کس کو ٹالیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کو نہیں مانتے کیونکہ تاریخی حقائق سے ان الزامات کا رد ہوتا ہے۔ نیز شرفائے کفار کا فتح مکہ کے دن خاتمہ ہو گیا، شرفائے مکہ سے مراد کفار کے بڑے بڑے جبارین و متکبرین ہیں۔ اس سے آنحضرت کی کم

نسبی سے کیا تعلق؟ نہایت تعجب کی بات ہے کہ یہ آیت کفار سے مخاطب ہے تو کیسے اس آیت کے حوالہ سے آپ کی کم نسبی کو شمار کیا جائے جس کے بارے ذرا سا بھی اشارہ نہیں ملتا، یہ ناانصافی ہے۔ مارگولیس نے اپنے آباء یعنی کفار کے اعتراض کو دہرایا ہے جس کا جواب قرآن کریم نے دیا، ''أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ۔۔۔۔لِلْمُتَّقِينَ (زخرف ۳۲، پارہ ۲۵)۔ ترجمہ: کیا وہ بانٹتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو جو ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں اور ہم نے ہی بلند کیا بعض کو بعض پر مراتب میں تاکہ ایک دوسرے کے کام آسکیں اور آپ کے رب کی رحمت بہت بہتر ہے اس سے وہ جمع کرتے ہیں، اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کے لیے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا، ان کے مکانوں کے لیے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں ،جن پر وہ چڑھتے ہیں، اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں، وہ بھی چاندی کے اور سونے کے اور یہ سب چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہیں اور آخرت آپ کے رب کے نزدیک پرہیزگاروں کے لیے ہے''۔ اسرائیلیوں نے بھی طالوت کے بادشاہ بننے پر یہی اعتراض اٹھایا تھا، دولت کے انبار نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل نظریہ کی نفی فرما دی'' وَقَالَ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ ۔۔۔۔۔۔ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ '' (البقرہ ۲۴۷، پارہ ۲)۔ ترجمہ: اور کہا انھوں نے بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تمھارے لیے جالوت کو، بولے کیونکر ہو سکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر، حالانکہ ہم زیادہ ہیں حق دار حکومت کے، اس لیے اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت کی، نبی نے فرمایا: بے شک اللہ نے چن لیا ہے اسے تمھارے مقابلہ میں اور زیادہ دی اسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔ اس آیت میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ ا: علم ،۲: جسم ،۳: عطائے خداوندی، جسے چاہتا ہے رب عطا کرتا ہے۔ یہی باتیں مستشرقین اور مشرکین کی سمجھ سے بالاتر ہیں اور کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہیں۔ ''منٹگمری واٹ'' نے یہ اعتراض کرنے والوں کو بنی اسرائیلیوں سے تشبیہ دی ہے جنھوں نے طالوت کے بادشاہ بننے پر اعتراض کیا تھا۔ انھوں نے اعتراض کیا تھا کہ طالوت اس لیے بادشاہ نہیں بن سکتا کیونکہ اس کے پاس دولت کے انبار نہیں ہیں۔ اسی طرح کفار نے حضور ﷺ کی رسالت و نبوت کا انکار کیا کہ آپ مالدار نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے اس باطل نظریہ کی بیخ کنی کر دی۔

استدلال چہارم کا رد: اس بات میں شک نہیں بلکہ شک کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ واقعی آپ نے مولیٰ اور سیّد کے لقب سے انکار فرمایا۔ احادیث میں تصریح ہے۔ آپ نے فرمایا: ''مجھ کو سیّد و مولیٰ نہ کہو، سیّد و مولیٰ اللہ ہے۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ کو مولیٰ کہا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے، ''نعم

المولیٰ و نعم الوکیل ‘‘اس میں عزت و عظمت اور جلال خداوندی کا اظہار ہے ان القابات کو قبول نہ کرنے سے آپ ﷺ کی شرافت نسبی میں فرق نہیں پڑتا البتہ نیک، عمدہ اور اعلیٰ نسب کی عظمت ہے کہ آپ نے ان القابات کو قبول نہ فرمایا جو ذات خداوندی کے لیے مختص ہیں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں نہ کہ اللہ یا اللہ کے بیٹے۔ ہاں یہ بات دل کو لگتی ہے کہ آپؐ کے بجز کوئی اور ہوتا تو وہ ان القابات کو فخر اور پسندیدگی سے اختیار کر لیتا اور پھولے نہ سماتا، آج کل کچھ نام نہاد افراد sir، نواب، مخدوم کا لقب وصول کر کے اپنی بڑائی اور سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ آپ نے اپنے لیے اور دوسرے کے لیے مولا کا لفظ استعمال فرمایا ہے، کیوں؟ تو اس کی وجہ مجاز ہے۔ انھیں مجازی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، حقیقی معنوں میں نہیں جیسے رب، حقیقی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے مگر مجازی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ’’قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا۔۔۔۔۔۔مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ‘‘ (یوسف ۳۳، پارہ ۱۲)

ترجمہ: یوسف نے عرض کی اے میرے رب مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے اس کام سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہے اور اگر تُو مجھ سے ان کا مکر نہ پھیرے گا، تو میں اسی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادان بنوں گا۔ تمام استدلال رد کرنے کے بعد مارگولیس کے الزام ’’یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمد ﷺ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کا جائزہ لیتے ہیں۔

آپ ﷺ عمدہ، اعلیٰ اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنوں کے بجز غیروں نے بھی آپ کے معزز و محتشم خاندان کے گن گائے ہیں۔ مستشرق ٹارانڈرائے کہتا ہے۔ آپ ایک معزز مگر غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ٹارانڈرائے آپ کا معزز خاندان تسلیم کرتا ہے جو مارگولیس کے اعتراض ’’ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے‘‘ کا رد کرتا ہے۔ آپ کے شریف النسب اور اعلیٰ نسبی کا ذکر ہو چکا، اب اس الزام کے دوسرے حصہ کہ ’’ایک غریب خاندان سے تھے‘‘ کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ بحوالہ ابراھیم سیالکوٹی، مسعود مفتی (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ ص ۲۹) رقم طراز ہیں ’’حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے، یہ سب اپنی امتوں کے بارہ رئیس تھے، یہ سب عرب کے مختلف علاقوں میں آباد تھے۔ عرب کے کئی ایک شہران کے نام پر آباد تھے (تفصیل کے لیے حوالہ بالا کا ص ۵۰ ملاحظہ کریں) مختصر آپ کے خاندان کے چند امجاد کا ذکر کرتے ہیں تاکہ گھرانے کی غربت معلوم ہو سکے۔

حضرت کنانہ: آپ جان دو عالم ﷺ کے جدِ امجد ہیں۔ یہ انتہائی مہمان نواز تھے، اکیلے کھانا تناول نہ فرماتے، جب کوئی ساتھ نہ ہوتا تو ایک نوالہ خود تناول فرماتے اور دوسرا لقمہ پتھر پر رکھ دیتے (حوالہ بالا۔ ۲۸۰)۔ حضرت کنانہ کے پوتے مالک کو مالک اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت عرب کے حاکم تھے۔

خواجہ قُصّی: علامہ ابن جوزی کے علاوہ کئی حضرات نے لکھا ہے ''قصی بن کلاب مکہ مکرمہ کے سردار تھے۔علامہ زرقانی کہتے ہیں ''قصی بن کلاب کو تمام قبائل قریش پر اقتدار حاصل تھا، حاجیوں کو کھانا کھلانا، زمزم کا پانی پلانا، مسافروں کی پذیرائی کرنے، مشورہ کرنے کے لیے روساء قریش کو دارالندوہ (دارالمشورہ) میں طلب کرنے اور قریش کا پرچم لہرانے کے اہم فرائض ان کے سپرد تھے۔قصی نے مکہ میں حکومت قائم کی۔اس کے اہم مناصب ان کی اولاد کے پاس تھے۔عرب میں اس قدر عزت پائی کہ جو قصی کہہ دیتا سب مان لیتے، کوئی انکار نہیں کرتا۔ان کی اولاد خانہ کعبہ کی متولی تھی۔اس سبب سے پورے عرب اور بیرون عرب میں آپ کی عزت تھی۔(حوالہ بالا)

خواجہ عبدمناف: خواجہ عبدمناف کا نام مغیرہ تھا۔ اپنی سرداری کے زمانہ میں قریش کو خدا ترسی اور حق شناسی کی نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ صدیق اکبر نے رسول اللہ کے حضور کسی شاعر کے شعر پڑھے۔ان میں سے ایک شعر، جس کا ترجمہ یہ ہے، یہ تھا۔''او! گٹھڑی اُٹھا کر لے جانے والے (یعنی مسافر) تُو عبدمناف کے ہاں کیوں نہ جا اترا، اور وہاں چلا جاتا تو ناداری اور تنگ دستی دور کر دیتے، وہ تو امیر غریب سے یکساں سلوک کرتے ہیں اور فقیر کو مستغنی کر دیتے ہیں۔ نبی مکرمؐ نے ان اشعار کو سن کر تبسم فرمایا اور مسرور ہوئے (حوالہ بالا)

خواجہ ہاشم: حضرت ہاشم قبیلہ قریش کے معزز سردار تھے ان کے گھر میں مال و منال بہت تھا۔ان کی عزت وقار کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حبشہ کے حکمران اور قیصر روم آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔قیصر روم نے حکم نامہ جاری کیا کہ قریش جب اس علاقہ میں بغرض تجارت آئیں تو ان سے ٹیکس نہ لیا جائے۔حبشہ کے نجاشی سے بھی اس قسم کا حکم نامہ حاصل کیا۔سیرت دھلانیہ میں ہے'' ہاشم اور آپ کے بھائیوں عبدشمس۔مطلب اور نوفل کے بارے لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی پناہ گاہ اور ان کے اعزاز و افتخار ہیں اور عرب کے سردار ہیں (حوالہ بالا)۔

حضرت عبدالمطلب: حج کے موقع پر اونٹنیوں کے دودھ میں پانی ملا کر اور شہد حل کر کے حاجیوں کو پلاتے۔ پہاڑوں پر کھانا بکھیر دیتے تا کہ چرند پرند کھائیں۔بایں سبب آپ کو پرندوں کا میزبان کہا جاتا ہے۔آپ نے فاطمہ بنت عمرو سے نکاح کیا تو بڑی کوہان والی ایک سو ناقہ اور دس اوقیہ سونا مہر میں دیا۔حضرت عبداللہ کی قربانی کے بدلے سو اونٹ قربان کیے۔یہی بعد میں مقتول کا خون بہا مقرر ہُوا۔ ۔صاحب قرآن کے عقیقہ پر عربوں کی ضیافت کی۔بنی سعد سے حضور ﷺ کی واپسی پر گم شدگی ہوئی تو بازیابی پر بقول علامہ قسطلانی بڑے کوہان والے ہزار ناقے اور سو رطل سونا صدقہ دیا (ایک رطل ..۲۸ تولہ،۲/۱۔۴ ماشہ۔۔نور اللغات)

حضرت عبداللہ: حضرت آمنہؓ نے اپنے شوہر کی وفات پر ایک مرثیہ کہا اس کے ایک شعر کا ترجمہ یوں ہے ''موت نے انھیں بغیر کچھ بتائے اپنی آغوش میں لے لیا اور ان کے جانے کا افسوس کیوں نہ ہو، جب کہ وہ کثرت کے ساتھ عطا کرنے والے اور بہت رحم دل تھے'' کثرت سے عطا کرنے والا سخی ہوتا ہے غریب نہیں ہوتا۔ یہ شعر ان کی سخاوت کے ساتھ امارت کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔آپ نے ورثہ میں چھوڑا۔ا: پانچ اونٹ،۲: بکریوں کا ریوڑ،۳: ایک کنیز (اُم ایمن)،۴: ایک شقران نامی غلام، جس کے بارے یہ بھی ہے کہ نبی مکرمؐ نے اسے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔۵: چاندی،۶: تلوار،۷: مکان (اسی میں آپؐ کی ولادت ہوئی اور بنوسعد سے واپسی پر آپؐ اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ اس مکان میں رہائش پذیر رہے) فتح مکہ کے بعد آپؐ سے پوچھا گیا کہ آپؐ آبائی گھر میں آرام فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انتظام کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا: میں گھر میں نہیں اترنا چاہتا اور نہ ہی میرے قدر دانوں نے میرے لیے باقی رہنے دیا ہے۔(خاتم النبیین ۔۸۳۰)،۸: ایک دکان (جس میں کپڑا فروخت ہوتا اور سلتا تھا)،۹: سامان تجارت، آپ کے والد ماجد شام کو تجارتی سامان لے گئے، واپسی پر بیمار ہوئے اور فوت ہوئے، اس سامان تجارت میں نقد، جنس یعنی کھجور، چمڑا وغیرہ تھا۔(سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔۲۸۶) اگرچہ یہ اثاثہ امارت کو ظاہر نہیں کرتا لیکن آپ ﷺ کی غربت کا اظہار بھی نہیں ہوتا۔

آنحضرت ﷺ کے چچا صاحبان: آپ ﷺ کے چچاؤں میں حمزہ، عباس اور ابولہب لکھ پتی ہو چکے تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ حضرت عباسؓ زمانہ جاہلیت میں بہت بڑے رئیس تھے۔انھوں نے حضرت جعفرؓ کی کفالت کا بیڑا اُٹھایا۔ یہ وہی عباس ہیں جنھوں نے اپنے دو بھائیوں، ابو طالب اور حارث کے بیٹوں عقیل اور نوفل کا فدیہ اپنے مال سے ادا کیا تھا۔ وہ جنگ بدر میں قیدی ہوئے تھے۔ ہر فرد کا فدیہ ستر اوقیہ تھا۔

سید المرسلین جناب محمد ﷺ: بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ بظاہر مالی لحاظ کمزور تھے۔ مگر ایسا نہ تھا۔ یہ ایمان افروز واقعہ سنیے جس سے حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ گاہک پہلے آپؐ کے پاس آتے تھے۔آپؐ روزانہ تھیلیاں بھر کر لے جاتے ہیں ان تھیلیوں میں کیا ہے؟ اس بات کا کھوج لگانے ایک دن عتبہ آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ آپ ایک مکان کے قریب پہنچے۔ دستک دی۔ ایک بڑھیا نکلی۔ عتبہ نے دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا اور بولا یہ تو قیس کا گھر ہے جو حرب فجار میں چل بسا تھا۔ اس مکان میں چھوٹے بچے اور بڑھیا رہتی تھی۔ پیارے رسول آگے بڑھے۔ گلی میں ایک اپاہج رہتا تھا۔ دستک دی۔ دروازہ کھلا، بوڑھا باہر آیا۔ اس کی حالت اچھی نہ تھی۔ آنکھیں دھنسی ہوئی، چہرہ کی ہڈیاں باہر ابھری ہوئیں، رنگ زرد اور ہاتھوں میں کپکپاہٹ، آپ نے مصافحہ کیا۔ تھیلی اسے تھما دی۔ بوڑھا دعائیں دیتا رہا۔ عتبہ حیران

تھا۔آپ ﷺ آگے بڑھے، بچے کھیل رہے تھے۔وہ دیکھتے ہی آپؐ کی طرف لپکے۔کسی نے دامن تھاما، کوئی ہاتھوں سے چمٹا،کوئی ٹانگوں کو لپٹا،آپؐ نے کسی کے سر پر ہاتھ پھیرا،کسی کے گال تھپتھپائے،کسی کو چمکارا،کسی کو چوم لیا۔عتبہ کو ایسے بچوں سے نفرت تھی۔اِدھر آپؐ محبت کے پھول نچھاور کررہے تھے۔ سارے بچوں میں تھیلیاں بانٹ دیں۔وہ خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔عتبہ نے چپ سادھ لی لیکن پھر بھی بن کہے آگے نہ بڑھ سکا۔"آپؐ مال و دولت اور سیم و زر جمع کر کے امیر بننا نہیں چاہتے تھے۔غریبوں، حاجت مندوں اور بے سہارا انسانیت کی مدد اور خیر خواہی کرنا چاہتے تھے" آپؐ اس فرمان کی عملی تصویر پیش کررہے تھے۔"یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ "ترجمہ:آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں۔کہہ دیجیے جوان کی ضرورت سے زیادہ ہو،سب خدا کی راہ میں دے دیں"۔یہ ہے آپ کے خاندان کا حال جسے مستشرقین غریب خاندان سے تھے، کہتے ہیں (نعوذ باللہ)۔قارئین کرام خود پڑھ کر اندازہ لگالیں کہ مستشرقین کس سوچ کے مالک اور کس نفرت وتعصب کے بھرے ہوئے ہیں۔بلا دلیل اور بے بنیاد اعتراض کردیتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۰۷

حضورؐ کی زندگی میں اتنی بات یقینی ہے کہ آپؐ ایک معزز مگر غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے،آغاز حیات میں شفقت پدری سے محروم تھے اور آپؐ کی پرورش ایک غریب گھر میں ہوئی لیکن بعد کے ازدواجی ذریعے سے آپؐ نے معاشی خوشی حاصل کرلی تھی۔(ٹارانڈ رائے۔ضیاالنبی ۲۱۸/۷)

۲۔ مائیکل ہارٹ کہتا ہے"جب آپ کی شادی ایک اہل ثروت خاتون سے ہوئی جس سے مالی حالت بہتر ہوگئی۔

جواب: ٹارانڈ راے نے یہ تو تسلیم کیا کہ آپ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔نیز ٹارانڈ راے نے مارگولیس کے سابقہ اعتراض "آپؐ ایک ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے" کا رد کردیا۔آپ کے اعلیٰ حسب ونسب اور شرافت و بزرگی کا ذکر پچھلے صفحات میں تفصیل سے ہوا اور آپؐ کے غریب خاندان سے ہونے کی بھی نفی اور ابطال کیا گیا ہے۔باقی مذکور اعتراض میں دو کا جواب دینا باقی ہے۔ا: آپ کی پرورش ایک غریب خاندان میں ہوئی،۲: رشتہ ازدواج کے ذریعے آپؐ نے معاشی خوشحالی حاصل کرلی تھی۔

جہاں تک پہلے الزام کا تعلق ہے کہ"آپ کی پرورش ایک غریب گھر میں ہوئی" ٹارانڈ رائے اسے ایک غریب گھر میں محدود کردیتا ہے۔یعنی اس کا نشانہ حضرت ابوطالب کا گھر ہے۔کیونکہ ابوطالب نے آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری اپنے باپ عبدالمطلب کی زندگی ہی میں لے لی تھی۔پہلی بات تو یہ ہے

کہ ٹارانڈ رائے چار یا پانچ سال کی بنی سعد میں پرورش کا انکار کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عبدالمطلب کی کفالت کی مدت کو بھی ڈکار لیے ہضم کر جاتا ہے۔ اس دادا نے آپؐ کی کفالت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ابوطالب نے اپنے باپ کی نصیحت پر آنحضرت کی پرورش کا ذمہ لیا تھا اور آپؐ کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری عبدالمطلب کی وفات کے بعد پڑی تھی۔ اس وقت آپ کی عمر آٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ کے چچا ابوطالب نے نہ صرف اپنے خاندان کے ایک آدھ فرد بلکہ مشرکین مکہ کی مخالفت مول لی تھی جو ہر وقت آپ کو ٹھکانے لگانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ غریب گھر اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ آپ قلیل المال تھے۔ یہ درست نہیں ہے اس کی تفصیل پیچھے آ چکی ہے۔ غریب گھر اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ آپ قلیل المال کے ساتھ کثیر العیال تھے۔ یہ بھی درست نہیں آپ کی پرورش کے زمانہ میں ابو طالب کے تین بچے تھے اسے کثیر العیالی نہیں کہا جا سکتا۔ غریب گھر اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ ابوطالب لنگڑے تھے یا پیدائشی معذور تھے۔ وہ سرپرستی کیا کرتے یا تجارت کیسے کر سکتے تھے؟

اگر وہ لنگڑے تھے تو تجارت میں اس عذر سے رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، کسی کو ایجنٹ یا حصہ دار بنا کر تجارت کی جا سکتی ہے۔ حضرت خدیجہؓ کا کاروبار تجارت وسیع تھا۔ وہ صرف نگرانی فرماتی تھیں اور تجارتی سامان دوسروں کے سپرد کر دیتیں، انھیں معاوضہ دیتیں، یا تجارتی کارواں کے ساتھ اپنا سامان تجارت غلاموں کے ہمراہ بھیج کر تجارت کرتی تھیں۔ ایسا ابوطالب نہیں کر سکتے تھے؟ دور دراز ملکوں میں تجارت اونٹوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ سواری کے لیے یہی اونٹ کام آتے تھے تو بجائے پیدل سفر کرنے کے، جس میں دشواری ہو، اونٹوں کو سواری کے لیے استعمال کر کے اپنا کام انجام دے سکتے تھے۔ عام طور پر روزمرہ مشاہدہ کی بات ہے کہ ایسے لوگ اپنا کام احسن طریقے سے کرتے نظر آتے ہیں۔۲: آنحضرت کی قریباً ۹ سال کی عمر میں ابوطالب نے بغرض تجارت شام کا سفر کیا، اس وقت یہ معذوری کیوں پیش نہ آئی؟

قابل غور نکتہ: آنحضرت ﷺ کو رضاعت کے لیے حلیمہ سعدیہؓ گود میں لیتی ہیں۔ اس کی چھاتی میں دودھ اس قدر کم تھا کہ ان کا بیٹا عبداللہ بھوک سے ساری رات چلاتا اور بلبلاتا رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس کی تسکین خاطر کے لیے رات جاگ کر گزارتے۔ اونٹنی تھی کہ وہ قطرہ دودھ بھی نہ دیتی تھی۔ دراز گوش جس پر سوار ہو کر حلیمہ سعدیہ مکہ آئیں اس قدر کمزور اور نڈھال تھی کہ بنی سعد قبیلہ کی باقی عورتوں سے پیچھے رہ جاتی۔ حتیٰ کہ وہ مکہ میں سب سے آخر میں پہنچی۔ وہی سواری جو چل نہ سکتی تھی، واپسی پر سب سے آگے نکل جاتی ہے۔ حلیمہ سعدیہؓ کی چھاتی میں دودھ کی افزونی ہوئی کہ آنحضرت اور ان کا بیٹا عبد اللہ دودھ سیر ہو کر پیتے تھے۔ اونٹنی کے تھن دودھ سے بھر گئے۔ حلیمہ کے گھر میں برکتوں کا نزول شروع ہُوا۔ مال مویشی فربہ ہو گئے۔ قحط اور کال کٹ گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مستشرق دور کی کوڑی لاتا ہے اور کہنا یہ چاہتا ہے کہ آپؐ کے وجود سے حلیمہ سعدیہؓ کا گھر بقعہ نور بن گیا۔ کال کٹ گیا۔ مویشی فربہ ہو گئے۔ دودھ کی فراوانی ہوگئی گویا خوشحالی نے سعدیہ کا گھر دیکھ لیا تو کیوں کر ابو طالب کے گھر کی غربت نہ گئی؟ ان کے حالات کیوں نہ بدلے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ مسلمانوں نے حلیمہ سعدیہ کو پیش آنے والے واقعات کو خود گھڑ لیا ہو جن کا حقیقت سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ یہ مستشرق کی اپنی سوچ اور تعصب اور حقائق کو مسخ کرنے کی ایک ناکام اور ناتمام کوشش ہے۔ جب کہ تاریخ اس کا رد کرتی ہے۔ آپ کی پرورش کے زمانے میں ابو طالب نہ تو کثیر العیال تھے نہ قلیل المال تھے۔ اس وقت ابو طالب کے تین بچے تھے۔ یعنی طالب اور دو بیٹیاں ام ہانی اور حجانہ۔ ابو طالب آپؐ کے قیام کے زمانہ میں خوشحال تھے۔ ان کا اپنا تجارتی کاروبار تھا۔ ایک دکان کپڑے کی تھی جس میں کپڑا فروخت ہوتا اور سلتا تھا۔ ان کے سگے بھائی عبد اللہ کا سامان تجارت بھی آپ کو ہی ملا ہوگا کیونکہ آنحضرت ﷺ کی کفالت کی ذمہ داری ابو طالب کی تھی۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ کفالت کے ذمہ دار شخص کو ہی سامان تجارت سپرد کرنا چاہیے تھا۔ ایسے گھر کو غریب نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ ایک وقت آیا جب ابو طالب کے حالات کمزور تھے لیکن یہ سید الابرار کی کفالت کے بعد کا زمانہ ہے جب نبی کریمؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے جعفرؓ کو اپنی اپنی کفالت میں لیا تھا تاکہ ان کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ آپؐ کی پرورش کے زمانہ میں ابو طالب کی مالی اور معاشی حالت بہتر تھی۔ یہ یار لوگوں کی من گھڑت کہانیاں اور رنگین بیانیاں ہیں۔ تاریخی حقائق کو چھپا کر افسانوی رنگ میں ڈھال کر اپنی دشمنی کی بھڑاس نکالنا ان کی عادت دیرینہ ہے جو سراسر ناانصافی ہے۔ اس کا جواب کیا دیں گے کہ ابو طالب نے آپؐ کے خدیجہ سے نکاح پر اپنے مال سے حق مہر بیس اونٹ مقرر کیے تھے۔ لیکن اس وقت آپ کے پاس کتنے اونٹ تھے معلوم نہیں ہو سکا پھر بھی حق مہر کے لیے بیس اونٹ مقرر کرنا کافی ہیں چونکہ آپ نے تنہا مہر میں بیس اونٹ دیئے جبکہ تمام اہل مکہ نے ہجرت کے موقع پر ایک سو اونٹ کا انعام مقرر کیا تھا۔

دوسرا جز: اس اعتراض کا دوسرا جز ہے ''ازدواج کے ذریعے سے آپ نے معاشی خوشحالی حاصل کر لی تھی۔ (ٹار انڈرائے) یہی بات مائیکل ہارٹ کہتا ہے ''جب آپ کی شادی ایک اہل ثروت عورت سے ہوئی جس سے مالی حالت میں بہتری ہوئی''۔

جواب: یہ بات کہنا کہ شادی ایک اہل ثروت خاتون سے ہوئی جس سے آپ ﷺ کی معاشی اور مالی حالت میں بہتری پیدا ہوئی یا مالی پریشانیوں سے نجات مل گئی، درست نہیں ہے۔ مآخذ سے انکار ہے یا مطالعہ کی کمی ہے۔ سنیے! جان دو عالم ﷺ تجارت کیا کرتے تھے۔ آپؐ بہت اچھے شریک کار

تھے۔ آپؐ نہ مخالفت کرتے تھے اور نہ ہی کسی سے جھگڑا کرتے تھے۔ آپؐ کا تجارت کرنا از خود اور اپنے والد کے ترکہ میں سے ملنے والے مال کے ذریعے تھا۔ مفتی مسعود (اعلان نبوت سے پہلے۔ ۲۹۵) بحوالہ محمد احسان الحق، مولانا شبلی کی عربی تالیف 'بدر اسلام' کے ترجمہ سیرت طیبہ از میمونہ سلطان شاہ بانو، کے حاشیہ سے لکھتے ہیں کہ ''رسول اللہ خدیجہ سے نکاح کے وقت مکہ کے ایک مشہور تاجر تھے۔ تجارتی امور میں آپؐ کی مہارت کے ساتھ ساتھ آپؐ کی امانت و دیانت کا ہر کوئی معترف تھا۔

دوم: ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیغمبر اسلام۔ ۸۰) بتاتے ہیں ''اگر ہم بولنے والی کے لیے کوئی گنجائش رکھیں اور موقع و محل کو بھی مدِ نظر رکھیں، پھر بھی یہ باتیں ہمیں واضح بتاتی ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ اپنی زوجہ کی دولت کو ہاتھ نہ لگاتے تھے، بلکہ اپنے خاندان کو چلانے کے لیے کافی کچھ کماتے تھے۔ آپؐ کی اپنی تجارت، ذریعہ معاش تھا لیکن یقینی طور پر یہ ممکن ہے کہ آپؐ نے اپنی زوجہ کے کاروبار کی دیکھ بھال بھی جاری رکھی ہو، کیوں کہ مکہ والوں کے رواج کے مطابق بیوی کی جائیداد شوہر کو نہیں ملتی تھی بلکہ شادی کے بعد بھی مکمل طور پر بیوی کے پاس رہتی تھی۔ اس پر قاطع دلیل السائب کی حدیث ہے۔ قیس بن السائب مخزومی کہتے ہیں ''میں نے زمانہ جاہلیت میں محمد بن عبد اللہ ﷺ سے بہتر ساتھی، اور ساجھی کوئی نہیں پایا۔ اگر ہم آپ کا مال تجارت لے کر جاتے تو واپسی پر آپؐ ہمارا استقبال کرتے اور خیر و عافیت پوچھتے اور گھر چلے جاتے۔ بعد میں حساب دیتے تو اس میں قطعی تکرار یا بحث نہ کرتے، ہم جو کہتے اس کو مان لیتے۔ دوسرے شرکاء تجارت پہلے نفع و نقصان کی بات کرتے، مال و منال پر اصرار کرتے (مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔ ۵۳) اس کے برعکس اگر آپؐ تجارتی سفر سے لوٹتے تو جب تک پائی پائی بے باق نہ کر دیتے گھر کی راہ نہ لیتے۔ مال خرید کر لاتے تو ہمارے حوالے کر دیتے، اہل و عیال کی خیر و عافیت پوچھتے''۔ گویا ان تاریخی حقائق سے بات واضح ہوئی کہ آپؐ کی معاشی حالت پہلے ہی سے بہتر تھی نہ کہ اہل ثروت خاتون سے شادی کرنے کے بعد بہتر ہوئی۔ یہ مستشرقین کی رنگ آمیزیاں' غلط بیانیاں اور فضول کہانیاں ہیں۔ یہ محض باطل ہیں اور ''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے'' کے سوا اور کچھ نہیں۔

اہم نکتہ: ''جب ابو طالب شام کے سفر کے لیے جانے لگے تو حضورؐ نے ان کے اونٹ کی مہار پکڑ کر اپنے مہربان چچا سے فرمایا، آپ مجھے کس کے سہارے پر چھوڑے جا رہے ہیں، میری ماں ہے نہ میرا باپ جو میری دیکھ بھال کرے'' (س۔ جلد اول، ص ۲۹۳)

جواب: ابو طالب آپ ﷺ کی خواہش کا لحاظ بدرجہ اتم رکھتے تھے اور کسی موقع پر بھی اس کو پورا کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ مجھے کس کے سہارے پر چھوڑے جا رہے ہیں، میری ماں نہ میرا باپ یہ بات سن کر ابو طالب کا دل پسیجا اور ہمدردی کرتے ہوئے انھیں ساتھ لے لیا اور شام کو

روانہ ہوئے اس بات سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاید ابو طالب کی بیوی حضورؐ کا خیال نہ فرماتی ہوگی۔ مگر یہ یاد رہے کہ آپؐ نے اپنی چچی کے بارے میں فرمایا: 'یہ میری ماں ہیں۔ مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ خود بھوکی رہتیں لیکن مجھے کھلاتی تھیں۔ یہ میری ماں کے بعد میری ماں ہیں''۔

دوم: اتنے دور دراز سفر پر جانا بضد نہ تھا یا پیاری چچی کے گھنے خنک سائے میں رہنے سے انکار نہ تھا۔ بلکہ تجارتی اسرار ورموز سے آشنائی اور چچا کا بار ہلکا کرنے کے لیے ان کا ہاتھ بٹانا مقصود تھا اس لیے جانے کا اصرار کیا۔ ابو طالب بھی آپؐ کو دانستہ ساتھ لے گئے کہ کل حضورؐ کو خود اپنا کام سنبھالنا ہے اس لیے انھیں کاروبار سے واقفیت ہو جائے۔ اس طرح یہاں بھی ابو طالب حضور ﷺ کو بحیثیت شریکِ کار لے کر گئے تھے۔

سوم: یہ وہی چچی فاطمہ ہیں جن کی وفات ہوئی۔ آپؐ ان کی قبر میں لیٹ گئے۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا طلب فرمائی۔ ذرا سوچیں اگر وہ آپؐ کا خیال نہ رکھتی ہوتیں، دکھ دیتی ہوتیں تو آپؐ ان کی قبر میں لیٹتے؟ یہ فاطمہ کے اچھے سلوک اور پیار و محبت کے صلہ میں کیا کہ ان کی قبر کو یہ شرف بخشا۔

سفرِ شام اور راہب: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ابو طالب روسائے قریش کے ہمراہ شام کی طرف (تجارت کے لیے) چلے۔ ان کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ بھی شریکِ سفر تھے۔ جب بحیرا راہب (اصل نام: برجیس۔ مواہب لدنیہ) کے مکان کے قریب پہنچے تو انھوں نے کجاوے کھولنے شروع کیے۔ راہب ان کے پاس آیا۔ اس سے پہلے بھی یہ لوگ راہب کے پاس سے گزرتے تھے تو وہ ان کے پاس نہ آتا تھا نہ ان کی طرف توجہ کرتا تھا۔ (اب کی دفعہ خلافِ معمول چل کر آیا)۔ حضرت موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ لوگ ابھی کجاوے کھول رہے تھے تو وہ ان کے درمیان گھس کر چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے آکر رسول اللہ کا ہاتھ مبارک پکڑ لیا اور اس نے (لوگوں کو مخاطب کر کے) کہا: یہ تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کرے گا اور یہ تمام عالم کے سردار ہیں۔ روسائے قریش نے پوچھا: یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ پادری نے کہا جس وقت تم لوگ عقبہ سے چلے تو جتنے پتھر اور درخت تھے سب سجدہ میں گر پڑے۔ ایک پتھر اور ایک درخت بھی ایسا نہ رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہو اور درخت اور پتھر سوائے پیغمبر کے کسی کو سجدہ نہیں کرتے اور میں ان کو مہر نبوت سے بھی پہچانتا ہوں جو آپؐ کے مونڈھے (شانہ) کی ہڈی کے نیچے سیب کی مانند ہے پھر وہ پادری واپس چلا گیا اور ان لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنے لگا۔ جس وقت وہ کھانا لے کر ان کے پاس آیا تو آپؐ اونٹوں کے چرانے میں مصروف تھے۔ اس نے آپ ﷺ کو بلا بھیجا جس وقت حضور وہاں سے چلے تو ایک بدلی آپؐ کے سر پر سایہ کیے ہوئے تھی۔ جب آپؐ لوگوں کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ مجھ سے پہلے درختوں کے سایہ میں جگہ پا چکے تھے۔ جب آپؐ بیٹھے تو درخت کا سایہ آپ ﷺ کی طرف

جھک گیا۔ پادری نے لوگوں سے کہا: دیکھو: اس درخت کا سایہ آپؐ پر جھک گیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ پادری ان کے پاس کھڑا قسمیں کھا کھا کر ان کو سمجھا رہا تھا کہ ان کو روم کی طرف نہ لے جاؤ، کیوں کہ رومی لوگ اگر ان کو دیکھیں گے تو صفت و علامت سے ان کو پہچان لیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی ہیں) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر ڈالیں گے۔ اتنے میں اس نے منہ موڑ کر کیا دیکھا کہ سات آدمی روم کی طرف چلے آ رہے تھے۔ پادری نے ان کا استقبال کیا اور ان سے پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟ انھوں نے کہا ہم اس لیے آئے ہیں کہ وہ نبی اس مہینہ میں نکلنے والے ہیں۔ پس کوئی راستہ ایسا نہیں جہاں چند آدمی نہ بھیجے گئے ہوں اور ہمیں ان کی خبر ملی ہے تو ہمیں اس راستہ کی طرف بھیجا گیا ہے۔ پادری نے پوچھا: کیا تم لوگوں کے پیچھے تم سے بہتر آدمی بھی ہے؟ انھوں نے کہا ہمیں تو آپ کے راستہ کی خبر دی گئی ہے (اور کچھ نہیں بتایا گیا)۔ پادری نے کہا: اچھا یہ بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی امر کا ارادہ کیا ہو تو کیا کسی انسان کی طاقت ہے کہ اسے روک دے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ الغرض انھوں نے آپ سے بیعت کر لی اور آپ کے ساتھ مقیم رہے۔ پادری نے قریش سے کہا: تمھیں خدا کی قسم یہ بتاؤ کہ تم میں اس کا ولی (سرپرست) کون ہے؟ انھوں نے کہا ابو طالب (آپؐ کے چچا اور سرپرست ہیں)۔ پادری نے قسمیں دے کر ابو طالب سے کہا کہ اِنھیں واپس لے جاؤ۔ آخر ابو طالب نے آپؐ کو مکہ واپس بھیج دیا اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپؐ کے ہمراہ بلالؓ کو بھیجا اور اس پادری نے آپؐ کو زادِ راہ کے لیے روٹیاں اور روغن دیا۔ (یہ حدیث حسن غریب ہے) (ترمذی شریف جلد دوم ص ۳۵۳/۳۵۴ ابواب المناقب)

حدیث کے بارے میں شبلی نعمانی کی تقریر: وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت نا قابل اعتبار ہے اور اس روایت کا زیادہ مستند طریقہ جو ترمذی شریف میں ہے اس کے متعلق تین باتیں قابلِ غور ہیں۔ ۱: ترمذی نے اس روایت کے متعلق حسن غریب لکھا ہے اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے۔ حسن کا مرتبہ صحیح سے کم ہوتا ہے۔ اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے ۔۲: اس حدیث کا ایک راوی عبد الرحمٰن بن غزوان ہے۔ اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے لیکن اکثر اہلِ فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے۔ علامہ ذہبی، میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ عبد الرحمٰن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے جن میں سب سے بڑھ کر وہ روایت ہے جس میں بحیرا راہب کا ذکر ہے۔ ۳: حاکم نے المستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔ ۴: اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور حضرت ابو بکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے۔ حالانکہ اُس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابو بکرؓ کم

سن تھے۔۵: اس حدیث کے آخری راوی ابو موسیٰ اشعریؓ شریکِ واقعہ نہیں تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔اس کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلہ سند مذکور ہے، وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے، شریک واقعہ نہیں ہے۔کسی صحابی کا نام نہیں لیتا اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں، دونوں کا نام نہیں لیتا۔۔۔

۶۔حافظ ابن حجر روایت پرست کی بناء پر اس حدیث کو تسلیم کرتے ہیں لیکن چونکہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ کی شرکت بداہتاً غلط ہے اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر غلطی سے روایت میں شامل کیا گیا ہے لیکن حافظ ابن حجر کا ادعا بھی درست نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں ،ثقہ ہیں۔عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ''وہ خطا کرتا تھا'' اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے۔ممالیک کی ایک روایت جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔(تقریر ختم ہوئی) امام ترمذی، بیہقی اور حافظ ابن حجر جیسے محدثین نے جب اس حدیث کو مستند مان لیا ہے اور حافظ ابن تیمیہ نے نصاریٰ کے رد میں بطور حجت پیش کیا ہے۔صرف اسماء الرجال کی کتب سے مخالفین کے اقوال نقل کرنا اور موافقین سے پہلو تہی کرنا درست نہیں۔اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ اوہام سے صحیحین کی حدیثیں بھی خالی نہیں ہیں۔

صاحب اصح السیرّ کہتے ہیں ''سب سے بہتر وہ روایت ہے جو ترمذی میں ابو موسی اشعری سے مروی ہے۔ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ اس روایت کے رجال ثقہ ہیں لیکن اس کے آخر میں ایک جملہ ہے جو بالکل لغو ہے۔وہ یہ کہ ابو طالب نے حضور کو واپس کر دیا اور ابو بکرؓ نے بلال کو حضور کے ساتھ کر دیا۔یہ لغو اس واسطہ ہے کہ اس وقت ابو بکر کم سن تھے اور بلال حبشی ان کے پاس نہ تھے۔ابن حجر لکھتے ہیں کہ احتمال ہے کہ رواۃ نے کسی اور روایت کا جملہ غلطی سے اس میں شامل کر دیا ہے، روایت درست ہے اور اس جملہ کے سوا اور کوئی بات اس میں قابل انکار نہیں ہے مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ بلال سے مراد بلال حبشیؓ ہے، ممکن ہے کہ اور بلالؓ بھی ابو بکرؓ کے غلام ہوں اور باوجود کم سنی کے ابو بکر بھی ابو طالب کے ساتھ گئے ہوں۔۔۔مزید لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی نے اس روایت پر دو اعتراض کیے ہیں۔اول یہ کہ عبدالرحمٰن بن غزوان اس کے ایک رواۃ ہیں جو مجروح ہیں حالانکہ عبدالرحمٰن صحیح بخاری کے رواۃ میں سے ہیں۔دوم یہ کہ ابو موسی اشعریؓ کے آخری ایک رواۃ ہیں، وہ واقعہ کے وقت موجود نہ تھے اور انہوں نے یہ بتایا نہیں کہ کس سے سنا؟ نہ بتایا مگر بلا تحقیق غلط بیانی کا تو ان سے قرینہ نہیں ہے۔خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔صحابہ کا بیان حجت ہے۔ واللہ اعلم (اصح السیرّ۔ج ۱۔۱۷) مارگولیس، ولیم میور اور ڈریپر وغیرہ اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے پرچارک ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق اور اسرار و رموز بحیرا

راہب سے سیکھے، انہی پر آپ ﷺ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔ جس وقت وہ (راہب) کھانا لے کر واپس آیا تو آپؐ اونٹوں کو چرانے میں مصروف تھے۔ اس نے آپ ﷺ کو بلا بھیجا۔ جس وقت حضورؐ وہاں سے چلے تو ایک بادل آپؐ کے سر پر سایہ کیے ہوئے تھا۔

اہم نکتہ: علامہ دھلانی لکھتے ہیں کہ ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بال سفید تھے اگرچہ حضور ﷺ کی عمر مبارک ابوبکرؓ سے زیادہ تھی (آپ ﷺ کے سر اور ریش مبارک کے بالوں میں گنتی کے چند موئے مبارک سفید تھے) بعض نے سترہ موئے مبارک سفید لکھے ہیں۔ جن حضرات نے پہلے حضور ﷺ کی زیارت نہیں کی تھی، وہ ابوبکرؓ کی طرف لپکے۔ ابوبکرؓ صدیق آپ ﷺ کے متعلق بتانا چاہتے تھے۔ جب حضور ﷺ پر دھوپ آ گئی تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور اپنی چادر سے حضور ﷺ کو سایہ کرنے لگے۔ اس طرح صحابہ کرامؓ کو علم ہو گیا کہ مخدوم کون ہے اور خادم کون ہے۔ یہ روایت ان روایات کے منافی نہیں ہے جس میں یہ تذکرہ ہے کہ حضور ﷺ پر بادل سایہ فگن رہتا تھا کیونکہ بعثت سے پہلے بادل آپ ﷺ پر سایہ کناں رہتا تھا۔ یہ حضور ﷺ کی نبوت کے لیے بطور ارہاص تھا۔ بعثت کے بعد آپ ﷺ کے متعلق کسی صحابی سے ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ آخری جملہ محل نظر ہے وہ یوں کہ خود علامہ مذکور نے سفر طائف کے ضمن میں ایک حدیث امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے، انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کی ''کیا آپ ﷺ پر غزوہ احد کے دن سے بھی زیادہ شدید دن گزرا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''میں نے تمہاری قوم سے بڑی اذیتیں برداشت کی ہیں مگر عقبہ کا روز مجھ پر سب سے زیادہ شدید گزرا'' عقبہ سے مراد وہ مخصوص مقام ہے جس جگہ آپ ﷺ نے عبد یالیل سے ملاقات کی تھی۔ اس سے مراد عقبہ منیٰ نہیں جہاں آپ ﷺ نے انصار سے ملاقات کی تھی۔ آپ ﷺ نے تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا ''میں نے عبد یالیل کو دعوت حق دی مگر اس نے لبیک نہ کہا۔ میں واپسی عازم ہوا۔ میں انتہائی غم زدہ اور مغموم تھا، میں قرن الثعالب پہنچا تو میں نے اپنا سر اٹھایا تو مجھے بادل کو ٹکڑا نظر آیا، جو مجھ پر سایہ فگن تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس میں جبرئیل امین نظر آئے، انہوں نے مجھے آواز دی ''اللہ تعالیٰ نے بنو ثقیف کے تلخ جوابات اور انکار حق سن لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تاکہ آپ ﷺ اسے جو چاہیں حکم دیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''مجھے پہاڑوں کے فرشتوں نے آواز دی، اس نے مجھے سلام کیا پھر کہا، محمد عربی! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی قوم کے اذیت ناک جوابات اور پیغام حق کی ترغیب سن لی ہے۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ ﷺ کی بارگاہ میں بھیجا ہے اگر آپ ﷺ مجھے حکم دیں تو میں ان دو پہاڑوں کے مابین پیس کر رکھ دوں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ

تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اس وحدہ لاشریک ذات کی عبادت کریں گے۔
(السیرۃ النبویہ۔ا۔۴۰۵)

اعتراض نمبر ۱۷

مستشرقین آنحضرت ﷺ پر بادل کا سایہ کرنے کے انکاری ہیں۔

۲۔ حلیمہ سعدیہؓ نے دیکھا کہ بادل آنحضرت ﷺ پر سایہ کناں ہے۔ ولیم میور نے اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ اگر اس روایت میں کچھ صدق ہے تو غالباً عارضہ سابقہ (مرگی) یعنی صرع کے عود سے مراد ہوگی۔ (نعوذ باللہ)

جواب: بدر عالم (ترجمان السنہ۔۱۹۱۔۳) لکھتے ہیں "درختوں اور پتھروں کا سجدہ کرنا' ظاہر ہے کہ جس نبی کے معجزات میں حیوانات کا سجدہ' پتھروں کا سلام کرنا' اس کے دست مبارک میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا' اور جس کے حکم سے کھجور کے درخت کا خوشہ آجانا' اور جس کے حکم سے دو درختوں کا آکر باہم مل جانا اور پھر اس کے حکم سے جُدا جُدا اپنی جگہ جا کر کھڑے ہو جانا' مستند طریقوں سے ثابت ہو وہاں اتنی بات پر کیا تعجب کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ درختوں کی شاخوں کا جھک جانا اور بادل کا سایہ کرنا امر ایزدی کے ماتحت صرف ایک واقعہ میں آپ ﷺ کے ساتھ حرکت کرنا' ان امور میں سے نہیں جو انبیاءؑ کے معاملوں میں موجبِ حیرت ہوں۔ آخر اس نبی اولوالعزم کے صدقہ میں ابو طالب نے بارش مانگی تو کیا بادل نہ آگئے اور نہ برسے تھے؟ پھر کیا اسی رسول کی دعا پر بارہا بادلوں نے اپنی بارش کے دہانے نہیں کھول دیئے اور کیا پھر اسی رسول کی انگشت مبارک کے اشارہ پر بادلوں نے مدینہ طیبہ کی بستی چھوڑ کر ٹیلوں اور پہاڑوں کا رُخ نہیں کر لیا تھا؟ آپ ﷺ کے اشارہ پر بادلوں کی اتنی حرکت کیا عجب نہ تھی۔ پھر جب کہ میدانِ تیہ میں بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ فگن رہنا قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس کے بعد بادل کے ایک ٹکڑے کا آپؐ پر سایہ کر لینا کون سی بعید از قیاس بات ہے۔ اب رہا اس حدیث کا اسنادی پایہ تو ہمارے نزدیک امام ترمذی، بیہقی اور آخر میں حافظ ابن حجر جیسے متفق علیہ محدثین نے جب اس حدیث کو مستند مان لیا ہے اور حافظ ابن تیمیہ جیسے شخص نے نصاریٰ کے مقابلہ پر اس کو بطور حجت پیش کیا ہے تو اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نکالنا بہت ناموزوں ہے۔ صرف کتب رجال سے اُٹھا اُٹھا کر مخالفین کے اقوال نقل کرنا اور موافقین کا ذکر نہ کرنا انصاف نہیں ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اوہام سے صحیحین کی حدیثیں بھی خالی نہیں ہیں۔ ان کے رجال پر کہیں کہیں کلام کیا گیا ہے"۔ (ترجمان السنہ۔۳۔۱۹۱)

حضرت عائشہ سے مروی ہے (حدیث کا ایک ٹکڑا ہے) انہوں نے فرمایا کہ "ایک بادل کا ٹکڑا مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ اس کی طرف نظر کی تو دیکھا! اس میں جبرائیل موجود ہیں اور فرماتے ہیں۔ اللہ

تعالیٰ نے آپؐ کی قوم کا جواب سن لیا اور آپؐ کی خدمت میں پہاڑوں پر موکل فرشتہ کو بھیجا ہے آپؐ جو چاہیں اس کو حکم دیں (ترجمان السنہ۔۱۵۶۔۴)۔اس روایت میں اور راہب والی روایت میں بادل کے سایہ کا ذکر ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔صاحب ترجمان السنہ نے (۱۵۸۔۴) کیا خوب لکھا ہے ''جس پر رحمت باری سایہ فگن رہتی ہو اس پر اگر سو بار بادل سایہ کرے تو تعجب کیا ہے''؟ محدثین اور سیرت نگاروں نے بحیرا راہب کے واقعہ میں بادل کے سایہ کرنے کو تسلیم کیا ہے۔تو اس واقعہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ حالانکہ یہ واقعہ صحیح بخاری میں صاف الفاظ میں مذکور ہے۔اس حدیث میں طائف کے مصائب کا ذکر ہے۔بادل قصداً قدرت کی طرف سے آپؐ پر سایہ کرنے پر مامور تھا تاکہ اگر ایک طرف لوگوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہو تو دوسری طرف رحمت الٰہی آپ کے ساتھ ہو (حوالہ بالا)۔

ضمناً اعتراض: سر ولیم میور کی فکری پرواز کا جواب نہیں وہ کہتے ہیں کہ حلیمہ سعدیہؓ نے دیکھا کہ بادل آنحضرت پر سایہ کُناں ہے' سے نتیجہ یہ نکالا اگر اس روایت میں کچھ صدق ہے تو غالباً عارضہ سابقہ (مرگی) یعنی صرع کے عود سے مراد ہوگی۔'' ولیم میور

جواب: دیکھنے والوں کو بادل نظر آیا اور ولیم میور اسے عارضہ سے تعبیر کرتا ہے، کیونکر قابلِ یقین ہو سکتا ہے۔ایک بات یقینی ہے اور دوسری ظنّی۔اور ظنّی قابل یقین نہیں ہوتی۔برسات کے موسم میں بادل کئی لوگوں پر سایہ کیے ہوتے ہیں۔انھیں تو کبھی کسی نے مصروع (مرگی زدہ) نہیں کہا۔نہ جانے ولیم میور نے طب کی کون سی کتاب پڑھی ہے جس سے یہ بات کہہ دی۔حضور ﷺ کا یہ معجزہ ہے قدرت آپؐ کو گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے بادل کا سایہ فراہم کرتی ہے اور یہ لوگ اس معجزہ کا انکار کرنے کی تاویلات کرنے میں مگن ہیں جو سرتاپا جھوٹ ہے۔اپنوں نے بھی معرفت کا لبادہ اوڑھ کر تاویلات کا سہارا لیا۔جیسے شیخ بدر الدین زرکشی نے بعض اہل معرفت سے روایت کی ہے نبی مکرم معتدل الحرارت اور برودت تھے۔آپ کو نہ گرمی اور نہ سردی لگتی تھی۔آپؐ اپنے اعتدال کے سایہ میں تھے۔(مواہب لدنیہ۔۱۳۱۔۱)

پیچھے بخاری کی ایک حدیث کا ٹکڑا' ترجمان السنہ جلد۴ ص ۱۵۶ سے نقل کیا گیا ہے۔سیرت نگاروں نے بڑی مشکل سے بحیرا راہب کے قصہ میں آپؐ کے اوپر بادل کے سایہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کے سوا کسی دوسرے واقعہ میں نقل نہیں کیا۔بعض سیرت نگاروں نے میسرہ اور آپؐ کے تجارتی سفر اور حضرت خدیجہ نے کاروان کی واپسی پر فرشتوں کا سایہ کرنا بھی دیکھا۔اگر معجزات سے منحرف طبائع پر گراں ہوں تو ان کو اختیار ہے کہ وہ اس کی تاویل بھی کر ڈالیں۔اس کے لیے تظلیل صحابہ سے زیادہ اور کوئی صریح لفظ نہیں ہو سکتا مگر تاویل کا قلم کہیں روکا نہیں جا سکتا۔یہ بات بھی یاد رہے کہ آپؐ نے سر مبارک اُٹھایا تو اس میں جبرائیلؑ کو دیکھا، اس کی آواز سنی، اس لیے اس کو اتفاقیات پر محمول کرنا غیر معقول ہے۔در

حقیقت یہ بادل قصداً قدرت کی طرف سے آپؐ پر سایہ کرنے پر مامور تھا۔ جب آپؐ رضاعت کے لیے بنی سعد میں تھے۔ دودھ چھڑانے کے بعد آپؐ کی رضاعی بہن شیما بنت حلیمہؓ نے دوپہر کے وقت آپ کو دیکھا کہ ایک بادل آپؐ پر سایہ کرتا ہے جس وقت آپ ٹھہر جاتے وہ ٹھہر جاتا آپ کے سر اقدس پر۔ اور جس وقت قدم بڑھاتے وہ ابر قدم بہ قدم آپؐ پر سایہ کیے جاتا (مواہب لدنیہ۔ ج اوّل۔۱۳۱)

جس طرح محدثین اور سیرت نگاروں نے بحیرا راہب کے قصہ میں بادل کے سایہ کو تسلیم کیا ہے تو یہاں پر تسلیم کرنے میں کون سی شے مانع ہے۔ ایک ہی ذات جس پر بادل سایہ کرتا ہے وہ متعدد بار قدرت کاملہ اپنی رحمت سے بادل کو سایہ کرنے کا حکم دے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ اس کی قدرت کا معجزہ ہے اور حضورؐ پر اپنی رحمت کا سایہ۔ یہ حضورؐ کی ذات کے مرتبہ ورتبہ کا معجزہ ہے کہ نبی مکرم اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کس قدر مقبول ومحبوب ہیں۔

ولیم میور جو اسے صرع سے تعبیر کرتا ہے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ ولیم میور اولاً تو اس واقعہ کا قائل نہیں ہے، اگر مانتا ہے تو اس قدر کہ یہ واقعہ عارضہ ہے یعنی اس نے تسلیم نہیں کرنا تھا اس لیے اس کی تاویل سابقہ عارضہ سے جوڑ دی ہے۔ عینی شاہد بادل کا ذکر کرتے ہیں، دیکھتے ہیں۔ شیماؓ گواہی دیتی ہے کہ بادل آپؐ پر سایہ کُناں رہتا ہے۔ چونکہ ولیم میور نے اس سے انکار کرنا تھا اس لیے ضروری تھا کہ تاویل کرتا، وہ تاویل اس نے کر ڈالی۔ عمر بھر اس عارضہ کا تعلق آپؐ سے کسی نے نہیں جوڑا۔ نیز مصروع کی علامتیں واضح ہوتی ہیں جن میں سے ایک بھی آپؐ میں موجود نہ تھی۔ جس کی گواہی بڑے بڑے دشمنوں نے بھی نہ دی بلکہ انھوں نے تسلیم کیا کہ آپؐ اس مرض میں مبتلا نہ تھے۔

صرع کے دوروں کا الزام

مستشرقین اپنے مذموم عزائم کو بروا کار لاتے ہوئے آپ ﷺ کو مصروع ثابت کرنے کے لیے چند واقعات کا سہارا لیتے ہیں جو ان کی ذہنی اختراع اور باطل تاویلات کا نتیجہ ہیں جبکہ ایسے واقعات دیگر مقدس ہستیوں کو بھی پیش آئے لیکن مستشرقین ومنکرین سب کو چھوڑ کر صرف حضور ﷺ کے سر الزام دھرتے ہیں اور دوسری برگزیدہ شخصیات کا نام تک نہیں لیتے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کی اپنی محبوب ہستیاں بھی زد میں آتی ہیں۔ وہ واقعات جن سے یہ مستشرقین آپ کو مصروع ہونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسپرنگر حضرت آمنہ کے فرشتوں کو دیکھنے کو مرگی سے تعبیر کیا اور یہی مرض حضور کو ورثہ میں ملا' کا الزام دھر دیا۔ علامہ محمد احسان الحق سلیمانی لکھتے ہیں کہ حضرت آمنہؓ، حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ نے اپنے رویا میں فرشتوں کو دیکھا جو انہیں احمد ﷺ کی خوشخبری دینے اور آپ کا نام مبارک تجویز کرنے آئے تھے۔'' سپرنگر نے کہا کہ فرشتوں نے کیا بشارت دینی تھی، حقیقت میں حضرت آمنہ کو ضعف دماغ اور صرع کی

بیماری تھی۔ حضرت آمنہؓ تو فرشتوں کو دیکھے اور یہی کہے کہ یہ فرشتے ہیں لیکن مستشرقین اسے صرع کہتے ہیں، عجیب منطق ہے۔ جو ساتھی آپ کے ساتھ مدت العمر رہے انہوں نے کسی موقع پر بھی مصروع نہیں کہا ۔ یہ سب کچھ پیغمبر اسلام اور آپ کے گھرانہ کی شان گھٹانا چاہتے ہیں (۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے بچپن میں اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرانے گئے کہ آپ کا رضاعی بھائی اپنے والدین کے پاس دوڑتا ہوا آیا کہ دو سفید پوش مردوں نے میرے قریشی بھائی کا لٹا کر اس کا سینہ چاک کر دیا ہے۔ رضاعی والدین دوڑے چلے آئے دیکھا تو آپ کھڑے ہیں اور آپ ﷺ کا رنگ متغیر ہے۔ پوچھنے پر آپ فرماتے ہیں کہ میرے پاس دو آدمی آئے جنہوں نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے، انہوں نے مجھے لٹایا، اور میرا سینہ چاک کیا اور اس میں سے کوئی چیز تلاش کی جو مجھے خبر نہیں کہ کیا تھی؟ مستشرقین کہتے ہیں کہ سینہ چاک نہیں ہوا تھا آپ کو صرع کا دورا پڑا تھا۔ ''نکلسن'' اپنی کتاب تاریخ ادب عربی اور ولیم میور نے لائف آف محمد میں شق صدر کے واقعہ کو مرگی کا دورہ قرار دیا۔ اس واقعہ سے نا صرف صرع کو آپ ﷺ کے لیے ثابت کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ آپ کے رضاعی ماں باپ بھی مرگی کا دورہ سمجھتے تھے اس کے استدلال میں حدیث کے اس ٹکڑا کو پیش کرتے ہیں۔ قَالَت وَقَالَ لِیَاَبُوْہٗ یَا حَلِیمَۃُ لَقَدْ خَشِیتُ اَنْ یَّکُوْنَ ھٰذَا الْغُلَامُ قَدْ اُصِیبَ فَالْحِقِیہِ بِاَھلِہٖ ''ترجمہ (حضرت حلیمہ) کہتی ہیں اس کے باپ نے مجھ سے کہا: اے حلیمہ! مجھے خطرہ ہے کہ اس بچے کو کچھ ہو گیا ہے، بہتر یہی ہے کہ تم اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دو۔''

سر سید نے پوکاک کی تاریخ ابوالفداء کے لاطینی ترجمہ کی عبارت کو لکھا ہے۔ ''فقال زوج حلیمہ لھا قد خشیت ان ھذا الغلام قد اصیب بالحقیہ باھلہ فاحتملۃ حلیمہ وقدمت بہ الیٰ امہ'' اس عبارت کا ترجمہ لیٹن زبان سے اردو میں اس طرح پر ہوتا ہے'' تب حلیمہ کے شوہر نے کہا: مجھ کو بہت خوف ہے کہ اس لڑکے کو کسی اپنے ساتھی سے دماغی مرض کو اخذ کر لیا ہے، اس واسطے اس کو حلیمہ سے لے کر اس کی ماں آمنہ کے پاس لے گیا''۔ قد اصیب فالحقیہ باھلہ اور پوکاک کی عبارت میں قد اصیب بالحقیۃ باھلہ، ایک تو عربی عبارت غلط لکھی پھر ترجمہ کیسے صحیح ہوگا'' اس لڑکے نے کسی ساتھی سے دماغی بیماری اخذ کر لی ہے، یہ ترجمہ عربی عبارت کے کسی جملہ کا ترجمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصیب فعل مجہول ہے جس کا ترجمہ کسی صورت میں بھی ''اس نے بیماری اخذ کر لی'' نہیں کیا جا سکتا نیز عربی متن کے کسی لفظ سے جس کا ترجمہ ''اپنے ساتھی سے'' کیا جا سکے، نہیں بنتا ہے۔ پھر حلیمہ کا شوہر بچے کو حلیمہ سے لے کر اس کی ماں حضرت آمنہ کے پاس لے گیا، عربی عبارت کے کسی جملے کا یہ معنی نہیں بنتا۔ پوکاک کی عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے'' کہ حلیمہ نے بچے کو اٹھایا اور اسے اس کی ماں کے پاس لے گئی'' یہ ہیں ان کی ہیرا پھیری کی باتیں کچھ کا کچھ لکھ کر اور اپنی مرضی کا ترجمہ کر کے اپنا مقصد نکالنا انہی کا کام ہے جو بڑی جسارت ہے۔ خود گمراہ

ہیں اور دوسروں کو گمراہی کے جال میں پھنسانے کے لیے ہمہ دم بسیار کوشش میں سرگرم ہیں۔ دین اسلام کو نادرست اور اپنے مذہب کو سچا ثابت کرنے کی کاوشیں کی ہیں۔ یہی نہیں ولیم میور نے تو کمال ہی کر دیا اور اپنی عربی دانی کا ثبوت فراہم کیا۔ اس نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں اصیب کی جگہ امیب لکھ مارا یعنی صاد کی جگہ میم اور اس کے معنی Fit یعنی عارضہ کے لکھے، یہ اسی طرح کی سازش اور سرقہ ہے جیسے پوکاک نے بالحقیہ کا لفظ گھڑا، ولیم نے اصیب کے لفظ کو امیب کا لفظ لکھ کر بدل ڈالا یہ ان کی تحریف کے ثبوت ہیں اور یہ ان کا روزمرہ کا کام ہے اور اسے اپنی غلطی نہیں سمجھتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ولیم میور صاد اور میم کا فرق نہ جانتے ہوں مگر یہ ان کی سیاہ بختی ہے جو انہیں حقیقت کے قریب آنے نہیں دیتی اور حقیقت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ بادل کا سایہ کناں ہونا: بادل کے سایہ کرنے کو صرع سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ نے دیکھا کہ بادل حضور ﷺ پر سایہ کیے ہوئے ہے وہ اس صورت حال سے خوف زدہ ہوئیں۔ ولیم میور نے اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر اس روایت میں کچھ صدق ہو تو غالباً عارضہ سابق کے یعنی صرع کے آثار کے عود سے مراد ہوگی۔ بھلا حلیمہ سعدیہؓ کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی تھیں انہیں پتہ نہ چلا کہ بادل سایہ کیے ہوئے ہے اور صرع کا وجود تک نہیں دیکھنے والی سعدیہ کو صرع کے آثار نظر نہیں آتے یعنی عینی شاہد اسے بادل ہی کا سایہ سمجھتا ہے جو آپ ﷺ پر گرمی کے سبب سایہ کناں تھا۔ کوئی ایسا مصروع دکھا دیں جس پر کبھی، ہمیشہ یا صرف ایک بار ہی بادل نے سایہ کیا ہو، اگر بادل کا سایہ کسی پر ہو جائے تو اسے بھی صرع زدہ کہیں گے۔ حضرت خدیجہؓ نے دیکھا کہ بادل آپ پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ راہب نے دیکھا کہ بادل آپ پر سایہ کناں ہے اور حلیمہ سعدیہ بھی یہی دیکھتی ہیں۔ باقی چھوڑ کر اپنے ہم مذہب راہب کی بات مان لیں۔

۴۔ نزول وحی کو صرع سے جوڑتے ہیں۔ جب آپ پر نزول وحی کے وقت حالت ہوتی تھی اور زبان مبارک سے جو جو الفاظ نکلتے تھے جن کے اثر سے یہود و نصاریٰ اپنے لوگوں کو بچانے کے لیے تاہنوز پریشان و سرگرداں تھے انہوں نے اس حالت کو مرگی کا دورہ کہا۔

۵۔ کفار مکہ نے آپ پر مجنون کا الزام دھرا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے رد فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے "اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ۔ (القلم ۲، پارہ ۲۹) ترجمہ "نہیں تو اپنے رب کے فضل سے دیوانہ" کفار نے ساحر، کاہن، سحر زدہ وغیرہ کے الزامات لگائے لیکن اکثریت نے کہا کہ ان میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی لیکن مستشرقین اس بات پر بضد ہیں لیکن عینی شاہدوں کے ہوتے ہوئے غیب کی شہادت قابل قبول نہیں ہوتی۔

اعتراض نمبر ۲۷

ولیم میور کہتا ہے "ان دوروں کو جن کو حلیمہؓ صرع کی قسم کے حملے سمجھ کر ڈر گئی تھی، محمد ﷺ کے

مزاج میں ان مضطر حالتوں اور بے ہوش کنندہ غشوں کے صریح آثار نمودار تھے جو نزول وحی کے ہوتے تھے اور شاید جن کے سبب ان کے دل میں نزول وحی کا پیار پیدا ہو گیا تھا اور ان کے متبعین نے ان اضطرابوں اور غشوں کو نزول وحی کا شاہد قرار دیا تھا''۔

جواب: مستشرق یہ کہنا چاہتا ہے کہ بچپن میں اس قسم کے دورے پڑتے تھے جس سے ان دونوں کی وجہ سے ان کے دل میں وحی کے نزول کا خیال پیدا ہوا اور ان کے پیروؤں نے اسے وحی قرار دیا۔ ولیم کے اعتراض سے چند امور سامنے آتے ہیں۔ (۱) مضطر حالت، غشی کا ہونا کے آثار موجود تھے جسے آپ ﷺ نزول وحی کی حالت قرار دیتے تھے (۲) حلیمہ سعدیہؓ صرع کی قسم کے حملے سمجھ کر ڈر گئی تھی۔ (۳) آپ کے متبعین ان اضطرابوں اور غشوں کو وحی کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کی آمد پر آپ یکسو ہو کر متوجہ ہو جاتے تھے جسے غشی اور مضطر حالت قرار دیا جاتا ہے۔ حلیمہؓ صرع کے حملے سے ڈر گئی تھی یہ بات بھی درست نہیں وہ اس لحاظ سے کہ صرع کے مریض کو جب دورہ پڑتا ہے تو کیا اسے افراد زمین پر لٹاتے ہیں اور پیٹ چاک کرتے ہیں۔ کہیں ایسے شخص مصروع کی موجودگی کی نشاندہی ہو سکتی ہے کہ آدمی آئیں، پیٹ چاک کریں اور پھر وہ شخص ہنستا مسکراتا کھڑا ہو۔ پھر ضعف و نقاہت کے آثار بھی نہ ہوں اور کسی قسم کا اضطراب اور بے چینی کا نشان تک نہ ہو۔ یہ وہ علامات ہیں جو مصروع میں مثلاً بے چینی، ضعف و نقاہت، زمین پر گر پڑنا پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک بھی آپ ﷺ میں پائی نہیں جاتی آپ کے متبعین مدت العمر اس بیماری سے کیونکر بے خبر رہے؟ اور انہوں نے آپ کی ہر بات پر عمل کیوں کیا؟ نیز انہیں بیماری کی علامات اور وحی کے آثار میں فرق بھی نظر نہیں آتا تھا۔ حالانکہ مصروع کا حافظہ جاتا رہتا ہے، دورے پڑنے اور بعد میں ہوش آنے پر اسے کچھ یاد نہیں رہتا جبکہ آپ وحی کی تعلیمات اپنے صحابہ کو پہنچا دیتے تھے اور وہ وحی سمجھ کر ازبر کر لیتے تھے یا ضبط تحریر میں لاتے۔ صحابہ آپ کی ہر بات کو دین سمجھتے اور اسے یاد رکھتے تھے تو ان مقدس ہستیوں کی شہادت کے ہونے سے طرفدار مستشرق کی بات قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے۔

ولیم میور یہ بھی لکھتا ہے ''کچھ مواقع ایسے آتے ہیں جب بے قراری، وجد یا کشف کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی تفصیلات سے بہت کم آگاہ ہیں۔ بعض عیسائی مصنفین نے ان کیفیات کو مرگی کے دورے قرار دیئے ہیں اور ان کا تعلق ان علامات سے جوڑا ہے جو آپ کے بچپن میں نظر آتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی زندگی کے آخری حصے میں بھی نزول وحی سے پہلے آپ پر اس قسم کی غشی اور بیداری کے سپنے کی کیفیت طاری ہوتی تھی''۔ ولیم میور مرگی کے دوروں کو دوسرے عیسائیوں کے نام منسوب کرتا ہے یعنی وہ اکیلا نہیں بلکہ اور لوگ بھی اس مرض کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ولیم میور ان سے دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آخری حصہ میں بھی وحی سے پہلے اس قسم کی غشی طاری رہتی تھی۔ قارئین کرام

آپ نے اندازہ لگایا کہ یہاں نزول وحی سے پہلے غشی طاری ہوتی ہے، کہا ہے۔ اگر وہ یہ نہ کہتا تو تسلیم کرنا پڑتا کہ وحی کے نزول کے وقت غشی ہونا وحی کے سبب تھا مگر وہ وحی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ولیم میور مزید کہتا ہے کہ نزول وحی کے وقت بے چینی پیغمبر کو گھیر لیتی ،آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو جاتے ، آپ کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے اور آپ اس طرح زمین پر گر پڑتے جس طرح انسان حالت وجد میں زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نزول وحی کے وقت پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوتے تھے لیکن آپ زمین پر نہیں گر پڑتے تھے۔ ولیم نے زمین پر گرنے کا اضافہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ بھی حدیث کا حصہ ہے، لیکن وحی کی تفصیلات میں یہ احادیث کا حصہ نہیں ہے۔ نزول وحی کا مشکل ترین طریق گھنٹی کی آواز کی طرح مسلسل آنے کا تھا لیکن اس طریق وحی میں بھی گر پڑنے کا ذکر نہیں۔ ولیم میور صرع کی الزام کو ثابت کرنے کے لیے زمین پر گرنے کا مفروضہ اور ڈھونگ رچاتا ہے کیونکہ مصروع حالت دورہ میں زمین پر گر جاتا ہے لیکن من گھڑت قصوں سے حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ حدیث کے ساتھ ایک جملے کا اضافہ کر کے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حدیث کا حصہ ہے۔ محدثین نے تو ایک زائد یا کم لفظ پر ایسی بحثیں کی ہیں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا ہے۔ ولیم میور جیسے طرفدار مستشرق کی چالاکی و ہوشیاری حدیث میں اضافہ کو دنیا کے علمائے حدیث کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتی۔ یہ اضافہ اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔

ضمناً اعتراض

مصری عالم کے حوالے سے محمد حسین ہیکل (حیات محمد۔ص ۳۶) لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جن باتوں کو وحی بتا کر اپنے مسلمان پیرووں کی ہدایت کرتے ، وہ ان کے مرض صرع کا کرشمہ تھا جس کے دورے سے وہ لرزنے لگتے اور منہ سے جھاگ اگلنا شروع کر دیتے لیکن ہوش میں آنے کے بعد وحی خداوندی کے نام سے کلام سنا کر فرماتے کہ اس بے ہوشی میں مجھ پر یہ کلام نازل ہوا ہے۔“

جواب: آنحضرت ﷺ کے تریسٹھ سال کی زندگی کے افکار، اعمال، عادات و خصائل اور کردار نے جو انقلاب برپا کیا اس کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہیں۔ نیز آپ ﷺ کی زبان مبارک سے جاری ہونے والی باتوں کا ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ یہ کارہائے نمایاں اور رشد و ہدایت کے چمکتے موتی کسی مصروع کے نہیں ہو سکتے۔ وہ تمام علامات جو مصروع میں پائی جاتی ہیں، آپ ان سے مبرا و منزا ہیں۔ مرگی کی علامات صاحب ضیاالنبی بحوالہ محمد فرید واجدی ص ۲۶۴ پر لکھتے ہیں۔ ”مرگی اعصابی بیماری ہے جو مریضوں کے حس اور شعور کو زائل کر دیتی ہے، انہیں زمین پر گرا دیتی ہے اور وہ بلا مقصد ادھر اُدھر پھرنے لگتے ہیں بیماری کے آغاز میں جسم اکڑ جاتا ہے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور پھر جسم شدت

سے کانپنے لگتا ہے۔ جبڑے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، منہ سے خون ملی جھاگ نکلنے لگتی ہے اور ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ چند منٹوں کے بعد مریض کی سابقہ حالت لوٹ آتی ہے، نیند محسوس کرتا ہے اور سو جاتا ہے پھر وہ جاگتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی عارضہ پیش نہیں آیا''۔ بحوالہ گرولیر انسائیکلوپیڈیا (Grolier Encyclopidia)، صاحب ضیاالنبی۔ ج۔ ۷۔ ص ۲۶۶۔ ۲۶۵ پر لکھتے ہیں ''گریڈمل (مرگی کی قسم) کی خصوصیت تشنج کے دورے ہیں۔ بعض حالات میں مریض کو پہلے سے احساس ہو جاتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے، اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً اعضاء یا چہرے پر گرمی یا سردی کا محسوس ہونا، آنکھوں کے سامنے روشنی کا چمکنا، کانوں میں آوازیں سنائی دینا یا پیٹ میں بے چینی محسوس کرنا، وقفہ کے بعد (جس کی مدت مختلف ہو سکتی ہے) مریض اچانک بے ہوش ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زمین پر گر پڑے لیکن وہ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا، بعض اوقات دورے سے پہلے مریض بلند آواز سے چیختا ہے۔ ابتداء میں پٹھے سخت ہو جاتے ہیں، جبڑے بھنچ جاتے ہیں، اعضاء پھیل جاتے ہیں اور نظام تنفس کے معطل ہونے سے چہرہ زرد ہو جاتا ہے، کچھ لمحے کے بعد تشنج کے شدید دورے پڑتے ہیں، اعضاء کو جھٹکے لگتے ہیں، چہرے کے پٹھوں میں اضطرا کی حرکت پیدا ہوتی ہے اور زبان کے شدید طور پر زخمی ہونے کا خطرہ ہوتا ہے ایک یا دو منٹ کے بعد مریض غنودگی کے عالم میں چلا جاتا ہے جس کے بعد وہ دیر تک سویا رہتا ہے۔ شدید بیماری کی شکل میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دورے دوبارہ پڑ سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وقفہ کے دوران بھی مریض کو ہوش نہ آئے۔ خفیہ مرگی اس بیماری کی ایک ایسی قسم ہے جس میں دورے کے بعد مریض ہذیان یا جنون آمیز غصہ کی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کے سبب تشدد آمیز جرائم کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ فنک اینڈ ویگنلز انسائیکلوپیڈیا (Funican and Wagnalls Encyclopedia) میں مرگی کی علامات یہ بتائی گئی ہیں۔ ''مرگی شدید ذہنی بیماری ہے جس کی خصوصیت بار بار پڑنے والے دورے ہیں۔ یہ دورے ذہنی خرابی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مریض کی حالت مختلف ہونے سے دوروں کی کیفیت بدلتی رہتی ہے اور یہ دورے بے ہوشی، جسم کے مختلف اعضاء کے جھٹکوں، جذباتی غل غپاڑے یا ذہنی خلل کے وقفوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں'' مذکورہ علامات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ مصروع نہیں تھے۔ آپ ﷺ کی زبان سے نکلا ہر لفظ محفوظ ہے، وہ حکمت سے بھرپور، سچائی میں گوندھا ہوا اور تضاد سے پاک ہے۔ بھلا کسی مصروع کی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ جس پر نازل ہونے والی کتاب الٰہی موجود ہے اور رہتی دنیا تک موجود رہے گی۔ کیا ایسی کتاب الٰہی کسی مصروع نے پیش کی ہے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے اور اس کی صحت کو جانچنے کے لیے جرمنی کی میونخ

یونیورسٹی نے دنیا بھر سے چالیس ہزار قرآن مجید اکھٹے کیے اور پچاس سال تک اس کی جانچ پڑتال کی آخر کار جرمنی کی اس یونیورسٹی نے یہ سرٹیفکیٹ دیا کہ اس کے متن میں کوئی اختلاف نہیں۔ جن مستشرقین نے قرآن پاک یا احادیث پر کام کیا ہے وہ ان شاہکار کو مصروع سے منسوب تو کرتے ہیں، چھوڑ کیوں نہیں دیتے کہ یہ مصروع کا کلام ہے اور اس میں افراط تفریط ہے بلکہ اس مصروع کے لائے ہوئے کلام پر کام کرتے کرتے اپنی زندگیاں بتا چکے ہیں۔ اگر کسی مصروع نے کوئی نیا دین یا کتاب پیش کی تو وہ تضاد سے خالی نہیں کیونکہ وہ ان کی ذہنی پیداوار ہے نہ کہ انعام الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ کسی بڑے سے بڑے عاقل اور دانشمند انسان نے ایسی تصنیف نہیں کی بلکہ کر بھی نہیں سکتے کیونکہ قرآن پاک کا چیلنج ہے کہ قرآن پاک جیسی ایک ہی آیت لا کر دکھائیں ۔ یہود و نصاریٰ کو علمی میدان میں لا جواب کیا۔ میدان جنگ میں دشمنوں کو شکست دی، معاشی، معاشرتی، سیاسی مذہبی زندگی کا نمونہ پیش کیا، امامت کے فرائض انجام دیئے، حج و عمرہ کی ادائیگی، تبلیغ کا کام کیا، معاہدات کیے، فتح مکہ کے دن تمام دشمنوں کو معاف فرمایا۔ سب کچھ غریبوں یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں میں بانٹ دیتے گھر پر کچھ نہ بچا رکھتے، علم و عمل میں پیش پیش تھے الغرض ساری زندگی نمونہ انسانیت ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنہ" انہیں مرگی زدہ کہنا محض عیسائیت کی مکروہ اور گھناؤنی چال ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ صاحب ضیا النبی (ضیا النبی ۔۷۔۲۸۶) لکھتے ہیں "حضور کو مرگی کا مریض قرار دینے میں خجالت محسوس نہیں کرتے۔ مستشرقین کے اس حیران کن رویہ کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آج کل عالم عیسائیت میں جو مذہب عیسائیت کے نام سے مروج ہے، اس کا بانی سینٹ پال مرگی کا مریض تھا، ممکن ہے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ سینٹ پال جیسا بڑا آدمی مریض ہوسکتا ہے تو پھر کوئی دوسرا عظیم انسان مرگی کا مریض کیوں نہیں ہوسکتا۔ یاد رہے کہ یہ الزام مرگی کا سینٹ پال پر ہم نہیں لگا رہے بلکہ ان کے سر پر یہ تاج ان کے اپنے پیروکاروں نے سجایا ہے۔ سینٹ پال نے جو مذہب ایجاد کیا تھا اس کی رو سے اس کے پیروکار علماء کو آگ میں جلانے کی سزائیں دیتے رہے اور روزانہ غسل کرنے والوں پر مخالفت دین کی فرد جرم عائد کرتے رہے۔ آج بھی اس دین کے پیروکار لاکھوں انسانوں کا خون بہا کر قہقہے لگاتے ہیں اور چند پرندوں کے مرنے پر آنسو بہاتے ہیں۔ جس شخص نے ایسا دین ایجاد کیا تھا وہ یقیناً مرگی کا مریض ہوگا اس نے ان تمام انجیلوں کو طاقت کے زور پر تلف کر دیا جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے برعکس ہیں اور ان کے بدلے میں ایسی خود ساختہ انجیلوں کو رواج دیا جن میں اس کے مرگی زدہ ذہن کے تخلیق کردہ عقائد اور خیالات تھے۔ حضرت مسیحؑ کا ایک حواری برنباس اپنی کتاب میں لکھتا ہے" ۔۔۔ پال بھی ان لوگوں میں سے ہے، جو شیطان کے دھوکے میں آگئے ہیں اور یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہہ رہا ہوں ان وجوہات کی بناء پر میں وہ حقائق قلم بند کر رہا ہوں جو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے دیکھے یا سنے ہیں تا کہ تم محفوظ رہو اور شیطان کے دھوکے میں آ کر اپنی آخرت تباہ نہ کر بیٹھو لہٰذا میری اس تحریر کے خلاف جو بھی تمہارے سامنے کسی دوسرے عقیدہ کا پرچار کرے اس سے ہوشیار رہو تا کہ تم ابدی

نجات پاؤ۔‘‘(ضیاء النبی۔۷۔۲۸۶)

صرع کے الزام میں مستشرقین کی تردید

’’واٹ‘‘(نزول وحی کے وقت) کبھی کبھی کچھ جسمانی عوارض پیش آتے تھے آپ کو شدید درد کا احساس ہوتا، کانوں میں گھنٹی کی گونج کی سی آواز سنائی دیتی جب وحی کا نزول ہوتا تو پاس کھڑے ہوئے لوگ شدید سردی کے عالم میں بھی آپ کے چہرے پر پسینے کے موتی دیکھتے، اس قسم کی چیزوں سے بعض مغربی نقادوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ مرگی کے مریض تھے لیکن اس خیال کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ مرگی انسان کو ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور کر دیتی ہے لیکن محمد ﷺ میں اس قسم کے کوئی آثار نظر نہیں آتے بلکہ اس کے برعکس آخر تک آپ کے تمام ذہنی اور جسمانی قویٰ واضح طور پر صحیح اور سلامت تھے۔‘‘

’’ولیم میور‘‘۔۔اگرچہ ولیم میور حضور ﷺ پر مرگی کا الزام لگانے میں پیش پیش ہے لیکن وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ آپ ساری زندگی صحت مند رہے وہ لکھتا ہے’’حلیمہ سعدیہؓ نے بچے کا دودھ چھڑایا اور اسے واپس آمنہؓ بی بی کے پاس لے گئی، بچے کو صحت مند دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور حلیمہ سعدیہؓ سے کہا: تم بچے کو واپس اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ مکہ کی غیر صحت بخش فضا میں بچے کی صحت پر اثر نہ پڑے۔ ولیم میور مذکور لکھتا ہے کہ’’حضرت محمد ﷺ سوائے ایک بار کے اپنی زندگی میں کبھی کسی سخت بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے‘‘اپنے الزامات کی خود ہی تردید کر کے دھجیاں اڑا دیں اور ولیم میور کی منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اسے حضور ﷺ میں بچپن ہی سے مرگی کے آثار نظر آتے ہیں اور تیئس سال کے عرصہ پر محیط نزول وحی کی کیفیات کو بھی مرگی کے دورے قرار دیتا ہے جبکہ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ آخر عمر تک صحت مند رہے سچ ہے کہ دروغ گورا حافظہ نباشد۔(جھوٹے کا حافظہ نہیں ہوتا)

گبن: تریسٹھ سال کی عمر تک محمد ﷺ کی قوت ان کے فریضہ حیات کی جسمانی اور روحانی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے قابل تھی۔ آپ کی مرگی کے دورے جو یونانیوں کی ایک غیر معقول تہمت ہے وہ ان کے لیے نفرت کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے ترحم کے جذبات پیدا کرے گی۔ گبن مزید لکھتا ہے کہ’’انتقال سے تین دن پہلے تک آپ باقاعدگی سے نمازوں کی امامت فرماتے رہے‘‘۔

حضور ﷺ پر لگائے گئے مرگی کے الزام کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے گبن مذکور لکھتا ہے ’’محمد ﷺ کی مرگی کا ذکر تھیوفینز Theophanes، زونارس Zonaras اور دوسرے یونانیوں نے کیا جیسے ہوٹنگر Hottinger پریڈو اور مراقی Maracci کے شدید تعصب نے انتہائی شوق سے نگل لیا۔ قرآن مجید کی دو سورتوں’’المزمل‘‘اور’’المدثر‘‘اس کے عنوانات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی تفسیر مرگی سے کی جا سکے۔ مسلمان مفسرین کی اس مسئلے سے ناواقفیت اور ان کی خاموشی اس الزام کے قطعی

انکار سے بھی زیادہ فیصلہ کن تردید ہے'' جان ڈیون پورٹ: یہ متواتر بیان کہ محمد ﷺ کو عارضہ صرع لاحق تھا، یونانیوں کی ایک دلیل اختراع ہے جنہوں نے اس عارضہ کے طوق کو ایک نئے مذہب کے بانی کی طرف اس غرض سے منسوب کیا ہوگا کہ ان کے اخلاقی چال چلن پر ایک دھبہ ہو جو عیسائیوں کی طعنہ زنی اور تنفر کا مستوجب ہو''۔

ر۔ف۔ بودلے: یہ اپنی کتاب حیات محمد میں لکھتا ہے، اطباء کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ مرگی کے مریض کا دورہ ختم ہو اور اس کی عقل روشن افکار سے چمک رہی ہو۔ طب یہ بھی کہتی ہے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے انتقال سے ایک ہفتہ قبل تک اپنی زندگی جس قابل رشک صحت مندی سے گزاری ایسی اچھی صحت والے آدمی پر مرگی کا حملہ نہیں ہوتا۔ یہ ناممکن ہے کہ مرگی کا مرض کسی شخص کو نبی یا واضع قانون دان بنا دے۔ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مرگی کا مریض کسی ایسے بلند مقام پر فائز ہوا ہو۔ پہلے زمانے میں مرگی زدہ شخص کو پاگل یا آسیب زدہ قرار دیا جاتا تھا اور دنیا میں اگر کسی شخص کو صحیح معنوں میں عقل سلیم کا مالک کہا جا سکتا ہے تو وہ محمد ﷺ ہیں۔ یہ حقیقت محمد ﷺ پر لگائے جانے والے اس الزام کی تردید کرتی ہے۔''

اے ڈرمنگھم: ۔۔۔ اس الزام کی یوں تردید کرتا ہے'' محمد (ﷺ) اس اعتبار سے دنیا کے واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں بلکہ منور اور روشن ہے۔ عقل سلیم سے عاری انسان ہی محمد ﷺ پر کسی بیماری کا الزام عائد کرسکتا ہے۔ یہاں موازنہ نہیں بلکہ واقعہ اور حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ عہد نامہ قدیم کے پیغمبر کتنے جلالی تھے اور مغلوب الغضب اور تو اور عہد جدید میں مسیحؑ جیسے حلیم اور نرم دل کو بھی ہم غصہ اور طیش سے مغلوب ہوتے دیکھتے ہیں اور ایسی زبان بھی بولتے ہیں جو شائستہ قرار نہیں دی جاسکتی، کیا محمد ﷺ کا بڑے سے بڑا معترض ایسا واقعہ بتا سکتا ہے جب آپ ﷺ نے اپنے غصے اور طیش کو غالب کرلیا ہو۔ بدوں حکمت کسی ایسے واقعہ کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جب آپ نے غیر شائستہ زبان استعمال کی ہو؟ کوئی معترض اور نقاد بھی محمد ﷺ کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ بیان نہیں کرسکتا کہ جب کسی مرض یا تکلیف کی وجہ سے آپ ﷺ کسی میدان جنگ یا زمانہ امن میں کسی بیماری کے دورے کے زیر اثر آئے ہوں، کوئی ایسا واقعہ ان کی زندگی میں نہیں آیا کہ بیماری کی وجہ سے بہک گئے ہوں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس دلنواز خطاب سے نوازا جاتا ہے''مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ (النجم ۲، پارہ ۲۷) ترجمہ'' تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا''۔ ان کی جسمانی اور ذہنی صحت قابل رشک تھی آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں چالیس فوجی مہمیں روانہ کیں جن میں ایک اندازے کے مطابق تیس جنگوں میں آپ نے خود حصہ لیا اور ہر جنگ میں جس فراست، شجاعت، جنگی حکمت عملی اور مہارت کا ثبوت آپ نے فراہم کیا، کیا وہ کسی ایسے شخص کے لیے ممکن ہوسکتا ہے جو کسی بھی نوع کی بیماری میں مبتلا ہو؟ محمد ﷺ کی صحت

منداور توانا شخصیت کو بیمار کہنے والے درحقیقت خود ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔ آنکھیں رکھنے والے ایسے لوگ ہیں جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے اور جان بوجھ کر اندھے بن جاتے ہیں۔" (ضیاالنبی۔ ۷۔ ۲۹۲)

اعتراض نمبر ۳۷

اگر آپ ﷺ فاضل شخص ہوتے تو نئے مذہب کی اشاعت نہ کر سکتے کیونکہ ان پڑھ ہی کچھ ان پڑھوں کی ضرورتوں کو زیادہ جانتا ہے اور انہیں راہ پر لا سکتا ہے۔ (۲) اگر آپ ﷺ عالم ہوتے تو شاید قرآن مجید میں مضامین کا سلسلہ کسی قدر بہتر ہوتا۔ (تمدن عرب۔ ۱۵۷)

جواب: ارشاد ربانی ہے عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔۔۔ تجھے علم سکھایا ان چیزوں کا جن کا تجھے علم نہ تھا۔

قرآن مجید کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اب "علمک" لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کو خود خدا پاک نے تعلیم دی تھی۔ دنیا میں شاگرد کو تعلیم حواس خمسہ سے دی جاتی ہے پھر ان حواس میں قائم ہو جاتی تو اس کا نام "تعلیم پانا" رکھا جاتا ہے۔ انبیاء کی تعلیم ان کے قلب سے شروع ہوتی ہے "نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ" اللہ کی تعلیم دینا اور بندہ کی تعلیم دینے میں بڑا نمایا فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى، ہم تجھے پڑھائیں گے اور تو نہ بھولے گا۔ قرآن کریم کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں احوال ماضیہ اور مستقبلہ اور عہد حال کے احکام بکثرت ہیں، تب یقین ہو جاتا ہے کہ نبی الامی کو ٹھیک اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی تھی۔ ارشاد ربانی ہے "وما کنت تتلوا من قبله ۔۔۔ الا رتاب المبطلون" ترجمہ "اے رسول قرآن سے پہلے تو تم نہ کسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے اور نہ تمہارے دست راست نے کبھی کوئی خط کھینچا تھا، تب تو یہ بطلان والے شک بھی کر سکتے تھے۔" آپ ﷺ کو اس لقب نبی الامی سے بلایا اور یاد کیا جاتا ہے آپ ﷺ اس طرز خطاب سے خوش ہوتے ہیں لیکن اب زمانہ حال میں بھاری بھر کم القابات سننا اور کہلوانا پسند کیے جاتے ہیں۔ امی لقب کے حضور میں ہزاروں علماء اور سینکڑوں دانش مند حاضر ہوتے ہیں، زانوے ادب تہہ کرتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا علم وفہم ان لوگوں کے علم وفہم کے مقابلہ میں قلزم وقطرہ کی مثال ہے۔ بھول اس سے ہوئی کہ آپ ﷺ بے پڑھے ہو کر محاسن اخلاق، محامد اعمال، تدبیر منزل، سیاست مدن، اقتصادیات، عمرانیات سیاسیات غرضیکہ ہر شعبہ زندگی کے علوم کا درس دیتے ہیں اور ان کے دل ودماغ کی آبیاری فرماتے ہیں نیز اس بارگاہ اقدس کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے، وہاں کوئی داخلہ فیس ہے نہ ماہانہ۔ وہاں سبھی امیر غریب، بدو اور شہری پہلو بہ پہلو تعلیم حاصل کرتے نظر آتے ہیں ۔۔۔ درحقیقت آپ ﷺ کی تعلیم کا منبع ومحور ذات کبریا ہے "تجھے علم سکھایا ان چیزوں کا جن کا تجھے علم نہ تھا" حالانکہ آپ ﷺ بارگاہ خداوندی سے تعلیم یافتہ تھے ارشاد ربانی ہے الرحمٰن علم القرآن" اس سے

اشارہ ملتا ہے کہ رحمٰن نے آپ ﷺ کو قرآن سکھایا نیز اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے اور سکھانے والی وہی ذات کبریا ہے جو سب کا خالق ہے اور آپ ﷺ تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے معلم انسانیت بنا کر بھیجا۔ آپ ﷺ سے بہتر قرآن کے مضامین اور رموز و حقائق کون جانتا ہے؟ مضامین میں ہمیشہ دو اعتبار ملحوظ ہوتے ہیں۔ اول وسعت، یہ وہ دعویٰ ہے جو خود قرآن نے کیا ہے "لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین"۔ اس دعویٰ پر کل دنیا کو مخاطب کر کے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی ایسا مسئلہ جس کا تعلق تہذیب نفس صفائی قلب اور حصول نجات سے ہو خواہ اس کی بنیا داعلیٰ فلسفہ پر ہو یا قدیم وجدید اکتشافات و تجربہ پر ہو خواہ وہ الشراقین الٰہیات سے لیا گیا ہو یا الٰہین کے شوارکات کوئی شخص ہمارے پیش کریں، ان شاء اللہ اس مسئلہ کو وضوح تمام اور صحت کاملہ کے ساتھ قرآن مجید میں بیان شدہ دکھلا دیا جائے "ولا یاتو بمثل الله جئناك بالحق واحسن تفسیرات (۲۵۔۳۵)۔ یاد رکھو کہ کوئی علمی صداقت قرآن مجید پر مبادرت نہیں کر سکتی۔ (۲) عمدگی دنیا میں ہستی باری تعالیٰ کا یقین رکھنے والی جس قدر اقوام ہیں وہ علمی طور پر مسئلہ توحید کی ضرور قائل ہے۔ ہاں قرآن مجید اپنے مضامین کے لحاظ سے علم ہے "انزلنہ بعلمہ" وہ شنوائی، بینائی اور دانش کے لیے گنجینہ خرد ہے اور قوائے مدرکہ اور حواس جارحہ کا راہبر ہے۔ پہلی وحی کا آغاز لفظ اقراء سے ہوتا ہے، اس سے اشراہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے پڑھایا ہے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلم اعظم ہیں تو پھر یہ نظریہ کہ ان پڑھوں کی ضروریات کو بے پڑھا ہی کچھ زیادہ جانتا ہے، غلط ٹھہرا کیونکہ آپ ﷺ تو بے پڑھے نہیں ہیں۔ اور دوسرا نظریہ بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ اگر آپ ﷺ عالم ہوتے تو شائد قرآن کے مضامین کا سلسلہ کسی قدر بہتر ہوتا۔ آپ ﷺ تو عالم ہیں لیکن قرآن کے مضامین کا سلسلہ اسی طرح ہے جیسا کہ تھا آپ ﷺ چونکہ معلم انسانیت ہیں اور آپ ﷺ کے عالم ہونے کے باوجود قرآن مجید کے مضامین کا سلسلہ بہتر نہیں ہوا، ہوتا کیسے؟ کیونکہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اس میں کسی دوسرے کو آمیزش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کر سکتے ہیں۔ پس ہر وہ مخالف یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ کسی نے آپ ﷺ کو بنا کر یہ کتاب دے دی۔ چونکہ آپ ﷺ بے پڑھے تھے اس لیے اس کے مضامین بہتر نہ ہوئے۔ ویعلمکم ما لم تکونوا تعلمون، نبی نے تم کو وہ کچھ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

آپ ﷺ امی ہوں یا غیر امی آپ ﷺ میں اعلیٰ درجے کی فہم و فراست تھی۔ آپ ﷺ ہر معاملے کی نزاکت کو سمجھنے اور حل کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ حجر اسود کو خانہ کعبہ کی دیوار میں نصب کرنے کے معاملہ پر تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا، ہر ایک کی خواہش تھی کہ یہ سعادت اسے نصیب ہو۔ تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے ایک ثالث مقرر کرنے پر رضا مندی ہوئی۔ بفضل تعالیٰ آپ ﷺ حکم ٹھہرے۔ آپ ﷺ نے اپنی ردائے مبارک زمین پر بچھا دی اور پتھر کو اپنے دست اقدس سے اٹھا کر چادر میں رکھ دیا پھر معزز قبائل کے سرداروں سے گویا ہوئے کہ

چادر کے کونوں کو پکڑ کر اٹھایئے اور حجر اسود کے نصب کرنے کے مقام پر لے جایئے۔ایسا ہی کیا گیا، جب اس مقام نصب پر پہنچے تو دوبارہ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔آپ ﷺ کی عمر اتنی زیادہ نہ تھی لیکن قریش کے سرداروں کی عمریں زیادہ تھیں۔وہ آپ ﷺ کی فہم وفراست پر سب مطمئن ہو گئے اور یہ فیصلہ قبول کیا۔عام حالات میں کسی بات پر لوگوں کو تلقین کرنا آسان ہوتا ہے نیز اسے قبول یا رد کرنے میں اتنی کوفت نہیں ہوتی ،جس قدر تمام افراد ماننے سے انکاری ہو جائیں مگر نزاع کی صورت میں تمام کو متفق اور راضی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔فریقین خواہ پڑھے ہوں یا ان پڑھ ان کو جادہ مستقیم پر گامزن کرنے کے لیے صحیح راہ دکھانا تاکہ لاینحل مسئلہ طے پا جائے، یہ ثالث کی اعلیٰ عقل مندی، صداقت وامانت اور عدل وانصاف کے اوصاف سے متصف ہونے کا مرہون منت ہیں اور وہ ایسا امی لقب نبی ﷺ ہے جس کے متعلمین میں ہر قسم کے کاملین نظر آتے ہیں جیسے ابو بکرؓ وعمرؓ ملک داری وجہاں بانی کی تعلیم، ابو عبیدہؓ وخالدؓ ہنگامہ آرائی وجہاں کشائی کی، معاذؓ وابو دردہؓ بیان اور دین ودانش کی، سلمانؓ وابو ذرؓ زہد وقناعت کی، علیؓ وعبداللہ بن مسعودؓ حقائق علمیہ کی، عثمانؓ وابن عوفؓ پرورش یتمیٰ واعانے کی، زید بن ثابتؓ وابی بن کعب انصاریؓ فرائض الٰہیہ کی تعلیم کل دنیا کو دے رہے ہیں۔یہ چند نام صرف مدعا کے واضح کرنے کے لیے درج کیے ہیں ورنہ اس بارگاہ اقدس کا وہ کونسا تلمیذ ہے جو کشت زار علوم کے لیے باران رحمت ثابت نہیں ہوا۔دوم: اگر فاضل شخص ہوتے تو نئے مذہب کی اشاعت نہ کر سکتے کیونکہ ان پڑھ ہی کچھ ان پڑھوں کی ضروریات زیادہ جانتے ہیں اور انہیں راہ پر لا سکتے ہیں۔یہ کلیہ اس کا گھڑا ہوا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے کیونکہ ان پڑھ تو آپ ﷺ کی تعلیم وہدایت سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں گے اور راہ راست پر آجائیں گے اور پڑھے لکھے بے فیض رہیں گے۔اس میں ایک اور غلطی یہ بھی ہے وہ یہ کہ ''کچھ'' کا لفظ محل نظر ہے۔ان پڑھ ہی کچھ ان پڑھوں کی ضرورتوں کو زیادہ جانتے ہیں، تمام ان پڑھوں کی ضرورتوں کو نہیں جانتے بلکہ کچھ ان پڑھوں کی ضرورتوں کو تو سارے ان پڑھ راہ راست پر نہیں آئیں گے۔لفظ کچھ سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ مان لیں کہ بے پڑھے ان پڑھوں کی ضرورتوں کو زیادہ جانتے ہیں تو دوسری طرف جو پڑھے ہوئے افراد ہیں، ان کی ضرورتوں سے یکسر بے خبر رہیں گے جس سے پڑھے افراد تعلیمات اسلام سے محروم رہ جائیں گے جبکہ ہمارا نبی ﷺ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے '' ویعلمھم الکتاب و الحکمہ '' سب لوگوں کو تعلیم دیتا ہے یہاں ان پڑھ اور پڑھے افراد کی قید نہیں ہے نیز قرآن مجید میں ہے ''وما ارسلنا ک الا کافتہ للناس (۳۴۔۹۸) ہم نے تجھے جملہ نوع انسانی کے لیے بھیجا ہے تو پھر ان پڑھے اور پڑھے کی شرط درست نہیں رہتی کیونکہ سب کو اللہ کا پیغام پہنچانا ہے ہر ایک کو دعوت توحید دینا ہے خواہ امی ہو یا غیر امی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اسلامی عقاید اور دیگر مذاہب

اعتراض نمبر ۴۷

ڈریپر صاحب (معرکہ علم و مذہب) میں لکھتے ہیں، بحیرہ راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد ﷺ کو نسطوری عقاید کی تعلیم دی۔ آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا۔ بعد میں آپ کے طرزِ عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقاید نے آپ پر کہاں تک قابو پا لیا تھا۔ (سیرت النبی۔ ج ا ص ۱۱۸)

جواب: بحیرہ راہب والی روایت پیچھے درج ہوئی ہے جس سے کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ آپؐ نے راہب سے تعلیم حاصل کی۔ حجر و شجر کا سجدہ کرنا، بادل کا سایہ کُناں ہونا، مہر نبوت کا ذکر کرنا اور بوسہ دینا، درخت کی شاخوں کا جھک کر آپ پر سایہ کرنا وغیرہ یہ وہ باتیں ہیں جو راہب نے کہیں اور سب سے بڑھ کر ببانگ دہل یہ کہا کہ ''تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کرے گا اور یہ تمام عالم کے سردار ہیں'' لیکن یہ نہیں کہتا کہ اس کی تعلیم کی ذمہ داری میری ہے۔ میں اسے تعلیم دوں گا، مجھے ان کی تعلیم کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ اس قسم کی کوئی بات راہب نہیں کہتا' مگر ادھر مستشرقین ہیں کہ ان کی جان پر بنی ہوئی ہے وہ یہی رٹ لگائے جاتے ہیں کہ اس راہب سے آپ ﷺ نے مذہب کے اسرار و رموز سیکھے۔ اسے کہتے ہیں مدعی سست گواہ چست۔

دوم: آپؐ کی اس وقت عمر مبارک قریباً ۱۲ سال تھی۔ اس عمر کے لڑکے کو راہب نے مذہب کے تمام حقائق اور اسرار و رموز اور احکام بتا دیئے جو نسطوری عقائد سے متعلق تھے۔ تمام عقائد کی تعلیم ایک ہی ملاقات میں اور مختصر وقت میں دے دی۔ آپؐ نے اپنے حافظہ میں سب کچھ سمیٹ لیا اور چالیس سال بعد اس کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس کی پیروی کرنے کی ترغیب و تلقین کی، یہ سب بعید از قیاس باتیں ہیں۔

سوم: آپ ﷺ کی کس کس راہب سے ملاقات ہوئی، اس نے انصاف یا ناانصافی کی راہ سے آپ کے متعلق کیا کہا کیونکہ توراۃ و انجیل ان پر نازل ہوئی تھیں، اگر وہ شہادت دیں تو ان کی شہادت بڑی مضبوط، معتبر اور مستند ہوگی۔ ان کے پاس آپ ﷺ کے خلاف شہادت موجود نہیں البتہ ان کی مقدس کتب میں آپ کے موافق ذکر موجود ہے اور ان کے علماء باخبر ہیں کہ آپؐ حضرت عیسیٰؑ کے بعد تشریف

لائیں گے۔ آپ ﷺ آخری نبی ہوں گے ان کی علامات وصفات یہ ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ ارشادِ خداوندی ہے ''اولم یکن لھم ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل (الشعراء)[ترجمہ] کیا ان کے لیے یہ بات نشانی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس کی خبر رکھتے ہیں۔

سورہ البقرہ میں ہے ''جن کو ہم نے کتاب دی وہ ان کو پہچانتے ہیں جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو''۔ توراۃ وانجیل اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اور قرآن کریم بھی۔ نجاشی نے جب سورہ مریم کی آیات حضرت جعفرؓ سے سنیں تو کہا کہ جو کلام موسیٰؑ پر اترا تھا اور یہ، ایک ہی سرچشمہ سے پھوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نجاشی، عیسائی تو کلام الٰہی اور صحیفہ آسمانی تسلیم کرے اور آج، کل اور پرسوں کے عیسائی منکر ہوئے جاتے ہیں۔ نہ اپنوں کی مانتے ہیں نہ دوسروں کی مانتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے عقیدہ کو تو مان لیتے۔ دوسری طرف ورقہ بن نوفل سے آپ ؐ کی ملاقات ہوئی ورقہ نے بھی کہا کہ یہ وہی ناموس اکبر ہے جو موسیٰ پر آیا کرتا تھا۔ وحی اور نبوت کے اقرار کا اظہار کر دیا مگر یہ منکر مستشرقین ہیں کہ اپنے بڑوں کی بات سے بھی متفق نہیں ہیں۔ ان کی سوچ کی پرواز کی انتہا بے تُکی، بے ڈھنگی اور بے بنیاد باتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ (محمد رسول اللہ۔ ۱۷) بتاتا ہے ''اس دعوت میں بحیرا نے شاید ٹوٹی پھوٹی عربی (زبان) میں جتنی وہ جانتا تھا اپنے مہمانوں سے خطاب کیا لیکن ایک فرانسیسی مورخ CARRADE VEAUX کی خیالی پرواز کس قدر حیران کن اور مضحکہ خیز ہے کہ اس نے ایک مکمل کتاب ON BAHIRA, THE AUTHOR OF QURAN کے نام سے تحریر کی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دس بارہ سال کی عمر کا بچہ محمد ﷺ قرآن کریم کی ۱۱۴ سورتوں کو مختصر وقت میں حفظ کر لے اور ایک نسل بعد لوگوں کو پیش کرے کہ یہ کلام الٰہی ہے، ایسا ممکن ہی نہیں۔ ہاں اگر کوئی اسے خرق عادت کہے تو پھر راہب کے تعلیم دینے کی کیا منطق؟

چہارم: یہودی سمجھتے تھے کہ ایک نبی عنقریب آنے والا ہے وہ بنی اسرائیل سے ہوگا۔ ان کی امیدیں بر نہ آئیں بلکہ خاک میں مل گئیں اور وہ آخر الزماں پیغمبر ﷺ بنی اسمٰعیلؑ کی نسل سے جلوہ افروز ہوئے، اس پر وہ بپھر گئے۔ آپ ؐ کے جانی دشمن بن گئے اور آپ ؐ کی نبوت و رسالت کا انکار کر بیٹھے۔ جب کہ آپ ؐ کی آمد سے قبل کافروں پر فتح پانے کے لیے آپ ؐ کے وسیلہ جلیلہ سے دعائیں طلب کرتے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ ''وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ''

''اور یہ لوگ (نبی) کے آنے سے پہلے کافروں پر فتح پانے کے لیے آرزو مند رہا کرتے تھے جب (نبی) ظاہر ہوا اور انھوں نے پہچان بھی لیا، تب اس کے منکر ہو بیٹھے''

اس آیت کریمہ سے بحیرا راہب کے قصہ کی نفی ہوتی ہے اور یہ قصہ سراسر غلط ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہودی آپ کو لڑکپن میں پہچان لیتے تو اپنے عقائد کی بنا پر حضورؐ کو اپنی فتح کا دیوتا سمجھ کر خدمت کرتے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہودی رسول موعود کے انتظار میں رہا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے آنے پر یہودیوں کو کافروں پر فتح و نصرت ہوگی۔ یہ اعتقاد اس وقت تک رہا جب تک حضورؐ کی بعثت نہ ہوئی، جب بعثت ہوئی تو منکر ہو گئے۔

پنجم: چالیس سال بعد جو تعلیم آپ ﷺ نے ظاہر فرمائی وہ اس راہب کی تعلیم تھی یا اس کا اثر تھا۔ اگر آنحضرت ﷺ نے تثلیث اور کفار کا رد مسیح کے صلیب پر جان دینے کا بطلان اس راہب کی تعلیم ہی سے کیا تھا تو اب عیسائی اپنے اس بزرگ کی تعلیم کو قبول کیوں نہیں کرتے اور مذکورہ باتوں سے اجتناب کیوں نہیں کرتے؟ آج کے مستشرقین آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کے منکر تو ہیں ہی مگر اپنے بزرگ بحیرا راہب کو بھی سچا نہیں مانتے کیوں کہ وہ نبوت کا اقرار کرتا ہے، مُہر کو بوسہ دیتا ہے۔ حجر و شجر کو سجدہ کرتے دیکھتا ہے اور پکار پکار کر برملا اعلان کرتا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ مگر مستشرقین کے پیٹ میں مروڑ اُٹھتے ہیں، نہ اپنوں کی مانتے ہیں نہ دوسروں کی، اسے کہتے ہیں نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

ششم: آنحضرت ﷺ کے شریک سفر حضرات سے ایسی کسی قسم کی گواہی یا شہادت نہیں ملتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ آپؐ نے راہب سے تعلیم حاصل کی اور نہ یہ ثبوت ملتا ہے کہ آپؐ نے راہب سے تنہا ملاقات کی ہو اور اس گوشہ تنہائی میں تعلیم بھی حاصل کی ہو۔ نیز آپ کے شریکِ سفر ساتھیوں نے کسی موقعہ پر یہ نہیں کہا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو راہب سے حاصل کی تھی اور جس کی پیروی کا ہمیں حکم دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ خاموش ہے جو بحیرا سے منسوب تعلیم کا رد ہے۔

ہفتم: آپؐ کے ساتھ اس سفر میں اور افراد بھی شریک تھے۔ راہب نے ان میں سے کسی اور کو نبی نہیں کہا؟ آپ ﷺ کو حجر و شجر نے سجدے کیے، بادل سایہ کُناں رہا اور آپؐ ہی کو کہا کہ آپ ﷺ اللہ کی طرف سے تمام عالم کے لیے رسول ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ان کی تعلیم میرے ذمہ ہے، میں انھیں تعلیم دوں گا۔ وہ اس اعزاز پر پھولے نہ سماتا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نبی مامور من اللہ ہوتا ہے اور اس کی تعلیم و تربیت بارگاہ ربِ العزت کی طرف سے بذریعہ وحی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے نبی کی تعلیم کے بارہ میں فرمایا۔ ''اَلرَّحۡمٰنُ ۔ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۔ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ'' ''رحمٰن نے اپنے حبیب کو قرآن سکھایا، پیدا فرمایا ہے، انسان (کامل) کو (نیز) قرآن کا بیان سکھایا۔ قابلِ غور بات ہے ''متعلم محمد بن عبداللہ روحی وقلبی فداہ ہے اور معلم خود خالق ارض و سماء ہے۔ متعلم مکہ کا باسی اور معلم لامکان اور علم الغیب والشہادۃ ہے۔ اور پڑھایا کیا جا رہا ہے ''قرآن مجید'' اور

قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ "لَا رَطبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِی کِتَابٍ مُّبِین" کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جس کا ذکر اس کتاب میں نہ ہو، اس تعلیم سے جو بحر بے پیدا کنار اور اس صدر منشرح میں موجزن ہو، اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ اور علمہ البیان سے مراد بیانِ حقیقت اور اظہار اسرا کی وہ بے پناہ صلاحیت جو شانِ نبوت کا خاصہ ہے تو شانِ رحمانیت کی ضیاباریوں کا عالم کیا ہوگا۔ (ضیاالقرآن ۵/۵۵)

ف: اول قرآن کلامِ الٰہی ہے وہ آپؐ یا کسی دوسرے کی تصنیف نہیں۔ وہ آپؐ پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ دوم: آپ ﷺ کی تعلیم کا منبع و مصدر وحیِ الٰہی ہے۔ "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" (النجم ۳،۴، پارہ ۲۷) آپ نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ سوم: یہود و نصاریٰ کے لیے چیلنج ہے کہ وہ بتائیں وہ کون سا علم تھا جو راہب سے سیکھا؟ وہ کون سے حقائق و رموز تھے جو اخذ کیے؟ کیا چالیس برس بعد جس علم کا اظہار کیا، یہود و نصاریٰ کے عقائد کے موافق تھا یا مخالف؟ اگر عقائد موافق تھے تو انھیں نبی کیوں نہ مانا؟ اگر مخالف تھے تو راہب سے کیا سیکھا؟ ان سوالات کا جواب کبھی بھی نہ دے پائیں گے۔ بلکہ مذکور آیت سے ان کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا اور بات نکھر کر سامنے آئی کہ قرآن کریم کلامِ الٰہی ہے اور آپؐ کی تعلیم بارگاہ رب العزت سے بذریعہ وحی ہوئی۔

ہشتم: قرآن کریم میں کفار کے طرح طرح کے اعتراضات کا ذکر ہے جن کا رد خالقِ حقیقی نے خود فرمایا مثلاً "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ" (الحجر ۶، پارہ ۱۴) "اے وہ شخص کہ اُتارا گیا اس پر قرآن تو البتہ دیوانہ ہے"۔ اللہ نے اس کا رد فرمایا "مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (القلم ۲، پارہ ۲۹)" "نہیں، تو اپنے رب کے فضل سے دیوانہ" ۲: اِنَّـنَا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (الصفات ۳۶، پارہ ۲۳) "کیا ہم چھوڑ دینے والے ہیں اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ کے واسطے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ" (الصفات ۳۷، پارہ ۲۳) "بلکہ وہ لایا حق اور سچا کیا پیغمبروں کو"

۳: اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (بنی اسرائیل ۴۷، پارہ ۱۵)۔ "نہیں پیروی کرتے تم مگر ایک مرد مسحور کی"

اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا" (بنی اسرائیل ۴۸، پارہ ۱۵)

ترجمہ: دیکھ کیونکر بیان کیں انھوں نے تیرے واسطے مثالیں پس وہ گمراہ ہو گئے، پس نہیں پا سکتے کوئی راہ (طعن) کی۔

۴: کیا اللہ نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ (بنی اسرائیل ۱۱۶) جواب: کہہ دے اگر زمین پر فرشتے چلا کرتے آرام سے تو البتہ ہم اتارتے ان پر آسمان سے فرشتے کو پیغمبر بنا کر۔ ارشاد خداوندی

ہے'' وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ '' ترجمہ)اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب مرد ہی تھے جنہیں ہم وحی کرتے)(یوسف ۱۰۹، پارہ ۱۳)

۵: آپ کو ابتر کہا تو قرآن نے فرمایا۔۔۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔

۶: هُوَ اُذُنٌ (توبہ ع ۸) قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ۔۔۔ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ '' کہہ دے وہ اچھا جاننے والا ہے تمھارے واسطے ایمان لاتا ہے۔ اللہ پر اور باور کرنے والا ہے مومنوں کی بات اور رحمت ہے واسطے ان (منافقوں) کے جنھوں نے اظہارِ ایمان کیا تم میں سے''

۷: کفار نے جبیر نامی عیسائی جو کہ کوہ صفا کے قریب رہتا تھا، کے بارے میں کہا کہ وہ آپ کو قرآن سکھا تا ہے۔ جبیر بنو الحضرمی کا غلام تھا۔ ان غلاموں میں بلعم لوہار، صفوان بن امیہ نطاس اور صہیب رومی بھی ہیں جنھیں آپ کا معلم قرار دیا۔ (نعوذ باللہ) بارگاہ رب العزت سے اس الزام کا رد آتا ہے۔

''لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ؕ (النحل ۱۰۳، پارہ ۱۴) ترجمہ: ''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ انھیں تو یہ (قرآن) ایک انسان سکھا تا ہے۔ حالانکہ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ قرآن کی نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور قرآن عربی زبان میں ہے''۔

ثابت ہُوا کہ آپؐ نے کسی آدمی سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر منکرین اس وقت کسی راہب کی تعلیم کا تذکرہ کرتے تو لازمی طور پر اس کا رد بھی قرآن کریم پیش کرتا گویا یہ الزام بعد کا گھڑا ہوا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ کسی سے سیکھ کر یہ مرتب کیا نہ از خود تصنیف کی اور نہ ہی یہود و نصاریٰ یا دیگر کسی مذہب سے اخذ شدہ ہے۔ اس قسم کے الزامات سے تمام مستشرقین کا رد ہوتا ہے جو قرآن کریم کو آپؐ کی تصنیف کہتے ہیں جیسے مائیکل ہارٹ (سو بڑے آدمی، ص ۲۹) میں لکھتا ہے کہ قرآن آپؐ کی تصنیف ہے۔ (نعوذ باللہ)

پروفیسر محمد اکرم طاہر (محمد رسول اللہ۔۴۰۱۔۔۴۰۰) لکھتے ہیں مستشرقین کی بے بنیاد باتیں سن کر گمان ہوتا ہے کہ ہمارا مخاطب افسانوی ادب سے متعلق غالباً مُلّا نصیر الدین جیسا کوئی مزاحیہ کردار ہے نہ کوئی فاضل محقق۔ مُلا نصیر کے پاس ایک آدمی آیا۔ کسی کی شکایت کی۔ مُلّا نے جھٹ سے کہا: تم درست کہتے ہو۔ اس کے بعد مخالف فریق آیا اور اس نے اپنا موقف پیش کیا۔ مُلّا نے اسے بھی کہا: تم درست کہتے ہو۔ مُلّا کی بیوی نے سٹپٹا کر کہا'' آخر یہ دونوں شخص بیک وقت کیسے برحق ہو سکتے ہیں؟ مُلّا نصیر الدین نے فوراً جواب دیا' بے شک تم بھی درست کہتی ہو۔ اب یہی بات علمی تحقیق کے نام پر ''فری لینڈ ایبٹ'' سے سنیے۔ ''بعض لوگ کہتے ہیں! محمد کا ایک یہودی اتالیق تھا جو کہ بات درست ہو سکتی ہے۔

۲: بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپؐ عیسائی راہبوں سے واقف بل کہ متاثر تھے۔ یہ خیال بھی درست ہوسکتا ہے۔۳: کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جس تجارتی معاشرے میں آپؐ رہتے تھے اس سے آپؐ نے مختلف مذاہب کا ایک متنوع تصور اخذ کیا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہوسکتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ آپؐ نے خود کسی طبع زاد بات کا دعویٰ نہیں کیا۔ ایبٹ نے اس بحث سے جو نتیجہ اخذ کیا اس سے قطع نظر، اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ تینوں باتیں بیک وقت کیسے صحیح ہیں تو جواب یہی ہونا چاہیئے'' ہاں یہ بھی درست ہے''۔

مولانا شبلی (سیرت النبی ج ا ص ۱۱۸) لکھتے ہیں کہ'' اگر شارح اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتا یا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید کا خالص ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہوسکتا جو قرآن کے ہر صفحہ سے نظر آتا ہے''۔

نہم: قرآن پاک کا نزول بعثت سے لے کر خطبہ حجتہ الوداع تک تقریباً ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوتا رہا۔ آخری آیت'' الیوم اکملت لکم۔۔۔۔عند اللہ الاسلام '' حجتہ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی اور قرآن کریم مکمل نازل ہوگیا۔ ادھر مستشرقین کہتے ہیں کہ راہب سے جو تعلیم حاصل کی آپؐ نے چالیس سال بعد ظاہر کیا' درست نہیں کیونکہ چالیس سال سے لے کر آپؐ کی حیات مبارک کے آخری ایام تک قرآن نازل ہوتا رہا، ایسا نہیں کہ یک بارگی بعثت کے بعد تمام قرآن کریم نازل ہوا اور راہب کی تمام کی تمام تعلیم کا اظہار کر دیا، وہ کون سی تعلیم تھی جو راہب سے لی اور اس کو چالیس سال بعد ظاہر کیا۔ جب کہ آپؐ پر قرآن بذریعہ وحی نازل ہوتا رہا اور اسی کی تعلیم اپنے پیروؤں کو دیتے رہے۔ مسلم شریف (ا۔۳۳۷) میں ہے'' حضرت عائشہؓ نے مجھے (مسروق) کو مخاطب کر کے فرمایا: اے ابو عائشہ (یہ مسروق کی کنیت ہے) تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان تینوں میں سے کسی کو بھی قبول کرے وہ اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھے گا۔۔۔(ان میں تیسری چیز کے بارے) ام المومنین نے فرمایا: جو شخص یہ کہتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن میں سے کچھ چھپالیا، اس نے بھی اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' یا ایھا الرسول ۔۔۔ فما بلغت رسالتہ (اے رسول جو کچھ قرآن میں آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے وہ امت تک پہنچا دیجئے، اگر آپ ﷺ نے بالفرض ایسا نہیں کیا تو (نعوذ باللہ) آپ ﷺ نے فریضہ رسالت کو ادا نہیں کیا''۔ حضرت عائشہؓ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے پورے کا پورا قرآن امت تک پہنچا دیا۔ اور قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی، اس سے ثابت ہوا کہ امت کے ہاتھوں جو قرآن مجید محفوظ ہے، یہ وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کی وساطت سے آپ ﷺ پر نازل فرمایا تھا۔ شیعہ حضرات کا یہ کہنا کہ موجودہ قرآن

اصل قرآن کا ایک تہائی ہے، باطل ہے۔ شیخ کلینی روایت کرتے ہیں ''حضرت ابو عبداللہ نے فرمایا جس قرآن کو حضرت جبرئیل حضرت سیدنا محمد ﷺ کے پاس لے کر آئے اس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور جو لوگ کہتے ہیں کہ اس میں اضافہ ہوا، ان کے لیے بھی اس آیت میں رد ہے۔ آپ ﷺ نے پورے کا پورا قرآن مجید امت تک پہنچا دیا یعنی جتنا تھا اتنا ہی امت کے ہاتھوں میں دے دیا نہ کم نہ زیادہ۔

دہم: اس وقت کے مذاہب عالم کی تعلیمات کا مختصر ذکر کرتے ہیں تا کہ اسلام اور مذاہب عالم کا فرق واضح ہو جس سے ثابت ہو سکے گا کہ دین اسلام عالمی مذاہب کا چربہ یا ان سے اخذ شدہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی پادری یا کسی اور شخص سے سیکھا ہوا ہے۔

زرتشت: زرتشتی مذہب میں دو خداؤں' یزداں اور اہرمن جانے جاتے ہیں۔ خوید وگداس یعنی تزویج محرمات (اس عقیدہ کی رو سے حقیقی ماں، بہن، بیٹی سے شادی زیادہ متبرک اور بہتر خیال کی جاتی تھی (محمد رسول اللہ ۴۲)۔ اسلام ماں کے قدموں تلے جنت کی تعلیم دیتا ہے، بیٹی کو رحمت اور بہن کو نعمت کہتا ہے۔ بہن' بیٹی سے شادی کو اسلام حرام بتاتا ہے اور رشتے کی دو بہنوں کو اکٹھا حرم میں داخلہ کی ممانعت کرتا ہے۔

برہمنیت یا ہندومت: اگرچہ برہمنیت یعنی ہندومت کے پیروکار ایک خدا پر یقین رکھتے تھے، تاہم وہ خدا کے مظاہر کی بھی پرستش کرتے ہیں چاہے وہ خدا کی تخلیق ہو یا خدا کی کسی خاصیت کی نمائندگی کا اظہار ہو' یوں برہمنوں کے مطابق ان کے دیوتا کی تعداد ۴۰ کروڑ ہے گویا دیوتاؤں کی تعداد پجاریوں سے زیادہ ہے اور گائے دیوتاؤں کے اس کثیر اجتماع کی صدر (سردار) ہے۔ ہندومت کے پیروکار اگر جانوروں مثلاً ناگ اور ہنومان (بندر) کی پرستش کرتے ہیں تو وہ درختوں، پتھروں، دریاؤں کے سنگم اور منبع، سورج، چاند اور ان گنت دوسری چیزوں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ مزید کہ وہ علم موت اور دولت وغیرہ کو بتوں کی شکل دیتے اور انھیں دیوتا مان کر پوجا کرتے تھے۔ برہمنیت ایک خاندان تک محدود تھی یعنی برہمن کے علاوہ کوئی ہندو دوسرا شخص برہمن نہیں بن سکتا۔ اس مذہب کا عقیدہ تناسخ بھی ہے (ایک روح مختلف اجسام میں کئی جنم لیتی ہے)۔ ایسا شخص جو عالمگیر مذہب کا متلاشی ہو اور پوری انسانیت کو اپنی برکتوں کی آغوش میں لے لے۔ ایسے مذہب کی طرف کیونکر رجوع کر سکتا ہے۔ نیز وہ تو سوائے خدائے واحد کے کسی کی پرستش کی اجازت نہیں دیتا۔ (قل هو الله احد الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا احد) (اخلاص، پارہ ۳۰)

بدھ مت: ریاست کپل وستو کے بادشاہ سُدودھن کا بیٹا بدھ شکی مُنی ہی اس مذہب کا بانی تھا۔ وہ خدا کے بارے خاموش ہے جب کہ ترکِ دنیا اور نفس کشی پر اصرار کرتا ہے۔ ایک دن اس نے جنازہ

دیکھا تو اس سے متاثر ہو کر، گھر بار چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور رہبانیت اختیار کر لی ۔ جب کہ اسلام لا رہبانیت فی الاسلام بتاتا ہے۔ نیز اپنے اہل وعیال سے اچھے برتاؤ کی تلقین کرتا ہے اور اس کے خلاف ہے کہ بیوی بچوں کو بے سہارا چھوڑ کر جنگل میں ٹھکانہ بنا لیا جائے ۔اسلام میں بیوی، بیٹا اور بیٹی کے حقوق موجود ہیں ان سب کے حقوق کی پاس داری کرنا لازمی ہے۔ بدھ کے پیرو کار اس کے مجسموں کی پرستش کرنے لگے، ایسا مذہب جو شخصیت پرستی اور ترک دنیا کو مذہب کا لازمی جز سمجھتا ہو عوام الناس کے لیے باعث کشش نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ ترکِ دنیا تو چند اشخاص کے لیے مرغوب اور مخصوص ہو سکتی ہے سب کے لیے نہیں حالانکہ انسان پر کئی فرائض عائد ہوتے ہیں جنھیں پورا کرنا اس کی اولین ذمہ داری ہے۔انسان اللہ کی عبادت کے ساتھ عائد فرائض انسانیت کو بھی پورا کرتا ہے۔ باقی مخلوقات سے اشرف ہونے کے سبب اسے دین و دنیا کے علایق سے بھی نمٹنا ہے۔ بدیں سبب کسی نے خوب کہا ہے۔

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اکثر مذاہب میں دین سے محبت اور خدا کی پرستش کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان معاشرہ سے الگ تھلگ حتی کہ اپنے بیوی بچوں اور مال ومتاع کو چھوڑ کر جنگل میں یا پہاڑ کی کسی غار میں بیٹھ رہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی اسے عبادت صحیح قرار دیتا ہے۔ عبادت تو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی حقوق کو پورا کرنے کا نام ہے۔ فرد تنہائی اور گوشہ نشینی کر لے تو وہ اپنے بھائی ماں باپ اور رشتہ دار و دوست احباب کے حقوق کی ادائیگی سے قاصر ہوتا ہے لیکن اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان بے شمار علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر تمام تعلقات اور علائق اور حقوق وفرائض سے کنارہ کشی اختیار نہ کرے بلکہ اپنے حقوق و فرائض کو بخوبی سرانجام دے۔ دنیا کے سب جھمیلوں اور بکھیڑوں کو راہ سے ہٹاتے ہوئے خدا کی عبادت اور نوع انسانی کے حقوق وفرائض کو پورا کرے۔ عبادت ترک فرض نہیں بلکہ ادائے فرض ہے، ترک عمل نہیں بلکہ ادائے عمل ہے، کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے فلاں! تم ایسا نہ کرو تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے۔ اس فرمان نبوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں ان حقوق کو بجالانا عبادت ہے ان کا ترک کرنا جائز نہیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی کو گوشہ نشینی کے لیے ایک مقام پسند آیا جہاں چشمہ تھا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ جنگلی بوٹیاں بھی تھیں ۔ آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ایک غار ہاتھ آ گیا ہے جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں ۔ جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر لوں۔ آپ نے فرمایا: ”میں یہودیت اور نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن دین ابراہیمی لے کر آیا ہوں“۔

قابل غور: اسلام میں گوشہ نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے ایک اس شخص کے لیے جس میں فطرتاً بدی ہے جس کی گھٹی میں دوسروں کو نفع پہنچانا پایا ہی نہیں جاتا بلکہ تکلیف دینا ہے۔آپ نے اس کو برائی سے بچنے کے لیے یہ تدبیر بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلقی اختیار کرے صحیح بخاری کتاب الرقاقت کی شرح تفہیم البخاری ج ۹۔ ۷۸۶ میں ہے کہ ایک بدو نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ! سب سے بہتر شخص کون ہے فرمایا: ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے دوسرا وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے۔اس تعلیم نبوی نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی تو ان پر فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض ادا کریں حتیٰ کہ ان کے لیے اپنی گرہ سے دولت بھی خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے اور ان کی جان بھی کام آ جائے تو غم نہ کرے۔دوسرے وہ لوگ جن کی فطرت انسانوں کو دکھ و تکلیف میں مبتلا کرنا ہے بلکہ دکھوں میں ڈال کر خوشی محسوس کرتے ہیں ان کی اخلاقی قدر اور روحانی اصلاح کے لیے معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر عبادت میں مشغول ہونا فائدہ مند ہے۔

دوسرا موقع جس میں آپ نے گوش نشینی کی اجازت فرمائی ہے وہ ہے جب مجمع و آبادی یا ملک و قوم میں فتنہ فساد کا بازار گرم ہو، فساد کا سیل رواں رکنے کا نام نہ لیتا ہو اور وہ انسان کے بس میں نہ ہو کہ اسے روک سکے تو ایسے حالات میں اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ جماعت سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرے۔ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا" ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا تا کہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنوں سے بچا سکے۔تفہیم البخاری شرح بخاری کتاب الرقائق باب العزلتہ راحتہ من خلاط السوء) میں مذکور دو مواقع بھی درحقیقت نہایت احسن اصول پر مبنی ہیں پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس کا جماعت اور لوگوں کو نفع و بھلائی کی بجائے نقصان پہچانے کا خدشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لیے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع میں جب کہ جماعت کا انتظام ابتر ہو جاتا ہے اور کوئی فرد جو خود تو نیکوکار ہے اور پرہیزگار ہے لیکن اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ اس جماعت کے ساتھ بھلائی یا اس کی اصلاح نہیں کر سکتا تو اس کے لیے عزلت نشینی اختیار کرنا فائدہ مند ہے اور اپنے آپ کو الگ رکھ کر عبادت میں مشغول رہے اور ثواب دارین حاصل کرنے کا خواہاں رہے۔(سیرت النبی۔۵۔۴۳۔۴۴) گوشہ نشینی کے بہت فائدے ہیں مثلاً انسان دوسروں کے شر سے دور رہتا ہے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا: اپنی زندگی میں کچھ وقت گوشہ نشینی اختیار کرو اور فرمایا گوشہ نشینی برے ساتھیوں کی صحبت سے بچاتی ہے، اس میں راحت ہے۔

سوال: اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو مسلمان لوگوں سے میل جول کرتا ہے

اوران کی اذیت برداشت کرتا ہے وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جولوگوں کی اذیت پر صبر نہیں کرتا اس کا جواب یہ ہے کہ ان حدیثوں میں ایک تو تضاد نہیں ہے کیونکہ دونوں حدیثوں کے محمل جدا جدا ہیں کہ بعض اوقات تنہائی بہتر ہوتی ہے اور بعض اوقات لوگوں سے اختلاط بہتر ہوتا ہے۔

سوال: اگر یہ سوال کیا جائے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف اوقات، لوگوں اور ان کے احوال کے اعتبار سے ہے لہٰذا حدیثوں میں تضاد نہیں ہے۔

یہودیت: یہودی خود کو تمام اقوامِ عالم سے بہتر و برتر سمجھتے ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ ؑ کے لائے ہوئے دین کی مکمل پیروی کرتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کے دور میں تمام دنیا کے یہودی ذلت کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے، کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے قوانین کی مسلسل خلاف ورزی کی تھی۔ تورات محفوظ نہ رہی۔ پہلے بخت نصر نے پھر انطوشس، طیطوس اور دوسروں نے تباہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تورات کا آخری نسخہ بھی ناپید ہو گیا اور صرف یادداشت کے سہارے تورات کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔ موجودہ تورات میں ابہام اور آمیزش کے ساتھ مطابقت رکھنے والی بے جوڑ باتیں شامل کی گئیں جس سے اس کی تعلیمات بھی قابلِ تقلید نہ رہیں۔

عیسائیت: حضرت عیسیٰ ؑ پر انجیل نازل ہوئی اس میں تحریف ہوئی۔ خرافات در آئیں۔ عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث یعنی باپ (اللہ۔ نعوذ باللہ) بیٹا (عیسیٰؑ۔ نعوذ باللہ) اور روح القدس (جبرائیل) اور مریم پوجا یعنی عیسائی مریم کے بت کی پوجا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کو اس مذہب میں بت پرستی نظر آتی ہے۔ قرآن کریم اس بات پر سخت تنقید کرتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنے پادریوں کو (خداوند (ارباب) قرار دے دیا' ارشاد ربانی ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبہ ۳۱، پارہ ۱۰) (ترجمہ) انھوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو اور انہیں حکم نہ تھا مگر یہ کہ ایک اللہ کو پوجیں، اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں وہ پاک ہے ان کے شرک سے''۔

سینٹ پال نے کہا کہ عیسیٰؑ کی آمد تورات کی منسوخی ہے (جب کہ عیسیٰؑ نے واضح کیا تھا کہ آپ توراۃ اور دوسرے انبیاء کی کتابوں کی منسوخی کے لیے نہیں آئے)۔ رومیوں کے نام ایک خط میں کہا روح القدس (جبرائیلؑ) اور ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ ان ضروری باتوں کے علاوہ تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں وہ یہ کہ تم بتوں کو پیش کی جانے والی قربانیوں سے اور لہو سے اور گلا گھوٹے ہوئے جانوروں سے اور حرام

کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو گے تو تم یقیناً بہتر کرو گے۔ اس طرح خنزیر کے گوشت اور شراب کو حلال قرار دیا جب کہ سبت (ہفتہ یہودیوں کا متبرک دن) اور ختنہ کی رسم منسوخ کر دی گئی۔۔ رب تعالیٰ اور حضرت عیسیٰؑ کو باپ بیٹا اور ایک ہی مادہ سے تخلیق قرار دیا۔ صلیب کو مذہب کا حصہ بنا دیا گیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ و حضرت مریمؑ کی مورتیاں اور تصاویر تمام مذہبی جوش و خروش کے ساتھ متعارف کرائی گئیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے باطل مذہب کی تعلیمات کے لیے اسلام کے ہاں کوئی گنجائش اور وقعت نہیں۔ اسلام ایک خدا کی عبادت کا کہتا ہے۔ بتوں کی ممانعت کرتا ہے۔ تمام انسانی حقوق کی ادائیگی کی تلقین کرتا ہے۔ دو خداؤں کو ماننا، حقیقی ماں، بہن، بیٹی سے شادی کرنا، کہیں حجر و شجر کی پرستش، کہیں گائے کی پوجا، مظاہر قدرت کی پوجا، دیوتاؤں کی تعداد پجاریوں سے زیادہ، ناگ اور بندر کی پوجا، کہیں دنیا کو جنجال پورہ سمجھ کر جنگلوں کی راہ لے کر رہبانیت اختیار کرنا، کہیں عیسائیت تین خداؤں کو قائل ہے، کہیں خنزیر، شراب حلال، ختنہ کی رسم منسوخ اور صلیب کو مذہب کا جز و بنانا وغیرہ وغیرہ۔ ایسی چیزیں ہیں جن کا اسلام سختی سے قلع قمع کرتا ہے۔ مذاہبِ عالم کی اس قسم کی تمام مکروہات اور بدترین عقیدہ کی مخالفت کرتا ہے یعنی اسلام ہر مذہب کی تعلیمات کے خلاف ہے جو ان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں فقط اسلام ہی سچا دین ہے۔ نیز کوئی مذہب بھی اپنی اصلی حالت میں سوائے اسلام کے موجود نہیں۔ تو کیسے کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلام، زرتشی، صابی، بدھ مت، ہندومت، برہمنیت، یہودیت اور عیسائیت، مذاہب سے اخذ شدہ ہے۔ یہ عالمی مذاہب دین اسلام کے سامنے اپنے باطل عقائد کے ساتھ مخالف کھڑے نظر آتے ہیں۔ تو کس منہ سے مستشرقین یہ رٹ لگائے رہتے ہیں کہ اسلام عیسائیت، یہودیت یا فلاں فلاں مذہب کی پیداوار ہے۔ یہ محض باطل ہے اور مذکور مختلف مذاہب اور دین اسلام کی تعلیمات سے ظاہر ہے۔

اعتراض نمبر ۷۵

اسلام سے پہلے عربوں میں یہودیت و عیسائیت، توحیدی بیج بو چکی تھی۔

جواب: اسلام نے خالص توحید کا پیغام انسانیت تک پہنچایا اگرچہ مستشرقین پیغام توحید پھیلانے میں اسلام کے سر سہرا نہیں باندھتے بل کہ کہتے ہیں کہ اسلام سے قبل عربوں میں توحیدی بیج بویا جا چکا تھا۔ یہ اعزاز یہودیت و عیسائیت کے سر منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اسلام سے قبل یہودیت و عیسائیت توحید کے پھیلانے میں بری طرح ناکام و نامراد ہو چکی تھیں۔ اسلام سے پہلے خانہ کعبہ بتوں کا گھر بنا ہُوا تھا۔ اس میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ شاید یہ تعداد سال کے دنوں کے برابر رکھی گئی ہو اور ہر دن ایک نئے بت کی پوجا اور پرستش کی جاتی ہو گی۔ ورنہ اس تعداد یعنی تین سو ساٹھ سے کم اور زیادہ بھی

بت ہو سکتے تھے۔اس کے علاوہ قبائل کے بت الگ الگ مقامات پر نصب تھے۔خانہ کعبہ کا طواف، مرد و زن ننگا دھڑ نگا ہو کر کرتے تھے۔لڑکیاں زندہ درگور کرتے تھے، شراب سرِ عام اور کھلے بندوں پیتے تھے۔جُوا، لوٹ کھسوٹ، چوری چکاری، بات بات پر جھگڑا، زنا کاری وغیرہ، الغرض ایسی کوئی برائی نہ تھی جو اس عرب معاشرہ میں موجود نہ تھی۔ پوجا پاٹ کے لیے شجر و حجر، جانور، اجرامِ فلکی اور اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بت تھے۔اسلام کی کوششیں رنگ لائیں جو یہود و نصاریٰ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔اس سے اسلامی رنگ چڑھا۔توحید کا پیغام کُو بہ کُو پہنچا۔مگر یہودیت و عیسائیت پھر بھی اپنے آپ کو توحید پھیلانے کا علم بردار گردانتی ہیں۔''واٹ'' کہتا ہے''دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مکہ والے یہودیت و عیسائیت کے زیرِ اثر توحید کی طرف گامزن تھے۔جواباً عرض ہے کہ اگر عرب توحید کی طرف گامزن تھے تو نبی ﷺ نے توحید کا پیغام عربوں کو پہنچایا تو عرب آپ کی جان کے دشمن کیوں بن گئے؟ یہود و نصاریٰ بھی توحید کے پھیلانے والے اور مذہب اسلام کا شارح بھی توحید کا پیغام پہنچانے والا' تو یہود و نصاریٰ کس بنا پر آپ کے مخالف ہو گئے؟ ثابت ہوا کہ اہلِ مکہ تو بتوں کے پجاری تھے آپ ﷺ نے انھیں کہا کہ یہ مٹی اور پتھر کے بت یا مظاہرِ قدرت یعنی حجر و شجر، چاند سورج وغیرہ اِلٰہ نہیں ہیں۔صرف وہ واحد ذات''اللہ'' ہے جو عبادت کے لائق ہے۔اسلام نے بتوں پر کاری ضرب لگائی۔آخر بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا۔جب کہ اسلام سے قبل تو صرف خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک نہ کر سکے جو خانہ خدا ہو کر بتوں کا گھر بنا ہُوا تھا۔واقعی:

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا

مستشرق کا اسی سفر سے اشارہ بحیرا راہب سے ملاقات والا سفر ہے اور آپ ﷺ نے راہب سے تمام رموز و معارف و معلومات مذہب کی تعلیم حاصل کر کے چالیس سال بعد اس کا اظہار کیا۔اس سے ثابت کرنا یہ چاہتا ہے کہ دین اسلام عیسائیت سے اخذ شدہ ہے۔۲۔آپ ﷺ مامور من اللہ نبی نہیں تھے اور قرآن کریم الہامی کتاب نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ان تمام اعتراضات کا جواب پچھلے صفحات پر بتفصیل بیان کر دیا گیا ہے۔دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اعتراض نمبر ۶۷

آنحضرت ﷺ کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک جدید مذہب کا خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر(سفر شام اور بحیریٰ اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے'' (ولیم

میور۔سیرت النبی شبلی ۔ا۔۱۱۸)

جواب: دین اسلام کوئی جدید اور نیا دین نہیں ہے حضرت آدمؑ سے لے کر آپ ﷺ تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدمؑ سے محمد ﷺ تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا رہا۔ وحدت دین کے بارے قرآن کریم شہادت دیتا ہے (ترجمہ) اس نے دین میں تمہارے لیے وہی رہ مقرر کی جو نوحؑ سے کہی تھی اور ہم نے تیرے پاس جو حکم بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیمؑ سے اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ سے یہ کہ دین کو قائم کرو اور اس کی طرف رجوع اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بار وقت مقرر تک کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے اختلاف کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امر حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا' ہو تو سب کو اس حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ بازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں' ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ہے ایک اللہ' ہم کو ہمارے کوموں کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کاموں کا' ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔ الشوریٰ ۱۵، پارہ ۱۵)

مذکورہ آیات میں واضح کر دیا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوحؑ کو' ابراہیمؑ کو اور تم کو اے محمد ﷺ عطا کیا گیا ہے۔ اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنی ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں فرقے پیدا کیے اور تعصّبات سے فرقہ واری کی راہیں نکالیں۔ پھر یہ بھی بتا دیا کہ اہل کتاب کو وحدت دین کی حقیقت سے بے خبری ہے وہ شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تاریکی کے قعر مذلت میں گھرے ہوئے ہیں لہذا ان کو اس حقیقت کی طرف بلا کر اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور اپنے طریقے سے آگاہ کر دیجئے کہ میرا مذہب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے' میں اس کی صداقت کو مانتا ہوں اور اے اہل کتاب تمہارے ساتھ انصاف کروں پھر یہ بھی صراحت کر دی کہ تمہارا اور ہمارا خدا ایک ہی ہے دو نہیں اس پر تمہارے اور درمیان اتحاد ہو سکتا ہے۔ یہ بنیادی نقطہ اتصال ہے البتہ جو اختلاف ماو شما کے مابین ہے اس کے ذمہ دار ہم اور تم ہیں ہر ایک اپنے کیے کا جواب دہ ہے اب ہمارے تمہارے درمیان جھگڑا نہیں ہے اسی دین کی وحدت کی حقیقت کو ''سورہ

الانعام ۔۱۶۱'' میں بیان کیا گیا ہے (ترجمہ) ''کہہ دے کہ تیرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف میری راہنمائی کی جو دین مستقیم ہے' ابراہیمؑ حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیمؑ) مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

سورہ حم السجدہ ۔۴۳'' میں ہے') اے محمد ﷺ) تجھ سے اس کتاب میں وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا ہے''۔اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ محمد ﷺ سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا۔۔ان معنوں میں قرآن مجید کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا بلکہ یہ دعوت پہلی دعوت کی تائید مزید ہے۔اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا' ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا' ایک ہی حقیقت کی دعوت دی جاتی رہی البتہ انسانوں کی غفلت کیشی' تصرف اور اپنے خیالات کی سچائی کی بدولت تحریفات ہوتی رہیں مگر آخری بار پوری حفاظت کے وعدے کے ساتھ آپ ﷺ کے ذریعہ سے کامل و اکمل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔'' ان نحن نزلنا الذکر و ان له لحافظون ''لہذا میور کا اعتراض باطل ہے جو کہتا ہے کہ جدید مذہب کا خاکہ قائم کیا کیونکہ یہ وہ مذہب ہے جو تمام پیغمبروں پر نازل ہوتا رہا اور وہ لے کر آتے رہے اور نوح انسانی کو اس کی تعلیمات سے ہدایت کا راستہ دکھاتے رہے۔

اس قسم کے تجارتی سفر تو بت پرستوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں نے بھی کیے ہوں گے۔کفارِ مکہ گرمیوں،سردیوں میں تجارت کی غرض سے مختلف جگہوں کا سفر کرتے تھے۔عرب تاجر قبل از اسلام سندھ اور مالابار کی بندرگاہوں پر بکثرت آتے جاتے تھے۔ ہندوستانی تاجر بھی جنوب مشرقی عرب کی بین الاقوامی بندرگاہ ''دبا'' کے سالانہ تجارتی میلے میں شرکت کرتے تھے۔ ہندوستانی تاجر یمن بھی جاتے تھے۔ڈاکٹر حمید اللہ (محمد رسول اللہ۔۱۹۷) بتاتا ہے جہاں تک ''دبا'' کا تعلق ہے آنحضرت ﷺ خود بھی وہاں تشریف لے جا چکے تھے۔عبدالقیس کے قبیلے کا وفد آیا۔آپ سے ملاقات ہوئی تو وہ حیران ہوئے۔ جب انھیں علم ہوا کہ آپ عمان کا طویل اور وسیع دورہ کر چکے ہیں۔(حوالہ بالا۔۱۹۵) آپ مشقر اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی جا چکے تھے۔جب یمن کے قبیلہ بل حارث کا وفد مدینہ پہنچا تو سرکارِ دو عالم نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستانی دکھائی دیتے ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔ان تاجروں کو ان سفروں کے دوران تجربات و مشاہدات بھی ہاتھ لگے ہوں گے۔ان سفر نوردوں کے متعلق تاریخ کیا یہ گواہی دیتی ہے کہ محض سفر کے تجربوں اور مشاہدوں کی بنیاد پر وہ بت پرستی سے متنفر اور بے زار ہو گئے اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو خیر باد کہا۔کسی عالم کے واعظ و نصیحت سے متاثر ہو کر بتوں سے کنارہ کش ہوئے ہوں

اور ایک نئے اور جدید مذہب کا تانا بانا بُنا ہو؟ ایسا ہرگز نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سب مفروضے کیوں تراشے جا رہے ہیں؟ بے بنیاد اور من گھڑت الزامات کیوں لگائے جا رہے ہیں؟ یہ باطل الزامات آپ کی ذات تک کے لیے ہی محدود کیوں؟ حقیقت یہ ہے کہ مستشرق ثابت کرنا یہ چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ بحیرا راہب کی تعلیم کی کارفرمائی تھی۔ اس تعلیم کا اثر آنحضرت ﷺ پر ہوا۔ یہ محض باطل ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بحیرا راہب از خود متاثر ہوا۔ پہلے کبھی قافلوں کے پاس نہ آتا تھا۔ اس قافلے کی طرف خود چلا آیا، کھانے کا انتظام کیا اور اعلانیہ آپ ﷺ کے نبی ہونے کی گواہی دی۔ بحیرا راہب نے لات و عزیٰ کی قسم دے کر پوچھا تو آپ نے فرمایا ان کی قسم دے کر نہ پوچھو: خدا کی قسم! میں ان سے بڑھ کر کسی چیز سے بغض نہیں رکھتا۔ آپ تو راہب کے عقیدہ کے خلاف ہیں تو پھر راہب سے تعلیم منسوب کرنا چہ معنی دارد؟ حد تو یہ ہے کہ یورپین مورخین نے کہا آپ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو وسعت دی ہے" ایک اور مورخ لکھتا ہے کہ آپ نے بحری سفر کیا تھا جس کی دلیل قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفانوں کی کیفیت کی ایسی تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بُو آتی ہے۔ (مارگولیس یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ 'آپ مصر تشریف لے گئے اور بحر مردار (Dead sea) کا معائنہ بھی کیا مولانا شبلی (سیرت النبی۔۱۲۴) بتاتے ہیں "یورپین مورخین کے خیال کی بنیاد صرف قیاس ورائے پر ہوتی ہے اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے لیکن آنحضرت ﷺ کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے عہدِ مظلم کی مضحکہ خیز روایت ہے۔ بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا لیکن اگر آپ کے بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہو گا۔ بحرِ مردار کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب و شام کے درمیان میں ہے جہاں سے آپ کئی بار وفدِ تجارت کے ساتھ گزرے ہوں گے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (محمد رسول اللہ۔۱۹۱) لکھتے ہیں کہ بحران یا بحیرین (یہ موجودہ بحیرین نہیں) بلکہ وہ علاقہ ہے جو آج کل سعودی عرب کے مشرقی سرحدی صوبہ الحمساء پر مشتمل ہے۔ یہ بھی لکھتا ہے "جدید جزیرہ بحیرین جو کہ خلیج عرب و فارس میں جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں واقع ہے ان دنوں "اُول" کہلاتا تھا (حوالہ بالا۔۱۹۶)۔ پر ہے بحیرین سعودی عرب کا موجودہ ضلع الحمساء ہے۔ شاید اس وقت قطر بھی اس علاقے میں شامل تھا۔ قطر خاص طور پر خلیج کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور دو سمندر وجود میں آتے ہیں۔ اگر موجودہ بحیرین نہیں اور سعودی عرب کو صوبہ الحمساء ہے تو پھر آپ بحیرین موجودہ نہیں گئے، شاید اس بحیرین جو سعودی عرب کا صوبہ ہے وہاں

تشریف لے گئے ہوں گے۔ نیز تجارتی غرض کی وجہ سے سفر کیے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ اپنی رائے وقیاس سے ان سفروں کو جدید مذہب کے خاکہ میں معاون سمجھنا کسی طور درست نہیں ہے۔ کئی ایسے سیاح گزرے ہیں جنھوں نے دنیا کے دُور دراز علاقوں اور ملکوں کے سفر کیے، نئے ملکوں کو دریافت کیا جیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ وہ آنحضرت کے ایک ہزار برس بعد پیدا ہُوا تھا۔ واسکوڈی گاما ایک پُرتگالی کپتان افریقہ کا چکر لگا کر بحر ہند میں داخل ہوا اور کوئی دس مہینے میں نو دس ہزار میل کی دریا نوردی کر کے ۹۰۴ھ میں جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ پہنچ گیا (مغلوں کا زوال۔۲۱۲، ہاشم فرید آبادی) ۔بیسویں صدی میں انگریز آنے لگے۔ انگریز ملاحوں نے شمال مغرب کی طرف سمندر کا چکر کاٹنے کی کوشش کی۔ اس تلاش میں "New Found Land" یعنی جزیرہ نَو دریافت کیا۔ ایک بہادر ملاح بحرِ منجمد شمالی کے راستے چلا اور خود تو ہلاک ہو گیا مگر اس کے ساتھی شمالی روس کے ساحل بحرِ سفید تک جا پہنچے، گویا سیدھا راستہ ایشیاء تک پہنچنے کا پھر بھی نہ ملا (حوالہ بالا۔۲۲۲)۔ سیاحوں، ملاحوں نے سفر ترتیب تو بہت دیئے۔ نئے علاقے بھی دریافت کیے، سمندروں کے چکر بھی کاٹے لیکن انسانیت کو نیا مذہب نہ دے پائے۔ کوئی ضابطہ نہ دیا، کوئی نیا مذہبی خاکہ دنیا کو دے نہ پائے اور کسی نے ان ملاحوں کے تجربات و مشاہدات سے یہ اخذ نہ کیا کہ طوفانوں کی کیفیت، جہازوں کا سمندروں میں گھومنا پھرنا وغیرہ الہامی کتاب میں ان کے تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ ہے، نیز ان سفروں سے عجیب وغریب معارف کے خزانے تو ہاتھ لگے مگر انھوں نے اپنے آباء کا دین نہ چھوڑا۔ اندھا کیا جانے بسنت کی بہار، انھیں کیا خبر کہ نبوت عطائے ربی ہے۔ کسبی نہیں اور نہ ہی سفری تجارب اور معارف کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے ارشاد خداوندی ہے ’’ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (الانعام ۱۲۴، پارہ ۸) اللہ جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت رکھے‘‘۔ دینِ اسلام ایک مکمل دین ہے جس نے رہتی دنیا تک کے انسانوں کی رہنمائی کرنی ہے (ان شاء اللہ) اور نظامِ حیات کو برقرار رکھنے کے لیے تمام لوازمات عطا کرنے ہیں، تو یہ رہنمائی اللہ کی عطا سے اس کے بھیجے ہوئے رسول دیتے ہیں۔ یہ ان سفروں کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ عطائے الٰہی اور انعام خداوندی ہوتا ہے۔ سورہ الرحمٰن میں ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ’’ دو دریاؤں، ایک گرم پانی کا اور دوسرا ٹھنڈے پانی کا ہے‘‘ کے درمیان ایک آڑ ہے وہ تجاوز نہیں کرتے، ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ قرآن کریم نے جو یہ بیان کیا تو کیا آپؐ نے وہاں کا سفر کیا تھا؟ کیا وہاں جانے پر معارف ومعلومات حاصل ہوئی تھیں جن کی بازِگشت قرآن مجید میں ہے۔ (ن ۴۹ص) یہ سفر بقول سر ولیم میور مستشرق کے مختلف تجارب و

معارف کا نتیجہ تھے حالانکہ یہ سفر مابعد جدید مذہب کا باعث بنا، یا مابعد نبوت کا سبب بنا غیر منطقی استدلال ہے ایسے سفروں کے تجارب جہانگیری و جہانبانی کی بنیاد قرار نہیں دیے جاسکتے۔نبوت ورسالت وہبی ہے کسبی نہیں۔نبوت ورسالت خالص اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔اکمل وکامل دین جس نے قیامت تک کے لیے درست نظامِ حیات کا مقام قائم رکھنا ہے وہ ان تجارتی سفروں کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔اگر چہ یہ فرائض اوران کی انجام دہی صبر واستقلال، تدبر وفہم، امانت ودیانت کی عادت کے موجب بن سکتے ہیں مگر ایک مکمل دین کے جزئیات کا حل اورامت کی زندگی کے ہر شعبہ میں ہدایت ورہنمائی سفروں کی بدولت نہیں ہوسکتی۔

اعتراض نمبر ۷۷

یہ بات واضح ہے کہ اسلام کی نئی مذہبی تحریک حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں مکہ کے حالات سے ابھری ہوگی، ایک نیا مذہب اس وقت تک وجود میں نہیں آتا' جب تک اس کے لیے کافی عوامل موجود نہ ہوں۔آنحضرت ﷺ اوران کے انتہائی پیروؤں کی نظروں میں کچھ ضروریات آئی ہوں گی جن کو اس نا پختہ مذہب کے عقاید اور معمولات کے ذریعہ پورا کیا گیا۔

جواب: رسالت کی دعوت کا محور ومرکز ایمان باللہ ہے یعنی آپ ﷺ کی دعوت کا آغاز اس سے ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور مدت العمر اسی مشن کو آگے بڑھاتے رہے اور لوگوں کو حقیقی پروردگار سے آشنا کر کے انہیں صرف اور صرف اللہ کی بندگی پر گامزن کرتے رہے۔اسلام سے پہلے عرب کی یہ حالت تھی کہ وہ آسانی سے اس طریق دعوت سے رام ہونے والے نہیں تھے۔انہیں اپنی زبان دانی پر فخر و ناز تھا وہ بخوبی جانتے تھے کہ لا الہ اور لا الہ الا اللہ کا مطلب کیا ہے یعنی اقتدار پورے کا پورا کاہنوں' پروہتوں' قبائلی سرداروں اورامراء وحکام لے ہاتھ سے نکل کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔وہ جانتے تھے کہ لا الہ الا اللہ کا اعلان دنیاوی اقتدار کی بساط لپٹنے کے لیے ہے جس نے الوہیت کی حاکمیت کو یرغمال بنا رکھا ہے۔وہ جانتے تھے کہ یہ نعرہ ان تمام نظاموں اوران کے وضع کردہ قوانین کے خلاف کھلا چیلنج اور اعلان بغاوت وجنگ ہے جو غاصبانہ قبضہ کی بنیاد پر بنے ہیں اس لیے انہوں نے اس انقلابی اقدام کا نفرت وتعصب' تشدد ودشمنی سے استقبال کیا۔کیا یہ حالات دعوت حق کے لیے سازگار تھے۔ظہور اسلام کے وقت زرخیز وشاداب علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں دیگر اقوام کا قبضہ تھا جیسے شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے قبضہ میں تھے جن کے ماتحت عرب کے شیوخ حکمرانی کرتے تھے جنوب میں یمن کا پورا علاقہ اہل فارس کے قبضہ میں تھا انہوں نے عرب حکام کو حکمرانی کے لیے سونپ رکھا تھا۔آپ ﷺ کو

عرب الصادق والامین تسلیم کر چکے تھے۔ حجر اسود کے نصب کرنے میں آپ ﷺ کو اپنا حکم بنا چکے تھے۔ نسب کے لحاظ سے آپ ﷺ بنو ہاشم کے اونچے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس وقت اگر آپ ﷺ چاہتے تو قومیت کا نعرہ بلند کر کے عربوں کو اپنے گرد اکھٹا کر لیتے جو معمولی جھگڑوں پر سالہا سال کی جنگوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انہیں قومیت کا درس دیتے اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے قبضہ سے عرب سرزمین کو آزاد کرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ عرب قومیت اور عربیت کا پرچم لہرا کر اور جزیرہ عرب کے اطراف و اکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست کی داغ بیل ڈال دیتے مگر آپ ﷺ نے توحید کا اعلان کیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور ساتھ اس طرف بھی توجہ دلائی کہ اس اعلان کے بعد آپ ﷺ خود اور وہ کم تعداد افراد اس دعوت پر لبیک کہیں اور ہر قسم کی تکلیف و اذیت اور مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ تشدد اور ظلم کا نشانہ نہ بننے کے لیے اہل ایمان کے لیے حق نہیں چاہتا تھا مگر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا جو اس دعوت کے مزاج کے ہم آہنگ ہو کیونکہ یہ درست نہیں تھا کہ رومی و ایرانی طاغوت سے نجات پا کر عربی طاغوت کے پنجہ میں جکڑ دیا جاتا۔ جب طاغوت کے زیر اثر ہی رہنا ہے تو طاغوت رومی ہو یا ایرانی یا عربی، کسی صورت مفید و کارآمد نہیں ہے۔ یہ ملک اللہ کا ہے اور اس پر صرف اللہ کا اقتدار ہی ہونا اور رہنا چاہیے۔ انسان کا انسان پر غلبہ نہ ہو، انسان صرف اللہ کے بندے اور اس کے غلام ہیں۔ اسلام انسانوں کے لیے جس قومیت کا علمبردار ہے وہ اسی ''لا الہ الا اللہ'' کے ایمان و عقیدہ کی بنیاد پر طے ہوتی ہے۔ رنگ و نسل، اور علاقہ و زبان کے امتیازات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سب اس عقیدہ کی نگاہ میں نعرہ توحیدی کے تحت مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے اس فطری طریق کو اپنایا اور قومیت کے نعرہ کو اہمیت نہ دی۔ ۲۔ اقتصادی لحاظ سے عرب کا معاشرہ دولت کی نامنصفانہ تقسیم اور عدل گستری کے غیر صحت مندانہ نظام میں جکڑا ہوا تھا اور چند لوگوں کا گروہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ مال و دولت اور تجارت کو سودی دھندے سے بڑھاتا جا رہا تھا جس کے نتیجہ میں عرب کی اکثریت نادار اور افلاس کا شکار تھی۔ مال دار لوگ ہی عزت والے تھے عوام بچارے جو دولت سے بے حال اور تہی دامن اور عزت و شرف سے بے بہرہ تھے ان حالات کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے اجتماعی اقتصادی تحریک نہیں چلائی، جس کے لیے وہ حالات سازگار تھے۔ غریب عوام کو دولت کی انصاف مندانہ تقسیم پر ابھارتے اور سرمایہ داروں سے مظلوم اور محنت کش طبقے کو حق دلاتے جس سے کمزور طبقہ امیروں کے

خلاف ڈٹ جاتا۔ یہ نہج اپنایا جاتا تو نہایت موثر ہوتا مگر یہ نہ اپنایا جس سے پورا معاشرہ لا الہ الا اللہ کے خلاف صف آرا ہو جاتے اور چیدہ چیدہ لوگ اسلام کے پیروکار ہوتے لیکن اس طریق پر چلنے کی راہ اختیار نہ کی کیونکہ دعوت اسلامی کے لیے یہ مناسب نہیں ہے عدل وانصاف کی اجارہ داری صرف اس ہمہ گیر لا الہ الا اللہ کے نظریہ سے ممکن ہے جو معاملات کو اپنے قبضہ میں لینے کی بجائے اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہے اور معاشرہ اس فیصلہ کو بخوشی قبول کرتا ہے اور ہر فرد کے دل کی آواز خواہ وہ دینے والے یا پانے والے کی آواز ہو دلوں میں گھر کر جاتی ہے کہ وہ جس نظام کے نفاذ کا خواہاں ہے اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے اور اس نظام کی اطاعت سے دنیا وآخرت میں فلاح وکامیابی ہوتی ہے تلوار اور ڈنڈے کے زور اور ظلم وتشدد پر قائم نظام ہو جس میں انسانوں کے دل اور ان کی روحیں سسک سسک کر دم توڑ رہی ہوں وقتی طور پر غالب آ سکتا ہے یعنی چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات والی بات ہو گی۔ آج کل کے نظاموں میں یہی کچھ ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح زوال وادبار کا شکار تھی صرف چند اخلاقی قدریں اخلاق سے عاری اور خام حالات میں تھیں۔ ظلم وتشدد کی فضا نے پورے معاشرہ کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بقول زمانہ جاہلی کے ایک شاعر ''جو ہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا تباہ وبرباد ہو جائے گا اور جو خود بڑھ کر ظلم نہیں کرے گا تو وہ خود ظلم کا شکار ہو جائے گا۔ دین عوامل کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا اور یہ بھی درست ہے کہ دین معاشرہ میں ظلم وستم، ناانصافی اور جہالت وبربریت کی روک تھام کے لیے وجود میں آتا ہے جب انسانیت اپنے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتی تو وہ کسی ایک ایسے مسیحا کی آمد کا انتظار کرتی ہے جو ان کے دکھوں کا علاج کرے کیونکہ تنم تنم زخم پنبہ کجا نہم کی سی کیفیت ہوتی ہے اور انسانیت پکار پکار کر کہتی ہے ''میرے دکھ کی دوا کرے کوئی'' ایسے میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہوتا ہے اور اپنے رسول مقبول کو گمراہ، پسی ہوئی، ظلم کی ماری مخلوق کی طرف مبعوث فرماتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ جہالت عروج پر ہو اور دکھوں میں جکڑی اور مفلوج انسانیت خود بخود ہدایت کی طرف گامزن ہو جائے جبکہ قعر مذلت میں ڈوبی اور زبوں حالی کا شکار قوم پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوتا ہے تب اس کے کرم کے صدقے رسول مبعوث ہوتا ہے جو لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتا ہے اور صراۃ مستقیم پر چلنے کا درس دیتا ہے۔

مکہ میں بلکہ عرب میں عیسائیت و یہودیت کی ذرا برابر کامیابی نہ ہوئی اور یہ دونوں مذاہب ان ضرورتوں کو پورا نہ کر سکے جنہیں دین اسلام نے پورا کر دکھایا پھر بھی مستشرق اسلام کو ناپختہ دین کہتا ہے جس نے لوگوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ مستشرق یہودیت وعیسائیت کی ناکامی کے باوجود

اسلام سے افضل شمار کر رہا ہے حالانکہ اسے اچھی طرح خبر ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی مہر قرآن نے ثبت کر دی ۔الیوم اکملت ۔۔۔'' لیکن جیسے مستشرق ناپختہ دین کہتا ہے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کر دیا مستشرق یہودیت وعیسائیت کو ناکامی کے باوجود اسلام سے افضل شمار کر رہا ہے حالانکہ اسے اچھی طرح خبر ہے کہ دین اسلام ناپختہ دین نہیں ہے۔ایک مکمل اور اکمل دین ہے۔جس نے ہر طرح سے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ہدایات فراہم کیں اور انسانیت کو ذلت کے گڑھے سے نکالا۔

اعتراض نمبر ۷۸

ولیم کہتا ہے کہ ماحول اتنا ساز گار اور تبلیغ اتنی پر جوش تھی کہ مذہب اسلام ایک گھر سے دوسرے گھر اور ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے تک پھیلا، یہودی سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے اور جن لوگوں کو بت پرستی کی قباحتوں سے دور رکھنے کے لیے کئی نسلوں سے کوشش کر رہے تھے وہ لوگ اب اپنے بتوں کو جھوٹا، چھچھوندروں اور چمگادڑوں کے سامنے پھینک کر خدائے واحد پر ایقان لا رہے تھے۔اس کامیابی کا راز وسیلے کی موزونیت میں تھا، یہ مذہب مقامی تھا اور طبیعتوں کے موافق تھا۔یہودی مذہب جو اجنبی ممالک کی پیداوار تھا وہ عربوں کی ہمدردیاں حاصل نہ کر سکا اور اسلام جو عربی عقائد، توہمات، قومیت اور رسوم کی پیوندکاری سے بنا تھا وہ سرعت کے ساتھ عربوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔(ضیا النبی ۔۷۔۳۳۴)

جواب: جب تک اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو تب تک ایک ناخوشگوار ماحول خوشگوار ماحول نہیں بن پاتا اور تبلیغ اتنی پر جوش اور دلوں میں گھر کر جانے والی نہیں بنتی' ہاں جب وہ رحمت معاون و مددگار ہو تو مفلوج، ظلم وستم اور ناانصاف زدہ ماحول بھی ساز گار بن جاتا ہے۔

سارے موسم تیرے موسم کیا ساون کیا چیت
تو چاہے تو مٹی سونا، نہیں تو سونا ریت

۲۔ ولیم میور نے خود اقرار کیا کہ یہودیت ناکام ہو چکی تھی کیونکہ ان کے عقائد، عبادتیں اور ضابطے بے روح ہو چکے تھے اس وجہ سے کہ وہ دین اصل نہیں رہا تھا بلکہ تحریف شدہ تھا یعنی انسانوں کا بنایا ہوا مذہب رہ گیا تھا۔وہ مذہب جو انسانی ذہن کی پیداوار ہو وہ بھلا کب پروان چڑھ سکتا ہے وہ تو از خود ختم ہو جاتا ہے دوسروں کو ہدایت کیسے دے سکتا ہے؟ ولیم میور نے پر جوش تبلیغ کو مان لیا جس کی اثر انگیزی سے اسلام ایک گھر سے دوسرے گھر اور ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے تک پھیلنے لگا۔ولیم میور یہ کہنا چاہتا ہے کہ مذہب تو یہودیت ہی اچھا ہے لیکن وہ درآمد شدہ ہے اس لیے عربوں نے اسے پذیرائی نہ بخشی بلکہ

مسترد کر دیا۔ یہ بھی مستشرق کی بھول ہے اور خطا ہے کیونکہ وہ مذہب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے وہ سچا ہوتا ہے اگر چہ وقتی طور پر اسے کم لوگوں کی تعداد قبول کرتی ہے جبکہ اس کی حقانیت میں کسی قسم کا ریب نہیں ہوتا مگر جب اس میں ملاوٹ یعنی لفظی و معنوی تحریف ہو جائے وہ اپنا اثر کھو دیتا ہے کیونکہ وہ اب اصل دین نہیں رہا ہے بلکہ انسانی ذہن کی پیداوار ہو چکا ہے۔ پر جوش تبلیغ کام نہیں آتی جب تک دین سچا نہ ہو اور سچا دین صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہوتا ہے۔ تحریف شدہ یا انسانوں کا خود بنایا ہوا مذہب پر جوش تبلیغ سے کبھی کامیاب نہ ہوا ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔

۳۔ ولیم میور تضاد کا شکار ہے اس کی کس بات کو مانیں اور کس کو نہ مانیں وہ تو سیماب صفت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام نے عربوں کو بت پرستی سے توحید کی طرف لانے کی کوشش کی اور پھر یہ کہتا ہے کہ اسلام عربی عقائد، توہمات، قومیت اور رسوم کی پیوندکاری سے بنا ہے یہ تضاد ہے اور اجتماع ضدین ممکن نہیں لیکن ولیم میور کے نزدیک تضاد کی کھلم کھلا گنجائش ہے جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث اور توحید میں فرق نہیں ہے۔ ان کے حساب سے ایک اور تین برابر ہوتے ہیں۔ وہ تین خداؤں کو مان کر بھی توحید پرست ہیں۔ عربوں کے عقائد میں رسوم و قیود کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسلام بت شکن ہے جبکہ عرب بت پرست تھے عرب باپ دادا کے دین پر فخر کرتے تھے۔ اسلام نے ان کے آباء کے مذہب کو جھوٹا کہا۔ عربوں میں خاندانی شرافت کو اہم سمجھا جاتا تھا اسلام نے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اعلان کیا کہ تم میں وہ اچھا ہے جو متقی و پرہیز گار ہے۔ عمل کی اساس تقویٰ پر رکھی۔ معیار زندگی یہ تھا کہ ایک بے دین امیر ایک غریب ایماندار دیندار کے مقابلے میں پرکاہ کے برابر بھی نہیں تھا۔

۴۔ ولیم میور کا یہ کہنا کہ یہودیت درآمدی مذہب تھا جس کی بناء پر ناکام ہوا، اسی طرح عیسائی مذہب پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ یہودی مذہب لوگوں کو مائل کرنے اور اپنے مشن کو جزیرہ نمائے عرب میں پھیلنے میں ناکام رہا اس طرح عیسائیت کا مشن بھی لوگوں کو اپنی طرف نہ لا سکا۔ یہودیت کی حمایت میں اور ناکامی کے الزام کو سر سے اتارنے کی دانستہ کوشش کی ہے تاکہ یہودیت کی بریت سے عیسائیت کی بھی اس الزام سے بریت ہو جائے گی، لیکن اہل علم ان کی چالوں سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔ مستشرقین کو اسلام دشمنی نے ہلا کر رکھ دیا ہے وہ اس دشمنی میں باولے ہوئے جا رہے ہیں نیز ایک مستشرق کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ کہتا ہے جیسے مذکورہ بیان میں ولیم میور نے کہا کہ درآمدی مذہب کی وجہ سے یہودیت کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف ''واٹ'' کہتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ

مکہ والے یہودیت اور نصرانیت کے زیر اثر توحید کی طرف گامزن تھے۔ یہ تضاد ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ولیم درآمدی مذہب کی بناء پر ناکامی کا اقرار کرتا ہے اور ''واٹ'' عربوں کو ان مذاہب کے ذریعے توحید کی طرف گامزن ہونے کی بات کرتا ہے۔ کس بات میں وزن ہے؟ کس کی بات تاریخ کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے؟ بلکہ یہ درست ہے کہ دونوں کے اعتراضات باطل ہیں۔

۵۔ ورقہ بن نوفل اپنے ہم مذہب بزرگ کی بات مان لیتے تو خوب تھا، جو سمجھتا ہے کہ ایک نبی عنقریب آنے والا ہے اس کی تشریف آوری کی دنیا منتظر ہے جس کی نبوت و رسالت کی گواہی ورقہ بن نوفل نے دی، جس کی رسالت و نبوت کی گواہی حبشہ کے شہنشاہ نجاشی نے دی، اس وقت کے راہبوں اور عالموں نے شہادت دی کہ وہ مامور من اللہ ہیں اور انہی کے دم قدم سے اسلام پوری دنیا میں پھیل گیا اور دیگر مذاہب پر غالب آ گیا کیونکہ یہ دین اللہ کی طرف سے تھا۔

اعتراض نمبر ۷۹

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جا کر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہبِ قدیم 'یہودیت' سے بدل دیا جائے۔ (واٹ۔ن۔۱۱۔۵۳۷)۔

مدینہ جا کر شہکار کارنامہ جو ابتداً کیا 'میثاقِ مدینہ ہے۔ جس میں یہودیوں نے پیغمبر کی حیثیت کو مان لیا اور دستور میں بار بار مسلمانوں اور یہودیوں کا الگ الگ ذکر ہے تو پھر یہ تسلیم کیسے کر لیں کہ اسلام کو یہودیت میں بدلنے کی کوشش کی جبکہ دونوں مذاہب کا اپنا اپنا امتیاز اور تشخص برقرار ہے۔ ان کے جرم کی پاداش میں انھیں سزائیں دی گئیں۔ گویا آپؐ مجاز اتھارٹی اسلام تھے۔ تحویلِ کعبہ جو سترہ ماہ بعد عمل میں آئی اور مسلمانوں کا قبلہ وکعبہ ان کے اجداد کا قرار پایا۔ یہ کوشش اسلام کی یہودیت مذہب بدلنے کی تھی یا یہودیت کے خلاف تھی۔ حالانکہ مسلمان بیت المقدس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں لیکن رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہی ٹھہرا۔ مستشرق ولیم میور نے تحویل قبلہ کے متعلق کہا کہ ایک خاص وقت کے بعد یہودیت وعیسائیت سے بے زاری کی کوشش تھی۔ بالکل درست ہے کہ عیسائیت اور یہودیت کے تحریف شدہ مذہب سے بے زاری تھی۔ ان کے غلط عقاید سے منافرت تھی اور ان کے طعن پر کہ پرچار اپنے دین کا مسلمان کرتے ہیں اور عبادتیں اور نمازیں ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے پڑھتے ہیں۔ بنابریں اللہ تعالی نے مسلمانوں پر فضل کیا اور انھیں وہی قبلہ عطا فرمایا جو ان کے اجداد ابراھیمؑ اور اسمٰعیلؑ کا تھا۔

اہم نکتہ: روایتی اسلام کہتا ہے کہ محمد ﷺ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، لیکن یہ بات جدید مغربی

محققین کے نزدیک مشکوک ہے۔ یہ بات تو صرف اس عقیدہ پر زور دینے کے لیے کہی جاتی ہے کہ محمد کا قرآن لانا ایک معجزہ تھا۔ اس کے برعکس ہمیں معلوم ہے کہ مکہ کے بہت سے باشندے پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ اس لیے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک کامیاب تاجر اس قسم کے فنون سے ضرور واقف ہوگا'' (واٹ، علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔۱۴۱)

جواب: واٹ کہتا ہے کہ'' مکہ کے بہت سے باشندے پڑھنا لکھنا جانتے تھے''۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ مگر سارے خواندہ نہ تھے، تو واٹ نے یہ فرض کرلیا کہ آنحضرت (ﷺ) بھی پڑھے لکھے تھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں کیوں کہ ایک ہی شہر میں کافی افراد کا پڑھا لکھا ہونا اسی شہر کے کسی دوسرے آدمی کے ناخواندہ ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ نیز واٹ کے الزام کے اس جملہ'' کہ مکہ کے بہت سے باشندے پڑھنا لکھنا جانتے تھے'' کا اس بات سے رد ہوتا ہے کہ مکہ کے تمام لوگ پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر سارے افراد پڑھے لکھے ہوتے تب کہا جا سکتا تھا کہ آپ ﷺ بھی پڑھے لکھے تھے مگر ایسا نہیں ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے امیت یا ناخواندگی کا نظریہ متاخرین کی ایجاد نہیں ہے بلکہ ان کے آباء کا نظریہ بھی یہی تھا جس کے رد میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

'وَمَا كُنتَ تَتلُوا مِن قَبلِهٖ مِن كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِينِكَ اِذًا لَّارتَابَ المُبطِلُونَ (العنکبوت ۴۸، پارہ ۲۱) ترجمہ: اور اس سے پہلے آپ کسی کتاب کی تلاوت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے تب تو یہ بطلان والے شک بھی کر سکتے۔'' معنی بالا کے لحاظ سے اسم نبی الامی حضور ﷺ کا عظیم معجزہ ہے۔ اسم امی اُن کی طرف منسوب ہے اس اعتبار سے کہ نبی ﷺ بوجہ پاکی فطرت وعصمت من جانب رب العزت جملہ عیب ونقائص سے ایسے ہی پاک صاف ہیں جیسے کہ ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یہودیوں نے اہل عرب کا نام امیون رکھ دیا تھا۔ قرآن مجید سورہ آل عمران میں ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُم قَالُوا لَيسَ عَلَينَا فِي الاُمِّيّٖنَ سَبِيلٌ' (ترجمہ: یہودی کہتے ہیں کہ ہم ان امی لوگوں کے ساتھ خواہ کچھ بھی برتاؤ کریں ہم پر کچھ مواخذہ نہ ہوگا)

یہ نام آپ ﷺ کے سوا'' النبی الامی اور کسی نبی کا لقب نہ تھا۔ حضور ﷺ کا ہی لقب انبیاء کرام اور سابقہ امم کو بتلایا گیا ہے۔ لفظ امی سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کا طرز وطریق خواندگی اہل دنیا سے بالاتر تھے۔

دوم: واٹ نے جو کسی کامیاب تاجر کے ناخواندہ نہ ہونے کا مفروضہ قائم کیا ہے کہ ایک کامیاب

تاجر اس قسم کے فنون سے ضرور واقف ہوگا۔اس کے لیے دور نہ جائیں خود اس زمانہ کے کسی شہر کے کامیاب تاجروں کے حالات معلوم کر لیجیے۔آپ کو بہت سے ایسے تاجر مل جائیں گے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے ہوں گے۔کم سے کم میں ایک ایسے تاجر کی مثال پیش کرسکتا ہوں جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا، البتہ اس کا حافظہ اچھا تھا اور اچھا خاصا حساب کرسکتا تھا۔اگر یہ مثال چودھویں صدی ہجری میں پائی جا سکتی ہے تو ہجرت سے قبل اس تصور سے کیوں کسی کا دل گھبراتا ہے (علوم اسلامیہ اور مستشرقین ۔۱۴۲) ۔کیوں کسی کے پیٹ میں مروڑ اُٹھتے ہیں یہ تو حقیقت ہے جس کا ثبوت ہر وقت فراہم ہوسکتا ہے آپ ﷺ اس جہان کے کسی معلم سے تعلیم یافتہ نہ تھے بلکہ انہیں خالق حقیقی نے خود علم کے زیور سے مزین فرمایا جیسا کہ الرحمٰن علم القران سے ثابت ہے۔

ارشاد ربانی ہے ''اس (کتاب) کے نزول سے پہلے آپ ﷺ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرستوں کو شبہ ہو جاتا! اس سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے دنیاوی کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔قریش مکہ کے سامنے آپ ﷺ کی بتائی زندگی تھی وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی کوئی کتاب نہ قلم ہاتھ میں لیا۔۔۔ و قالوا اساطیر الا ولین اکتتبها فهی تملٰی علیه بکرة و اصیلا (الفرقان ۵، پارہ ۱۸)''اور انہوں نے یہ کہا یہ پہلے لوگوں کی لکھے ہوئے قصے ہیں جو اس (رسول) نے لکھوا لیے ہیں، سو وہ صبح شام اس پر پڑھے جاتے ہیں''۔اس آیت میں آپ ﷺ کے لکھنے اور پڑھنے کی نفی کو آپ ﷺ کے اعلان نبوت سے مقید کیا ہے اور یہی مقصود ہے کیونکہ اگر اعلان نبوت سے اور نزول قرآن سے پہلے آپ ﷺ کا لکھنا پڑھنا ثابت ہوتا تو اس شبہ کی راہ نکل سکتی تھی۔۔۔اس قید لگانے کا یہ تقاضہ ہے کہ اعلان نبوت کے بعد آپ ﷺ سے لکھنے پڑھنے کا صدور ہو سکتا ہے اور بعد میں آپ ﷺ کا لکھنا پڑھنا اس استدلال کے منافی نہیں ہے

اعتراض نمبر ۸۰

سید مودودی کہتے ہیں ''ان لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی ﷺ کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ یہاں قرآن مجید صاف الفاظ میں حضور ﷺ کے ناخواندہ ہونے کی آپ کی نبوت کے حق میں ایک طاقت ور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے، جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ لکھے پڑھے تھے یا بعد میں آپ ﷺ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا، وہ اول تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی، پھر وہ بجائے خود بھی

اتنی کمزور ہے کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہوسکتی، ان میں سے ایک بخاری کی روایت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفار مکہ کے نمائندے نے محمدؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضور ﷺ نے کاتب یعنی حضرت علی کو حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا لفظ کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دو، حضرت علیؓ نے رسول اللہ کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ سے قلم لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیئے اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا ہوسکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؓ نے ''رسول اللہ'' کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ اس جگہ ان سے پوچھ کر اور ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابن عبداللہ کے لفظ لکھوا لیے ہوں (الی قولہ) تاہم اگر واقعہ یہی ہو کہ حضور ﷺ نے اپنا نام اپنے ہی دستِ مبارک سے لکھا ہو تو ایسی مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ ان پڑھ لوگ صرف اپنا نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں، باقی کوئی چیز نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ۳۔)

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کا یہ لکھنا درست نہیں ہے کہ اعلان نبوت کے بعد نبی کا لکھنا قرآن مجید کی اس آیت اور اس کے استدلال کے خلاف ہے کیونکہ قرآن مجید میں آپ ﷺ کے لکھنے اور پڑھنے کی مطلقاً نفی نہیں کی بلکہ نزول قرآن سے پہلے آپ ﷺ کے لکھنے پڑھنے کی نفی کی ہے، لہٰذا نزول قرآن کے بعد جن احادیث میں آپ ﷺ کے لکھنے کا ثبوت ہے، وہ روایات قرآن مجید کے خلاف نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ صحیح بخاری و مسلم شریف اور دیگر صحاح ستہ کی بکثرت احادیث سے رسول اللہ کا لکھنا ثابت ہے اور مولانا مودودی کا ان احادیث کو بجائے خود کمزور کہنا لائق التفات نہیں ہے۔ ثالثاً مولانا مودودی نے جو یہ تاویل کی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی اور کاتب کو لکھوا دیا ہو، یہ احتمال بلا دلیل ہے اور الفاظ کو بلا ضرورت مجاز پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ رابعاً اس بحث کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مولانا نے نبی امی ﷺ کو عام ان پڑھ لوگوں پر قیاس کیا ہے اور لکھا ہے ''اگر آپ ﷺ نے اپنا نام اپنے ہی دست مبارک سے لکھا ہو تو ایسی مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ ان پڑھ لوگ صرف اپنا نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں، باقی کوئی چیز نہیں پڑھ سکتے اور نہ لکھ سکتے ہیں۔'' عام لوگوں کا ان پڑھ ہونا نقص اور ان کی جہالت ہے اور رسول اللہ ﷺ کا امی ہونا، آپ ﷺ کا کمال ہے کہ دنیا میں کسی استاد کے آگے زانوائے تلمذ نہیں کیا، کسی مکتب میں جا کر لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا اور براہ راست خدائے لم یزل سے علم پا کر اولین و آخرین کے علوم فرمائے اور پڑھ کر بھی دکھایا اور لکھ کر بھی دکھایا۔

امام مسلم فرماتے ہیں ''حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے قیصر، نجاشی اور ہر سردار کی طرف خط لکھا اور ان کو اسلام کی دعوت دی''۔ صحیح بخاری میں ہے کہ معاہدہ حدیبیہ پر مشرکین کے اعتراض پر آپ ﷺ نے رسول اللہ کا لفظ کاٹ دیا اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔ علامہ عینی لکھتے ہیں کہ اللہ نے امی کہا، تو

آپ ﷺ نے کیسے لکھا؟ خود علامہ عینی نے اس کے تین جواب دیئے، ایک یہ کہ امی وہ شخص ہے جو مہارت سے نہ لکھتا ہو نہ وہ جو (بالکل) نہ لکھتا ہو۔ دوسرا جواب یہ کہ اس حدیث میں اسناد مجازی ہے۔ تیسرا جواب یہ کہ آپ ﷺ کا یہ لکھنا معجزہ تھا۔ (شرح مسلم ۵۔۵۴۳)

اعتراض نمبر ۸۱

حضرت محمد (ﷺ) نے اپنی دعوت میں جو تصورات پیش کیے ان میں کئی تصور مانی مذہب سے ماخوذ تھے وہ کہتا ہے کہ یہ تصور کہ ہر امت کے پاس الہامی ہدایت آتی ہے' یہ تصور سب سے پہلے مانی مذہب نے پیش کیا۔ اسی طرح یہ تصور بھی مانی نے پیش کیا کہ دنیا میں جتنے رسول یا پیغمبر آئے، وہ ایک ہی پیغام لے کر تشریف لائے تھے (ٹارانڈ رائے) ضیا النبی۔ جلد ۷ ص ۳۴۸)

جواب: اکثر مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات، یہودیت وعیسائیت سے ماخوذ ہیں۔ شکر ہوا کہ ٹارانڈ رائے ان کے باطل نظریات کا رد کرتا ہے، وہ بڑا دور اندیش نکلا اور اسے وہ چیزیں نظر نہیں آئیں جو اسلام نے عیسائیت و یہودیت سے اخذ کی ہوں البتہ دبے لفظوں میں اس بات کا بھی اقرار کرتا ہے کہ یہودیت وعیسائیت اسلام کی تعلیمات سے متصادم ہیں۔ یہودی وعیسائی اسرائیلی نسل کو خدا کی پیاری قوم سمجھتے ہیں اور الہامی ہدایت کا مستحق بھی ٹھہراتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نبوت ورسالت ان کے خاندان میں بند ہے اور ان کے خاندان کے لیے مخصوص ہے جب کہ قرآن کریم فرماتا ہے" لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ "' ہر قوم کے لیے ہادی ہے' اور ایک ہی دین تمام ہادیوں کا تھا۔ یہ بات یہود ونصاریٰ کو کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ ترجمہ: آپ فرمائیے: بلکہ ہم تو ابراھیمؑ کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا ابراھیمؑ ، اسمعیلؑ، اسحٰقؑ ویعقوبؑ اوران کی اولاد پر اور عطا کیے گئے موسیٰؑ وعیسیٰؑ اور جو عطا کیے گئے باقی انبیاء کو اپنے رب کے پاس سے' ہم ان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھتے ہیں''۔

دوم: یہ نہایت غور طلب امر ہے کہ اگر مذہب مختلفہ کی چند باتیں یکساں ہوں تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں مذہب فلاں مذہب سے ماخوذ ہے جس طرح ٹارانڈ رائے نے سمجھ رکھا ہے کہ مانی مذہب میں ہے کہ ہر امت کے پاس الہامی ہدایت آتی ہے اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔ تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسلام مانی مذہب سے ماخوذ ہے۔ مانی مذہب کی تعلیمات اسلام کے خلاف ہیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا یہی نا کہ اسلام نے ان چیزوں کو اپنا لیا جو ان کے فائدہ کی تھیں اور باقی چھوڑ دیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام مانی مذہب سے ماخوذ نہیں ہے اسلام بجائے خود ایک مکمل واکمل دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے انسانیت کو عطا فرمایا۔

اعتراض نمبر ۸۲

مانی کی قوم یہودیت وعیسائیت کے مذہبی تسلط سے آزادی چاہتی تھی۔ مانی نے اپنی قوم کو آزادی کے حُصُول کی ترغیب دی اور اپنی قوم میں مقبولیت حاصل کر لی۔ محمد ﷺ نے بھی مانی کے تجربہ سے فائدہ اُٹھایا اور اپنی قوم کو یہودیت وعیسائیت کے چنگل سے نکالنے کی تحریک چلائی اور اپنی قوم میں مقبول بھی ہوئے اور اس تحریک میں انھیں کامیابی بھی ہوئی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ’’یہ بات واضح ہے کہ مذہبی آزادی کی کوششوں نے مانی اور باطنی فرقوں کو مشرقی اقوام میں جو بے پناہ مقبولیت عطا کی تھی، محمد ﷺ اس سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے‘‘۔ (حوالہ بالا)

جواب: مستشرق یہ کہنا چاہتا ہے کہ دیگر مشرکین اقوام کی طرح عرب بھی یہودیت اور عیسائیت کے مذہبی تسلط میں جکڑے ہوئے تھے اور جس طرح مانی نے مذہبی تسلط سے اپنی قوم کو نکالنے کی کوشش کی۔ آپ ﷺ نے بھی اسی طرح قوم کو تسلط سے نکالنے کے لیے کوشش کی اور مقبولیت حاصل کرنے کی سعی کی اس کی غلطی اس طرح واضح ہوتی ہے کہ یہ مستشرق نہیں بتاتا کہ عرب ان مذاہب میں کس کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا ۔عرب وہ قوم ہے جسے روم اور ایران کی حکومتیں اپنے سیاسی تسلط میں جکڑنے میں ناکام رہیں۔ وہ کسی دوسری قوم کے سیاسی و مذہبی تسلط میں کیسے آ سکتی تھی؟ عرب روایات دوسری قوموں کی روایات میں خلط ملط نہ ہوئیں، خالص رہیں۔ یہ بات ان کی آزادی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کسی اور کے تسلط میں آنے کی نفی ہے۔

۲: یہ مستشرق نہیں بتاتا کہ مانی مذہب کے تصورات جنابِ محمد ﷺ کو کیسے پہنچ پائے تھے۔ کیا عربوں کے ساتھ مانی قوم کے تعلقات استوار تھے؟ نہیں نہیں وہ خود ہی اقرار کر لیتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے ’’محمد ﷺ مانی مذہب کے نظریاتی نظام کے متعلق یا تو بالکل کچھ نہ جانتے تھے اور یا بہت کم جانتے تھے۔ آپؐ نے ان کے صرف نظریات کو پکڑ لیا جن کا آپ کے اردگرد مذہبی ماحول سے گہرا تعلق تھا‘‘۔ ایک طرف اقرار دوسری طرف انکار، صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں۔ ان کی کس بات کو مانا جائے گویا مستشرق کی گومگو کی کیفیت اس کے اندر کے چور کی یعنی باطل افکار کا پتہ دیتی ہے۔ مفروضہ کا کمال دیکھیے ’’یا تو بہت جانتے تھے یا بالکل نہیں جانتے تھے‘‘۔ اس کھلے تضاد پر یقین ممکن نہیں۔ خود تذبذب کا شکار ہے۔ اس غیر یقینی صورتِ حال میں کسے پڑی کہ خواہ مخواہ اس کے باطل نظریہ کو بہ دل و جان تسلیم کر لے۔ محض سید الابرارؐ سے بغض وعناد نے ان مستشرقین کو اپنے خود ساختہ مذہب کا دیوانہ بنا رکھا ہے اور ہر طرح سے اپنے مذہب سے پیار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی حالت یوں ہے۔

اس کے پیار نے بے ترتیب کیا ہے اتنا
بچھڑ کے خود کو سلجھانے میں وقت لگے گا

نیز جو مذہبی معلومات نہیں تھیں ان کو آپ ﷺ کے عیسائیت قبول نہ کرنے اور رسالت کا دعویٰ کرنے کا سبب سمجھتا ہے۔اس طرح ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ کیوں محمد ﷺ نے عیسائی بننے کے متعلق کبھی سوچا تک نہ تھا۔مانی مذہب کا وحی کے متعلق عقیدہ پہلے ہی ان کے کانوں تک پہنچ چکا تھا اور وہ عقیدہ یہ تھا کہ عالم عیسائیت وحی کے اعزاز کے لیے مختص نہیں بل کہ عیسائی بھی ان متعدد حلقوں میں سے ایک ملت ہیں جن کے پاس الہامی ہدایت آ چکی تھی۔اس کے علاوہ جس نظریہ نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا وہ یہ تھا کہ ہر امت کے پاس رسول آیا تھا' انھوں نے سوچا کہ وہ شخص کہاں ہے جو ان کی قوم کو الہامی روشنی سے مستفیض کرے گا؟ اس خیال کے علاوہ انھوں نے عیسائی راہبوں کی تلاوت صحف کی محفل میں زبور اور دیگر صحائف کی تلاوت کرتے دیکھا تھا' ان دونوں چیزوں نے مل کر وحی اور کتاب سے تلاوت کے خیال کے لیے راستہ ہموار کیا۔(ضیاالنبی۔جلد ۷،ص ۳۴۱۔۳۴۰)

پہلے بیان ہو چکا کہ مختلف مذاہب میں چند چیزیں یکساں اور مشترک ہوں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں مذہب فلاں مذہب سے ماخوذ ہے۔یہ عقیدہ کہ وحی کے اعزاز کے لیے عیسائیت ہی مختص نہیں بل کہ متعدد حلقوں میں سے ایک ملت ہیں جن کے پاس الہامی ہدایت آ چکی تھی۔یہ وہ عقیدہ و نظریہ ہے جو مانی سے قبل چلا آ رہا تھا۔اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجتا رہا ہے۔ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ کہ انسان کی تخلیق کے بعد اسے بے مہار چھوڑ دیا جائے اور اس کی ہدایت کا سامان نہ کیا جائے۔ انسانیت کی ہدایت کے لیے انبیاء دنیا میں تشریف لاتے رہے بل کہ یوں کہنا درست ہوگا اور مانی کے عقیدہ کا بطلان بھی ہوگا کہ مانی نے سابقہ ہدایت کی روشنی سے یہ نتیجہ اخذ کیا نہ کہ از خود اس نے یہ عقیدہ ایجاد کیا۔جب یہ عقیدہ اس کا اپنا ہی نہیں تو کوئی اس سے کیا اثر لے سکتا ہے بل کہ وہ تو اسی عقیدہ سے متاثر ہوگا جو شروع سے چلا آ رہا ہے حالانکہ مانی نے تو ثنویت کا عقیدہ زرتشت سے اخذ کیا تھا۔

اہم نکتہ: بعض کہتے ہیں کہ مکہ عبادتی مرکز تھا۔دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ مکہ آتے جاتے تھے وہ آپ ﷺ کو اپنے عقائد و نظریات سے آگاہ کرتے تھے جن پر عالمی دین کی بنیاد رکھی۔تاریخ کے حوالے سے یہ بھونڈا انداز ہے اس پر تاریخ گواہ ہے کہ آپ ﷺ نے حصول علم کے لیے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا نیز مستشرقین آپ ﷺ کے سرپرستوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ کی تعلیم پر توجہ نہ دی صرف یہ خیال رکھا کہ آپ ﷺ کے جسم و جان کا رشتہ قائم رہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مستشرقین بھی آپ ﷺ کے تعلیم حاصل نہ کرنے پر متفق نظر آتے ہیں۔ان تمام باتوں کے باوجود وہ پھر بھی یہ تاثر دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کی نظر تمام نظریات اور فلسفوں پر تھی جو اس زمانہ میں جس کسی علاقے میں بھی متعارف رہ چکے تھے حالانکہ جس وقت آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اس وقت بھی انسائکلو پیڈیا قسم کے علمی خزانے دستیاب

نہیں تھے جن سے دنیا کی مختلف قوموں اور افراد کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو سکتیں۔

۲: اس دور میں اس قدر سہولیات نہ تھیں جو آج میسر ہیں' دُور دراز علاقوں سے تعلقات کا فقدان' کتابوں کی کمی' دوسرے ملکوں میں آنے جانے کے پر پیچ راستے اور مشکلات کے علاوہ ان کے نظریات اخذ کرنا جو اس قوم کے دینی ماحول کے لیے ساز گار ہوں، کہنا کتنی نادانی کی بات ہے۔؟ ذرا سوچیے کہ نبی مکرم نے علم کے حُصول کے لیے کسی کے سامنے زانوئے تلمیذ تہ نہیں کیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مکہ میں تھوڑے سے لوگ پڑھے لکھے تھے۔ اس کا ادراک مستشرقین کو بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تعلیم پر مطلقاً توجہ نہ دی اور صرف یہ خیال رکھا کہ آپ کے جسم و جان کا رشتہ قائم رہے۔

یہ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے باہر سے آنے والے لوگوں کے لیے خصوصی انتظام کر رکھا ہو' جن سے ان کے مذاہب کی معلومات حاصل کریں، اگر آپ کو اس وقت کے مذاہب سے واقفیت ہوتی اور ان کی تعلیمات کو قبول کرتے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ غارِ حرا میں کیوں جاتے تھے؟ وہاں جانے کا مقصد سچ کی تلاش اور حقیقت کی معرفت ہی تو تھی' اگر یہ سب کچھ مروجہ مذہب سے مل جاتا تو غار کی راہ نہ لیتے۔ مختصر مانی مذہب کی کہانی سن لیں۔

۱: مانی کا ایک اہم تصور زرتشت کی ثنویت پسندی سے ماخوذ ہے ان میں سے ایک شر اور دوسرا خیر کا۔ بظاہر خدا اور شیطان کا تصور' عیسائیت کی بازِگشت ہے۔

۲: ہر امت کے پاس الہامی ہدایت آتی ہے۔

۳: جتنے پیغمبر آئے ایک ہی پیغام لے کر آئے۔

۴: جنسی تعلقات خواہ وہ تفریحاً ہوں اجتناب ضروری ہے۔ مگر عام پیروؤں کو اس کی اجازت ہے۔

۵: گوشت خوری ممنوع تھی، منتخب لوگوں پر عبادت کی ذمہ داری تھی۔ موت کے بعد ارواح جنت میں جاتی تھیں۔

۶: بارہ برس میں وحی کا نزول۔

۷: بیس برس نئے عقیدہ کا پرچار وغیرہ وغیرہ۔ ۶۰۰ء تک یہ مذہب مغرب سے ناپید ہو چکا تھا (سو بڑے آدمی، ص ۴۰۹)۔

۱: اسلام معبودانِ باطلہ کی نفی کرتا ہے اور ایک خدا کی تعلیم دیتا ہے "قُل ھُوَ اللہُ اَحد"۔ اِلٰھُکُم الہ واحد۔

۲: غلط جنسی اختلاط کی ممانعت ہے لیکن حلال طریقہ سے یعنی نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ آپ کا فرمان "النکاح من سنتی" اس کی تصدیق کرتا ہے۔

۳: حلال چیزوں کی اسلام میں اجازت ہے "یَامُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ

لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ ۔۔۔۔۔ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔۔(ترجمہ: وہ نبی حکم دیتا ہے انھیں نیکی کا اور رد کرتا ہے برائی سے انھیں اور حلال کرتا ہے ان کے لیے، پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان سے ان کا بوجھ اور (کاٹتا) وہ زنجیریں جو پکڑے ہوئے تھیں انھیں)۔

۴: دین اسلام کے اوامر ونواہی کا اطلاق کالے گورے، شاہ وگدا سب پر یکساں ہوتا ہے۔اس میں عام وخاص کی تمیز نہیں۔عبادت سب کے لیے،اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں کہ خاص عبادت میں جُٹے رہیں اور عام کو عبادت سے کھلی چھٹی ہو۔ارشاد خداوندی ہے ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ''o

مستشرقین بتائیں کہ اسلام کی تعلیمات ، مانی مذہب سے متصادم ہیں تو اسلام مانی مذہب سے ماخوذ کیسے ہوا؟

اعتراض نمبر ۸۳

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں جو جو اچھی باتیں ہیں وہ سب اس نے یہودیت یا عیسائیت سے اخذ کی ہیں۔(روحِ اسلام جلد دوم، ص ۲۴۴)

۲۔ اسلام یہودیت اور عیسائیت کا مرہون منت ہے۔(kleimn) (مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر۔۲۱۲)

جواب: یہودی عزیرؑ اور عیسائی عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں ارشاد خداوندی ہے '' وقالت الیہود و النصری نحن ابنوا اللہ و احباؤہٗ o ترجمہ: اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں'' اور وہ بھٹک رہے تھے بتوں کی پوجا دین عیسوی کا جز ولاینفک تھی۔تمام برائیوں سے حضرت عیسیٰؑ نے روکا لیکن وہ آہستہ آہستہ ان کے مذہب میں در آئیں۔عیسائیوں کی اندھا دھند تقلید سے ان کے مذہبی اعصاب مفلوج ہو چکے تھے۔اور ان مذاہب کا یہ کہنا کہ اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے اس کی تعلیمات کے سرچشمے عیسائیت اور یہودیت ہیں ۔ یہ دعویٰ عہد وسطیٰ کی یادگار ہے جس میں اسلام کو عیسائیت کی ایک بدعتی شاخ قرار دیا جاتا تھا حالانکہ یہ انہیں معلوم ہے کہ تمام مذاہب میں کسی نہ کسی طور توحید، ہدایت پر عمل، عبادت، نیکوکاری پر عمل اور بدکاری ورذائل سے اجتناب کی قدریں مشترک ہیں۔ جن پر مذاہب استوار ہوتے ہیں اور اس بنیاد پر مذاہب عالم سب کے سب ایک دوسرے سے ایسی مماثلتیں رکھتے ہیں نہ کہ ایک دوسرے مذہب سے اخذ کی گئی ہیں۔ڈویش (Deutsch) کہتا ہے کہ یہ عام قاعدہ بن گیا ہے کہ اسلام میں جو جو خوبیاں ہیں انھیں عیسائیت سے منسوب کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ دیانت دارانہ تحقیق کے نتائج سے مطابقت نہیں رکھتا کیوں کہ محمد ﷺ کے زمانہ میں جزیرہ

نمائے عرب کی عیسائیت نا گفتہ بہ حالت میں تھی۔اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس کے مقابلہ میں تو جدید مہری (Modern Amhare) عیسائیت بھی جس کے بارے میں ہم نے تحیر انگیز قصے سنے ہیں، خالص اور اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں۔البتہ یہ حقیقت ہے کہ مختلف مذاہب میں چند امور مشترک ہوتے ہیں یہ Comenerities ہیں نہ کہ ایک دوسرے مذہب کی اخذ شدہ باتیں ہیں۔

لمحہ فکریہ:

غیروں کے ساتھ عہد کی توثیق ہو گئی
تیری زبان سے ہمیں تصدیق ہو گئی

(نسیم اللغات۔۲۹۶)

مولانا مودودی کو بھی یہی اعتراض ہے۔''عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ہ''اس پر انیس فرشتے مقرر ہیں' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہلِ کتاب کے ہاں ان کی مذہبی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں لیکن وہ اس کی توجیہہ کرتے ہیں کہ''سیدنا ختمی المرتبت ﷺ نے یہ باتیں ان کتابوں سے نقل کی ہیں''۔اس کے بارے میں علامہ غلام رسول سعیدی (تبیان القرآن۔ج ۱۲ص ۳۸۱) لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض اہلِ کتاب یہ توجیہہ پیش کرتے تو ان کی یہ توجیہہ قطعاً باطل اور مردود ہے۔

نزول قرآن سے پہلے نبی مکرم کسی مکتب میں پڑھنے کے لیے نہیں گئے تھے۔آپ نے اہل کتاب کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں اور نہ نزولِ قرآن سے پہلے آپ کا لکھنے پڑھنے کے ساتھ کوئی شغل تھا۔قرآن مجید کی اس آیت سے یہ شہادت ملتی ہے۔

''وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْكِتٰبِ وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت ۴۸، پارہ ۲۰)

ترجمہ: اور قرآن کے نزول سے پہلے آپ نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ کسی کتاب کو اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے ورنہ باطل پرست لوگ شک میں پڑ جاتے''

یعنی اگر نزول قرآن سے پہلے آپ ﷺ کو پڑھنے کا شوق ہوتا تو آپ ﷺ کی نبوت اور قرآن کریم کے کلامِ الٰہی ہونے کے منکر شک میں پڑ جاتے اور یہ کہتے کہ آپ ﷺ ہم کو جو کچھ بتا رہے ہیں وہ سب آپ ﷺ نے پچھلی کتابوں سے پڑھا اور نقل کیا ہے اور جب قرآن کریم کے نزول سے پہلے آپ ﷺ کے لکھنے پڑھنے کا شغل تھا ہی نہیں، تو کسی کو یہ کہنے کی جرات ہی نہ ہو سکی، یہ جرات مودودی صاحب نے کی ہے۔اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔صرف یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام اور عیسائیت کے بعض بنیادی تصورات میں مماثلت پائی جاتی ہے بل کہ ایسی مماثلت تو بعض عقائد میں یہودیت اور اسلام میں بھی

تلاش کی جا سکتی ہے۔ مسیحؑ کی بعض تعلیمات بدھ کی تعلیمات سے مماثلت رکھتی ہیں اس وجہ سے بعض محققین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بعض روایات میں حضرت مسیحؑ نے جو چالیس یوم صحرا نوردی کی وہ ایام نوردی نہیں، وہ بدھ مذہب کے کسی معبد میں گزارے تھے۔ (محمد رسول اللہ۔۱۶۷) مستشرقین کو ایسی مماثلتیں اسلام اور عیسائیت میں نظر آئیں جن کی بنیاد پر اسلام کو عیسائیت سے ماخوذ مذہب قرار دیں لیکن انھیں اسلام اور عیسائیت کے بنیادی اختلاف کیوں نظر نہیں آتے جیسے تثلیث (Trinity) الوہیت مسیح (Divinity) اور کفارہ (Atonement)۔

موریس بوکائیے کی کتاب جس کا اردو ترجمہ بائیبل، قرآن اور سائنس کے نام سے ہے، اس کے صفحہ نمبر ۱۷۸ پر رقم طراز ہے "یقینی طور پر بعض دوسرے موضوعات سے متعلق بالخصوص مذہبی تاریخ کے بارے میں بائیبل اور قرآن میں یکسانیتیں ضرور موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اس نقطہ نظر سے یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ یسوع کے خلاف کوئی شخص بھی اس حقیقت کا اظہار نہیں کرتا کہ وہ بھی بائیبل کی تعلیمات سے اسی نوع کے حقائق لیتے ہیں۔ یہ بات دراصل مغرب میں بسنے والے حضرات کو اس امر سے باز نہیں رکھتی کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو ان کی اپنی تعلیم میں اس قسم کے واقعات پیش کرنے پر الزام دیں وہ بھی اس فتویٰ کے ساتھ کہ وہ ایک فریبی (نعوذ باللہ من ذالک) شخص تھے اس لیے کہ انہوں نے ان باتوں کو وحی و تنزیل کہہ کر پیش کیا جہاں پر ثبوت کا تعلق ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے قرآن میں وہ باتیں دہرا دیں جو آپ ﷺ کو راہبوں نے بتائی تھیں یا املاء کرائی تھیں تو اس کے لیے اس بیان کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک عیسائی راہب نے آپ ﷺ کو اعلیٰ قسم کی مذہبی تعلیم دی تھی۔ بہتر ہوگا کہ کوئی شخص دوبارہ اس بیان کو پڑھے جو آر بلشیر اپنی کتاب محمد کا مسئلہ (پرابلم ماحوٹ) میں اس افسانے کے بارے میں بتانے کے لیے دیا ہے۔

یکسانیت کا ایک اور نقطہ بھی قرآن مجید میں دیگر بیانات اور عقائد کے دوران پیش کیا جاتا ہے جو نہایت ہی دور لے جاتا ہے۔ غالباً وقت کے اعتبار سے بائیبل سے بھی کہیں بعید زمانہ میں۔ کچھ زیادہ عمومیت سے گفتگو کی جائے تو پتہ چلے گا کہ آفرینش سے متعلق بعض اساطیر صحف مقدسہ میں تلاش کر لیے گئے ہیں مثلاً یہ عقیدہ جو بالنیشیا کے باشندے دور اولین کے ان سمندروں کے وجود کے بارے میں رکھتے ہیں، جو تاریکی میں لپٹے ہوئے تھے یہاں تک کہ روشنی ہوئی وہ الگ الگ ہوئے اور اسی طرح زمین و آسمان بنے۔ یہ اسطورہ تخلیق سے متعلق اس بیان کے مانند ہے جو بائیبل میں دیا گیا ہے۔ جس میں بلاشبہ ایک نوع کی مماثلت ہے لیکن یہ ایک سطحی بات ہوگی اگر بائیبل پر یہ الزام لگایا جائے کہ اس نے آفرینش کے بارے میں اس اسطورہ کو نقل کر دیا ہے۔ یہ کہنا بھی اسی طرح ایک سطحی بات ہے کہ دور اولین کا وہ مادہ جس سے ابتدائی مرحلہ میں کائنات کا ہیولیٰ تیار ہوا، ایک ایسا تصور جو جدید سائنس نے قائم کیا ہے، اس کی

تقسیم کے بارے میں قرآن مجید کا تصور وہی ہے جو آفرینش کے متعلق کسی نہ کسی شکل میں مختلف اساطیر میں موجود تھا اور قرآن مجید میں اس کو وہیں سے اخذ کیا۔'' (بائبل' قرآن اور سائنس۔۱۷۸)

ضمناً اعتراض

مائیکل ہارٹ (the.100) کہتا ہے عیسائیت اور اسلام دونوں ہی یہودی عقیدہ توحید سے ماخوذ ہیں۔

جواب: وہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء ایک ہی دعوت توحید کے داعی، مبلغ اور موید ہیں قرآن حکیم میں اس حقیقت کبریٰ کو بیان کیا گیا ہے۔'' وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لااله الا انا الا انا فاعبدون '' (الانبیاء۲۵، پارہ) ترجمہ: اور تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں سو میری عبادت کرو''

آنحضرت ﷺ سے اہل مدینہ نے بیعت عقبہ کے موقعہ پر درخواست کی کہ ان کے ساتھ ایک معلم کو بھیج دیں تا کہ وہ اہل مدینہ کی تعلیم و تربیت انجام دیں آپ ﷺ نے مصعب بن عمیر کو ان کے ہمراہ مدینہ روانہ فرمایا۔ ان کی شبانہ روز سعی و کوشش سے مدینہ کا ایک ایک گھر اسلام کے نور سے جگمگا اٹھا اگرچہ اوس کے چند گھرانے ابھی اسلام کے دامن سے دور تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر کی امامت میں اوس و خزرج اور ایسے قبائل نماز ادا کرتے تھے جو اس سے قبل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے ان کی دشمنی کا لاوا پھوٹتا رہتا تھا۔ لڑائی جاری رہتی اور یہ لڑائی کا سلسلہ نہ ختم ہونے والے عرصہ پر محیط تھا۔ اب بد ترین دشمن ایک ہی صف میں شانہ بشانہ ایک خدا کے حضور عبادت میں مصروف تھے یہ ایک عظیم انقلاب تھا۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے بطور احسان مندی قرآن مجید میں یوں فرمایا'' واذ کروا نعمة الله علیکم اذ کنتم اعدآء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمة اخوانا و کنتم علیٰ شفا حفرة من النار فانقذکم منها '' (ترجمہ) اور تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اپنی نعمت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا اور تم لوگ آگ سے بھرے گڑھے کے قریب تھے تو اس نے تم کو بچالیا۔''

مدینہ کے یہود جن کے اوس و خزرج قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے، نے اس انقلاب کو بڑی حیرت سے دیکھا انہیں یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ اوس اور خزرج کے خون خوار قبائل آسانی سے دین اسلام کی تعلیمات پر ایمان لائیں گے۔ ظلم و ستم، قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے باز رہ کر دوسروں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے ذمہ دار بن جائیں گے اور اس قسم کے دوسرے رذائل اور کفر و شرک کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے بن جائیں گے۔ اس سے قبل یہود نسل در نسل بت

پرستی اور شرک کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکام رہے

سر ولیم میور کہتا ہے ’’ The jews looked on in amazement at the people , who they Had in vain endeavoured for generations to convince of the errors of polytheism and to dissuade from the abominatoins of idolatory and of their own accord casting away their idol sand professing belief in the one true God,,

’’یہود نے ان لوگوں کو بڑی حیرت سے دیکھا جنہیں شرک والحاد کی غلطیوں پر قائل کرنے اور بت پرستی سے ہٹانے کی سخت ناکام کوشش وہ نسلاً بعد نسل کرتے چلے آئے تھے، وہی لوگ اب یکا یک اور برضا ورغبت اپنے بتوں کو چھوڑ کر صرف ایک سچے خدا پر ایمان کا اظہار کر رہے تھے‘‘۔(نقوش رسول نمبر۔ جلد نمبر۔۵۔ صفحہ نمبر۔۷۹)

اعتراض نمبر۸۴

مذہب اور الٰہیات کی تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل ہے (ش۔ا۔۱۱۸)

جواب: اس الزام میں پھر وہی غلطی دہرائی جارہی ہے یعنی۔

الفاظ نئے ہیں مگر افکار پرانے
دستار تو بدلی ہے مگر سر نہیں بدلا

مستشرق یہ نہیں بتاتا کہ وہ کون سے مسیحی اثرات تھے جن کا اسلام پر بڑا عمل دخل ہے۔ اسلام اثر تو تب قبول کرتا اگر یہ دین' دین خداوندی نہ ہوتا بل کہ کسی انسان کے ذہن کی پیداوار ہوتا۔۲: اسلام کی تعلیمات مسیحیت سے متصادم ہیں' عیسائی ایک سے تین اور تین سے ایک کے چکر میں پھنس کر رہ گئے ہیں مگر اسلام صرف ایک خدا کا درس دیتا ہے۔ ’’قُل ھواللہ احد‘ اِلٰھُکم اِلہٌ وَاحدٌ' عیسائیت مسیحؑ کی موت کے دعوے دار ہے جب کہ اسلام ان کو زندہ آسمانوں پر اٹھائے جانے کا عندیہ دیتا ہے۔ مسیحؑ کا سولی پر چڑھنا تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ ادھر اسلام اعلان کرتا ہے کہ ہر فرد اپنے کیے کا جواب دہ ہے۔‘‘ لیس لا نسا ن الا ما سعی‘‘ وغیرہ وغیرہ، مستشرقین کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور مختلف المذاہب کے لوگ مکہ آتے جاتے تھے' انھوں نے آپؐ کو اپنے اپنے عقائد سے مطلع کیا جس پر ایک نئے عالمی دین کی بنیاد رکھی۔ ذرا سوچیے کہ لوگ تو مختلف مذہب کے آتے ہیں اور سب کو چھوڑ کر صرف شام کی مسیحیت کا بڑا عمل دخل ہے' کیوں؟ یا تو یہ کہا جاتا کہ شام کے مسیحی خاص طور پر آپ ﷺ کو اپنے عقائد

سے مطلع کرتے تھے۔ آپ بھی ان کی باتوں میں دل چسپی لیتے تھے، اگر وہ آپ کو ملنے نہ آتے تو آپ ان کو بلا لیتے یا مسیحی مذہب سچا لگا ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ اسلام اور مسیحیت کی تعلیمات متصادم ہیں اور دیگر مذکور سوالات بھی باطل ہیں کیوں کہ دور و نزدیک کے لوگوں میں ایک نبی کی آمد کا چرچا تھا اور مکہ والے اس نبی سے باہر کے لوگوں کو ملاقات کرنے سے روکتے تھے۔

اور طرح طرح کے الزامات دھرتے تھے تو بھلا دوسری جگہوں سے آنے والے لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ اپنا عقیدہ ظاہر کرتے کیونکہ وہ عقائد تو نبی کو ناپسند تھے اور اس کی تعلیمات کے خلاف تھے، البتہ نبی کی تلقین و ترغیب اور ہدایت سے باہر آنے والے لوگوں کو اپنے عقیدہ سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اہلِ مدینہ کی مثال اس کی واضح مثال ہے۔ اہلِ مدینہ نے بھی سن رکھا تھا کہ ایک نبی نئے دین کی تلقین کرتا ہے، وہ آتے ہیں، آپؐ کی باتیں سنتے ہیں اور مشرف بہ اسلام ہو جاتے ہیں۔ مگر مستشرقین کی یہ خام خیالی کی باتیں ہیں۔ مائیکل ہارٹ (The100) بتاتا ہے کہ ''حضرت محمد ﷺ نہ صرف اسلام کی الہیات کی تشکیل میں فعال تھے بل کہ اس کے بنیادی اخلاقی ضوابط بھی بیان کیے، علاوہ ازیں انھوں نے اسلام کے فروغ کے لیے بھی مساعی کیں اور اس کی مذہبی عبادات کی بھی توضیح کی''۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ دین اسلام اللہ کا عطا کردہ ہے۔ جیسے جیسے احکامات ملتے رہے، دین کی تشکیل ہوتی رہی۔ ایسا بھی نہیں کہ آپؐ نے از خود الہیات کی تشکیل کی ہو بل کہ وہ تو ''وما ینطق۔۔۔۔۔ الا وحی یوحیٰ'' کی کھلی تفسیر تھے۔ مائیکل کا یہ نظریہ اس کی کبیدہ خاطر ہونے کا اظہار ہے۔

اعتراض نمبر ۸۵

آنحضرت ﷺ نے نبوت کی تعلیم مسیلمہ سے پائی (مارگولیس ن ۴۸۹/۱۱)

۲۔ آنحضرت ﷺ نے مسیلمہ کذاب سے حنفی دین کا لقب لیا۔ (حوالا بالا)

جواب: نبوت وہبی ہوتی ہے کسبی نہیں۔ صاحب معارج القدس (امام غزالی) فرماتے ہیں'' نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت' حیوانیت سے بالاتر ہے۔ وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے۔ سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

اللہُ اَعلَمُ حَیثُ یَجعَلُ رِسَالَتَہ' (الانعام ۱۲۴، پارہ ۸) ترجمہ: اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیغمبری کا منصب بنائے۔۔ سورہ شوریٰ میں ہے'' وَکَذٰلِکَ اَوحَینَا اِلَیکَ رُوحًا مِّن اَمرِنَا، مَا کُنتَ تَدرِی مَا الکِتٰبُ وَلَا الاِیمَانُ وَلٰکِن جَعَلنٰہُ نُورًا نَّھدِی بِہٖ مَن نَّشَاءُ مِن عِبَادِنَا وَ اِنَّکَ لَتَھدِی اِلٰی صِرَاطٍ مُّستَقِیمٍ (شوری ۵۲، پارہ ۲۵)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب

کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا جس سے ہم نے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سمجھائیں۔ ”ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ “ (جمعہ۴، پارہ ۲۸) ”یہ نبوت اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے دے“

اوپر کی آیات قرآنی میں واضح ثبوت ہے کہ منصب نبوت محض اتفاقی نہیں کہ مجاہدہ و مراتب عبادت وریاضت سے حاصل ہو جائے۔ یہ منصب عطیہ الٰہی اور فضلِ خداوندی ہے۔ اللہ عزوجل جس کو چاہے عطا کرے۔ کسی انسان میں یہ ملکہ اور قابلیت نہیں کہ اپنی جدوجہد، سعی و کوشش سے ازخود یا کسی دوسرے کے تعلیم دینے سے حاصل کر سکے۔ اس طرح نبوت کی تعلیم اور کتاب اللہ بھی اللہ کی طرف سے منصب نبوت پر فائز ہستی کو دی جاتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

”وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ، وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا“ (النساء۱۱۳، پارہ ۵) ترجمہ: خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

نبوت کے فرض منصبی میں اہم فرض عوام الناس کی تعلیم ہے۔ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے، اللہ کے احکام بذریعہ وحی اترتے ہیں۔ ان احکامات سے نبی بندوں کو تعلیم دیتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

”وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا “ (الانبیاء۷۳، پارہ ۱۷) ”اور ہم نے پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے ہیں۔

سورہ الاعراف میں ہے ”اُبَلِّغُكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ“ (الاعراف) (ترجمہ) میں تمھیں رب کا پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمھارا خیر خواہ ہوں۔ نبی بندوں سے ان کی تعلیم پر کوئی معاوضہ نہیں لیتا اس کا اجر و ثواب صرف اللہ کے ذمہ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ ”یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنَّ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ“ (ہود۵۱، پارہ ۱۲) (ترجمہ) اے قوم میں تم سے اجر طلب نہیں کرتا۔ میری مزدوری تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم کو عقل نہیں“۔

ف: نبوت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ دوم: نبوت عطائے خداوندی ہے یعنی وہبی ہے کسبی نہیں ہے۔

سوم: نبی مامور من اللہ ہوتا ہے۔ چہارم: نبی کی تعلیم قادرِ مطلق کی طرف سے ہے۔

پنجم: عوام کو پیغام توحید کی تعلیم دی جاتی ہے جیسے سورہ الاعراف میں ہے ”میں تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچاتا ہوں، عوام کو مفت تعلیم دیتا ہوں۔ اس کا معاوضہ اور اجر اللہ پاک کے ذمہ ہے“۔

ششم: وہ بے غرض نصیحت کرتا ہے۔ وہ یقیناً خیر خواہ ہوتا ہے اور سچا ہوتا ہے، باطل کار جو کسی کو گمراہ کرتا ہے ضرور کسی نہ کسی مقصد اور غرض سے کرتا ہے، اس سے حق و باطل اور نبی وغیر نبی کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ یہ

بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی اور جو آپؐ کو مسیلمہ سے نبوت کی تعلیم حاصل کرنے کا کہتا ہے یہ اس کی بھول ہے اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی ہے نیز تعصب وخود غرضی اور حقائق کو مسخ کرنے کی ناکام سعی وکوشش ہے۔ کیا مسیلمہ نے دعویٰ کیا کہ نبی آخر الزماں کو نبوت کی تعلیم اس نے دی؟ حالانکہ مسیلمہ کے پاس اس دعویٰ کو پیش کرنے کا بہترین موقع تب تھا جب وہ نبوت کا دعویدار بن بیٹھا تھا اور نبی مکرم سے کہا تھا کہ اسے بھی کارِ نبوت میں شریک کریں۔ تو کیا مسیلمہ نے اپنی زبان سے کہا تھا کہ کل تک آپ نے مجھ سے نبوت کی تعلیم لی اور آج مجھے ساجھی نہیں بنایا! میری دی ہوئی تعلیم سے لوگوں کو اپنا پیرو بنایا اور اب مجھے پوچھتا بھی نہیں؟ وہ کیوں کہتا جب اس نے تعلیم کا دعویٰ ہی نہیں کیا نیز ان باتوں سے تاریخ بھی خاموش ہے مگر مارگولیس کے کانوں میں چودہ صدیاں گزرنے پر کہاں سے بھنک پڑی کہ دعویدار (مسیلمہ) خاموش ہے مگر مارگولیس (گواہ) ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے' واہ جی واہ! مدعی سست گواہ چست۔

اس مکتوب اور جوابی مکتوب سے اس سے تعلیم حاصل کرنے کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ مسیلمہ کذاب کا مکتوب بنام جان دو عالم ﷺ "من مسیلمہ رسول الله الی محمد رسول الله اما بعد فانی تدا شرکت ھد فی الامر وان لنا نصف الارض و لقریش نصفها ولکن قریشاً قوم یعتدون" (ترجمہ: مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے، محمد رسول اللہ ﷺ کے نام، معلوم ہو کہ اس (امر نبوت) میں آپ کا شریک کار رہوں' (عرب کی) سرزمین نصف ہماری اور نصف قریش کی ہے لیکن قریش کی قوم زیادتی اور ناانصافی کر رہی ہے۔

صادق مصدق علیہ تحیۃ والسلام کا مکتوب مسیلمہ کذاب کے خط کا جواب:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"، (اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے)

من محمد رسول الله الی مسیلمہ کذاب! (من جانب محمد رسول اللہ بنام مسیلمہ کذاب)

سلام علی من اتبع الهدی اما بعد فان الارض الله یرثها من تشاء من عبادہ والعاقبة للمتقین' (آئینہ تلبیس ۶۳)

(سلام اس پر ہو جو ہدایت کی پیروی کرے، اس کے بعد معلوم ہو زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کو مالک بنا دیتا ہے اور عاقبت کی کامرانی متقین کے لیے ہے۔)

چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ مکتوب کا تقابل مقصود نہیں، صادق اور کذاب کا فرق جانتے ہیں اور ہدیہ قارئین کرتے ہیں تاکہ مستشرقین کے غبارہ سے ہوا نکل جائے۔

ا: آنحضرتؐ نے مکتوب کی ابتدا بسم اللہ شریف سے کی

۲: آپ نے خود کو رسول اللہ لکھا اور مسیلمہ کو کذاب لکھا، رسول نہیں لکھا۔ یعنی خود کو رسول کہنے سے کوئی رسول نہیں بن جاتا بل کہ یہ عطیہ الٰہی ہے اللہ کا فضل ہے اس فضل سے مسیلمہ محروم ہے۔ یہ بھی لکھا کہ سلام ہو اس پر جو ہدایت قبول کرے اور پیروی کرے تو اس کے لیے سلامتی ہے، بصورت دیگر عذاب کا مستحق ہے آپ نے کذاب کہہ کر مدعی نبوت کے دعویٰ کو یکسر رد کر دیا کہ وہ رسول ہے اور نہ ہی نبی اور نہ ہی وہ نبوت میں شریک کار ہوسکتا ہے

۳: زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا اسے مالک بنا دیتا ہے، زمین کسی کی ملکیت نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ مالک نہ بنادے دعویٰ کرنے سے زمین کا مالک نہیں ہوتا اور نہ ہی زمین ملتی ہے، سب کچھ اسی ذات بے ہمتا کا ہے اور اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور یہ سب کچھ اسی کی عطا ہے تو قریش قوم کے لیے زیادتی و نا انصافی برت رہی ہے۔ اسے نا انصافی کہنا بے بنیاد و بیکار ہے۔

مسیلمہ اپنے خط کی ابتدا بسم اللہ سے نہیں کرتا

مسیلمہ نے اپنے آپ کو اللہ کا رسول لکھا اور آقا کریم کو بھی اللہ کا رسول تسلیم کیا ساتھ ہی یہ بھی مانا کہ آپ ہدایت پر ہیں کسی اور ہدایت کی پیروی نہیں کرتے نیز یہ بھی تحریر نہیں کرتا کہ جو تعلیم مجھ سے پائی اس پر کار بند ہیں۔ بجز اس کے مسیلمہ نبوت کو عطائے الٰہی سمجھتا، اسے ایک دنیاوی اعزاز سمجھتا ہے، وہبی نہیں کسبی جانتا ہے۔ اس زعم میں وہ متمنی تھا کہ آنحضرت اسے کارِ نبوت میں شریک بنائیں۔ زمین نصف ہماری نصف قریش کی، لیکن قریش قوم زیادتی و ناانصافی کر رہی ہے۔

۴: آخرت پر ایمان کا ذکر فرمایا اور آخرت میں کامیاب جماعت کے لیے بشارت دی کہ وہ جماعت متقین کی ہے اور یہی قوم کامیاب ہے۔

ملاقات: انیس افراد پر مشتمل بنو حنیفہ کا ایک وفد جس میں مسیلمہ کذاب بھی تھا' مدینہ آیا۔ وفد رملہ بنت حارث کے گھر ٹھہرا۔ اس وفد کو پانچ اوقیہ چاندی عطا کی، سامان کی حفاظت کے باعث مسیلمہ کی بارگاہ نبوی میں غیر حاضری کی اطلاع کی گئی' کریم آقا ﷺ نے اس کے لیے بھی چاندی عطا کی۔

اخلاق میں کردار میں یکتا ہیں محمدؐ
ان جیسا زمانے میں کوئی اور نہیں ہے

اور فرمایا: یہ سن لو۔ اس نے تمھیں مکان کی خبر نہیں دی' جب وہ واپس مسیلمہ کے پاس گئے اور اسے حضورؐ کا ارشاد سنایا جو کریم آقا نے اس کے بارے میں فرمایا تھا' اس نے کہا: آپ نے اس لیے فرمایا ہے کہ آپ جانتے ہیں۔ آپ کے بعد خلافت میرے لیے ہوگی اور بد بخت نے اس کلام سے استدلال کر کے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ دعویٰ نبوت کے بعد بڑا لشکر لے کر مدینہ آیا اور جنابِ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اور اس قوم کی تالیف کے لیے ان کے پاس تشریف لے گئے' آپ کا خیال تھا کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے جب کہ انھیں قرآن سنایا جائے گا۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ مسیلمہ کذاب اس وقت تک خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا اور کفر چھپاتا تھا، اس کے بعد اس نے کفر کا اظہار کر دیا، اس وقت آپ کے ساتھ حضرت قیس بن شماس تھے' وہی وفود کا جواب دیتے تھے۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں کھجور کی شاخ کا ایک ٹکڑا تھا اور آپ نے اجمالی کلام فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر تو نے اعراض کیا تو تُو ہلاک ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جو آقا دو جہاں کی زبان مبارک سے صادر ہوا (تفہیم البخاری۔۵/۵۰۲)

ف: اس سے قبل بھی مسیلمہ نے آپؐ سے ملاقات کی تھی۔ کیا یہ ملاقات دو بدو تھی' کس مقام پر اور کتنے آدمیوں کے ہمراہ ہوئی تھی؟ وہ ملاقات کس سلسلہ میں تھی؟ اگر دو بدو ملاقات تھی تو کیا تاریخ اس کا ذکر کرتی ہے؟ مسیلمہ نے کسی ایسی ملاقات کا ذکر کیا ہو کہ آپؐ میرے پاس تشریف لائے اور میں نے انھیں نبوت کی تعلیم دی؟ مذکورہ تمام سوالات مارگولیس کے اعتراض کا رد کرتے ہیں۔ صرف مارگولیس کے بے بنیاد دعویٰ کو کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ کوئی سند بھی پیش نہیں کرتا۔ اس پر مستزاد حیرانی والی بات یہ ہے کہ بنو حنیفہ کے وفد کا ایک فرد بھی گواہی نہیں دیتا کہ ملاقات کے وقت تعلیم سے متعلق کوئی بات چھڑی ہو؟ آپ یمن کے شہر جرش میں بغرض تجارت دو بار تشریف لے گئے تھے، ان سفروں میں بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کہیں کسی مقام پر آپؐ کی ملاقات مسیلمہ سے ہوئی ہو۔ (ش۔۱۲۲)

مسیلمہ کی طرح عامر بن طفیل نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ میرے تمھارے درمیان تین باتیں ہیں۔ بادیہ کے مالک تم اور شہروں کا میں یا اپنے بعد مجھے جانشین بنائیں، ورنہ غطفان کو لے کر چڑھ آؤں گا۔ آنحضرت ﷺ نے منظور نہیں فرمایا تھا (ش۔۲۲۸)۔ مسیلمی عقائد سنیں جن سے مارگولیس

کے اعتراض کی رہی سہی کسر نکل جائے گی۔۱: بے جہت نماز پڑھنا۔۲: ہر مسلمان پر فرض ہے کہ مسیلمہ کو پیغمبر مانے ورنہ اسلام سے خارج۔۳: مسیلمہ آپ کی رسالت میں ہارون کی طرح ساجھی تھے۔۴: مسیلمہ کے پیروکار اپنے آپ کو رحمانیہ کہتے تھے۔۵: مسیلمہ پر فاروق اول صحیفہ نازل ہوا پھر کتاب فاروق ثانی بھی ملی۔۶: اقربا میں شادی کرنا مذموم۔۷: تعداد ازدواج نا جائز سمجھتے تھے۔۸: رمضان کے روزے ممنوع۔۹: تین نمازیں ظہر، عصر اور مغرب مقرر کیں۔۱۰: ظہر مشرق اور عصر مغرب کے رخ پڑھیں۔۱۱: سنت پڑھنا نا جائز۔۱۲: نماز میں درود پڑھنا ختم۔

معجزات کی نقالی مہنگی پڑی: مسیلمہ کذاب نے مرغی کے انڈے کو بوتل میں ڈال رکھا تھا' کہا کہ یہ بشری طاقت سے نہیں' اگر کسی میں ہمت ہے تو کر دکھائے۔شاید کوئی فکر مند ہو تو انڈے کو چند دن سرکہ میں بھگوئے رکھے۔نرم ہو تو بوتل میں ڈال رکھے' یہ شعبدہ ہے معجزہ نہیں۔۲: شیر دار بکری کے تھن پر دودھ کے لیے ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا کی، اس کا سارا دودھ خشک ہو گیا۔

۳: اس نے سنا کہ آنحضرت ﷺ لعاب دہن سے آشوبِ چشم اچھا کر دیتے تھے۔اس نے بھی ایک مریض کی آنکھ میں لعاب دہن لگایا۔وہ بے چارہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا۔صاحب آئمہ تلبیس دبستان مذہب میں لکھتے ہیں کہ وہ سن ۱۰۵۳ میں محمد قلی نام کے ایک شخص سے مشہد میں ملا، وہ مسیلمہ کا پیروکار تھا۔اس نے کہا مسیلمہ کے اشارے سے چاند نیچے اترا اور اس کی گود میں اصحاب کی موجودگی میں آبیٹھا۔اس کا گزر خشک درختوں پر ہوا' اس کی دعا سے وہ سب ہرے ہو گئے'

طفل نوزائیدہ نے اس کی نبوت کی شہادت دی، اس پر ایک جماعت ایمان لے آئی' لیکن کوئی مسیلمی اپنے مقتداء کے کسی معجزہ کے کسی راست باز عینی شاہد کا نام نہیں بتا سکتا' یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسیلمی معجزات ڈھکوسلے تھے۔محض مسیلمیوں کی دماغی اختراع تھی سچ ہے کہ ''پیراں نمی پرند' مریداں می پرانند''

اعتراض نمبر ۸۵ کا دوسرا جز

مسیلمہ کذاب سے حنفی دین کا لقب لیا۔۔۔(مارگولیس نقوش رسول نمبر۔۱۱۔۴۸۹ر)

جواب: پہلے الزام میں '' آنحضرت ﷺ نے نبوت کی تعلیم مسیلمہ سے پائی کا ردّ تفصیل بیان کیا گیا ہے اب اس الزام کا دوسرا جز کہ حنفی دین کے لقب مسیلمہ سے لیا، محض الزام ہے اس کی اصل نہیں۔ حالانکہ یہ لقب آقائے دوجہاں کے آباؤ اجداد کو بارگاہ ایزدی سے عطا ہوا۔ارشاد ربانی ہے۔

''قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ''۔(البقرة،۱۳۵،پارہ۱)(ترجمہ) آپ فرما دیجیے (اے نبی) بل کہ ہم تو ابراھیم کا دین (حنیف) لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے''۔

حنیفاً سے حضرت ابراھیمؑ کا لقب حنیف مشہور ہوا' اور سارے نبیوں کا یہی دین حنیف تھا۔آپؐ

اپنے جد امجد حضرت ابراھیمؑ کے دین کی نسبت سے حنفی کہلائے نہ کہ مسیلمہ کذاب سے یہ لقب لیا بل کہ یہ لقب بارگاہ رب العزت سے اس وقت جنابِ ابراھیمؑ کو عطا ہوا جب کہ مسیلمہ کا نام ونشان تک نہ تھا یعنی وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔صدیوں سے جان دو عالم کے آباء اس لقب سے نوازے گئے' یہاں تک کہ پھر اس حنفی دین کے لقب کا تاج آنحضرت ﷺ کے سر سجایا گیا۔یہ وہی دین حنیف ہے جو باطل کو مٹانے والا ہے اور ہر جہل و تعصب وخرافات کی بیخ کنی کرنے والا ہے۔ بقول شاعر

قوم سے تُو بھی یونہی جہل و تعصب کو مٹا
جس طرح دین حنفی سے مٹے لات و منات

والدہ ماجدہ کی شہادت: وفات کے وقت سیدہ آمنہ نے اشعار پڑھے جن میں سے کچھ کا ترجمہ یہ ہے'' اے میرے بیٹے! حق اور باطل جو باہم مل گئے ہیں۔تو باطل سے حق کو جدا کرنے کے لیے مبعوث ہوگا۔حق اور اسلام کے بیان میں مبعوث ہوگا کہ وہ تیرے باپ ابراھیمؑ کا دین ہے' وہ محسن اور خدا کے مطیع تھے۔(مواہب لدنیہ۔ا۔۱۱۶)

ابوطالب کا استفسار: بسا اوقات آنحضرت ﷺ اپنی رفیقہ حیات اور چچیرے بھائی علیؓ کو لے کر ارد گرد کے صحراؤں کی تنہائیوں میں نکل جاتے۔تاکہ اللہ کے احسانوں کا شکریہ ادا کریں' ایک دن تینوں نماز میں مصروف تھے۔ابو طالب ادھر آ نکلے۔انھوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھ لیا یہ کون سا مذہب ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو؟ آپ نے جواب فرمایا: یہ اللہ کا' اس کے فرشتوں کا' اس کے نبیوں کا اور ہمارے جدِ امجد حضرت ابراھیمؑ کا مذہب ہے۔ارشاد ربانی ہے۔'' وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ، يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ''۔(البقرہ ۱۳۲، پارہ ۱) 'اور اس دین کی وصیت کی ابراھیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہا اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے یہ دین تمھارے لیے چن لیا ہے' تو نہ مرنا مگر مسلمان''۔یہ وہی دین حنیف ہے جس کی آپ پیروی کرتے تھے اور لقب آپ کو دین حنیف سے ملا۔(روح اسلام، ص ۹۷)۔

مارگولیس حنفی کا لقب مسیلمہ سے جوڑتا ہے کہ اس سے آپؐ کو ملا۔یہ مستشرق جس گرو کا چیلا ہے اس کی کیا کہیے۔نبی ہونے کا دعویٰ کرنے کے بعد اسے سوجھی کہ کتاب بھی اس کی طرف سے منسوب ہو جسے کہا جائے کہ من اللہ ہے۔آیئے اس کی کتاب کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔قارئین کرام خود فیصلہ کریں گے کہ یہ کلام الٰہی ہے کہ نہیں؟ کیا یہ سرقہ ہے یا کسی عبارت سابق کی نقل کر کے ردوبدل سے کلام وحی بنایا ہے؟ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیسا بے معنیٰ' بے ربط' بے کار اور باطل معارضہ ہے۔سورہ الفیل جیسی سورہ بنائی؛ ملاحظہ کیجیے۔'' الفیل وما الفیل لاذنب و میل و خرطوم طویل ان ذلك من خلق ربنا

الجلیل ۔۔(ترجمہ)’’ہاتھی اور ہاتھی کیا ہے؟اس کی بدنما دُم اور لمبی سونڈ ہے۔ یہ ہمارے رب جلیل کی مخلوق ہے‘‘۔جبکہ قرآن کریم کی سورہ الفیل میں ایک تاریخی واقعہ کا بیان ہے یعنی ابر ہہ جو کعبہ کو ڈھانے آیا تھا وہ اپنے لشکر سمیت عذاب الٰہی میں مبتلا ہوا جس سے وہ اور اس کا سارا لشکر بھس کی طرح ہو گیا۔

۲:اِنَّآ اَعطَینکَ الجَواھِرَ، فَصَلِّ لِرَبِّكِ وَھَاجِر، اِنَّ مُبغَضَكَ رَجُلُ فَاجِرَ‘‘ (ترجمہ) ’’ہم نے دیے تم کو جواہر‘ سو نماز پڑھ اپنے رب کی اور ہجرت کر‘ بے شک جو دشمن رکھنے والا ہے تجھ کو وہ بدکردار ہے‘‘(حیات محمد،، ہیکل ۵۸۱)

یہ مسیلمہ کذاب کا فاروق اول کے صحیفہ سے کلام ہے جو عام فہم آدمی بھی فرق جان سکتا ہے اور جان کر اسے نبی کاذب کہے گا۔تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قتل ہوا تھا‘ اس کے قتل کی پیش گوئی الصادق الصدوق نبیؐ نے فرمائی تھی جو سچ ثابت ہوئی۔ایسے عقائد جھوٹے نبی کے ہی ہو سکتے ہیں اور ایسا کلام بھی ایسے کاذب نبی ہی کا ہو سکتا ہے۔مگر مارگولیس ایسے کذاب سے حنیفی لقب کی وصولی منسوب کرتا ہے۔حالاں کہ یہ لقب آپ کے آباؤ اجداد کا تھا اور بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا اور یہ وہ دین پسندیدہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔یہی دین حنیف ہے۔اور یہی دین اسلام ہے۔

☆☆☆☆☆☆

حلف الفضول

انسانی معاشرے کے معرض وجود میں آتے ہی مسائل جنم لیتے ہیں۔ایک ساتھ مل جل کر زندگی گزرانے کے دوران اختلافات اور تنازعات سر اٹھانے لگتے ہیں ظلم و ناانصافی' رائے کا اختلاف' حقوق وفرائض میں بے اعتدالی کا بازار گرم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ نوبت جنگ و جدل تک پہنچ جاتی ہے۔توہین آمیزی و بے ادبی' عصمت دری اور مال واسباب پر قبضہ جمالینا معمول بن جاتا ہے۔ یہ چیزیں معاشرے کے امن وسکون کو تہہ و بالا کر دیتی ہیں' جس سے معاشرے کی ترقی کا پہیہ رک جاتا ہے۔معاشی اور معاشرتی نمو کا عمل تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب میں کوئی باقاعدہ اور منظّم حکومت نہیں تھی اس وقت عدالتیں بھی ناپید تھیں، جہاں مظلوم اپنے حق کے حصول کے لیے ان کے دروازے پر دستک دے سکتا۔ تمام عرب قبائلی نظام میں جکڑا ہوا تھا۔ قبیلے کا سردار ہی طاقت کا سرچشمہ ہوتا تھا اور اس کا حکم ماننا از بس ضروری تھا۔قبائل خود ہی اپنے معاملات کو نمٹاتے تھے۔کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کے فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کا قبیلہ صرف اپنے فرد کے قاتل کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا تھا بلکہ قاتل کا پورا قبیلہ اس کے نشانے پر ہوتا تھا اور یہ انتقامی آگ کبھی سلگتی اور کبھی بھڑکتی رہتی تھی۔اس قبائلی نظام میں یہ خرابی بھی تھی کہ کمزور قبیلہ طاقت ور سے اپنا انتقام لینے سے قاصر تھا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔اس وجہ سے کئی قبائل کا متحدہ محاذ قائم تھا اس صورت میں اگر کسی کمزور قبیلہ پر وار ہوتا تو وہ اپنے متحدہ قبائل کے ساتھ مل کر مقابلہ کرتا گویا یہ بچاؤ اور حفاظت کا ایک طریقہ موجود تھا۔عرب معاشرے میں طاقت کے قانون نے امن وسلامتی کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔کمزور قبائل جن کا کسی سے اتحاد نہ ہوتا تھا وہ طاقت ور قبائل کے رحم وکرم پر ہوتے تھے اور انہیں غلام بنا لیتے تھے۔ پرانی باہمی رنجشیں اور دشمنیاں کبھی سرد کبھی بھڑک اٹھتی تھیں۔البتہ متحدہ قبائل جوانمردی سے ان کا مقابلہ کرتے جو ان پر ظلم کرتے فتح کے بعد غنیمت آپس میں بانٹ لیتے تھے اور وہ ایک کے حلیف اور دوسرے کے حریف قبائل قرار پاتے تھے۔حریف وحلیف کا یہ نظام بھی قدیمی تھا یعنی جنگوں میں ان کا ایکا ہوتا اور ایک دوسرے کے معاون ہوتے تھے پھر بھی مختلف قبائل کے دوسرے قبائل سے تعلقات بھی رہتے تھے ان کی مہمان نوازی اور آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے حتیٰ کہ دشمن قبائل کے کمزور افراد کے مال ومنال اور املاک کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔بچوں اور خواتین کی حفاظت کا بیڑا بھی اٹھاتے تھے یعنی حلیف قبائل باہم یک جان اور دو قالب ہوتے تھے۔ جنگ اور برے حالات میں ان کی تمیز کرنا مشکل تھا کہ کوئی کون سے قبیلے سے ہے بلکہ چھوٹے بڑے قبیلے کا تشخص اور امتیازی

شان برابری اور مساوات کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ جیسے دوران جنگ موت واقع ہونے سے تمام ہلاک شدگان کا خون بہا ادا کرنا یکساں ہوتا تھا۔ اس طرح کمزور حلیف کی برابری اور عزت برقرار تھی۔

عرب گمراہی اور بے علمی کے باعث نسلی امتیاز، شخصی برتری اور انا پرستی میں غرق تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آجاتے، تلواریں بے نیام ہو جاتیں اور اپنے بھائی بندوں کا بے دریغ قتل کر کے خون کی ندیاں بہادیتے تھے۔ تھوڑی سی انا کو ٹھیس پہنچتی تو مدتوں کے کیے گئے معاہدوں پر خط تنسیخ کھینچ دیا جاتا پھر کسی کا جان و مال محفوظ نہیں تھا افراتفری اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ مقامی اور غیر مقامی افراد میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا ہر شخص ان کی نشانے پر ہوتا تھا مسافر بچارے دن کی روشنی میں لٹ جاتے اور کوئی ان کا فریاد رس نہ تھا۔ اس کس مپرسی کے عالم میں بنو جرہم کے اور بنو قطورہ کے چند نیک اور رحم دل لوگ سر جوڑ کر بیٹھے اور اس تشدد و بربریت پر غور و خوض کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایک صلح کا معاہدہ عمل میں لایا جائے جس سے ظلم کا خاتمہ ہو اور امن و سلامتی کی ٹھنڈی ہواؤں کا راج ہو۔ آخر کار بنو جرہم اور بنو قطورہ میں معاہدہ ہوا جو تاریخ میں حلف الفضول کے نام سے موسوم ہے۔ اس معاہدہ کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جن افراد نے اس معاہدہ کی تحریک اور اس کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ان کے نام کی نسبت سے اس معاہدہ کا نام رکھا گیا ان کے نام یہ ہیں (۱) فضل بن شراعہ (۲) فضل بن بضاعتہ (۳) فضل بن قضاعہ، بعض کے نزدیک ان بانیان کے نام یہ ہیں۔ (۱) فضیل بن حرث (۲) فضیل بن واعہ (۳) فضیل بن فضالہ، ان نیک افراد کے ناموں میں چونکہ فضل کا مادہ موجود تھا بایں سبب اس کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ یہ حلف الفضول اول تھا۔

تجدیدی معاہدہ حلف الفضول یا حلف الفضول دوم: اسلام کے آغاز تک عربوں میں جنگی سلسلہ چلا آ رہا تھا حرب فجار کے نام سے کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ یہاں پر اس جنگ فجار کا ذکر کیا جا رہا ہے جس میں آپ ﷺ نے شرکت فرمائی۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر بیس سال تھی۔ عرب معاشرہ میں ہر وقت جنگ کے بادل منڈلائے رہتے تھے، اس سے پہلے سینکڑوں لوگ خون میں نہلا چکے تھے، ہزاروں گھر اجڑ چکے تھے، کئی بچے یتیمی کا داغ لیے پرورش پا رہے تھے، حالات کی سنگینی جوں کی توں رہتی تھی، راستے غیر محفوظ تھے قافلے کسی کی پناہ لینے کے بغیر سفر نہ کر سکتے تھے۔ اس جنگ کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عکاظ کے میلے میں جانے کے لیے نعمان بن منذر والئی حیرہ اپنے نمائندوں سے پوچھتا ہے کہ میرا سامان تیار ہے اسے عکاظ تک لے جانے کا ذمہ کون لیتا ہے؟ بنو کنانہ کے نمائندہ براض نے کہا کہ میں قافلے کو پناہ دیتا ہوں نعمان نے کہا ''میں تو ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جو میرے قافلے کو اہل نجد و تہامہ سے پناہ دے''۔ یہ سن کر عروہ جو بنی ہوازن کا سردار تھا بولا یہ تمہارے قافلے کو کیا پناہ دے گا۔ آپ یہ قافلہ میرے حوالے

کریں میں آپ کے قافلے کو اہل نجد و تہامہ سے پناہ دیتا ہوں ۔ براض بھڑک اٹھا اور غصہ سے لال پیلا ہو گیا مگر وہ عروہ رحال کا ہم سر نہ تھا اس نے چپ سادھ لی ۔نعمان اپنا قافلہ رحال کو دے دیتا ہے، براض عروہ کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے آخر کار براض موقعہ پا کر ایک دن عروہ کو قتل کر دیتا ہے یہ معاملہ شدت اختیار کر جاتا ہے اور جنگ کی نوبت آ جاتی ہے۔ اس جنگ میں ایک طرف قریش اور دوسری طرف بنو ہوازن تھے ۔آغاز جنگ میں بنی قیس بڑی شدت سے قریش اور بنو کنانہ پر حملہ کرتا ہے ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں ۔لیکن حرب بن امیہ ڈٹا رہتا ہے صبح سے دوپہر تک قیس کا پلہ بھاری رہا مگر دوپہر کو حالات کا رخ بدل جاتا ہے قریش بڑی پھرتی اور تیزی سے قیس کے لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔میدان جنگ لاشوں سے اٹ جاتا ہے اب فریقین میں لڑنے کی سکت باقی نہیں رہتی صلح کی بات چیت ہونے لگتی ہے آخر اس بات پر اتفاق ہوتا ہے کہ فریقین کے مقتولین کا شمار کیا جائے' جس فریق کے مقتول زیادہ ہوں وہ قبیلہ مخالف سے ان زائد آدمیوں کا خون بہا وصول کرے ۔شمار کیا جاتا ہے تو بنی قیس کے بیس یا چالیس آدمی زیادہ ہلاک ملتے ہیں اب قریش کے پاس رقم نہیں ہے کہ اتنے آدمیوں کا خون بہا ادا کر سکتے ۔قریش کے سردار حرب نے کہا میں اپنے بیٹے ابوسفیان کو بنی قیس کے پاس رہن رکھتا ہوں اور کہا ''جب ہم تمہارا تاوان ادا کر دیں گے اس وقت اپنے بیٹے کو چھڑا لیں گے ۔اس جنگ کا پس منظر بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اس جنگ میں شرکت فرمائی یا نہیں ۔شرکت تو کی لیکن کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ہاتھ اس لیے نہیں اٹھایا' باقاعدہ جنگ میں حصہ نہیں لیا کیوں کہ اول تو یہ کہ دونوں فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اللہ پاک نے دیا کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ دوم: یہ لڑائی ایام الحرام میں ہوئی ۔اس لڑائی کو فجار اس لیے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں لڑی گئی جن میں جنگ کرنا جائز نہیں تھا۔'' امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود جنگ میں حصہ نہیں لیا' وہ لکھتے ہیں' اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی، حالاں کہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے ۔اس کی وجہ یہ تھی کہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی ۔نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اللہ نے اس لیے دیا کہ اللہ کا بول بالا ہو (ش ۔۱۱۹) اس موقع پر آپ کی عمر دس سال یا بیس سال تھی؟ ہیکل کہتا ہے کہ میرے خیال میں پندرہ اور بیس برس میں تطبیق ایسے ہو سکتی ہے کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو آپؐ دس سال کے تھے، جب جنگ چار سال بعد ختم ہوئی تو آپ کی عمر چودہ سال تھی ۔بلوغت کی کمی کی وجہ سے جنگ میں اولاً حصہ نہ لیا، صرف تیر جمع کر کے اپنے بزرگوں کے حوالے کر دیتے تھے مگر جنگ کے آخری سال میں جو تقریباً چار سال مسلسل جاری رہی، پختہ عمر کو پہنچنے کے سبب خود بھی لڑائی میں حصہ لینے لگے جیسا کہ حرب الفجار کے تذکرہ میں آپؐ نے فرمایا: ''میں خود بھی اپنے عم ہائے بزرگوار کے ساتھ حرب الفجار میں

شامل تھا اور اپنے ہاتھوں سے دشمنوں پر تیر برسائے اور مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔(حیات محمد۔۱۱۳)

جزیرہ نمائے عرب میں کوئی منظّم حکومت نہ تھی نہ وہاں باقاعدہ عدالتیں تھیں تاکہ مظلوم کی دادرسی کے لیے ان کا دروازہ کھٹکھٹا سکے۔سارا عرب معاشرہ قبائلی نظام میں جکڑا ہوا تھا ہر وقت بدامنی اور انتشار اور جنگ وجدل کی کالی آندھیاں چل رہی تھیں کہ تھمنے کا نام تک نہ لیتی تھیں لوگ جنگ فجار کی تباہ کاریوں سے نڈھال اور بے حال ہو چکے تھے۔ بیرون علاقہ سے آنے والے مسافر بھی اس افراتفری اور بربریت سے محفوظ نہ تھے وہ بچارے دن دہاڑے لوٹ لیے جاتے تھے۔قبیلہ قین کا ایک مشہور شاعر حنظلہ اگرچہ ایک ذی مرتبہ قریشی عبداللہ بن جدعان کی پناہ میں آیا اور پناہ لینے کے باوجود سر بازار لٹ گیا۔اس صورت حال سے مکہ کے وہ باشندے جن کو اللہ تعالیٰ نے دردمند دل عطا کیا تھا بہت پریشان تھے۔انہیں ہرگز یہ پسند نہیں تھا کہ مکہ کا کوئی رئیس بے یارو مددگار مسافر اور تاجر پر ظلم کرے اور وہ لاچار ہو کر تماشائی بنے رہیں۔اسی اثناء میں ایک واقعہ پیش آتا ہے جو تجدیدی حلف الفضول کے معرض وجود میں آنے کا باعث بنتا ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ زبید (یمن) کا ایک تاجر اپنا تجارتی سامان لیے مکہ مکرمہ آیا۔مکہ کے رئیس عاص بن وائل نامی نے اس تاجر سے سامان خریدا لیکن اس کی قیمت چکانے سے صاف مکر گیا۔ وہ اجنبی تھا اس کی یہاں نہ جان نہ پہچان تھی اس نے عاص بن وائل کے دوست قبائل عبدالدار، مخزوم، جمح، سہم اور عدی بن کعب سے شکایت کی، بجائے اس کے کہ وہ اس کی مدد کرتے الٹا تاجر کو ڈانٹ پلائی اس کے بعد تاجر نے یہ کام کیا کہ طلوع آفتاب کے بعد جب قریش حرم کعبہ میں حسب معمول اپنی محافل جمائے بیٹھے تھے وہ جبل ابوقبیس پر چڑھ گیا اور بلند آواز سے پکار کی ”اے فھر کی اولاد اس مظلوم کی فریاد سنو! جس کا مال ومتاع مکہ شہر میں لٹ گیا ہے وہ غریب الدیار ہے، اپنے وطن سے دور، اپنے مددگاروں سے دور“

”وہ ابھی احرام کی حالت میں ہے اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اس لیے ابھی عمرہ بھی ادا نہیں کیا، اے مکہ والو! میری فریاد سنو، مجھ پر حطیم اور حجراسود کے درمیان ظلم کیا گیا ہے“۔

”عزت وحرمت تو اس کے لیے ہے جس کی شرافت کامل ہو، جو فاجر اور دھوکہ باز ہو اس کے لباس کی کوئی حرمت نہیں۔“ حرم میں موجود قریشیوں نے یہ آواز سنی مگر کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مدد کرتا سوائے حضرت زبیر بن عبدالمطلب کے۔جنہوں نے اس بے یارو مددگار تاجر کی فریاد پر لبیک کہا، اٹھ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا ”اس فریاد کو نظر انداز کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔“ پس بنی ہاشم، بنی زہرہ بنی تیم بن مرہ وغیرہ قبائل عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے ان سب نے معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ حضرت زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک سے عمل میں آیا اور انہی کی نگرانی میں یہ معاہدہ لکھا گیا۔اس معاہدہ کا حلف اٹھاتے ہوئے کہا ”خدا کی قسم! ہم سب ایک ہاتھ بن جائیں گے اور ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کریں گے یہاں تک کہ ظالم مظلوم

کو اس کا حق ادا کر دے اور ہم اس عہد پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔'' اور ہم اس عہد پر پابند رہیں گے جب تک سمندر' صوف (اون) کو تر کرتا ہے اور جب تک حراء اور ثبیر کے پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے اور معاش میں ہم ایک دوسرے کی ہمدردی کریں گے اس معاہدہ کی دفعات یہ تھیں۔

(۱) ہم ایک دوسرے کی حق تلفی نہیں کریں گے۔

(۲) ہم قوی سے ضعیف اور مقیم سے مسافر کا حق دلوایا کریں گے۔

(۳) ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کریں گے۔

جب معاہدہ کی تحریر مکمل ہو گئی ہر شخص نے اپنی شہادت باری باری ثبت کر دی تو زبیر بن عبدالمطلب بولے'' آپ کو مبارک ہو' آپ نے اپنے دادا ابراہیمؑ کے دین کو دوبارہ دوام بخشا ہے اسے نئی زندگی دی ہے' یہ کام پورا ہو چکا ہے آؤ اب عاص بن وائل کی خبر لیں اور اس سے مظلوم کا حق دلوائیں۔'' عبداللہ بن جدعان بولے! ٹھہرو! ابھی نہیں ابھی یہ کام نامکمل ہے حضرت زبیر نے حیرت سے پوچھا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ کام مکمل ہو چکا ہے مگر آپ کہہ رہے ہیں کہ ابھی نامکمل ہے' ہم کچھ سمجھے نہیں؟ عبداللہ بن جدعان نے مسکرا کر حضرت زبیر کی طرف دیکھا کہ ایک شخص کی شہادت ابھی باقی ہے جو معتبر شخص ہے' اس کی شہادت کے بعد معاہدہ مکمل ہو گا' وہ شخص جو ہم میں سے سب سے زیادہ امن پسند' غریبوں کا ہمدرد' صلح جو اور وعدہ وفا ہے اس کی شہادت کے بغیر معاہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ شخص ہے محمد ﷺ۔ ان کی شمولیت سے یہ معاہدہ سند کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ آپ ﷺ کو بلایا گیا اور سب کچھ بیان کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا'' میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی کہ مجھے صلح اور امن کے لیے یاد کیا جائے' میں دل و جان سے حاضر ہوں''۔ اب معاہدہ مکمل ہوا تو یہ افراد عاص بن وائل کے گھر گئے اور اسے تاجر کے سامان کی رقم ادا کرنے کو کہا۔ عاص بن وائل موقعہ کی نزاکت کو بھانپ گیا کہ اب بہانہ نہیں چلے گا وہ خاموش اپنے گھر گیا اور رقم لا کر عبداللہ جدعان کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے زبیر بن عبدالمطلب کے حوالے کی جنہوں نے زبیدی تاجر کا حق اسے ادا کر دیا اور سب خاموشی سے واپس چلے گئے۔

قابل غور: بعض کہتے ہیں کہ معاہدہ حلف الفضول کئی بار ہوا ہے' کئی بار کا تعین واقعات مختلفہ کی بنیاد پر کرتے ہیں ان واقعات کو گڈ مڈ کر دیا گیا ہے ان واقعات کے التباس سے معاہدہ کے کئی بار وقوع پذیر ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ درج ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

واقعہ دوم: پیچھے ایک واقعہ کا ذکر ہوا جو معاہدہ حلف الفضول دوم کا باعث بنا۔ اب دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک جنوبی علاقہ کا بدو فریضہ حج ادا کرنے مکہ مکرمہ آیا اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی جو بڑی

خوبصورت تھی ۔ مکہ کے دولت مند تاجر نبیہ بن الحجاج نے اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا باپ کو کچھ سجھائی نہ دیا آخر کار اس نے سوچا کہ اپنے قبیلے کے پاس واپس جائے اور انہیں اپنی داستان غم سنائے اور ان سے مدد کی درخواست کرے لیکن پھر اسے یاد آیا کہ اس کے قبیلہ کے مردوں کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ مکہ کے دس قریشی قبائل کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ اسی پریشانی کے عالم میں سرگرداں تھا کہ جناب محمد ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی ۔آپ ﷺ نے قریش کے نوجوانوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں کہا کہ قریشی نے ایک اجنبی سے زیادتی کی ہے جو نہایت نازیبا حرکت ہے ۔اس پر ہم خاموش تماشائی نہ بنے رہیں چنانچہ قریشی نوجوان کعبہ شریف میں اکھٹے ہوئے اور سب نے حلف اٹھایا۔ حلف کے الفاظ یہ تھے ’’ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم مظلوم کی مدد کریں گے یہاں تک کہ ظالم سے وہ اپنا حق واپس لے لے اور ہم قسم اٹھاتے ہیں کہ اس حلف سے اس کے بغیر ہمارا کوئی اور مقصد نہیں ہوگا‘ ہم اس بات کی پروانہیں کریں گے کہ مظلوم غنی ہے یا فقیر۔‘‘ جب انہوں نے قسم اٹھائی تھی تو آپ ﷺ ان کے ساتھ تھے‘ نوجوانوں نے حجر اسود کو دھویا اور اس کا دھوون پیا‘ اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنی قسم پر پختہ رہیں گے۔اس کے بعد آپ ﷺ نوجوانوں کے ہمراہ اس ظالم تاجر کے پاس گئے اس کے مکان کا محاصرہ کرلیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس لڑکی کو عزت و آبرو کے ساتھ واپس کر دے ۔تاجر نے نہایت غلیظ اور بے غیرتی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ ایک رات مجھے مہلت دے دو‘ میں صبح لڑکی اس کے باپ کو لوٹا دوں گا لیکن نوجوانوں نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور اسے مجبور کیا کہ ابھی لڑکی واپس کرو بادل نخواستہ اس نے لڑکی واپس کردی۔

امام السہیلی کا بیان ہے کہ خشعم خاندان کا اک فرد عمرہ یا حج کرنے اپنی بیٹی ’’قتول‘‘ کے ہمرہ جو دنیائے عرب کی حسین ترین عورت تھی‘ مکہ آیا۔نبیہ بن الحجاج نامی مکہ کے ایک باشندہ نے اس لڑکی کو اغوا کرلیا، اس کا باپ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔آخر اس نے اِس شخص کے خلاف دہائی دی۔لوگوں نے اس سے کہا کہ وہ حلف الفضول والوں سے جا کر فریاد کرے۔ چنانچہ وہ کعبہ کے پاس آ کے پکارا؛ اے حلف الفضول والو! مدد! وہ تلواریں بے نیام کیے چلے آئے۔انھوں نے کہا محافظ تیرے پاس آ گئے ہیں‘ بتاؤ کیا بات ہے؟ اس نے کہا نبیہ بن الحجاج نے میری بیٹی مجھ سے زبردستی چھین لی ہے۔

مجھے بیٹی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا ہے۔وہ اس کے ساتھ نبیہ کے دروازے پر گئے۔دستک دی۔وہ باہر آیا۔حلف الفضول اراکین نے کہا: لڑکی نکالو! تم تباہ ہو جاؤ گے۔تم یقیناً جانتے ہو کہ ہم کون ہیں؟ اور ہم نے قسم کھائی ہے۔اس نے جواب دیا‘ میں ایسا ہی کروں گا لیکن مجھے ایک رات اس کے ساتھ گزارنے دو۔انھوں نے کہا: خدا کی قسم! ہم تجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔پس وہ لڑکی لے آیا اور ان کے حوالے کردی۔اس واقعہ کو رومانیہ کا وزیر کونستانس جیور جیو یوں نقل کرتا ہے ’’اس واقعہ کا علم جب

سرکارِ دو عالم ﷺ کو ہوا' آپ نے قریش کے دس نو جوانوں کو اپنے پاس بلایا اور انھیں فرمایا کہ قریشی نے تاجر کے ساتھ نازیبا حرکت کی ہے' اس پر ہمیں خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ قریش کے نو جوان کعبہ شریف کے پاس جمع ہوئے اور سب نے یہ حلف اٹھایا'' ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم مظلوم کی مدد کریں گے یہاں تک کہ ظالم سے وہ اپنا حق واپس لے لے اور ہم قسم اٹھاتے ہیں کہ اس حلف سے اس کے بغیر ہمارا کوئی اور مقصد نہیں ہوگا۔ ہم اس بات کی پرواہ نہیں کریں گے کہ مظلوم غنی ہے یا فقیر'' لہٰذا مسلّح دستہ نے تاجر کی مدد کی اور اس کا حق واپس دلا کے رہے۔ یہی مصنف لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی ہے کہ ایک پردیسی تاجر مکہ مکرمہ آئے' ابوجہل نے اس سے کچھ سامان خریدا لیکن اس کی قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیا اس پردیسی تاجر کو نو جوانوں کے اس جتھے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ وہ فریاد کناں اپنے قبیلے کے پاس آیا' انہیں برانگیختہ کیا کہ وہ اس کی مدد کریں لیکن ایک محدود افراد پر مشتمل قبیلہ قریش کے دس قبیلوں سے کیسے ٹکر لے سکتا تھا؟ انہوں نے معذرت کر لی، وہ تاجر پھر مکہ لوٹ آیا۔ حضور ﷺ کو ابوجہل کی اس حرکت کا علم ہوا تو آپ ﷺ بنفس نفیس ابوجہل کے گھر تشریف لے گئے اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس سامان کی قیمت تاجر کو ادا کر دے۔ مرتا کیا نہ کرتا چنانچہ بادل نخواستہ اسے قیمت ادا کرنا پڑی۔

۴۔ مکی دور کا واقعہ ہے کہ ابوجہل قبیلہ اراش کے ایک شخص سے کچھ اونٹ خرید لیتا ہے اور طے شدہ رقم کی ادائیگی سے صاف مکر جاتا ہے۔ وہ شخص مسجد حرام میں قریش کے سرداروں کے سامنے اپنے پر ہونے والے ظلم کی فریاد کرتا ہے کہ ابوالحکم (ابوجہل) نے مجھ بے نوا، اور پردیسی کا حق مار لیا ہے حاضرین میں سے کوئی شخص بھی ابوجہل سے بات کرنے کو تیار نہ تھا بلکہ اپنے سے بار اتارنے اور آپ ﷺ کا تمسخر اڑانے کی خاطر حرم شریف کے ایک کونے میں بیٹھے شخص محمد ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ تمہارا حق دلوا سکتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ قریش نے تو بات ازراہ مذاق کی تھی کہ وہ حق دلوا سکتے ہیں لیکن یہ بات بھی مبنی برحقیقت ہے کہ آپ ﷺ حق دلوا سکتے ہیں۔ آپ ﷺ حق نہ دلوائیں گے تو اور کون دلوا سکتا ہے؟ اس تاجر کی درخواست پر آپ ﷺ فوراً اس کے ساتھ ابوجہل کے گھر تشریف لے گئے دستک دی' آواز آئی کون؟ آپ ﷺ نے پورے وقار کے ساتھ جواب دیا'' میں محمد ﷺ ہوں''۔۔۔۔ باہر آؤ اس آواز میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ وہ سنتے ہی باہر آ جاتا ہے آپ ﷺ کو دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا آپ ﷺ ابوجہل سے فرماتے ہیں'' اس آراشی کا حق ادا کر دو'' وہ بلا تاخیر اور لیت ولعل کیے بغیر گھر لوٹتا ہے اور اس اجنبی کے واجبات ادا کر دیتا ہے۔ ابوجہل کے ساتھیوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے کہا ہمیں تم سے اس بزدلانہ حرکت کی امید نہ تھی۔ وہ اپنی بے بسی پر کہتا ہے' میں تو ان کی آواز سن کر خوف زدہ ہو گیا تھا پھر جب باہر آتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایک خوفناک اونٹ جبڑے کھولے کھڑا ہے اب بھلا

میں یہ مطالبہ پورا نہ کرتا تو کیا کرتا۔(محمد رسول اللہ۔ پروفیسر اکرم طاہر۔۱۴۰۔۱۴۱) کہیں پانی پینے پلانے پر جھگڑا۔ کہیں گھوڑا آگے دوڑانے پہ جھگڑا، یعنی معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا ہوتا' پھر بعض جھگڑے اتنا طول کھینچتے کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتے تھے۔ برس ہابرس یہ سلسلہ جاری رہتا۔ان لڑائیوں کے مسلسل سلسلے نے سینکڑوں گھرانوں کو تباہ کردیا تھا۔قتل وغارت ان کا مشغلہ بن چکا تھا۔اخلاق نام کی کوئی شے نہ بچی تھی۔ایسے حالات میں بعض لوگوں میں قتل وغارت سے نجات اور اصلاح عامہ کی تحریک پیدا ہوئی۔ جنگ فجار سے لوگ پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ کے چچا اور خاندان کے سردار تھے' نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا' کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ زبردست کو زیردست پر ظلم کرنے سے روکا جائے گا۔ جس پر ظلم ہوگا اس کی حمایت کریں گے۔ مسافروں کی حفاظت اور ملک سے بدامنی کو دور کیا جائے گا۔ چنانچہ خاندان ہاشم' زہرہ اور تیم' عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا جو حلف الفضول کے نام سے موسوم ہے۔اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لیے کہا جاتا ہے کہ اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا ان کے نام میں لفظ ''فضیلت'' کا مادہ داخل تھا۔مثلاً فضیل بن حرث' فضیل بن واعہ اور مفضل وغیرہ۔ یہ لوگ جرہم اور قطورا قبیلہ کے تھے۔ اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا اور ہر کوئی اسے بھول گیا البتہ بانی اول کو نیک نیتی کا پھل یہ ملا کہ ان کے ناموں کی یادگار باقی ہے، چنانچہ قریش نے ازسرِ نو بنیاد ڈال دی جسے حلف الفضول دوم کہتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۸۶

بعض کہتے ہیں کہ معاہدہ کے قدیم اور جدید معاہدے کئی بار ہوئے ہیں یعنی حلف کے دوبار وجود میں آنے پر تو سبھی سیرت نگاروں اور مورخین نے اتفاق کیا ہے تاہم ناچیز (پروفیسر محمد طفیل) کی رائے میں حلف الفضول کا بیڑا بار بار اٹھایا گیا ہوگا جن میں تین اوقات بالکل واضح ہیں۔

(۱) رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے اور اس وقت اس کا محرک عرب کا اہم قبیلہ بنو جرہم تھا جن کے بانیان اور موسیسین فضل کے نام سے موسوم تھے اور یہ معاہدہ انہی ناموں کی نسبت اور جمع کے اعتبار سے حلف الفضول کہلاتا ہے۔

(۲) دوسری بار اس معاہدہ کی اس وقت تجدید کی گئی جب دیہاتی لڑکی کا اغواء ہوا اور اس کی تجدید وتدوین میں بہت سے مکہ کے قبائل نے شرکت کی تھی۔ یہ معاہدہ عبداللہ بن جُدعان کے گھر پر طے ہوا تھا جس میں خاتم الانبیاء ﷺ نے بنفس نفیس شرکت کی تھی جس کا ذکر احادیث نبویہ میں بھی ملتا ہے اور اس کے مقاصد بھی وہی ہیں جو پہلے معاہدوں میں متعین ہوئے تھے۔

(۳) تیسری بار حلف الفضول کا معاہدہ بعثت نبوی کے بعد عمل میں آیا۔۔۔جیسا کہ اس واقعے

سے عیاں ہوتا ہے کہ ایک غیر ملکی تاجر اپنا سامان تجارت لیے مکہ مکرمہ آیا۔ قریشی سردار ابو جہل نے اس تاجر سے کچھ سامان تجارت خریدا لیکن اپنی سرداری کے گھمنڈ میں خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیا' اس غیر ملکی اور اجنبی تاجر کو حلف الفضول کے رضا کاروں اور خدائی خدمت گاروں کا علم نہ تھا۔ وہ اپنے وطن واپس جا کر اپنے قبیلہ سے فریاد کناں ہوا کہ اس بارے میں اس کی مدد کی جائے لیکن محدود افراد پر مشتمل اس کا قبیلہ مکہ کے دس مضبوط اور طاقت ور قبائل سے ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ تاجر واپس آیا تا کہ وہ کسی تدبیر سے مکہ کے رئیس سے اپنا مال تجارت کی قیمت وصول کر سکے جب محسن انسانیت کو خبر ہوئی تو حلف الفضول نوجوان رضا کاروں کے ساتھ ابو جہل کے گھر تشریف لے گئے۔ اس سے اجنبی مسافر تاجر کے سامان کی قیمت ادا کرنے یا سامان لوٹانے کا مطالبہ کیا۔ حضور ﷺ کی ہیبت سے ابو جہل اس قدر مبہوت ہوا کہ اس تاجر کے مال کی قیمت ادا کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا چنانچہ اس نے خریدے ہوئے مال کی فوری طور پر قیمت تاجر کو ادا کر دی یقیناً یہ معجزہ تھا جو عرب معاشرہ میں وقوع پذیر ہوا۔

جواب: ابو جہل اور تاجر سے منسوب تین واقعات ملتے ہیں ایک رومانیہ کے وزیر جیورجیو نے اپنی سیرت کی کتاب میں لکھا ہے دوسرا واقعہ البدایہ والنہایہ کے حوالے سے پروفیسر اکرم طاہر نے (محمد رسول اللہ۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱) لکھا ہے اور تیسرا واقعہ پروفیسر محمد طفیل نے (ماہنامہ ضیاے حرم۔ ۲۵۔ ۲۶) لکھا ہے لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

پہلے دونوں واقعات جو ابو جہل اور تاجر کے حوالے سے ہیں بظاہر دو معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں وہ ایک ہی واقعہ ہے فرق صرف ہے تو اختصار اور تفصیل کا ہے۔ ان ہر دو واقعات میں ایک ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ آپ ﷺ مسلح نوجوانوں کے دستہ کو لے کر ابو جہل کے گھر تشریف لے گئے دوسرے واقعے کے یہ الفاظ ہیں ''اس (تاجر) کی درخواست پر آپ ﷺ فوراً ابو جہل کے گھر تاجر کے ساتھ گئے۔۔۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ رضا کاروں کے مسلح دستے کے بغیر ابو جہل کے گھر تشریف لے گئے۔

۴۔ تاجر قریشی سرداروں سے کہتا ہے کہ ابو جہل نے مجھ سے مال لے لیا ہے اور میری قیمت ادا کرنے سے صاف مکر گیا ہے' میری مدد کیجئے! ان میں ہمت نہ تھی کہ تاجر کی دادرسی کے لیے ابو جہل سے بات کرتے بلکہ انہوں نے اپنی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے راہ نکالی نیز آپ ﷺ کو اذیت دینے کی ترکیب سوجھی۔ وہ تاجر سے کہتے ہیں کہ وہ شخص جو کعبہ کے کونے میں بیٹھا ہے اسے کہیے کہ میرا حق دلوا دیں وہ حق دلوا سکتا ہے انہوں نے تو ازراہ مذاق یہ بات کہی تھی لیکن حقیقت میں یہ درست ہے کہ آپ ﷺ حق دلوا سکتے ہیں اگر آپ ﷺ حق نہیں دلوائیں گے تو اور کون دلوا سکتا ہے؟ اگر قریشی سرداروں کو

تجدیدی معاہدہ حلف الفضول کا علم ہوتا تو وہ تاجر سے کہتے کہ حلف الفضول والوں کو بلاؤ' وہ تیری مدد کریں گے ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت حلف الفضول کا وجود نہ تھا اگر انہوں نے جان بوجھ کر اس بات کو اخفاء میں رکھا کہ حضور ﷺ کو دکھ پہنچائیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرداروں نے تو یہ بات صیغہ راز میں رکھی لیکن آپ ﷺ کو تو معاہدہ کا علم تھا کیونکہ اس معاہدہ میں شرکت کر چکے تھے اس کے باوجود آپ ﷺ اس مسلح دستے کو اپنے ساتھ لیے بغیر ابوجہل کے گھر تاجر کے ہمرہ تشریف لے جاتے ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس واقعے سے پہلے حلف الفضول کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ فرض کریں اگر یہ مان لیں کہ معاہدہ ہوا تھا اور آپ ﷺ نے مسلح دستے کو اپنے ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا ہو تو پھر بھی ہر دو صورتوں میں یہ دونوں واقعات تجدیدی معاہدہ حلف الفضول کے وقوع پذیر ہونے کا باعث نہیں بنتے ہیں۔

۳۔ جہاں تک واقعہ چہارم کا تعلق ہے اس میں آپ ﷺ قریشی نوجوانوں کو بلاتے ہیں کہ ایک مکی تاجر دولت مند نے ایک دیہاتی کی لڑکی اغوا کر لی ہے ہم خاموش تماشائی نہ بنے رہیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ پس نوجوانوں نے کعبہ میں حاضر ہو کر حلف اٹھایا ''ہم قسم اٹھاتے ہیں کہ ہم مظلوم کی مدد کریں گے یہاں تک کہ ظالم سے وہ اپنا حق واپس لے لے اور ہم قسم کھاتے ہیں کہ اس حلف سے اس کے بغیر کوئی اور مقصد نہیں ہوگا' ہم اس بات کی پروا نہیں کریں گے کہ مظلوم غنی ہے یا فقیر۔'' پھر ان نوجوانوں نے حجر اسود کو دھویا اور اس کا دھوون پی لیا' یہ عمل ان کی معاہدہ سے وفاداری اور پختگی کا اظہار تھا۔ بقول پروفیسر محمد طفیل ''جو افراد بھی حلف الفضول کا عہد کر کے اس تنظیم کا حصہ بنتے وہ اپنی رضامندی کی مضبوطی اور عہد کی بجا آوری کے لیے یہ عمل کرتے تھے اور حلف الفضول کی قسم اٹھانے کے بعد وہ بیت اللہ میں حاضر ہوتے۔ وہاں حجر اسود کو آب زم زم سے دھوتے اور پھر اس دھوون کو پی لیتے۔'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تجدیدی معاہدہ حلف الفضول پہلے سے وجود میں آ چکا تھا بعد میں اس معاہدہ میں شمولیت کے لیے حلف اٹھایا جاتا تھا' یہ معاہدہ کا ممبر یا رکن بننے کے لیے ایک قسم کی کاروائی تھی معاہدہ کا ڈول نہیں ڈالا گیا تھا۔

کرم شاہ صاحب بھیروی (ضیا النبی۔۱۲۵۔۱۲۶) لکھتے ہیں جب حضور ﷺ نے اس (معاہدہ) میں سرگرم حصہ لیا اور حضور ﷺ کی ترغیب پر قریشی نوجوانوں کا ایک ایسا مسلح جتھہ تیار ہو گیا جو اس معاہدہ کے تحت کیے گئے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر وقت سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ یعنی معاہدہ موجود تھا اور رونما ہونے والے واقعات کے متعلق یہ دستے کی کاروائیاں تھیں۔ قریشی نوجوان خانہ کعبہ میں حلف اٹھاتے' نئے سرے سے معاہدہ کی داغ بیل نہیں ڈالتے جیسے آجکل بھی حکومتی عہدے داران اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے حلف اٹھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ججز' صدور' وزیر اعظم' نیشنل اور قومی اسمبلیوں کے اراکین اور سینٹ کے ممبران حلف اٹھاتے ہیں اور اقرار

کرتے ہیں کہ اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کریں گے ملک وقوم کی فلاح کے لیے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاکر مضبوط اور مستحکم بنائیں گے۔اس حلف نامے کا مضمون اور تحریر پہلے ہی چند اہل علم نے تیار کی ہوتی ہے تمام ممبران یا عہدے داران نے تیار نہیں کی ہوتی ممبران تو صرف حلف اٹھاتے ہیں وہ یوں کہ ممبران صرف حلف لینے والے شخص کے ساتھ اس حلف کی تحریر کو دہراتے ہیں یہی حلف کی صورت مذکورہ واقعات میں بھی ہے۔قریشی مسلح نوجوانوں نے حلف اٹھایا تھا نہ کہ وہ تجدیدی معاہدہ کو عمل میں لائے تھے۔

معاہدہ اور کارروائی میں فرق ہے' معاہدہ فریقین کے درمیان کسی مسئلہ پر اتفاق کرنے کو کہتے ہیں اور کارروائی معاہدہ طے پا جانے کے بعد طے شدہ امور من وعن خود عمل کرنا اور دوسروں سے عمل کروانے کا نام ہے۔معاہدہ کی ایک کارروائی ملاحظہ کیجئے اس سے ساری بات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

امام السہیلی کا بیان ہے کہ خثعم خاندان کا ایک فرد عمرہ یا حج کرنے اپنی بیٹی ''قتول'' کے ہمراہ جو دنیائے عرب کی حسین ترین عورت تھی' مکہ آیا۔نبیہ بن الحجاج نامی مکہ کے ایک باشندہ نے اس لڑکی کو اغوا کرلیا۔اس کا باپ بے چارہ بہت پریشان تھا آخر اس نے اس شخص کے خلاف دہائی دی لوگوں نے اس سے کہا کہ وہ حلف الفضول والوں سے جا کر فریاد کریں چنانچہ وہ کعبہ کے پاس آ کر پکارا: اے حلف الفضول والو! مدد! وہ تلواریں بے نیام کیے چلے آئے انہوں نے کہا محافظ تیرے پاس آ گئے ہیں' بتاؤ کیا بات ہے؟ اس نے کہا نبیہ بن الحجاج نے میری بیٹی مجھ سے چھین لی ہے۔مجھے بیٹی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ اس کے ساتھ نبیہ کے گھر گئے' دستک دی' وہ باہر آئے حلف الفضول والوں نے کہا: تم تباہ ہو جاؤ گے' تم یقیناً جانتے ہو کہ ہم کون لوگ ہیں اور ہم نے قسم کھائی ہے' اس نے جواب دیا میں ایسا ہی کروں گا لیکن مجھے ایک رات اس کے ساتھ گزارنے دو' انہوں نے کہا: خدا کی قسم! ہم تجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے پس وہ لڑکی لے آیا اور ان کے حوالے کر دی یہ معاہدہ کی کارروائی تھی کیونکہ معاہدہ اس سے قبل ہو چکا تھا اس معاہدہ پر عمل کرتے ہوئے یہ اقدام کیا گیا تھا۔

امام السہیلی اور جیور جیو کے واقعہ میں قدرے اختلاف ہے وہ یہ کہ امام السہیلی کے واقعہ میں انجمن حلف الفضول کے اراکین تلواریں سونتے چلے آئے جب کہ جیور جیو کے واقعہ میں اراکین انجمن کا دستہ بلانے پر آتا ہے اور خانہ کعبہ میں حلف اٹھاتا' حجر اسود کا دھوون پی کر دولت مند تاجر کی طرف چل پڑتے ہیں۔اس اختلاف سے قطع نظر یہ حلف الفضول والوں کی کارروائی ہے نہ کہ یہ واقعہ معاہدہ کے وجود میں آنے کا باعث بنا۔

تیسری بار حلف الفضول کا معاہدہ ابوجہل اور تاجر کے معاملہ سے وقوع میں آیا پروفیسر محمد طفیل تیسری بار کے معاہدہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نوجوان رضا کاروں کے ساتھ ابوجہل کے گھر تشریف لے گئے اس سے اجنبی مسافر تاجر کے سامان کی قیمت ادا کرنے کا مطالبہ کیا سرورِ کونین ﷺ کی

ہیبت سے ابو جہل اس قدر مبہوت ہوا کہ اس تاجر کے مال کی قیمت ادا کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا چنانچہ اس نے خریدے ہوئے مال کی قیمت فوری طور پر تاجر کو ادا کر دی۔ یقیناً یہ معجزہ تھا جو عرب معاشرے میں رونما ہوا۔

ڈاکٹر حمید اللہ (پیغمبر اسلام۔۶۵۔۶۶) حلف الفضول کی کاروائی سے متعلق چار واقعات لکھتے ہیں۔

۱۔ پہلا واقعہ حج یا عمرہ ادا کرنے والے اجنبی شخص کی لڑکی کے اغوا سے متعلق ہے۔

۲۔ واقعہ یہ ہے کہ ازد قبیلے کے ایک اجنبی نے ابی بن خلف کے پاس چند چیزیں فروخت کیں، جو مکہ کے بڑے سرداروں میں سے تھا لیکن ابی بن خلف طے شدہ رقم ادا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مایوسی کے عالم میں ازدی نے حلف الفضول والوں سے اپیل کی جنہوں نے اسے کہا ''ابی بن خلف سے جا کر کہو کہ تم حلف الفضول والوں کی طرف سے آئے ہو اور اگر وہ فوری طور پر تمہاری تسلی تشفی نہ کرے تو پھر اسے ہمارا انتظار کرنے دو''۔ اس مرتبہ ابی بن خلف نے رقم ادا کر دی اور کوئی زیادہ دیر نہ لگائی۔ اس واقعہ کو ابن جوزی نے بھی حلف الفضول کے وجود میں آنے کو الوفا میں لکھا ہے۔

۳۔ زبید قبیلہ کا ایک تاجر چند چیزیں بیچنے کے لیے مکہ مکرمہ آیا۔ ابو جہل نے دوسرے تاجروں اور خریداروں کو زبیدی سے مال خریدنے سے منع کر دیا اور خود اس نے ان چیزوں کی زبیدی کو بہت کم قیمت کی پیشکش کی، ابو جہل کا اثر ورسوخ تھا کوئی دوسرا شخص زیادہ قیمت کی پیشکش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مغموم اور ستم رسیدہ تاجر محمد ﷺ کے پاس گیا جنہوں نے اس سے تین اونٹ اس قیمت پر خریدے، جتنی وہ طلب کر رہا تھا اور ابو جہل سے بات کی جس کی بدمزاجی بڑی مشہور تھی۔

۴۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ ﷺ نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے یہ واقعہ ابو جہل اور اراش قبیلے کے ایک تاجر کے درمیان ہوا سامان خرید لیا مگر قیمت ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ آپ ﷺ سے تاجر نے درخواست کی کہ اسے اپنا حق واپس دلا دیں۔ آپ ﷺ اس کے ہمراہ ہو لیے اور ابو جہل کے گھر تشریف لے گئے۔ ابو جہل نے آپ ﷺ کی آمد کی وجہ پوچھی، پھر کیا تھا کہ اس نے فوری طور پر سامان کی قیمت ادا کر دی۔ جتنے واقعات رونما ہوئے سوائے پہلے واقعہ جو عاص بن وائل اور تاجر کے، سب کی سب کارروائیاں تھیں۔ یہ نہیں کہ جتنے واقعات پیش آئے اتنی ہی مرتبہ ان کا سبب احیاء حلف الفضول تھا۔ ہمارے موقف کی تائید ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے وہ کہتے ہیں ''چاہے کچھ بھی ہو مکہ والے حلف الفضول پر بہت فخر کرتے تھے، جس نے طویل عرصے تک بے شمار مواقع پر مداخلت کی۔ اس میں صرف ایک کمی تھی کہ کسی نئے ممبر کو اس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اور یوں چند دہائیوں کے بعد اس کے آخری ممبر کی وفات کے بعد یہ ختم ہو گیا۔ (پیغمبر اسلام۔۶۷)

حلف الفضول کی امتیازی شان

یہ معاہدہ انسانیت کی بھلائی، خیر خواہی اور بنی نوع انسان کو ظلم و بربریت اور ناانصافی کے چنگل سے آزاد کرانے اور امن و سلامتی کو عام کرنے کا نام ہے۔ اس کی امتیازی شان اس کے نام سے عیاں ہے عربی زبان میں معاہدہ کے لیے متعدد اصطلاحات مثلاً عہد' معاہدہ' عقد' حلف' میثاق' بیت اتفاقیہ' اعلامیہ وغیرہ موجود ہیں مگر اس معاہدہ کے لیے حلف کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے یعنی اس میں قسم کا مفہوم بھی شامل ہے کیونکہ قسم کھا کر کسی چیز کو بیان کرنا اس کی پختگی اور مضبوط ارادہ وعزم کا اظہار ہوتا ہے نیز یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جس بات پر قسم اٹھائی جارہی ہے وہ بات پروقار اور ذیشان ہے اور قسم کو اٹھانے والے بھی مکرم و محترم و محتشم ہیں۔ مرتبہ و مقام کے لائق وہی ذات بے ہمتا ہے جو واحدہ لاشریک ہے۔ عہد رسالت میں کفار بتوں کی قسمیں بھی اٹھاتے تھے لیکن گمان غالب ہے کہ حلف الفضول کا ڈول ڈالنے والی تمام سعادت مندروحیں تھیں جو اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتی تھیں اور نیکی و بھلائی کے فروغ کے لیے کوشاں تھیں' برائی کے خاتمے اور بھلائی کو عام کرنے کی توفیق اللہ کی طرف سے تھی اور اسی کی رضا کے لیے یہ معاہدہ عمل میں آیا۔ جبکہ مطیبوں اور احلاف نے اس حلف کو ناپسند کرتے ہوئے اسے حلف الفضول کا نام دیا اور اس عہد کو قوم کے فضول کاموں سے شمار کرنے لگے۔ اگرچہ یہ بات معاہدہ کی روح کے خلاف ہے لیکن مخالف نے یہ بات کہہ دی ہے تو یہ محض اس کی دشمنی کا اظہار ہے۔ (الوفا۔۱۷۵)

۲ دوسری امتیازی شان یہ ہے کہ حلف الفضول انسانیت کی بھلائی اور فلاح کا معاہدہ تو ہے ہی لیکن یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ معاہدوں کے طے پانے میں دو فریق شرکت کرتے ہیں جبکہ اس معاہدہ میں ایک ہی فریق موجود نظر آتا ہے اور دوسرا فریق منظر سے غائب ہے۔ اس کے باوجود دوسرے فریق کا دائرہ بہت وسیع ہے یعنی وہ پوری انسانیت کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ قدیم معاہدہ کی ایک شق یہ تھی جو تجدیدی معاہدہ میں بھی ہے کہ ''ہم قوی کو ضعیف اور مقیم سے مسافر کا حق دلائیں گے کیونکہ ان دونوں معاہدوں کے اغراض و مقاصد ایک ہی تھے یہ مرد عورت' مقیم' مسافر' ملکی وغیر ملکی اور امیر غریب کو محیط تھا گویا یہ پوری انسانیت کے لیے ایک دستور کا درجہ رکھتا ہے۔

۳۔ تیسری امتیازی شان یہ ہے کہ اس معاہدہ میں فریق اول کی بجائے فریق دوم کو فائدہ حاصل ہے۔ فریق دوم جہاں کہیں کا ہو یا کوئی بھی ہو مکہ میں اس پر ظلم نہ ہونے دیا جائے گا۔ اس کی ممکنہ دادرسی کی جائے گی۔ حقوق چھیننے والے افراد کے خلاف کارروائی کی جائے گی اور ان کا حق طاقت ور سے دلا دیا جائے گا۔

۴۔ امتیازی شان یہ ہے کہ یہ معاہدہ خود اختیار کردہ ہے یہ ظلم و زیادتی کے خلاف ایک معاشرتی اور اخلاقی تحریک ہے۔ یہ غیر حکومتی ادراہ ہے کیونکہ وہاں کوئی حکومت قائم نہ تھی جس کی سرپرستی اسے

حاصل ہوتی البتہ قبائل کے افراد کی امداد حاصل تھی۔ یہ آزاد اور رضا کارانہ انجمن ہے اور رفاہی تنظیم ہے جو عرب سماج کے گندے کاموں اور بدترین لڑائیوں کے خلاف تھی اور اچھی روایات کو پھیلانے کے لیے قائم ہوئی تھی۔ لوگوں میں بھلائی کی تڑپ اٹھی تو انہوں نے اس معاہدہ کو برضا و رغبت قبول کیا اور اپنی ذمہ داریوں کو ہر قیمت پر پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا' جس نے قبائلی نظام کی چولیں ہلا دیں بلکہ قبائلی نظام پر کاری ضرب پڑی کہ ان کی مطلق العنانی چراغ سحر ثابت ہوئی۔

۵۔ یہ امتیازی شان ہے کہ آپ ﷺ کی عمر مبارک بیس سال تھی جب یہ معاہدہ طے پایا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے (ترجمہ) جاہلیت میں جو معاہدہ ہوا اسلام نے اس کے استحکام ہی کو بڑھایا ہے۔ (سیرت ابن ہشام۔ا۔۱۵۹)

آپ ﷺ اس معاہدہ سے شاداں و فرحاں تھے۔ اسلام نے اس کے استحکام کو بڑھایا ہے۔ سے اشارہ ملتا ہے کہ اگر کوئی کام عہد جاہلیت میں ہوا اور وہ عمدہ ہے تو اسے اگلے دور میں بھی لاگو ہونا چاہیئے کی توثیق فرمادی بلکہ آپ ﷺ کے عہد بعثت سے پہلے بھی معاہدہ اسی نام سے طے پایا تھا جس میں آپ ﷺ نے شرکت فرمائی تھی۔ حضرت زبیر کی تحریک پر ان کی زیر نگرانی معاہدہ لکھا گیا۔ معاہدہ کا حلف اٹھاتے ہوئے کہا'' خدا کی قسم! ہم سب ایک ہاتھ بن جائیں گے اور ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کریں گے یہاں تک کہ ظالم مظلوم کو اس کا حق ادا کر دیں اور ہم اس عہد پر پابند رہیں گے جب تک سمندر اون کو تر کرتا ہے۔ قدیم معاہدہ کی توثیق فرمادی اور اپنے دور بعثت سے پہلے ہونے والے معاہدہ میں شرکت فرما کر مہر ثبت کر دی کہ آئندہ بھی اس قسم کے معاہدے امن میں لائے جائیں' جس سے معاشرے کا امن بحال ہو اور ایک مثالی معاشرہ قائم ہو سکے۔ زمانہ جاہلیت میں کوئی کام نیکی اور بھلائی کا ہوتا ہے تو اسے اسلام برقرار رکھتا ہے جیسا کہ آپ ﷺ کے مذکورہ فرمان سے ظاہر ہے نیز اسلام محض ان کاموں سے روکتا ہے جن میں شرک اور اسلام کی تعلیمات کے خلاف باتیں ہوں جبکہ دوسری طرف اچھی باتوں کی تائید اور ان کو پھیلانے کی ترغیب دیتا ہے۔

۶۔ اس معاہدہ کی امتیازی شان یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے بنفس نفیس اس میں شرکت فرمائی۔ جب معاہدہ کی تحریر مکمل ہو چکی تھی اور ہر شخص باری باری اپنی شہادت ثبت کیے جا رہا تھا تب حضرت زبیر بن عبدالمطلب بولے'' آپ کو مبارک ہو آپ نے اپنے دادا ابراہیمؑ کے دین کو دوبارہ زندہ کیا۔ اسے ایک نئی زندگی دی ہے' یہ کام پورا ہو چکا ہے۔ آؤ اب عاص بن وائل کی خبر لیں اس سے مظلوم کا حق دلوائیں'' یہ سن کر عبداللہ بن جدعان بولے!

عبداللہ: ٹھہرو ابھی نہیں' ابھی یہ کام نامکمل ہے۔

زبیر: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ہمارے خیال میں تو کام پورا ہو چکا ہے مگر آپ اسے نامکمل کہہ رہے ہیں ہم کچھ سمجھے نہیں۔

عبداللہ: مسکراتے ہوئے حضرت زبیر کی طرف دیکھا پھر کہا ابھی یہ کام مکمل نہیں ہوا کیونکہ ایک شخص کی شہادت باقی ہے ایک معتبر شخص کی' اس کی شہادت کے بعد یہ معاہدہ مکمل ہوگا۔ وہ شخص جو ہم میں سب سے زیادہ امن پسند' غریبوں کا ہمدرد' صلح جو اور وعدہ کا پابند ہے اس کی شہادت کے بغیر یہ معاہدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

زبیر: وہ شخص ہے کون' کچھ ہمیں بھی پتہ چلے۔؟

عبداللہ: تمہارا بھتیجا محمد ﷺ مجھے یقین ہے کہ وہ حلف الفضول میں ضرور شمولیت کریں گے اور ان کے شامل ہونے سے یہ معاہدہ ایک سند کی حیثیت اختیار کرلے گا۔ تم اسے فوراً بلاؤ! آپ ﷺ کو بلایا جاتا ہے عبداللہ کہتے ہیں' محمد ﷺ ہم نے امن وامان برقرار رکھنے کے لیے معاہدہ تحریر کیا ہے اس پر آپ ﷺ کی شہادت درکار ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرط مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا ''میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی کہ مجھے صلح اور امن کے لیے یاد کیا جائے' میں دل وجان سے حاضر ہوں'' اس پر حضرت زبیر نے آپ ﷺ کو تھپکی دی۔ معاہدہ آپ ﷺ کے بغیر کچھ اہمیت وحیثیت نہیں رکھتا، آپ ﷺ کی شرکت نے اسے چار چاند لگا دیئے اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ آپ ﷺ برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کو فروغ دینے والے ہیں۔

اہم نکتہ: جیورجیو لکھتا ہے ''بعثت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حلف الفضول کے منصوبے کی تجویز بڑی اہمیت کی حامل ہے اس جدت سے حضور ﷺ نے لوگوں کے کھوئے ہوئے حقوق واپس دلانے میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس تجویز کے ذریعے سارے قبیلے کو ہدف انتقام بنانے کے نظریہ کا قلع قمع کر دیا''۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حلف الفضول کا آغاز حضرت زبیر بن عبدالمطلب نے کیا۔ صاحب ضیاء النبی لکھتے ہیں کہ ''حلف الفضول کا آغاز حضرت زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک سے ہوا اور اس کے بعد عبداللہ بن جدعان کے گھر چند مشہور قبائل کے سردار جمع ہوئے اور انہوں نے مظلوم کی امداد کرنے کا معاہدہ کیا جو حلف الفضول کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا لیکن اس میں صحیح قوت اور جان اس وقت پیدا ہوئی جب حضور ﷺ نے اس میں سرگرم حصہ لیا اور حضور ﷺ کی ترغیب پر قریشی نوجوانوں کا ایک ایسا مسلح جتھا تیار ہو گیا جو اس معاہدہ کے تحت کیے گئے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر وقت سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار رہتا تھا اور مکہ کے بڑے بڑے سرداروں اور سرمایہ داروں کی مجال نہ تھی کہ ان

کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے' اسی لیے یورپین مورخ نے اس معاہدہ کے نظریہ کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اس معاہدہ کا آغاز حضرت زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر ہوا وہ اس طرح کہ جب ایک تاجر مکہ سردار عاص بن وائل کے ہاتھوں لٹتا ہے تو حضرت زبیر سے اس کی پکار سن کر یارائے ضبط نہ رہا' اٹھ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا ''مالھذا مترک'' یعنی اب اس فریاد کو نظر انداز کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ پھر جب مکی سردار سے اس کا مال واپس دلوایا تو اس موقع پر حضرت زبیر نے مسرت کا اظہار یوں کیا ''یہ معاہدہ کرنے والوں نے قسم اٹھائی ہے کہ سرزمین مکہ میں کوئی ظالم نہیں ٹھہر سکے گا''۔

''یہ ایسی بات ہے جس پر ان سب نے متفقہ معاہدہ کیا ہے کہ پردیسی اور فقیر جوان کے ہاں ہوگا' ہر قسم کے جور وستم سے محفوظ ہوگا''۔

آپ ﷺ نے بعثت سے پہلے حلف الفضول منصوبے کی تجویز نہیں دی بلکہ اس تجدیدی معاہدہ کا آغاز آپ ﷺ کے چچا حضرت زبیر کی تحریک سے ہوا اور یہ معاہدہ عبداللہ بن جدعان کے گھر طے پایا تھا' جس میں آپ ﷺ نے شرکت فرمائی تھی۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر بیس سال تھی آپ ﷺ نے اس معاہدہ کو فعال کرنے میں از حد کوشش کی۔ بدامنی لوٹ مار اور جور وستم کا گرم بازار سرد پڑ گیا یہاں تک کہ طاقت ور سے طاقت ور سردار کو ان کے فیصلے چیلنج کرنے کی ہمت نہ رہی

(السیرت النبویہ۔ ۱۲۹) علامہ دحلانی لکھتے ہیں ''وہ ہستی جس نے سب سے پہلے اس معاہدہ کی دعوت دی وہ زبیر بن عبدالمطلب تھے۔ اسی طرح شبلی نعمانی (۱۔۱۲۰) لکھتے ہیں ''جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو حضرت زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے اور خاندان کے سرگروہ تھے یہ تجویز پیش کی''۔

ہیکل (حیات محمد) لکھتے ہیں' ''ایک دن حضرت زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر تمام قریش جمع ہوئے۔۔۔۔اس عہد میں نبی مکرم ﷺ بھی شامل تھے۔''

حضرت زبیر کی حلف الفضول کی تحریک کے سوا اس تحریک کو سرور عالم سے منسوب کرتے ہیں' ماخذ کے خلاف ہے اور اس کی تفصیل معاہدہ کی امتیازی شان نمبر ۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

عصریات

آپ ﷺ کا فرمان عالی شان ہے ''اس معاہدہ یعنی حلف الفضول کے بدلے میں اگر مجھے کوئی سرخ اونٹ دے' تب بھی میں لینے کو تیار نہیں اور اس قسم کے معاہدے کی دعوت اسلام میں بھی اگر کوئی مجھے دے تو میں اسے قبول کروں گا۔'' اس ارشاد گرامی سے اشارہ ملتا ہے کہ معاہدہ سرخ اونٹوں سے بھی

بہتر اور قیمتی ہے (آجکل جن کی قیمت کئی بلین روپے ہوسکتی ہے) اور انسانی فلاح و بہبود اور کمزور و ناتواں افراد کے لیے عدل و انصاف فراہم کرنے کو ترجیح دی اور ان تمام مال و دولت کی پیشکشوں اور منفعتوں کا قلع قمع کر دیا جو بھلائی کی راہ میں سد راہ بنتی ہیں۔ یکسر ذاتی اغراض کو نظر انداز اور تج کر کے انسانیت کی بھلائی کا بیڑا اٹھانے کی ترغیب و تعلیم دی۔ آج ہمیں بھی ان تمام رکاوٹوں اور حائل مشکلات کا سامنا کر کے ایسے معاہدوں کو عمل میں لانا چاہیے۔ بغیر کسی غرض کے برضا و رغبت ایسی رفاہی تنظیموں' انجیوز اور اداروں کے قیام کی کوششیں بروئے کار لائیں۔ اور ذی شعور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر کے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالیں۔

ہر کام کے آغاز میں دقتیں اور قباحتیں پیش آتی ہیں لیکن ارادے مضبوط ہوں اور قلب سلیم خیر خواہی کے جذبات سے معمور ہو اور نیتیں صاف ہوں تو یقیناً آہستہ آہستہ تمام مشکلیں راہ سے ہٹتی جاتی ہیں اور ایک مثالی معاشرہ جنم لیتا ہے' جس طرح حلف الفضول نے باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں کا خاتمہ کیا' بد امنی' لوٹ مار اور افراتفری کی گھٹائیں چھٹ گئیں بلکہ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ اس معاہدہ کو ایسی پذیرائی اور طاقت ملی کہ بڑے سے بڑے سرداروں اور امرا کو ارکین معاہدہ کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ دوسری طرف مظلوم پر ظلم ڈھانے اور غریبوں کے حقوق پائمال کرنے سے تحفظ بہم پہنچایا۔ آجکل بھی گرل گائیڈز' سکاوٹس' ہلال احمر' رفاہی فاونڈیش اور انجیوز وغیرہ قائم ہیں جن کے بارے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا خمیر حلف الفضول کے معاہدہ سے اٹھایا گیا ہے تو بجا ہوگا۔ وبائی امراض' قحط' زلزلہ اور سیلاب جیسی آفات کو باہمی کارروائی سے قابو میں لا سکتے ہیں کیونکہ بسا اوقات حکومتی مشینری سست روی یا بے پروائی کا شکار ہو جاتی ہے اور بروقت حکومت کے انتظام نہ کرنے سے ناقابل تلافی نقصان ہو تا ہے اس وقت یہ رضا کارانہ کمیٹیاں' انجمنیں اور تنظیمیں میدان میں اتر کر حادثات کی شدت میں ہاتھ بٹا سکتی ہیں' جس سے انسانی جانوں کے ضیاع' مال واجداد اور مکانات کے نقصان کا ازالہ ہو پاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام کا پورا نظام انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے تحفظ فراہم کرتا ہے اور انصاف کی فراہمی سے بچاؤ اور بڑوں سے چھوٹوں کے حقوق کو غصب کرنے سے تحفظ دینے کا داعی ہے۔ اسلامی حکومتی ادارے امن وامان برقرار رکھنے میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ معاہدہ کی یہ شق ہے'' کہ جب تک سمندر اون کو تر کرتا رہے گا اور جب تک حرا اور ثبیر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں'' سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب تک دنیا کا نظام چلتا رہے گا اس کے مسائل جنم لیتے رہیں گے۔ کائنات کی ساری چیزیں اپنا عمل جاری رکھے ہوئے ہوں گی تب تک اس معاہدہ کی روح انسانیت کی بھلائی کا درس دیتی رہے گی اور ظلم و زیادتی کے خلاف پکارتی رہے گی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ بدلتے حالات اور نا مساعد

حالات میں بدستور زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتا رہے گا۔ اور کسی نہ کسی شکل میں اس کی از سرِ نو تنظیم ہوتی رہے گی یعنی ہر دور میں اس کی بازگشت سنائی دے گی۔ جس طرح کہ معاہدہ اول کے بعد دوبارہ اس معاہدہ کا احیاء ہوا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے ''اگر اب زمانہ اسلام میں بھی اس قسم کے معاہدہ کی طرف بلایا جاؤں تو ان میں شرکت کروں گا'' اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہمیں اس قسم کے بھلائی اور خیر خواہی کے معاہدوں میں شرکت کرنی چاہیے۔ بلایا جائے تو دعوت قبول کریں' یہی اسوہ رسول کا تقاضہ ہے کہ ایسے امن وسلامتی کے معاہدوں میں شرکت اور شمولیت کو ناگزیر بنائیں اور لاپرواہی یا کسی غرض وہوس کی بنیاد پر ترک نہ کریں۔ ایسے معاہدے بنی نوع انسان کے جذبے کے تحت ہوں یہ غیر حکومتی اور غیر مذہبی تنظیم کی بنیاد پر ہوں ہر مذہب' مسلک اور عقیدہ رکھنے والے لوگ تمام انسانیت کی بلا امتیاز خدمت کریں کسی کی دشمنی میں انسانیت کی خدمت سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیے مثال کے طور پر بنی کلاب کی طرف ایک سریا بھیجا گیا یہ لوگ بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو گرفتار کرلائے۔ وہ مسیلمہ کذاب کے حکم پر آپ ﷺ کو ٹھکانے لگانے آیا تھا (نعوذ باللہ) مسجد نبوی کے ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا یہاں باندھنے کی حکمت یہ تھی کہ پانچ وقت لوگوں کو بارگاہ خداوندی میں عجز ونیاز سے التجائیں کرتے دیکھ لے تاکہ اس کا دل بھی پسیج جائے اور دین اسلام کی راہ پر چل نکلے۔ آپ ﷺ ثمامہ کے پاس سے گزرے: فرمایا: میری نسبت تیرا کیسا گمان ہے؟ ثمامہ: میرا گمان آپ ﷺ کی نسبت اچھا ہی ہے۔ اگر آپ ﷺ مجھے قتل کریں گے تو ایک خونی کا قتل کریں گے اگر آپ ﷺ احسان فرمائیں گے تو ایک شکر گزار اور قدر دان احسان فرمائیں گے۔ اگر مال کی خواہش ہے تو جتنا چاہیں لے لو۔ رسول خدا ﷺ یہ سن کر خاموش ہو گئے' دوسرے روز گزرے پھر پوچھا' ثمامہ پہلا اور دوسرا جملہ حذف کر دیا صرف یہ جواب دیا اگر آپ ﷺ احسان فرمائیں تو ایک قدر دان اور شکر گزار پر احسان ہوگا۔ آپ ﷺ خاموش رہے۔ تیسرے روز پھر یہی سوال دوہرایا تو ثمامہ نے دوسرا جملہ بھی حذف کر دیا اور اپنا معاملہ آپ ﷺ کے خلق عظیم اور عفو جمیل پر چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو۔ وہ قریب کے نخلستان میں گیا اور غسل کر کے واپس آ گیا اور مشرف با اسلام ہو گیا۔ مکہ میں عمرہ کرنے گیا تو کسی کافر نے انہیں کہا کہ یہ تو صابی ہو گیا ہے' بے دین ہو گیا ہے اس نے کہا نہیں میں محمد ﷺ کا دین قبول کر چکا ہوں اور مسلمان ہو گیا ہوں۔۔۔۔ پھر کہا جو غلہ یمامہ سے یہاں آتا تھا اب ایک دانہ بھی نہیں آئے گا جب آپ ﷺ اجازت نہیں فرمائیں گے۔ غلہ کی بندش نے قریش کی بولتی بند کر دی آخر کار حضور ﷺ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ آپ ﷺ تو صلہ رحمی کا سبق دیتے ہیں اور ہم آپ ﷺ کے رشتہ دار ہیں ہم پر رحم فرمائیں اور ثمامہ سے کہیں کہ غلہ بند نہ کرے۔ آپ ﷺ نے ثمامہ کو خط لکھا کہ غلہ آنا نہ روکیں۔ یہ ہے خدمت خلق کا جذبہ جس کے سامنے شدت کی

دشمنیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی امداد کی جاتی ہے۔ یہی جذبہ معاہدوں میں کار فرما ہو تو یہی حلف الفضول معاہدہ کی روح ہے۔

اعتراض نمبر ۸۷

یہ (انجمن حلف الفضول) ناانصافی کے خلاف ایک عام انجمن نہیں تھی۔ (واٹ)

جواب: بنیادی وجہ: حلف الفضول کے وقوع پذیر ہونے کی بنیادی وجہ جنگ فجار ہے جس کی تباہ کاریوں سے لوگ تنگ آ چکے تھے سینکڑوں لوگ جان کی بازی ہار چکے تھے ماؤں کی گود بچوں سے خالی ہو گئی اور شوہروں کا موت کو گلے لگانے سے سہاگنوں کے سہاگ اجڑ چکے تھے ہر وقت لڑائی کے سائے منڈلاتے رہتے تھے کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا ایسے حالات میں سرداروں نے سر جوڑ لیے اور جنگ کی ہولناکیوں سے بچنے کے لیے سوچ بچار کرنے لگے۔ آخر طے پایا کہ ایک صلح کا معاہدہ عمل میں لایا جائے اور اس کی پابندی کی جائے اور اس میں طے شدہ امور پر ہر قیمت پر عمل ممکن بنایا جائے امام ابن جوزی (الوفا۔۱۷۳) لکھتے ہیں ''اس حلف اور عہد و پیمان کا موجب و باعث یہ تھا کہ قریش باہم ایک دوسرے کے ساتھ حرم پاک میں ظلم و زیادتی کرتے رہتے تھے تو عبداللہ بن جدعان، زبیر بن عبدالمطلب نے لوگوں کو عہد و پیمان پر آمادہ کیا۔

فوری وجہ: جنگ فجار ختم ہوئی ہی تھی کہ ناگاہ ایک یمن کے تاجر کا سامان عاص بن وائل خرید لیتا ہے لیکن طے کردہ مقررہ وقت سامان کی قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیتا ہے اس پر بنو ہاشم (حضور ﷺ کا خاندان) اور ان کے رشتہ دار و اتحادی، بنو المطلب، بنو زہرہ (آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا خاندان) اور بنو تیم (حضرت ابوبکرؓ اور عبداللہ بن جدعان کا خاندان) جمع ہوئے۔ ابن الجوزی کے مطابق بنو اسد اور مکہ والوں کے اتحادی گروپ احابیش نے بھی شرکت کی یہ سارے عبداللہ بن جدعان کے گھر اکھٹے ہوئے اور تجدیدی معاہدہ حلف الفضول وقوع پذیر ہوا اس معاہدہ پر آپ ﷺ فخر فرمایا کرتے تھے اس اعزاز کو سرخ اونٹوں کے ریوڑ کے بدلے میں بھی دینے کو تیار نہیں۔ حتیٰ کہ اب بھی آپ ﷺ کمزور کی مدد کے لیے جانے کو تیار ہیں۔ معاہدہ مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ملک میں بدامنی دور کریں گے۔ ۲۔ مسافر کی حفاظت کی جائے گی،

۳۔ کوئی شخص مقیم ہو یا مسافر (یعنی مکہ یا کسی اور جگہ کا ہو) جس پر ظلم ہو اس کی حمائت کریں گے اور اس پر کیے گئے ظلم کا ازالہ کریں گے اور زیردست پر ظلم کرنے سے زبردست کا ہاتھ روکا جائے گا۔

۴۔ غریبوں کی مدد کریں گے۔

۵۔ اللہ کی قسم! ہم سب ظالموں کے خلاف مظلوموں کا ساتھ دینے کے لیے اس وقت تک یک

مشت رہیں گے جب تک مظلوموں کو ان کے سابقہ حقوق نہیں مل جاتے اور یہ ساتھ اس عرصہ تک ہوگا جب تک سمندر ایک بھی بال کو گیلا کرنے کے قابل ہوگا اور جب حرا اور ثبیر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔

معاہدہ کے معرض وجود میں آنے کی وجہ صرف اور صرف غریبوں' بے یار و مددگار کے جان و مال و عزت و آبرو' مسافروں کے لٹنے اور طاقتوروں کو ناتوانوں پر ظلم کرنے سے روکنا تھا۔ معاہدہ کی تمام شقیں عدل و انصاف کی فراہمی پر مبنی ہیں۔ یہ معاہدہ تو ہے انصاف کی فراہمی اور ظلم و زیادتی سے روکنے اور خاتمہ کے لیے۔ مگر ''واٹ'' اسے ناانصافی کی انجمن کہتا ہے۔ تاریخی حقائق کو جھٹلانے اور Face the fact سے چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔ شائد انھیں حلف الفضول کی شقیں ناانصافی پر مبنی لگتی ہوں' لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں دیتا تو پھر ''واٹ'' مستشرق کا اعتراض قابلِ تسلیم نہیں ہوسکتا۔

دوم: جس واقعہ کی توثیق تاریخی اعتبار سے ہو تو پھر مفروضوں کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہتی۔

سوم: پیچھے بیان کیے گئے دردناک، اندھیر گردی اور اخلاقی گراوٹ و بربریت کے واقعات' جس قدر بھیانک ہیں اسی قدر حلف الفضول کے اراکین نے اپنی مدد فراہم کر کے ظالموں کے پنجہ استبداد سے غریبوں کو چھڑایا اور ان کی دادرسی کی مثال قائم کردی۔ یہ واقعات وقوع پذیر ہوئے اور بروقت امداد کر کے ان کو احسن طریق سے حل کیا گیا۔ اگر انجمن حلف الفضول بروقت کارروائی نہ کرتی تو مکہ کا باشندہ نبیہ بن الحجاج اپنی ہوس پرستی سے عورت کی چادر عصمت کو تار تار کر دیتا۔ نیز ہوسکتا تھا کہ عورت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی کے گھر کی ہو رہتی تو پھر کہا جاسکتا تھا کہ انجمن ناانصافی پر مبنی تھی۔ اس کے مقاصد کچھ اور تھے۔ جبھی تو مظلوم کی مدد نہ کی گئی' بل کہ ادھر تو کیفیت یہ ہے کہ اراکین انجمن اپنی تلواریں سونت لیتے ہیں۔ مرنے اور مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور فوراً Action کر کے اغوا کنندہ سے لڑکی بازیاب کرا لیتے ہیں۔

''واٹ'' صاحب سے ہمیں پوچھنے کا یہ حق حاصل ہے کہ بتائیں کس قسم کے انصاف پر انجمن ہونی چاہیے تھی؟ یہ بھی بتائیں کہ انجمن کی کاروائی انصاف پر مبنی نہیں تھی؟ یہ بھی بتائیں کہ اس کے سوا یہ وفاق کس طاقت ور قبیلہ یا مال دار طبقہ کے خلاف تھا اس کی کوئی تاریخی شہادت ملتی ہے؟ ایسے اور اس قسم کے دیگر سوالات کا جواب ''واٹ'' سے نہ بن پڑے گا۔ اس لیے اسے اور اس کے ہم نواؤں کو یہ اقرار کر لینا چاہیے کہ اس کا بیان سچ پر موقوف نہیں مگر ایسا اقرار تو مستشرقین کی گھٹی میں نہیں ہے۔ ہاں انکار چاہے سو مرتبہ کروالو۔

نتیجہ: ''واٹ'' اس معاہدہ سے یہ نتیجہ نکالنا چاہ رہا ہے کہ آپ ﷺ کی قبل از اسلام زندگی گم نامی کی زندگی ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے مکہ کے عقل مند اور منصف مزاج لوگ بہ رضا و رغبت متفق تھے اور ان لوگوں کا تعاون حاصل تھا تمام شرکاء نے نہایت بے غرضی اور دیانت داری سے یہ ذمہ داری سنبھال کر یہ کام کیا تھوڑے عرصہ میں امن و امان قائم ہو گیا چونکہ جزیرہ نمائے عرب میں کوئی منظّم حکومت نہ تھی اور نہ

وہاں با قاعدہ عدالتیں تھیں کہ مظلوم انصاف کے لیے ان کے دروازہ پر دستک دے سکیں۔ معاشرہ قبائلی نظام کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ کسی قبیلے کا کوئی فرد دوسرے قبیلہ کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کا قبیلہ محض باز پرس کر کے چپ نہیں ہو جاتا تھا بلکہ قاتل کے سارے قبیلہ کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونک دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ کم زور قبائل کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ طاقت ور سے اپنا حق لے سکتے۔ ایسے کمزور قبائل کے حقوق کے تحفظ کے لیے یہ انجمن بنائی گئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ اس معاہدہ کے سرگرم رکن تھے اور اکثر بصد افتخار اس کو یاد فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ''میں نے عبداللہ بن جدعان کے گھر پر حلف برداری میں حصہ لیا، اگر اسلام میں بھی اس قسم کے وفاق کے نام پر مجھے مدد کے لیے پکارا جائے تو میں سرخ اونٹوں کی قیمت پر بھی اس کو ترجیح دوں گا لیکن ''واٹ'' کے مفروضوں پر قائم اعتراضات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس بات کو ثابت کرنا چاہتا ہے جو کئی مستشرقین کے دل کی بات بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبل از اسلام زندگی گم نامی کی زندگی ہے اور آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات پوری طرح نہیں ملتے وہ یوں کہنا چاہیے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کی اسلام سے قبل زندگی کے واقعات کے منکر ہیں اور یہ کہ آپ ﷺ نے کسی اہم تاریخی واقعہ میں حصہ نہیں لیا چہ جائیکہ اس وفاق میں حصہ لیا ہو جو خاص امن و امان قائم کرنے اور مظلوم و زیر دستوں کی حمایت کے لیے معرض وجود میں آیا ہو جبکہ آپ ﷺ کی زندگی روز روشن کی طرح درخشاں ہے آپ ﷺ کے سر ''ورفعنا لک ذکرک'' کا تاج سجا کر پہلے اور بعد کے فرق کو مٹا دیا اور ''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ'' فرما کر آپ ﷺ کی پوری زندگی کو نمونہ قرار دے کر مہر ثبت کر دی کہ آپ ﷺ کی تمام زندگی کھلی کتاب ہے اس کا ہر ہر ورق روشن و درخشندہ ہے آپ ﷺ نے توحید کا درس دیا عدل و انصاف و خیر خواہی و بھلائی اور امداد و تعاون کی تبلیغ کی۔ ظلم و زیادتی غرض و ہوس اور نا انصافی سے منع فرماتے تھے اور بتوں کی پوجا پاٹ سے روکتے تھے اور یہ معاہدہ جس کی بنیاد سراسر خیر و فلاح ہے جس سے گورے کالے کے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں اور ہر امیر غریب کو سستا اور بروقت انصاف ملتا ہے۔ یہ آپؐ کی زندگی کے بے نظیر عملی نمونے ہیں، جو تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھے ہیں۔

اعتراض نمبر ۸۸

''واٹ'' نے حلف الفضول کے بارے میں ایک اور نظریہ قائم کیا۔ اس کا قیاس ہے کہ ہاشم اور المطلب کمزور ہونے کے باعث ایک وفاق کے ضرورت مند تھے۔ انھوں نے حلف الفضول بنو عبد شمس و بنو نوفل، جو بغیر کسی وفاق کے گزر کرنے کے لیے کافی مضبوط ہو چکے تھے، کے خلاف اپنی اعانت کے لیے قائم کیا تھا'' (ن ۶۰۷/۱۱)۔ نیز ''واٹ'' اس مفروضہ کی تائید میں دو واقعات کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اول مطیبون اور

احلاف کا اتحادٗ دوم حسین بن علی بن ابوطالب اور ولید بن عتبہ بن ابوسفیان کے درمیان جھگڑا''۔

جواب: مزے کی بات یہ ہے کہ ''واٹ'' بدستور اپنے مفروضوں سے واقعات میں شک وشبہات پیدا کرتا ہے اور اس کی تحقیق اور دعویٰ بے دلیل اور بے بنیاد ہوتا ہے۔

اول: مطیبون اور احلاف کا اتحاد مناصب سے متعلق تھا۔ قصی کے تین بیٹے عبد مناف، عبدالدار اور عبدالعزیٰ تھے۔ قصی (ان کے والد) نے جیسے مناصب تفویض کیے' عبد مناف نے قبول کیے لیکن عبد مناف کے بیٹے (عبد شمس، ہاشم، المطلب، نوفل) اپنے تایا عبدالدار اور اس کے بیٹوں کی بالا دستی زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے۔ اس طرح کچھ قبائل عبد مناف اور کچھ عبدالدار کے ساتھ ہو گئے۔ عبد مناف نے بنو اسد، بنو زہرہ اور الحارث کے ساتھ وفاق بنایا یہ مطیبون کہلاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ انھوں نے خوشبو کے بھرے پیالہ میں ہاتھ ڈال کر حلف اٹھایا تھا۔ بنو عبدالدار کے حلیف بنو مخزوم، بنو ہاشم، بنو جمح اور عدی قبائل تھے' یہ گروہ احلاف کہلائے۔ احلاف کے معنیٰ 'وفاق' کے ہیں۔ قریش الظواہر کے عامر بن لوی اور محارب غیر جانب دار رہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ کہتے ہیں کہ ''قبائلی رقابت کی وجہ سے سعد بن سہام حلف الفضول میں شامل نہ ہوئے۔ لیکن وہ اسی نوع کا کوئی انتظام کرنا چاہتے تھے۔ ان کے بنو زہرہ سے خوش گوار تعلقات تھے۔ وہ رسول اللہ کی والدہ کا قبیلہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے مل کر'' حلف الاصلاح'' (معاہدہ صلح) کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ''اگر بنو قریش یا ان کے حلیف احابیش میں سے کسی کے درمیان جھگڑا ہوا تو وہ فریقین میں مفاہمت کرائیں گے۔ بنو زہرہ چونکہ دونوں معاہدوں میں اہم حیثیت کے مالک تھے اس طرح غالباً ان دونوں معاہدوں میں بھی ایک طرح کا رابطہ تھا۔ (ن ۵۲۱/۲) ''واٹ'' نے فجار کے سلسلہ میں جس عبارت کا اقتباس دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبد مناف کے بیٹوں عبد شمس، نوفل، ہاشم اور المطلب کے خاندانوں نے اپنے دشمنوں کے خلاف بغیر آپس کی کش مکش اور افتراق کے ایک متحدہ محاذ پیش کیا۔ یہ یاد رہے کہ بقول ابن سعد حلف الفضول کا معاہدہ'' الفجار'' جنگ کے بعد ایک مہینہ کے اندر اندر قائم کیا گیا تھا۔ یقیناً وہ واقعہ جسے ''واٹ'' بیان کرتا ہے ان چند دنوں میں وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ (ن ۶۰۷/۱۱) نیز یہ جھگڑا مناصب کی تقسیم کا تھا اور یہ معاملہ ثالثی سے طے پا گیا' جس سے عبد مناف کو افادہ اور سقایہ کے منصب دیئے گئے تھے۔

واقعہ دوم: ابن اسحاق سے یزید بن عبداللہ بن اسامہ بن الہادی اللیثی نے بیان کیا' انھوں نے محمد بن ابراھیم الحارث تیمی سے روایت سنی کہ حسین بن علیؓ بن ابی طالب اور ولید بن عتبہ بن ابوسفیان کے درمیان کسی جائیداد کے متعلق جھگڑا تھا' جو'' ذی المروہ'' میں تھی (وادی قریٰ کی ایک وادی یا بستی)۔ ان دنوں مدینہ پر حاکم ولید بن عتبہ تھا اور یہ عہدہ اس کے چچا معاویہ بن ابوسفیان نے دیا تھا۔ ولید نے اپنے

اقتدار میں حسین ابن علیؓ سے زیادتی کی تھی۔ حسینؓ نے فرمایا: میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ تجھے میرے حق میں انصاف کرنا ہوگا۔ ورنہ میں اپنی تلوار لوں گا اور مسجد رسول اللہ میں کھڑا ہو کر حلف الفضول کی رو سے امداد طلب کروں گا''۔ راوی کہتا ہے کہ حسینؓ کی اس گفت گو کے وقت عبداللہ بن زبیر بھی پاس تھے، انھوں نے کہا: میں بھی خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر انھوں نے حلف الفضول کی رو سے امداد طلب کی تو تلوار لے کر ان کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ یہاں تک کہ ان دونوں کے حق میں انصاف کیا جائے یا ہم سب مر جائیں گے۔ راوی کہتا ہے کہ یہ خبر جب مِسوَر بن مخرمہ بن نوفل الزہری کو پہنچی تو اس نے بھی وہی کہا اور عبدالرحمٰن بن عثمان بن عبیداللہ تیمی کو یہ معلوم ہوا تو اس نے بھی وہی کہا۔ یہ بات جب ولید بن عتبہ تک پہنچی تو اس نے حسین کے حق میں انصاف کیا' یہاں تک کہ وہ اس معاملہ پر راضی ہو گئے (ابن ہشام ۱/۱۶۰)

اہم نکتہ: حسین بن علی بن ابی طالبؓ اور ولید بن عتبہ بن ابوسفیان کے جھگڑے کو قدیم حلف الفضول کا حوالہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ امام حسینؓ نے قدیم حلف الفضول کے نمونہ پر اتحاد قائم کرنے کی دھمکی دی تھی جو ظالموں کے خلاف مظلوموں کے تحفظ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ جواد علی کہتے ہیں کہ ''حسینؓ ابن علیؓ کے حوالہ سے یہ اخذ کرنا ممکن نہیں کہ قدیم حلف الفضول اس وقت بھی زیرِ عمل تھا۔ مزید یہ کہ حلف الفضول بنوامیہ کے خلاف بنو ہاشم کا سیاسی اتحاد تھا جیسا کہ ''واٹ'' نے خیال کیا ہے۔ یہ درست نہیں کیوں کہ حسینؓ ابن علیؓ کی زندگی میں اس کا بہترین موقع وہ تھا جب ان کا سیاسی تنازعہ بنوامیہ سے ہوا تھا مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور یہ بھی واضح رہے کہ حسینؓ ابن علیؓ نے اس نازک مرحلہ پر بھی کبھی حلف الفضول انجمن سے فریاد نہیں کی''۔ سو بات کی ایک بات کہ حلف الفضول اس وقت زیرِ عمل نہ تھا۔ ختم ہو چکا تھا۔ البتہ آنحضرت ﷺ کی شادی یعنی ۵۹۵ تک پوری طاقت سے یہ حلف برقرار تھا (ن ۱۱/۶۰۸۔۶۰۷)

اعتراض نمبر ۸۹

''واٹ'' قبیلہ ہاشم کی اہمیت گھٹانے کے لیے ایک اور شوشہ چھوڑتا ہے کہ بنو ہاشم نے حلف الفضول میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ تنظیم ان قبائل نے بنائی تھی جو مکہ کے اجارہ دار قبائل کے خلاف تھے اور خود وہ قبائل کمزور تھے۔۔ وہ کہتا ہے جن قبائل نے حلف الفضول کا معاہدہ کیا تھا' یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ قبائل تھے جو یمن کی طرف سے تجارتی قافلے بھیجنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے یا وہ قبائل تھے جو شام اور مکہ کے درمیان ہونے والی تجارت میں ہی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ (ضیا النبی ۱۹۸/ ۷)

جواب: ''واٹ'' کا یہ الزام کہ بنو ہاشم اور عبدالمطلب کے کمزور ہونے کے باعث یہ معاہدہ اجارہ دار قبائل کے خلاف وفاق تھا۔ سابقہ اعتراض میں اس کا رد کر دیا گیا ہے۔ پھر لفظوں کے ہیر پھیر سے ''واٹ'' نے اسے تجارتی ضرورت قرار دیا۔ ''واٹ'' کا سارا کام مفروضوں پر مبنی ہے۔ ان مفروضوں پر

انحصار کرتا ہے سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ بھلا سوچیے کہ مفروضے کب تک حقیقت کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں؟ بنو ہاشم کا قبیلہ تو وہ ہے جس کے امجاد نے غسان و روم کے شہزادوں سے تجارتی معاہدے کیے۔ بازنطینی، مکہ تعلقات کچھ دیر خوش گوار رہے۔ بعدازاں قصی کے پوتے ہاشم نے ۴۶۷ء میں قیصر روم سے شام اور فلسطین کے مابین مکی تجارتی قافلوں کی قیادت کا پروانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مزید برآں شہنشاہ نجاشی کے نام ایک تجارتی خط بھی دیا تاکہ وہ انھیں اسی نوعیت کا اجازت نامہ ان قافلوں کے لیے دے دے، جو حبشہ جا رہے ہوں (حمید اللہ۔ پیغمبر اسلام۔ ۲۲۶) ان کی وسیع پیمانے پر تجارت کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا کہ وہ وفاق کرتے۔ دوم: بنو ہاشم کا قبیلہ خانہ کعبہ کا متولی تھا۔ دُور دراز سے آنے والے زائرین اور تاجران ان سے شناسا تھے۔ اس قبیلہ کے تجارتی قافلے جہاں کہیں بھی جاتے انھیں کوئی بھی نہ لُوٹتا۔ یہ خانہ کعبہ کی متولیت ہونے کا اعزاز بھی تھا۔

سوم: بنو ہاشم قبیلہ افرادی لحاظ سے بھی اتنا کمزور نہ تھا۔ ان واقعات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ابوجہل کا قبیلہ مضبوط تھا اور اسے حلیف کی حمایت بھی حاصل تھی۔ قبیلہ کی سرداری اس کے نام منسوب تھی۔ حضرت حمزہ، ہاشمی جوان نے اپنے بھتیجے محمد ﷺ کے ساتھ ابوجہل کی گستاخی کا یوں نوٹس لیا کہ اپنی کمان سے ابوجہل کا سر پھاڑ دیا۔ اہلِ محفل دیکھتے رہے لیکن حضرت حمزہ کا ہاتھ نہ روک سکے۔ یہ اسی کمزور قبیلہ کا ایک فرد ہے جس نے ابوجہل اور اس کے موجود حمائتیوں کی پروا کیے بغیر اس پر وار کیا۔ اگرچہ کچھ لوگ حمزہ کے خلاف اٹھنا چاہتے تھے، جنھیں ابوجہل نے روک دیا۔ اس سے یہ کوئی مطلب اخذ نہ کر بیٹھے کہ اگر ابوجہل اپنے ساتھیوں کو نہ روکتا تو حمزہ کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ نہیں نہیں یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کیوں کہ حمزہ نے ان کے پاس بیٹھے حمایتیوں کو دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ ان سے ڈرتے تو حملہ ہی نہ کرتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ حمزہ کے دل میں جو آیا وہ کر ڈالا۔ یہ ایک فرد کی طاقت کا مظاہرہ ہے تو پورے قبیلہ کی طاقت کا کیا عالم ہوگا؟

ہجرت مدینہ کے موقع پر رات کے وقت ہر قبیلہ کا ایک جوان درِ نبوت کا محاصرہ کیے ہوئے ہے کہ آپؐ کی برآمدگی پر یک بارگی حملہ کر کے نعوذ باللہ کام تمام کر دیں۔ یعنی کسی ایک قبیلہ کو جرات نہیں ہوتی کہ ہاشمی قبیلہ کی دشمنی مول لیتا۔ اس لیے قبائل سے ایک ایک جوان پہرہ میں شریک ہوتا ہے۔ اسی طرح عتبہ اور ولید بن عتبہ نے اپنے مقابل جنگ بدر میں جو جنگجو طلب کیے اور یہ شرط لگائی کہ اپنے خاندان کے آدمیوں کو بھیجو۔ آپ نے حمزہؓ، عبیدہؓ اور علیؓ کو مقابلہ کا حکم دیا۔ قریش نے قبول کیا کیوں کہ پہلے جو جنگجوان کے مقابلہ پر گئے تھے انھیں ہم پلہ نہ سمجھ کر مطالبہ کیا کہ اپنے خاندان کے آدمیوں کو بھیجو۔ گویا ان جنگجوؤں کو اپنے ہم پلہ سمجھتے تھے۔ حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان سے آپ نے نکاح کیا۔ اس پر ابو سفیان اور دیگر قبیلہ کے افراد کو کوئی اعتراض نہ تھا کیوں کہ وہ بنی ہاشم کو اپنا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ بایں سبب اس

نکاح کی خبر سن کر ابوسفیان باوجود دشمنی کے حضورؐ کے ساتھ رشتہ پر فخر کیا کرتا تھا۔ اگر ام حبیبہ کسی ایسے مسلمان سے شادی کر تیں جوان کا ہم پلہ نہ ہوتا تو ان کی عداوت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ (ضیا النبی ۵۱۱) حلف الفضول تجارتی معاہدہ تھا نہ طاقت ور قبائل کے خلاف وفاق تھا۔ بقول وزیر رومانیہ کونستانس جیور جیو حلف الفضول عبارت ہے اس منظّم دستہ سے جو مسلح نو جوانوں پر مشتمل تھا اور جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی مظلوم کا حق ضائع نہ ہو‘‘۔ بے یار و مددگار اور مظلوم جو بڑوں کا نشانہ ستم بنے ہوئے تھے، ان وڈیروں کا رعب داب، دھونس اور طاقت کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی کو روکنے کا حوصلہ نہ تھا، اس معاہدہ سے اب بے کسوں کو ایک سہارا مل گیا جب بھی کسی پر ظلم و زیادتی ہوتی تو اس ظالم سے ظلم کا حساب چکاتے۔ حلف الفضول کا دستہ دادرسی کے لیے میدان میں اتر آتا۔ ملک سے لوٹ مار، بدامنی کا خاتمہ، مسافروں، تاجروں اور غریبوں کی امداد خواہ وہ مقامی ہو یا غیر مقامی، زبردست سے زیردست کے حقوق کا تحفظ، جان و مال اور عزت و آبرو کی پاسداری وغیرہ حلف الفضول کے مقاصد تھے۔ نہ کوئی معاشی اور نہ ہی کوئی تجارتی اور نہ ہی کسی طاقت ور قبیلہ کے خلاف کمزور قبیلہ کا اتحاد تھا۔ بل کہ یہ تو ہر اس فرد، اس قبیلہ کے خلاف اقدام تھا جو ظلم و زیادتی کو محبوب مشغلہ سمجھتا تھا۔ حلف الفضول کی ایک شق یہ ہے کہ ’’اس حلف سے اس کے بغیر (مظلوم کی دادرسی کے) ہمارا کوئی اور مقصد نہ ہوگا‘‘ سے ہمارے موقف کی تائید اور ’’واٹ‘‘ کے مفروضہ کی تردید ہوتی ہے

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ انہوں نے پختہ پیمان باندھا اور باہمی معاہدہ کیا کہ وہ جس کسی کو اہل مکہ میں سے یا ان تمام انسانوں میں سے جو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا سے وہ ظلم کا شکار پائیں تو یقیناً اس کا ساتھ دیں گے اور وہ اس وقت تک ظلم کے خلاف مظلوم کے ساتھ کھڑے ہوں گے جب تک اس ظلم کا ازالہ نہ ہو جائے۔ اس روایت کی روشنی میں معاہدہ کے ارکان ایک ایسی تحریک کا آغاز کرتے ہیں۔

اہم نکتہ: بعض روایات میں ہے کہ حضور اکرمؐ نے حلف المطیبین میں بھی شرکت کی۔ مگر یہ موقف درست نہیں۔ کیوں کہ یہ معاہدہ حضور اکرمؐ کے عالم رنگ و بو میں جلوہ افروز ہونے سے قبل طے پایا تھا۔ یہ معاہدہ بنوعبد مناف بن قصی یعنی بنو ہاشم، بنوعبد شمس، بنو مطلب، بنو نوفل، بنو زہرہ، بنو تیم، بنی حارث کے مابین ہوا تھا۔ انھیں مطیبون کہا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے چچازاد بنو عبد الدار بن قصی بھی تھے۔ بنو مخزوم، بنو سہم، بنو جمح اور بنو عدی ان کے حلیف تھے۔ انھیں احلاف کہا جاتا تھا۔ (السیرۃ النبویہ۔ ۱۔ ۱۳۱)

نیز مطیبون اور احلاف کا اتحاد اس وقت قائم ہوا جب بنو عبد مناف کا جھگڑا بنو عبد الدار سے اس بات پر ہوا تھا کہ وہ بھی اپنے جد قصی کے قائم کردہ اختیارات و مناصب میں حصہ رکھتے ہیں۔ یہ معاملہ ثالثی سے طے ہوا تھا جس کی رُو سے افادہ اور سقایہ کے مناصب عبد مناف کو دیئے گئے تھے۔ باقی بدستور عبد الدار کے پاس رہے۔

شام کا دوسرا سفر تجارت

حضورؐ پچیسویں سال، حضرت خدیجہ کا مال تجارت ''بطریق مضاربت'' لے کر شام کی جانب تجارت کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ اس قول کی بنا پر کہ ابو طالب نے حضورؐ سے عرض کیا' چونکہ میرے پاس اب مال بالکل نہیں رہا ہے اور قریشیوں کا قافلہ بغرض تجارت جانے والا ہے۔ لہٰذا خدیجہ بنت خویلدؓ سے جا کر کہو، وہ قریش کے مال دار لوگوں میں سے ہیں اور لوگوں کو مضاربت کے طور پر مال تجارت دے کر بھیجتی ہیں تو اگر آپ خود اپنے لیے چاہیں گے تو وہ یقیناً مال تجارت آپ ﷺ کو بھی دے دیں گی اور ممکن ہے کہ اس طرح کچھ نفع حاصل ہو جائے۔ لیکن صحیح تر قول یہ ہے کہ سیدہؓ خود کسی ایسے امین کی متلاشی تھیں جسے وہ اپنا مال تجارت سپرد کریں اور وہ حضورؐ سے زیادہ کسی کو امین نہ پاتی تھیں۔ چونکہ حضور اکرم ﷺ کو تمام قریش اظہارِ نبوت سے قبل ''محمد ﷺ کو امین'' کہا کرتے تھے۔ لہٰذا سیدہ خدیجہؓ نے کسی کو آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا کہ اگر میرا مال تجارت آپ لے جائیں اور حق تعالیٰ اس میں نفع دے تو جتنا نفع آپ مناسب خیال فرمائیں لے لیں۔ ایک روایت میں ہے کہ دو گنا مال دوسروں کی نسبت دوں گی۔ سید عالم ﷺ نے ابو طالب کے مشورہ کو قبول فرمایا۔ اس کے بعد سیدہؓ نے اپنا غلام جس کا نام میسرہ تھا اور اپنا ایک مخصوص آدمی جس کا نام خزیمہ تھا آپؐ کی خدمت کے لیے ساتھ کر دیا۔ آپؐ جب بصریٰ پہنچے تو وہاں ایک صومعہ یعنی کلیسا تھا جس میں نسطورا راہب رہتا تھا۔ اس نے حضور ﷺ کو ایک ایسے درخت کے نیچے جلوہ افروز دیکھا جس کے بارے میں خبر تھی کہ اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے کوئی نہیں بیٹھے گا اور یہ کہ یہ درخت بے برگ و بار اور خشک تھا۔ اس کے تنے بھی بوسیدہ تھے اور پتے جھڑ چکے تھے۔ آپؐ کے بیٹھنے کی وجہ سے وہ درخت سرسبز و میوہ دار ہو گیا۔ آپ نے مال فروخت کیا، دوگنا منافع حاصل ہوا۔ پس مکہ لوٹ آئے واپسی پر دوپہر کا وقت تھا۔ سر مبارک پر دو فرشتے سایہ کناں تھے۔ یہ نظارہ سیدہ خدیجہؓ نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بالا خانہ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ انھوں نے کئی دن بعد اس کا ذکر اپنے غلام میسرہ سے کیا، تو میسرہ کہنے لگا کہ میں نے تو پورے سفر میں یہی منظر دیکھا ہے۔

قابل غور: آپ ﷺ اپنے پہلے سفر شام میں بصریٰ شہر میں تشریف لے گئے جہاں ایک خانقاہ (صومعہ) اور بحیرہ راہب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی جگہ اب ایک اور راہب سے ملاقات ہوتی ہے جس کا نام ''نسطورا'' تھا دونوں سفروں کے درمیان تیرہ سال کا عرصہ حائل ہے۔ پہلے سفر شام میں آپ ﷺ کی عمر بارہ سال اور دوسرے سفر شام میں پچیس سال تھی ممکن ہے اس اثناء میں پہلا راہب فوت ہو گیا ہو اور یہ بھی بعید نہیں کہ وہ یہاں سے نقل مکانی کر کے کسی اور خانقاہ میں چلا گیا ہو۔ (ضیاالنبی۔۲۔۱۲۹)

حضرت خدیجہؓ سے شادی اور ان کا کاروبار

اعتراض نمبر ۹۰

جب آپؐ جوان ہو گئے اور مضبوط ہو گئے (آپ کے پاس زیادہ مال نہ تھا) سیدہ خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو تجارت کے لیے اجرت پر بلا لیا۔ اور حضورؐ کے ساتھ ایک اور آدمی کو اجرت پر رکھ لیا'' (اردو ترجمہ دلائل نبوہ ا۔ ۶۴۔ ابو بکر احمد بن الحسین بیہقی)

' تاریخی کتب سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کو سیدہ خدیجہؓ نے گویا اپنا ملازم یا تجارتی کارندہ مقرر کیا تھا'' (سیرت اعلان نبوت سے پہلے۔ ۲۹۵۔ ۲۹۴)

جواب: صاحب ضیا النبی (۔۲۔ ۲۱۷) لکھتے ہیں کہ آپ (خدیجہ) اپنے نمائندوں کو سامان تجارت دے کر روانہ کرتیں، جو آپ کی طرف سے کاروبار کرتے۔ اس کی دو صورتیں تھیں۔

اول: یا تو ملازم ہوتے، ان کی اجرت یا تنخواہ مقرر ہوتی جو انھیں دی جاتی، نفع ونقصان سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

دوم: یا نفع میں ان کا کوئی حصہ، نصف یا چہارم مقرر کر دیا جاتا۔ اگر نفع ہوتا تو وہ اپنا حصہ لے لیتے۔ بصورت دیگر یعنی نقصان کی صورت میں ساری ذمہ داری خدیجہؓ پر عائد ہوتی، اس کو شریعت میں '' عقد مضاربہ'' کہتے ہیں۔ آنحضرت ایک خود مختار اور خوش حال تاجر تھے۔ آپ نے کسی تاجر کی ملازمت کبھی اختیار نہیں کی تھی، ڈاکٹر تحسین فراقی نے کتاب کے تعارف میں لکھا'' ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہ نے حضورؐ کو اپنا ملازم یا تجارتی کارندہ مقرر کیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے نکاح سے بہت پہلے آپؐ خود مختار اور خوش حال تاجر کے طور پر معروف ہو چکے تھے اور اس ذیل میں قیس بن السائب کی روایت استناد کا درجہ رکھتی ہے۔

ایک اور روایت: ابو طالب نے اپنے بھتیجے سے کہا'' میں نے سنا ہے کہ (حضرت خدیجہ) اجرت پر ملازم رکھ رہی ہے۔ آپؐ ان سے مل کر ملازمت حاصل کر لیں۔ خدیجہ نے ہر ملازم کا معاوضہ دو دو اونٹ مقرر کیا ہے، اگر یہ کام کر سکو تو میں بی بی خدیجہ سے دریافت کروں؟ لیکن ہم اتنے معاوضے پر نہیں کریں گے۔ پھر ابو طالب نے خدیجہ سے بات کی اور کہا'' دوسروں کی طرح ہم دو اونٹوں پر مزدوری نہیں کر سکتے، اگر تم میرے برادر زادہ کے لیے چار اونٹ منظور کر لو تو وہ بھی چلے جائیں'' حضرت خدیجہؓ دوگنا دینے پر رضا مند ہو گئیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ آپؐ ایک خود مختار اور خوش حال تاجر تھے۔ آپ

نے کسی تاجر کی ملازمت اختیار نہیں کی تھی۔ اس بنا پر ابو طالب نے ملازمت کے لیے نہیں کہا ہوگا بل کہ حصہ داری کے لیے کہا ہوگا جسے خدیجہؓ نے قبول کر لیا۔ دوم: جب حصہ داری منافع پر ٹھہری تو پھر دوسروں سے دوگنا صلہ لینا چہ معنی دارد؟ اس بات کی تائید درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔

پیر کرم شاہ بھیروی لکھتے ہیں کہ قحط سالی نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔ میرے پاس سرمایہ بھی نہیں کہ اسے تجارت میں لگا سکوں۔۔ خدیجہؓ کئی لوگوں کو اجرت دے کر بھیج رہی ہے کہ وہ اس کا مال لے جائیں اور تجارت کریں۔ اگر آپؐ اس کے پاس جا کر اپنی خدمات پیش کریں تو یقیناً وہ آپ ﷺ کو دوسروں پر ترجیح دیں گی کیوں کہ آپ کے خصال حمیدہ سے خوب واقف ہے۔ اگر چہ میں پسند نہیں کرتا کہ آپ ﷺ کو شام روانہ کروں کیوں کہ وہاں یہود سے ایذا رسانی کا خطرہ ہے لیکن اب اس کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ حضور ﷺ کی غیرت نے کسی کے پاس سائل بن کر جانا گوارا نہ کیا اور اپنے شفیق چچا کو جواب دیا ''شائد وہ خود ہی مجھے اس سلسلے میں بلا بھیجے۔ ابو طالب نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کسی اور کو مقرر کر دے گی۔ پھر آپ ایک ایسی چیز کو طلب کریں گے جو پیٹھ پھیر چکی ہوگی۔ حضورؐ نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔ حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ کے محاسن اخلاق، آپ کی دیانت اور پاک بازی کی شہرت سن رکھی تھی لیکن اس پیش کش کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ جب انھیں چچا بھتیجا کی اس گفت گو کا علم ہوا تو فوراً پیغام بھیج کر بلایا۔۔۔

حضرت خدیجہ

خدیجۃ الکبریٰؓ کی شادیاں: حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد عرب کے مشہور تاجر تھے۔ قریش میں نامور تھے ان کی وفات کے بعد خدیجہؓ نے ان کے تجارتی کاروبار کو سنبھالا دیا اور اسے وسعت دی۔ عفت و پاک دامنی کے سبب خدیجہ طاہرہ کے لقب سے جانی پہچانی جاتی تھیں۔ ان کی پہلی شادی عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوئی' ان میں سے دو اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکا عبداللہ بن عتیق اور ایک لڑکی ہند بنت عتیق۔ خدیجہ کے شوہر عتیق کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد خدیجہ کی دوسری شادی ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی۔ ان سے ہالہ' طاہر اور ہند پیدا ہوئے' یہ تینوں بھائی صحابی تھے۔ (رحمۃ اللعالمین۔۱۴۴۔۲)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ بعض سیرت نگاروں نے خدیجہ کا پہلا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ سے ہوا تھا' لکھا ہے' اس بات میں مورخین کا اختلاف ہے۔ ''قتادہ'' نے عتیق کا پہلا نکاح بتایا ہے اور جرجانی نے ابو ہالہ کا۔ صاحب الاستیعاب نے بھی جرجانی کے قول کو صحیح کہا ہے۔ میں (سلمان) نے قتادہ کے قول؛ کو اس لیے پسند کیا ہے کہ صاحب الاستیعاب نے ہند کو ربیب رسول اللہ لکھا ہے اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ ابو ہالہ کے بعد نبی مکرم ﷺ کا نکاح ہوا ہو (حوالہ بالا)

دونوں شوہروں کا انتقال ہوا' بعد ازاں قریش کے سرداروں نے انہیں نکاح کرنے کے پیغامات بھیجے

مگر خدیجہؓ نے سب پیغامات ٹھکرا دیئے لیکن آپ کے پیغام کو بہ دل و جان قبول کیا۔ نکاح کے پیغام کو قبول کرنے کی وجہ ابن اسحاق یوں بیان کرتے ہیں جو خود خدیجہؓ کے الفاظ میں یہ ہے ''انی قد رغبت فیک لحسن خلقک وصدق حدیثک''یعنی میں نے آپ کے اچھے اخلاق اور آپ کی سچائی کی وجہ سے آپ کو پسند کیا۔''

آپ نے اس رشتہ کو اپنے چچا ابو طالب اور خاندان کے بڑے لوگوں کے سامنے رکھا' اس سے کسی کو انکار نہ تھا نیز اس سے پہلے دونوں خاندانوں میں رشتہ داری کا رشتہ قائم تھا۔ وہ اس طرح کہ آپ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ عوام بن خویلد، خدیجہؓ کے بھائی کے نکاح میں تھیں۔ خدیجہؓ نے صفیہؓ سے آپ کے حال احوال معلوم کیے۔ دوسری جانب تجارتی قافلہ کی واپسی پر میسرہ کی زبانی وہ حالات سنے جو تجارتی سفر کے دوران پیش آئے تھے۔ اس پر خدیجہ نے اپنی سہیلی نفیسہ بنت امیہ کے ذریعے حضور ﷺ کی خدمت میں نکاح کا پیغام بھیجا۔ آپ نے اسے شرف قبولیت بخشا۔

شادی سے متعلق روایات

(۱) طبرانی نے عبداللہؓ بن عباسؓ سے روایت کی کہ حضرت خدیجہؓ کے والد آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکاح کرنا نہیں چاہتے تھے حضرت خدیجہؓ نے کھانا پکایا اور اپنے باپ اور قریش کے چند لوگوں کو بلایا۔ سب لوگوں نے کھانا کھایا اور شراب پی یہاں تک کہ خویلد کو نشہ چڑھ گیا اس وقت خدیجہؓ نے اپنے باپ سے کہا! میری شادی آنحضرت ﷺ سے کر دیں چنانچہ ان کی شادی آنحضرت ﷺ سے کر دی خدیجہؓ نے اپنے باپ کو خلوق لگائی اور انہیں نیا جوڑا پہنایا۔ اس وقت یہ رواج تھا چنانچہ جب باپ کا نشہ اترا تو اس نے نیا جوڑا اور خلوق لگی دیکھی تو دریافت کیا کہ میرا یہ حال کیسا ہے؟ خدیجہ نے کہا کہ میری شادی محمدؐ بن عبداللہؓ سے ہوگئی ہے' باپ نے کہا! میں ایک یتیم سے تمھاری شادی نہیں کروں گا' اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ خدیجہ نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ قریش کے سامنے یہ کہیں گے کہ میں نشہ میں تھا اور میں نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ چنانچہ خدیجہؓ کے باپ نے جب یہ بات سنی تو راضی ہو گئے۔ (سیرت خدیجہ الکبری از محمد حسیب القادری۔۲۷۔۲۶)

(۲) **ایک اور روایت**: حضرت عمارؓ بن یاسر فرماتے ہیں' میں سب سے زیادہ جانتا ہوں' حضور ﷺ کے خدیجہؓ سے بیان کے بارے میں کیونکہ میں حضور کا ہم عمر تھا اور میں آپ کا دوست اور پیارا تھا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک دن باہر نکلا اور ہم بازار حزورہ میں پہنچ گئے۔ ہمارا گزر سیدہ خدؓیجہ کی بہن کے پاس سے ہوا' وہ ایک بچھونے پر بیٹھی تھی جس کو وہ فروخت کرنا چاہتی تھی اس نے مجھے آواز دی' میں اس کی طرف لوٹ آیا۔ رسول اللہ ﷺ میرے لیے اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ کیا تیرے اس دوست (محمد ﷺ) کو خدیجہؓ سے شادی کرنے کی ضرورت ہے؟ عمارؓ کہتے ہیں کہ میں

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹ کر آیا تو میں نے آپ کو یہ بات بتائی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ہاں! کیوں نہیں: میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بات اس کو بتا دی۔ اس نے کہا کہ تم لوگ صبح کو ہمارے پاس آنا، چنانچہ ہم لوگ ان کے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے ان کو اس طرح پایا کہ انہوں نے گائے ذبح کی ہوئی تھی اور خدیجہؓ کے والد کو ایک جوڑا بھی پہنایا ہوا تھا اور ان کی داڑھی کو بھی رنگ لگایا ہوا تھا (پیلا رنگ یا مہندی وغیرہ) میں نے خدیجہ کے بھائی سے بات کی، اس نے اپنے والد سے بات کی، حالانکہ وہ اس وقت شراب پیئے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان کے سامنے ذکر کیا گیا اور ان کا مرتبہ بھی۔ تم نے ان سے خدیجہ کے ساتھ بیاہ دینے کی درخواست کی، انہوں نے خدیجہؓ کو ان کے ساتھ بیاہ دیا۔ ان لوگوں نے گائے کے گوشت سے کھانا بنایا ہم لوگوں نے اس میں سے کھانا کھایا، پھر ان کے والد سو گئے، پھر وہ اٹھے تو چیخ رہے تھے کہ یہ کیسا جوڑا ہے اور شراب کیسی ہے اور یہ کھانا کیسا ہے؟ چنانچہ ان کی بیٹی نے جس نے خدیجہؓ کی شادی کی بات عمار سے کی تھی، اس نے ان سے کہا کہ یہ جوڑا تمہیں محمدؐ بن عبداللہ، تمہارے داماد نے پہنایا ہے اور یہ گائے ہدیہ کی تھی ہم نے اس کو ذبح کیا ہے اور تم نے خدیجہؓ کے ساتھ بیاہ کیا ہے۔ اس نے انکار کیا کہ اس نے خدیجہؓ کو ان کے ساتھ بیاہ دیا ہے اور چیختا ہوا باہر نکل گیا حتیٰ کہ ایک پتھر کو اٹھا کر لے آیا اور بنو ہاشم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکل آئے اور اس کے پاس گئے اور اس سے بات کی، پھر وہ کہنے لگے کہ وہ تمھارا بندہ کہاں ہے جس کے بارے میں تم کہتے ہو کہ میں نے اس کے ساتھ خدیجہؓ کا بیاہ کر دیا ہے؟
(ترجمہ دلائل النبوہ۔۲۔ص۔۳۲۵)

رسول اللہ اس کے سامنے آ گئے، جب اس نے آپ کی طرف دیکھا تو کہا کہ اگر میں نے اس کے ساتھ بیاہ دی ہے تو ٹھیک ہے اور اگر نہیں بیاہی تھی تو اب میں نے اسے اس کے ساتھ بیاہ دیا ہے۔ اس طرح بھی عمار کی سند سے روایت ہے ایک بار خدیجہ کو ابو ہالہ نے کوہ صفا و مروہ کے درمیان دیکھا اور ہالہ نے خود حضرت عمار کے ذریعہ رسول اللہ کو خدیجہ کا پیغام دیا آپ نے قبول کیا اور دوسرے دن آپ اپنے چچاؤں کے ساتھ خدیجہ کے گھر گئے اور ابو طالب نے نکاح پڑھا۔۔۔۔ علامہ یعقوبی نے خویلد بن اسد کی اس شادی میں بحالت نشہ اور بحالت ہوش ناراضی کی روایت بیان کی ہے۔ پھر اس روایت کے بعد ابن اسحق کی روایت کا حوالہ دیتا ہے کہ خویلد نے خود اپنے ہاتھوں سے اس شادی کی تقریبات کو برضا و رغبت انجام دیا۔ ڈاکٹر مظہر الدین اپنے ایک مضمون نقوش رسول نمبر ا۔۵۷۷ بحوالہ تاریخ یعقوبی عمار والی روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمار والا حدیث کا ٹکڑا الحاقی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مقصد حضرت عمار کی عظمت وشان کی سیاسی رجحان کے سبب ظاہر کرنا ہے۔

یہ روایت بھی کی جاتی ہے کہ حضرت خدیجہ نے اپنے چچا سے ان کی رضا مندی پہلے ہی سے

حاصل کرنے کی جرات نہیں کی مبادا کہ وہ محمد ﷺ کی غربت کی وجہ سے اعتراض کریں اور خاندان کے دوسرے افراد کی طرح انہوں نے اپنے چچا کو بھی اجتماع کا اصل مقصد بتائے بغیر ہی مدعو کیا۔ جہاں تک آپ ﷺ کے چچا کا تعلق ہے تو وہ تقریر کرنے کے لیے اس وقت کے رسم ورواج کے مطابق خدیجہؓ کے اشارہ کا انتظار کرنے لگے تھے جب کھانا کھلا دیا گیا تو حضرت خدیجہؓ نے اس طرف خصوصی توجہ دی جو کچھ ان کے چچا نے پیا جب چچا نے پینا شروع کیا تو خدیجہؓ نے انہیں خوبصورت چادر سے ڈھانپ دیا' انہیں زعفران سے بنی ہوئی خلوق لگائی اور پھر ابو طالب کو اشارہ کیا۔ ابو طالب کھڑے ہوئے' انہوں نے معمول کے مطابق عورت کے خاندان کے سربراہ سے باضابطہ اجازت چاہی۔ اپنی تقریر میں ابو طالب نے اپنے بھتیجے کی بے مثل و بے نظیر خوبیوں کو بیان کیا جو کسی بھی دوسرے مکی جوان میں نہیں تھیں' انہوں نے مزید کہا کہ ان کا بھتیجا اگرچہ امیر نہیں ہے مگر دولت ڈھلتے سائے کی طرح ہے' تاہم قابل ذکر بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو بہتر سمجھتے ہیں' چنانچہ دونوں کے ملن میں اس سے زیادہ مناسب وموزوں بات نہیں ہوسکتی۔ خدیجہ کے چچازاد ورقہ بن نوفل کو بھی لازمی طور پر اعتماد میں لیا گیا۔ وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ کہہ کر اس تجویز کی تائید کی کہ " محمد ﷺ ایک ایسے اچھی نسل کے اونٹ کی مانند ہیں جسے بٹھانے کے لیے اس کی ناک پر چھڑی نہیں مارنا پڑتی "۔ حضرت خدیجہؓ کے چچا ساکت و جامد رہے اور ان کی خاموشی ہی کو رضامندی سمجھا گیا۔ معمول کی تالیوں اور مبارکبادیوں کی گونج میں مہمان خشک کھجور اور مصری کی ڈلیوں کی طرف لپکے' جو روایتاً دلہا کے سر پر پھینکی جاتی ہیں یہ شام کا وقت تھا جب بوڑھا چچا عمرو بن اسد نیند سے بیدار ہوا اور انتہائی حیران زدہ ہو کر پوچھا کہ یہ خوشبویات' مہک آمیز دھواں' پرتکلف لباس اور موسیقی کہاں سے آئے؟ خدیجہؓ نے جواب دیا" لیکن یہ تو آپ ہی ہیں جنہوں نے عبداللہ کے بیٹے محمد ﷺ سے شہر کے معززین کی موجودگی میں آج میرا نکاح کیا ہے۔ اس پر چچا اور آزاد و خود مختار بھتیجی میں تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ابن سید الناس اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شادی شدہ جوڑے کے دونوں طرف سے کچھ نوجوان رشتہ داروں نے ہتھیار اٹھا لیے تھے لیکن انہیں استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب عمرو نے دیکھا کہ دلہا ایک اعلیٰ خاندان کا اور شریف النسل نوجوان ہے اور یہ کہ خدیجہؓ کوئی مصلحت رعایت نہیں کرے گی تو اس نے بہتر یہی سمجھا کہ خاموشی اختیار کی جائے اور اس میں شوہر کو اپنی دلہن لے جانے کی خوشی و آمادگی کے ساتھ اجازت دے دی۔" (پیغمبر اسلام۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ص ۷۶)

روایات کے بارے میں تضادات

اول و دوم روایات میں ہے کہ خدیجہؓ کا باپ زندہ تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا جبکہ روایت سوم میں ہے

کہ خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد نشہ میں مست تھا (۲) اول دوم روایتوں میں ہے کہ خدیجہؓ کے باپ خویلد نے خود اپنی بیٹی کی شادی کی' اگرچہ کچھ تند و تیز باتیں ہوئیں لیکن روایت سوم میں ہے کہ عمرو بن اسد نے بطور ولی کے یہ شادی کی۔ آنحضرت سے خدیجہ کو بیاہ دیا اور خویلد کا ذکر تک نہیں (۳) پہلی روایت میں ہے کہ خویلد نے کہا میں یتیم سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کروں گا اور بیاہ بھی دیتا ہے جبکہ روایت سوم میں عمرو بن اسد کا ذکر ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو خدیجہؓ سے بیاہ دیا تھا نیز خدیجہؓ نے اپنے چچا کو شادی کی خبر دی اور نہ ہی ان سے رضامندی حاصل کرنے کی جرات کی کہ ان کا چچا غربت کی وجہ سے اعتراض کر کے پیچیدگی پیدا نہ کر دیں۔۔اور دوسرے افراد کی طرح انہیں مدعو کیا گیا۔

اردو ترجمہ' دلائل النبوہ۔ ج ۲ ص ۳۲۶ میں عبداللہؓ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ خدیجہ کے والد نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیاہ دیا میرا گمان ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ نشے کی حالت میں تھے ۔۔۔ڈاکٹر عبدالمعطی حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اس روایت کو امام احمد نے مسند میں طویل نقل کیا ہے مگر اسناد ضعیف ہیں اور ہیثمی نے اسے ''الزوائد'' میں طبرانی سے نقل کی ہے' انہوں نے کہا کہ طبرانی اور مسند احمد کے راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ (ویسے یہ کوئی حیرانی والی بات نہیں ہے یہ اس دور کی عادت تھی۔ مترجم)(۲) عمر بن ابوبکر سے روایت ہے کہ مجھے یہ حدیث متعدد لوگوں نے بیان کی کہ عمرو بن اسد نے خدیجہ کا بیاہ آنحضرت ﷺ سے کیا تھا۔

(۳) موصلی نے کہا کہ متفق علیہ بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کا نکاح خدیجہ سے جس نے کیا تھا' وہ عمرو بن اسد' خدیجہ کا چچا تھا۔

(۴) ضیا النبی جلد۲ ص ۱۳۸ پر ابن اسحٰق کے حوالے سے یہ روایت ہے کہ وہ (خویلد) زندہ تھے نکاح کی تقریب سے پہلے انہیں شراب پلا دی گئی' وہ بے ہوش ہو گئے اور اس حالت میں ان سے نکاح کی اجازت لی گئی۔ نکاح کے بعد انہیں نیا لباس پہنایا گیا اور کستوری لگائی گئی' جب انہیں ہوش آیا تو پوچھا یہ شور و غوغا کیسا ہے؟ یہ خوشبو کس نے لگائی؟ اور یہ زرق برق لباس مجھے کس نے پہنایا ہے؟ حضرت خدیجہؓ نے جواب دیا! میرے باپ نے میری شادی محمد بن عبداللہ (فداہ ابی وامی) کے ساتھ کر دی ہے۔ اس خوشی میں یہ سب کچھ ہے۔ خویلد کہنے لگے میں نے نہیں کی اور میں کر بھی کیسے سکتا ہوں' جبکہ بڑے بڑے اکابر قریش کی درخواست کو میں نے مسترد کر دیا۔ امام ابن جریر طبری یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں' واقدی نے کہا کہ یہ روایت غلط ہے اور جو روایت صحیح سند کے ساتھ مروی ہے وہ یہ ہے کہ نکاح عمرو بن اسد نے پڑھایا اور خدیجہؓ کا باپ خویلد حرب فجار سے کئی سال پہلے فوت ہو چکا تھا اس روایت کی امام طبری نے متعدد صحیح سندیں تحریر کی ہیں۔ اول بواسطہ محمد بن جبیر بن مطعم۔ (ب) بواسطہ ام المومنین عائشہ

(ج) بواسطہ ابن عباس رضوان اللہ علیھم یہی مروی ہے کہ حضرت خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد نے ان کا نکاح اللہ کے رسول کے ساتھ کیا۔ حضرت خدیجہؓ کے والد حرب فجار سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ صاحب ضیا النبی فرماتے ہیں کہ اس صحیح روایت کے علاوہ درایت بھی ابن اسحٰق کی اس روایت کی تصدیق نہیں کرتی۔ آنحضرت ﷺ کی ذات والا صفات ظاہری حسن و جمال نیز اپنے معنوی محامد و کمالات کے باعث اہل مکہ کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی تھی۔ جس گلی سے گزرتے' دیدہ و دل ان کے قدموں میں از خود بچھے چلے جاتے' ان کی امانت و صداقت کی صفات سے اپنے بیگانے اتنے متاثر تھے کہ سب آپ ﷺ کو الامین اور الصادق کے لقب سے پکارتے تھے۔ کسی بڑے سے بڑے رئیس کو بھی اگر آنحضرت ﷺ اپنے داماد ہونے کے شرف سے مشرف فرماتے تو وہ اس کو اپنے لیے بڑا اعزاز تصور کرتا۔ خویلد اگر زندہ ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ نیز یہ تقریب نکاح لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کسی گوشہ تنہائی میں منعقد نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ تو ایک محفل عام تھی۔ بنو ہاشم کے سردار عبد المطلب کے فرزند اور آنحضرت ﷺ کے چچاؤں نے اس میں شرکت کی تھی' ان کے علاوہ خاندان قریش کے قابل ذکر افراد مدعو تھے۔ ان کی غیرت کب یہ گوارا کر سکتی تھی کہ ایک ایسی بیوہ سے اپنے عدیم المثال بھتیجے کا عقد کریں اور اس کا باپ رضامند نہ ہو' پھر اس کے لیے ایک ایسی نازیبا حرکت کریں جو اس جاہلی معاشرہ میں بھی بنظر استحسان نہ دیکھی جاتی تھی۔ خود خدیجہؓ جیسی عفت مآب اور عصمت شعار خاتون جو اس فسق و فجور کے دور میں "الطاہرہ" کے لقب سے مشہور تھی' اپنے لیے اس طرز عمل کو کیونکر پسند کر سکتی تھی؟۔۔۔ابن اسحٰق کی یہ روایت عقل و نقل' درایت و روایت یعنی کسی معیار پر پورا نہیں اترتی۔ عصر حاضر کے مایہ ناز محقق امام محمد ابوزہرہؒ رقمطراز ہیں "یعنی ابن اسحٰق کی یہ روایت جس میں یہ مذکور ہے کہ حضرت خدیجہ کا نکاح ان کے والد خویلد نے پڑھایا تھا' صحیح نہیں ہے کیونکہ خویلد حرب فجار سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔" علامہ سہیلی نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔

علامہ ابن کثیر نے السیرت النبویہ میں تصریح کی ہے کہ خود ابن اسحٰق نے بھی اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ علامہ ابن کثیر نے سہیلی کے قول کی تائید کی ہے۔ (صاحب ضیا النبی کی تقریر ختم ہوئی)

علامہ ابن جوزی (احوال مصطفیٰ ترجمہ الوفا۔ ص۔۱۸۲) فرماتے ہیں کہ خویلد حرب فجار ثانی سے پہلے وفات پا گئے تھے اور یہ نکاح پانچ سال بعد ہوا۔

مارٹن لنگس (مترجم: ابوبکر سراج الدین) اپنی کتاب "محمد ﷺ" صفحہ ۹۷ پر لکھتی ہیں' دونوں کے مابین (یعنی نبی مکرم ﷺ اور خدیجہؓ) یہ طے ہوا کہ آپ ﷺ اپنے چچا سے اور وہ اپنے چچا عمرو بن اسد سے تذکرہ کریں گی کیونکہ ان کے والد خویلد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہاشمیوں نے اس موقع پر حضرت حمزہؓ کو اپنی جانب سے نمائندگی سپرد کی۔ ان کی بہن حقیقی صفیہؓ کی شادی کچھ ہی دن پہلے خدیجہؓ کے بھائی عوام

سے ہوئی تھی۔ حمزہ اپنے بھتیجے کے ہمراہ عمرو بن اسد کے پاس گیا اور ان سے بھتیجے کے لیے خدیجہؓ کا رشتہ مانگا۔ طے ہوا کہ محمد ﷺ خدیجہؓ کو مہر کے طور پر بیس اونٹنیاں دیں گے۔

اعتراض نمبر ۹۱

سر ولیم میور لکھتا ہے ''خدیجہؓ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف نبی اکرم ﷺ سے شادی کرنا چاہتی تھی ٥ جس دن نکاح کی تاریخ آئی' اس نے گائے ذبح کی ٥ اور اپنے باپ کو کھلائی اور خوب شراب پلائی ٥ جب وہ نشہ میں چور ہو گیا تو اس وقت نبی ﷺ کو بلا بھیجا۔ خویلد نے نشہ کی حالت میں اپنی بیٹی کا نکاح پڑھ دیا' لیکن جب ہوش آیا' چاروں طرف نظر دوڑائی اور گائے ذبح ہونا' کھانے کا پکنا اور براتیوں کا اجتماع اس کی سمجھ میں نہ آیا' اس سے بیان کیا گیا کہ محمد ﷺ تمہارے داماد ہیں اور تو نے ابھی اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا ہے ٥ یعنی ان کی زوجیت میں دے دیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ غصہ سے کانپنے لگا اور کہا ہرگز میں اپنی حسین بیٹی قریش کے ایک غریب لڑکے سے نہیں بیاہوں گا ٥۔ بڑے بڑے عربی رئیس اس کے خواہش مند ہیں۔ اس بات کو سن کر آنحضرت ﷺ کے چچاؤں کو غصہ آ گیا اور انہوں نے نہایت سخت لہجہ میں جواب دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کی خواہش نہیں کی تھی بلکہ اس نے اپنی خوشی سے ہی درخواست کی تھی اور اس کی تحریک سے یہ شادی ہونا قرار پائی تھی ٥ الغرض فریقین سے اس قدر تیزی برتی گئی کہ تلواریں کھچ گئیں مگر یکا یک خدیجہؓ کا بوڑھا باپ ٹھنڈا پڑ گیا اور باہم مصالحت ہو گئی ٥'' (سیرت الکبریٰ از تاج الدین تاج ص ۲۸)

جواب: روایات کا پیچھے ذکر کیا گیا ہے جس سے حقیقت کھل کر سامنے آ گئی یعنی

کھل گئی ساری حقیقت پیشِ یار
ہے اگر یہ بوئے تو نابود ہوں

ولیم نے روایات سے کہانی گھڑی ہے جبکہ یہ اخلاق سے عاری دل سوز اور من گھڑت ہے اس کی حقیت جاننے سے پہلے چند ابتدائی باتیں منظر عام پر لانا ضروری ہیں۔

مشیت ایزدی: حضرت ابو سعیدؓ خدری سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنی ازواج میں سے کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور نہ اپنی بیٹی کسی کے نکاح میں دی' جب تک جبرائیل اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر میری جانب نہ آئے۔ (سیرت خدیجہؓ الکبریٰ از محمد الحسیب القادری۔ ص۔ ۳۰)

سعادت مند خواب: حضرت خدیجہ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند ان کی گود میں آ گیا ہے۔ اس خواب کی تعبیر بحیرا راہب سے پوچھی گئی' اس نے کہا: اے ملکہ قریش! ایک اولوالعزم رسول ملک عرب میں پیدا ہو چکا ہے' عنقریب تمہیں اپنے نکاح میں لائے گا اور تمام جہاں اس کے

مذہب کے انوار سے ضوفشاں ہو جائے گا۔

ورقہ بن نوفل اور خدیجہ میں مکالمہ: خدیجہ کے غلام میسرہ نے جو حضور ﷺ کے ہمراہ شام کے تجارتی سفر میں تھا واپسی پر آپ کی امانت و دیانت کے علاوہ جو محیر العقول واقعات دوران سفر پیش آئے تھے، اپنی مشفق مالکن سے کہہ دیئے۔ دوسری طرف خود طاہرہ نے تجارتی قافلہ کا مکہ میں داخل ہوتے ہوئے اپنے مکان کے بالا خانے سے نظارہ کیا تھا۔ وہ دیکھتی ہیں کہ گرمی کی شدت سے بچاؤ کے لیے فرشتے ان پر سایہ کناں ہیں۔ اپنی آنکھوں دیکھا حال اور اپنے غلام میسرہ کے بیان کردہ واقعات اپنے چچا ورقہ سے بیان کیے۔ وہ بہت بڑا عیسائی عالم تھا۔ ورقہ نے کہا: اے خدیجہؓ! اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو پھر یقیناً آنحضرت ﷺ اس امت کے نبی ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس امت میں ایک نبی آنے والا ہے، جن کا ہمیں انتظار ہے اور ان کا زمانہ عنقریب آ گیا ہے۔ (امہات المومنین ص ۵۴)

عورتوں کا میلہ: عرب میں قریشی عورتوں کا میلہ لگتا تھا ایک دفعہ خدیجہؓ نے میلہ میں شرکت کی۔ ایک یہودی منجم بھی وہاں چلا آیا اور خواتین سے یوں مخاطب ہوا ''اے قریش کی عورتو! عنقریب یہاں ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے اگر تم میں سے کوئی خاتون اس سے نکاح کی خواہش مند ہو تو کوشش کرے۔'' اب آتے ہیں ان الزامات کی طرف جو ولیم نے من گھڑت کہانی میں دھرے ہیں

اس شادی کے سلسلے میں ہاشمیوں نے حضرت حمزہؓ کو اپنی جانب سے نمائندگی سپرد کی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی حقیقی بہن حضرت صفیہ کی شادی کچھ دیر پہلے خدیجہؓ کے بھائی عوامؓ سے ہوئی تھی حمزہ اپنے بھتیجے کے ہمرہ عمرو بن اسد کے پاس گئے اور ان سے اپنے بھتیجے کے لیے اس کی بھتیجی خدیجہؓ کا رشتہ مانگا۔ طے ہوا کہ محمد ﷺ خدیجہؓ کو مہر کے طور پر بیس اونٹنیاں دیں۔

اعتراض نمبر ۹۱ کا (الف) جز

''یہ الزام کہ خدیجہ نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف آنحضرت ﷺ سے شادی کرنا چاہی تھی۔''

جواب: سوال یہ ہے کہ کیا خدیجہؓ نے اپنے باپ یا چچا سے شادی کرنے کی اجازت چاہی تھی اور انہوں نے خدیجہ کو آپ ﷺ سے بیاہنے کا انکار کیا تھا؟ عرب کے سرداروں نے خدیجہؓ سے شادی کے پیغامات بھیجے تو کیا خدیجہؓ کے باپ نے ان میں سے کسی کے حق میں ہاں کر دی تھی یا کہیں اور رشتہ جوڑنا چاہتے تھے اور طاہرہ نے اسے ناپسند کرتے ہوئے انکار کر دیا تھا؟ اس بناء پر باپ بیٹی میں کوئی ٹسل چل رہی تھی؟ کیا خدیجہ کے والد بوقت نکاح زندہ تھے یا وفات پا چکے تھے یہ سوالات مستشرق کے الزامات کا رد کرتے ہیں۔

خدیجہؓ عاقل، بالغ، مالدار، شریف النفس اور طاہرہ کے اوصاف کی مالکہ تھی۔ دو شوہروں کی بیوہ، خود مختار، تجربہ کار اور اپنے تجارتی کاروبار کی واحد مالکہ تھی اس وقت آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ طاہرہ

کے اس جائز فعل پر کوئی امر مانع نہیں تھا نیز اس کا والد اس احسن اقدام پر بھلا کیسے معترض ہو سکتا تھا؟ آنحضرت ﷺ الصادق والامین کے القابات سے مشہور تھے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ اور آپ کے خاندان والے خدیجہؓ کو غلط راہ پر لگانے کا اقدام قطعاً اٹھا نہیں سکتے تھے اور دوسری طرف خدیجہ طاہرہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وقت کے رسم ورواج کے مطابق عورت اپنی مرضی کی شادی کر سکتی تھی کوئی قدغن اور پابندی نہیں تھی۔ عورت کو آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہیے شادی رچا لے حضرت عبدالمطلب کی والدہ حضرت سلمٰی النجاریہ اپنے نکاح میں یہ شرط رکھتیں کہ وہ جب چاہے گی اپنے شوہر کو طلاق دے دے گی یعنی نکاح کے وقت اپنا طلاق کا حق شوہر سے حاصل کر لیتیں آج کل بھی عورت کو خلع کا حق حاصل ہے۔ (مولانا شبلی سیرت النبی۔ ج ا۔ ص ۱۲۲) کہتے ہیں کہ عرب عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں۔ نیز اس میں بالغہ اور نابالغہ کی قید نہ تھی۔ اس طرح خدیجہؓ طاہرہ نے اپنے چچا عمرو بن اسد کے ہوتے ہوئے نکاح کے تمام مراحل براہ راست طے کر لیے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ سر ولیم میور نے تاریخی حقیقت سے آنکھ چرالی ہے اور اسے تاریخ میں یہ کہیں نظر نہ آیا کہ خدیجہؓ طاہرہ کا باپ خویلد وفات پا چکا تھا جب ان کا نکاح آنحضرت ﷺ سے ہوا۔ جیسا کہ ’’مبرذ‘‘ اور دوسرے مورخین کہتے ہیں کہ طاہرہ کا والد حرب الفجار میں یا اس سے قبل انتقال کر گیا تھا اور بوقت نکاح زندہ نہ تھا۔ جب کہ ابن عباس کی روایت میں ہے کہ یہ رشتہ طاہرہ کے والد نے جوڑا تھا لیکن امام سہیلی نے لکھا کہ مبرد وغیرہ کا قول ہی درست اور صحیح ہے اور یہی جبیر بن مطعم، سیدہ عائشہ اور سیدنا ابن عباس کی ایک روایت میں منقول ہے۔‘‘

فرض کریں اگر نکاح درست نہیں تھا اور بقول ولیم میور باپ کی مرضی شامل نہ تھی تو خویلد نکاح فسخ کر سکتے تھے مگر انہوں نے نکاح فسخ نہیں کیا، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ نکاح کی تنسیخ کی نوبت تب آتی اگر خویلد زندہ ہوتے۔ اور فرض کریں کہ اگر نشہ کی حالت میں نکاح پڑھا ہوتا اور اس رشتہ پر راضی نہ ہوتے تو تنسیخ نکاح کا قضیہ پیش آتا۔ ابن اسحٰق، طبری اور دیگر مورخین نے بروایت صحیح لکھا ہے کہ خویلد نکاح سے قبل وفات پا گئے تھے اور چچا کی ولایت میں نکاح ہوا۔ بھائی اور چچا نے برضا ورغبت رشتہ کیا۔ اس سے بڑھ کر دونوں خاندانوں کی رضامندی اور کیسے ہو سکتی تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ خدیجہؓ نے اپنی باندیوں کو حکم دیا کہ دف بجا کر خوشی کا اظہار کریں۔ یہ اظہار مسرت کا انتظام نہ کیا جاتا اگر یہ شادی دونوں خاندانوں کی مرضی کے بغیر انجام پاتی۔

یہ تقریب چھپ کر نہیں کی گئی تھی یہ ایک عام محفل تھی۔ بنو ہاشم کے سردار اور آپ کے چچے اور قریش کے اکابرین شریک تھے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ باپ کی رضامندی کے بغیر شادی کی جاتی۔ یہ

عربوں کی غیرت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری طرف خدیجہؓ طاہرہ اپنے باپ کی مرضی کے بغیر شادی کرنا پسند نہ کر سکتی تھی۔

اعتراض نمبر ۹۱ کا (ب) جز

اس (خدیجہؓ) نے گائے ذبح کی۔'' جواب: براتیوں کی ضیافت کے لیے گائے ذبح کی گئی۔ ولیم میور نے مختلف روایات سے اپنے مقصد کی باتیں لے کر اپنی اس روایت میں مرچ مصالحہ لگا کر اور مزے دار بنا کر بیان کیا ہے۔ یہ یاد رہے کہ سر ولیم میور انگریز حکومت کا نمائندہ تھا۔ صوبہ جات آگرہ اور اودھ کا لفٹیننٹ گورنر تھا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آگرہ میں شعبہ جاسوسی کا سربراہ تھا۔ اس کا بھائی جان میور بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ ان کی وفاداریاں انگریز حکومت کے ساتھ تھیں جس کا راج مضبوط کرنے کے لیے اور برطانوی حکومت کے تاج کو ہمیشہ کے لیے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ولیم میور مستشرق دور کی کوڑی لایا ہے۔ وہ یوں کہ انگریز حکومت کی پالیسی برصغیر ہندوپاک میں divide and rule کی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پھوٹ ڈال کر دو دھڑوں میں تقسیم کرنے کا خواہاں تھا' جبکہ وہ پہلے ہی بٹے ہوئے تھے۔

ایک دھڑا جو اپنی روایات و اقدار کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک الگ وطن چاہتا تھا جبکہ دوسرا دھڑا علیحدہ وطن پاکستان کے قیام کا مخالف تھا۔ اس طرح ہندو مسلم میں ہر ممکن اختلافات کے فاصلے بڑھائے' جن کا پاٹنا ناممکن ہو گیا اور یہ اختلاف بتدریج ہندوؤں اور مسلمانوں میں بدستور چلے آ رہے ہیں۔ مستشرق کا ضیافت میں گائے ذبح کرنے سے یہ مقصود تھا کہ ہندو مسلم یک دوسرے کے جانی دشمن بنے رہیں اور ایک دوسرے کے دست و بازو نہ بنیں۔ پیغمبر ﷺ اور خدیجہ کی طرف سے ہندوؤں کے دل میں نفرت کا بیج بویا' اس نفرت کے بیج سے دشمنی کا تن آور درخت برگ و بار لے آیا اور ہندو و مسلم آپس میں لڑتے رہے اور انگریز حکومت مزے سے چلتی رہی۔۔۔ ہندو گاؤ ماتا کی پوجا کرتے ہیں اور مسلمان اسے ذبح کر کے مزے سے کھاتے ہیں۔ ہندوؤں کی پوجا پاٹ کی مقدس گاؤ ماتا کو کاٹ کر کھانا ہندوؤں کو نہیں بھاتا تھا اس طرح ضیافت میں گائے ذبح کرنے کو خدیجہ و پیغمبر ﷺ سے منسوب کر کے ہندو و مسلم کے درمیان مذہبی منافرت پھیلانا اور ان کی دشمنی کو ہوا دینا گویا جلتی پر تیل چھڑکنا تھا۔ جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاصلے بڑھائے اور اپنی دشمنی کی بھڑاس نکالی وہاں اپنی مذہبی اور حکومتی سیاسی وفاداریوں کو بھی پورا کیا یعنی ایک تیر سے دو نشانے۔۔۔ بلکہ کئی نشانے۔

اعتراض نمبر۹۱ کا (ج) جز

خویلد کو شراب پلائی۔ جب وہ نشہ میں چور تھا تو نکاح کا خطبہ پڑھا، گائے ذبح کی کھانا پکا' اور لوگوں کا اجتماع اس کی سمجھ میں نہیں آتا، اس سے بیان کیا گیا کہ آنحضرت ﷺ تمہارے داماد ہیں اور تو نے ابھی اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا ہے۔۔۔۔

جواب: سر ولیم میور کہتا ہے کہ خدیجہؓ کا باپ نشہ میں تھا اور نشہ کی حالت میں خطبہ نکاح پڑھایا گیا۔ خویلد کے بھائی عمرو بن اسد اور چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل اور دیگر مدعو حضرات نے شراب نہیں پی تھی اور نہ ہی نشہ میں دھت تھے انہوں نے براتیوں کو خویلد کے مکان پر کیوں آنے دیا اور انہیں کیوں بٹھایا گیا؟ اور نہ ہی انہوں نے آپ ﷺ اور آپ کے ہمراہیوں سے پوچھا کہ تم یہاں کیسے آئے ہو؟ ہر ایک کو دعوت میں بلائے جانے کا علم تھا۔ خویلد اپنے قبیلہ کا سردار تھا وہ اتنا بے خبر نہیں تھا کہ اسے یہ خبر نہ ہو کہ اسے شراب کیوں پلائی گئی۔ ابو طالب نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد آنحضرت ﷺ کا ابراہیمؑ کی نسل سے ہونے کا بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ میرا بھتیجا ایسا جوان ہے کہ کوئی قریشی مرد اس کے ہم پلہ نہیں۔۔۔۔ یہ وہ ہستی ہے جسے خویش و اقارب خوب پہنچانتے ہیں بلاشبہ آپ خدیجہ کی خواستگاری چاہتے ہیں اور میں اپنے مال سے ان کا مہر بیس اونٹ مقرر کرتا ہوں۔ پھر ورقہ بن نوفل نے اپنے خطبہ میں کہا: ''اس خدائے برتر کی حمد و ثناء جس نے ہمیں ایسا بنا دیا۔۔۔۔ ہمیں وہ فضیلت بخشی۔۔ اور اس بناء پر ہم تمام عربوں میں سب سے برتر ہیں اور ان کے پیشوا ہیں اور بلاشبہ ہم سب کی خواہش ہے کہ تمھارے ساتھ عقد و نکاح کے ذریعے اتصال ہو' تو اے گروہ قریش! تم گواہ رہو کہ میں نے خدیجہؓ بنت خویلد کو محمدؐ بن عبداللہ کی زوجیت میں چار سو مثقال عوض مہر پر دیا۔'' پھر عمرو بن اسد نے کہا ''اے گروہ قریش! گواہ رہو کہ میں نے خدیجہؓ بنت خویلد کو محمد بن عبداللہ کی زوجیت میں دیا پھر دونوں جانب سے ایجاب و قبول ہوا۔'' (مدراج النبوہ۔۲۔۴۵) ایجاب و قبول کے بعد سردارانِ قریش نے ابو طالب اور دیگر عمائدین بنو ہاشم کو مبارک باد دی۔

ایک نکتہ: بعض روایات میں حق مہر ساڑھے بارہ اوقیہ سونا تھا' ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے یعنی حق مہر پانچ سو درہم ہوئے اس میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایک شتر کی قیمت پانچ سو درہم یا چار سو مثقال ہوگی۔ (ساڑھے چار اوقیہ سونا جو اوپر مذکور ہوا وہ درست نہیں ہے یہاں پر ساڑھے بارہ اوقیہ سونا ہونا چاہیے شائد یہ سہو ہوا ہے نیچے تفصیل درج ہے۔) ایک اوقیہ برابر ہے چالیس درہم تو ساڑھے بارہ اوقیہ برابر ہوگا پانچ سو درہم کے لہٰذا ساڑھے چار اوقیہ سونا درست نہیں۔ دوسرے دن ابو طالب نے دعوت ولیمہ پر رؤساء قریش کو مدعو کیا۔

نکاح خواں ابو طالب' ورقہ بن نوفل اور عمرو بن اسد ہیں۔ عمرو بن اسد کی ولایت میں نکاح ہوا

کیونکہ خویلد کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ حرب فجار ثانی سے قبل ہی وفات پا گئے تھے۔ جب سر ولیم میور کی اس من گھڑت کہانی میں مرکزی کردار یعنی خویلد اس تقریب میں موجود نہیں ہے تو ساری کہانی جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوئی لیکن مستشرقین کی یہ پرانی روش ہے کہ وہ محض الزام لگاتے ہیں لیکن تاریخی حقائق سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ انہیں حقیقت شناس بنائے۔

اعتراض نمبر ۹۱ کا (د) جز

''ہرگز اپنی بیٹی حسین و جمیل کو قریش کے ایک غریب لڑکے سے نہیں بیاہوں گا''

جواب: یہ ذہن نشین رہے کہ طاہر اور طاہرہ کے حسن و جمال کا تقابل مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ان کے حسن و جمال کے کمال میں کمی بیشی کے فرق کو بیان کرنا ہے کیونکہ وہ دونوں ہستیاں سراپا جمال و کمال ہیں بلکہ صرف اور صرف عیسائی مستشرق ولیم میور کے الزام میں استعمال شدہ الفاظ کو زیر بحث لانا ہے جو امر مجبوری ہے نیز قارئین کی دلی خلش کو دور کرنا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی دل میں ولیم میور کے بیان سے شک وشبہ کا وسوسہ پیدا ہو۔

خدیجۃ الکبریٰؓ کے حسن و جمال کی خبر اور تصدیق ان کے والد دے رہے ہیں، اب شاہ خوباں جان دو عالم ﷺ کے حسن کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حسن و جمال مصطفیٰ ﷺ کے بارے جان ڈیون پورٹ لکھتا ہے کہ ''آپ کی شکل شاہانہ تھی' خط و خال باقاعدہ اور دل پسند تھے آنکھیں سیاہ اور منور تھیں' بینی ذرا اٹھی ہوئی' دہن خوبصورت تھا' دانت موتی کی طرح چمکتے تھے' رخسار سرخ تھے آپ کی صحت نہایت اچھی تھی' آپ کا تبسم دل آویز اور آواز شیریں و دل کش تھی۔ (نقوش رسول نمبر۔۴۔۵۳۰)

ایڈورڈ گبن کہتا ہے ''آنحضرت ﷺ حسن میں شہرہ آفاق تھے اور یہ نعمت صرف انہی کو بری معلوم ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا نہیں ہوئی پیشتر اس کے کہ آپ ﷺ بات فرمائیں آپ کسی آدمی یا گروہ کو متوجہ کرلیا کرتے تھے' لوگ آنحضرت ﷺ کی شاہانہ شکل' نورانی آنکھیں' خوش نما تبسم' بکھری ہوئی داڑھی (گھنی داڑھی) اور ایسا چہرہ جو دل کے ہر ایک جذبہ کی تصویر کھینچ دے اور ایسے حرکات وسکنات جو زبان کا کام دیں' دیکھ دیکھ کر تعریف کیا کرتے تھے۔'' دو مستشرقین کی آراء اس لیے بیان کیں تاکہ ولیم میور کے ہمنواؤں سے الزام کا رد ہو کیونکہ گھر کی گواہی معتبر سمجھی جاتی ہے۔ مستشرق کے الزام کا جواب مستشرق ہی سے لیا تاکہ ان کی تضاد بیانیاں واضح ہوں۔ مستشرق کے الزام کا رد مستشرق ہی کرے تو وہ زیادہ معتبر ہے یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انہیں مسلمانوں کی بات سے چڑ ہے اور درست بات کو بھی نہیں مانتے شائد اپنوں کی مان لیں۔ اب قارئین کی تسلی کے لیے مسلمانوں کے پیغمبر حضرت داودؑ نے جو تعریف و توصیف فرمائی وہ پیش کی جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں ''تو حسن میں بنی آدم سے کہیں

زیادہ ہے تیرے ہونٹوں میں لطف بٹایا گیا ہے اس لیے خدا نے تجھے ابد تک مبارک باد کیا۔'' (نقوش رسول نمبر۴۔۴۴۰) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (پیغمبر اعظم و آخر۔۳۹) لکھتے ہیں کہ ورقہ بن نوفل جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے شمائل اس طرح بیان کرتے ہیں ''اس کا چہرہ چاند سا، پیشانی روشن، آنکھیں سیاہ، اس کی خوش بو مشک سے زیادہ معطر اور اس کی بات شیریں ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے چودھویں رات کا چاند متحرک ہو اور ابرِ رحمت برس رہا ہو۔۔ وہ پیکرِ حسن اور عالی نسب ہے۔ وہ حسنِ سیرت میں دنیا بھر میں بہترین اور اخلاقِ حسنہ کا مرکب ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو اس کے لٹکے ہوئے بالوں سے سیاہی ٹپک ٹپک پڑتی ہے۔ اس کے رخسار گلاب کی کلی سے زیادہ شاداب ہیں اور اس کی خوش بو خالص مشک سے زیادہ معطر اور اس کی باتیں شہد و شکر سے زیادہ شیریں ہیں''۔ کیا دونوں ہستیاں حسن و جمال میں بے مثل نہیں ہیں تو اور کس شان کے فرد سے ان کا باپ اپنی لڑکی کو بیاہنے کے لیے تیار تھا بلکہ جب آپ ﷺ کو دیکھا تو پکار اٹھا اگر یہی وہ جوان ہے جسے میں نے اپنی بیٹی کو بیاہا ہے تو ٹھیک ہے اگر نہیں بیاہا تو اب بیاہ دیتا ہوں۔ اب کسی اور بیان کی ضرورت نہیں رہ جاتی کیونکہ جسے اختلاف تھا وہ اتنا خوش وخرم کہ خود بیاہنے کی حامی بھر لیتا ہے حالانکہ وہ بہت پہلے فوت ہو چکا تھا۔ یہ چند سطریں ان کے لیے لکھیں' جو خدیجہؓ کے باپ کے زندہ ہونے کی بات کرتے ہیں۔

اعتراض کا دوسرا حصہ یہ ''قریش کے ایک غریب لڑکے سے نہیں بیاہوں گا''۔ اس کا رد بھی ایک غیر مسلم کی زبانی سنیئے۔ ''آپ کو مال و دولت جمع کرنے یا امیر بننے کی خواہش نہیں تھی بلکہ آپ نہایت درجہ سادگی پسند اور منکسر المزاج شخص تھے۔ (مہاشے منوہر سہالے۔ ن۴۔۴۵۳) وشونرائن لکھتا ہے کہ ''دولت' عزت وجاہ وحشمت کی خواہش سے آنحضرت ﷺ نے اسلام کی بنیاد نہیں ڈالی تھی' شاہی تاج ان کے نزدیک بے مایہ شے تھی' تخت شاہی کو آپ ٹھکراتے تھے' دنیاوی وجاہت کے بھوکے نہیں تھے

ان کی زندگی کا پیغام موت وحیات کے متعلق اہم زاویوں کا پرچار کرنا تھا۔ (حوالہ بالا)۔ آپ کو کفار مکہ نے سرداری و مال ودولت' خوبصورت دوشیزاؤں وغیرہ کی پیش کش کی مگر آپ نے سب کچھ ٹھکرا دیا۔ اگر آپ امیر بننے کے خواہش مند ہوتے تو یہ موقع غنیمت تھا۔ (۲) آپ ﷺ نے اپنے باپ سے ورثہ میں پانچ اونٹ' بکریوں کا ریوڑ' ایک مکان جو آپ کے چچا ابو طالب اور آپ کا مشترکہ تھا' اور ام ایمن بطور کنیز پائی۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک سو گوسپندیں اور سات بکریاں تھیں' ان بکریوں کے نام عمروہ' زم زم' سقیہ' برکہ' اطلال' المراف اور غثیہ تھے۔ جنہیں چرانا ام ایمن کی ذمہ داری تھی (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔۲۸۱)

یہ اثاثہ ان کی مال داری اور ثروت مندی کا ثبوت نہ سہی مگر ان کے فقر وفاقہ میں گھرے رہنے اور

غربت کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں جس کے پاس آٹھ ہزار درہم ہیں وہ تونگر اور مال دار ہے اور جس کے پاس اس سے کم ہے وہ درویش ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ وہ حضرت ایوب پیغمبر کے مرتبہ میں ہے''۔اگرچہ اس پر فتویٰ نہیں ہے۔فتویٰ یہ ہے کہ جس کے پاس گھریلو ضروریات کے علاوہ پچاس روپے ہوں اور اس پر سال گزر جائے' وہ روپے اس کے کام نہ آئیں تو وہ غنی ہے یا اس کے پاس ۵۲ تولے چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہو' وہ غنی ہے اگر یہ نہیں تو درویش قرار پائے گا جیسا کہ عالمگیری میں ہے کہ وہ فقیر ہے جو نصاب سے کم کا مالک ہو۔(ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی بنام انیس الارواح ص ۸۸)

''ووجدک عائلا فاغنیٰ'' اس آیت کی تفسیر میں مقاتل نے کہا آپ کے دل کو غنی کر دیا اور آپ کو جو رزق دیا اس کے ساتھ' لوگوں سے آپ کو غنی کر دیا تھا۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' وہ آدمی فلاح پا گیا جس نے اسلام قبول کیا اور اسے ضرورت کے مطابق رزق دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو عطا کیا اس پر اسے قناعت عطا فرمائی (مسلم شریف کتاب الزکوۃ ج ۳ ص ۷۰) حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا! رسول اللہ ﷺ نے دعا کی کہ یا اللہ محمد کی آل کی روزی موافق ضرورت رکھ(یعنی دنیا کی طمطراق اور ساز و براق اور حمل واثقال کے تجمل مشاق اور زبردستی کی دھوم دھام اور ہجوم دوام اور ناحق زق زق اور اہل معاملات کی بک بک سے محفوظ رکھ۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موافق کی ضرورت کے روٹی ملنا' فقر اور غنی دونوں سے افضل ہے۔''خیر الامور اوسطھا''۔حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا! امیری اور تونگری بہت مال واسباب ہونے سے نہیں ہوتی بلکہ دل کے غنی ہونے سے''۔(بخاری کتاب الرقاق

اس حدیث کے عنوان میں تفہیم البخاری ج ۹ ص ۳۷۷ پر علامہ غلام رسول رضوی لکھتے ہیں کہ مال میں خیریت لزاتیہ نہیں بلکہ اس کے متعلق کے اعتبار سے ہے' اگرچہ اس کو خیر کہا جاتا ہے۔اسی طرح زیادہ مال دار آدمی لزاتیہ غنی اور بے نیاز نہیں بلکہ اس کے تصرف کے اعتبار سے غنی ہے کیونکہ اگر وہ لزاتیہ غنی ہو تو اس کی غنا مال کو واجب' مستحبات اور دیگر نیک امور میں صرف کرنے پر موقوف نہ ہوتی اور اگر وہ لزاتیہ فقیر ہوتا تو مال کے ختم ہونے کے خطرہ کے پیش نظر وہ خرچ کرنے سے رک جاتا وہ درحقیقت' صورت اور معنی کے اعتبار سے فقیر ہے اگرچہ مال اس کے ہاتھ میں ہو' کیونکہ وہ اس مال سے دنیا اور آخرت میں نفع حاصل نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات یہ مال اس کے لیے وبال ہوتا ہے۔ارشاد ربانی ہے ایحسبون انما نمدھم بہ من مال و بنین۔۔۔ترجمہ: کیا کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کی جو مال اور بیٹوں سے مدد کرتے ہیں ہم ان کے لیے خیر میں جلدی کرتے ہیں بلکہ ان کو شعور تک نہیں۔'' ترمذی شریف جلد

دوم صفحہ ۷۴ پر ہے کہ تو انگری بہ دل است نہ بہ مال۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا امیری مال و دولت کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ اصل امیری دل کی امیری ہے حاشیہ پر مذکور حدیث کے ضمن میں لکھا ہے کہ ”غنا کہتے ہیں بے نیازی کو اگر کسی کے پاس مال و دولت کثیر ہو لیکن دل چین سے نہ ہو تو وہ غنی نہیں، غنی وہ ہے جس کا دل غنی ہو۔“

اعتراض نمبر ۹۱ کا (ل) جز

”آپ کے چچاؤں کو غصہ آ گیا اور انہوں نے سخت لہجہ میں جواب دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کی خواہش نہیں کی تھی بلکہ اس نے خود خوشی سے درخواست کی تھی اور اس تحریک سے شادی ہونا قرار پائی تھی۔“

جواب: خواجہ ابو طالب کے نکاح کے خطبہ میں یہ جملہ ہے کہ آپ ﷺ خدیجہ کی خواستگاری فرماتے ہیں‘ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ”یہ محمد ﷺ خدیجہ بن خویلد کی طرف مائل ہیں اور اسی طرح خدیجہؓ آپ سے نکاح کی طرف مائل ہیں۔“ ان جملوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الزام‘ ہم نے تیری لڑکی کی خواہش نہیں کی تھی‘ صریحاً غلط ہے۔ آپ جب خواستگاری فرماتے ہیں تو چچاؤں کا غصہ میں آنا‘ لال پیلا ہونا اور سخت لہجہ میں جواب دینا تیری لڑکی کی خواہش تھی‘ درست نہیں دوسری روایت میں ہے کہ دونوں نکاح کی طرف مائل ہیں تو چچاؤں کا غصہ چہ معنی دارد اور یہ کہنا کہ تیری لڑکی کی خواہش تھی‘ غیر معقول اور ناموزوں الزام ہے جس کا رد نکاح کے خطبہ کی عبارت کرتی ہے۔

اہم نکتہ: طرفین میں سے کسی کی طرف سے ازدواجی سلسلہ قائم کرنے میں پہل ہو جائے‘ اس میں کوئی حرج نہیں کسی قسم کی قباحت اور کوئی امر مانع نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ رسم ہے کہ نکاح کا پیغام لڑکے والوں کی طرف سے بھیجا جاتا ہے جب کہ لڑکی والوں کی طرف سے نکاح کی خواستگاری کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ آج کل کے دور میں بھی دونوں طرف سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کو بے عزتی سمجھنا کہ لڑکی والوں نے رشتہ کی پیش کش کی ہے‘ ساری عمر کے لیے لڑکی کی عزت خاک میں ملا دی‘ یہ سب لاعلمی کی باتیں ہیں اور اسلامی تعلیمات سے ناآشنائی ہے‘ یا جانتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہونے سے انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں بلکہ دین اسلام کی تعلیمات کو پس پشت ڈالنا ہے۔ مثلاً فتح مکہ کے روز ام ہانیؓ کا شوہر جب اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور ابھی تک اسلام میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اس وقت حضرت علیؓ نے بارگاہ نبوی میں درخواست کی کہ ام ہانیؓ اسلام لا چکی ہیں لہذا اگر قرابت کے ساتھ رشتہ مناکحت بھی ہو جائے تو بہتر ہو۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دینے کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا: غور کروں گا‘ چند دن بعد معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ اس رشتہ پر راضی نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا تو انہوں نے بھی خاموشی اختیار

کی ۔آخر کار وہ حرم نبوی میں داخل ہوئیں ۔المختصر عرب کے رواج کے مطابق رشتہ مناکحت کے لیے لڑکی والوں کی طرف سے پیغام بھیجنا باعث شرم و عار نہ تھا۔ اگر بدنامی کا خدشہ ہوتا تو وہ عرب کا معاشرہ جس میں لڑکیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے چونکہ لڑکیاں ان کے لیے ننگ و عار کا باعث تھیں تو پھر ایسی عورتوں کو کیونکر کھلی چھٹی دی جاسکتی تھی کہ وہ از خود رشتہ طے کر سکتیں اور انہیں قتل نہیں کیا گیا گویا یہ برا فعل نہ تھا اور نہ ہی نام کو بٹہ لگنے کا عمل تھا بلکہ برائی سے بچنے کا ایک احسن طریقہ تھا۔ مرد و زن کے خاندانوں میں سے کوئی بھی برائی سے بچنے کی خاطر ایسا اقدام کرے تو سعادت مندی ہے آج کل بھی طرفین کے والدین کی طرف سے کوشش کی جاتی ہے کہ بیٹے اور بیٹی کی شادی کر کے اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جائیں۔

اعتراض نمبر ۹۱ کا (م) جز

طرفین میں اس قدر تیزی آ گئی کہ تلواریں کھچ گئیں مگر یکا یک خدیجہؓ کا بوڑھا باپ ٹھنڈا پڑ ا گیا اور باہم مصالحت ہو گئی۔

جواب: عربوں میں چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر جھگڑا معمول کی بات تھی۔

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

پھر یہ جھگڑے سالہا سال کی لڑائیوں پر محیط ہوتے' یہ لڑائیاں ختم ہونے کا نام نہ لیتیں ادھر ولیم میور کہتا ہے کہ تلواریں کھچ گئیں۔ اتنا حساس معاملہ کہ تلواریں نیام سے باہر آ گئیں مگر بیچ بچاؤ ہو گیا' لڑائی نہ ہوئی اور مصالحت ہو گئی۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ مصالحت کیسے ہوئی؟ یہ وجہ بتانے کو گول کر جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ جس بات پر لڑائی ہوتے ہوتے نہ ہوئی اور صلح ہو گئی' اس کا ذکر کرتا مگر ذکر ندارد۔

(۲) براتی نکاح لینے آئے تھے یا لڑائی کرنے آئے تھے اور خویلد خاندان براتیوں کا استقبال بے نیام تلواروں سے کیوں کرنا چاہتے تھے۔؟ اگر لڑائی کا خطرہ تھا تو نکاح سے پہلے بنو ہاشم کو روک دیتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اگر معمولی سی بھنک بھی بنو ہاشم کے کانوں میں پڑ جاتی کہ خویلد خاندان رشتہ مناکحت پر رضامند نہیں ہے۔ تو وہ نہ آتے۔ اگر وہ آتے بھی تو نہتے نہ آتے وہ بھی دم ٹھونک کر تلواریں لہراتے چلے آتے جب کہ رشتے رضامندی سے ہوتے ہیں لڑائی بھڑائی' دھونس' دھاندلی اور دھمکی سے انجام پذیر نہیں ہوتے اگر لڑائی سے رشتہ گانٹھا جائے اور زبردستی عورت کو لے جایا جائے تو یہ ایک فلمی سین تو ہو سکتا ہے شادی برضا و رغبت نہیں ہو سکتی اور نہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

(۳) یہ مصالحت خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کو ایک آنکھ نہ بھاتی' انہیں انتقام لینے کا سنہری موقع ہاتھ لگا تھا' وہ یوں کہ خدیجہ کا باپ ورقہ سے اپنی بیٹی کا رشتہ جوڑنے کا خواہاں تھا لیکن یہ

شادی نہ ہوسکی۔لیکن وہی ورقہ بن نوفل نکاح کا خطبہ دیتے ہیں۔ان کی طرف سے کسی شکررنجی یا انتقامی کارروائی جوانتقام ومنافرت پر منتج ہو نظرنہیں آتی گویا خویلد کا خاندان کا دامن شکووں اورگلوں سے بھی پاک صاف تھا۔ورقہ نے اس شادی پراعتراض نہیں کیا۔ایسا کسی قسم کا واقعہ نہیں ہواجس کے نتیجے میں کہا جائے کہ مصالحت ہوگئی۔وہاں توطرفین اول تا آخر راضی خوشی' شاداں وفرحاں تھے نیز مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ خدیجہؓ کا باپ حرب فجار ثانی سے پہلے انتقال کرگئے تھے۔جب مرکزی کردار ہی کہانی کا غائب ہے تو لاکھ کہانی کوسچا ثابت کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے جائیں:وہ بے سود' بے کار اور لاحاصل کوشش ہے۔

اہم نکتہ: رؤسائے عرب نے خدیجہؓ سے نکاح کرنے کے پیغامات بھجوائے آپ نے پہلے دوشوہروں کی وفات کے بعد عرب کے سرداروں کے پیغامات ٹھکرادیئے اور نبی مکرم ﷺ سے رشتہ مناکحت ہوا کیوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ روساء عرب اور اکابرین قریش نے خدیجہ طاہرہؓ کو نکاح کے پیغامات بھیجے۔خدیجہؓ نے سب کی پیش کش کوٹھکرادیا' کیونکہ طاہرہ فرماتی ہیں ''ان کی نظر میرے مال پر تھی''۔(۲) آپ سے نکاح کی وجہ یہ بھی تھی کہ خدیجہؓ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاندان کی گود میں آگیا ہے۔(۳) تجارتی سفر کا حال اپنے غلام میسرہ سے سن چکی تھیں اور پیش آنے والے محیرالعقول واقعات بھی سن لیے تھے نیز ازخود تجارتی قافلہ کے مکہ میں داخل ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور یہ بھی دیکھا کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے آپ کے سر پر بادل یا فرشتے سایہ کناں ہیں۔(۴) یہودی منجم کی پیش گوئی حضرت خدیجہؓ کے گوش مبارک میں سرایت کرچکی تھی کہ ایک عنقریب نبی آنے والا ہے۔اس افتخار کے حصول کے لیے حضرت خدیجہ نے نکاح کی سب پیشکشیں ٹھکرادیں اور اولوالعزم نبی کی زوجہ بننے کے لیے کوششیں تیزتر کردیں تاکہ عالم کی سرداراورتمام عالم کے مومنوں کی ماں بننے کا شرف حاصل کرسکیں اوراللہ تعالیٰ کی فرماں برداراور حبیب کبریا کی محبوب زوجہ محترمہ بن جائیں۔حضرت خدیجہؓ کی خواہش کے قربان جایئے۔انہوں نے جان لیا تھا کہ آنحضرت ﷺ سے نسبت ہوگئی توسب کچھ ہاتھ آجائے گا' اس بناء پرآپ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہوکر سب کچھ حاصل کرلیا۔

ان کے دامن سے ہو کے وابستہ
سب سے دامن چھڑا لیا ہم نے

اعتراض نمبر۹۲

حضرت خدیجہؓ سے سات بچے پیدا ہوئے' اس پر اشکال یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے اگر ہر سال ایک بچہ کی پیدائش فرض کریں تواس کا مطلب یہ ہوا کہ آخری بچے کی پیدائش کے وقت ان کی عمر ۴۸ برس ہو

گئی ہوگی۔ یہ بات ناممکن تو نہیں ہے مگر حیرت انگیز ہے جس پر رائے زنی کی جاسکتی ہے' یہ ایسی بات ہے جسے بعد میں معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ (منٹگمری واٹ۔ علوم اسلامیہ اور مستشرقین۔۹۳)

(۲) ڈاکٹر محمد حمید اللہ (محمد رسول اللہ۔۲۱) بتاتے ہیں کہ اس بات میں اختلاف رائے نہیں کہ نکاح کے وقت آپ ﷺ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ جہاں تک خدیجہؓ کی عمر کا تعلق ہے' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی تھیں جبکہ دوسرے مؤرخوں کا کہنا ہے کہ ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔ موخر الذکر افراد کے خیال میں اس حیاتیاتی حقیقت سے توثیق ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ سے حضرت خدیجہؓ کے ہاں سات اولادیں' تین بچے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ (قاسم' طاہر' طیب' زینب' رقیہ' ام کلثوم اور فاطمہ) ڈاکٹر ظفر محمود احمد (خاتم النبین۔۱۶۰) بھی ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے سے متفق نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ سیدہ خدیجہؓ مکہ کی رہنے والی خاتون تھی جو چالیس سال کی عمر کے پیٹے میں تھیں جب ان کی شادی ہوئی' یہ عام روایت ہے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق ہے کہ خدیجہؓ کی عمر اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر کے برابر تھی اور یہی صحیح ہے۔ (۳) ''واٹ'' مورخین اسلام پر یہ الزام ٹھونس دیتا ہے کہ ''ابن ہشام' طبری' ابن سعد کے ہاں (یعنی عمر کے بارے) کوئی رائے زنی نہیں ملتی گویا ان مورخین میں تنقیدی شعور موجود ہی نہیں تھا اور گویا مسلمان کسی بھی خلاف مظہر کا رشتہ فوراً مذہب سے جوڑ دیتے ہیں۔''

جواب: واٹ کی تضاد بیانی کے کیا کہنے! وہ یوں کہ واٹ آپ ﷺ اور خدیجہؓ کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ''روایتی صراحت اس شادی کی یوں ہے کہ خدیجہؓ نے دیکھا کہ آپ ﷺ اعلیٰ کردار کے حامل' دیانت دار اور قابل اعتبار شخص ہیں۔ انہوں نے آپ ﷺ کو اپنا تجارتی نمائندہ بنا کر ملک شام جانے والے ایک تجارتی قافلے میں بھیجا۔ ان کے دو سابقہ شوہروں میں سے دوسرے شوہر کا تعلق بنو مخزوم سے تھا مگر اب انہوں نے ذاتی طور پر اپنے تجارتی نمائندوں کے ذریعے تجارت شروع کی۔ خدیجہؓ نے محمد ﷺ سے اپنے کاروبار کے تجارتی نمائندے کی حیثیت سے ملنے والے نتائج سے اور ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو شادی کی پیشکش کر دی۔ آپؐ نے قبول فرمائی ایک روایت کے مطابق ان کی عمر چالیس سال اور آنحضرت ﷺ کی عمر ۲۵ سال تھی یہاں پر واٹ بات کو گول کر دیتا ہے اور وہ یہ نہیں کہتا کہ خدیجہؓ کی عمر اتنی نہ تھی اور بچوں کے جنم کے بعد ان کی عمر ۴۸ سال کے لگ بھگ ہوئی ہوگی اور یہ بات ناممکن تو نہیں بلکہ حیرت انگیز ہے۔ یعنی کبھی کچھ کہتا ہے اور کبھی کچھ۔ یہ گومگو کی کیفیت اور تضاد بیانی کسی صورت قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ نقشہ ملاحظہ فرمائیں

بوقت نکاح حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال' حضرت سودہ کی عمر پچاس سال ہے۔ سیریل نمبر ۷۔۹۔۱۱ کی عمریں ۳۵۔۳۶ سال ہیں۔ باقی ازواج مطہرات کی عمریں سترہ سال سے تیس سال تک ہیں تو سوال یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ حضرت سودہؓ کے بعد باقی تمام امہات المومنینؓ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی اور اس حیاتیاتی حقیقت کا اثر نہیں ہوتا۔ ان امہات المومنینؓ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی جبکہ ان کی عمریں اولاد پیدا کرنے کے مطابق وموافق تھیں۔ ڈاکٹر محمد ثناء اللہ لکھتے ہیں کہ یہ بات ہر کسی کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ پچاس سال کی عمر تک تولید کی صلاحیت پائی جا سکتی ہے تو پھر حضرت خدیجہؓ کی عمر میں اولاد پیدا کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ امام جوزی (الوفا باحوال مصطفیٰ۔۔ ۶۸۹) لکھتے ہیں کہ ''محمد بن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب کی ایک لونڈی تھی، جن کا نام سلمیٰ تھا۔ وہ حضرت خدیجہؓ کی اولاد کے معاملہ میں کفالت کرتی تھیں اور خدمت کرتی تھی۔ وہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری بطور عقیقہ ذبح کیا کرتی تھیں اور اولاد میں ایک ایک سال کا وقفہ ہوتا تھا اور اولاد کی رضاعت کا انتظام ان کی ولادت سے قبل ہی فرما لیتی تھیں۔ آپ ﷺ نے خدیجہ الکبریٰؓ سے شادی کی تو اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ۲۵ سال اور بی بی خدیجہؓ ۴۰ سال تھی۔ مذکورہ روایت کے مطابق کہ ''اولاد میں ایک سال کا وقفہ ہوتا تھا''۔ آپ ﷺ کی خدیجہؓ سے چھ اولادیں ہوئیں، دو بیٹے اور چار بیٹیاں، یعنی بیٹے حضرت قاسم اور حضرت عبداللہ اور بیٹیاں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ۔ اس حساب سے حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۶ سال بنتی ہے۔ واٹ کو اقرار بھی ہے اور ساتھ ہی انکار کرتا ہے وہ یوں کہ آخری بچہ کی ولادت کے وقت خدیجہؓ کی عمر ۴۸ سال ہوگئی ہوگی یہ بات ناممکن تو نہیں مگر حیرت انگیز ہے۔ جب اس بات کو مان لیا کہ یہ بات ناممکن نہیں تو پھر اس پر رائے زنی کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر ناممکن امر ہوتا اور ممکن ہو جاتا تب کہا جا سکتا تھا کہ یہ حیرت انگیز ہے مگر یہاں ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی جسے وہ ممکن بھی کہے اور حیرت انگیز بھی۔ خدیجہؓ کی عمر کے بارے میں ''واٹ'' کی اس رائے سے بھی ابطال ہوتا ہے کہ ابن ہشام' طبری اور ابن سعد کی اس موضوع پر کوئی رائے زنی نہیں۔ اس عقل کے اندھے کو یہ بھی علم نہیں کہ رائے زنی تب ہوتی اگر یہ امر ناممکن ہوتا' جب یہ بات ناممکن ہی نہیں تو پھر اس پر تنقید کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ''واٹ'' کی طرح یہ مورخین مفروضات سے کام نہیں لیتے۔ وہ ٹھوس اور وزنی دلائل سے حقیقت کو سامنے لاتے ہیں۔ بے فائدہ اور مصنوعیت کے گورکھ دھندا سے دور رہتے

نام امہات المومنین	سن نکاح	گزشتہ شادیاں	گزشتہ اولاد	آپ کی عمر بوقت نکاح	امہات المومنین کی عمر بوقت نکاح	عمر بوقت انتقال	سن وفات امہات المومنین	رفاقت کا عرصہ	کیفیت
حضرت خدیجہ بنت خویلد قرشیہ	۲۵ نبوی	۲	۵	۲۵ سال	۴۰ سال	۶۵ سال	۱۰ نبوی	۲۵ سال	بیوہ
حضرت سودہ بن زمعہ قرشیہ	۱۰ نبوی	۱	۱	۵۰ سال	۵۰ سال	۷۲ سال	۲۲ھ	۱۳ سال	بیوہ
حضرت عائشہ بنت ابوبکر قرشیہ	۱۱ نبوی	۔	۔	۵۵ سال	۱۷ سال	۶۷ سال	۵۸ھ	۹ سال	کنواری
حضرت حفصہ بنت عمر قرشیہ	۳ھ	۱	۔	۵۵ سال	۲۰-۲۲ سال	۶۰ سال	۴۱ھ	۸ سال	بیوہ
حضرت زینب بنت خزیمہ ہلالیہ	۳ھ	۳	۔	۵۵ سال	۳۰ سال	۳۳ سال	۳۳ھ	۸ ماہ	بیوہ
حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ قرشیہ	۴ھ	۱	۴	۵۶ سال	۲۴-۲۵ سال	۸۰ سال	۶۰ھ	۷ سال	بیوہ
حضرت زینب بنت جحش اسدیہ	۵ھ	۱	۔	۵۷ سال	۳۵-۳۶ سال	۵۰ سال	۳۰ھ	۶ سال	مطلقہ
حضرت جویریہ بنت الحارث خزاعیہ	۵ھ	۱	۔	۵۷ سال	۲۵ سال	۶۵ سال	۵۰ھ	۶ سال	بیوہ
حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان قرشیہ	۶ھ	۱	۱	۵۸ سال	۳۵-۳۶ سال	۷۲ سال	۴۲ھ	۵ سال	بیوہ
حضرت صفیہ بنت حی اسمائیلیہ	۷ھ	۲	۔	۵۹ سال	۱۷-۱۸ سال	۶۰ سال	۵۰ھ	۴ سال	بیوہ
حضرت میمونہ بنت حارث ہلالیہ	۷ھ	۲	۔	۵۹-۶۰ سال	۳۶ سال	۸۰ سال	۵۱ھ	۳-۴ سال	بیوہ
حضرت ماریہ قبطیہ مصریہ	صلح حدیبیہ کے بعد	۔	۔	۵۹-۶۰ سال	۔	۔	۔	۔	کنواری

ہیں نیز واٹ نے نہایت زیادتی اور ناانصافی سے کام لیا ہے اور یہ کہنے کی بڑی جسارت کی کہ ان مورخین میں تنقیدی شعور نہ تھا بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ واٹ کو تنقید کا علم نہیں ہے صرف مفروضوں کی دنیا کا نمائندہ ہے۔ مستشرقین کا کام ہے جہاں اپنے مطلب کی کوئی بات انہیں ملتی ہے اچک لیتے ہیں جب کہ وہ مورخین کے سہو پر مبنی ہے جسے قبول کر کے پراپیگنڈا اور غلط آمیز کہانیوں کا طوفان برپا کر دیتے ہیں اور تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اگر ان کے خلاف حقیقت پر مبنی واقعہ بیان کیا جائے تو وہ اسے یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی پرانی دشمنی کی روش اپناتے ہوئے انکار کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا تھو تھو۔ زرقانی نے بھی ایک روایت مغلطائی سے روایت کی ہے کہ شادی کے وقت خدیجہؓ کی عمر ۲۸ سال تھی۔ یہ روایت شاذہ ہے۔ (رحمت العالمین ۔۲۔۱۴۰)۔

قابل غور بات: واٹ اور دیگر حضرات کی یہ غلطی بھی ہے کہ جو آنحضرت ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے آپ کی سات اولادیں تھیں۔ اس میں اختلاف ہے لیکن اصح قول یہی ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے آپ کی چھ اولادیں ہوئیں۔ دو بیٹے اور چار بیٹیاں اور ایک بیٹا حضرت ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھا۔ واٹ کو یہ بھی معلوم نہیں' کہ وہ کہتا ہے کہ خدیجہؓ کے بطن سے سات بچے پیدا ہوئے جبکہ ساتواں بچہ حضرت ماریہؓ سے تولد ہوا۔ (۲) چالیس سال کی عمر میں شادی ہوئی ہر سال ایک بچہ پیدا ہو' تب بھی آپ کی عمر ۴۶ سال بنتی ہے' ۴۸ سال نہیں بنتی واٹ شاید ریاضی میں بھی کورے کاغذ کی طرح ہے۔ (۳) ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی کتاب محمد رسول اللہ میں کہتے ہیں کہ خدیجہ سے تین بچے اور چار بچیاں پیدا ہوئیں۔ (نقوش رسول نمبر ۔۲۔۵۲۲) انہوں نے بیٹوں کے نام قاسم' طاہر اور طیب لکھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو سہو ہوا ہے کیونکہ حضرت خدیجہ سے آپ کی چھ اولادیں' دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں انہیں اس طرح سے غلطی لگی ہوگی کہ طاہر اور طیب نام کے دو بیٹے ہیں حالانکہ یہ بیٹوں کے نام نہیں القابات ہیں اور یہ القابات آنحضرت ﷺ کے صاحب زادہ حضرت عبداللہ کے ہیں۔ اس بات کی وضاحت قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کرتے ہیں اور اپنی ذاتی رائے بھی پیش کرتے ہیں کہ طیب کا لقب نبی مکرم ﷺ اور طاہر کا لقب خدیجہؓ طاہرہ کی جانب سے تھا۔ (رحمۃ العالمین ۔۱۔۹۶)۔ علامہ رضا المصطفیٰ فرماتے ہیں کہ ام المومنین خدیجہؓ کے ہاں رسول اللہ ﷺ سے چھ اولادیں ہوئیں۔ حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن اقدس سے نبی مکرم ﷺ کے دو شہزادے اور چار شہزادیاں

تھیں۔ قاسمؓ، عبداللہؓ اور شہزادیاں فاطمہؓ ' زینبؓ، ام کلثومؓ اور رقیہؓ۔ صاحب اثبات بنات اربعہ لکھتے ہیں ''قرب الاسناد میں امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی اولاد طاہر و قاسم اور فاطمہ و ام کلثوم، رقیہ و زینبؓ سبھی خدیجہؓ سے تولد ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حیاتیاتی حقیقت کی توثیق کے بارے بعض مورخین کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں کسی ایک کا نام تک نہیں لیتے اور نہ ہی کسی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں ایسے تو کہا جا سکتا ہے کہ بعض مورخین کہہ کر اپنی مرضی اور دل کی بات کہی جا سکتی ہے۔ عمر کی قید ۴۶ یا ۵۰ سال لگانا کوئی حتمی بات نہیں کیونکہ اس سے زیادہ عمر میں بھی بچے پیدا ہو سکتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ: آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہؓ اور سودہؓ کے بعد تمام نکاح ۵۴ سال سے لے کر ساٹھ سال کی عمر میں کیے۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے بادشاہوں کو خطوط لکھے' ان خطوط میں سے ایک خط مقوقس کے نام بھی تھا۔ اس نے آپ ﷺ کے مکتوب کا بڑا ادب کیا اور تحفے تحائف ارسال خدمت کیے' ان میں دو معزز خواتین ماریہ اور سیرین بھی تھیں۔ آپ ﷺ نے ماریہ کو حرم نبوی میں داخل فرمایا صلح حدیبیہ کے وقت آپ ﷺ کی عمر ۵۹ سال تھی اور ماریہ سے آپ ﷺ کی شادی ۵۹ ویں سال ہوئی حضرت ماریہؓ کے بطن سے آپ ﷺ کے فرزند ابراہیم تولد ہوئے۔ اگر حضرت ماریہؓ سے اولاد نہ ہوتی تو اسے بنیاد بنا کر کہا جا سکتا تھا کہ امہات المومنین جن کی عمریں ۱۷ سال سے لے کر ۳۰ سال تک ہیں ان سے اولاد کا نہ ہونا آپ کا معمر ہونا اور تولیدی صلاحیت کا برقرار نہ رہنے کا الزام لگایا جاتا۔ (نقل کفر کفر نباشد) اس الزام کا رد بھی آپ ﷺ کے اسوہ کامل نے فراہم کر دیا اور حضرت ماریہؓ کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے کی پیدائش نے اس باطل مفروضہ کا قطعی رد کر دیا ہے۔

واٹ کا یہ کہنا کہ یہ بات ناممکن تو نہیں بلکہ حیرت انگیز ہے اور رائے زنی کی جا سکتی ہے کہ مسلمان اسے معجزہ قرار دے دیں گے۔ اول تو واٹ خود تسلیم کرتا ہے کہ یہ بات ناممکن تو نہیں اور پھر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے شکوک پیدا کرتا ہے۔ جہاں تک معجزہ کا تعلق ہے' تاریخی حقائق کے ہوتے ہوئے اس واقعہ کو معجزہ سے جوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ البتہ واٹ کا عقیدہ واضح ہو گیا کہ وہ معجزہ کا منکر ہے۔ مستشرقین باقی انبیاءؑ کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں' مثال کے طور پر حضرت مسیحؑ پیدا ہوتے ہی اعلان فرماتے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے کتاب دی گئی ہے اور میں سچا نبی ہوں۔ وہ کوڑھیوں کو شفایاب کرتے ہیں اندھوں کو بینائی عطا کرتے ہیں اور مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ لیکن آخری پیغمبر ﷺ کے

معجزات سے انکار کرتے ہیں۔اپنے عقلی فتور کے سبب معجزہ کا انکار کرتے ہیں لیکن حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا جس طرح حضرت لوطؑ کی بیوی بوڑھی ہیں' انہیں بیٹے کی بشارت دی جاتی ہے' تو وہ حیران رہ جاتی ہے لیکن وہ قادر مطلق جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ویسا ہی ہو کر رہتا ہے۔معجزہ کے متعلق مختصر بیان کرنے کا مقصد ''واٹ'' کے پہلے اعتراض کا رد کرنا نہیں ہے بلکہ یہاں معجزہ سے انکار کی وجہ پر چند جملے تاکیداً اور تائیداً تحریر کیے ہیں۔کوئی یہ نہ سمجھے کہ آخر کار اس واقعہ کو معجزہ سے جوڑ ہی دیا۔حالانکہ واٹ کے الزام کو تاریخی حقائق رد کرتے ہیں اور باطل ٹھہراتے ہیں معجزہ سے اسے جوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

اعلان نبوت سے پہلے حضورؐ کا عقیدہ اور ایمان

اعتراض نمبر ۹۳

مارگولیس کہتا ہے حضرت خدیجہؓ اور آنحضرت ﷺ قبل از نبوت' دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرلیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا۔ (مارگولیس ۔امہات المومنین ۔۵۹)

۲۔انسائیکلو پیڈیا آف اسلام واقعہ غرانیق کے تحت متعدد الزامات تحریر کیے،اس کے بعد کہا ''ابتدائی اعتقادات کی جھلک اس طرح بھی نظر آتی ہے کہ عربوں کی طرح انہیں (محمد ﷺ) بھی جن وشیطان پر عقیدہ تھا۔مکہ اپنے حرم کے ساتھ ان کے نزدیک بھی مقدس تھا جن کے تقدس اور رسوم کو انہوں نے اپنے مذہب میں باقی رکھا پھر ایک مرتبہ کفر کی طرف لوٹ جانے کی خواہش نے زور کیا جس پر جلد قابو پالیا''۔

جواب: انبیاء اور رسل اعلان نبوت و رسالت سے قبل بھی صفات خداوندی سے آشنا ہوتے ہیں اور ذرا برابر انہیں ان صفات میں شک و شبہ نہیں ہوتا ارشاد ربانی ہے'' ولقد الھنا ابراھیم ۔۔۔۔۔ عالمین''۔''ترجمہ'' بے شک ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی سے ان کی شان کے مطابق رشد عطا کیا اور ہم ان کی استعداد کو پہلے سے خوب جانتے تھے۔'' یہ رشد کیا ہے؟ سورہ الحجرات میں ہے کہ'' رشد قلب میں ایمان واطاعت خداوندی کی محبت اور کفر وفسق اور معصیت کی نفرت راسخ ہو جائے اس کا نام رشد ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سیدنا ابراہیمؑ ابتدا ہی سے رشد وہدایت پر تھے یہی حال تمام انبیاء ورسل کا ہے۔آپ کا ارشاد ہے''جب میرا نشو ونما شروع ہوا' اس وقت سے بتوں کی شدید نفرت اور عداوت اور اشعار سے سخت نفرت میرے دل میں ڈال دی گئی۔''

(۲) مارگولیس اس الزام کی دلیل میں امام احمد بن حنبلؒ کی روایت پیش کرتا ہے' روایت یہ ہے۔

''قال عروہ احد ثنی جار لخدیجہ بنت خویلد انہ سمع النبی ﷺ وھو یقول لخدیجہ خل اللات خل العزیٰ واللہ لا اعبد ابدا قال فتقول خدیجۃ خل اللات خل العزیٰ قال کانت صنمھم اللتی کانوا یعبدون ثم یضطجعون '' (ضیا النبی ۔۲۔۱۷۹)''ترجمہ عروہ نے مجھ سے کہا خدیجہؓ بنت خویلد کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو حضرت خدیجہؓ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے خدیجہؓ! اللہ کی قسم کہ میں کبھی لات وعزیٰ کی پرستش نہیں کروں گا' خدیجہؓ کہتی تھی لات

کو جانے دیجیے، عزیٰ کو جانے دیجیے (یعنی ان کا نام تک نہ لو) عروہ کہتے ہیں کہ لات و عزیٰ وہ بت تھے جن کی پرستش اہل عرب سونے سے پہلے کیا کرتے تھے اس کے بعد وہ بستر پر لیٹتے۔''

عربی صرف و نحو کا معمولی طالب علم بھی جان لے گا کہ روایت مذکور میں ''کانوا'' کا لفظ آیا ہے جو جمع کا صیغہ ہے جس کا یہ معنی ہے کہ اہل عرب لات و عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اگر آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کی طرف اشارہ ہوتا تو صیغہ جمع کی بجائے تثنیہ استعمال ہوتا، جس کا معنی یہ ہوتا کہ دونوں پرستش کرتے تھے۔ مارگولیس کو جمع اور تثنیہ کے صیغہ میں فرق نظر نہیں آتا ہے۔ بڑا عالم ہے اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اسے اس فرق کا علم نہ ہو البتہ

اب اس کے طرز تجاہل کو کیا کہے کوئی
وہ بے خبر تو نہیں پھر بھی بے خبر سا لگے

یہ اس کی اسلام دشمنی ہے کہ واقعات کو توڑ مروڑ کر غلط استدلال کر کے شکوک و شبہات کا جامہ پہنا دیتا ہے مگر یہ اس کی بھول ہے کہ اس کی اسلام دشمنی کی شاطرانہ چال کو نہ سمجھا جاسکے کیونکہ

ع ''تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں''

(۳) آنحضرت ﷺ اپنے معبود برحق کی قسم کھا رہے ہیں کہ آپ ﷺ لات و عزیٰ کی ہرگز پرستش نہیں کریں گے نیز ان بتوں کے مقابل معبود حقیقی کی قسم اٹھاتے ہیں، کسی بت کی نہیں، جس سے ان کی توحید پرستی روز روشن کی طرح آشکار ہوتی ہے۔ نیز توحید کا پیغام پہنچانے والے الصادق والامین نبی ﷺ نے خداوندان محسوس یعنی بتوں کو اپنے ہاتھ سے توڑا، اپنے اصحاب کو توڑنے کا حکم فرمایا کہ انہیں جہاں دیکھیں، توڑ دیں آپ کے زمانہ میں بتوں کے وجود کو اس دنیا سے مٹانے کے بعد ان کا نام اور ان سے منسلک قصوں اور کہانیوں کو بیان کرنے سے پرہیز کیا گیا۔ قرآن و سنت میں بر سبیل تنبیہ کے ذکر کرنا تھا نہ کہ ان کا ذکر بت پرستی کا اعادہ تھا۔ اس شدت کے ساتھ بت پرستی کے خاتمہ کے لیے اقدامات کیے گئے اور کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ دوسری طرف حضرت خدیجہؓ بتوں کا نام نہ لینے کا کہتی ہیں۔ ان کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتیں مگر مارگولیس ہے کہ اس حدیث سے غلط استدلال کر کے آنحضرت ﷺ اور خدیجہؓ پر بت پرستی کا الزام لگاتا ہے۔ بت پرست ثابت کرنے کی ناکام، باطل اور بے کار سعی اور کوشش کی ہے۔ مستشرقین نے اسلام، پیغمبر ﷺ اسلام اور اسلام کے پیروکاروں کی توہین و گستاخی کرنے کا ٹھیکہ اپنے نام لے رکھا ہے۔ وہ ایسے بے ادب اور توہین آمیز گستاخانہ کلمات لکھتے ہیں کہ مہذب انسان کسی ادنیٰ فرد

کے لیے بھی لکھنا' کہنا یا سننا گوارا نہیں کرتا۔ان کی علمی خیانت اور بد دیانتی کی انتہا ہے۔ان کی فتنہ انگیز اور تعصب و منافرت سے بھرپور غلط نگاری کی امتیازی شان یہی ہے۔کذب وافترا' الزام تراشی اور بہتان طرازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اس کے بجز جانبداری اور تضاد بیانی میں بہت طاق اور ہوشیار ہیں۔اسی مستشرق کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے۔ the biographersof the prophet muhammed from a long series which it is impossible to end but in which it would be honourable to find a place.(ترجمہ) محمد ﷺ کے سیرت نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا ختم کرنا ناممکن ہے لیکن آپ کے سیرت نگاروں میں جگہ پانا باعث شرف اور موجب عزت ہے۔''

ناز ہم سے اور دشمن سے نیاز
طاق ہے فتنہ گر ہر کام میں

اگر کوئی مسلمان سیرت نگار بھی مارگولیس کے بیان کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''ایک نہایت پتہ کی بات لکھی ہے''۔مگر سچ تو یہ ہے کہ

بات کو سمجھ لینا عام بات ہے لیکن
بات کی نزاکت کو لوگ کم سمجھتے ہیں

بھلا جو شخص الزام لگائے' بہتان طرازی کرے' گستاخانہ اور توہین آمیز کلمات استعمال کرے' علمی بد دیانتی اور خیانت کا ارتکاب کرے جیسا او پر حدیث میں آپ نے مشاہدہ کیا کہ غلط رنگ دے کر شک کا پہاڑ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔آپ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کو بت پرست ثابت کرنے کی کوشش کی (نعوذ باللہ) ایسے سیرت نگاروں کا سیرت نگاری میں جگہ پانا باعث ننگ و عار ہے' باعث ذلت وخواری ہے نہ کہ عزو شرف کم پڑھے لکھے لوگ مستشرقین کے دام فریب سے مشکل بچ سکتے ہیں۔

(۴)اس روایت کے آخری جملہ میں ہے کہ اہل عرب سونے سے پہلے لات وعزیٰ کی پوجا پاٹ کرتے تھے پھر بستر پر لیٹتے تھے۔اس میں تو دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کیونکہ ظہور اسلام سے قبل کفر وشرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔بتوں کی پوجا پاٹ ان کا مذہبی اور عبادتی معمول تھا۔کئی لوگ ہدایت کی روشنی کی آس لگائے بیٹھے تھے حتی کہ خالق کائنات نے دکھی انسانیت کی فریاد سن لی اور اپنے آخری پیغمبر ﷺ کو بنی نوع انسان کی رہنمائی اور رشد وہدایت کے لیے بھیجا۔وہ روشنی بانٹنے والا' اور

ہدایت کے راستے پر گامزن کرنے والا کیسے بت پرستی کر سکتا ہے؟ آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کا سامان تجارت شام کے شہر بصریٰ لے جاتے ہیں اپنا سامان فروخت کرتے ہیں اور شام کی مصنوعات خریدتے ہیں اونٹوں پر سامان لادتے ہیں کہ اس اثناء میں کسی گاہک سے خرید وفروخت پر اختلاف ہو جاتا ہے' اس پر گاہک کہتا ہے کہ آپ ﷺ لات وعزیٰ کی قسم کھائیں تو میں بات مان لوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا' میں جھوٹے خداؤں کی قسم نہیں کھایا کرتا۔ وہ اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ شخص کہتا ہے۔ ''القول قومک'' (اے الصادق والامین)' جو آپ کہتے ہیں وہی سچ ہے' قسم کی ضرورت نہیں۔ (ضیاالنبی ۲۔ ۵۴۸)۔

غیروں کی آراء: حضرت محمد ﷺ کی زندگی انسانیت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے جو عمل سے مالا مال ہے' انہوں نے فرض شناسی اور خدمت انسانی کی زندہ مثال پیش کی۔ آپ ﷺ نے ۲۳ سال کے قلیل عرصہ میں بت پرستی اور توہم پرستی کو مٹا کر واحدانیت کا سبق پڑھایا۔ (لالہ موہن سروپ۔ نقوش ۴۔ ۴۵۸)۔

آپ ﷺ نبی تھے' بت پرستی کو باطل' غلط اور لغو جانتے تھے' انہوں نے اپنی قوم کو وحشیانہ مذہب اور پست اخلاق سے نجات دلائی۔ ممکن نہیں کہ ہم ان کے قلبی خلوص اور دینی حمیت سے انکار کریں۔ (پرنسپل ایڈورڈ سارتھ۔ نقوش ۴۔ ۴۹۱)۔

مسٹر گارس کہتا ہے ''محمد ﷺ نے ان کو خدا پرست بنا دیا جو عرب بت پرست تھے''۔ (حوالا بالا۔ ۴۹۳)۔

مسٹر صیبان کہتا ہے ''محمد ﷺ بہت بڑے حکیم تھے انہوں نے واحدانیت پر زور دیتے ہوئے انسانوں کو بت پرستی اور انسان پرستی سے اس علمی وعقلی قاعدہ کے ذریعہ سے نجات دلائی تاکہ دنیا اور دنیا کا ہر زندہ ہلاک ہونے سے محفوظ ہو گیا۔ (نقوش ۴۔ ۴۹۲)۔

پروفیسر گیان کہتا ہے ''اسلام اور بانیٔ اسلام کی نسبت جو میرے خیالات ہیں ان خیال کا حامل اگر مسلمان کہلا سکتا ہے تو بلاشبہ میں مسلمان ہوں اور مجھ کو اس پر فخر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بت پرستی کو مٹانے پر زور دیا' یہ بہت ضروری تھا کیونکہ بت پرستی ترقی کی راہ میں ایک سخت رکاوٹ تھی لیکن ان کا مقصد پتھر اور لکڑی کے بتوں کو توڑنے سے زیادہ معنوی بت پرستی کا خاتمہ تھا جو انسان کو عضو معطل بنا دیتی ہے' بت پرستی کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً قبیلہ کا بت' لیڈری کا بت' وطنیت کا بت' انسان پرستی کا بت وغیرہ' آپ نے سب بتوں کو توڑ ڈالا''۔

ضمناً اعتراض

آنحضرت ﷺ نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی بھیڑ ذبح کی تھی۔ (مارگولیس) (سیرت النبی

ج۔۱۔۱۲۵)

جواب: مارگولیس طرح طرح کے بے بنیاد اور جھوٹے واقعات کو زیر بحث لاتا ہے لیکن اسے معتبر سند کی پرواہے اور نہ بے بنیاد ہونے سے غرض' اگر تعلق ہے تو اسے محض الزام دھرنے سے ہے۔ یہ روایت ویل ہازن کے حوالے سے نقل کرتا ہے لیکن اس کی سند میں کسی عربی ماخذ کا حوالہ نہیں دیتا۔ ماخذ ہی نامعلوم ہو تو کہاں سے تلاش کیا جائے' معتبر اور غیر معتبر ہونے کا معاملہ بعد کا ہے اور بغیر ماخذ روایت قابل اعتبار نہیں ہوتی' وہ ایک فرد کی رائے ہو سکتی ہے۔ اللہ بھلا کرے ہمارے علمائے کرام کا کہ کہیں نا کہیں سے نہایت جانفشانی اور محنت بسیار سے ایسی روایات کا سراغ لگا لیتے ہیں' پھر ان کی معتبری اور غیر معتبری کو ثابت کرتے ہیں۔ ''مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ جغرافیہ کی ایک کتاب معجم البلدان میں ایک روایت اسی مضمون کی موجود ہے' اس میں قباحت یہ ہے اول تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے' ثانیاً اس کتاب کی روایت کلبی سے ہے جو مشہور دروغ گو ہے'' (سیرت النبی۔۱۔۱۲۵)۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیغمبر اسلام۔۶۱) بحوالہ ابن کلبی کی کتاب الاصنام سے لکھتا ہے ''قبل از اسلام کم سن محمد (ﷺ) کو مجبور کیا گیا کہ آپ ایک بت کے لیے بھوری (خاکستری) بھیڑ قربان کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی بوانہ کی قربانی ہو' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھیڑ آپ کی توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد چچیوں نے فراہم کی تھی''۔ بہر حال بھیڑ کالی ہو یا بھوری' آپ ﷺ نے کسی بت کے لیے ذبح نہیں کی ہے۔ اس کی قاطع دلیل مولانا شبلی نے پیش کر دی کہ الکلبی ایک مشہور دروغ گو ہے تو اس کی یہ روایت نامقبول اور غیر معتبر ہو گئی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ام ایمنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ'' قریش زمانہ جاہلیت میں بوانہ کے پاس عید مناتے تھے' یہ ایک بت تھا جس کی قریش پوجا کرتے تھے' اس کی تعظیم کرتے' اس کے لیے جانور ذبح کرتے اور اس کے پاس قسمیں اٹھاتے۔ قریش ہر سال میں ایک رات وہاں اعتکاف کرتے تھے۔ ابو طالب اپنی قوم کے ہمراہ آتے تھے' انہوں نے آپ سے بھی وہاں جانے کے لیے کہا: اے محمد عربی! آپ ہمیشہ بتوں سے پرہیز کرتے' ہمیں خدشہ ہے کہ ان کی وجہ سے کسی اذیت کا سامنا کرنا پڑے ہمارے ساتھ چلیے۔ آپ نے وہاں جانے سے انکار کیا تو ابو طالب سخت ناراض ہوئے۔ :عورتوں نے کہا آپ ہمارے بتوں سے اجتناب کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے لیے کچھ جمع کرتے ہیں۔ ان کے اصرار پر آخر حضور ان کے ساتھ گئے' پھر آپ مرعوب اور گھبرا کر واپس آ گئے۔ خواتین نے پوچھا آپ کو کیا ہوا؟ فرمایا! مجھے خطرہ ہے کہ کہیں شیطان مجھے مس نہ کر دے'' خواتین نے

کہا! رب تعالیٰ آپ کو اس آزمائش میں مبتلا نہیں کرے گا۔ آپ ہر قسم کے اخلاق حمیدہ سے آراستہ ہیں۔ آپ نے کیا دیکھا ہے؟ فرمایا ''جب بھی میں ان بتوں کے پاس گیا تو اچانک ایک طویل سفید شخص نمودار ہوا وہ میرے پیچھے زور سے کہتا ''محمد عربی ﷺ'' میرے ماں باپ قربان) بتوں کو ہاتھ نہ لگانا'' حضرت ام ایمنؓ کہتی ہیں'' آپ نے کبھی اس عید میں شرکت نہیں کی، حتیٰ کہ رب تعالیٰ نے نبوت کا تاج آپ کے سر پر سجا دیا''۔ (السیرۃ النبویہ دحلانی۔۱۔۱۲۵)

یہی روایت ''الوفا'' میں یوں ہے حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ ام ایمنؓ فرماتی تھیں کہ قریش کا ایک بت معبود تھا جس کو بوانہ کہا جاتا تھا وہ اس کی عبادت اور تعظیم بجالاتے اور اس کے لیے قربانیاں دیتے اور اس کے پاس سر کے بال ترشواتے اور سال میں ایک دن صبح سے شام تک اس کے پاس معتکف رہتے۔ ابو طالب بھی قوم کے ہمراہ اس کے پاس جاتے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کے متعلق بات چیت کرتے تو آپ ﷺ انکار فرما دیتے۔ وہ اس کو بہت محسوس کرتے اور آپ ﷺ کی پھوپھیاں بھی تھیں حتیٰ کہ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں آپ ﷺ کے معبودات قریش سے احتراز پر حوادث ومصائب میں مبتلا ہونے کا ڈر لگتا ہے اور کہتی تھیں کہ قوم کے ساتھ عید کے دن شمولیت کیوں نہیں کرتے اور ان کی جمعیت میں کثرت واضافہ کا موجب کیوں نہیں بنتے۔ اہل قرابت کا جب اصرار بڑھا تو ایک دن سرور عالم ﷺ ان کے ہمراہ تشریف لے گئے اور ان کی نظروں سے کافی دیر اوجھل رہنے کے بعد جب سامنے آئے تو آپ ﷺ پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ آپ ﷺ سے پھوپھیوں نے عرض کیا تمہیں کس امر نے گھبراہٹ میں ڈالا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھ پر ''جن'' اثر انداز ہو گئے ہوں۔ انہوں نے کہا یہ تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں شیطان کی آزمائش سے دوچار کرے کیونکہ تم امتیازی شان، خصلتوں اور پاکیزہ صفات کے مالک ہو۔ ذرا بتلایئے تو سہی تم نے دیکھا کیا ہے جس سے یہ اندیشہ لاحق ہوا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں جب بھی کسی بت کے قریب گیا، ایک سفید رنگت دراز قد شخص میرے قریب آجاتا اور مجھے کہتا ہے ''اے محمد ﷺ پیچھے ہٹ جایئے اس بت کو ہاتھ مت لگایئے۔ ام ایمنؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد کبھی بھی آپ ﷺ ان کی عید میں شریک نہ ہوئے تا آنکہ آپ ﷺ کو شرف نبوت کے ساتھ مشرف کیا گیا اور اعلان نبوت کا حکم دیا گیا۔ آپ ﷺ بتوں سے متنفر اور بے زار تھے اور قطعاً ان کی طرف توجہ نہیں فرماتے تھے۔ ہرگز اوثان واصنام کے قریب نہیں جاتے تھے بلکہ ان کی قباحت اور عیوب ونقائص بیان کرتے تھے۔

محمد بن عمرو نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو جب بحیرا راہب نے حقیقت احوال دریافت کرنے کے لیے لات وعزا کا وسیلہ دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ہرگز ان کا واسطہ نہ دو' جتنا بغض ان سے ہے اتنا اور کسی شے سے بھی نہیں ہے۔

اعتراض نمبر ۹۴

آپ ﷺ اپنی قوم کے دین ومذہب پر تھے۔

جواب: امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ رسول کریم ﷺ اپنی قوم کے دین ومذہب پر تھے تو اس نے بہت بری بات کی۔ کیا یہ امر روز روشن کی طرح عیاں نہیں ہے کہ آپ ﷺ بتوں کے لیے ذبح کیے ہوئے جانوروں اور انصاب پر ذبح کیے ہوئے جانوروں کا گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے۔

ابوالوفا علی بن عقیل نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ قبل از بعثت حضرت ابراہیمؑ کے مذہب پر کاربند تھے جس امر کا بھی ملت ابراہیمی سے ہونا آپ ﷺ کے نزدیک پایہ صحت کو پہنچتا آپ ﷺ اس پر عمل فرماتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا بعد از بعثت ونزول وحی بھی پہلی شریعتوں پر آپ ﷺ عمل پیرا رہے یا نہیں' اس میں دو روایتیں ہیں اول یہ کہ بذریعہ وحی جن امور کا شریعت رسل میں سے ہونا معلوم ہوتا اس پر عمل فرماتے نہ اہل کتاب سے سن کر اور نہ ہی کتب سابقہ کو دیکھ کر' ابوالحسن تمیمی کا مختار یہی ہے اور امام ابو حنیفہ کے اصحاب کا مسلک یہی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی دوسری شریعت پر عمل پیرا نہیں تھے بلکہ جو وحی آپ ﷺ پر نازل ہوتی اسی پر کاربند رہتے۔ (اپنی شریعت ہونے کی رو سے اگرچہ وہ پہلی شریعتوں کے موافق ہی کیوں نہ ہوتی) معتزلہ اور اشاعرہ کا مختار یہی ہے اور امام شافعیؒ سے دونوں قول منقول ہیں، مثل دونوں روایتوں کے جن حضرات نے آپ ﷺ کو پہلی شریعتوں پر متعبد اور کاربند تسلیم کیا ہے۔ ان میں پھر اختلاف ہے کہ آپ ﷺ کس پیغمبر کی شریعت پر عمل فرماتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف ابراہیمؑ کی شریعت پر اور حضرت امام شافعیؒ کے متبعین کا مختار یہی ہے اور ایک جماعت کا مختار یہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ کی شریعت پر عمل فرماتے تھے ماسوائے ان امور کے جو ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکے تھے۔ امام احمدؒ کے کلام سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک آپ ﷺ کسی ایک نبی کی شریعت پر پابندی نہیں فرماتے تھے بلکہ جو امر بھی درست طریقہ پر معلوم ہوتا کہ کسی نہ کسی پیغمبر کا معمول ہے اور ان کی شریعت میں درست وصحیح ہے اس پر عمل فرمالیتے بشرطیکہ اس پر خط نسخ نہ کھینچ دیا گیا ہو اور کلام مجید سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اولئک الذین ھدی اللہ فبھد اھم اقتدہ'' یہی وہ مقدس گروہ انبیاء ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی کمالات اور امتیازی اوصاف سے موصوف فرمایا ہے لہذا تم بھی ان کی سیرت و کردار اور اخلاق و اعمال کو اپناؤ۔ (ڈاکٹر حمید اللہ)

ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ عرب ہمیشہ کے لیے دین اسماعیلؑ کی جو بات بھی ان کو معلوم تھی اس پر کاربند رہے۔ انہی امور میں سے حج بیت اللہ، ختنہ، تین طلاق کے بعد رجوع کا سقوط، ایک اور دو طلاق کی صورت میں خاوند کے لیے حق رجعت کا اعتراف و تسلیم، قتل ناحق کی دیت سو اونٹ، غسل جنابت، قرابت یا رشتہ داری کی وجہ سے حرام ہو جانے والی عورتوں کے ساتھ نکاح حرام سمجھا اور محبوب خدا ﷺ ان کے ساتھ ایمان باللہ اور عمل با شرائع مثل ختان، غسل جنابت اور حج میں موافقت فرماتے تھے۔ (بظاہر اس دعویٰ پر قول باری تعالیٰ ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان سے اعتراض وارد ہوتا تھا کیونکہ ظاہری معنی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ تو ابن قتیبہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد تفصیلات شریعت ہیں نہ کہ تصدیق و اقرار کیونکہ حضور ﷺ کا معاملہ تو الگ ہے (آپ ﷺ کی فطرت سلیمہ اور خلوص نیت و محویت اور تقدم رسالت و نبوت، ارواح انبیاءؑ کے لیے روح نبوی کا مربّی ہونا، ملائکہ کو درس تسبیح و تقدیس دینا، آباؤ اجداد کی اصلاب میں ذکر خداوندی اور تسبیح و تقدیس میں مشغول رہنا اور وقت ولادت سربسجود ہونا وغیرہ ایسے امور ہیں جو آپ ﷺ کے ایمان باللہ پر شاہد عادل ہیں اور نا قابل انکار و تردید و براہین و دلائل ان سے قطع نظر) آپ ﷺ کے آباؤ اجداد کو زمانہ شرک میں دارِ فانی سے رحلت کر گئے وہ بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور اسی کے لیے حج بھی ادا کرتے تھے حالانکہ وہ اہلِ جاہلیت میں سے تھے اور وہ دور شرک و کفر کا تھا (تو جب وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان سے بے خبر نہیں تھے تو سرور انبیاء اور سید المرسلین ﷺ کیونکر بے خبر ہو سکتے تھے۔ (الوفا۔ ص۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸)

☆☆☆☆☆☆☆

ازواجِ مطہرات، زیادہ شادیاں اور عرب روایات

اعتراض نمبر ۹۵

نجران کے یہودیوں نے سرکار دو عالم ﷺ کے خلاف ایک یہ الزام دھرا کہ آپ ﷺ کی یہ ساری محنت اور جان ماری اس مقصد کے لیے ہے کہ جو مقام و رتبہ حضرت مسیحؑ کا چلا آ رہا ہے وہ آپ ﷺ کے قبضہ میں آ جائے اور عیسائیوں اور دیگر افراد کو آہستہ آہستہ اپنے آہنی شکنجہ میں جکڑ کر اپنی پرستش اور پوجا پاٹ میں لگا لیا جائے۔

جواب: اس اعتراض سے پہلے اس کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے تا کہ حقیقت سامنے آ سکے۔ یمن کے ایک شہر نجران جو تہتر گاؤں پر مشتمل تھا وہاں سے ایک عیسائی وفد ساٹھ افراد پر مشتمل سن ۹ ہجری میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان افراد میں رئیس الوفد عبدالمسیح تھا' دوسرا شخص ایہم جو سیاسی امور کا نگران تھا اور تیسرا ان کا لاٹ پادری اور روحانی پیشوا ابو حارثہ بن علقمہ تھا۔ صحابہ کرامؓ عصر کی نماز ادا کر چکے تو اس وقت یہ وفد، مسجد نبوی میں آیا یہ لوگ بھی نماز پڑھنے لگے صحابہ کرام نے منع کرنا چاہا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ نے ان پر اسلام پیش کیا اور قرآنی آیات تلاوت فرمائیں لیکن انہوں نے اسلام قبول نہ کیا اور انہوں نے کہا ''ہم آپ ﷺ سے پہلے کے مسلمان ہیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا۔۔۔ تین چیزیں تمہیں اسلام سے روکتی ہیں۔ اول صلیب کی عبادت دوم سؤر کا گوشت سوم تمہارا یہ گمان کہ مسیحؑ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ (نعوذ باللہ) ایک روایت کے مطابق ان میں سے ایک شخص نے کہا ''مسیح اللہ کے بیٹے ہیں کیونکہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے''۔ دوسرے شخص نے کہا ''مسیح اللہ ہیں کیونکہ انہوں نے مردے زندہ کیے' غیب کے متعلق بتایا' ساری امراض سے شفایاب کیا' مٹی سے پرندہ بنا کر اڑا دیا''۔ ان کے افضل شخص نے کہا آپ انہیں برا بھلا کیوں کہتے ہیں' آپ ﷺ کا گمان ہے کہ وہ بندے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کا (خاص) بندہ ہے اور وہ پاکیزہ کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی طرف پھینکا تھا''۔ یہ فرمان سن کر عیسائی غضب ناک ہو گئے اور انہوں نے کہا ''ہم صرف اس صورت میں آپ ﷺ سے راضی ہوں گے جب آپ ﷺ کہیں گے کہ حضرت عیسیٰؑ الٰہ ہیں اگر آپ ﷺ سچے ہیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ کا ایسا بندہ دکھائیں جو مردوں کو زندہ کرتا ہو' مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو شفایاب کرتا ہو' مٹی سے پرندہ بنائے پھر اس میں پھونک ماریں اور وہ پرندہ بن کر اڑ جاتا ہو''۔ آپ ﷺ نے سکوت فرمایا پھر یہ آیت طیبہ تلاوت فرمائی

"اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِندَاللہ کَمَثَلِ اٰدَمَ ط خَلَقَہُ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُن فَیَکُونَ ۔۔۔ لعنۃ اللہ علی الکذبین (آل عمران)" "بے شک مثل عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے پھر فرمایا اسے ہوجا تو وہ ہوگیا۔(اے سننے والے) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے پس تو نہ ہوجا شک کرنے والوں سے پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ ﷺ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آ گیا آپ ﷺ کے پاس علم تو آپ ﷺ کہہ دیجیے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور تمہاری بیٹیوں کو بھی اور اپنی بیٹیوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی' اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی پھر بڑی عاجزی سے اللہ کے حضور دعا کریں پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر"۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ رب العزت نے مجھے حکم دیا کہ اگر تم اسلام کے لیے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو میں تمہارے ساتھ مباہلہ کروں ۔۔۔ عیسائیوں نے مشاورت کے لیے وقت مانگا' باہم مشاورت کے بعد ان میں سے ایک نے کہا "باخدا! تم خوب جانتے ہو کہ یہ وہ ہستی نبی مرسل ہے' کوئی قوم کسی بھی نبی پر لعنت نہیں کرتی مگر اسے جڑ سے اکھیڑ دیا جاتا ہے' اگر تم اپنے دین پر رہنا چاہتے ہو تو انہیں چھوڑ دو اور ان کے ساتھ صلح کر کے اپنے وطن لوٹ چلو"۔انہوں نے مباہلہ سے معذرت کر لی اور جزیہ پر مصالحت کر لی۔اہل نجران کے رد میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں کئی آیات نازل فرمائیں ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے "ھوالذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء (آل عمران)" "وہی ہے جو تمہاری تصوریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے۔" اگر آپ ﷺ عیسیٰؑ والا منصب لینا چاہتے تو نجران کے وفد سے یہ نہ فرماتے کہ (آدمؑ) کو مٹی سے بنایا پھر فرمایا اسے ہوجا تو وہ ہوگیا" کیونکہ عیسائی تو مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔آپ ﷺ اس کی مخالفت اور رد فرما رہے ہیں اسی بات پر تو عیسائی ناراض ہوگئے آخرکار جزیہ دے کر مصالحت کر لی۔

آپ ﷺ پوجا پاٹ اور بتوں کی پرستش کے خلاف تھے جیسا کہ پیچھے مستشرقین کی آراء سے تائید اور مخالفین کی تردید واضح ہوتی ہے۔اس کے علاوہ آپ ﷺ نے اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی ایسے منصب کی طلب کا اشارہ تک آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں ملتا ہے لیکن مخالف نے خود اپنے ذہن سے ایک طومار گھڑ لیا اور اپنی جگہ یہ ٹھہرا لیا کہ محمد ﷺ کا مقصد تو یہی تھا کہ عیسیٰؑ کی طرح بن کر اپنی پوجا کرائیں ۔۔۔ دعویٰ نہ کیا ہو تو نہ سہی' دل میں اسی بات کا ارادہ تھا' ابھی ارداہ سامنے نہیں آیا تو کیا ہوا آثار بتاتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی یہ ارادے سامنے آ کر رہیں گے۔نجران کے وفد کے ارکان کے کان ان فضولیات سے بھرے گئے جس پر ایک رکن ابونافع قرظی نے یہ سوال آپ ﷺ سے کھلم کھلا کیا کہ "کیا آپ ﷺ ہم سے یہ چاہتے ہیں

کہ ہم آپ ﷺ کو اس طرح پوجیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ کی پوجا کرتے ہیں''۔ایک دوسرے رکن الرئیس نے بھی پوچھا کہ ''اے محمد ﷺ! کیا آپ ہم سے یہی چاہتے ہیں اور اسی کے لیے دعوت دیتے ہیں۔؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' خدا کی پناہ! اس بات سے کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کروں یا اس کے سوا کسی اور بندگی کی دعوت دوں پس مجھے خدا نے اس مقصد کے لیے نہیں اٹھایا ہے اور نہ مجھے اس کا حکم دیا ہے۔قرآن نے اس موقع پر تنبیہ کی ''ما کان بشر عن یؤ تہ اللہ الکتاب وا لحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کو نو ا عبادالی من دون اللہ (سورۃ آل عمران ۷۹، پارہ ۳) (ترجمہ) کسی انسان کا یہ منصب نہیں ہے کہ خدا اسے کتاب اور حکمت اور نبوت سے سرفراز کرے تو پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ''۔

کسی نے کہا سوتے وقت آپ ﷺ ایک بت کی پوجا کر کے سوتے تھے' کسی نے کہا آپ ﷺ نے بتوں کی پرستش کی۔کسی نے کہا کہ آپ ﷺ نے خانہ کعبہ میں موجود بتوں پر تنقید نہیں کی' سب سے بڑھ کر وفد نجران کے اراکین نے حد کر دی اور بول پڑے کہ آپ ﷺ ہم سے اپنی پرستش کروانا چاہتے ہیں تا کہ حضرت مسیح کا مقام و مرتبہ حاصل ہو جائے۔آپ ﷺ نے تو بت پرستوں کو خدا پرست بنا دیا' بڑے بڑے بتوں کو آپ ﷺ کے حکم سے صحابہ کرام نے پاش پاش کر دیا' کعبہ میں رکھے بتوں کو توڑ کر کعبہ کو صاف کر دیا' تو کیسے وہ ذات دوسروں کو اپنی پوجا کے لیے کہے گی کیونکہ اپنی پوجا کروانا بتوں کی پوجا سے کیا کم تھا' نہیں اسی لیے ہر قسم کے بت کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کی توحید کا ڈنکا بجایا اور عام کیا۔یہ سب مفروضے اور من گھڑت باتیں ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں' ماخذ کلیتاً اس کا رد کرتے ہیں اور باطل ٹھہراتے ہیں' یہ بداہتاً غلط ہے کیونکہ وہ ذات جو ایک خدا کی ایک وقت میں دعوت دے اور دوسرے وقت میں دیوی دیوتاؤں' بتوں' مجسموں کی پوجا پاٹ کروانے کا حکم دے سکتا ہے یا اپنی پرستش کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ ہرگز ہرگز نہیں!

اس اعتراض کے رد میں ان کے ہمنواؤں کی آراء بیان کی جاتی ہیں۔

نپولین بونا پارٹ:۔۔ پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں لوگوں کی کثیر تعداد نے جھوٹے دیوتاؤں کی پرستش سے توبہ کر لی' مٹی کی بنی ہوئی دیویاں مٹی میں ملا دی گئیں یہ حیرت انگیز کارنامہ تھا آپ ﷺ کی تعلیم کا۔

مسٹر صیبان: انہوں نے وحدانیت پر زور دیتے ہوئے انسانوں کو بت پرستی اور انسان پرستی سے اس علمی اور عقلی قاعدہ کے ذریعے سے نجات دلائی کہ دنیا اور دنیا کا ہر ذرہ ذرہ ہلاک ہونے سے محفوظ ہو گیا۔

مسٹر سیمیر (فرانسیسی) بجائے تثلیث کے لغو عقیدہ کے' وحدانیت کے پاک عقیدہ کا اعلان فرمایا یہی چیز اسلام کا اصل اصول ہے اور آپ ﷺ کی کامیابی کی کنجی ہے۔

اعتراض نمبر ۹۶

نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ آپ ﷺ کے اعتقادات میں جو تغیر پیدا ہوا وہ عہد نبوت سے ہوا اور نہ اس سے پہلے آپ کا طرز عمل وہی تھا جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے پہلے صاحبزادے کا نام عبدالعزیٰ رکھا تھا' یہ روایت تاریخ صغیر بخاری میں ہے'' لیکن یہ روایت اگر درست بھی ہو تو اس سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کیونکر استدلال ہوسکتا ہے حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا۔ آنحضرت ﷺ ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے اس لیے آپ ﷺ نے تعرض نہ فرمایا۔

جواب: دراصل یہ روایت فی نفسہ بھی ثابت نہیں۔ اس روایت کا زیادہ ترصحیح سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے جس کا پہلا راوی اسماعیل یعنی اسماعیل بن اویس' اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے۔

۱۔ معاویہ بن صالح کہتے ہیں۔۔۔ اسماعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔

۲۔ یحیٰ بن مخلط کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے۔

۳۔ امام نسائی کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔

۴۔ نصر بن مسلمہ مروزی کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ وہ کذاب ہے۔

۵۔ دار قطنی کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اس کو صحیح روایت کے لیے پسند نہیں کرتا

۶۔ سیف بن محمد کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ جھوٹی حدیثیں بناتا ہے۔

۷۔ سلمہ بن شعیب کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھ سے خود اس نے اقرار کیا ہے کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنالیتا تھا۔ (سیرت النبی۔ا۔۱۲۵)

اس روایت کا یہ جز ''نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا وہ عہد نبوت سے ہوا'' کو زیر بحث لاتے ہیں۔ یہ بات بھی درست نہیں اس پر مولانا شبلی بحوالہ مستدرک فرماتے ہیں یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کردی تھی اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد تھا ان کو اس بات سے منع فرماتے' اس بات سے نصاریٰ کو دھوکہ ہوا کہ آپ اعلانیہ بتوں سے منع نہیں فرماتے تھے ابتدائی مراحل میں کئی وجوہ پر با اعتماد لوگوں کو اس پیغام کی دعوت دیتے تھے۔ اگر آپ مخالفت نہ کرتے اور (نعوذ باللہ) آپ کا عقیدہ بھی یہی ہوتا اور با اعتماد لوگوں کو کھلی چھٹی دے دیتے کہ جاؤ اور بت پرستی کرو' لیکن ایسا کسی طور ثابت نہیں۔

(۲) بخاری شریف کی ایک طویل حدیث کا ٹکڑا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زید بن عمرو بن نفیل

سے بلدح میں آپ پر وحی کے نزول سے پہلے ملاقات کی۔ بلدح (وادی کا نام) کے لوگوں نے آپ ﷺ کے سامنے دستر خوان بچھا دیا' لیکن آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ کھانے سے انکار کر دیا پھر زید نے کہا: جو تم بتوں کے نام پر ذبح کرتے ہو' میں نہیں کھاتا ہوں میں تو وہی کھاتا ہوں جس پر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو۔ (تفہیم البخاری۔۵۔۸۰۹) یہ واقعہ قبل از نبوت کا ہے آپ کا یہ عمل بت پرستی کے خلاف عملی تربیت و تعلیم کا نمونہ ہے۔ آپ ﷺ شروع دن ہی سے ان تمام مشرکانہ رسوم سے اجتناب کرتے تھے' بعثت سے قبل اور بعد میں۔ آپ بت پرستی کا خاتمہ کرنے کے لیے تشریف لائے اور ایک خدا کا پیغام پہنچانے آئے تھے جو رحمان و رحیم ہے۔ اور ان اللہ علی کل شی ءقدیر''۔ مستشرقین پر لازم ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب دیں۔

(ا) آپ نے عمر کے کسی حصہ میں بت پرستی کا اقرار کیا ہو یا کسی بت کی پرستش کی ہو یا یہ کہا ہو کہ پہلے پہل میں بت پرستی کی طرف مائل تھا اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی اور بت پرستی کو ترک کر دیا۔ (ب) یا کسی دوست اور ساتھی کے ساتھ کسی بت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے ہوں یا کسی موقعہ پر بت پرستی کی تائید و حمایت کر کے کسی خاص گروہ کو رعایت بخش دی ہو کہ تمہیں بت پرستی کی اجازت ہے یا گھر کے کسی فرد نے یہ کہا ہو کہ آپ پہلے بت پرست تھے؟

اہم نکتہ: اگر کوئی کہے کہ مسند امام احمد میں ایک روایت ہے جو مذکورہ بخاری کی روایت کے متضاد ہے تو ان میں سے کون سی روایت معتبر ہے اور کون سی غیر معتبر؟

مسند کی روایت میں ہے'' آنحضرت ﷺ نے زید بن عمرو بن نفیل کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کر دیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا تیار شدہ کھانا نہیں کھایا'' جواباً عرض ہے اول یہ کہ مسند کے راویوں کا حال نہیں ملتا، اس لیے یہ روایت معتبر نہیں ہے۔ بخاری کی روایت کے مقابل یہ قابل وقعت نہیں آپ کی زید بن عمرو سے ملاقات قبل از نزول وحی ہوتی ہے اور آپ ﷺ نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کر دی تھی تو پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ نے بتوں کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کا تیار شدہ کھانا کھایا ہو۔ آنحضرت ﷺ بت پرستی کی مخالفت نہ کرتے تو مشرکین مکہ درپے آزار نہ ہوتے۔ بت جنہیں کفار خدا کے حضور اپنا سفارشی سمجھتے تھے اور ان کی سفارش کی قبولیت کے دعویدار تھے۔ وہ بتوں کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ان طاقتور سفارشیوں کو تنقید کا نشانہ بننا گوارا نہیں کر سکتے تھے دوسری طرف آپ ﷺ ایک خدا کی وحدانیت کا پیغام پہنچا رہے تھے جس پر کفار سیخ پا ہو گئے اور آپ کے جانی دشمن بن گئے مگر آپ ﷺ نے جان کی پروا کیے بغیر اللہ کے پیغام کو پہچانے کا فریضہ ادا کرتے رہے' اور بتوں کی پوجا کو باطل کہتے رہے۔ غور فرمائیے کہ

وہ ذات جو زمانہ بھر کی دشمنی مول لے لے اور ہر قدم پر جاں گسل خطرات پیش ہوں اور وہ کسی مرحلہ پر بھی پیچھے نہ ہٹا ہو تو وہ کیونکر بتوں کی پرستش کرے گا؟ اگر آپ ان کے مذہب کو باطل نہ کہتے تو وہ آپ کے مخالف اور دشمن نہ ہوتے اور نہ ہی مصائب کے پہاڑ راہ میں کھڑے کرتے۔ فتح مکہ کے موقع پر کعبہ کو بتوں سے صاف کیا گیا سارے بت توڑ دیئے گئے۔ اتنے بڑے دشمن موجود تھے لیکن کسی کی زبان سے یہ الفاظ نہ نکلے کہ دیکھو کل تک تو وہ بت پرست تھا اور آج بت شکن بن گیا ہے۔ لات ومنات کے بعد تراشا جانے والا بت عزیٰ تھا فتح مکہ کے پانچ دن بعد خالد بن ولید کو تیس صحابہ کی جماعت کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اس بت کو توڑ دو۔ (ن۔۴۔۴۱۵) آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ سُوَاع قبیلہ ہذیل کا بت مُشلل کے مقام پر نصب تھا' اسے گرانے کا حکم حضرت عمرو بن العاصؓ کو ملا' اس نے تعمیل کی۔ الغرض پیغمبر اسلام ﷺ نے بعثت سے قبل اور بعد بت پرستی کی مخالفت کی اور ہر ممکن اس کے خاتمہ کے اقدامات کیے۔ ''ایڈورڈ گبن'' کہتا ہے مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی' انسانوں کی' ستاروں کی اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کر دیا کہ جو شے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے جو حادثہ ہے وہ فانی ہے جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے چنانچہ اس کے معتقدین ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھتے ہیں اور بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا۔ (خطبات احمدیہ۔۱۵)

ایڈورڈ گبن کے بیان پر حاشیہ چڑھاؤں گا۔ اس نے مکہ کا پیغمبر لکھا جبکہ آپ ﷺ ساری دنیا کے لیے رسول بن کر آئے اور پوری دنیا کے لیے رہتی دنیا تک کے لیے بلکہ حشر تک کے لیے رسول ہیں۔ ارشاد ربانی ہے ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ'' (السبا ۲۸، پارہ ۲۲) اور سورت اعراف میں ہے ''قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا'' ترجمہ: تم فرماؤ اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول ہوں۔ پھر یہ کہنا کہ معتقدین ہندوستان سے مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں حالانکہ صرف ہندوستان سے مراکو تک نہیں بلکہ پوری دنیا میں آپ ﷺ کے معتقدین موجود ہیں اور یہ صرف موحد نہیں بلکہ مومن ہیں' جو اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کے پیغمبروں پر' اس کی کتابوں پر' آخرت کے دن پر اور خیر و شر پر' اور موت کے بعد اٹھنے پر جو اللہ کی طرف سے ہے' ایمان رکھتے ہیں۔ (امنت باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالٰی والبعث بعد الموت'')

اعتراض نمبر ۹۷

۱۔ تین سال تک نبی کریم ﷺ نے نہ تو توحید کا تصور پیش کیا اور نہ ہی آپ نے بتوں کے خلاف کچھ کہا۔ ابتداء میں محمد ﷺ کے عقائد اپنے دیگر ہم قوم لوگوں کے عقائد سے متفق تھے۔ (ٹارانڈ رائے)

۲۔ واٹ کہتا ہے، قرآن حکیم بتوں کے وجود کا انکار نہیں کرتا بلکہ ان کی طاقت کا انکار کرتا ہے۔

(ضیاالنبی۔۷۔۳۶۴)

۳۔قرآن مجید نے بعض بتوں کی مخالفت کی ہے لیکن بعض دوسرے بتوں کے متعلق اسلام نے مصالحت کا رویہ اپنایا ہے۔

۴۔آپ نے جو حملے بتوں پر کیے وہ حملے ان بتوں کے خلاف نہیں تھے جو خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے بلکہ آپ ﷺ کے حملے خانہ کعبہ کے بتوں کے علاوہ دیگر صنم کدوں کے بتوں کے خلاف تھے۔ (حوالہ بالا) واٹ یہ بھی کہتا کہ محمد ﷺ نے کعبہ میں مورتیوں کی پوجا پاٹ پر کبھی براہ راست تنقید نہیں کی اس کے نزدیک قرآن نے کعبہ کے بتوں کی مذمت نہیں کی ہے اور نہ ہی تنقید کی ہے اگر کعبہ کے بتوں کی مخالفت کرتے تو عرب کے لوگ مکہ آنا جانا بند کر دیتے اور تجارت ٹھپ ہو جاتی۔

۵۔حضور نے بتوں کو فرشتے قرار دیا اور ان کی شفاعت کو تسلیم کیا' آپ نے صرف ان کو خدا کی بیٹیاں کہنے سے منع کیا۔

۶۔اسلام نے شرک کو ختم کیا لیکن مشرکانہ نظریات و رسوم کو جاری رکھا۔(حوالہ بالا)

جواب:(ا) آپ ﷺ نے ابتدائی تین سالوں میں نہ توحید کا تصور پیش کیا اور نہ ہی آپ نے بتوں کے خلاف کچھ کہا۔اس کی دلیل مستشرقین یہ پیش کرتے ہیں کہ کفار نے آپ ﷺ کی مخالفت نہ کی اگر شروع ہی سے بتوں کے خلاف کہتے تو شروع دن ہی سے کفار آپ ﷺ کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوتے۔اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جب سے اسلام کا پیغام دینا شروع کیا اسی وقت سے شرک سے باز رہنے اور توحید پر ایمان لانے کی ہدایت فرما رہے تھے۔آپ نے تبلیغ عام یعنی اعلانیہ تبلیغ سے قبل لوگوں کو خفیہ طریقے سے اسلام کی دعوت دی وہ دعوت توحید تھی جس نے اسلام کو گلے لگایا اور اس کی زبان سے توحید کے اقرار کا اعلان ہوا یعنی اس نے لا الہ الا اللہ پڑھا۔یہ خفیہ تبلیغ ہی تھی جس کی بدولت حضرت صدیقؓ اور خدیجہؓ ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔اس خفیہ تبلیغ کے ذریعے تقریباً چالیس کے قریب افراد مشرف با اسلام ہوئے۔حضرت صدیقؓ نے پیغمبر خدا ﷺ کی دعوت کے جواب میں یوں کہا"میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں' آپ نے سچ فرمایا ہے اور آپ سچوں میں سے ہیں۔میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی معبود برحق نہیں' آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں"۔اسی طرح بچوں میں حضرت علیؓ اور غلاموں میں حضرت زیدؓ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔یہ ہستیاں تین سال کے بعد نہیں بلکہ شروع ہی سے ایمان لائیں تھیں

(۲) بعض مستشرقین صرف قرآن مجید کو فوقیت دیتے ہیں اور اعتماد رکھتے ہیں لیکن اگر وہ تھوڑا سا غور کر لیتے تو یہ راز ان پر عیاں ہو جاتا۔ابتدائی آیات کے نزول میں سورۃ مدثر شامل ہے اس میں بتوں

کی مخالفت ہے اور آپ ﷺ کو رسالت کے فرائض کی ادائیگی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ”یا ایھا المدثر ہ قم فانذر ہ و ربك فکبر ہ ثیابك فطھرہ والرجز فاھجر o ترجمہ: اے چادر لپیٹنے والے اٹھیے اور ڈرایئے اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے لباس کو پاک رکھیے اور بتوں سے دور رہیے۔“

سورہ الشعراء میں ہے ” فَلَا تَدعُ مَعَ اللهِ اِلٰهاً اٰخَرَ فَتَکُونَ مِنَ المُعَذَّبِینَ“ ترجمہ: پس نہ پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو اور خدا کو ورنہ تو ہو جائے گا ان لوگوں میں جنہیں عذاب دیا گیا ہے۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ ابتداء میں بتوں کی مخالفت نہیں کی' کیا انہیں علم نہیں کہ جو مسلمان اسلام میں داخل ہوئے انہوں نے توحید کا ترانہ لا الہ الا اللہ پڑھا تھا' یہ ترانہ تمام بتوں خواہ وہ کعبہ میں تھے یا باہر کہیں، سب کی خدائی کا انکار تھا۔ نہ جانے مستشرقین کو اس کلمہ توحید میں بتوں کی مخالفت کا عنصر کیوں نظر نہیں آتا؟

(۳) قرآن کریم بتوں کے وجود کا انکار نہیں کرتا صرف ان کی طاقت کا انکار کرتا ہے۔ (واٹ)

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام سے قبل لوگ حجر و شجر، شمس و قمر، آگ اور دیگر محسوس خداؤں کی پوجا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انسان خدائی کا دعویٰ کر کے خدا بن بیٹھا۔ جب کہ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اللہ ہی ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، زندگی و موت اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ عزت و ذلت دینے والی وہی ذات بے ہمتا ہے۔ یہ نظام ہستی وہی چلا رہا ہے، صرف وہی خدائے واحد ہے ”قل ھو اللہ احد“ وہی عبادت کے لائق ہے اس ذات کے سوا کسی کی عبادت کرنا، کسی کو خدا سمجھنا کائنات کا خالق جاننا شرک ہے۔ اسلام یہ بتانے نہیں آیا تھا کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں جس کی عبادت کی جاتی ہو جب کہ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ لوگ محسوس خداؤں کی پوجا پاٹ کرتے تھے بلکہ اسلام بتانے یہ آیا تھا کہ جن چیزوں کو کفار خدا سمجھ بیٹھے ہیں یہ خدا نہیں ہیں۔ یہ کسی کام کے نہیں ہیں اور نہ نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اگر ان کے منہ پر مکھی بیٹھ جائے تو اسے اڑانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ محض مجبور و عاجز اور بے بس بھلا خدا ہو سکتے ہیں؟ خدا تو وہ ہے جس کی شان ہے ”ان اللہ علی کل شی قدیر“ اسلام بتوں کا قلع قمع کرنے آیا تھا۔ بت پرستی کو جڑ سے اکھاڑنے آیا تھا لیکن اسلام جو دین حق ہے اس کی تعلیمات سے ایسی توقع رکھنا ناممکن ہے کہ وہ ایسی بات کی تعلیم کرے جو خلاف واقعہ ہو۔

(۴) قرآن حکیم نے بعض بتوں کی مخالفت کی لیکن بعض دوسرے بتوں کے متعلق اسلام نے مصالحت کا رویہ اپنایا۔ یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ اسلام نے بتوں کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تو کفار اسلامی تعلیمات کے مخالف ہو گئے۔ مشرکین اسلام کے نام لیواؤں کے جانی دشمن بن گئے، کیا یہ دشمنی بتوں سے مصالحت کا نتیجہ تھی۔ عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے کہ دشمنی تب ہوتی ہے جب آپ ان کے

خلاف بات کرتے ہیں۔ مصالحت سے دشمنی پیدا نہیں ہوتی پھر حد یہ ہے کہ اس باطل نظریہ کی دلیل قرآن کی آیات سے لاتے ہیں۔ارشاد ربانی ہے

اَفَرَءَیتُم اللّٰتَ وَالعُزّٰی۔ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الاُخرٰی (النجم ۱۹،۲۰، پارہ ۲۷) ترجمہ: اے کفار! کبھی تم نے غور کیا لات وعزیٰ کے بارے اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے۔

مستشرقین کا کہنا ہے کہ لات وعزیٰ اور منات جو طائف کی وادی نخلہ اور بحیرہ احمر کے کنارے نصب تھے۔ یہ مکہ کے گردونواح میں بت تھے۔ان کی مخالفت نام لے کر کی مگر مکہ میں موجود اور مکہ سے باہر دوسری بستیوں کے بتوں کی مخالفت نہیں کی گئی۔اس کی ایک اور دلیل یہ بھی لاتے ہیں کہ حضور کی مخالفت انہی لوگوں نے کی جو مکہ کے باسی تھے لیکن ان کی جائدادیں طائف میں تھیں۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور نے مکہ کے بتوں کی مخالفت اس خوف سے نہ کی کہ کہیں مکہ کے سرداران کے مخالف نہ ہو جائیں ۔ان حضرات کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ توحید کا پیغام یعنی لا الہ الا اللہ تین بتوں کی مخالفت میں تھا یا سب بتوں کے لیے؟ یہ مستشرقین کے لیے چیلنج ہے کہ اس کا جواب دیں،ان شاءاللہ وہ اس کا جواب نہیں دے پائیں گے۔

الف۔انہیں یہ بھی علم ہے کہ مکہ کے بڑے بڑے سرداروں نے آپ کی مخالفت میں کمر کس لی تھی اگر مکہ کے بتوں سے مصالحت اسی سبب سے تھی کہ مکہ والے ناراض نہ ہو جائیں،مخالفت میں سینہ سپر نہ ہو جائیں تو یہ مقصد فوت ہو جاتا اور یہ مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ مکہ کے سرداروں کی جائدادیں طائف میں تھیں اور آپ ﷺ نے طائف کے بتوں کی مخالفت کی جس سے وہ آپ ﷺ کے دشمن بن گئے۔ان کے مخالف ہو جانے سے وہ کون سی وجہ تھی کہ آپ مکہ کے بتوں کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرتے؟ خوف یا ڈر تو ان کی دشمنی کی وجہ سے تھا،مگر جب وہ دشمن جان بن گئے تو بتوں کے خلاف کچھ نہ کہنا اور نرم رویہ اختیار کرنا چہ معنی دارد۔

ب۔کفار اپنے خداؤں کی بادشاہی اور خدائی کو خطرے میں دیکھ رہے تھے آپ ﷺ کے بتوں کی مخالفت میں دلائل و براہین سے ان کے پادری بیخ پا ہو رہے تھے تدبیریں سوچنے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان تدابیر اور ان کے ردعمل کا نقشہ قرآن کریم یوں کھینچتا ہے۔

"اَجَعَلَ الاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔اِنَّ هٰذَا لَشَیءٌ عُجَابٌ وَانطَلَقَ المَلَاُ مِنهُم فِی المِلَّةِ الاٰخِرَةِ اِنَّ هٰذَا اِلَّا اختِلَاقٌ (ص ۴۔۵، پارہ ۲۳)

ترجمہ: کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا، بے شک یہ بڑی عجیب بات ہے اور تیزی سے چل دیئے قوم کے سردار اور یہاں سے نکلو اور جمے رہو اپنے بتوں پر بے شک اس میں اس کا

کوئی مدعا ہے، ہم نے تو ایسی بات آخری ملت میں بھی نہیں پائی، یہ بالکل من گھڑت مذہب ہے۔

یہ پریشانی دو سبب سے تھی ایک تو بتوں کی مخالفت تھی کہ وہ کچھ نفع و نقصان نہیں دے سکتے وہ منہ پر بیٹھی مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتے تو اوروں کے کس کام آسکتے ہیں؟ گویا ان کے غلط عقائد کا بھانڈا پھوٹا جا رہا تھا۔ دوسری وجہ پریشانی کی یہ تھی کہ اسلام کے پرچار سے آئے دن نت نئے لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے ان میں وہ جری اور بہادر جوان بھی تھے جن کے رعب اور جلال اور طمطراق سے عرب اور عرب سے باہر قیصر و کسریٰ کانپ اٹھتے تھے۔ یعنی حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے لوگ ایمان لائے بت پرستی کے محل کی عمارت گرنے والی ہی تھی اور یہی فکر ان کے وڈیروں اور سرداروں کی نیندیں اڑائے ہوئے تھا۔ انہیں اپنے خداؤں کی خدائی ہاتھوں سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس وجہ سے پریشان حال تھے۔ قریش مکہ کے لوگ کئی بار آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس جا چکے تھے اور کہہ چکے تھے کہ اپنے بھتیجے سے کہیں کہ وہ ان کے بتوں کو برا بھلا کہنے سے باز رہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے طرح طرح کی پیش کشیں کیں تا کہ بتوں کی مخالفت چھوڑ دیں۔ گویا مستشرقین کے پہلے سردار یعنی کفار تو مان رہے ہیں کہ آپ نے بتوں کی مخالفت کی اور سرداروں نے آپ ﷺ کو روکنے کے بسیار جتن کیے مگر آج کل کے مستشرقین نہ اپنوں کی بات مانتے ہیں نہ غیروں کی۔ کیا یہ ہٹ دھرمی اور اسلام دشمنی نہیں ہے۔؟

(۵) آنحضرت ﷺ نے بتوں کو فرشتہ قرار دیا، ان کی شفاعت کو تسلیم کیا، آپ نے صرف ان کو خدا کی بیٹیاں کہنے سے منع کیا (ضیا النبی۔۳۶۵)

جواب: انسان نے مختلف مظاہر فطرت کو معبود ٹھہرا لیا تھا۔ اپنے جیسے انسانوں کو خدا کے مقرب بندے اور رسولوں اور نبیوں کو خدا سمجھ لیا اور کبھی فرشتوں کو اِلٰہ بنا بیٹھے اور حق شفاعت کا سہرا ان کے سر سجا دیا۔ قرآن حکیم نے سوائے اللہ تعالیٰ کے تمام ان چیزوں کی عبادت کو لائق نہ سمجھا کیونکہ یہ خود محتاج اور بے بس ہیں، وہ کیسے خدا ہو سکتے ہیں؟ قرآن پاک کی آیت جس کا ترجمہ ہے ''نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لیے کہ عطا کر دے اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور حکومت اور نبوت، تو پھر کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر، بن جاؤ اللہ کہنے والے، اس لیے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے اور وہ تمہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنا لو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا، کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔ (سورہ آل عمران ۷۹،۸۰، پارہ ۴)

گویا عیسائیت کا اپنا عقیدہ ہے کہ نبی و رسول اور فرشتوں کو خدا سمجھتے ہیں۔ کسی نبی و رسول نے ایسا کرنے کو کچھ نہیں کہا۔ انتہا کی حماقت یہ ہے کہ مسیح ؑ تو خود کو اللہ کا بندہ کہیں اور بندہ خدا ہونے پر نازاں

ہوں مگر گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ یا فرشتوں کو خدا سمجھ لیا۔ ارشاد ربانی ہے ''لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَ لَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا ۝

(ترجمہ): ''ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیحؑ کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی مقرب فرشتے اس کو (عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلد ہی جمع کرے گا سب کو اپنے ہاں۔''

مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہودی اور عیسائی عزیرؑ اور مسیحؑ کو بیٹا کہتے تھے نیز یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ شفاعت کریں گے۔ ان غلط عقائد کی تردید قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کی ہے۔ (ترجمہ) اور وہ کہتے ہیں بنالیا ہے رحمان نے بیٹا، سبحان اللہ کیونکر ہو سکتا ہے بلکہ وہ تو اس کے معزز بندے ہیں، نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اس کے حکم پر کاربند ہیں، اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گزر چکا ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لیے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں۔ (الانبیاء ۲۶، ۲۸ پارہ ۱۸)

مذکور ارشاد خداوندی علی الاعلان کہہ رہا ہے کہ خدا کے معزز بندے اس کی مخلوق ہیں خدا نہیں اور شفاعت بھی اس کی کریں گے جس کا اذن بارگاہ رب العزت سے ہوگا۔ الغرض کفر و شرک کی تمام صورتوں اور قسموں کی بیخ کنی کر دی اور فرمایا۔'' قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ لَمْ یَلِدْ۔ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ ترجمہ: اے نبی! فرما دیجئے وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ صمد ہے نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔'' اس بات پر بھی مستشرقین مطمئن نہیں بلکہ انہیں گلہ ہے کہ دو ٹوک فیصلہ آجاتا کہ بت ہیں ہی نہیں جس طرح قرآن مجید نے بتوں کی خدائی کا انکار کیا اور جس طرح فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنے سے منع فرما دیا، ایسے ہی اعلان ہوتا کہ بت ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں اسی طرح فرشتے بھی کچھ نہیں۔ شائد مستشرقین حفظ مراتب و مقام سے بے خبر ہیں اور ان کی منشاء کے مطابق ہونا غیر فطری اور ناممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے قدیر ہے، یہی وجہ ہے کہ بتوں، انبیاء و رسولوں کو اپنے مقام پر اور فرشتوں کو ان کے مقام پر رکھا ہے۔

(۶) اسلام نے شرک کو ختم کیا لیکن مشرکانہ نظریات اور رسوم کو جاری رکھا۔ (ضیاالنبی۔ ج۔ ۷۔ ۳۶۳)

مذکور الزام کی تائید میں مستشرقین یہ دلیل لاتے ہیں کہ حج کی رسمیں، کعبہ اور حجر اسود کے ادب و احترام کو قائم رکھا کیونکہ اسے مشرکین بھی بجالاتے تھے۔ ان مشرکانہ رسوم کو ختم کرنے کے لیے کوشش کی گئی مگر یہ رسوم اہل مکہ کے ذہنوں میں راسخ ہو چکی تھیں کہ ان کو ختم کرنا اور حرف مکرر کی طرح مٹا دینا اسلام کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھا نیز وہ لوگ ان رسومات کو چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہیں تھے۔

یا رلوگوں کا کہنا کہ کسی مصلحت کے سبب مشرکانہ رسومات کو قائم رکھا یہ بے بنیاد الزام ہے۔
آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر قسم اور ہر صورت کے شرک کا قلع قمع کیا خانہ کعبہ میں رکھے ۳۶۰ بتوں کا صفایا کیا مگر خانہ کعبہ کو قائم رکھا۔ اس کے تقدس کا بہت خیال رکھا۔ مصلحت اندیشی کا عنصر غالب آتا تو بتوں کو پاش پاش نہ کرتے۔ بات صرف سمجھنے کی یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کی ان رسموں کو برقرار رکھا جن سے شرک کی بو نہ آتی تھی۔ شرک سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے کی۔ خدائے واحد کی عبادت کے لیے خانہ خدا بنایا۔ زم زم کا چشمہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ کی یادگار ہیں، کو محفوظ رکھا۔ حج کے تمام مناسک حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوئے تھے اور ان مناسک حج کو ابراہیمؑ کی سنت سمجھ کر زندہ وجاوداں بنایا۔ البتہ ایسی رسمیں جو حج کا حصہ نہ تھیں مثلاً ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ختم کر دیا کیونکہ یہ ان کی خود ساختہ رسم تھی، اس کے برعکس خانہ خدا کا تقدس، طواف کعبہ، وقوف عرفات، منیٰ میں قربانی اور صفا و مروہ کے درمیان سعی مشرکانہ رسمیں نہیں تھیں۔ اسلام نے انہیں جاری وساری رکھا کیونکہ آپ ﷺ نے شرک کو مٹانا تھا اور ایسی مقدس چیزوں کو جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل بیت کی سنت تھیں، کو برقرار رکھنا تھا لہذا اوٹ کا الزام محض بے بنیاد ہے

اعتراض ۹۷ (جز و۔ا)

مستشرقین سمجھتے ہیں کہ شرک کے خاتمہ اور توحید کے لیے ضروری تھا کہ حضور صحیح یا غلط میں تمیز کیے بغیر بھی ہر اس چیز کو ختم کر دیتے جو مشرکین کے ہاں مروج تھی۔ (ضیا النبی ۷۔۳۸۶)

صحیح یا غلط کی تمیز کیے بغیر ختم کر دینے کی بات بے سود اور غیر مفید ہے کیونکہ اچھی چیز کو مٹانا حماقت اور نادانی ہے اس کے برعکس بری چیز کو حرف مکرر کی طرح مٹا دینا دانش مندی ہے۔ مشرکین مکہ بت پرست تھے۔ اس کے ساتھ وہ مہمان نواز، سخی، بہادر، وعدے کے پکے وغیرہ خوبیوں کے مالک تھے۔ ان خوبیوں کو نہ تو خامیاں کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں ختم کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ خوبیاں معاشرہ سے ناپید ہو سکتی ہیں۔ تو کیا اسلام مشرکانہ عقائد کے خاتمہ کے ساتھ ایسی خوبیوں کو بھی مٹا ڈالتا' جس سے انسانیت ان معراج نما اور اعلیٰ خوبیوں سے محروم ہو جاتی، اسے کوئی ذی فہم تسلیم نہیں کر سکتا۔

نیز مستشرقین نے اسلام اور شرک کے ساتھ تعلق ثابت کرنے کے لیے لکھا کہ جنوں اور شیطانوں اور فرشتوں کے وجود کے عقائد مشرکانہ تھے، اسلام نے ان کو قائم رکھا۔

(۲) مستشرقین نے اسلام اور شرک کے ساتھ تعلق ثابت کرنے کے لیے لکھا کہ جنوں اور شیطانوں اور فرشتوں کے وجود کے عقائد مشرکانہ تھے، اسلام نے ان کو قائم رکھا۔

جواب: یہ محض الزام تراشی میں سب کچھ بھول جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ باتیں جن سے اسلام پر

الزام لگاتے ہیں وہ باتیں ان کے مذاہب میں بھی موجود ہوتی ہیں اور وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ مذاہب توحیدی ہیں۔ مذکورہ عقیدہ یعنی جنوں، فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کا صرف کفار و مشرکین مکہ کا ہی نہیں بلکہ یہودی و عیسائی بھی اس عقیدہ کے قائل تھے۔ عہد نامہ قدیم وجدید میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ''واٹ'' فرشتوں کے وجود کے عقیدہ کو مشرکانہ بھی کہتا ہے اور پھر خود ہی اس کی تردید کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ عقیدہ یہود و نصاریٰ کے ہاں بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے the christions and jews beloved in the existance of a secondary and subordinat kind of supernatural being angels. یہودی و عیسائی ایک ثانوی قسم کی مافوق الفطرت مخلوق فرشتوں پر یقین رکھتے تھے۔ مستشرقین کے قلم کی تعصّبانہ تحریریں محض ریت کا گھروندا اور جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں اور ان کے وجود کا عقیدہ شرک نہیں اس طرح وہ تمام رسوم و عقائد جنہیں اسلام نے بدستور جاری رکھا، ان کا شرک سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے بلکہ وہ سب توحید کے مظاہر ہیں۔ انہیں اسلام میں قائم رکھا اور جن کو مٹا دیا وہ اس لیے کہ مشرکانہ اور باطل عقائد تھے لہذا ان کی جڑ کاٹ دینا ہی مناسب تھا۔ اسلام اللہ کا عطا کردہ دین ہے اس میں تضاد نہیں ہے اور نہ ہی آمیزش کا شائبہ ہے دوسرے ادیان پر غالب آنے والا دین مکمل و اکمل ہی ہوسکتا ہے۔ جس میں مشرکانہ اور باطل باتیں بھی ہوں اور سچی اور کھری باتیں بھی ہوں، ممکن نہیں انہیں تو اپنے مذہب کی تعلیمات کی خبر نہیں ہے (جیسا کہ فرشتوں، جنوں اور شیطانوں کے) وجود کا عقیدہ ان کے مذہب میں ہے اور اس کے قائل بھی ہیں مگر صاف مکر جاتے ہیں اور نہیں مانتے۔

اعتراض نمبر ۹۸

واٹ کہتا ہے محمد ﷺ نے کعبہ میں مورتیوں کی پوجا پر کبھی براہ راست تنقید نہیں کی۔ اس کے نزدیک قرآن نے کعبہ کے بتوں کی مذمت نہیں کی ہے اور نہ ہی تنقید کی ہے۔ اگر کعبہ کے بتوں کی مخالفت کرتے تو عرب کے لوگ مکہ آنا بند کر دیتے اور تجارت ٹھپ ہو جاتی۔

جواب: آپ ﷺ کی تنقید اور بتوں کی مخالفت سے قریش پریشان تھے۔ اسی لیے تو بار بار آپ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب کے ہاں آتے اور ہر بار کہتے کہ اپنے بھتیجے کو منع کریں کہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہیں۔ لیکن آپ ﷺ کے چچا نے آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑا حتیٰ کہ مقاطعہ قریش کی وجہ سے آپ شعب ابی طالب میں تین سال تک رہے دوسری طرف کفار نے مکمل طور پر بائیکاٹ کیے رکھا لیکن آپ نے بتوں کی مخالفت اور ایک خدا کی پرستش کرنے کی تبلیغ جاری رکھی اس سلسلے میں آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے پہاڑ جیسی مصیبتوں کا مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ آپؐ کو جان سے مار دینے کا منصوبہ بنایا (نعوذ

باللہ)۔ یہ محض مذہبی مخالفت کا نتیجہ تھا، کوئی تجارتی مفاد نہ تھا۔

۲۔ بتوں کی مخالفت جاری تھی اور لوگ مکہ میں آتے جاتے تھے۔ ہر سال لوگ حج کو آتے رہتے تھے اور حج کے پہلے اور بعد بھی یہ لوگ تجارتی غرض سے مکہ آتے تھے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیش نہ تھی۔ واٹ کو چاہیے تھا کہ بتوں کی مخالفت کے سبب جن لوگوں یا قبائل میں مکہ میں آنا جانا چھوڑ دیا تھا ان کا حوالہ دیتا۔ مگر مفروضوں پر بات کرنے والے کو حوالوں سے کیا لینا دینا۔ الطبقات الکبیر میں ابن عباس فرماتے ہیں ’’آپ ﷺ گھر میں کوئی ایسی چیز دیکھتے جس پر صلیب کا نشان ہوتا تو اسے توڑ دیتے تھے۔ (نقوش رسول نمبر۔ ۱۔ ۵۳۸) آپ ﷺ نے جہاں تبلیغ کے فرض کو پورا کیا اور دین اسلام کی تعلیمات کو عام کیا اسی طرح اپنے کردار سے عملی طور بھی اسلام کے خلاف ہر بات کا ردفرمایا جیسا کہ اوپر والی روایات سے ظاہر ہے۔

آپ ﷺ کا دین توحید الٰہی کا گل سرسبز ہے نیز اس دین کے ساتھ وحدت انسانیت‘ دین و دنیا کی یک جائی و یکسانیت‘ معاش و معاد کے امتزاج اور دنیا و آخرت کے باہمی ربط کا حامی و علمبردار ہے آپ ﷺ کا دین مسجد و بازار عبادت و معاملات‘ خدا پرستی اور دنیا داری کی دوئی کا یکسر قائل نہیں بلکہ آپ ﷺ کے دین وحدت نے انسانی زندگی کو ایک’ کل‘‘ کی صورت میں پیش کیا جس میں انسان کے جملہ انفرادی و اجتماعی دینی و دنیاوی‘ قومی و طبقاتی‘ نجی و عائلی‘ تجارتی و زراعتی‘ صنعتی و معاشی‘ اقتصادی سیاسی و معاشرتی‘ عمرانی احوال و معاملات کا انتہائی منصفانہ قابل عمل حل پیش کر دیا جس نے جملہ طبقات انسانی کے مفادات و ضروریات کی رعایت کی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پیغام اس کا اپنا نہیں تھا بلکہ اس کا ہر قول و فعل رضائے الٰہی کا پیغام رساں اور نمونہ ہوتا ہے اس کا مخلوق سے تعلق اپنی انسانی و ذاتی نسبت سے کم اور اپنی نبوت اور نسبت الٰہی سے زیادہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے ’’ترجمہ: محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیامبر اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے‘‘۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ سے تمہارا نسبی تعلق نہیں اس لیے ان کے کلام کو ان کی بشری حیثیت سے نہ پڑھو بلکہ ان کی رسالت کی حیثیت سے ان کے ہر قول و فعل اور پیام و کلام اور ان کے عطا کردہ ہر نظام کو مانو خواہ وہ عبادات سے متعلق ہو یا معاملات سے ہو‘ معاشرت سے ہو یا معاشیات سے‘ اقتصادیات سے ہو یا سیاسیات سے ہو‘ تدبیر مدن سے ہو یا عائلی قوانین سے یعنی زندگی کے جس طبقے سے یا جس مسئلے کے متعلق انہوں نے جو حل پیش فرما دیا اور طریقہ بتا دیا ان کا ذاتی نہیں بلکہ رسول اللہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علم و پیام اور حکم و منشاء کو انسانیت تک پہنچایا ہے یعنی ان کی بات اللہ تعالیٰ کی بات اور ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول شاہد ہے۔ مذکورہ بحث سے کئی باتوں کے بجز ایک یہ کہ آپ ﷺ آخری رسول و نبی ہیں۔

آپ ﷺ اپنا ذاتی پیغام نہیں سناتے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ دین توحید میں دوئی کا قطعاً عمل دخل نہیں ہے کہ ایک وقت میں اس کی تعلیم بتوں کو توڑنے اور ان کی عبادت کے باطل طریقہ کو نیست و نابود کردے اور دوسرے لمحے ان کی پوجا پاٹ کی تعلیم کی اجازت دے دے، یہ کبھی اور کسی صورت ممکن نہیں ہے کیونکہ اسلام میں کسی قسم کے تضاد کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ یہ دین انسانیت کے لیے قیامت تک کے لیے ہے یہی اسلامی کامیابی و کامرانی، فوز وفلاح اور نجات کا واحد ذریعہ ہے اور آخری نظام ہے جس میں کسی تبدیلی و تغیر کو دخل حاصل نہیں ہے مستشرقین اسلام کے ساتھ تعلق جوڑنے کے لیے ایسے ایسے الزامات تراشتے ہیں جن کا حقیقت سے دور تک کا واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

ام المومنین حضرت خدیجہؓ

اعتراض نمبر ۹۹

۱۔ اسپرنگر کہتا ہے کہ سیدہ خدیجہؓ سے آپ ﷺ کی شادی اور ان کی موجودگی میں کسی دوسری شادی سے احتراز میں قلبی قسم کے قلبی لگاؤ کو دخل نہ تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ آپ معاشی طور پر سیدہ خدیجہؓ کے دست نگر تھے (محمد رسول اللہ اکرم طاہر۔۲۹۴)۔

۲۔ اسپرنگر (sprenger) کہتا ہے کہ جناب پیغمبر ﷺ سیدہ خدیجہؓ سے اس لیے وفادار رہے کہ وہ ان کی متوسلہ تھیں۔

جواب: اس باب میں حضرت خدیجہؓ سے متعلق گفت گو ہوئی تھی۔ ان پر بت پرستی کا الزام لگایا گیا کیوں کہ مستشرقین آپ ﷺ کو اور خدیجہؓ کو بت پرست سمجھتے تھے۔ اب ان کے سر دیگر کئی قسم کے الزام لگائے جن کا جائزہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ (پیغمبر اسلام۔۸۰) کہتے ہیں اگر بولنے والی کے لیے کوئی رعایت و گنجائش رکھیں اور موقع محل کو بھی مدنظر رکھیں پھر بھی یہ باتیں ہمیں واضح طور پر بتاتی ہیں کہ پیغمبر اسلام اپنی زوجہ کی دولت کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے بلکہ خاندان کا خرچہ اٹھانے کے لیے کافی کچھ آپ ﷺ کماتے تھے۔ آپ ﷺ کی اپنی تجارت ذریعہ معاش تھا لیکن یقینی طور پر یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زوجہ کے کاروبار کی دیکھ بھال بھی جاری رکھی ہو، کیونکہ مکہ والوں کے رواج کے مطابق بیوی کی جائداد اس کے شوہر کو نہیں ملتی تھی۔ بلکہ شادی کے بعد بھی مکمل طور پر بیوی کے پاس ہی رہتی تھی۔

دوم: حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کے تجارتی سفر سے واپسی پر اپنی سہیلی نفیسہ کو اس خدمت پر مامور کیا کہ حضور ﷺ سے شادی کے بارے میں دریافت کرے۔ چنانچہ نفیسہ گئی بات چیت ہوئی واپس آکر سارا ماجرا خدیجہؓ سے کہہ دیا پھر انہوں نے حضور کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، آپ ﷺ

تشریف لے گئے۔ بات چیت ہوئی حتیٰ کہ طاہرہ کو یقین ہو چلا کہ آپ اس کی درخواست کو پذیرائی بخشیں گے تو خدیجہؓ کہنے لگیں اے میرے چچا زاد! میں اس لیے تم میں رغبت رکھتی ہوں کہ رشتہ میں میرے تم قریبی ہو، اپنی قوم میں تمہاری بلند شان ہے۔ امانت، حسن خلق، صدق مقال آپ کی خصوصی صفات ہیں ۔ جب انہوں نے ادب واحترام کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ حضور ﷺ نے اسے قبول فرمایا یہ منگنی تھی نکاح نہ تھا۔ (ضیا النبی ۔۲۔۱۳۵)

قریبی رشتہ داری، قوم میں بلند شان اور دیگر اعلیٰ صفات کی بناء پر منگنی کے تمام مراحل طے پا گئے۔ کیا یہ رضامندی متوسلہ کے سبب تھی؟ کیا خدیجہؓ نے آپ ﷺ کا خرچ اٹھانے کی ذمہ داری قبول کی تھی؟ خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی اعلیٰ صفات اور قریبی رشتہ داری کو بیان کر کے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا اور نہ کہ آپ کو یقین دلایا تھا کہ میں تمہاری متوسلہ ہوں۔

باسورتھ سمتھ (basworth smith) نے سپرنگر کے مذکور الزام کی تردید ان الفاظ میں کی ہے جس کا ترجمہ ہے ''سپرنگر ڈھٹائی کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہے کہ خدیجہؓ کی وفات تک آنحضرت ﷺ کا اظہار خلوص وفا ان سے رغبت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس لیے تھا کہ وہ ان کا مالی سہارا تھی۔ اگر ایسا تھا پھر خدیجہؓ کی وفات کے بعد پیغمبر ﷺ کی دوسری شادی میں اتنا وقفہ کیوں رہا؟ اور پھر کیوں ان کی وفات کے ایک لمبے عرصہ بعد حضرت ام المومنین عائشہؓ نے اپنی نوعمری اور حسن کا موازنہ سیدہ خدیجہؓ کی پیرانہ سالی اور جسمانی نقاہت سے کیا تو آپ ﷺ نے کیوں ان کے متعلق امتنان تشکر کا اظہار کیا۔ (حوالہ بالا)

جان ڈیون پورٹ کہتا ہے ''پھر حضرت محمد ﷺ کے حضرت خدیجہؓ کے سانحہ ارتحال کے بعد لمبے عرصہ تک شادی نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ مزید برآں ایسا کیوں ہے کہ سالہا سال بعد آپ ﷺ نے خدیجہؓ کے ساتھ گزارے یادگار لمحات کا ذکر اس وقت بھی بڑی اپنائیت سے کیا جب حضرت عائشہؓ نے اپنی جوانی وحسن کا موازنہ ان کی بڑی عمر سے کیا۔''

سیدہ خدیجہؓ کی تعریف سے کوئی روشن خیال یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ان کی زندگی میں آپ ﷺ تعریف کرتے رہے کیونکہ وہ مالی سہارا تھیں تو وہ اس بارے میں کیا کہے گا کہ بعد از انتقال بھی آنحضرت ﷺ کے اس رویہ میں کمی نہیں آئی۔ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں ''رسول اللہ ﷺ سیدہ خدیجہؓ کا جب بھی ذکر فرماتے تو ان کی بہت تعریف کرتے۔ وہ فرماتی ہیں کہ مجھے ایک روز رشک آ گیا، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ اکثر ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو وفات پا چکی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے اچھی بیویاں عطا فرما دی ہیں، آپ نے فرمایا عائشہؓ اللہ نے مجھے اس سے اچھی بیویاں نہیں دیں جب لوگ میرا انکار کر رہے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لائیں، جب لوگ تکذیب کر رہے تھے تو انہوں نے میری

تصدیق کی، جب لوگ مجھے مال سے محروم کر رہے تھے انہوں نے کھل کر میری مدد کی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے اولاد دی، جب کہ اور عورتوں سے میرے اولاد نہیں ہوئی۔(امہات المومنین۔۴۳)

اہم نکتہ: شائد کہ کوئی مذکورہ جملہ ''انہوں نے میری کھل کر مدد کی، سے یہ مطلب اخذ کر لے کہ پھر وہ متوسلہ ہوئیں۔ اس بارے میں عرض ہے کہ سیدہ خدیجہؓ کا تجارتی کاروبار بہت وسیع تھا۔ اہل مکہ کا تجارتی قافلہ دوسرے ملکوں میں جاتا تو آپ کا تجارتی سامان بھی ساتھ ہوتا۔ وہ سامان تجارت جتنا اہل مکہ کے قافلے کا ہوتا اتنا تنہا سیدہ خدیجہؓ کا ہوتا تھا۔ اتنے زیادہ سامان تجارت کا منافع بھی زیادہ ہوگا اور منافع میں شریک تاجر کو منافع بھی لازماً کافی ملتا ہوگا گویا آپ کا تجارتی سامان لے جانا ایک طرح سے مالی امداد ہوسکتا ہے جبکہ دوسری طرف آپ کی ایمان داری، وعدہ ایفائی، اور صداقت وامانت کے سبب منافع دوگنا سے بھی زیادہ ملا یعنی آپ کے دم قدم کی برکت سے خدیجہؓ کے سرمایہ میں بہت اضافہ ہوا یہ ایک طرح سے خدیجہؓ کی مالی امداد کا بدلہ تھا کیونکہ اس سے قبل کسی تاجر نے اتنا نہیں کمایا اور نہ خدیجہؓ کو لاکر دیا اس کی تائید میں مزید وضاحت آپ کے فرمان سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ پر جس نے بھی احسان کیا اس کا بدلہ چکا دیا سوائے صدیق اکبرؓ کے، مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکر کے مال نے دیا۔(ماہنامہ انوار لاثانی اپریل۔۶۲)

۲۔ وہ عورتیں جو خدیجہؓ کی سخاوت سے فیض یاب ہوتی رہی تھیں آپ ﷺ نے ان کے ساتھ اسی قسم کا رویہ اپنائے رکھا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ عہد کا پورا کرنا بھی ایمان ہے۔ آپ ﷺ کی محبتیں اور وفاداریاں اس لیے بھی تھیں کہ آپ وفاداری کو جزو ایمان ٹھہراتے تھے یعنی قدیم شناسائی کے حقوق کے رعایت کرنا بھی ایمان کی ایک بات ہے۔(ترجمان السنہ۔۲۔۲۰۴)

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں لیکن آقا کریم ﷺ خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کا ذکر فرماتے تھے۔ ان کی سہیلیوں سے سلسلہ ملاقات قائم رکھا، ان کی دلجوئی کی ان کی باتیں سنیں ان کے ہاں تحفے تحائف بھیجے، یہ سب کچھ خدیجہؓ کی وفات کے بعد ہوتا رہا، کیا اسے بھی خدیجہ کے متوسلہ ہونے سے جوڑیں گے؟ اہل دل جانتے ہیں کہ سب رویے اور طرز عمل محبت کے غماز ہیں۔ حقیقی محبت بوجہ متوسلہ نہیں ہوتی بلکہ ہر دو فریق کے رضا و رغبت اور پیار و محبت کی معجز نمائی ہوتی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک بڑھیا حضور ﷺ کی خدمت میں آئی آپ نے فرمایا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا ''جثامہ المزنیہ'' آپ نے فرمایا نہیں بلکہ حسانۃ المزنیہ ہو۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی خیریت پوچھی اس نے جواب دیا یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں خیریت سے ہوں۔ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ سے پوچھا! یا رسول اللہ یہ کون عورت ہے؟ ایک اور روایت میں ہے سیدہ عائشہؓ نے پوچھایا

رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں جو کچھ آپ اس بڑھیا سے کر رہے ہیں یہ اور کسی دوسرے کے لیے نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے عائشہ! یہ خدیجہؓ کی زندگی میں ہمارے پاس آیا کرتی تھی اور عہد کو پورا کرنا بھی ایمان میں سے ہے۔ خدیجہؓ کی زندگی میں بڑھیا کا آنا خوشگوار تعلق اور محبت کا آئینہ دار ہے اب ان کی وفات کے بعد گزرے دنوں کا سا رویہ اور سلوک روا نہ رکھتے تو کوئی بھی کہہ سکتا تھا بالخصوص پرانے ساتھی تو کہہ دیتے کہ آپ بدل گئے ہیں (نعوذ باللہ) اپنی زوجہؓ کی وفات کے بعد آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں اور خیر و عافیت و حال احوال نہیں پوچھتے تو یہ امر معنی خیز اور تعجب خیز تھا لیکن آپ ﷺ نے اپنی رفیقۂ حیات کے بعد بھی حسن سلوک کا وہی رویہ برقرار رکھا جو آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کے وقت رویہ رکھا کرتے تھے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے پاس جب بھی کوئی شے لائی جاتی تو آپ ﷺ فرماتے یہ خدیجہؓ کی فلاں سہیلی کے گھر لے جاؤ۔ ایک اور روایت میں ہے، اس کو فلاں کے گھر بھیج دو کیونکہ وہ خدیجہؓ سے محبت کرتی تھی۔ ایمائل ڈرمنگھم (emile dermenghm) کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خوشگوار ازدواجی زندگی پارسائی کا نمونہ تھی، سیدہ خدیجہؓ ایک مثالی بیوی تھی اور جناب محمد ﷺ بہترین شوہر تھے۔ پندرہ سال بڑی عمر کی واحد بیوی کے ساتھ انتہائی وفادار رہے۔ اسی مستشرق کی بات مان لو جو کہہ رہا ہے کہ آپ ﷺ بہترین شوہر اور خدیجہؓ مثالی بیوی تھی اور ان کی زندگی پارسائی کا نمونہ تھی۔ پارسائی میں متوسلہ ہونے کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ متوسلہ ہونے میں کوئی نہ کوئی غرض چھپی ہوتی ہے۔ لیکن پارسا لوگ اغراض سے خالی ہوتے ہیں۔

ولیم ڈیورانٹ (William Durant) نے سپرنگر کے نظریہ متوسلہ کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آپ نے پچیس سال کی عمر میں متعدد بچوں کی چالیس سالہ خاتون سے شادی کی اور اس خاتون کی وفات تک رسول اللہ ﷺ ان کے رفیق حیات رہے۔ پچیس سال تک سیدہ خدیجہؓ آپ ﷺ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں واحد بیوی کے طور پر منسلک رہیں جو ایک متمول مسلمان کے لیے ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے لیکن یہ ایک باہمی قدرتی لگاؤ کا نتیجہ تھا۔ ولیم ڈیورانٹ نے گویا یہ کہا کہ متوسلہ ہونے کے سبب وفادار نہیں رہے بلکہ ان میں باہمی قدرتی لگاؤ تھا۔

زندگی میں پیار اور محبت مالی منفعت کے لیے ہوسکتا ہے مگر بعد از وفات کس منفعت اور مفاد کی خاطر تھا کہ خدیجہؓ کی سہیلیوں سے ملتے، ان سے باتیں کرتے ان کے گھر تحفے بھیجتے وغیرہ وغیرہ؟

حضرت عائشہ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بڑھیا (خدیجہؓ) کے بدلہ میں آپ کو اس سے بہتر عورتیں عطا فرمائی ہیں۔۔ حضور ﷺ غصہ میں آئے، یہ حالت دیکھ کر حضرت عائشہؓ نے کہا میری جان گئی۔ میں

نے اپنے دل میں کہا کہ اب اگر حضور ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، میں پھر کبھی خدیجہؓ کا ذکر نہیں کروں گی۔ تھوڑی دیر بعد غصہ ٹھنڈا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا! عائشہ! تو نے یہ بات کیسے کہہ دی؟ بخدا جب لوگ میرا انکار کر رہے تھے وہ مجھ پر ایمان لائیں، جب لوگ مجھے چھوڑ رہے تھے انہوں نے مجھے پناہ دی، جب لوگ میری تکذیب کر رہے تھے اس نے میری تصدیق کی، جب لوگ مجھے مال سے محروم کر رہے تھے، اس نے میری مالی مدد کی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے اولاد دی۔ کیا یہ غصہ بعد از وفات بھی متوسلہ کے سبب تھا؟ محبت میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہتا ہے جبکہ مالی منفعت اور اقتصادی غرض پر شادیاں اکثر ناکام ہو جاتی ہیں بلکہ اگر شروع سے علم ہو جائے تو شادی ہو بھی نہیں پاتی۔ سیدہ خدیجہؓ کا قول اس کی قاطع دلیل ہے کہ میں نے عرب کے روساء کے نکاح کے پیغامات کو اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ ان کی نگاہ میرے مال پر تھی، تو کیا اتنی زیرک و ذہین خاتون کو بخوبی اس بات کا علم ہے کہ اقتصادی بنیاد پر شادی ناکام ہو سکتی ہے انہوں نے اس لیے مال کو شادی کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ تو پھر یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ آپ متوسلہ تھیں اس لیے جان دو عالم ﷺ وفادار رہے۔ یہ الزام ہر لحاظ سے باطل ہے۔ مستشرقین محبت کو خاک جانتے ہیں، ایک دو دن کی شادی پھر علیحدگی ان کی عادت ہے جبکہ اہل دل کے ہاں محبت کا نقطہ کمال یہ ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

میں تو ہو جاؤں اور تو میں ہو جائے میں جسم اور تو جاں ہو جائے۔۔۔ تاکہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہے میں اور ہوں، تو اور ہے۔

اعتراض نمبر ۱۰۰

آنحضرت ﷺ نے خدیجہؓ سے شادی کر لی اور اس طرح تمام مالی پریشانیوں سے نجات حاصل ہوئی۔ (سیرت النبی اعلان نبوت سے پہلے۔ ص ۲۹۴)

۲۔ جب آپ کی شادی ایک اہل ثروت خاتون سے ہوئی جس سے آپ کی مالی حالت میں بہتری ہوئی۔ (سو بڑے آدمی، ص ۲۵)

۳۔ تاریخی کتب سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ محمد ﷺ کو خدیجہؓ نے گویا اپنا تجارتی کارندہ مقرر کیا تھا۔

جواب: یہ بیان کرنا کہ شادی ایک اہل ثروت سے ہوئی جس سے آپ کی مالی حالت بہتر ہوئی یا مالی پریشانیوں سے نجات ملی، آپ ﷺ کی سیرت و کردار سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے یا مستشرقین کی پرانی روش کارفرما ہے کہ بے بنیاد اور باطل الزامات لگا کر مغالطے اور شکوک پیدا کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ خود تجارت کرتے تھے، آپ بہت اچھے شریک کار تھے، آپؐ نہ مخالفت کرتے

تھے اور نہ ہی کسی سے جھگڑا کرتے تھے۔آپ ﷺ کے آباؤاجداد کا پیشہ تجارت تھا آپ ﷺ نے بھی اسی پیشہ کو اختیار کیا۔صاحب سیرت اعلان نبوت سے پہلے بحوالہ محمد احسان الحق،مولانا شبلی کی عربی تالیف ’’بدرالاسلام‘‘ کے ترجمہ سیرت طیبہ از میمونہ سلطان شاہ بانو کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خدیجہؓ سے نکاح کے وقت مکہ کے ایک مشہور تاجر تھے،تجارتی امور میں آپ کی مہارت کے ساتھ ساتھ آپ کی امانت و دیانت کا ہر کوئی معترف تھا۔تجارت مال سے ہوتی ہے گویا آپ ﷺ کے پاس اتنی دولت تھی جس سے آپ تجارت کرتے تھے۔اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو شادی سے قبل مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔آپ کی مالی حالت بہتر تھی۔شادی سے قبل آپ کا شراکتی کاروبار قیس بن السائب بن ابی سائب سے تھا۔وہ کہتے ہیں ’’میں نے زمانہ جاہلیت میں محمد بن عبداللہ (ﷺ) سے بہتر ساجھی کوئی نہیں پایا اگر ہم آپ ﷺ کا مال تجارت لے کر جاتے تو واپسی پر آپ ہمارا استقبال کرتے اور خیر و عافیت پوچھ کر واپس چلے جاتے۔بعد میں جب ہم حساب دیتے تو اس پر قطعی تکرار یا بحث نہ فرماتے،ہم جو کہتے اس کو مان لیتے۔دوسرے شرکاء تجارت سے نفع و نقصان کی بات کرتے اور مال و منال پر اصرار کرتے،اس کے برعکس اگر آپ تجارتی سفر سے لوٹتے تو جب تک پائی پائی کا حساب بے باق نہ کر دیتے گھر کی راہ نہ لیتے،مال خرید کر لاتے تو ہمارے حوالے کر دیتے،اہل و عیال کی خیریت دریافت فرماتے تھے۔‘‘ قریش کے ایک بڑے سوداگر و تاجر ابوبکر صدیقؓ بھی آپ کے تجارتی کاروبار میں شریک تھے،وہ کبھی کبھی تجارتی سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے۔

اہم نکتہ: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ’’اور آپ کو فقیر پایا پھر غنی کر دیا‘‘ صاحب روح البیان کی تفسیر کے اردو ترجمہ میں ہے ’’بی بی خدیجہؓ کے مال سے یا اس سے کہ آپ ﷺ کو غنیمتیں حاصل ہوئیں،یہاں تک کہ آپ ﷺ ایک ایک شخص کو سو سو اونٹ عطا کر دیتے تھے: بعض نے ’’اغنیٰ‘‘ کا معنی قَنَّعَكَ وَاَغْنٰى قَلْبَكَ ’’ کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قناعت کی دولت بخشی اور آپ کے قلب کو غنی کر دیا۔آگے حدیث بیان کرتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے ’’غنا‘‘ کثرت اسباب کا نام نہیں بلکہ نفس کے مستغنی ہونے کا نام غنا ہے۔۔۔۔مزید امام قشیری کے حوالے سے لکھتے ہیں ’’انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دو قسم کا غنا بخشا ہے۔(۱) اموال و اسباب میں کثرت سے نوازا،یہی عوام ہیں اور غنا مجازی یہی ہے۔(۲) انہیں تصفیہ احوال سے نوازا،یہی خواص (انبیاء و اولیاء) اور غنا حقیقی یہی ہے،اس لیے کہ مخلوق کا اپنے احوال کے لیے تصفیہ کے لیے ایسے حضرات کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں بہ نسبت اموال کی محتاجی کے۔حدیث میں ہے کہ نفس کے مستغنی ہونے کا نام غنا ہے،یہی اصح ہے اور قشیری کے قول سے بھی حقیقی غنا یہی ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ آدمی فلاح پا گیا‘

جس نے اسلام قبول کیا اور اسے ضرورت کے مطابق رزق دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو عطا فرمایا اس پر اسے قناعت عطا فرمائی (مسلم شریف۔ کتاب الزکوۃ ۔۳۔۷۰)'' قرآن پاک کی آیت کی تفسیر اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو نفس میں غنا حاصل ہوئی۔۔ جبکہ آپ ﷺ مال و دولت میں بھی امیر تھے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لہٰذا مائیکل ہارٹ یا دیگر مستشرقین اور کچھ اپنے روشن خیال مورخین کی یہ بات درست نہیں کہ ایک متمول خاتون سے شادی کرنے سے مالی حالت بہتر ہوئی اور مالی پریشانیوں سے نجات ملی۔ ڈاکٹر حمید اللہ (پیغمبر اسلام ۔۸۰) کہتے ہیں'' بلکہ اپنے خاندان کو چلانے کے لیے آپ ﷺ کافی کچھ کماتے تھے۔ آپ ﷺ کی اپنی تجارت ذریعہ معاش تھا لیکن یقینی طور پر یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زوجہ کے کاروبار کی دیکھ بھال جاری رکھی ہوگی کیونکہ مکہ والوں کے رواج کے مطابق بیوی کی جائداد اس کے شوہر کو نہیں ملتی تھی بلکہ شادی کے بعد بھی مکمل طور پر بیوی کے پاس رہتی تھی۔

اعتراض نمبر ۱۰۰ کا دوسرا جز

تاریخی کتب سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ محمد ﷺ کو خدیجہؓ نے گویا اپنا تجارتی کارندہ مقرر کیا تھا۔ (سیرت اعلان نبوت سے پہلے ۔۲۹۴) جواب: پیر محمد کرم شاہ بھیروی (ضیاالنبی ۔۱۲۷۔۲) لکھتے ہیں کہ آپ (خدیجہؓ) اپنے نمائندوں کو سامان تجارت دے کر روانہ کرتی تھیں جو آپ کی طرف سے کاروبار کرتے اس کی دو صورتیں تھیں۔ (۱) جب وہ ملازم ہوتے اور ان کی اجرت یا تنخواہ مقرر ہوتی جو انہیں دی جاتی اور نفع نقصان سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ (۲) یا نفع میں ان کا کوئی حصہ نصف، تہائی یا چہارم مقرر کر دیا جاتا، اگر نفع ہوتا تو وہ اپنا حصہ لے لیتے بصورت دیگر یعنی نقصان کی ذمہ داری خدیجہؓ پر عائد ہوتی، اس کو شریعت میں'' عقد مضاربہ'' کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ ایک خود مختار اور خوشحال تاجر تھے۔ آپ نے کسی تاجر کی ملازمت اختیار نہیں کی تھی''۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے کتاب کے تعارف میں لکھا'' ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کو اپنا ملازم یا تجارتی کارندہ مقرر کیا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے نکاح سے بہت پہلے آپ ﷺ ایک خود مختار اور خوشحال تاجر کے طور پر معروف ہو چکے تھے اور اس ذیل میں قیس بن السائب کی روایت استناد کا درجہ رکھتی ہے۔

اعتراض نمبر ۱۰۱

'' واٹ'' کہتا ہے'' تاہم ان (محمد ﷺ) کو احساس تھا کہ آپ ﷺ کی صلاحیتیں مکمل طور پر استعمال نہیں ہو رہی ہیں۔ آپ ﷺ اپنی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس وقت مکہ کے کسی بڑے سے بڑے کاروباری عمل کو کنٹرول میں لا سکتے تھے لیکن بڑے تاجروں نے آپ ﷺ کو کاروباری

مرکز سے دور رکھا۔ آپ ﷺ کی ذاتی بے اطمینانی نے آپ ﷺ کو مکی زندگی کے لیے بے اطمینانی کے پہلوؤں کا احساس دلایا۔ ان غیر معروف سالوں میں آپ ﷺ نے بارہا ان معاملات پر غور کیا ہوگا آخر کار جو جذبات باطن کی گہرائیوں میں پک رہے تھے وہ منظر عام پر آ گئے‘‘۔(ضیا النبی۔ ۷۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱)

جواب: مفروضے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقعہ نہیں ملا تھا یہ سراسر تاریخی حقیقت سے لاعلمی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ کسی مفروضے سے تاریخی حقائق جھٹلائے نہیں جا سکتے آپ ﷺ کامیاب تاجر تھے اور آپ ﷺ کو کاروباری صلاحتیں دکھانے کا بھرپور موقعہ ملا تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی صلاحیتوں کے اظہار اور کامیاب تاجر کی بنیاد پر آپ ﷺ کا انتخاب کیا تھا اور اپنا مال تجارت ان کے حوالے کر دیا تھا اس تجارت میں اتنا نفع ہوا جتنا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا اور خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو طے شدہ معاوضہ کے بجز دوگنا معاوضہ دیا۔ اس سے بڑھ کر اور تجارتی صلاحیت کیا ہو سکتی ہے جس کا مطالبہ واٹ کر رہا ہے۔؟

دوم: آپ ﷺ کا انتخاب بارگاہ خداوندی میں بطور نبی و رسول کے تھا۔ آپ ﷺ کو نبوت کے فرائض پورا کرنے تھے اگر صرف آپ ﷺ کو تجارت ہی پر رہنا ہوتا تو آپ ﷺ کاروباری دنیا میں تمام تاجروں پر چھا جاتے جس کا ثبوت خدیجہؓ کی تجارت کا ہے جسے آپ ﷺ نے چار چاند لگا دیئے نیز قیس بن السائب کی روایت آپ ﷺ کی صلاحیتوں اور کامیابیوں پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ ﷺ کو چونکہ نبوت کے فریضہ کو انجام دینا تھا اور آپ ﷺ نے نبوت میں وہ عظمتیں حاصل کیں جو آپؐ سے قبل کسی نبی و رسول کے حصہ میں نہیں آئی تھیں بل کہ مخلوق خدا کو رشد و ہدایت کی وہ عزتیں اور عظمتیں بخشیں کہ قعر مذلت میں ڈوبی انسانیت ہدایت کی روشنی سے جگمگا اٹھی بے راہ روی، زیادتی و ناانصافی، ظلم و تشدد سے مکدر ہوئی فضا انصاف ہمدردی اور ہدایت سے صاف شفاف ہوگئی۔ تو پھر یہ کہنا بجا ہے کہ واٹ کا مفروضہ محض تعصب کا نتیجہ ہے۔

اعتراض نمبر ۱۰۲

ڈاکٹر لی اون نیمائے یونیورسل جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے کہ بلاشبہ یہ شادی (محمد ﷺ اور خدیجہؓ کی) مصلحتاً عمل میں آئی کیونکہ خدیجہؓ کو ایک مضبوط، انتھک اور تجربہ کار تاجر چاہیے تھا جو ان کے تجارتی مفادات اور کاروباری نظام کو سنبھال سکے۔ اس طرح یہ ساری صورت حال تقریباً ایک مثالی رفاقت، لگن، پیار اور باہمی احترام میں بدل گئی، جناب محمد ﷺ نے خدیجہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی اور ہمیشہ سیدہ خدیجہؓ کی دل کی گہرائیوں سے قدر کی، سیدہ خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہونے والے دو بیٹوں کے وصال کے بعد احساس ممنونیت میں اضافہ ہو گیا۔(امہات المومنین اور مستشرقین۔ ۸۴)

جواب: ابن اسحاق کہتے ہیں کہ خدیجہؓ نے فرمایا! '' اچھے اخلاق، دیانت وایمانداری اور سچائی کی بدولت پسند کرتی ہوں اور آپ ﷺ سے نکاح کرنا چاہتی ہوں'' ۔(۲) حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند میری گود میں آ گیا ہے۔ راہب سے تفسیر پوچھی گئی تو اس نے بتایا اے ملکہ قریش! عنقریب عرب میں ایک اولوالعزم نبی مبعوث ہونے والا ہے اور تم اس کی زوجیت میں جاؤ گی اور تمام جہان اس کے مذہب کے انوار سے ضوفشاں ہو جائے گا۔ الغرض یہ شادی مصلحتاً نہیں تھی بلکہ خدیجہؓ کے ایمان اور حرم نبوی میں داخل ہو کر ام المومنین کے اعزاز پانے کی خواہش کا نتیجہ تھی۔ نیز آپ ﷺ کے کمالات عالیہ اور اوصاف حمیدہ اور دوسری طرف حضرت خدیجہؓ بیسیوں نوکر چاکر اور خادماؤں کی سردار متمول خاتون پارسائی کا پیکر طاہرہ کے لقب سے مشہور اور بے داغ شخصیت کی مالکہ ہونے کی وجہ سے شادی قرار پائی تھی جس میں مفاد پرستی اور دنیاوی مال و دولت کے لالچ کی گرد بھی ان کے پاک و شفاف دامن کو آلودہ نہ کر سکی تھی۔ اس سلسلے میں مستشرقین کی آراء پیش کرتے ہیں تا کہ الزام کار داس کے اپنے ہمنواؤں کی زبانی ہو سکے۔

لارڈ ہیڈلے (Lord Headley) ایک مشہور نو مسلم برطانوی مصنف لکھتا ہے '' تمام مورخین متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک انتہائی آئیڈل شوہر تھے اور انہوں نے اپنی زوجہ سے بھرپور پیار کیا اور ان کی گھریلو قابل رشک زندگی پر کسی زاویہ سے انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، نبی ﷺ کے پچیس برس کی عمر میں خدیجہؓ سے عقد کے بعد ستائیس برسوں پر محیط ان کی ازدواجی زندگی فی الواقعی نہ صرف یہ کہ دو مخلص ہاتھوں کا مصافحہ اور دو دلوں کا پر مسرت اور پر خلوص ملاپ تھا بلکہ دست و دل کی اس ہم آہنگی میں ستائیس برسوں تک سر مو فرق نہ آیا۔'' (امہات المومنین اور مستشرقین۔۹۰)

مارگولیتھ: شدت پسند نقاد بھی خراج عقیدت پیش کیے بغیر نہ رہ سکا، کہتا ہے '' ام المومنین خدیجہؓ کے لیے جناب محمد ﷺ رطب لسان رہے۔ جناب پیغمبر ﷺ اپنی زندگی کے آخیر تک ان تمام عورتوں پر شفقت فرماتے رہے جو سیدہ خدیجہؓ کی سخاوت سے فیض یاب ہوتی رہیں۔ آنحضرت ﷺ کے مطابق وفاداری جز وایمان ہے۔''

تھامس کارلائل: حضرت خدیجہؓ کی شادی کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔'' ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جناب نبی ﷺ نے اپنی زوجہ محسنہ کے ساتھ انتہائی پیار و محبت سے بھرپور زندگی بسر کی اور ان کو دل و جان سے چاہا، ایسی ازدواجی زندگی کا یہ انداز ان کے خلاف جھوٹے دعویدار ہونے کے دعوے کی یکسر نفی کرتا ہے۔ مسلمہ طور پر انہوں نے مکمل طور پر بے عیب، کلی پر سکون اور سیدھے سادھے انداز میں زندگی گزاری حتیٰ کہ گرم جوشی کے سال گزر گئے۔ (حوالہ بالا۔۸۶)

Historians History Of The World نامی کتاب میں رقم ہے۔'' جناب محمد ﷺ اپنی زوجہ محترمہ سیدہ خدیجہؓ کی زندگی میں ان سے کلی طور پر وفادار رہے اوران کی وفات کے بعد بھی ان کے تقدس واحترام کے احساس میں کمی نہ آنے دی۔۔۔ جناب محمد ﷺ کا یہ قول ہمیشہ رہا کہ وہ تمام عورتوں کے لیے قابل تقلید اور مثالی خاتون تھیں۔(حوالہ بالا۔۸۹)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے اپنی ازواج میں سے کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور نہ ہی اپنی بیٹی کسی کے نکاح میں دی جب تک جبرائیل اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر میری جانب نہ آیا۔''(سیرت خدیجۃ الکبریٰ از محمد حسیب قادری۔۳۰)

غیر معتبر روایت: ڈاکٹر محمد مظہر الدین صدیقی بحوالہ تاریخ یعقوبی (نقوش رسول نمبر۔ج۔اول۔ص۔۵۷۰) لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ نزاع میں دوسری دنیا کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں کہ رسول اللہ تشریف لاتے ہیں اور تسلی وتشفی کے کلمات کے بعد حضرت خدیجہؓ سے فرماتے ہیں کہ وہ جنت میں اپنی سوکنوں سے آپ کا سلام کہہ دیں۔استفسار پر وضاحت کرتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے جنت میں میری شادی تم سے کی تھی اور تین شادیاں، مریم بنت عمران، آسیہ بنت حزام اور ام کلثوم (بہن حضرت موسیٰ) سے کر دی ڈاکٹر صاحب اس کے رد میں کہتے ہیں کہ یہ قصہ لوگوں کے زرخیز دماغ کا زائیدہ ہے''۔روایت مذکور میں ہے کہ آپ ﷺ تشریف لائے اور تسلی کے کلمات کے بعد۔۔۔کیا حضرت خدیجہؓ کو بحالت نزاع سوکنوں کی خبر دینا بھی تسلی کے کلمات ہیں۔قصہ گھڑنے والوں کو تسلی اور غیر تسلی بخش مواقع کے فرق کا بھی پتہ نہیں، پھر اس وقت ایسے کلمات کا کہنا بہت اذیت ناک ہے۔اور نہ ہی ایسے کلمات کہے گئے ہوں گے یہ محض ان کی اپنی من گھڑت کہانی ہے۔اس وقت تو اپنے مالک حقیقی کو یاد کرنے کا وقت ہوتا ہے اور بجز نیک خاتمہ کی دعا کے لبوں پر کچھ نہیں ہوتا۔

اہم نکتہ: حضرت خدیجہؓ نے اپنے آپ کو حضور ﷺ کے کیوں پیش کیا یعنی نکاح کا پیغام کیوں بھیجا۔اس کا جواب یہ ہے کہ ایک سبب تو وہ واقعات تھے جو ان کے غلام میسرہ نے انہیں بتائے تھے۔دوسرا سبب یہ کہ انہوں نے خود بھی کئی علامات دیکھ لی تھیں۔اس کے علاوہ منجم کی پیش گوئی بھی سن چکی تھیں۔پھر انہوں نے یہ ساری باتیں ورقہ بن نوفل سے کہیں تو ورقہ نے کہا! خدیجہؓ اگر یہ باتیں سچ ہیں تو پھر محمد عربی ﷺ اس امت کے نبی ہیں مجھے علم ہے کہ وہ اس وقت کے نبی ہوں گے، وہ نبی منتظر ہیں، یہ ان کا زمانہ ہے۔تیسرا سبب یہ ہے کہ خواتین کے میلے میں ایک یہودی نے آکر کہا ''اے قریش کی خواتین! عنقریب تم میں سے ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔تم میں سے جو ان کی زوجہ بننے کی استطاعت رکھتی ہو تو وہ ضرور ایسا کر گزرے''، قریش کی خواتین نے یہ سنا تو اس یہودی کو پتھر مارنے لگیں

مگر خدیجہؓ نے یہودی کی بات کو بگوش ہوش سنا، دیگر عورتوں کی طرح یہودی کو پتھر نہ مارے بلکہ اس کی بات دل میں بٹھالی۔(السیرت النبویہ دھلان۔۱۔۱۳۷)

چوتھا سبب یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے چاند میری آغوش میں آگیا ہے۔اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ تم آخری نبی کی بیوی بنوگی۔ان باتوں کے ہوتے ہوئے انہوں نے پیشگی قدم اٹھایا تاکہ پیغمبر ﷺ کی بیوی اور مومنوں کی ماں ہونے کا اعزاز حاصل کرسکیں۔خدیجہؓ کو اپنے تجارتی مفادات اور کاروباری نظام کو سنبھالنے کی غرض ہو بھی سہی جس کے لیے ایک مضبوط، انتھک اور تجربہ کار تاجر چاہیے تھا بلکہ مذکورہ باتیں ان کی اس اعزاز کو پانے کے لیے تھیں وہ اعزاز یہ تھا کہ پیغمبر ﷺ کی زوجہ اور مومنوں کی ماں بن جائیں۔

ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی ازدواجی زندگی اور مستشرقین کی آراء

تھامس کارلائل: ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زوجہ محسنہؓ کے ساتھ انتہائی امن وسکون اور محبت سے بھرپور زندگی بسر کی اور ان کو دل وجان سے چاہا۔ایسی ازدواجی زندگی کا یہ انداز ان کے خلاف جھوٹے دعویدار ہونے کے دعویٰ کی یکسر نفی کرتا ہے، مسلمہ طور پر انہوں نے بے عیب، کلی پرسکون اور سیدھے سادھے انداز میں زندگی گزاری، حتیٰ کہ عمر کی گرم جوشی کے سال بیت گئے۔(امہات المومنین اور مستشرقین۔۸۶)

سٹینلے لین پول: لکھتا ہے ''پچیس سالہ محمد ﷺ اپنے سے بڑی عمر والی بیوی کے ساتھ وفادار رہے اور جب پینسٹھ سال کی عمر کو خدیجہؓ پہنچ گئیں اور انہوں نے یقیناً اپنی شادی کی سلور جوبلی منائی ہوگی تو اس وقت بھی آپ ﷺ نے خدیجہؓ سے ویسا ہی پیار روا رکھا ہوگا، جیسے انہوں نے پہلی مرتبہ خدیجہؓ سے شادی کے وقت کیا تھا۔اس تمام عرصہ میں فضیحت ورسوائی کی ایک سانس تک نہ آئی ہوگی، اس طرح جناب محمد ﷺ کی زندگی باریک بینی کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔

ایمائل ڈرمنگھم: ''جناب محمد ﷺ کی خوشگوار ازدواجی زندگی پارسائی کا مثالی نمونہ تھی۔سیدہ خدیجہؓ ایک مثالی بیوی تھی اور جناب محمد ﷺ بہترین شوہر تھے، وہ اپنے سے پندرہ برس بڑی عمر کی واحد بیوی کے ساتھ انتہائی وفادار رہے۔''

ریوہوجز:(Rew Hughes)''جناب محمد ﷺ اور خدیجہؓ کا گھرانہ روشن اور پرمسرت تھا اور ان کی شادی بڑے نصیبوں والی تھی اور ثمرآور تھی۔''

ٹارانڈرائے:(Torandrae)''فی الواقعی سیدہ خدیجہؓ اس روایتی شہرت اور نیک نامی کی مستحق تھیں جو ان کے حصے میں آئی۔جناب محمد ﷺ کے اعلان بعثت نبوی کے وقت سیدہ خدیجہؓ ان کے ساتھ انتہائی وفادار رہیں اور شانہ بشانہ رہیں، اس کے باوجود خدیجہؓ کی وفات حسرت آیات کے بعد یکے

بعد دیگرے آنحضور ﷺ نے نو شادیاں کیں مگر خدیجہؓ کے ساتھ شادی آپ کے لیے انتہائی پرمسرت تھی کیونکہ آنحضرت ﷺ نے خدیجہؓ کی زندگی میں کسی دوسری عورت کو حرم نبوی میں داخل نہیں کیا۔''

رچرڈ لیوان سن :(Richaerd Lewin Son) ''جناب محمد ﷺ کی خدیجہؓ کے ساتھ شادی جو چھبیس سال پر یعنی ان کی وفات تک محیط رہی، انتہائی پرمسرت تھی اور یہ یک زوجگی کی بہترین مثال تھی، یہ ان دنوں کی بات ہے جب بحیرہ احمر کے اس پار جہاں نجاشی بادشاہ کی قلمرو میں مسحیت انتہائی مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔ لاریب جناب محمد ﷺ اور سیدہ خدیجہؓ جیسی بے عیب اور شاندار شادی کی مثال نہیں ملتی تھی۔ آپ ﷺ بدرجہ اتم سیدہ خدیجہؓ کے محبّ اور وفادار تھے''۔

مارگولیتھ (Mar Goliouih) ''ام المومنین سیدہ خدیجہؓ کے لیے جناب محمد ﷺ ہمیشہ رطب اللسان رہے، جناب پیغمبر ﷺ اپنی زندگی کے اخیر تک ان تمام عورتوں پر شفقت فرماتے رہے جو سیدہ خدیجہؓ کی سخاوت سے فیض یاب ہوتی رہیں۔ آنحضرت ﷺ کے مطابق وفاداری جز ایمان ہے۔''

ام المومنین حضرت سودہؓ

حضرت سودہؓ کے والد کا نام زمعہ اور والدہ کا نام شموس بنت قیس تھا۔ آپ کے نانا قیس نبی پاک ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم کی بیوی ام سلمٰی کے بھائی تھے۔ ان کا تعلق مدینہ کے قبیلہ بنونجار سے تھا۔ حضرت سودہؓ کی پہلی شادی چچازاد سکران بن عمرو (سقران) سے ہوئی۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد گھر کے انتظام کرنے میں تبدیلی آئی۔ نگہداشت کرنے والا بچیوں کے لیے نہیں تھا۔ دو چھوٹی بچیاں ام کلثوم اور حضرت فاطمہؓ تھیں۔ حضرت خولہؓ نے خود کو آنحضرت ﷺ کی خدمت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ انہوں نے ایک دن ادباً درخواست کی کہ آپ شادی کر لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا! کس سے؟ حضرت خولہؓ نے کہا ایک بیوہ سودہ بنت زمعہ اور ایک کنواری حضرت عائشہؓ بنت ابوبکر صدیقؓ ہے۔ آپ نے فرمایا ''دونوں کے لیے پیغام لے جاؤ''۔ بالآخر دونوں یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کے عقد میں آئیں۔

اعتراض نمبر ۱۰۳

حضرت سودہؓ کو بوڑھی ہونے کے سبب آپ ﷺ نے طلاق دے دی۔

جواب: عبدالدائم دائم (سید الوریٰ ۔۳۔۳۷۸۔۳۷۷) فرماتے ہیں ''بعض کتب میں مذکور ہے کہ جان دو عالم ﷺ نے ان کو طلاق کہلا بھیجی۔ حضرت سودہؓ کو حد سے زیادہ قلق ہوا اور وہ اس راہ پر بیٹھ گئیں جس سے آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جب آپ نے جان دو عالم ﷺ کو دیکھا تو عرض کی! میں آپ کو اس ذات کو واسطہ دیتی ہوں اور پوچھتی ہوں، جس نے آپ پر

کتاب اتاری اور اپنی مخلوق میں سے آپ کو برگزیدہ بنایا، آپ نے مجھے طلاق کیوں بھیجی؟ آپ نے مجھ میں کوئی ایسا عیب دیکھا ہے جس کی وجہ سے آپ ناراض ہو گئے ہیں۔'' نہیں! جان دو عالم ﷺ نے فرمایا: للہ آپ رجوع فرمالیں، میں بوڑھی ہوں مجھے مرد کی چنداں ضرورت نہیں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ میرا حشر آپ ﷺ کی ازواج میں ہو۔ آخر جان دو عالم ﷺ نے ان سے رجوع فرمالیا اس پر حضرت سودہؓ نے کہا کہ میں اپنی باری کا دن حضرت عائشہؓ کو دیتی ہوں۔ لیکن یہ بات جان دو عالم ﷺ کی شان کے شایاں نہیں اور آپ کی ذات اقدس سے بعید ہے کہ آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کے بعد ایک عمر رسیدہ سے شادی کرلیں جو گھر کی حفاظت ونگرانی کے لیے موزوں ہو اور ماں کی طرح نو عمر بچیوں کی دیکھ بھال کرے اور چند سال بعد جب گھر میں دوسری نو عمر بیویاں آجائیں تو اس کو صرف اس لیے طلاق دینے پر آمادہ ہو جائیں کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہیں۔ پھر جب وہ اپنی باری کا دن آپ ﷺ کی چہیتی بیوی کو ہبہ کر دیں تو اس بوڑھی عورت حضرت سودہؓ کو اپنی زوجیت میں رکھنے پر آمادہ ہو جائیں، حالانکہ حضرت سودہؓ سے پہلے جس وقت آپ ﷺ کا عالم شباب تھا، آپ نے ایک عورت حضرت خدیجہؓ کے ساتھ پچیس سال گزار دیئے اور اس دوران آپ ﷺ نے کسی عورت سے نکاح کرنے کا خیال تک نہیں فرمایا، اگر آپ ﷺ چاہتے تو آپ ﷺ کے لیے نوجوان باکرہ عورتوں کی کمی نہ تھی لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا تا آنکہ خدیجہؓ کا وصال ہو گیا۔ آپ ﷺ عمر بھر ان کو یاد فرماتے رہے حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ کو بھی ان پر رشک آتا تھا۔'' بوڑھی ہونے کے سبب آپ نے طلاق نہیں دی تھی بلکہ یہ از خود حضرت سودہؓ کا وہم وگمان تھا کہ کہیں آپ ﷺ انہیں طلاق نہ دے دیں۔

اعتراض نمبر ۱۰۴

آنحضرت ﷺ کا زیادہ میلان حضرت عائشہؓ کی طرف ہونے کے باعث انہیں اپنی باری ہبہ کر دی تاکہ ان کی محبوب بیوی کی یہ خدمت کر کے جان دو عالم کی مزید قربت ومحبت حاصل کر سکے۔

جواب: ترمذی اور طبرانی میں سیدنا ابن عباس سے روایت ہے کہ سیدہ سودہؓ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ ﷺ انہیں طلاق نہ دے دیں اس پر سودہؓ نے عرض کی کہ آپ مجھے طلاق نہ دیں بلکہ اپنے ہاں رکھیں، میں اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دیتی ہوں، چنانچہ انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی " فلاجناح علیھا ـــ والصلح خیر " (النساء ۱۲۸، پارہ ۵)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ سودہ بنت زمعہؓ جب بوڑھی ہو گئیں تو انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ انہیں اپنے آپ سے جدا نہ کر دیں، سیدہ سودہؓ نے عرض کی! یا رسول اللہ ﷺ! میری باری عائشہؓ کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس عرضداشت کو قبول فرمایا۔ سیدہ

عائشہ فرماتی ہیں کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

" و ان المراۃ خافت من بعلھا نشوزا اوعراضا فلا جناح علیھا ان یصلحا بینھما صلحا والصلح خیر " (ترجمہ) اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بے پرواہی کا ہو سو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کر لیں اور یہ صلح بہتر ہے)

اہم نکتہ : شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آنحضرت ﷺ نے سودہؓ سے حضرت عائشہؓ کو باری لے کر دینے کو کہا ہو، (نعوذ باللہ) یہ بالکل خیال باطل ہے اور مفسد ذہن کی اختراع ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت سودہؓ کو ازخود اندیشہ ہوا کہ آپ بوڑھی ہوگئی ہیں اور آنحضرت ﷺ کہیں طلاق نہ دے دیں۔ انہوں نے اس بناء پر اپنی مرضی سے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو ہبہ کر دی۔ نیز اس اصل واقعہ کے دو اہم سبب ہیں۔ اول "فربہی" جس کی تصدیق اس بیان سے ہوتی ہے کہ حجتہ الوداع کے موقعہ پر تیز نہ چل سکنے کی وجہ سے سودہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کی، یا رسول اللہ! میرے لیے بھیڑ میں چلنا بہت دشوار ہے اس لیے مجھے اجازت مرحمت فرما دیں کہ میں رات کو منیٰ چلی جاؤں"۔ آپ نے اجازت فرما دی اور سودہؓ رات کو ہی مزدلفہ سے منیٰ روانہ ہوگئیں۔ بخاری شریف کتاب المناسک صفحہ ۶۱۳ پر حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت سودہؓ نے مزدلفہ کی رات نبی ﷺ سے روانگی کی اجازت مانگی وہ بھاری بھرکم بدن کی تھیں تو آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔" حضرت عائشہؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ ہم لوگ مزدلفہ میں اترے تو حضرت سودہؓ نے نبی اکرم ﷺ سے لوگوں کے روانہ ہونے سے پہلے روانگی کی اجازت مانگی اور وہ سست رفتار تھیں تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی وہ لوگوں کے ہجوم سے پہلے ہی روانہ ہوگئیں اور ہم لوگ ٹھہرے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی پھر ہم لوگ آپ ﷺ کے ساتھ لوٹے اگر میں بھی رسول اللہ ﷺ سے اجازت مانگتی جیسا کہ حضرت سودہؓ نے اجازت مانگی تھی تو میرے لیے بہت سی خوشی کی بات ہوتی۔

دوم: ان کی قوت سماعت کمزور ہوگئی بالآخر بہری ہوگئیں۔ (ن۔۲۔۶۴۹) اندیشہ ان دو سبب سے تھا۔ فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کا لاحق ہونا بدیہی امر تھا۔ فرض کریں آپ ﷺ بلائیں اور وہ سن نہ پائیں اگرچہ یہ بہرے پن کے عارضہ کے سبب ہے نہ کہ جان بوجھ کر حکم عدولی ہے، اس کو بھی سوءادب سمجھتی ہیں اور ان اندیشوں اور خدشات کی بناء پر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے لیے متاہلانہ زندگی میں کوئی کشش نہیں، میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں یوم نشور کو آپ ﷺ کی زوجہ کی حیثیت سے اٹھائی جاؤں، چنانچہ رسول اللہ انہیں گھر لے آئے۔ (ن۔۲۔۶۴۹) حضرت سودہؓ کی التجا محض ان کے اپنے گمان سے تھی جس کی تصدیق حضرت عائشہؓ کے بیان سے ہوتی ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔ نیز حضرت سودہؓ کا اپنی باری عائشہؓ کو دے دینے میں آنحضرت ﷺ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ یہ کام حضرت سودہؓ نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔

اہم نکتہ: اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت سودہؓ نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو کیوں ہبہ کی اور کسی دوسری زوجہ کو ہبہ نہیں کی۔ (۱) حضرت سودہؓ نے یہ سارا کام اپنی مرضی سے کیا تھا۔ وہ اپنی باری کی مالک ہے، جسے چاہے اپنی باری تفویض کریں۔

(۲) ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی کسی ایک کا کسی دوسرے کے ساتھ زیادہ تعلق اور لگاؤ ہوسکتا ہے جبکہ تمام ازواج مطہرات بڑی محبت اور پیار کے ساتھ ایک ساتھ رہتی تھیں کبھی کشیدگی کی نوبت نہیں آئی نیز حضرت سودہؓ کا کسی سوکن کے ساتھ اختلاف نہیں تھا لیکن حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ کی قربت کی ایک وجہ یہ تھی کہ آگے پیچھے حرم نبوی میں داخل ہوئی تھیں اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ کی شادی میں حضرت سودہؓ نے پوری دلجمعی اور محبت سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ایک عرصہ تک دونوں ساتھ ساتھ رہیں جس سے بہ نسبت دوسری ازواج کے ان کی Understanding زیادہ تھی کسی قسم کا اختلاف کبھی آڑے نہ آیا۔ اور یہ پیار بھرے بتائے سالوں کا نتیجہ ہوسکتا ہے کہ سودہؓ نے اپنی باری عائشہؓ کو دے دی۔

اعتراض نمبر ۱۰۵

اگر کوئی یہ کہہ دے کہ سودہؓ کو دوبارہ حرم نبوی میں داخل کرنے کے لیے یہ شرط آپ ﷺ نے عائد کی، کہ وہ اپنی باری عائشہؓ کو دے دیں۔

۲۔ بعض نے الزام لگایا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سودہؓ کو طلاق کیوں دی؟

جواب: یہ بالکل غلط اور انصاف کے خلاف ہے کیونکہ آپ ﷺ سے بڑھ کر اس جہاں میں اور کون منصف ہوسکتا ہے۔ بیبیوں کے درمیان وہ انصاف برقرار رکھتے تھے کہ مجال ہے کسی کا لمحہ بھر کے لیے دل ذرا میلا ہو جائے۔ حجرے الگ الگ تھے۔ شب باشی کی تقسیم ایسی تھی کہ ہر بی بی کے ہاں دن مقرر تھا۔ سفر میں بھی قرعہ اندازی کے ذریعے ازواج مطہرات کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ازدواجی زندگی نہایت پرسکون بسر ہو رہی تھی۔ ہمیشہ گلشن نبوی کی فضا خوشگوار اور معطر رہتی تھی اور گلشن کا ہر پھول اپنی خوشبو پھیلا رہا تھا۔ ہر پھول کی بھینی بھینی خوشبو اس جہاں کو مہکا رہی تھی۔ جہاں تک سفارش کا تعلق ہے اس تاریخی واقعہ سے سارا زمانہ واقف ہے کہ حضرت اسامہؓ نے بنی مخزوم کی فاطمہ نامی عورت کی سفارش کی تھی جسے چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کا اعلان ہو چکا تھا۔ آپ نے اسامہؓ سے فرمایا ''اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی ہوتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا'' جبکہ کسی کی بے جا سفارش قابل قبول نہیں تو خود ایسی سفارش کیونکر کرسکتے ہیں۔؟

اہم نکتہ: اگر کوئی یہ کہہ دے کہ حضرت عائشہؓ نے سودہؓ سے باری کی ڈیل کر لی، جس سے آنحضرت خوش ہو گئے اور سودہؓ کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ (نعوذ باللہ)

جواب: یہ حضرت عائشہؓ کی شان میں بہت بڑی گستاخی ہے۔ان کے بارے میں ایسا گمان کرنا بعید از قیاس ہے۔حضرت عائشہؓ تو وہ ہیں جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا! ''اپنے دین کا نصف علم اس حمیرا سے سیکھو''۔(ضیا النبی۔۷۔۴۹۷)

حضرت عائشہؓ وہ ہیں جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ''مردوں میں بہت سے لوگ رتبہ کمال تک پہنچے ہیں مگر عورتوں میں یہ مقام صرف مریم بنت عمران، آسیہ زوجہ فرعون، خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد ﷺ نے حاصل کیا اور عائشہؓ کو عورتوں پر وہی فضلیت ہے جو ثرید کو تمام کھانوں پر حاصل ہے''(حوالہ بالا)

ایسا مرتبہ و مقام کی خاتون جس کی تعریف محبوب کبریا ﷺ فرمائیں اور تربیت نبوی سے فیض یاب ہوں اور اپنے عہد کی معلّمہ، محدثہ، مفسرہ، اور فقیہہ ہوں تو وہ اس قسم کی ڈیل کا ارتکاب کرسکتی ہیں؟ ہرگز ہرگز نہیں۔آپ ہر قسم کے لالچ اور ناانصافی سے پاک ہیں۔یہی نہیں بلکہ دوسری طرف آپ ﷺ کی شان میں بے ادبی کی گئی ہے جبکہ آپ ﷺ سے ایسی ڈیل پر خوش ہونے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں اللہ سوءادبی سے بچائے!

اعتراض نمبر ۱۰۵ کا دوسرا جز

بعض نے الزام دھرا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سودہؓ کو طلاق کیوں دی۔؟

جواب: حضرت سودہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے لیے متاہلانہ زندگی میں کوئی کشش نہیں ہے۔میری خواہش ہے کہ میں یوم نشور آپ کی زوجہ کی حیثیت سے اٹھائی جاؤں، چنانچہ آپ انہیں اپنے گھر لائے۔اگر طلاق رجعی تسلیم کر بھی لیں تو یہ بھی آپ ﷺ کی شان کریمی اور رحمۃ اللعالمینی کا تقاضا ہے کہ آپ نے امت کے لیے نمونہ چھوڑا، جس کی کئی حکمتیں اور اسرار ہیں۔رجوع کر کے نئے سرے سے اپنے کاشانہ کو جنت نظیر بنانے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے۔آئندہ کے پچھتاوے اور اولاد کے بٹنے اور بیوی کے بے سہارا ہونے کی سی بلاؤں سے نجات ملتی ہے۔آپ ﷺ نے حضرت حفصہ ؓ کو بھی طلاق دی تھی اور پھر رجوع فرمالیا تھا۔

صاحب سید الوریٰ (ج۔سوم۔ص۔۳۸) فرماتے ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو طلاق دینے کا اختیار دیا ہے لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے کہ ناگزیر وجوہات کے بغیر بیوی کو طلاق دے دی جائے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ربانی ہے ''تمام حلال چیزوں میں سے جو چیز اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، وہ طلاق ہے'' اس طرح جب حضرت زید بن حارثہؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی اور اس نے آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور اللہ سے ڈر!'' پھر یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ جان دو عالم ﷺ جن کے نزدیک

طلاق ایک ناپسندیدہ فعل ہے وہ خود اپنی زوجہ کو محض بڑھاپے کی وجہ سے طلاق دے دیں یا دی ہوگی یا طلاق دینے کا خیال فرمایا ہوگا!!

صاحب اصح السیر لکھتے ہیں کہ اس باب میں سب سے بہتر روایت وہ ہے جو ترمذی میں ابن عباسؓ سے بطریق حسن روایت کیا ہے اور ابوداؤد حاکم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت سودہؓ کو خوف ہوا کہ حضور ﷺ طلاق دے دیں گے تو انہوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ طلاق نہ دیں، مجھ کو اپنی زوجیت میں رہنے دیں میں اپنی باری عائشہؓ کو دیتی ہوں۔ دمیاطی وغیرہ نے اس کی صحیح کی ہے کہ حضور ﷺ نے طلاق دی ہی نہیں' (اصح السیر ۔ ۵۶۷)

اعتراض نمبر ۱۰۶

ام المومنین حضرت سودہؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے تعلقات خادم ومخدوم جیسے تھے۔
(علوم اسلامیہ اور مستشرقین ۔ ص ۔ ۹۹)

جواب: حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد وقتی طور پر گھر کا نظام بکھر سا گیا تھا بچیوں کی پرورش، ان کی دیکھ بھال، اور ان کی شادی کا خیال اور تبلیغی سرگرمیوں کا بوجھ سر پر آن پڑا۔ گھر کے انتظام کو چلانے کے لیے خاتون خانہ کی ضرورت تھی۔ ان حالات وواقعات کے پیش نظر آپ ﷺ نے حضرت سودہؓ سے نکاح فرمایا۔ انہوں نے گھر کے انتظام کو ایسا سنبھالا کہ آنحضرت ﷺ کو فکر نہ رہی اگرچہ اپنی محبوب بیوی کے انتقال کا صدمہ رہا۔ گھر کے جملہ کاموں کو باحسن طریق سے انجام دیا وہ گھر کی مالکہ تھی اور انہوں نے اپنے گھر کے کام کاج کو ہر طرح سے بنایا اور سنوارا۔ ایسی گھر کی مالکہ کو خادمہ نہیں کہا جا سکتا؟ کیونکہ سلیقہ شعار اور سگھڑ بیوی ہی گھر کے تمام کام کر سکتی ہے۔ انہوں نے اس کام کی کبھی اجرت طلب نہیں کی اور نہ ہی انہیں اس خدمت کا بارگاہ نبوی سے کوئی معاوضہ ملتا ہے کیونکہ گھر کے کاموں اور دیگر فرائض کی انجام دہی زوجہ کے فرائض میں شامل ہوتی ہے ۔ اسے خادم ومخدوم کے تعلقات سمجھنا حماقت اور بے عقلی ہے، بلکہ یہ مستشرقین کے اپنے معاشرہ کی بات ہے جہاں بیوی کو گھر کی ملازمہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ آج شادی کی کل چھوڑ دی ایسا حال واقعی خادمہ کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے اپنی خامی، کوتاہی دوسروں کے سر تھوپ دینا ان کا محبوب مشغلہ اور تعصب کا نتیجہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت سودہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی، یا رسول اللہ! مجھے آپ طلاق نہ دیں۔ آپ ﷺ نے اس کی اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔ حضرت سودہؓ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بھیڑ میں چلنے سے دشواری ہوگی، میں رات کو منیٰ چلی جاؤں، آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ ناراض ہونے کی باتیں ہیں یا خادم ومخدوم کے تعلقات کی باتیں ہیں؟ جبکہ آپ ﷺ ہر موقعہ پر ان کی دلجوئی فرماتے ہیں یہ کرم فرمائیاں ان الزامات کی گرد کو پاس تک پھٹکنے نہیں دیتیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ دعویٰ بغیر دلیل کے بے بنیاد ہوتا ہے اور اس دعوی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ مستشرقین کے ذمہ یہ قرض ہے کہ وہ کوئی ادنیٰ سا واقعہ بطور مثال پیش کریں جس سے خادم و مخدوم کے تعلقات واضح ہوتے ہوں۔ مگر وہ ایسا واقعہ پیش کرنے کی مجال نہیں رکھتے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ کوئی بھی عارضہ خادمہ کو لاحق ہو جائے اور کام کاج کرنے سے عاجز و قاصر ہو تو ایسی صورت میں خادمہ کی چھٹی ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری خادمہ کا انتظام کر لیا جاتا ہے۔ ادھر فربہی اور بہرے پن کے عوارض ہیں لیکن ان عوارض کے باوجود حضرت سودہؓ مدت العمر حرم نبوی میں رہیں اور نبی مکرم ﷺ سے عطا کردہ حجرہ میں مقیم رہیں اور ام المومنینؓ کے اعلیٰ اعزاز کی سرفرازی ان کے ماتھے کا جھومر رہی اور یہی ان کا مقصد حیات اور حاصل زندگی تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ۔

حسابِ عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

اہم نکتہ: بعض یہ کہتے ہیں کہ افک کے واقعہ کی حیلہ سازی میں حضرت سودہؓ سے وہی کہلواتی ہیں جو عائشہؓ چاہتی ہیں کیونکہ حضرت سودہؓ کہتی ہیں کہ میں نے تمھارے ڈر سے وہی کچھ کہا جو تم نے مجھے بتایا تھا۔

جواب: مذکور الزام نہایت سوء ادبی ہے کیونکہ کیا حضرت سودہؓ زوجہ رسول اللہ ﷺ نہیں تھی؟ کیا وہ ام المومنین کے اعزاز سے با مشرف نہیں تھیں؟ کیا وہ کنیز یا خادمہ تھیں یا چھوٹی بچی جو ڈر کے مارے حضرت عائشہؓ کی بات ماننے کے لیے مجبور تھی یہ سوالات اس من گھڑت الزام کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں نیز ثابت ہو رہا ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر یہ سارا قصہ گھڑ لیا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

سر ولیم میور کہتا ہے ”اس خاتون کے کردار کے بارے میں اس قدر جانتے ہیں کہ جب وہ اپنے سابقہ خاوند سکران (سقران) کے ساتھ ہجرت کر گئیں تو اس وقت بھی وہ غیر معمولی طور پر اسلام کے نصب العین اور مقاصد کی پرستار اور گرویدہ تھیں۔ سیدہ خدیجہؓ کے سانحہ ارتحال کے بعد سیدہ سودہؓ آپ ﷺ کے عقد میں تین چار برس واحد زوجہ کی حیثیت سے آباد رہیں۔

مستشرقین کی آراء

منٹگمری واٹ کہتا ہے ”آنحضرت ﷺ کی سیدہ سودہؓ سے شادی کا اصل مقصد مسلمانوں کی بے سہارا بیواؤں کو تحفظ و نگاہ داشت دینا ہی ہو سکتا ہے جیسا کہ پیغمبر ﷺ نے بعد میں حضرت زینب بنت خزیمہؓ سے بھی اسی وجہ سے شادی کی“۔ (امہات المومنین اور مستشرقین۔ ۱۴۸)

کیرن آرم سٹرانگ کہتی ہیں ”یہ ایک انتہائی جرات مندی اور دلیری کا کام تھا جس کے لیے مضبوط قوت ارادی درکار تھی۔ امت کی غیر محفوظ خواتین کے متعلق فکر مند ہونے اور ان کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے

خود پیغمبر اسلام ﷺ نے مثال قائم کی۔ غزوہ احد کے شہید جہم بن عمرو کی بیوہ سیدہ زینب سے غزوہ احد کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے ان سے چوتھی شادی کی اور انہیں گھر فراہم کیا، وہ بدو قبیلہ بنو ہوازن کے سردار کی بیٹی تھیں، اس شادی سے اس قبیلہ کے ساتھ سیاسی اتحاد بھی مضبوط ہو گیا۔"

اہم نکتہ: عبداللہ بن جحش کی شہادت کے بعد یعنی تین ہجری میں ام المساکین سے حضور ﷺ نے خود نکاح کیا لیکن صاحب اصح السیر کہتے ہیں کہ محل تامل یہ ہے کہ عدت وفات چار مہینہ دس دن ہے لیکن غزوہ احد شوال کے مہینہ میں ہوا، اس لیے سن تین ہجری میں غزوہ احد کے بعد عدت پوری نہیں ہو سکتی تو آپ نے تین ہجری میں عقد کیسے کیا؟ (اصح السیر جلد اول، ص ۵۷۶) علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ شائد حمل ہو اور وضع حمل سے عدت پوری ہو گئی ہو۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ

اعتراض نمبر ۱۰۷

حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں کتب واحادیث میں چند ایسی روایات ہیں جن میں آپ کی عمر بوقت نکاح چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال کا ذکر ہے۔ جس طرح بخاری شریف جلد نمبر ۳ کتاب النکاح ص ۹۴ پر یہ روایت ہے "حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے نکاح کیا ان کے ساتھ جب وہ چھ سال کی تھیں اور داخل کی گئیں آپ ﷺ پر (زفاف کے لیے) جب وہ نو سال کی تھیں اور نو سال تک آپ کے پاس رہیں۔" (۲) سرولیم میور لکھتا ہے کہ "آنحضرت ﷺ سے شادی کے وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔"

جواب: مستشرقین نے دو موقعوں پر بی بی عائشہؓ کی عمر کو متنازعہ بنایا ہے۔ اول جب آنحضرت ﷺ کی حضرت عائشہؓ سے نسبت طے ہوئی۔ دوم: جب شادی انجام پذیر ہوئی۔ بات تو ایک ہی ہے اگر نسبت کے وقت عمر کا درست تعین ہو جاتا تو آگے غلطی کا امکان نہ رہتا بات یہیں ختم نہیں ہوتی کیونکہ کئی مسلم مورخین نے بھی ٹھوکر کھائی ہے شائد انہیں سہو ہوا ہے یا بلا تحقیق لکھتے چلے گئے یہاں تک کہ چوٹی کے محدثین بھی اپنی کتب احادیث میں یونہی نقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بخاری شریف میں پانچ، مسلم شریف میں چار، اور ابوداؤد میں ایک روایت ہے۔ ان روایات کو قبول کر کے مقدس ومحترم ہستیوں کی شان میں گستاخی و بے ادبی کرتے رہے۔ آیئے دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے؟۔

دلیل اول: امام بخاری کہتے ہیں جب قرآن کریم کی ۵۴ ویں سورہ القمر نازل ہوئی تو وہ (عائشہ) خاصی سمجھدار تھیں اور اس سورہ کی چند آیات انہیں یاد ہو گئی تھیں۔ وہ انہوں نے اپنے والد سے سنی تھیں۔ سورہ

القمر کا نزول چار یا پانچ نبوت ہے اس طرح بعثت کے دسویں سال میں ان کا سن ۶۔۵ سال ہونا درست نہیں کیونکہ ایسا ہو تو پھر ان کی پیدائش سورہ القمر کے نزول کے وقت ہوئی حالانکہ انہیں اس سورہ کی چند آیات ازبر تھیں تو ماننا پڑے گا کہ اس وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر نو یا دس سال ہوگی۔

دلیل دوم: ایک روایت میں ہے کہ براء بن عازبؓ نے کہا ''میں اور عبداللہ بن عمرؓ بدر کی جنگ میں کم سن تھے اور بدر کی جنگ میں مہاجرین کی تعداد ساٹھ سے کچھ اوپر تھی اور انصار دو سو چالیس سے کچھ زیادہ تھے۔ اس حدیث کی شرح میں غلام رسول رضوی تفہیم البخاری میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں کی عمریں حد بلوغ سے کم تھیں، اس لیے بدر میں شریک ہونے کی اجازت نہ ملی۔ آپ ﷺ ان لوگوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دیتے تھے جو بالغ نہیں ہوتے تھے۔۔۔ علامہ عینی کہتے ہیں کہ قاضی عیاض اور ابن تین نے اعتراض کیا کہ جنگ احد میں حضرت عبداللہ پیش ہوئے تو کم سن پایا گیا اور جنگ میں شریک نہ ہو سکا یہ روایت بخاری کی روایت کے خلاف ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں منافات نہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ دونوں جنگوں میں پیش کیے گئے تھے۔ خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس روز انہیں بدر کی جنگ میں پیش کیا گیا تو ان کی عمر تیرہ سال تھی اور جنگ احد میں ان کی عمر چودہ سال تھی اس لیے ان کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

اہم نکتہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اس دن (غزوہ احد) حضرت ام سلیمؓ اور حضرت عائشہؓ کو دیکھا کہ وہ کپڑا اٹھائے ہوئے پانی کی مشکیں بھر بھر کر اپنی پیٹھ پر لاتیں، مردوں کے منہ میں ڈالتیں اور لوٹ جاتیں اور میں ان کے پازیب دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں موقعوں پر ان کی عمریں کم تھیں۔ (تفہیم البخاری۔۶۔۱۷) غزوہ احد میں حضرت انسؓ کم سن تھے اس لیے ان کا ام المومنین کا پازیب دیکھنے میں حرج نہیں یا اچانک ان کی نظر پڑی ہوگی لہٰذا یہ نہ کہا جائے کہ حضرت انسؓ کا غیر محرمہ کی پنڈلی دیکھنا کیسے جائز ہے نیز اس وقت پردہ کی آیت نازل نہیں ہوئی تھی پردہ کی آیت ام المومنین حضرت زینبؓ سے نکاح کے وقت نازل ہوئی تھی اور احد کا واقعہ اس نکاح سے پہلے کا ہے۔ (حوالہ بالا)

آثار و احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ نابالغ کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہ تھی بلکہ صرف بالغ کو یہ رعایت حاصل تھی جو پندرہ سال کی عمر کو پہنچ چکے ہوتے، جس طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جنگ احد میں پیش کیا گیا لیکن اجازت نہ ملی کیونکہ ان کی عمر بالترتیب تیرہ اور چودہ سال تھی اور جب جنگ خندق ہوئی، اس میں پیش کیا گیا تو اجازت مل گئی کیونکہ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی لہٰذا حضرت عائشہؓ بالغ تھیں اور ان کی عمر پندرہ سال یا اس سے اوپر تھی تبھی تو بدر اور احد کی جنگوں میں حصہ لے رہی تھیں اور انہیں منع نہیں کیا گیا۔

فتویٰ: امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ وہ لڑکے اور لڑکی کی عمر پندرہ سال حد بلوغ قرار دیتے ہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور اسی پر احناف کا فتویٰ ہے۔ (تفہیم البخاری ج۔ اول۔ ص ۱۸۶)

اہم نکتہ: بعض کہتے ہیں کہ غزوہ احد اور غزوہ خندق کے درمیان دو سال کا فاصلہ ہے غزوہ احد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کی عمر چودہ سال تھی اس لیے جہاد کی اجازت نہ دی گئی۔ امام بخاری نے موسیٰ بن عقبہ کے قول کی جانب میلان کیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ سے احد کے روز عرض کی تھی کہ آپ جہاد کی اجازت مرحمت فرمائیں، اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی تو آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت نہ دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احد اور خندق کے غزوات کے درمیان ایک سال سے زیادہ کا زمانہ نہ تھا۔ ان کی یہ حجت مکمل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ابن عمرؓ نے جنگ احد کے وقت چودھویں سال میں قدم رکھا ہو اور احزاب میں پندرہ سال مکمل کر چکے ہوں، اس طرح یہ مدت دو سال بنتی ہے گویا جنگ احد اور احزاب کے درمیان دو سال کا فاصلہ ہوا، اس اعتبار سے غزوہ احزاب پانچ ہجری میں ہوا، اور یہ ثابت ہے کہ غزوہ احزاب پانچ ہجری میں ہوا۔ (تفہیم البخاری۔ ج۔ ۶۔ ص ۱۷۔ باب غزوہ بدر)

حضرت براء بن عازبؓ نے کہا کہ میں اور عبداللہ بن عمرؓ کو جنگ بدر میں پیش کیا گیا ہمیں کم سن پایا گیا۔ ہم دونوں کی عمریں حد بلوغ سے کم تھیں اس لیے بدر میں شرکت کی اجازت نہ ملی کیونکہ آپ انہی لوگوں کو جنگ میں شامل فرماتے جو بالغ ہوتے تھے۔

علامہ عینی نے کہا کہ قاضی عیاض اور ابن تین نے اعتراض کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ میں احد میں جنگ کے لیے پیش کیا گیا تو مجھے کم سن پایا گیا، مجھے کم سنی کے باعث جنگ احد میں شامل نہ کیا گیا۔ یہ روایت بخاری کی روایت کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ کہ ان دونوں حدیثوں میں منافات نہیں کیونکہ حضرت عبداللہؓ کو دونوں جنگوں میں پیش کیا گیا۔ خود عبداللہؓ کہتے ہیں کہ جس روز بدر میں اسے پیش کیا گیا تھا اس کی عمر تیرہ سال تھی اور انہیں شامل ہونے سے روک دیا گیا تھا اسی طرح احد کے معرکہ میں پیش کیا گیا، اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی تو انہیں مسترد کر دیا گیا کیونکہ دونوں موقعوں پر ان کی عمر کم تھی۔

دلیل سوم: ابونعیم اصبہانی کی روایت ہے کہ سیدہ اسماءؓ بنت ابوبکر ہجرت سے ۲۷ سال قبل پیدا ہوئیں اور ۷۴ ہجری میں وفات پائی۔ الاستیعاب میں ہے کہ سیدہ اسماءؓ جو اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ کی موت کے بعد ۷۳ ہجری میں فوت ہوئیں۔ وہ نابینا ہو گئی تھیں اور بوقت انتقال ان کی عمر سو سال تھی۔

البدایہ والنہایہ اور الکمال فی اسماء الرجال میں ہے کہ حضرت اسماءؓ اپنی بہن عائشہؓ سے دس سال

بڑی تھیں ۔ حافظ ابن عبدالبر نے بھی یہی لکھا کہ سیدہ اسماءؓ حضرت عائشہ سے دس سال بڑی تھیں (خاتم النبین ۔۶۵)۔امام ذہبی نے بھی عبدالرحمٰن بن ابی الرشاد کا قول نقل کیا ہے کہ سیدہ اسماء کی عمر عائشہؓ سے دس سال زیادہ تھی ۔ علامہ ابن جوزی نے لکھا کہ سیدہ اسماءؓ ہجرت سے ستائیس سال قبل پیدا ہوئیں ،سترہ آدمیوں کے بعد ایمان لائیں اور تہتر ہجری میں وفات پائی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیدہ اسماءؓ کی عمر بوقت ہجرت ستائیس سال ہے اور وہ عائشہؓ سے دس سال عمر میں بڑی ہیں تو بوقت ہجرت بی بی عائشہؓ کی عمر سترہ سال ہوئی اور بوقت رخصتی اٹھارہ یا انیس سال ۔۔۔ نیز ابن اسحٰق ، زرقانی ، ابن سید الناس اور امام سہیلی اور امام ابن کثیر نے حضرت عائشہؓ کے قبول اسلام کا ذکر کیا ہے۔ ''اور وہ کم سن تھی'' کے الفاظ درج کیے ہیں لہذا کم سنی میں قبول اسلام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں سوجھ بوجھ تھی کہ وہ اسلام میں داخل ہو رہی ہیں ۔ یہ سوجھ بوجھ کا زمانہ پانچ اور چھ سال کی عمر کا ہوسکتا ہے لہذا بوقت ہجرت سیدہ عائشہؓ کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال اور بوقت رخصتی اٹھارہ یا انیس سال ہے کیونکہ رخصتی ہجرت کے ایک یا دو سال بعد ہوئی ۔

دلیل چہارم : بخاری کی بعض روایات میں یہ منقول ہے کہ سیدہ عائشہؓ چار یا پانچ نبوت کو پیدا ہوئیں ، اس بات کی تردید کی ، ابن ہشام نے اپنی کتاب السیرت النبویہ میں سن ایک نبوت میں جو حضرات ایمان لائے ان کی فہرست دی ہے اس میں بی بی عائشہؓ کا نام شامل ہے الفاظ یہ ہیں ''پھر سید نا ابوعبیدہ بن الجراح دولت ایمان سے مشرف ہوئے اور سیدہ اسمٰاؓ بنت ابوبکر صدیقؓ اور سیدہ عائشہؓ بنت ابوبکر صدیقؓ ایمان سے بہرہ ور ہوئیں اور سیدہ عائشہؓ ان ایام میں چھوٹی تھیں ۔'' اس سے دو فائدے حاصل ہوئے ۔ سن ایک میں ایمان لانے والوں میں سیدہ عائشہؓ شامل ہیں اگرچہ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کم سن تھیں ، تو جو لوگ کہتے ہیں کہ ان کی پیدائش چار یا پانچ نبوت کی ہے ، درست نہیں ہے ۔

دوم : سیدہ عائشہؓ ایمان لانے یا نہ لانے کو سمجھتی ہیں ، اگر اس وقت عمر پانچ یا چھ سال مان لی جائے تو ہجرت کے وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال بنتی ہے نیز ہجرت کے ایک یا دو سال بعد رخصتی ہوئی ، اس حساب سے آپ کی عمر اٹھارہ انیس سال بنتی ہے ۔۔۔ ایمان لانے والوں کے بارے ابن سعد نے لکھا ہے کہ سیدہ خدیجہؓ کے بعد جو عورتیں ایمان لائیں ، وہ ام الفضل زوجہ حضرت عباسؓ اور اسماءؓ بنت ابی بکرؓ اور ان کی بہن عائشہؓ تھیں ۔ شرح زرقانی نے بھی یوں ہی ذکر کیا ہے البتہ عائشہؓ کے نام کے ساتھ بریکٹ میں یہ لکھ دیا ہے کہ ''وہ چھوٹی تھیں'' ۔

دلیل پنجم : حضرت خولہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے ؟ فرمایا ! کس سے ؟ خولہ نے کہا ! بیوہ بھی ہے اور کنواری بھی ۔ فرمایا بیوہ کون ہے اور کنواری کون ؟ خولہ نے جواب دیا کہ بیوہ حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور کنواری عائشہؓ بنت ابوبکر صدیقؓ ۔ اس جواب پر آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا

کہ حضرت عائشہؓ ابھی کم سن بچی ہے، نابالغ ہے اور اس کی رخصتی میں دیر لگے گی، یہ بھی نہیں فرمایا کہ وہ میرے منہ بولے بھائی کی بیٹی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس وقت بالغ تھیں اور گھریلو امور نمٹانے کی اہل تھیں۔ دوسرا یہ کہ حضرت خولہ نے کم سن بچی اور نابالغ کا نام ہی کیوں لیا تھا؟ اگر وہ کم سن تھی تو خولہ کو ایسا رشتہ کروانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تیسرا یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عائشہؓ کو آنحضرت ﷺ کو بیاہنے میں یہ عذر پیش نہیں کیا کہ وہ ابھی کم سن ہے البتہ یہ بات بطور عذر پیش کی کہ رسول اللہ ﷺ مجھے اپنا منہ بولا بھائی کہتے ہیں اور بھائی کی بیٹی بھتیجی ہوتی ہے تو پھر یہ رشتہ کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ عرب معاشرہ میں منہ بولے بھائی کی بیٹی کو حقیقی بھتیجی سمجھا جاتا ہے اور یہ رشتہ حرام جانا جاتا ہے نیز یہ کہ حضرت عائشہؓ کے والدین کو آنحضرت ﷺ سے اپنی کم سن بیٹی کو بیاہ دینے میں جلدی ہی کیا تھی؟ دوسری طرف روف و رحیم نبی ﷺ کیونکر کم سن سے شادی کرنے کے خواہاں ہو سکتے ہیں؟ (نعوذ باللہ) (سید الوریٰ۔۳۔۴۵)

دلیل ششم: روایات کی تحقیق: اس مفہوم میں روایات بخاری میں پانچ، مسلم میں چار اور ابو داؤد میں ایک ہے۔ بظاہر یہ دس روایتیں ہیں مگر حقیقت میں یہ صرف تین ہیں کیونکہ بخاری کی پانچ، مسلم کی دو اور ابو داؤد کی ایک روایت، یہ آٹھوں ایک ہی راوی سے یعنی ہشام بن عروہ سے مروی ہیں وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں جب کہ مسلم کی باقی دو روائتیں ہیں ان میں سے ایک زہری عروہ سے اور عروہ عائشہؓ سے راوی ہیں جب کہ دوسری میں ابراہیم، اسود سے اور اسود حضرت عائشہؓ سے روایت کرتا ہے۔ ہشام کو امام مالک کذاب کہتے ہیں لیکن دیگر محدثین ان کو ثقہ اور نہایت قوی راوی شمار کرتے ہیں۔ تاہم اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ آخری عمر میں ان کو کسی قدر نسیان اور وہم کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا ۔۔۔۔ اللہ اکبر! حضرت عائشہ کی رخصتی نو سال میں کراتے کراتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ نو کا ہندسہ ہشام کے ذہن پر اس حد تک مسلط ہوا کہ انہوں نے اپنی بیوی کی رخصتی بھی نو سال میں کر ڈالی۔۔۔۔!! چلیں کوئی بات نہیں، ہشام کو اگر نو سال اتنے ہی پسند ہیں تو یوں ہی سہی مگر انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک دوسری روایت میں ہشام بتاتے ہیں کہ میری بیوی مجھ سے تیرہ سال عمر میں بڑی تھی۔ واہ جی، ہشام صاحب زندہ باد! کیا کہنے آپ کے۔۔۔!! آپ نے ایسی عورت سے جو عمر میں آپ سے تیرہ سال بڑی تھی اس وقت شادی کر لی جبکہ اس کی عمر نو سال تھی گویا اپنی پیدائش سے چار سال پہلے آپ شادی کر چکے تھے۔۔۔۔۔ ہشام کی زندگی کے دو ادوار یعنی مدنی اور عراقی ہیں۔ مدنی دور ۱۲۱ ہجری تک قائم رہا اس دور میں ان کے سب سے اہم شاگرد امام مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب موطاء میں ہشام سے کئی روایات لی ہیں لیکن نکاح والی روایات موطاء میں دستیاب نہیں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ بھی ہشام کے اسی دور کے شاگرد ہیں انہوں نے بھی روایات لی ہیں مگر اس روایت کو نقل نہیں کیا۔ ۱۳۱ ہجری

تک ہشام بلاشبہ سب کے نزدیک ثقہ تھے لیکن ۱۳۱ ہجری میں انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر ایک لاکھ روپے قرض لے کر خرچ کیے اس امید پر کہ خلیفہ وقت سے مدد لے کر قرض اتار دوں گا۔ بنوامیہ کی حکومت بدلی اور بنوعباس برسر اقتدار آ گئے، خلیفہ منصور کے سامنے دست سوال دراز کیا، اس نے صرف دس ہزار دیئے، یہ ان کا پہلا دماغی صدمہ تھا۔ جس کے باعث اس نے روایات میں بہکنا شروع کیا۔ ۱۴۶ ہجری کو بغداد میں وفات پائی۔ ان کی روایات میں گڑبڑ اس دور سے متعلق ہے چنانچہ یعقوب بن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ ہشام کی وہ روایات جو اہل عراق ان سے نقل کرتے ہیں ان کا کوئی بھروسہ نہیں اور شادی والی روایت اہل عراق کی روایت ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ہشام کے حافظہ میں آخری عمر میں تغیر آ گیا تھا۔ حافظ عقیلی نے تو یہاں تک لکھ ڈالا کہ ہشام آخری عمر میں سٹھیا گئے تھے۔ ہشام کے شاگرد امام مالک نے بھی ہشام کی عراق والی روایات کے باعث اعتراض کیے ہیں۔ ابن حجر کا بیان ہے کہ عراقی روایات کے باعث تمام اہل مدینہ نے ان پر اعتراض کیے ہیں۔ (شمع حقیقت۔۳۰۳)

مندرجہ بالا دس روایتوں میں سے آٹھ تو ہشام کی وجہ سے باطل ٹھہریں۔ اب رہ گئیں مسلم کی دو روایتیں تو ان کی صورت حال یہ ہے کہ مسلم کی پہلی روایت میں سند اس طرح ہے۔ حدیث بیان کی ہم سے عبد بن حمید نے، اس نے کہا حدیث بیان کی ہم سے عبدالرزاق نے، اس نے کہا ہم سے حدیث بیان کی معمر نے، اس نے زہری سے اس نے عروہ سے، اس نے عائشہؓ سے۔ اس روایت میں زہری عروہ سے روایت کرتے ہیں اور محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہا امام زہری نے عروہ سے کچھ نہیں سنا۔ ابن حاتم نے ذکر کیا کہ محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ زہری نے عروہ سے کچھ نہیں سنا، جب زہری کا عروہ سے سماع حدیث ثابت نہیں تو پھر درج بالا روایت کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔۔۔ اس سند کے ایک راوی عبدالرزاق ہیں ان کو اگرچہ بہت سے محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ شیعہ تھے۔۔ زید ابن مبارک کہتے ہیں کہ ایک دفعہ عبدالرزاق ہمارے سامنے ابن حدثان کی وہ حدیث بیان کر رہا تھا جس میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وراثت سے حصہ طلب کرنے کے لیے حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو حضرت عمرؓ نے عباسؓ سے کہا کیا تم اپنے بھتیجے کا حصہ لینے آئے ہو اور علیؓ سے کہا کہ تم تو وہ حصہ طلب کرنے آئے ہو جو تمہاری بیوی کو باپ سے ملتا ہے۔۔۔ زید نے بتایا کہ یہاں پہنچ کر عبدالرزاق رک گیا اور کہا "ذرا! دیکھو اس جھوٹے (نعوذ باللہ) یعنی عمرؓ کو۔ کبھی کہتا ہے بھتیجے کی وراثت اور کبھی کہتا ہے بیوی کے باپ کی وراثت، یہ نہیں کہتا کہ رسول اللہ کی وراثت۔" زید کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر میں اٹھ کر چلا آیا پھر لوٹ کر نہیں گیا نہ اس سے کوئی روایت لی۔

مسلم کی دوسری روایت پر نظر ڈالتے ہیں جس میں چار راوی بیک وقت بیان کرتے ہیں کہ حدیث

بیان کی ہم سے ابومعاویہ نے، اس نے اعمش سے، اس نے ابراہیم سے، اس نے اسود سے، اس نے عائشہؓ سے۔۔۔۔۔ان میں سے پہلے دو راوی یعنی ابومعاویہ اور اعمش دونوں شیعہ تھے۔کئی علماء تو اعمش کو ہلکے درجہ کا شیعہ قرار دیتے ہیں۔۔۔مشہور و معروف محدث ان کے بارے میں لکھتے ہیں"وہ اپنی فضیلت اعتماد عظمت شان اور شیعہ ہونے کے سبب مشہور ہیں۔۔۔۔بہرحال اعمش ہلکے درجے کا شیعہ ہوں یا اعلی درجے کے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابومعاویہ پکا شیعہ تھا۔علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ ان کا غالی ہونا مشہور ہے۔(یعنی شیعیت میں غالی ہونا)"پکا شیعہ ہونے کے علاوہ یہ ارجاء کا عقیدہ بھی رکھتے تھے اور مرجئہ میں سے تھے اور یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ حضرت الشیخ نے غنیۃ الطالبین میں مرجئہ کو گمراہ فرقوں میں شمار کیا ہے۔اس گمراہی کی وجہ سے محدث وکیع ان کے جنازہ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ وکیع ان کے جنازہ میں اس لیے حاضر نہیں ہوئے تھے کہ وہ مرجئہ تھے۔"(صاحب سید الوریٰ کا بیان ختم ہوا)

دلیل ہفتم: سیدہ زینب بنت جحش کی شادی پر طوفان کھڑا ہو گیا کہ متبنیٰ بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی۔پہلے جب زینبؓ کنواری تھی آپ ﷺ نے اس سے نکاح کیوں نہ کیا؟ اپنے پرائے سب نے دل کھول کر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی حتیٰ کہ قرآن پاک نے اس کا جواب دیا اور دشمنان اسلام کی بولتی بند کر دی اس طرح سے زمانہ جاہلیت کی ایک باطل رسم کا خاتمہ ہو گیا۔لیکن بی بی عائشہؓ کی شادی کے بارے کہیں سے کوئی آواز نہیں اٹھتی، کوئی شور شرابہ نہیں ہوتا، کسی قسم کا طوفان بدتمیزی برپا نہیں ہوتا حالانکہ وہ وقت آپ ﷺ کی دشمنی و مخالفت کے لیے نہایت سازگار تھا۔وہ جو چھوٹی چھوٹی بات کا بتنگڑ بنا دیتے تھے اس پر ان کی زبانیں کیونکر گنگ ہو گئیں، ان کے لب کیوں سل گئے؟ بات یہی ہے کہ سیدہ عائشہؓ کی شادی کے وقت عمر اٹھارہ انیس سال تھی جس کے سبب سارا ماحول مہر بلب تھا۔

دلیل ہشتم: یہ بھی ذہن میں رہے کہ شائد"عشرہ" کا لفظ راوی کی بھول سے چھوٹ گیا ہو یا جان بوجھ کر روایت سے حذف کر دیا گیا ہو اس لیے کہ پیغمبر کو معتوب کیا جا سکے حالانکہ آپ ﷺ کے خاندان میں شادیاں اس انداز سے انجام پذیر ہوئیں۔سیدہ فاطمہ کی اکیس یا چھبیس سال اور ام کلثوم کی اٹھارہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔سیدہ زینبؓ بنت جحش کی زید بن حارث سے شادی ۳۴ ویں سال میں ہوئی۔حضرت ابوبکرؓ کے خاندان میں سیدہ اسماءؓ کی شادی چھبیس یا ستائیس سال میں ہوئی، وہ سیدہ عائشہؓ سے عمر میں دس سال بڑی تھیں۔تو اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سولہ یا سترہ سال ہوئی اور رخصتی کے وقت اٹھارہ یا انیس سال ہوئی۔(امہات المومنین۔۱۲۷)

دلیل نہم: شیعہ مورخ محمد بن جریر طبری نے لکھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی دو شادیاں تھیں، ان سے چار اولادیں ہوئیں اور یہ تمام اولادیں زمانہ جاہلیت میں ہوئیں، اب اگر حضرت عائشہؓ بقول ابن جریر بعثت

سے چند سال قبل بھی پیدا ہوں تو رخصتی کے وقت ان کی عمر پھر بھی پندرہ سال بنتی ہے۔
دلیل دہم: حضرت ابو بکرؓ نے حبشہ ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو انہیں یہ فکر ہوا کہ پہلے اپنی بیٹی کا نکاح کروں۔ مطعم نے اپنے بیٹے جبیر کے لیے حضرت عائشہؓ کا رشتہ طلب کیا تھا اس سلسلے میں جب حضرت ابو بکرؓ مطعم بن عدی کے پاس گئے تو اس کی بیوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم ہمارے بیٹے کو بھی بے دین بنا لو گے۔ یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ واپس چلے آئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت حبشہ کے وقت یعنی سن پانچ نبوی میں حضرت عائشہؓ کی عمر اتنی تھی کہ ان کے والد کو ہجرت حبشہ کرنے سے پہلے ان کو بیاہ دینا چاہتے تھے۔ ولیم میور کو مغالطہ ہوا کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی نسبت جو مکہ میں طے پائی اور آپ کی عائشہؓ سے شادی جو سن دو ہجری میں مدینہ میں ہوئی، کے وقت کو آپس میں گڈ مڈ کرتا ہے۔ (حوالہ بالا)
دلیل یازدہم: اس سازش (کم سنی کی سازش) کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت فاطمہؓ بھی بعثت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں لیکن شیعوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نبوت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اور نکاح کے وقت ان کی عمر نو سال تھی حتیٰ کہ تحفۃ العوام میں جو اردو زبان میں شیعوں کی کتاب ہے یہ تحریر ہے کہ جب لڑکی نو سال کی ہو جائے تو اس کی شادی کر دی جائے، لہٰذا اس فریب کاری کو چھپانے اور اپنے باطل نظریہ کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اور حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ کی عمر میں مطابقت قائم کرنے کی خاطر حضرت عائشہؓ کی عمر کا ہوّا کھڑا کر دیا گیا۔
دوازدہم: ایک روایت میں حضرت عائشہؓ نے سورہ القمر کی آیت نمبر ۴۶ کے نزول کے بارے میں کہا کہ وہ اس وقت جاریہ تھی۔ ایک باشعور لڑکی سے ہی نزول آیات کا زمانہ یاد رہنا ہی متوقع ہو سکتا ہے اس طرح سے حضرت عائشہؓ زمانہ جاہلیت میں پیدا ہو چکی تھیں۔ (حوالہ بالا)

واقعہ افک

اعتراض نمبر ۱۰۸

"سر ولیم میور کہتا ہے کہ بنی مصطلق کے خلاف بھیجی ہوئی مہم جب مدینہ واپس آئی تو عائشہؓ کا محمل آپ کے سامنے دروازہ کے پاس مسجد کے متصل رکھا گیا، لیکن جب کھولا گیا تو وہ خالی تھا، تھوڑی دیر کے بعد صفوان جو ایک مہاجر تھے نمودار ہوئے، اونٹ پر عائشہؓ بیٹھی ہوئی تھیں اور آگے آگے صفوان تھے۔" مزید لکھتا ہے کہ "اگرچہ صفوان نے بڑی جلدی کی تاہم فوج کو نہ پا سکے۔ پس لوگوں کے اترنے اور خیمہ نصب کرنے کے بعد عائشہؓ صفوان کی رہبری منظر عام کے سامنے داخل شہر ہوئیں۔" (سیرت عائشہؓ از سلیمان ندوی ۹۴۔۹۵)
جواب: یہ واقعہ افک سے متعلق سر ولیم میور کی نفرت و تعصب پر مبنی رائے کا اظہار ہے۔ حقیقت

سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ کتب واحادیث اور السیّر اس کی نفی کرتی ہیں حالانکہ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ صفوان چند گھنٹوں کے بعد دوپہر کے وقت اگلی منزل پر فوج سے آملے۔ یہ سرے سے مدینہ کا قصہ ہے ہی نہیں بلکہ ولیم میور خود منافقین کا طرف دار بن کر اس گھناؤنے الزام میں شامل ہو کر اپنی اسلام دشمنی کا اظہار کرتا ہے جب کہ اس واقعہ کی سچائی کا اعلان قرآن پاک یوں کرتا ہے۔

مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا، سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ ترجمہ: ''کہا جاتا کہ ہمیں نہیں پہنچتا کہ ایسی بات کہیں، الٰہی پاکی ہے تجھے، یہ بڑا بہتان ہے۔''

ضمناً اعتراض

''سر ولیم میور نے ایک اور شوشہ چھوڑا کہ حسان نے اپنے شاعرانہ تخیل کو بدل کر ایک نہایت عمدہ نظم لکھی جس میں عائشہؓ کی عفت، حسن عقل مندی اور چھریرے خوبصورت بدن کی تعریف تھی۔ خوشامد بھری ہوئی تعریف نے عائشہؓ اور شاعر میں میل کرادیا۔''

مذکورہ اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ حسانؓ نے واقعہ افک میں حصہ لیا تھا جس سے عائشہؓ ان سے ناراض تھیں جب کہ ایسا نہیں ہے۔ بخاری و مسلم میں اس کا سبب خود حضرت عائشہؓ کی زبانی موجود ہے کہ حسانؓ آپ ﷺ کی طرف سے کافروں کو جواب دیتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ حسانؓ کو برا کہتے ہیں لیکن خود حضرت عائشہؓ اپنی زبان سے برا نہیں کہتی تھیں بلکہ لوگوں کو اس سے روکتی تھیں۔ یہ مستشرق اس ناراضی کو کم کرنے بلکہ دور کرنے کا سبب عمدہ نظم لکھنا بتاتا ہے جس میں خوشامد بھری تعریف نے ان دونوں میں میل کرادیا۔ الامان! ندوی صاحب فرماتے ہیں کاش انگلینڈ کا مستشرق اعظم ہم کو بتا سکتا کہ تمام نظم کے شعروں میں حضرت عائشہؓ کے حسن، عقل مندی اور چھریرے خوبصورت بدن کی تعریف کس شعر میں مذکور ہے شائد ہمارے محقق کو یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت عائشہؓ کو جب یہ شعر سنایا گیا تو ان کا سن اس وقت چالیس برس کا تھا، ان کا جسم اس وقت چھریرا نہیں بلکہ پندرہ سولہ سال میں بھاری ہو گیا تھا۔ (سیرت عائشہ از سلیمان ندوی۔ ص ۹۶)

سر ولیم میور کی عربی دانی کا کمال ہے وہ کہتا ہے کہ اس نظم میں عائشہؓ کے چھریرے خوبصورت بدن کی تعریف تھی۔ چھریرے بدن کی ہجو سے حضرت عائشہؓ کو بہت رنج ہوتا تھا۔ حسان جب اس فقرہ پر پہنچے جس میں ان کی لاغری کی طرف اشارہ تھا تو شوخی کے ساتھ شاعر کو روکا اور خود شاعر کی فربہی کی برائی کی۔۔۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ اس طرز اخلاق اور حلیہ کا پتہ نہیں چلا، ناچار خود سر ولیم میور کے بتائے ہوئے اشارہ پر ہم نے جستجو کی تو نظر آیا کہ تصویر کا قصور نہیں تھا بلکہ خود یورپ کے سب سے بڑے ماہر عربیات کے دماغی شیشہ کا قصور تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت حسانؓ کے شعر کا دوسرا مصرع یہ

تھا ''وتصبح غرثٰی عن لحوم الغوافل ۔۔۔ترجمہ: وہ بھولی بھالی عورتوں کا گوشت نہیں کھاتیں عربی محاورہ میں کسی کا گوشت کھانا، اس کی غیبت اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے سے عبارت ہے۔ حضرت حسان کا مقصود یہ ہے کہ آپ کسی کی غیبت اور پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرتیں۔ حضرت عائشہؓ نے تعریضاً کہا لیکن تم ایسے نہیں ہو (یعنی تم غیبت کرتے ہو) اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے کے مرتکب ہوئے ہو۔ یہ واقعہ افک کی طرف اشارہ تھا، اس سے یہ مقصود نہ تھا کہ میں تو دبلی ہوں مگر تم موٹے ہو۔'' (سید کا بیان ختم ہوا۔۹۵۔۹۶) اس جاہلانہ کمال کا تماشہ یورپ کے عجائب زار کے سوا ہم کو کہاں نظر آ سکتا ہے آخر میں ہم کو ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ اصل الزام کے بطلان سے ان کو بھی انکار نہیں' لکھتے ہیں ''ان کی (حضرت عائشہؓ) کی ماقبل اور مابعد زندگی ہم کو بتاتی ہے کہ وہ اس جرم سے بالکل بے گناہ تھیں۔''

سر ولیم میور الزام پر الزام دھرتا ہے اور سیدھی بات نہیں کرتا ہمیشہ کج فہم رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار وہ کوئی سچی بات کہہ دے تو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اب حقیقت پسند ہو گیا ہے اور اسلام کو سمجھنے لگا ہے ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ دروغ گوئی سے کام لیتا ہے۔ ایک وقت میں کچھ کہا اور دوسرے وقت میں کچھ کہا یہ تضاد بیانی اس کے ہاں بکثرت ملتی ہے۔ اسی واقعہ کے متعلق پہلے تین الزام دھرے پھر ان کی تردید کر دی، وہ لکھتا ہے ''ان کی (حضرت عائشہؓ کی) ماقبل و مابعد کی زندگی ہم کو بتاتی ہے کہ وہ اس جرم سے بالکل بے گناہ تھیں۔'' یہ لکھ کر بھی ہیر پھیر کی بات کی ہے اسے یہ علم نہیں کہ الزام اور جرم میں زمین آسمان کا فرق ہے کیونکہ الزام ثابت ہو جائے تو جرم بنتا ہے لہٰذا الزام بے ثبوت بے بنیاد اور باطل ہے تو اسے لکھنا چاہیے تھا کہ عائشہؓ اس الزام سے بالکل بے گناہ تھیں۔ چلو دشمنی نہ چھوٹی مگر کچھ تو اپنے بیان کی تردید و نفی کر دی۔ چونکہ مستشرق غلط اور وضعی روایات سے الزامات اخذ کرتے ہیں اس لیے ان کے اعتراضات کا جواب اصل روایات کے مطابق دیا جاتا ہے۔

واقعہ افک کی اصل حقیقت / حدیث الافک:

حدیث بیان کی ہم سے عبدالعزیز بن عبیداللہ نے، اس نے کہا ہم سے ابراہیم بن سعد نے، اس نے صالح سے، اس نے ابن شہاب سے، اس نے عروہ بن زبیر اور سعید بن مسیّب نے اور علقمہ بن وقاص نے اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے عائشہؓ سے جو نبی ﷺ کی بیوی ہیں۔ جب کہا ان کے بارے میں اہل افک نے جو کچھ کہا۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ ان سب نے یعنی عروہ، سعید، علقمہ اور عبیداللہ نے مجھے اس قصہ کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا سنایا اور ان میں سے بعض زیادہ یاد رکھنے والے تھے اور بہتر انداز میں بیان کرنے والے تھے اس قصہ کو بہ نسبت بعض کے۔ اور میں نے ان میں سے ہر ایک سے حدیث کے اس حصہ کو یاد کر لیا جو اس نے عائشہؓ کے حوالے سے مجھے سنایا اور بعض کی حدیث بعض

دوسروں کی بیان کردہ حدیث کی تصدیق کرتی ہے۔ اگرچہ بعض کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ یاد تھی۔ ان سب نے کہا کہ عائشہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو آپ اپنی بیویوں کا قرعہ ڈالتے تھے جس کا نام قرعہ میں نکلتا اسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے قرعہ ڈالا تو اس میں میرا نام نکل آیا، میں آپ کے ساتھ روانہ ہوئی، اس وقت حجاب کا حکم نازل ہو چکا تھا اس لیے کجاوہ میں بٹھا کر اتاری اور چڑھائی جاتی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ سے فارغ ہو کر واپس آئے اور ہم مدینہ کے قریب تھے تو رات کو رسول اللہ ﷺ نے چلنے کا حکم دیا، جب چلنے کا اعلان ہوا تو میں (حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے) روانہ ہوئی اور لشکر کی حدود سے نکل گئی۔ جب میں فارغ ہو کر اپنی سواری کے پاس آئی اور اپنے سینہ کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ میرا ہار، جو خزف یمنی کا تھا، ٹوٹ گیا ہے اور کہیں گر پڑا ہے۔ میں واپس گئی اور اپنا ہار ڈھونڈھنے لگی، اس کی تلاش میں مجھے دیر ہو گئی، جو لوگ مجھے سوار کراتے تھے انہوں نے کجاوہ اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا اور ان کا یہ خیال تھا کہ میں بیٹھ گئی ہوں کیونکہ اس وقت کی عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں، موٹی نہیں ہوتی تھیں، نہ ان کو گوشت نے ڈھانپا تھا کیونکہ کھانا بہت کم کھاتی تھیں اس لیے کجاوہ اٹھانے والوں نے اس کو ہلکا نہ جانا اور اونٹ پر رکھ دیا۔ اس وقت کم سن لڑکی تھی وہ سب اونٹ کو لے کر چل دیئے اور میں نے اپنا ہار لشکر روانہ ہونے کے بعد پایا جب میں لشکر کی جگہ آئی تو وہاں پکارنے والا تھا نہ جواب دینے والا۔ میں اپنی سابقہ قیام گاہ پر اس خیال کو بیٹھ گئی کہ جب سب کو میرا گم ہونا معلوم ہوگا تو مجھے تلاش کرنے ضرور آئیں گے۔ اس طرح میں اپنی جگہ بیٹھی تھی کہ مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گئی۔ صفوان بن معطل ذکوانی لشکر کے پیچھے رہتا تھا (تاکہ گری پڑی چیز اٹھا لائے) وہ صبح میرے پاس آئے اور سوتے آدمی کی پرچھائی سی دیکھی، اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا کیونکہ پردہ کے حکم سے پہلے مجھے دیکھا ہوا تھا، اس نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، پڑھا۔ میں اس کے انا للّٰہ پڑھنے سے بیدار ہو گئی اور اپنی چادر سے منہ چھپا لیا۔ اللہ کی قسم! ہم نے کوئی بات نہ کی نہ میں نے اس سے انا اللہ پڑھنے کے سوا کچھ سنا۔ صفوان نے اتر کر اپنی سواری کو بٹھایا اور اس کا اگلا پاؤں باندھا، میں اٹھ کر اس پر سوار ہو گئی تو صفوان اونٹ کو کھینچتا ہوا چل پڑا اور ہم شدت گرمی میں بوقت دوپہر لشکر میں جا پہنچے، وہ سب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں سے جس نے ہلاک ہونا تھا (تہمت لگا کر) ہلاک ہوا اور جو شخص بڑا مرتکب ہوا تھا اس بہتان کا وہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ عروہ نے کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ عبداللہ بن ابی کے روبرو یہ تہمت پھیلائی جاتی تھی اور اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی تھی جسے وہ خاموشی سے سنتا اور مزید کریدتا رہتا تھا۔ عروہ نے یہ بھی بتایا کہ اہل افک میں سے سوائے حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش کے اور کسی کا نام معلوم نہیں، حالانکہ کچھ اور لوگ بھی تھے لیکن مجھے ان کا علم نہیں

تاہم جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، وہ عصبہ یعنی ایک گروہ تھا اور ان کے بڑے کو عبداللہ بن ابی کہا جاتا تھا۔ عروہ نے کہا کہ عائشہؓ اس بات کو ناپسند کرتی تھیں کہ وہی تو ہے (رسول اللہ ﷺ کی مدح میں) کہا ہے کہ میں، میرا باپ، میرا دادا اور میری عزت اور ناموس محمد ﷺ پر قربان ہے۔

عائشہؓ نے کہا کہ ہم لوگ مدینہ پہنچے تو میں ایک مہینہ تک بیمار رہی اور تہمت لگانے والوں کی باتیں لوگ پھیلاتے رہے مگر مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ البتہ بیماری کی حالت میں اس وجہ سے کچھ شک ضرور تھا کہ نبی ﷺ میرے ساتھ اس طرح پیش نہیں آتے جس طرح اس سے قبل بیماری کے دوران پیش آیا کرتے تھے، اب تو صرف تشریف لاتے، سلام کرتے پھر پوچھتے تو کیسی ہے؟ تاہم مجھے صحیح طور پر اس شر کا قطعاً ادراک نہ تھا ایک رات میں اور مسطح کی ماں ''مناصح'' کی طرف (حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے) نکلیں۔ ہم لوگ رات کو ہی جایا کرتے تھے کیونکہ اس وقت گھروں میں بیت الخلا نہیں تھے اور ضروریات کے سلسلے میں ہمارا دستور وہی جو عربوں کا پہلے سے چلا آتا تھا یعنی فراغت کے لیے باہر جایا کرتے تھے اور گھروں میں بیت الخلا سے تکلیف محسوس کرتے تھے۔ میں اور ام مسطح جا رہی تھیں۔ ام مسطح ابی رہم بن عبدالمطلب بن عبدالمناف کی بیٹی ہے اور اس کی والدہ صخر بن عامر کی بیٹی ہے جو ابوبکر صدیقؓ کی خالہ ہے۔ مسطح کا باپ اثاثہ ہے جو عباد بن مطلب کا بیٹا ہے۔ اچانک ام مسطح اپنی چادر میں پھنس کر لڑکھڑائیں اور کہا ''مسطح ہلاک ہو جائے'' میں نے اس سے کہا! تو نے بہت بری بات کہی ہے تو ایسے آدمی کو برا کہتی ہے جو بدر میں شریک تھا۔ اس نے کہا! اے بی بی! کیا تم نے وہ نہیں سنا جو اس نے کہا؟ میں نے پوچھا۔ اس نے کیا کہا؟ تو اس نے مجھ سے تہمت لگانے والوں کی بات بیان کی ہے جسے سن کر میری بیماری اور بڑھ گئی۔ جب میں اپنے گھر آئی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام کے بعد پوچھا۔ تو کیسی ہے؟ میں نے عرض کی اگر اجازت ہو تو اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اس خبر کے متعلق ان سے جا کر تحقیق کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی، چنانچہ میں نے اپنی والدہ سے پوچھا۔ امی لوگ کیا باتیں کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا۔۔ بیٹی تو ایسی باتوں کی پروا نہ کر، واللہ جو عورت حسین ہو اور اس کے شوہر کو اس سے محبت ہو اور اس کی سوکنیں بھی ہوں تو اس قسم کی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ میں نے کہا۔۔ سبحان اللہ! کیا لوگ واقعی اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں نے وہ رات اس حالت میں گزاری کہ میرے آنسو تھمتے تھے نہ مجھے نیند آتی تھی۔ جب صبح ہوئی اور وحی اترنے میں دیر ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے علیؓ بن ابی طالب اور اسامہ بن زیدؓ کو بلایا اور اپنی اہلیہ کو چھوڑنے کے سلسلے میں ان سے مشورہ طلب کیا، اسامہ چونکہ جانتا تھا کہ آپ ﷺ اپنے گھر والوں کو پاک دامن سمجھتے ہیں اور اپنی بیویوں سے محبت کرتے ہیں۔ اس لیے اس نے ویسا ہی مشورہ دیا اور کہا۔۔ یا رسول اللہ ﷺ وہ آپ کی گھر والی ہیں

اور میں آپ کے گھر والوں میں بھلائی ہی جانتا ہوں۔ لیکن حضرت علیؓ نے کہا۔۔ یا رسول اللہ! اللہ نے آپ پر تنگی نہیں کی اور عورتیں اس کے سوا بھی بہت ہیں آپ لونڈی سے دریافت کریں، وہ آپ سے سچ بیان کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور فرمایا اے بریرہ! کیا تو نے (عائشہؓ میں) کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو تجھے شبہ میں ڈال دے؟ بریرہ نے عرض کی۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے ان میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جو عیب کی ہو بجز اس کے کہ وہ کم سن ہیں، آٹا گوندھا ہوا چھوڑ کر سو جاتی ہے اور بکری کھا جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہو گئے اور عبداللہ بن ابی کے مقابلے میں تعاون طلب کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے جماعت مسلمین! کون ہے جو میرا ساتھ دے اس شخص کے مقابلے میں جس نے مجھے میرے گھر والوں کے متعلق اذیت دی حالانکہ اللہ کی قسم! میں اپنے گھر والوں میں بھلائی ہی جانتا ہوں اور جس مرد کا یہ نام لیتے ہیں، اس میں بھی بھلائی ہی دیکھتا ہوں۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی میرے گھر والوں پر داخل ہوتا ہے۔ یہ سن کر سعد بن معاذؓ جو بنی عبدالاشہل سے تھا، کھڑا ہوا اور کہا یا رسول اللہ! میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں، اگر وہ شخص قبیلہ اوس کا ہوا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر وہ ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا ہو تو آپ جیسا حکم دیں گے ہم اس پر عمل کریں گے، یہ سن کر قبیلہ خزرج کا ایک شخص کھڑا ہو گیا جس کے چچا کی بیٹی حسان کی ماں تھی اور اس قبیلہ کی ایک شاخ سے تھی۔ سعد بن عبادہؓ جو خزرج کا سردار تھا وہ اس سے پہلے ایک اچھا آدمی تھا مگر اس کو قومی عصبیت نے اکسایا اور اس نے کہا۔ اللہ کی قسم! نہ تو اسے مارے گا نہ اس کے قتل پر قادر ہے اور اگر وہ تیرے قبیلے سے ہوتا تو تو اس کے قتل کو ہرگز پسند نہ کرتا پھر اسید بن حضیر کھڑا ہوا جو سعد بن معاذ کے چچا کا بیٹا تھا اور سعد بن عبادہ سے کہا۔ تو جھوٹ کہتا ہے اللہ کی قسم، ہم اسے قتل ضرور کریں گے، تو منافق ہے اور منافقوں کی طرف سے جھگڑا کرتا ہے۔ اس طرح دونوں قبیلے اوس اور خزرج بھڑک اٹھے اور قریب تھا کہ لڑ پڑتے جبکہ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے ان کو چپ ہونے کا کہہ رہے تھے یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے اور آپ ﷺ بھی خاموش ہو گئے۔

یہ سارا دن میں نے روتے ہوئے گزارا، نہ میرے آنسو تھمتے تھے اور نہ مجھے نیند آتی، میرے والدین میرے پاس تھے اور میں دو راتیں اور ایک دن مسلسل روتی رہی، نہ میری آنکھ لگی نہ آنسو رکے اور مجھے یوں لگتا تھا کہ رو رو کر میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ ایک موقعہ پر میرے ماں باپ میرے پاس بیٹھے تھے اور میں رو رہی تھی کہ اتنے میں ایک انصاری عورت نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ میں نے اجازت دے دی، وہ بھی میرے ساتھ آ کر رونے لگی۔ ہم اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام کر کے بیٹھ گئے حالانکہ جب سے مجھ پر تہمت لگی تھی میرے پاس نہیں بیٹھے تھے اور ایک

مہینہ تک انتظار کرتے رہے تھے لیکن میرے بارے میں کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، آپ نے تشہد پڑھا پھر فرمایا۔ اے عائشہؓ! تیرے متعلق مجھے ایسی خبر ملی ہے کہ اگر تو اس سے پاک ہے تو اللہ تعالیٰ تیری پاکیزگی ظاہر کر دے گا اور اگر تو اس گناہ میں مبتلا ہے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر اور توبہ کر، اس لیے کہ جب بندہ اپنے گناہوں کا اقرار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی گفتگو ختم کی تو میرے آنسو تھم گئے اور آنکھوں میں قطرہ تک باقی نہ رہا میں نے اپنے والد سے کہا، میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں! انہوں نے کہا۔ واللہ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ کو کیا کہوں۔ پھر میں نے اپنی ماں سے کہا! میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں، انہوں نے کہا! واللہ میں نہیں جانتی کہ رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں؟ عائشہؓ نے کہا میں کم سن اور زیادہ قرآن پڑھی ہوئی نہ تھی، تاہم میں نے کہا۔ بخدا میں جانتی ہوں کہ تم نے وہ چیز سن لی ہے جو لوگوں میں مشہور ہے اور وہ تمہارے دلوں میں بیٹھ گئی ہے اور تم نے اس کو سچ سمجھ لیا ہے، اب اگر میں یہ کہوں کہ میں اس سے پاک ہوں تو تم میری بات کو سچا نہیں جانو گے اور اگر میں اسی بات کا اقرار کروں کہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے پاک ہوں۔ تو تم مجھے سچا نہیں سمجھیں گے۔ پھر میں نے بستر پر کروٹ بدل لی اور چونکہ میں اس تہمت سے پاک تھی اس لیے مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ میری پاک دامنی ظاہر کر دے گا، لیکن یہ توقع نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں وحی نازل فرمائے گا، جس کی تلاوت کی جائے گی کیونکہ میں اپنے کو زیادہ سے زیادہ یہ سوچتی تھی کہ اللہ تعالیٰ خواب میں رسول اللہ ﷺ کو کوئی ایسا منظر دکھا دے گا' جس سے اللہ تعالیٰ میری پاک دامنی ظاہر فرما دے گا۔ پھر اللہ کی قسم آپ ﷺ اس جگہ سے ہٹے بھی نہ تھے اور نہ گھر والوں میں سے کوئی باہر گیا تھا کہ آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوگئی جو نزول وحی کے وقت ہوا کرتی تھی اور اس کلام کے ثقل کی وجہ سے جو آپ پر نازل ہو رہا تھا، سردی کے دنوں میں بھی آپ کے چہرہ پر پسینہ موتیوں کی طرح بہنے لگا، جب رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت دور ہوئی تو ہنسنے لگے اور پہلا کلمہ جو آپ کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا کہ عائشہؓ! اللہ کا شکر ادا کرو، اس نے تمہاری پاک دامنی بیان کی۔ مجھ سے میری ماں نے کہا۔ رسول اللہ کے سامنے کھڑی ہو جا، میں نے کہا۔ اللہ کی قسم! میں رسول اللہ کے لیے نہیں کھڑی ہوں گی اور صرف اللہ کا شکر ادا کروں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دس آیات نازل فرمائیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ ۔۔۔ جب اللہ تعالیٰ نے میری براءت نازل فرمائی تو ابو بکر صدیقؓ نے جو مسطح بن اثاثہ پر رشتہ داری اور اس کی تنگ دستی کی وجہ سے خرچ کیا کرتے تھے، کہا کہ اللہ کی قسم! مسطح نے عائشہؓ کے بارے میں جو کچھ کہا، اس کے بعد اب میں مسطح پر کچھ خرچ نہیں کروں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''والا یاتل اولوا الفضل۔۔۔ غفور رحیم'' ابو بکر نے کہا کہ میں تو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمائے اس لیے وہ مسطح پر جو خرچہ کیا کرتے تھے،

دوبارہ شروع کر دیا اور کہا۔ اللہ کی قسم! اب میں کبھی اس کا خرچہ نہیں روکوں گا''۔

حضرت عائشہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے زینب بن جحشؓ سے بھی میرے بارے میں پوچھا تھا کہ تو اس کے متعلق کیا جانتی ہے یا تو نے کیا دیکھا ہے، تو اس نے کہا کہ میں اپنے کانوں اور آنکھوں کی حفاظت کرتی ہوں اور میں نے بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانا، حالانکہ ازواج نبی ﷺ میں وہی تھیں جو میری ہمسری کیا کرتی تھیں مگر اس تقویٰ کی وجہ سے اللہ نے (تہمت لگانے سے) بچالیا البتہ ان کی بہن حمنہ اس کے لیے لڑتی رہی، تو ہلاک ہوئی ان کے ساتھ جو ہلاک ہوئے (تہمت لگانے کی وجہ سے) ابن شہاب نے کہا کہ یہ وہ کچھ جو مذکورہ بالا جماعت رواۃ کی وساطت سے مجھ تک پہنچا۔ عروہ نے بتایا کہ عائشہؓ نے کہا جس شخص کو میرے ساتھ متہم کیا گیا وہ کہا کرتا تھا کہ اللہ کی قسم! میں نے تو کسی بھی عورت کے قابل پردہ حصہ جسم سے پردہ نہیں ہٹایا، عائشہؓ نے یہ کہا کہ بعد میں وہ اللہ کے راستے میں مارا گیا تھا۔ یہ روایت زہری سے مروی ہے اور مضطرب اور قابل استشہاد ہے۔ یہ روایت نہیں بلکہ ایک کہانی ہے۔ زہری کا کہنا ہے کہ اخبرنی عروہ، ایک کھلی تدلیس ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زہری نے عروہ سے کچھ نہیں سنا، معلوم نہیں کس نے سنا اور عروہ کی جانب منسوب کر دیا۔ یہ ساری تفصیل جو حدیث افک میں منقول ہے، زہری کی روایت کے سوا کسی اور میں نہیں ملتی اور زہری کا ارسال اور تدلیس مشہور ہے اور زہری کا ادراج بھی محدثین میں بہت مشہور ہے۔ زہری سے اوپر اس روایت کا بالکل وجود نہیں ہے بلکہ زہری کے وقت میں بھی یہ روایت عام نہ تھی صرف اس کے خاص تلامذہ کو ہی اس کا علم تھا، بعد میں زہری کی اس روایت کا تتبع اور مرتب شکل میں عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں معمر کے واسطے سے بیان کیا، وہیں سے یہ روایت آگے چلی۔ امام احمد نے اس روایت کو عبدالرزاق سے لیا اور بعد میں ان کے ہم عصر محدثین نے اسے قبول کیا۔۔۔ یہ اصل روایت زہری کی ہے۔ محمد بن اسحٰق نے بھی زہری سے اس کو روایت کیا۔ ابن ہشام نے، ابن اسحٰق سے روایت لی اور اس کو مہذب صورت میں عبدالرزاق بن ہمام نے اپنی کتاب المصنف میں بیان کیا۔ یہ شخص سیدہ عائشہؓ سے بہت ہی ناراض ہے۔ ان کی اہانت سے اسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ زہری کی روایت عبدالرزاق کے دور میں بھی عام ہوتی تو اسے اس دور کی کتابوں میں آنا چاہیے تھا لیکن اس دور میں موطاء امام مالک، امام محمد اور امام ابو یوسف کی کتب میں نہیں ملتی۔ مسند ابو داؤد طیالسی اور واقدی اور ابن سعد نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ (خاتم النبین۔ ص۔ ۷۰۵ تا ۷۰۷)

روایت میں ہے ''اٹھانے والوں نے بغیر دیکھے ہودج اٹھا کر رکھ دیا'' لیکن آخر وزن تو کچھ ہونا ہی تھا جس سے اٹھانے والوں کو عائشہؓ کی موجودگی یا غیر موجودگی کا علم ہو جاتا مگر اس کا جواب یہ گھڑا ''اس زمانہ میں عورتیں کم کھاتی تھیں، اس لیے دبلی ہوتی تھیں''۔ کمزور ہو یا جس قدر دبلی ہو آخر کچھ وزن تو

ہوتا ہے جس سے لازمی طور پر ان کے ہودج میں ہونے یا نہ ہونے کا علم ہو سکتا تھا۔

دوم: رسول اللہ ﷺ قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ میں اپنی اہلیہ میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتا اور پھر آپ ﷺ کا یہ کہنا کہ (اگر تو گناہ میں مبتلا ہو چکی ہے تو توبہ اور استغفار کر) آپ سے یہ تضاد بیانی منسوب کرنا حبیب خدا ﷺ کی توہین ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے!

سوم: یہ احتمال اس قدر بڑھا کہ آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ اور حضرت علیؓ سے حضرت عائشہؓ کے بارے میں پوچھا۔ حضرت اسامہ نے نہایت مہذب اور واضح طریقہ سے حضرت عائشہؓ کی بریت بیان کی جب کہ حضرت علیؓ نے فرمایا "یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی اور عورتیں اس کے علاوہ بھی بہت ہیں۔" دوسری عورتوں کی ترغیب دینے کا مطلب واضح ہے کہ طلاق اور دوسری شادی کا مشورہ بریت سے متضاد ہے اور یہ حضرت علیؓ کی توہین ہے کیونکہ ایسے مشورہ کی ان سے ایسی توقع غیر متوقع ہے۔

چہارم: حضرت ام رومان اور حضرت صدیقؓ حضرت عائشہؓ کے کہنے پر بھی رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیٹی کی بریت اور پاکیزگی کا کچھ نہیں کہتے گویا انہیں بھی تذبذب تھا کہ ان کی بیٹی اس گناہ میں ملوث ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ حد تو یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا اور اپنی ماں باپ اور شوہر کو مخاطب یوں ہوئیں۔ اللہ کی قسم میں جانتی ہوں کہ تم لوگوں نے میرے بارے میں یہ بات سنی تو تمہارے دلوں میں بیٹھ گئی اور تم نے سچ سمجھ لیا۔ اب اگر میں کہوں کہ میں اس سے پاک ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں پاک ہوں تو تم مجھے سچا نہیں سمجھیں گے اور اگر میں اس کام کا اعتراف کروں، جس کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے پاک ہوں تو آپ مجھے سچا سمجھیں گے۔"؟

پنجم: یہ الزام منافقین نے دھرا لیکن روایت میں حضرت عائشہؓ کی والدہ ام رومان نے عائشہؓ کی سوکنوں پر الزام لگایا۔ وہ بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہتی ہیں۔ جب کوئی عورت خوبصورت ہو، خاوند کی نگاہوں میں پسندیدہ ہو اور اس کی سوکنیں بھی ہوں تو ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف باتیں نہ بنائیں۔ دیکھئے کہ بیٹی کی طرف داری میں ازواج حبیب خدا ﷺ پر تہمت لگائی ہے جبکہ ازواج مطہرات نے عائشہؓ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

ششم: حضرت زینب بنت جحش کی بہن حمنہؓ کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی بہن کی حمایت میں تہمت کی خبر اڑائی، جبکہ اس وقت سیدہ زینبؓ کا نکاح بھی نہیں ہوا تھا۔

ہفتم: مدینہ طیبہ کو روانگی ہوئی تو آپ کے ہمراہ سات سو آدمی تھے اور چھ سو قیدی جن میں ایک سو خواتین تھیں، ساتھ آئیں۔ پانچ ہزار بکریاں، دو ہزار اونٹ غنیمت میں آئے۔ ہار کی تلاش میں پیچھے رہ

جانے کے بعد حضرت عائشہؓ اپنی پہلی جگہ پر تشریف لائیں اور سو گئیں، ذرا سوچیے ! کہ وہ تنہا پیچھے رہ گئیں لشکر چل دیا اور کسی لشکری کو ان کے پیچھے رہ جانے کی خبر تک نہ ہوئی بعید از قیاس ہے اور بے فکر ہو کر سو گئیں جبکہ انہیں اس فکرمندی میں نیند کا آنا مشکل ہے۔

ہشتم: سب سے بڑا الزام (خاکم بدہن) نبی پاک ﷺ پر آتا ہے کہ آپ ﷺ نعوذ باللہ اس قدر غافل تھے۔ کہ بیوی پیچھے رہ گئی اور انہیں خبر تک نہ ہوئی کہ سیدہ عائشہؓ کہاں ہیں؟ حالانکہ آپ کا معمول تھا کہ غزوات میں ازواج مطہرات کو آپ ﷺ خود سواری پر سوار کرتے تھے تو اس موقع پر اس عمل سے کیونکر پیچھے رہے۔ اور یہ آپ ﷺ کے عمل کے خلاف ہیں۔

نہم: منافقین نے حسان، مسطح اور حمنہ پر الزام لگایا لیکن منافقین میں سے ابن ابی کے سوا کسی کا ذکر نہیں ملتا جبکہ قرآن میں عصبہ کا ذکر ہے اور عصبہ کئی افراد پر مشتمل گروہ ہوتا ہے۔

دہم: سعد بن معاذؓ، سعد بن عبادہؓ اور اسید بن حضیرؓ، عبداللہ بن ابی منافق کے بارے میں الجھ پڑے۔۔۔ ایک منافق کی حمایت میں بول رہا ہے تو دوسرا اسے منافق اور جھوٹا کہہ رہا ہے کیا صحابہ کی شان میں یہ توہین نہیں کہ وہ اس قسم کے اخلاق کا مظاہرہ کریں۔ حد تو یہ ہے کہ اوس وخزرج دونوں قبیلے اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑنے کے قریب تھے، انا للہ وانا الیہ راجعون'' اور یہ سب کچھ آپ ﷺ کی موجودگی میں ہو رہا ہے جبکہ اس ذات کے سامنے آواز بلند کرنے سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔۔۔ لا ترفعوا اصواتکم۔۔۔ اس پر دال ہے۔

یازدہم: وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ٥ (ترجمہ) آپ پر جان وارنے والے آپ ﷺ کو ایذا پہنچانے کی سوچ بھی نہیں سکتے تو بھلا کیونکر آپ ﷺ کو ایذا پہنچا کر عذاب علیم کے مستحق ٹھہرے۔''

بازدہم: تاریخی لحاظ سے صفوانؓ بن معطل کی شرکت غزوہ مریسع میں مشکوک ہے، واقدی کے بیان کے مطابق وہ پہلی دفعہ غزوہ خندق میں شریک ہوئے اور غزوہ خندق، غزوہ مریسع کے بعد واقع ہوا ہے تو وہ بی بی عائشہؓ، کے اونٹ پر سوار کر کے کیسے لا سکتے ہیں۔؟ اس طرح سے سارا قصہ غلط ہو جاتا ہے۔ کلبی کہتا ہے کہ صفوانؓ پہلی مرتبہ غزوہ مریسع میں شریک ہوئے جبکہ کلبی واقدی سے زیادہ معتبر نہیں اور اگر کلبی کا بیان درست مان لیا جائے تو سیدنا صفوانؓ کی پہلی شرکت تھی اور نووارد آدمی کو کسی غزوہ میں اتنی اہم ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی۔

سیزدہم: زہری کا اس قسم کی روایت کو بیان کرنے کی وجہ اس کا کور باطن ہے وہ عائشہؓ اور حضرت صدیقؓ کا زبردست مخالف ہے۔ چنانچہ محققین نے اسے رجال شیعہ میں سے لکھا ہے۔ حضرت مولانا پیر

قمر الدینؒ سیالوی نے بھی ابن شہاب کے بارے اپنی کتاب میں لکھا ''اب فدک والی روایت میں ایک شخص محمد بن مسلم ہے جس کو ابن شہاب زہری بھی کہتے ہیں۔ صرف یہی راوی یہ روایت کرتا ہے اس کے ساتھ کوئی شاہد نہیں اور یہ ابن شہاب اہل تشیع کی ''اصول کافی'' میں بیسیوں جگہ پر روایتیں کرتا نظر آتا ہے اور اہل تشیع کی ''فروع کافی'' نے تو اس کی روایتوں کے بل بوتے پر کتاب کی شکل اختیار کی ہے۔ تو بھائیو! اہل تشیع کے اس قدر مشہور و معروف کثیر الروایات آدمی کی روایت سے اہل السنّت پر الزام قائم کرنا اور آئمہ صادقین کو جھٹلانا عجیب نظر و فکر ہے۔ اگر اہل تشیع کے راویوں کی روایات اہل سنت کے لیے قابل توجہ ہوتیں تو پھر بخاری ہو یا کافی کلینی، میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔'' (مذہب شیعہ ص۔۹۳) محدثین نے ایک ایک حدیث پر غور فکر کیا اور چھان پھٹک کر اس کا درجہ مقرر کیا' اسے قبول یا رد کر کے وضاحت کر دی جیسے اسی واقعہ سے متعلق بخاری شریف کی ایک حدیث سے متعلق محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس روایت میں رواۃ کا تسامح ہے حدیث یہ ہے کہ افک عائشہ صدیقہؓ کے بعد حضور ﷺ نے مسجد میں فرمایا کہ کون ہے جو ان منافقوں کے مقابلہ میں مستعد ہو حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں مستعد ہوں۔ اصحاب سیرت لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے' اصحاب سیرت متفق ہیں کہ حضرت سعدؓ کا غزوہ احزاب کے بعد بنی قریظہ کا فیصلہ کر کے انتقال ہو گیا اور صحیح یہ ہے کہ غزوہ مریسع میں افک کا قصہ ہوا وہ اس کے بعد ہوا اس لیے حضرت سعد بن معاذؓ تو افک کے وقت تھے ہی نہیں' اکثر محدثین تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذؓ کا نام اس روایت میں رواۃ کا تسامح ہے۔ (اصح السیر ۔۱۱)

اعتراض نمبر ۱۰۹

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے جدید ایڈیشن کے ایک مقالہ میں حدیثوں کے بارے سیدہ عائشہؓ پر الزام لگایا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ سیدہ عائشہؓ ایک ہزار دو سو دس حدیثوں کی راویہ ہیں مگر صحیح مسلم و بخاری میں صرف تین سو حدیثوں کو درج کیا گیا ہے۔ (امہات المومنین ۔۱۳۱)

جواب: معترض اس اعتراض سے ایک بات تو یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ تین سو احادیث قابل اعتبار اور معتبر ہیں باقی غیر معتبر۔ دوسری یہ بات کہ باقی احادیث کی کتب میں حدیثیں جو موجود ہیں نا قابل اعتبار ہیں۔ دراصل اس مقالہ میں صحیحین کی حدیثوں کی تعداد بھی درج نہیں کی گئی۔ سید سلیمان ندوی سیرت عائشہؓ میں بخاری کی ۲۲۸، اور مسلم کی ۲۳۲ حدیثوں کا ذکر کرتے ہیں جو سیدہ عائشہؓ کی روایت کی گئی ہیں۔ ان دونوں کو ملا کر احادیث کی تعداد ۴۶۰ بنتی ہے لہٰذا مقالہ نگار کا تین سو حدیثوں کا ذکر کرنا غلط ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر محدث کا جامعین حدیث کا اپنا طریقہ ہے۔ اگر ہم مختلف محدثین کے طریقہ کار میں اختلاف تلاش کرنا شروع کر دیں تو یقیناً حدیث کے انحراف کے مترادف ہو

گا۔ نیز دیگر جامعین نے سیدہ عائشہؓ کی حدیثوں کو نقل کیا ہے جیسے مسند امام احمد بن حنبل کے چھٹے باب میں ام المومنین عائشہؓ کی بیان کردہ حدیثوں کے اندراجات سے ۲۵۳ صفحات پر مشتمل کتاب بن سکتی ہے۔Nabia Abbot (نابیہ ایبٹ) سیدہ عائشہؓ کو مدینہ کے چوٹی کے محدثین جناب ابوہریرہؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کے ہم پلہ قرار دیتی ہے۔ وہ انتہائی قابل رشک یادداشت اور حافظہ کی مالکہ تھیں' جنہیں دو تین ہزار کے قریب حدیثیں یاد تھیں۔ (حوالہ بالا)

پروفیسر بیون (Bevan) کہتے ہیں ''مسلمانوں کی کتب احادیث میں سیدہ عائشہؓ سے روایت کی گئی حدیثیں معتبر ترین اور کثیر التعداد ہیں۔ ایم سلیگ سون کہتا ہے کہ ام المومنین عائشہؓ راویان حدیث میں ممتاز ترین مقام پر متمکن ہیں۔ ایک ہزار دو سو دس احادیث کی وہ راویہ ہیں، اور یہ ایسی حدیثیں ہیں جو انہوں نے براہ راست پیغمبر اسلام ﷺ کے دہن مبارک سے سماعت کیں۔ اکثر اوقات ان سے دینی اور قانونی مسائل پر مشورہ لیا جاتا تھا۔ لوگ ان کی قابلیت کے رطب اللسان تھے۔ پڑھنا لکھنا جانتی تھیں اور انہیں کئی قصائد زبانی یاد تھے۔ (حوالہ بالا۔۱۳۸۔۱۳۷)

اعتراض نمبر ۱۱۰

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ شیعہ نے اس آیت ''وقرن فی بیوتکن۔۔۔الاولی'' سے حضرت عائشہؓ پر طعن کیا ہے کہ وہ مدینہ سے مکہ کی طرف گئیں اور مکہ سے بصرہ گئیں اور وہیں پر واقعہ جمل پیش آیا' وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو گھر میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا اور گھر سے نکلنے سے منع فرمایا تھا اور حضرت عائشہؓ نے اس حکم کی مخالفت کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گھر کے اندر رہنے کا حکم مطلقاً ہے نہ گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت مطلقاً ہے اگر یہ مخالفت مطلقاً ہوتی تو نبی مکرم ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ازواج مطہرات کو حج' عمرہ اور غزوات میں اپنے ساتھ نہ لے جاتے اور ان کو والدین کی زیارت' بیماروں کی عیادت اور رشتہ داروں کی تعزیت اور شادی بیاہ میں شرکت کی اجازت نہ دیتے اور یہ تمام امور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں کہ حضرت سودہؓ بنت زمعہ کے سوا دیگر ازواج مطہرات نے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حج کیا اور حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ میں سے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا اور حدیث صحیح میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد فرمایا: تمہیں اپنی ضرورت کی بناء پر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے اس سے معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات کو گلیوں اور بازاروں میں گھومنے سے منع فرمایا ہے اور حج یا کسی اور دینی مصلحت کی بناء پر ستر اور حجاب کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا ممنوع نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ مدینہ سے مکہ حج کے لیے گئی تھیں جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت صفیہؓ بھی حج کے لیے جا چکی تھیں۔ مکہ

میں جانے کے بعد حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر سنی اور یہ معلوم ہوا کہ قاتلین عثمانؓ حضرت علیؓ کے پاس جمع ہو گئے ہیں اس پر حضرت عائشہؓ کو شدید رنج ہوا اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب مسلمانوں کی جمعیت ٹوٹ جائے گی اور فتنہ وفساد برپا ہو گا' اسی اثناء میں حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ حضرت کعب بن عجزہ اور دیگر معزز صحابہ قاتلین عثمانؓ کے برپا کیے ہوئے فتنوں کے سبب مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ چلے آئے انہوں نے دیکھا کہ قاتلین اپنے اس فعل یعنی قتل عثمانؓ پر فخر کر رہے تھے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کو برسر عام برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔۔۔صحابہ نے بصرہ جانے کی تجویز پیش کی جسے بی بی عائشہؓ نے قبول کیا' صحابہ کا خیال تھا کہ بصرہ میں بی بی کا بڑا احترام ہو گا۔حضرت عائشہؓ مصلحت وقت اور ان صحابہ کی حفاظت کے خیال سے بصرہ روانہ ہو گئیں، بی بی عائشہؓ کے ہمراہ عبداللہ بن زبیرؓ بھانجے بھی تھے اور دیگر بھانجے بھی ساتھ تھے۔(مسلم شریف۔۵۔۔۶۸۹)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں''حضرت عائشہؓ پہلی بار جو گھر سے نکلیں تو اپنے محارم کے ساتھ حج کے لیے گئی تھیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اور دوسری بار جب وہ مکہ سے بصرہ گئیں تو وہ مسلمانوں کی صلح کے قصد سے گئی تھیں اور مسلمانوں میں صلح کروانا نفلی حج سے کم نہیں ہے اور اس سفر میں جو کچھ پیش آیا وہ حضرت عائشہؓ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا اس کے باوجود ان کو اپنے سفر پر انتہائی ندامت رہی' روایت ہے کہ وہ ایام جمل کو یاد کر کے اس قدر روتی تھیں کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا بلکہ عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اور ابن منذر' ابن شیبہ اور ابن سعد نے مسروق سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ جب ''وقرن فی بیوتکن'' کی تلاوت کرتیں تو ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا کیونکہ اس آیت کو پڑھنے سے ان کو وہ واقعہ یاد آ جاتا جب دونوں طرف سے بہت سارے مسلمان شہید ہو گئے تھے۔اسی طرح حضرت علیؓ بھی اس حادثہ پر افسوس کرتے تھے کیونکہ جنگ کے بعد جب حضرت علیؓ نے طرفین کی لاشیں دیکھیں تو افسوس سے اپنے زانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے کاش! میں اس سے پہلے مر جاتا اور بھولا بسرا ہو جاتا!

ارشاد ربانی ہے''وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما' (الحجرات ۹، پارہ ۲۶)'' اگر مسلمانوں کے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرا دو۔''اس آیت کا حکم مرد وزن دونوں پر لاگو ہوتا ہے اس وجہ سے حضرت عائشہؓ مسلمانوں میں صلح کرانے کی غرض سے میدان میں اتریں لیکن تقدیر میں صلح ہونا نہ تھا اور جنگ جاری رہی۔فریقین کا خون بہتا رہا حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں جس پر حضرت عائشہؓ سوار تھیں۔۔محمد بن ابی بکر تیس عورتوں کی معیت میں ان کو بصرہ لے گئے۔۔۔ان کا اجتہاد برحق تھا اور جن آیات میں اجتہاد کر کے میدان میں آئیں اس کی وجہ سے ان شاءاللہ اجر ملے گا۔

امہات المومنین کے لیے زمانہ جاہلیت کی زیب وزینت کر کے اور بغیر پردہ کے گھروں سے نکلنے کی

ممانعت ہے جبکہ مطلق ممانعت نہیں ہے جیسے حج عمرہ کے لیے جاتی تھیں اور اپنے والدین کے گھر آنا جانا تھا اور عیادت مریض فرماتی تھیں وغیرہ وغیرہ، اس سے معلوم ہوا کہ شرعی اور دینی معاملات میں نقاب اور ستر کے ساتھ گھر سے نکلنا جائز ہے یعنی مطلقاً گھر سے نکلنے پر پابندی نہیں ہے۔ اسی طرح بصرہ کے سفر میں بھی دینی وجوہ یعنی اصلاح بین المسلمین اور قصاص عثمان کی خاطر بصرہ تشریف لے گئیں؛ جس میں کوئی حرج نہیں اور نہ کوئی مانع امر ہے۔ چنانچہ سیدہؓ نے کئی موقعوں پر فرمایا کہ ''میں اصلاح بین المسلمین کے جذبہ کے تحت آئی ہوں۔ (امیر المومنین سیدنا علیؓ۔۔۔ حکیم محمود احمد ظفر سیدنا علی۔ ۳۰۳)

دوم: ان کا یہ سفر شرعی محرم کے ساتھ تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دو بہنوئی سیدنا زبیر بن العوامؓ اور طلحہ بن عبید اللہ اور ایک بہن زادہ عبداللہ بن زبیر تھے۔ ان دونوں بہنوئیوں کی اور اولادیں بھی ساتھ تھیں۔ (حوالہ بالا) مذکورہ اعتراض تعصب و نفرت پر مبنی ہے اس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ وہ اصلاح بین الناس کے جذبہ کے تحت نکلی تھیں لیکن صلح نہ ہوسکی اور جنگ کے شعلے آسمان کو چھونے لگے اور ان شعلوں کو سبائیوں نے اتنی ہوا دی کہ وہ ٹھنڈے نہ ہوسکے، آخر جنگ شروع ہوگئی جس کا سیدہ عائشہؓ کو عمر بھر دکھ رہا۔ دراصل یہ جنگ نہ ہی بی بی عائشہؓ کی خواہش کا نتیجہ تھی اور نہ ہی حضرت علیؓ اس کے خواہاں تھے کیونکہ یہ جنگ سبائیوں نے دونوں فریقین کی مرضی کے خلاف برپا کردی تھی۔ حضرت عائشہؓ کا بیان قطعیت کا درجہ رکھتا ہے جس سے اس اعتراض کے باطل ہونے میں ذرا برابر شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ فرماتی ہیں ''میرا خیال یہ تھا کہ اپنے مقام و مرتبہ کی وجہ سے لوگوں کے مابین جنگ و قتال سے مانع ہوں گی لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ لوگوں کے درمیان قتال واقع ہوگا، اگر مجھے اس سے قبل یہ بات معلوم ہوجاتی تو میں یہاں ہرگز نہ آتی، فرماتی تھیں: لوگوں نے میری بات نہ سنی اور اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور قتال واقع ہوگیا۔'' (حوالہ بالا)

اعتراض نمبر ۱۱۱

ان (عائشہؓ) کو مطعون کرنے کے لیے ایک غلط روایت بیان کی جاتی ہے کہ حوئب کے مقام پر کتوں نے آخر بھونکنا شروع کردیا۔ طبری اور اس کی پیروی کرتے ہوئے دیگر مورخین نے نقل کیا ہے کہ مکہ سے بصرہ جاتے وقت جب لوگ ایک بستی یا چشمہ کے قریب سے گزرے جس کا نام حوءب تھا تو وہاں کے کتوں نے بھونکنا شروع کردیا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز پر سیدہ عائشہؓ نے اس جگہ کا نام پوچھا! بتایا گیا کہ اس کا نام حوءب ہے۔ اس پر آپ نے انا للہ انا الیہ راجعون پڑھا اور واپسی کا ارادہ فرمایا۔ واپسی کی وجہ دریافت کرنے پر سیدہ عائشہؓ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی ازواج کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ'' نامعلوم تم میں سے کون ہوگی جس پر حوءب کے کتے بھونکیں گے۔

جواب: حضرت عائشہؓ ''وَ قَرنَ فِی بُیُوتِکُنَّ'' کو پڑھ کر روتی تھیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ایک دن

نبی مکرم ﷺ نے بشمول حضرت عائشہؓ اپنی ازواج مطہرات سے فرمایا تم میں سے کسی ایک حوءب کے کتے بھونکیں گے، حضرت عائشہؓ نے بصرہ روانگی کے وقت یہ نہیں پوچھا تھا کہ راستہ میں مقام حوءب آئے گا یا نہیں، حتیٰ کہ راستہ میں ایک جگہ پانی کے پاس کتے بھونکنے لگے، حضرت عائشہؓ نے محمد بن طلحہؓ سے پوچھا اس پانی کا کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا: حواءب'' انہیں وہ حدیث یاد آ گئی اور انہوں نے فرمایا: مجھے واپس لے چلو اور بی بی عائشہؓ نے آگے جانے سے انکار کر دیا اور واپسی کا قصد کیا لیکن ان کے ہمراہیوں میں سے اکثریت متفق نہ ہوئی اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ پس بی بی عائشہؓ اس لیے افسوس کرتی تھیں کہ انہوں نے روانہ ہونے سے پہلے یہ معلوم کیوں نہ کر لیا کہ راستہ میں مقام حوءب آئے گا یا نہیں۔ (علامہ کا بیان ختم ہوا)۔ یہ روایت موضوع ہے صرف سیدہؓ کے اقدام قصاص میں مطعون کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے نیز طبری نے جن راویوں کا ذکر کیا ہے وہ تمام مجہول ہیں اور جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ وہ گروہ ہے جو ازواج مطہرات اور صحابہ کرامؓ کے خلاف بدگمانی کے جراثیم رکھتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مکہ سے بصرہ تک اکیس منازل ہیں لیکن ان میں سے کسی منزل کا نام ''حوءب'' نہیں اور نہ ہی کوئی بستی یا چشمہ ہے جس کا نام حوءب ہے۔ اس اعتبار سے یہ روایت موضوع ہے۔ تفصیل کے لیے تفہیم البخاری جلد ۱۴ ص ۷۰۵ دیکھیں۔ (حوالہ بالا۔ ۱۴۷)

اعتراض نمبر ۱۱۲

بعض حضرات عورت کی سربراہی جائز سمجھتے لیکن جنگ جمل کے واقعہ سے عورت کی سربراہی کی دلیل پکڑتے ہیں اور یہ جواز پیش کرتے ہیں۔

جواب: بعض علماء جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت سے عورت کی سربراہی کے جواز پر استدلال کرتے ہیں لیکن یہ استدلال بالکل باطل ہے۔ اول تو حضرت عائشہؓ امارت اور خلافت کی مدعیہ نہیں تھیں البتہ وہ امت میں اصلاح کے قصد سے مکہ سے بصرہ گئیں لیکن یہ ان کی اجتہادی خطا تھی اور اس پر وہ تا حیات نادم رہیں، ابن سعد کے حوالے سے ہے کہ جب حضرت عائشہؓ ''وقرن فی بیوتکن'' تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو'' کی تلاوت کرتیں تو اس قدر روتیں کہ دوپٹہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے بصرہ کے سفر اور جنگ جمل میں حاضری سے کلی طور پر نادم ہوئیں۔

حافظ ذیلمی ابن عبدالبر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا تم نے مجھے اس سفر میں جانے سے کیوں نہ منع کیا؟ انہوں نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ ایک صاحب (یعنی عبداللہ بن زبیرؓ) کی رائے حضرت عائشہؓ کی رائے پر غالب آ چکی تھی۔

امام حاکم نیشاپوری قیس بن ابی حازم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اپنے دل میں

سوچتی تھیں کہ انہیں ان کے حجرے میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ دفن کیا جائے لیکن بعد میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی ایک بدعت کا ارتکاب کیا ہے اب مجھے آپ ﷺ کی دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ بقیع میں دفن کر دینا چنانچہ ان کو بقیع میں دفن کر دیا گیا۔(امام حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرائط پر صحیح ہے۔

عورت کی سربراہی کا تو مذکورہ واقعہ میں کوئی ذکر نہیں ہے اور عائشہؓ سربراہی کی مدعیہ تھیں نہ ہی جنگ میں پیشوائی کر رہی تھیں۔ جنگ جمل کا تو ایک اتفاقی حادثہ تھا جو قاتلین عثمانؓ کی سازش کے نتیجہ میں واقع ہوا تھا۔ اسلام نے عورتوں کو گھروں میں رہنے کا حکم دیا ہے اور بغیر شدید ضرورت کے باہر نکلنے سے روک دیا ہے ان صاف اور صریح احکام کے ہوتے ہوئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمان عورتیں سربراہ مملکت یا اسمبلیوں کی ممبر بنیں یا ریاست کے اہم امور کی مشیر بنیں یا بیرون خانہ سماجی کارکن بنیں۔۔۔وغیرہ وغیرہ (مسلم جلد ۵،ص ۶۹۰)

اعتراض نمبر ۱۱۳

مستشرقین اور عیسائی محققین کہتے ہیں ''چونکہ بکر عربی میں کنوارے کو کہتے ہیں اور عائشہؓ پیغمبر اسلام ﷺ کی تنہا کنواری بیوی تھیں اس شرف و امتیاز کی وجہ سے باپ کا خطاب اسلام میں ابوبکر قرار پایا'' (سیرت عائشہؓ۔ص۔۲۴)

جواب: اگر غیر اصل واقعہ سے ناواقف اور بے خبر ہوں تو انہیں الزام دھرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ان کی اس حرکت پر دکھ ہوتا ہے لیکن یہ اسلام دشمنی ان کی گھٹی میں پڑی ہے اس کے علاوہ اپنوں پر بھی افسوس ہوتا ہے کہ انہیں بھی اپنے گھر کی خبر نہیں ہے۔ یا انہیں سہو ہوا ہو۔ سید امیر علی بھی The Spirite Of Islam (ترجمہ روح اسلام) میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

عرب میں کنیت عزت کی علامت تھی، حتیٰ کہ کنیت سے اصل نام گم ہو جاتا تھا۔ ابوسفیان، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ، ان سب کو جانتے ہیں لیکن ان کے نام کو خال خال جانتے ہیں۔ ابوبکر کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کنیت نہ صرف حضرت عائشہؓ کی پیدائش بلکہ خود اسلام کے ظہور سے پہلے رکھی جا چکی تھی اس کے علاوہ پھر انہیں کون بتائے کہ عربی میں کنوارے کو بکر نہیں کہتے، وہ لفظ زیر کے ساتھ ہے یعنی بِکر۔ اس طرح ابوبکرؓ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے بنو بکر بن وائل مشہور قبیلہ تھا، اس کا بکر کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی تنقیص کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ مخالفین کی باپ اور بیٹی دونوں سے نہیں بنتی اور ان کی عزت گھٹانے کے لیے طرح طرح کے باطل الزامات جعلی اور دو نمبری بیانات و اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ سوائے اس کے اور کچھ نہیں

بکر جوان اور کنواری کو کہتے ہیں یہ مذکر مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے (المنجد۔ ۶۷) قرآن مجید میں ہے قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ۔ ترجمہ: "کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی اور نہ بالکل بچی، درمیانی عمر کی ہو۔

اعتراض نمبر ۱۱۴

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں سیدہ عائشہؓ کا ہاتھ تھا۔(امہات المومنین۔۱۴۷)

جواب: اس سلسلہ میں سیدہ عائشہؓ کا اپنا جواب اس الزام سے بریت کا قطعی ثبوت ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا: خدا کی قسم! میں نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا کہ حضرت عثمانؓ کی کسی قسم کی بے عزتی ہو، اگر میں نے ایسا کبھی پسند کیا ہو تو میں بھی قتل کی جاؤں، اے عبید اللہ بن عدی (ان کے باپ علیؓ کے ساتھ تھے) تم کو اس علم کے بعد کوئی دھوکہ نہ دے۔

اصحاب رسول کے اصحاب کی تحقیر اس وقت تک نہ کی گئی جب تک وہ فرقہ پیدا نہ ہوا جس نے حضرت عثمانؓ پر طعن کیا (نعوذ باللہ) اس نے وہ کہا جو نہیں کہنا چاہیے تھا، وہ پڑھا جو نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ اس طرح نماز پڑھنی چاہیے تھی جس طرح انہوں نے پڑھی۔ ہم نے ان کاموں کو غور سے دیکھا تو پایا کہ وہ صحابہ کے اعمال کے قریب تک نہ تھے۔ (حوالہ بالا۔۱۴۵)

سیدہ عائشہؓ کے بیان میں ایک جملہ یہ ہے کہ اگر میں نے کبھی ایسا پسند کیا ہو تو قتل ہو جاؤں، اس الزام سے یہ بریت کی قطعی دلیل ہے کہ بی بی عائشہؓ نے طبعی موت سے وفات پائی اور قتل نہیں ہوئی تھیں۔ (۲) ام المومنین حضرت عائشہؓ نے جب اپنی بریت کا اظہار کر دیا تو پھر شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر فرمایا کہ اے عبید اللہ بن عدی تم کو اس علم کے بعد کوئی دھوکہ نہ دے، فرما کر وضاحت کر دی کہ اب کسی کے دھوکہ میں نہ آنا۔ اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں، کرتے رہیں گے، وہ کرتے جائیں لیکن جب تم کو یہ معلوم ہو چکا تو اس کے بعد تمہیں کسی دھوکہ میں نہیں آنا چاہیے نیز سیدنا عثمانؓ محاصرہ میں تھے، سیدہ عائشہؓ اپنے معمول کے مطابق روانہ ہو گئیں۔ صحابہ اور دوسری امہات بھی حج کی ادائیگی کے لیے تشریف لے گئیں۔ کسی کے وہم وگمان میں یہ بات نہ تھی کہ ان کو شہید کر دیا جائے گا۔ حج سے واپسی پر سید عائشہؓ کو حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ملی، آپ مدینہ جانے کی بجائے واپس مکہ چلی آئیں۔ اس قتل عثمانؓ میں سیدہ عائشہؓ کے چھوٹے بھائی باغیوں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے اس پر سبائیوں نے سیدہ عائشہؓ کی شخصیت کو داغدار کرنے کا پراپیگنڈا شروع کر دیا چنانچہ ابن سعد نے لکھا کہ شہادت کے حادثہ سے قبل اشتر نخعی نے سیدہ عائشہؓ سے پوچھا کہ اس شخص (سیدنا عثمانؓ) کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا! معاذ اللہ! میں اماموں کے امام کے قتل کا حکم دے سکتی ہوں۔

اعتراض نمبر ۱۱۵

قادیانی اور ہروہ فرقہ جو آنحضرت ﷺ کے معراج جسمانی کے منکر ہیں اپنے دعویٰ میں سیدہ عائشہؓ کی اس روایت کو دلیل بناتے ہیں جو طبری نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔

جواب: آپ ﷺ کی عمر ۵۱ سال نو ماہ کی تھی جب معراج ہوئی۔ زم زم اور مقام ابراہیم کے درمیان سے آپ ﷺ براق حضرت جبرائیل کے ساتھ پہلے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے قرب الٰہی کی انتہائی منازل میں بلایا گیا۔ اس مقام پر ملائکہ کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔ آپ ﷺ نے صبح کو جب کفار سے ذکر کیا تو بڑی شدت کا ردعمل آیا۔ وہ لوگ جو بیت المقدس سے واقف و باخبر تھے، انہوں نے بر بنائے امتحان سوالات کیے۔ آپ ﷺ نے ایک ایک سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیا۔ راستے میں کچھ کارواں تھے، آپ ﷺ نے ان کے متعلق بتایا کہ وہ فلاں وقت پر پہنچیں گے اور عین وقت پر وہ پہنچے لیکن کفار تکذیب کرتے رہے اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ بعض لوگ حضرت صدیقؓ کے پاس گئے اور ان سے کہنے لگے کہ تمہارے یہ رسول کہتے ہیں کہ وہ رات کو بیت المقدس سے ہو آئے ہیں جبکہ قافلہ اس مسافت کو ایک ماہ میں طے کرتا ہے یعنی ایک ماہ جانے میں اور ایک ماہ آنے میں لگتا ہے۔ جناب صدیقؓ نے فرمایا: کہ اگر واقعی آپ ﷺ کہتے ہیں تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، میں اس سے بھی بڑی بات کہ فرشتہ ان پر وحی لاتا ہے، کو قبول کرتا ہوں۔ بعدازاں ابوبکرؓ آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: کہ ہاں! صدیق اکبرؓ نے فرمایا: میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، یارسول اللہ! آپ ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں سچ ہے۔ اسی دن ابوبکرؓ کو صدیق کا خطاب ملا۔ اس روایت کو بیان کرنا ضروری ہے تاکہ سیدہ عائشہؓ کی روایت کو دعویٰ بنا کر پیش کرنے والوں کی اصل حقیقت ظاہر ہو سکے، جو کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہؓ معراج جسمانی کی قائل نہ تھیں۔ طبری نے اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے ''ہم سے ابن حمید نے بیان کیا، اس سے مسلمہ نے اور وہ محمد سے نقل کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوبکر کی اولاد میں سے کسی نے بیان کیا کہ سیدہ عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ حضور ﷺ کا جسد مبارک (بستر سے) غائب نہیں ہوا تھا بلکہ معراج آپ ﷺ کی روحانی طور پر ہوئی (جسمانی نہیں) یہ روایت کئی طرح سے معتبر نہیں۔ (۱) سیدہ عائشہؓ کا بیان اور دوسری طرف جماعت صحابہ کے اقوال موجود ہیں۔ (۲) قرآن کریم اور احادیث صحیحہ بھی سیدہ عائشہؓ کے قول کی مطابقت نہیں کرتی ہیں۔ (۳) سیدہ عائشہؓ کے اس بیان میں منقول ہے کہ حضور ﷺ کا جسم مبارک غائب نہیں ہوا تھا۔ سیدہ کو یہ کیسے معلوم ہوا کیونکہ ان کی تو اس وقت شادی بھی نہیں ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر روایات کے مطابق ۴ یا ۵ سال تھی۔ جو لوگ ان کی عمر زیادہ بتاتے ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ

ان کی شادی اس وقت نہیں ہوئی تھی۔(۴) بااعتبار سند روایت نہایت کمزور ہے۔

اول طبری خود معتبر شخصیت نہیں، عقیدہ کے لحاظ سے وہ شیعہ ہے۔دوم: طبری نے یہ روایت ابن حمید سے سنی، یہ رے کا باشندہ تھا اور اس کا انتقال ۲۴۸ ہجری میں ہوا، اس پر بھی علماء جرح وتعدیل نے بہت بحث کی ہے۔اس کے بارے میں اسحٰق کوسج نے کہا کہ وہ کذاب تھا۔صالح جزوہ کا قول ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں دو شخصوں سے زیادہ کوئی جھوٹ کا ماہر نہیں دیکھا، ان میں ایک محمد بن حمید مؤرخ اور دوسرا ابن شاذ الکوفی ہے۔(۵) مسلمہ الابرش بھی (مسلمہ بن الفضل) شیعہ تھا۔یحیی ابن معین، اسحٰق بن راہویہ، ابن المدینی اور دوسرے علماء جرح وتعدیل نے بڑی جرح کی ہے۔یحیٰ بن معین نے لکھا کہ وہ شیعہ تھا۔ایک راوی ابن اسحٰق ہے جس کے لیے علماء نقد کے خیالات اچھے نہیں ہیں، امام نسائی نے اس کو قوی نہیں کہا ہے۔ابوحاتم اسے ضعیف کہتے ہیں، یحیٰ اسے کذاب کہتے ہیں۔امام مالک اسے دجالوں میں سے ایک کہتے ہیں۔محمد بن حمید کو بھی رے کے محدثین کذاب سمجھتے ہیں۔ا۔فضل رازی اا۔ابوزرعہ رازی ااا۔ابوحاتم رازی۔

(۶) محمد ابن جریر کا انتقال ۳۱۰ ہجری میں ہوا اور سیدہ عائشہؓ کا انتقال ۵۵ ہجری میں ہوا گویا ۲۵۲ سال میں اس روایت کا ایک فرد کے علاوہ کسی اور کو علم نہ ہوا۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ابن اسحٰق اور عائشہؓ کے درمیان ایک راوی یعنی ابوبکر صدیقؓ کے خاندان کے ایک شخص کا نام مذکور نہیں اس لیے یہ روایت پایہ صحت سے فروتر ہے۔(سیرت النبی۔ج ۳۔ص ۴۳۳) مگر صاحب خاتم النبین کہتے ہیں کہ تین راوی غائب ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا مذہب ہے کہ وہ جسمانی معراج کی قائل تھیں۔قاضی عیاض مالکی کہتے ہیں کہ یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا ہے کہ سیدہ عائشہؓ کا یہی قول صحیح ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی معراج جسم مبارک کے ساتھ تھی۔(خاتم النبین۔ص۔۳۵۰)

مرزائی یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ''قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہ'' یہ در منثور تحت آیت خاتم النبین اور تکملہ مجمع البحار صفحہ ۸۰ پر ہے۔یہاں تلبیس کر کے باقی عبارت کو انہوں نے کاٹ دیا ہے۔یہ لفظ صدیقہؓ نے حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا'' اصلھا فی حیث عیسیٰ انه یفعل الخنزیر و بکسر الصلیب و یزید فی الحلال ای یزید فی حلال نفسه بأن و یولد له و کان لم یخروج قبل رفعه الی السماء فزاد فی الھبوط فی الخلال فسحنیز یومن کل احد من اھل الکتاب و یتیقن انه بشر و عن عائشه قولو انه خاتم الا نبیاء ولا تقولوا لا نبی بعده ۔''

اس پوری عبارت سے معلوم ہوا کہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ نے آسمان پر اٹھائے جانے سے قبل نکاح نہیں کیا تھا۔آسمان سے اترنے کے بعد نکاح کریں گے اور اولاد بھی ہوگی' یہی حال میں

اضافہ ہے خنزیر خوری اور صلیب پرستی کا خاتمہ کریں گے اور سب اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے اس لیے حضور ﷺ کو خاتم الانبیاء کہو لیکن لا نبی بعد ہ، حضرت عیسیٰ ؑ کے نزول سے انکار کی بنیاد پر نہ کہو ان کا مقصد لا نبی بعدہ کی نفی سے فقط یہ ہے کہ اس لفظ کو نزول عیسیٰ ؑ کی نفی کے معنیٰ میں استعمال کر کے مت کہو باقی جدید نبوت کی نفی میں حضرت صدیقہؓ خود نفی کی قائل ہیں کہ مسند احمد: ۶: ۱۲۹ میں انہوں نے حضور ﷺ سے مرفوعاً روایت کی ہے لا نبی بعدی من النبوۃ الا المبشرات رای الرویا الصالحۃ ۔ نیز روایت عائشہؓ مجہول الاسناد بھی ہے (مقالات افغانی: ۲۔ ۱۹۔ ۱۸)

اعتراض نمبر ۱۱۶

مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے تعلیمی اور سیاسی مقاصد کے لیے زیادہ شادیاں کیں مگر شیری جونز کا کہنا ہے کہ ان کی ساری بیویاں بہت خوبصورت تھیں اس لیے اس کے خیال میں ان شادیوں میں ذاتی وجوہات (نفسانی خواہشات) بھی ہوسکتی ہیں۔ (جیول آف مدینہ۔ ص ۳۵۷) جیسا کہ حضرت زینبؓ سے شادی کے متعلق لکھتی ہے کہ اتفاق سے ایک دن حضرت محمد ﷺ نے حضرت زینبؓ کو عریاں دیکھا تو ان سے محبت کرنے لگے اور بالآخر شادی کر لی۔ (حوالہ بالا۔ ص ۱۴۴)

جواب: شیری جونز ایک امریکی خاتون صحافی ہے جس نے اپنے ناول دی جیول آف مدینہ، ۳۵۸ صفحات پر مشتمل لکھا جو اکتوبر ۲۰۰۸ میں نیو یارک امریکہ سے شائع ہوا اس ناول کے سرورق پر ایک عورت کی تصویر ہے جو انیسویں صدی کے جرمن آرٹسٹ Max Ferinand Deredt کی خیالی پینٹنگ ہے جس میں عربی رسم و رواج کے مطابق ایک عورت کو زیورات اور پردے والی چادر کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اس پینٹنگ کو اس نے The Queen Of The Harem کا نام دیا ہے۔ آج بھی یہ پینٹنگ BRidge Man Art Library سے ۳۹Euro میں دستیاب ہے۔ اس میں ازواج مطہرات کے لیے انتہائی غیر مہذب زبان اور ان کی طرف بے بنیاد باتیں منسوب کی ہیں۔ مذکورہ اعتراض اسی صحافی کا ہے۔ جواب ملاحظہ فرمایئے۔

ج: نفسانی خواہشات کا زمانہ عموماً پندرہ سال سے پچاس تک ہوتا ہے آپ نے پچیس سال کی عمر تک اپنی خواہشات پر بے مثل ضبط کیا اور پچیس سال تک مجرد رہے اور صاف شفاف زندگی بسر کی آپ کے مخالفین بھی آپ کی عفت و پاک دامنی پر انگلی نہ اٹھا سکے بلکہ اس معاشرہ میں جہاں ہر قسم کی برائی موجود تھی پاک دامن رہے اور قوم انہیں الصادق والامین کے القاب سے پکارتی تھی۔ پچیس سال کے بعد اپنے سے عمر میں پندرہ سال بڑی خاتون سے شادی کرتے ہیں اور پچاس سال تک اسی خاتون کے ساتھ زندگی کے دن بسر کیے کسی اور عورت سے شادی نہیں کی۔۔۔ کفار نے آپ ﷺ کو چند پیش کشیں

گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ قریش کی جن عورتوں کو آپ پسند کریں، ہم آپ کی پسند کی دس عورتیں آپ کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہیں لیکن آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں تو آپ نے فرمایا: ''اگر تم میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تو میں اپنے مشن سے باز نہیں آؤں گا۔ کیسا سنہری موقع تھا اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کر سکتے تھے لیکن آپ کو شادیوں کی خواہش نہیں تھی صرف اور صرف آپ کا کام توحید کی تبلیغ تھا' جس کے لیے آپ ﷺ مصائب و آلام برداشت کرتے رہے۔ پچاس سال تک تنہا خدیجہؓ زوجہ رہیں، بعد ازاں ۵۴ سال تک حضرت سودہؓ زوجہ رہیں یعنی ایک وقت میں صرف ایک بیوی حرم میں موجود تھی اس کے بعد ڈھلتی عمر میں ایسا کون سا طوفان آ جاتا ہے کہ آپ زیادہ شادیاں اور وہ بھی صرف خوبصورت عورتوں کی خواہش میں رچاتے ہیں۔ شادیوں کا سلسلہ اس وقت چل نکلا جب اقتدار ہاتھ میں تھا آپ واحد فرمانروا تھے۔ آپ خواہش مند ہوتے تو آپ کے صرف ایک اشارے پر حسین عورتوں کو حاضر کیا جا سکتا تھا لیکن نہیں نہیں وہ اللہ کا رسول ﷺ ہے اسے توحید کا پیغام پہنچانا ہے دکھی انسانیت کا دکھ اور درد بانٹنا ہے یہی وجہ ہے کہ سوائے ایک زوجہ محترمہ کے باقی سب ازواج بیوہ یا مطلقہ تھیں اور محض ان کی تالیف قلبی کے لیے ان کا سہارا بنے اور حرم میں داخل فرمایا۔

اعتراض نمبر ۱۱۷

حضرت عائشہ صدیقہؓ دعا کرتی تھیں کہ ان کی شادی حضرت محمد ﷺ سے نہ ہو کیونکہ وہ حضرت صفوان بن معطلؓ سے شادی کرنے کی خواہاں تھیں اور حضرت عائشہ صدیقہؓ شادی کے بعد بھی حضرت صفوانؓ کے ساتھ وقت گزارتی تھیں، اس لیے لوگ انہیں فاحشہ کہتے تھے (العیاذ باللہ) ''حوالہ بالا۔ ص ۱۵۵۔۸۵۔۳۵۔۴۔۳)

جواب: نبی کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں ارشاد ربانی ہے'' النبی اولٰی با لمو منین من انفسھم وازواجہ امھاتھم ''(نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ حدیث میں آتا ہے'' بے شک اللہ تعالیٰ انکار فرماتے ہیں مگر یہ کہ جن عورتوں سے میں شادی کروں یا جن مردوں سے میں اپنی بیٹیوں کی شادی کروں وہ جنتی ہوں'' (امہات المومنین ص۔ ۲۷) حضرت مریم پر الزام لگا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹے حضرت عیسیٰؑ (جو بھی چند دن کے بچے تھے) کے ذریعے ان کی بریت فرما دی۔ حضرت یوسفؑ پر تہمت لگی تو ایک چھوٹے بچے نے ان کی بریت کی گواہی دی۔ جب حضرت عائشہؓ پر تہمت لگی تو قرآن مجید نے نبی کی ازواج کو مومنوں کی مائیں کہہ کر اس الزام کا قلع قمع کر دیا کیونکہ اسلام نے روحانی یا خونی رشتہ سے کوئی آدمی اپنی ماں سے نکاح نہیں کر سکتا تو بھلا کوئی مسلمان اپنی ماں سے ناجائز تعلقات جوڑ سکتا ہے۔؟

ابن زید بیان کرتے ہیں کہ جب مومن اپنی ماں سے بدکاری نہیں کرتا اور نہ ماں اپنے بیٹے سے تو حضرت عائشہؓ سارے مومنوں کی ماں ہیں لہٰذا ان کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔ (تفسیر کبیر سورہ نور زیر آیت نمبر ۱۲)

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ کسی نبی کی بیوی نے کبھی زنا نہیں کیا۔ (بحر محیط۔ ج ۱۰۔ ص ۲۱۵ سورہ التحریم زیر آیت نمبر ۱۰)۔ بیوی کا بدکاری کرنا ایسا عیب ہے جس سے کفار بھی نفرت کرتے تھے اور یہ ایک فطری امر ہے کہ کوئی بھی اپنی بیوی کی بدکاری پسند نہیں کرتا لہٰذا حضرت نوحؑ اور حضرت لوط علیھم السلام کی بیویاں اگرچہ کافرہ تھیں مگر وہ بھی اس اخلاقی جرم میں ملوث نہیں تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی بیویوں کو انبیاء کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی زنا سے محفوظ رکھا ہے۔ جب کسی نبی کی بیوی نے بدکاری نہیں کی تو امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی زوجہ مطہرہ کی پاک دامنی کیسے عیب دار ہو سکتی ہے؟ (تفسیر روح المعانی سورہ النور زیر آیت نمبر ۱۷)

نبی کریم ﷺ نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر اپنی اہلیہ کی برات کا حلف اٹھا کر بیان کیا اور مفتری سے انتقام لینے کا حکم دیا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی پاک دامنی پر یقین تھا ورنہ آپ حلف نہ اٹھاتے اور نہ ہی مفتری کو سزا کا سزاوار ٹھہراتے۔ امام رازی لکھتے ہیں کہ اس تہمت کے واقعہ سے پہلے نبی ﷺ کو معلوم تھا کہ حضرت عائشہؓ فحش کاموں کے اسباب و محرکات سے بالکل محفوظ تھیں اور نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ ہونا ہی اس کا کافی ثبوت ہے کیونکہ انبیاء کرام کفار کو دین حق کی دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اس لیے واجب ہے کہ انبیاء کرام میں کوئی ایسا عیب نہ ہو جو لوگوں کو متنفر کرے اور جس شخص کی بیوی بدکار ہو اس سے لوگ بہت زیادہ نفرت کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر سورہ النور زیر آیت نمبر ۱۱)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے کبھی بے حیائی کا کام نہیں کیا، یہ حدیث حضور ﷺ سے سن کر فرما رہے ہیں، لہٰذا یہ حدیث حکماً مرفوع ہوئی۔ اس حدیث میں ہے کہ کسی نبی کی بیوی بدکار نہیں ہو سکتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کی بیوی بدکار ہو وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو ذلت و رسوائی سے محفوظ فرمایا ہے۔ حضرت بی بی عائشہؓ کا محمل صفوان اونٹنی کو ٹھیک دوپہر کے وقت تمام لشکر کے سامنے آتے ہیں اور آپ ﷺ بھی اس موقع پر موجود ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صحابہ کرامؓ میں کسی بدگمانی کا نشان تک نہ تھا، اگر بدنامی کا ڈر ہوتا تو صفوان کبھی لشکر میں نہ آتے بلکہ بی بی عائشہؓ کو بوقت شب لاتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ صفوان بن معطلؓ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں نے

کسی عورت کا پردہ نہیں اٹھایا یعنی (اس نے کبھی کسی عورت سے جماع نہیں کیا)۔
امام قسطلانی شارح بخاری شریف فرماتے ہیں'' یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ صفوان نامرد تھے اوران کا آلہ تناسل ناکارہ تھا اور وہ ریشہ اور کپڑے کی دھجی کے مانند تھا، اسی لیے نبی مکرم ﷺ نے صفوان کے متعلق فرمایا'' ماعلمت علیہ الا خیرا۔
قاضی ابن العربی کہتے ہیں کہ صفوان میں قوت مردمی نہ تھی اور نہ ہی وہ کسی عورت سے کبھی وطی کے مرتکب ہوئے ، ان کے متعلق واقعہ کے دوران معلوم ہوا کہ وہ عورتوں کے جماع پر قدرت نہیں رکھتے۔ یہ قاعدہ صحت ہے کہ خاص بیماریوں کا علم خاص دوستوں یا اپنے قریبی رشتے داروں کو ہوتا ہے، جب صفوان کی رازداری ان کے دوستوں سے مخفی نہ تھی تو بارواج زمانہ آپ ﷺ سے کیسے پوشیدہ ہوسکتی ہے۔ یہ قرینہ بتاتا ہے کہ آپ ﷺ خود بی بی عائشہؓ کے واقعہ میں شکی نہ تھے، بلکہ یقین رکھتے تھے۔ بخاری شریف میں جہاں یہ روایت مروی ہے وہاں حضور ﷺ نے قبل از آیات بی بی عائشہؓ کی صفائی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمائی: ''فو اللہ ماعلمت علی اھلی الا خیرا'' ترجمہ: باخدا میں اپنے اہل پر سوائے خیر کے کچھ نہیں جانتا۔

اعتراض نمبر ۱۱۸

بعض کہتے ہیں کہ ۵۴۔۵۵ سال کی عمر میں ۹ سال کی لڑکی سے شادی کرنا اور ۱۸ سال کی عمر میں بیوی چھوڑ جانا جبکہ قرآن مجید کی رو سے اس کا نکاح ثانی بھی کسی شخص سے نہ ہوسکتا ہو یہ ظلم نہیں ہے۔۔۔ معاذ اللہ؟
جواب: اس اعتراض کے پہلے حصہ کا جواب پیچھے تفصیل سے دیا گیا ہے پھر بھی ایک حوالہ پیش خدمت ہے۔ ابن کثیر اور دیگر مورخین نے لکھا ہے کہ بوقت ہجرت حضرت اسماءؓ کی عمر ۲۷ سال تھی وہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن تھی۔ بی بی عائشہؓ اپنی بہن اسماءؓ سے عمر میں دس سال چھوٹی تھیں اور تہتر ہجری میں ان کا انتقال ہوا بوقت انتقال حضرت اسماءؓ کی عمر سو سال تھی اس حساب سے اگر سو میں سے تہتر سال نکال دیں تو ستائیس سال بچتے ہیں یعنی حضرت اسماءؓ کی عمر ہجرت کے وقت ستائیس سال تھی اور وہ اپنی بہن عائشہؓ سے دس سال بڑی ہیں اس حساب سے حضرت عائشہؓ کی عمر ہجرت کے وقت سترہ سال ہوئی اس کے دو سال بعد رخصتی ہوئی اس وقت ان کی عمر انیس سال بنتی ہے۔
جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ چھوڑ دیا اور قرآن مجید کی رو سے نکاح ثانی کسی شخص سے نہیں ہوسکتا یہ ظلم ہے۔ حدیث شریف میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اے عائشہؓ! مجھے خواب میں تم کو دو دفعہ دکھایا گیا اور کہا گیا کہ یہ آپ کی بیوی ہے۔ (بخاری شریف کتاب النکاح ۳۔۶۸)
اور ترمذی باب المناقب میں ہے کہ جبریل رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت عائشہؓ کی تصویر سبز

ریشم میں لائے اور آپ ﷺ سے کہا کہ یہ دنیا و آخرت میں آپ کی بیوی ہیں۔
یہ انتخاب آپ ﷺ کا نہ تھا بلکہ مالک حقیقی کی طرف سے تھا وہ ذات علیم وخبیر ہے اسے علم ہے کہ اس بیویؓ سے انسانیت کی تعمیر و ترقی میں کیا عظیم خدمات لینی ہیں اور اس کے بیوہ ہونے کا اختیار بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے تو یہ کیسے ظلم ہوسکتا ہے ہاں البتہ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ بی بی عائشہؓ کو طلاق دے دیتے اور وہ ساری زندگی بیوگی میں گزار دیتی تو ظلم ہوتا کیونکہ وہ قرآن مجید کی رو سے کسی اور شخص سے شادی نہیں کر سکتی تھیں مگر آپ ﷺ نے انہیں طلاق نہیں دی اور مدت العمر ازواج مطہرات کی صف میں شامل رہیں اور ام المومنین کے اعزاز سے سرفراز رہیں۔ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مخالفین سے پوچھیں کہ کیا انہیں طلاق ہوئی تھی تو اس کا جواب صرف وہ یہی دے سکتے ہیں کہ نہیں، تو پھر کس منہ سے اسے ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں بیوہ بنایا کیونکہ موت وحیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے زندگی عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے موت دے دیتا ہے اسے علم ہے کہ کس شخص کو کب موت آئیگی اور فلاں شخص نے کتنی دیر بقید حیات دنیا میں رہنا ہے۔ نوشتہ خداوندی کے مطابق آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ظاہری زندگی کی مدت پوری کی۔ ازاں بعد مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دے جنہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ یہ الزام اللہ تعالیٰ پر بھی لگا رہے ہیں اور اس کی قدرت کا بھی انکار کر رہے ہیں۔ بیوگی کی زندگی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے اور آنحضرت ﷺ نے بی بی عائشہؓ کو نہ زبردستی بیوہ بنایا اور نہ تنہا چھوڑا۔ آپ ﷺ کے حرم میں حضرت عائشہؓ کے علاوہ بھی بیوہ خواتین موجود تھیں ان سب خواتین کی بیوگی پر کسی کو ترس نہیں آتا، ان کے بارے کوئی بات نہیں ہوتی، ان پر ظلم ہوا کسی کو نظر نہیں آتا اور صرف بی بی عائشہؓ کے بیوہ ہونے کا قصہ کیوں اچھالا جاتا ہے؟ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ محض دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بجز اجتماعی فوائد کے مقابلہ میں صرف اپنے ذاتی نقصان کی اہمیت اتنی نہیں ہوتی بلکہ کم ہوتی ہے مثال کے طور پر ان کے بیوہ ہونے سے خود ان کو اور ان کے خاندان یا کچھ رشتہ داروں کو نقصان محسوس ہوا ہوگا ساری دنیا کو دکھ نہیں ہوگا جب کہ اس کے برعکس ان کے بیوہ ہونے کی جتنی عمر ہے اور اس میں جو خدمات سرانجام دیں، اس دور سے لے کر رہتی دنیا تک کے لیے انسانیت کے لیے فائدے ہی فائدے ہیں نقصانات نہیں ہیں مثلاً ان سے مروی ۲۲۱۰ حدیثیں اسلام کا بیش بہا خزانہ ہیں جو ان کے وسیلہ جمیلہ سے قیامت تک کے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہیں اور یہ فیض بٹتا رہے گا اور لوگ فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ دوسری طرف عیسائی حضرات کس منہ سے یہ اعتراض کرتے ہیں جن کے ہاں اجتماعی مفاد کے بغیر بے مقصد مجرد زندگی گزارنا راہبوں اور راہبات کے لیے باعث فخر ہے بلکہ مذہبی خدمات بجالانے والوں کے

لیے لازم ہے۔ جہاں حضرت عائشہؓ ان اوصاف سے بدرجہ اتم متصف تھیں جن سے شوہر گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فرمانبرداری، نکتہ دانی، مزاج شناسی، وفاداری اور علمی تبحر کے عناصر خمسہ کا حسین امتزاج تھیں۔ مشہور شعراء کے کئی قصائد یاد تھے۔ تقریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتی۔ مذہبی علم کا یہ عالم کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کی اولاد نہ تھی اور حضرت اسماءؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو گود میں لے لیا اور ام عبداللہ کنیت تھی (وہ عبداللہ کی وجہ سے تھی)

اعتراض نمبر ۱۱۹

اتنی کم سن لڑکی سے نکاح (معاذ اللہ) نفس پرستی نہیں ہے۔؟

جواب: ہم الزام لگانے والوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایسا شخص نفس پرست ہو سکتا ہے جس نے ۲۵ سال مجرد گزار دیئے پھر ۲۵ سال کی عمر میں شادی کر کے اس واحد خاتون سے ۵۰ سال بتا دیئے ان کی وفات کے بعد ایک اور سن رسیدہ خاتون حضرت سودہؓ سے نکاح کر کے انہی کے ساتھ چار پانچ سال بسر کئے اس وقت بھی حضرت سودہؓ آپ ﷺ کی تنہا بیوی تھیں۔ جبکہ اس معاشرہ میں حسین و جمیل اور باکرہ لڑکیوں کی کمی نہ تھی اور یہ بھی نہ تھا کہ آپ ﷺ کو رشتہ نہ مل سکتا بلکہ آپ ﷺ جس سے چاہتے شادی کر سکتے تھے اور ان لڑکیوں کے والدین فخر محسوس کرتے اس کے باوجود ایک باکرہ عورت کے سوا جتنی شادیاں بھی کیں، بیوہ یا مطلقہ تھیں۔ معترضین یہ بتائیں کیا یہی نفس پرستی، شہوت رانی اور نفسانی خواہش ہے۔ کاش وہ آپ ﷺ کی شادیوں کی حکمتوں کو سمجھ سکتے جن سے انسانیت کو تا قیامت فائدے ہی فائدے حاصل ہوتے رہیں گے۔ آپ ﷺ کی شادیوں کے تعلیمی، تشریعی، سماجی، سیاسی، اجتماعی اور تالیف قلبی وغیرہ کے مقاصد تھے ان خواتین کی بدولت معاشرہ میں ہمہ گیر انقلاب برپا ہوا۔ آپ ﷺ کے حرم میں گیارہ ازواج تھیں جن میں سے ایک مطلقہ (زینب بنت جحش) ایک کنواری (حضرت عائشہؓ) اور باقی تمام بیوائیں تھیں۔ آنحضرت کی بیوہ یا مطلقہ زوجات مطہرات کی شرح فی صد ۹۱ ہے اس فی صد کے ہوتے ہوئے الزام دھرنے والوں کو ظالم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

رسوائے زمانہ، گستاخ رسول آریہ سماج لیڈر ''راج پال'' جس نے پیغمبر اسلام ﷺ سے عصبیت کے اظہار کے لیے بدنام زمانہ کتاب شائع کی جس کی پاداش میں وہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا وہ بھی آپ ﷺ کی عائلی زندگی کے بارے اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کہتا کہ ''محمد (ﷺ) کا پہلا نکاح ۲۵ سال کی عمر میں ہوا یہاں تو آریہ سماجوں کو ماننا پڑے گا کہ محمد (ﷺ) نے شاستر کے متعلق زندگی کا پہلا حصہ مجرد رہ کر گزارا۔ وہ برہم چاری تھے اور ان کا حق تھا کہ شادی کریں۔ معیار خانہ داری کے پچیس سال وہ ایک ہی بیوی پر قانع رہے اور وہ بھی دو خاوندوں کی بیوہ جو نکاح کے وقت چالیس سال اور انتقال کے وقت ۶۵ سال کی تھیں اس بوڑھی عورت سے اس جواں مرد نے نباہ کیا، یہ بات محمد (ﷺ) کی پاکیزہ زندگی پر دلالت

کرتی ہے۔(نبی ﷺ کی خانگی زندگی۔۱۴)

اعتراض نمبر ۱۲۰

ازواج مطہرات نبی کریم ﷺ سے مطمئن نہیں تھیں اور وہ آپ ﷺ کو ضدی اور سخت مزاج بھی کہتی تھیں۔(جیول آف مدینہ۔ص ۱۳۲)

جواب: سورہ آل عمران: ۱۵۹ آیت کا ترجمہ ''پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں اور اگر ہوتے آپ تندمزاج، سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے، تو آپ درگزر فرمایئے ان سے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لیے اور صلاح مشورہ کیجئے ان سے اس کام میں اور جب آپ ارادہ کرلیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے''۔اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے قلب اقدس کو اپنی رحمت سے شفقت والا بنایا اگر آپ ﷺ درشت خو ہوتے تو لوگ پروانہ وار آپ ﷺ کے گرد جمع نہ ہوتے۔حضرت انسؓ نے آپ ﷺ کی دس سال خدمت کی، ایک دن بھی ایسا نہ آیا جس دن آپ ﷺ نے ان سے سختی کی ہو بلکہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں دس سال رہا آپ ﷺ نے کسی دن مجھے اف تک نہیں کہا۔یہ سلوک سب کے ساتھ تھا جس میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات بھی شامل ہیں۔فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا جس سے مدینہ میں عام مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہوگئی اس پر ازواج مطہرات نے بھی نان ونفقہ بڑھانے کی درخواست بارگاہ نبوی میں پیش کی یہ بات گراں گزری اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اے نبی! اپنی ازواج مطہرات سے فرمادیجئے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی آرائش کی خواہاں ہو تو آؤ میں تمہیں مال ومتاع دے دوں اور پھر بڑی خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں'' جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے فرمایا میں آج تم سے ایک بات پوچھنے والا ہوں تم اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے اس کا جواب دینا، اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھیں تو اس کے جواب میں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا ''کیا میں اس بات میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ (میرا فیصلہ بالکل واضح ہے) میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دار آخرت کو منتخب کرتی ہوں''۔مسلم شریف کتاب الطلاق باب ۵) باقی تمام ازواج نے بھی یہی جواب دیا اگر حضرت عائشہ کے دل میں بقول شیری جونز حضرت صفوانؓ سے شادی کرنے کی خواہش تھی تو طلاق لینے کا یہ بہترین موقع تھا مگر سبحان اللہ! ایک تو ازواج مطہرات کو نبی کریم ﷺ سے محبت تھی دوسرا آپ ﷺ کے حسن اخلاق اور بہترین سلوک کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اگر آپ ﷺ درشت خو ہوتے تو واقعی وہ کنارہ کش ہو جاتیں مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے سوا کبھی کسی کو نہیں مارا، نہ کبھی کسی عورت پر ہاتھ اٹھایا اور نہ کبھی کسی خادم کو مارا۔ (مسلم شریف کتاب الفضائل)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا لیکن جب کوئی اللہ تعالیٰ کی حدود کی خلاف ورزی کرتا تو آپ ﷺ اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے انتقام لیتے۔ (بخاری شریف۔ کتاب الادب)

آپ ﷺ کا فرمان ہے ''یعنی جو سب سے زیادہ خوش خلق ہو اپنے اہل عیال کے ساتھ سب سے اچھے سلوک والا ہو وہ سب سے زیادہ ایمان میں کامل ہوگا۔ (سیرت مصطفیٰ جان رحمت۔۵۔۱۵۰)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے اہل کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی صراط مستقیم میں فرماتے ہیں حضور اقدس ﷺ جب رات کو مکان میں تشریف فرما ہوتے ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ جاگتے سن لیتے اور سوتے نہ جاگتے۔

صحیح مسلم کتاب النکاح، حضرت انسؓ ام المومنین صفیہؓ وام المومنین زینبؓ سے روایت کرتے ہیں ''حضور اقدس ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات پر گزرنا شروع کیا ان میں ہر ایک کو سلام فرماتے اور سلام علیکم کے بعد مزاج پرسی کرتے۔ (سیرت مصطفیٰ جان رحمت۔۳۔۱۵۱)

ترے خلق کو حق نے عظیم کہا تری خلق کو حق نے جمیل کہا
کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہو گا شہا ترے خالقِ حسن ادا کی قسم

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ترجمہ: اور محمد ﷺ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

آپ ﷺ کے اخلاق واوصاف کی قریش شہادتیں دیتے ہیں اور وہ ایک حرف بھی آپ ﷺ کے اخلاق اور صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے۔ مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے خلیق اور شفیق ہونے پر مہر ثبت کر دی ہے۔ دراصل یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ رہی تھی اور کفار و مشرکین کے اوہام اور جاہلانہ رسومات مٹا رہی تھی۔ مسلم شریف میں ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ ﷺ نے دے دیں اس پر آپ کے فیاضانہ رویہ کا اثر اس قدر ہوا کہ وہ مشرف با اسلام ہو گیا اور واپس اپنے قبیلے میں جا کر کہتا ہے لوگو! مسلماں ہو جاؤ کیونکہ محمد ﷺ اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔ وہ ہستی جو دوسروں کے ساتھ اس قدر پیار کرے تو یہ ناممکن ہے اور بداہتاً غلط ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھر والوں کے لیے سخت مزاج تھے۔

ام المومنین حضرت جویریہؓ

ان کا اصل نام برہ تھا۔ بنی مصطلق کے قبیلہ کے سردار حارث کی بیٹی تھیں۔اس قبیلہ کے اہل مکہ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ برہ کی شادی مسافع ابن صفوان سے ہوئی۔ دونوں یعنی مسافع اور حارث اسلام کے سخت ترین دشمن تھے۔حارث مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں سرگرم تھا۔اس سے قبل کہ وہ مدینہ پر چڑھ دوڑتا، اسلامی لشکر روانہ ہوا اور مریسع (ایک آبادی کا نام) میں قیام کیا۔اہل قبیلہ نے تیر برسائے دوسری طرف مجاہدین نے بھی جوابی کارروائی کی۔ بالآخر یک بارگی حملے سے مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے۔ان کے دس آدمی مارے گئے،جن میں برہ کا شوہر مسافع ابن صفوان شامل تھا۔غنیمت میں دو ہزار اونٹ، پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں اور چھ سو مرد، عورتیں اور بچے قیدی ہوئے۔قبیلہ کے سردار حارث کی بیٹی برہ بھی قیدیوں میں شامل تھی۔غنیمت کی تقسیم میں برہ، حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئیں۔ برہ نے ثابتؓ کو پیشکش کی کہ رقم لے کر مجھے آزاد کر دیں۔انہوں نے کہا: تم مجھے نو اوقیہ سونا دے دو،تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔حضرت ثابتؓ نے وعدہ کر لیا۔اس غرض سے وہ پہلے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔آپ ﷺ نے دریافت کیا کون ہو،اور کیسے آنا ہوا؟ میں حارث بن ضرار کی بیٹی ہوں جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا، قید ہو کر آئی ہوں اور ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آگئی ہوں،انہوں نے نو اوقیہ سونا میں مکاتبہ کیا ہے۔میں ادا نہیں کر سکتی، میری اعانت فرمائیں تاکہ مکاتبت ادا کر سکوں۔ آپ ﷺ نے مکاتبت کی رقم خود ادا کر دی اور برہ کو آزاد کر دیا۔آزاد ہو کر انہوں نے عرض کی کہ میں آپ کی خدمت میں رہنے کو فوقیت دیتی ہوں، والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔جب آپ کو علم ہوا تو آپ نے حارث کو برہ کے نکاح کا پیغام بھیجا۔انہوں نے قبول کر لیا اور چار سو درہم حق مہر پر اپنی بیٹی آپ ﷺ کی زوجیت میں دے دی۔آپ ﷺ نے نام برہ بدل کر جویریہ رکھ دیا۔

اعتراض نمبر ۱۲۱

ابن اسحٰق نے کہا مجھ سے محمد بن ابی جعفر نے بواسطہ عروہ ابن زبیر، حضرت عائشہؓ سے یہ روایات بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی مصطلق کے قیدیوں کی جب تقسیم کی تو جویریہ بنت حارث، حضرت ثابت بن قیس بن شماش یا ان کے عم زادہ کے حصہ میں آئیں۔انہوں نے اپنے مالک سے کتابت کی درخواست کی۔ جویریہ بہت حسین وجمیل وملیح تھیں، جو انہیں دیکھتا، اس کے دل پر قابض ہو جاتیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں کہ ان سے کتابت کے سلسلے میں مدد حاصل کریں۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: خدا کی قسم! میں نے انہیں اپنے حجرہ کے دروازہ پر دیکھا، مجھے کراہت ہوئی، میں سمجھ گئی کہ جو(

حسن و جمال) میں نے دیکھا ہے۔رسول اللہ ﷺ بھی دیکھیں گے۔ بہر حال جویریہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ! میں حارث ابن ضرار کی بیٹی ہوں جو اپنی قوم کے سردار ہیں، جو مصیبت مجھ پر آپڑی اس سے آپ باخبر ہیں۔ثابت بن قیس کے عم زادہ کے حصے میں پڑی ہوں۔میں نے انہیں کتابت پر راضی کیا ہے۔ یہ مکاتبت نو اوقیہ سونا پر کی گئی ہے۔اب میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں کہ اپنی کتابت میں آپ سے مدد لوں۔آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے ساتھ اس سے بہتر برتاؤ کیا جائے تو پسند کرو گی؟ جویریہ نے پوچھا: وہ کیا یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ میں تمہاری طرف سے بدل کتابت ادا کر دوں اور تم سے رشتہ ازدواج قائم کرلوں۔ جویریہ نے جواب دیا جی ہاں! یا رسول اللہ ﷺ (میں راضی ہوں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے کرلیا۔(ابن ہشام۔جلد دوم۔ص۔۳۵۷۔۳۵۶)

جواب:

حسن ہے یا کہ میرا حسنِ نظر
تیری رعنائیاں نہیں جاتیں

بعض کہتے ہیں کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے یعنی کسی آنکھ کو کوئی صورت اتنی بھا جاتی ہے کہ دیکھنے والا اس پر فریفتہ وشیدا ہو جاتا ہے جب کہ وہی صورت کسی دوسری آنکھ کو سرے سے متاثر نہیں کرتی (سیدالوریٰ جلد سوم۔۱۸) اوپر کی روایت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے بجز اس کے اگر یہ ہوتا کہ جو انہیں کوئی دیکھتا اس کے دل پر قابض ہو جاتیں، تو حضرت ثابتؓ یا ان کے عم زادہ کبھی کتابت کے لیے تیار نہ ہوتے مگر ادھر معاملہ اس کے برعکس ہے کہ وہ تو جویریہؓ کی درخواست پر کتابت کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ یقیناً یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔

(۲) آپ ﷺ نے تعلیمی تشریعی، سیاسی وسماجی مقاصد وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے شادیاں کیں لیکن ان میں جذبہ ترحم اور تالیف قلبی غالب تھا۔آپ محروم اور مصائب میں گھری خواتین کی دستگیری کرتے ہیں۔ یہ امر بالیقین ثابت شدہ ہے کہ آپ ﷺ نے کوئی ایک شادی بھی ایسی نہیں کی جو حسن جمال سے متاثر ہو کر انجام پذیر ہوئی ہو۔اگر خوبصورت عورت کا حصول ہی ہوتا تو عرب میں سینکڑوں خوبصورت دوشیزائیں تھیں اور کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی مگر آپ ﷺ نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔حد تو یہ ہے کہ کفار مکہ نے خوبصورت اور حسین وجمیل خواتین کی پیشکش کی تھی لیکن آپ ﷺ نے یکسر ٹھکرا دیا تھا۔

مولانا شبلی نعمانی کہتے ہیں۔''اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہؓ کا باپ عرب کا رئیس تھا۔ حضرت جویریہؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان اس سے بالاتر ہے، آپ ﷺ اس کو آزاد کر دیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ

کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ یہ معاملہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ حارث نے جا کر جویریہؓ سے کہا کہ محمد ﷺ نے تیری مرضی پر رکھا ہے۔ دیکھنا! مجھے رسوا نہ کرنا۔ انہوں نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے شادی کر لی''۔ یہ روایت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن مندہ سے نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن سعد نے بھی یہ روایت کی ہے۔ طبقات ابن سعد میں یہ روایت بھی ہے کہ حضرت جویریہؓ کے والد نے ان کا زرفدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہو گئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا (سیرت النبی۔ ا۔۲۴۳) ابن اسحٰق کی روایت کے اشکال جاتے رہے۔

سر ولیم میور کہتا ہے ''جونہی شادی کی بازگشت چار دانگ عالم میں سنی گئی تو لوگ کہتے تھے کہ اب بنی مصطلق ان کے رشتہ دار بن رہے ہیں، اس لیے بنی مصطلق کے بقیہ قیدیوں کو حضرت جویریہؓ کے حق مہر میں آزاد کر دیا جائے اور اس سے بڑھ کر خوش آئند بات یہ تھی کہ حضرت عائشہؓ نے آنے والے دنوں میں فرمایا کہ اس کے بعد کوئی عورت ان لوگوں کے لیے سیدہ جویریہؓ سے بڑی نعمت نہ ہوگی''۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''میں نے جویریہؓ سے زیادہ کسی عورت کو اپنی قوم کے حق میں بابرکت نہیں دیکھا، جس کی وجہ سے ایک دن میں ایک سو گھرانے آزاد کیے گئے۔'' (امہات المومنین۔۲۶۴)

اہم نکتہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی عورت جویریہؓ سے زیادہ اپنی قوم کے لیے عظیم البرکت ثابت ہوئی ہو۔ بنی مصطلق سے ایک سو اہل بیت قید تھے، سب چھوڑ دیئے گئے۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ ایک سو اہل بیت سے مراد ایک سو آدمی نہیں ہیں کیونکہ ان کی تعداد سات سو سے زیادہ تھی بلکہ ایک سو گھر کے باشندے مراد ہے۔

ام المومنین حضرت حفصہؓ

آپؓ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی صاحبزادی ہیں۔ آپؓ والدہ کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ اعلانِ نبوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد آپؓ کا قبیلہ مسلمان ہو گیا، اس وقت حضرت حفصہؓ بھی اسلام لائیں۔ ان کا پہلا نکاح حضرت خنیس بن حذافہؓ سے ہوا۔ وہ ابتدائی ایام میں ہی اسلام قبول کر چکے تھے انہوں نے پہلے حبشہ ہجرت کی اور بعد ازاں سیدہ حفصہؓ کے ہمراہ مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ جنگ احد میں جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت حفصہؓ کی عمر اکیس سال تھی جب وہ بیوہ ہوئیں۔ ان کے والد نے حضرت عثمانؓ سے نکاح کرنے کا کہا کیونکہ ان کی اہلیہ بی بی رقیہؓ بنت رسول ﷺ کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے چند دن کی مہلت مانگی۔ کچھ دنوں کے بعد پوچھا تو حضرت عثمانؓ نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ میں نکاح کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ

نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا تو انہوں نے بھی خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہ دیا۔ آخرکار ایک دن بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے حفصہؓ سے شادی کے لیے حضرت عثمانؓ سے کہا، انہوں نے صاف انکار کر دیا پھر میں نے ابوبکرؓ سے کہا تو انہوں نے خاموشی اختیار کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''فکر نہ کرو، حفصہؓ کی شادی اس شخص سے ہوگی جو ابوبکرؓ و عثمانؓ سے افضل ہے اور عثمانؓ کی شادی اس خاتون سے ہوگی جو حفصہؓ سے بہتر ہے''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ''تم اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو''۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی کا نکاح آپ ﷺ کے ساتھ بعوض چار سو درہم حق مہر کے کر دیا۔ تریسٹھ برس کی عمر میں سیدہ حفصہؓ علیل ہوئیں اور اس دنیا فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مدینہ کے گورنر مروان نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

طبرانی میں ہے ''سیدنا قیس بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے سیدہ حفصہؓ کو طلاق دے دی۔ اسی اثناء میں ان کے دو ماموں قدامہ بن مظعون اور عثمان بن مظعون ان کے پاس آئے۔ دیکھا کہ حفصہؓ رو رہی ہے اور فرما رہی ہیں، خدا کی قسم! آپ ﷺ نے مجھے کسی عیب کی وجہ سے طلاق نہیں دی۔ پس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے جبرائیل نے کہا ہے کہ حفصہؓ کی طلاق سے رجوع کر لیجئے، کیونکہ وہ بہت زیادہ روزے رکھنے والی اور بہت زیادہ نماز پڑھنے والی پرہیزگار ہے اور وہ جنت میں بھی آپ ﷺ کی بیوی ہوگی''۔

نبی مکرم ﷺ کا ہر فعل مبنی بر حکمت ہوتا ہے اور انصاف کے عین مطابق ہوتا ہے اور یہ طلاق دراصل ہلکی سی سزا تھی جو حضرت حفصہؓ کی طبیعت کی تیز مزاجی کی وجہ سے دی گئی تھی، یہ محض تنبیہ کے لیے تھی تاکہ اس عارضی انقطاع سے وہ سمجھ جائیں اور ان کی تیز مزاجی میں دھیما پن پیدا ہو۔ دوسری طرف حضرت جبرائیل اللہ تعالیٰ کا پیغام، طلاق سے رجوع کرنے کا لاتے ہیں اور سیدہ حفصہؓ کو جنت میں بھی آپ ﷺ کی زوجہ ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اس ہلکی سزا سے امت کے لیے ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے' کا سبق موجود ہے۔؟

ایمائل ڈرمنگھم کہتے ہیں کہ سیدہ حفصہؓ بنت عمرؓ جو بیوہ تھیں، کو پیغمبر خدا نے شریک حیات بناتے ہوئے حضرت عمرؓ سے بہترین تعلق اور رشتہ قائم کر لیا۔ یہ اس مستشرق کی اپنی رائے ہے کیونکہ آپ ﷺ اور حضرت عمرؓ کے مابین دینی رشتہ استوار تھا۔ یہ تعلق خون کے رشتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے دین کی خاطر خونی رشتے ختم ہو سکتے ہیں لیکن خونی رشتوں اور عصبیت کی بنیاد پر تعلقات سے دین کا رشتہ ختم نہیں ہوتا۔ دینی رشتہ کی خاطر عرب کے لوگ اسلام کو گلے لگانے والے بن گئے اور تمام علائق دنیوی یا مخالف دین تعلقات کو خاطر میں نہیں لائے۔

(p.delacy johnson) پی ڈیلسی جانسن: جناب پیغمبر ﷺ نے ایک اور بیوہ سیدہ حفصہؓ سے شادی کر کے حضرت عمرؓ بن خطاب سے اتحاد و دوستی کو اتنا پختہ کر دیا جیسے ان کی دوستی اور رفاقت حضرت ابوبکرؓ سے تھی۔ (امہات المومنین۔ص۔۱۴۴)

ہنری لیمنز متعصب عیسائی پادری ہے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں سیدہ حفصہؓ سے متعلق لکھے گئے ایک مضمون میں تسلیم کرتا ہے کہ ''یوم احد کے فوراً بعد نبی اکرم ﷺ نے عمر بن خطابؓ کے تعاون کی خاطر سیدہ حفصہؓ سے شادی کی۔

ولیم میور: سیدہ حفصہؓ کو حرم نبوی میں بطور زوجہ داخل کرنے سے آپ ﷺ نے ان کے والد جناب عمرؓ سے دوستی کے بندھن کو مستحکم کر دیا۔

جان بیگٹ: پیغمبر ﷺ پہلے ہی عائشہؓ سے شادی کر چکے تھے اور حفصہؓ بن عمرؓ سے شادی کر کے پیغمبر اپنے دونوں قریبی جان نثار ساتھیوں کو اپنے مزید قریب کرنا چاہتے تھے۔

واٹ: اواخر جنوری ۶۲۵ء میں جناب محمد ﷺ نے سیدہ حفصہؓ سے شادی فرمائی جو عمرؓ کی بیٹی تھیں۔ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ ثانی مقرر ہوئے۔ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق اس طرح سے ایک طرف تو جناب پیغمبر ﷺ نے اپنے نائب کمان دار اور ساتھی عمرؓ سے رشتہ مضبوط کر لیا اور دوسری طرف سیدہ حفصہؓ کی دلجوئی مقصود تھی۔ اس شادی یا دیگر شادیوں کا پیغمبر ﷺ نے اپنے لیے یا اپنے پیروکاروں کے لیے خود اہتمام کیا' ان میں سیاسی مقاصد یقیناً پیش نظر تھے چاہے کوئی دیگر وجوہات تھیں یا نہیں تھیں۔

مذکورہ مستشرقین کی یہ اپنی آراء ہیں ان کی آراء سے کئی وجوہ کی بنیاد پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اول یہ کہ حضرت عمرؓ نے خود اپنی بیٹی کی شادی کے لیے حضرت ابوبکرؓ و عثمانؓ سے بات چیت کی' انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ سارا قصہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''حفصہؓ کی شادی اس شخص سے ہوگی جو ابوبکرؓ و عثمانؓ سے افضل ہے'' اگر آپ ﷺ دوستی کو بڑھانے اور مستحکم کرنے کے خواہش مند تھے تو بجائے عمرؓ کے خود آپ ﷺ کو حفصہؓ کے نکاح کا پیغام بھیجنا چاہیے تھا۔ یہاں صورت مختلف ہے۔

دوم: ان کے شوہر نے جنگ احد میں جام شہادت نوش کیا اس پر حضرت عمرؓ کو ان کی بیوگی اور بیچارگی کا احساس تھا اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی کے نکاح کا پیغام دیا۔ آپ ﷺ ان کے دکھ اور درد سے بے خبر نہ تھے لہٰذا اس ابتلاء و آزمائش کی گھڑی میں ان کے زخموں کا مداوا' اپنے حرم میں شامل فرما کر کیا۔

مذکورہ مستشرقین کی آراء سے اس بات پر اختلاف ہے کہ سیدہ حفصہؓ سے آپ ﷺ نے شادی کر

کے حضرت عمرؓ سے دوستی پکی کر لی حالانکہ حضرت عمرؓ اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور اسلام کے سچے اور سچے وفادار تھے۔ جن مسلمانوں نے اسلام قبول کیا ان کے لیے اسلام ہی اوڑھنا بچھونا تھا اور عمر بھر اسلام پر قائم رہے۔ یہ رشتہ اس قدر پکا اور پختہ تھا کہ ساری عمر ٹوٹنے کا نام ونشان تک نہیں ملتا تو بھلا حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ سے آپ ﷺ کی شادی کرنے سے حضرت عمرؓ کے ساتھ اسلام کے رشتہ کی بجائے شادی کا رشتہ کیونکر مضبوط اور مستحکم کہا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی اپنی رائے ہے حالانکہ آپ ﷺ اور حضرت عمرؓ کے درمیان بہتر مذہبی تعلق کا رشتہ تھا اور دین کا رشتہ خونی رشتوں سے افضل ہوتا ہے۔ دین کی خاطر خونی رشتے ختم ہو جاتے ہیں مگر دینی رشتہ دوسرے علائق کے سبب ختم نہیں ہوتا۔

ام المومنین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ

ان کا پہلا نکاح حضرت عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد جہم بن عمرو سے نکاح ہوا اور وہ بھی غزوہ بدر میں کام آئے تب تیسرا نکاح عبداللہ ابن جحشؓ سے کیا انہوں نے بھی غزوہ احد میں جام شہادت نوش کیا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے حضرت زینبؓ بیوگی کے صدمہ سے دوچار ہوئیں لیکن غم گسار آقا آنحضرت ﷺ نے اپنے حرم میں انہیں داخل فرمایا۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ آپ ام المومنینؓ کے اعزاز سے بہرہ ور ہوں اور آپ ﷺ کے ساتھ دور کی رفاقت میسر نہ ہو، ایسا ہی ہوا کہ صرف چند ماہ بعد سیدہ زینب بنت خزیمہ، جو ام المساکین کی کنیت سے معروف تھیں، کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر مبارک تیس برس تھی۔

صہیبؓ آہن گر تھے۔ قریش نے روک دیا کہ مدینہ ہجرت نہ کریں۔ سامان باندھ کر مدینہ منورہ کو چلے تو قریش نے کہا "جب تم یہاں آئے تھے تو فقیر تھے محتاج تھے، یہاں رہ کر مالدار اور غنی ہو گئے ہو، اور اب تم چاہتے ہو کہ وہ سب کچھ جو تم نے یہاں کمایا ہے وہ ساتھ لے کر مدینہ چلے جاؤ۔۔۔ واللہ! یہ تو ہم کبھی نہ ہونے دیں گے"۔ حضرت صہیبؓ نے کہا "اگر میں یہ سارا کچھ تمہارے لیے چھوڑ دوں تو کیا مجھے جانے دو گے"؟ مشرکین بولے "ہاں! پھر تم آزاد ہو۔" صہیبؓ نے بغیر سوچے اور بغیر کسی جھجک کے اپنا سارا سامان کفار کے حوالے کیا اور خالی ہاتھ مدینہ روانہ ہو گئے۔ جب آپ ﷺ کو اس قربانی کی خبر دی گئی تو فرمایا: "صہیبؓ نے بڑا نفع کمایا، صہیبؓ نے بڑا نفع کمایا"!

ام المومنین حضرت ام سلمیٰؓ

ہند بنت ابی امیہ سہیل بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم کے شوہر نے ہجرت مدینہ کی، تو ہند ان کے (شوہر ابوسلمہؓ) ہمراہ نہ تھے۔

کیونکہ ام سلمہؓ کے میکہ والے مزاحم ہوئے اور انہوں نے اسے روک لیا، ام سلمہؓ اپنے گھر واپس آئیں تو ان کے شوہر ابو سلمہؓ کے گھر والوں نے اس سے بچہ چھین لیا، جس کا نام سلمہ تھا۔ وہ اپنے بچہ سے بچھڑ گئیں۔ وہ روزانہ گھر سے نکل پڑتی اور ابطع میں بیٹھ کر رویا کرتی تھی۔ سات آٹھ دن بعد ابطع سے ان کے خاندان کا ایک شخص نکلا۔ اس نے ام سلمہ کو روتے دیکھا تو اس کا دل جذبہ ترحم سے بھر آیا۔ گھر آ کر لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ اس پر ظلم کیوں کرتے ہو؟ اسے جانے دو: اور ساتھ ہی اسے بچہ دے دو۔ لوگوں نے بات مان لی اور بچہ ام سلمہؓ کے سپرد کر دیا اور مدینہ جانے کی بھی اجازت دے دی۔ وہ تنہا سفر کر رہی تھی۔ تنعیم کے مقام پر کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہ جو ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے، انہوں نے سیدہ سلمہؓ سے پوچھا، کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا۔ مدینہ۔ انہوں نے پوچھا: کوئی ساتھ ہے؟ آپ نے فرمایا ''خدا اور یہ بچہ''۔ انہوں نے اونٹ پر سوار کر لیا اور خود مہار پکڑ لی۔ جب قباء کی آبادی پر نظر پڑی تو عثمان نے کہا ''اب تم اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ، وہ یہیں قیام پذیر ہیں''۔ سیدہ سلمہؓ قباء کو اور عثمان مکہ کو روانہ ہو گئے۔

واقعی لوگ حیران تھے کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی کیسے تنہا سفر کر سکتی تھی۔ شرفاء عورتوں کو نکلنے کی جرائت نہیں ہوتی تھی۔ سیدہ مجبوراً خاموش ہو جاتیں۔ انہیں لوگوں کی حیرت کا پورا پورا اندازہ تھا لیکن وہ آتش ایمان جو قلب میں موجزن تھی جس نے دلیری بخشی۔ سیدہ قباء پہنچی تو لوگ ان سے پوچھتے تم کس کی بیٹی ہو؟۔۔۔ جب آپ بتاتی کہ ابو امیہ کی بیٹی ہوں تو وہ یقین نہیں کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب کچھ لوگ حج کے ارادہ سے نکلے اور عازم مکہ ہوئے تو سیدہ سلمہؓ نے ان کے ہاتھ اپنے گھر والوں کو ایک خط بھجوایا، انہیں یقین ہوا کہ وہ واقعی ابو امیہ کی بیٹی ہیں۔ وہ نہایت سخاوت کی پیکر تھیں اور اجواد العرب میں سے تھیں۔ (امہات المومنین۔۲۱۵۔۲۱۴)

اہم نکتہ: سیدہ ام سلمہؓ نے اپنے بیٹے عمر سے کہا کہ اٹھو اور حضور ﷺ سے میرا نکاح کر دو۔ نسائی کی روایت میں لابنھا (اپنے بیٹے عمر سے کہا) کے الفاظ ہیں۔ اگرچہ حافظ نے اس کی روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اور حافظ المزنی نے کہا کہ صحیح الفاظ یہ ہیں ''قم یا عمر'' مسند احمد کی کئی روایتوں میں یہ لفظ منقول ہیں اور جو لابنھا کا لفظ ہے وہ راوی کا سہو ہے، یا اپنے گمان وظن سے لکھ دیا ہے کیونکہ ان کے لڑکے کا نام بھی عمر تھا لیکن یہاں عمر سے مراد حضرت عمر بن الخطابؓ ہیں، ان کا لڑکا مراد نہیں کیونکہ وہ اس زمانہ میں صغیر السن تھا۔ نیز بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ نکاح کا پیغام لے کر آئے تھے، لیکن مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے نکاح کا پیغام سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ لے کے آئے تھے۔

اہم نکتہ: سیدہ ام سلمہؓ کا نکاح شوال چار ہجری کی آخری تاریخوں میں ہوا۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ

فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر کے واقعہ کے بعد شوال دو ہجری میں سیدہ ام سلمہؓ نے حضور سے نکاح کیا، لیکن یہ روایت غیر معتبر ہے کیونکہ ابو سلمہ کی وفات کے بعد اور عدت گزرنے پر آپ نے سیدہؓ سے نکاح کیا اور ابو سلمہؓ کی وفات جمادی الآخر چار ہجری میں ہوئی تھی۔

اہم نکتہ: ابوامیہ سے رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی عاتکہ بیاہی ہوئی تھی۔ عبداللہ بن ابوامیہ ام زبیر اور قریبہ ان کی اولادیں تھیں لیکن ام سلمہؓ کی ماں یہ عاتکہ نہیں تھیں۔ ارباب سیرؒ کہتے ہیں کہ ام سلمہؓ کی ماں عاتکہ بنت عامر بن ربیعہ بن مالک کنانیہ تھیں۔ یہاں پر صاحب روضۃ الاحباب کو نام کی وجہ سے دھوکہ ہوا ہے۔ (اصح السیرؒ ۔ ۵۷۷)

اہم نکتہ: سیدنا ام سلمہؓ کے بارہ میں مسند احمد اور دوسری کتب میں کچھ روایات واقعہ کربلا اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کے بارے میں ہیں جب وہ بیت اللہ میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ یہ سب روایات پایہ ثبوت تک نہیں پہنچتیں کیونکہ واقعہ کربلا سن اکسٹھ ہجری میں پیش آیا اور حضرت عبداللہؓ تریسٹھ ہجری کو بیت اللہ میں پناہ گزین ہوئے اور سیدہ ام سلمہؓ کا انتقال انسٹھ ہجری میں ہو گیا تھا۔ (حوالہ بالا ۔ ۲۴۲)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مدارج النبوہ ۔ ۲ ۔ ۵۰۰) فرماتے ہیں کہ یہی قول اصح ہے یعنی سیدہ سلمہؓ کا انتقال انسٹھ ہجری میں ہوا کیونکہ بعض نے باسٹھ ہجری قرار دیا ہے جس سے وہ کربلا کی روایات کی تطبیق کرتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۱۲۲

آیت تطہیر ''انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا'' (الاحزاب ۳۳، پارہ ۲۲) میں ازواج مطہرات شامل نہیں ہیں۔

اول: اہل سنت و جماعت کے نزدیک یہ آیت کریمہ بالاجماع صحابہ کرام، ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی اور اہل بیت سے مراد اس آیت میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات مراد ہیں اور تطہیر سے مراد تزکیہ نفس، تہذیب باطن اور تصفیہ قلب ہے جس سے بعد میں انسان گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے، لیکن شیعہ حضرات اس آیت سے مراد حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ و حسن و حسینؓ لیتے ہیں اور اس کی دلیل یہ لاتے ہیں کہ اہل سنت کی صحیح احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے ان چار حضرات کو اپنی کملی میں لے کر فرمایا ''اے اللہ! یہ چاروں میرے اہل بیت ہیں تو ان سے ناپاکی کو دور کر دے اور تو پاک کر دے''۔ اس آیت لفظ منکم اور یطھر کم'' میں جو ضمیریں ہیں مذکر کی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں ازاوج النبی مراد نہیں ہیں۔

دوم: اہل تشیع یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں اذہاب رجس اور تطہیر گناہوں سے پاک کر دینا ہے یعنی معصوم بنا دینا مراد ہے، جس سے ان چاروں کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ اہل بیت کی عصمت کو ثابت

کرنے کے لیے مذکور آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں۔

جواب: اول اعتراض کا جواب یہ ہے کہ لفظ اہل بیت اور لفظ آل عربی زبان میں دونوں ہم معنی ہیں۔ عربی لغت میں آل کے معنی اہل خانہ کے ہیں، جو مستقل گھر میں رہتے ہیں، جس میں امہات المومنین اصالتاً داخل ہیں اور اولاد اور ذریت تبعاً داخل ہیں۔ نیز غلاموں اور لونڈیوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جب لفظ اہل خانہ یا اہل بیت بولا جاتا ہے، عرفاً اور محاورۃً ہر شخص اس کا یہی مطلب لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو لوگ گھر میں رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس وصف میں اصل ازواج ہیں جو ہمیشہ گھر میں رہتی ہیں۔ بیٹوں اور بیٹیوں کا ہمیشہ گھر میں رہنا خلاف عادت ہے۔ خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے حجروں اور گھروں میں تو سوائے آپ ﷺ کی ازواج کے اور کوئی نہیں رہتا تھا۔

قرآن کریم میں بھی اس مفہوم کا ذکر آتا ہے۔ ''اتعجبین من امر الله رحمة الله و برکاته علیکم اهل البیت انه حمید مجید '' سیدنا ابراہیمؑ کے واقعہ میں فرزند کی بشارت دی تو بڑھاپے کی وجہ سے بشارت پر تعجب ہوا۔ اہل بیت کی کتاب میں حضرت سارہؓ داخل ہیں اور اصل خطاب انہی سے ہے۔ فرشتوں نے حضرت سارہ کو اہل بیت سے خطاب کر کے ان کو خدا کی رحمتوں اور برکتوں کی دعائیں دیں۔

۲۔ دوسرے اعتراض یعنی ضمیریں مذکر ہیں۔ شیعہ حضرات اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اعتراض وارد کرتے ہیں اور تنقید کرتے ہیں کہ تم نے نبی کی زوجہ سارہ پر لفظ اہل بیت کا اطلاق کیسے کیا اور تم نے مونث کے لیے مذکر کی ضمیر کیسے استعمال کی اور نبی کی زوجہ مطہرہ کو تم نے رحمۃ اللہ برکاتہ علیکم ضمیر مذکر کر کے کیوں خطاب کیا، تم کو چاہیے کہ علیکم کی بجائے علیکن کہتے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اہل بیت میں ازواج داخل ہیں اور تعجبین کا اصل خطاب سیدہ سارہؓ کو ہے جو صیغہ مونث ہے اور اس کے بعد رحمة الله برکاته علیکم ،اہل بیت ہیں۔ اہل بیت کو بلفظ مذکر ''علیکم '' خطاب کیا۔ علامہ زمخشری نے لکھا ''خود قرآن کریم میں سیدنا موسیٰؑ کے قصہ میں ہے ''قال لاهله امکثو '' انہوں نے اپنی بی بی سے کہا ذرا ٹھہر جاؤ۔ ظاہر کے مطابق یہاں امکثی یا الکثن ہونا چاہیے تھا، اس قسم کے مواقع میں صیغہ مذکر اور خطاب مذکر لفظ اہل کی رعایت سے لایا گیا ہے کہ وہ اصل میں مذکر ہے۔''

مذکورہ آیت میں اول تا آخر ازواج سے خطاب ہے اور اس قدر صریح ہے کہ تاویل کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ یا نساء النبی ۔۔ آخر خطاب تک ازواج مطہرات کو ہے مگر درمیان میں کچھ صیغے مونث کے استعمال ہوئے جیسے الطعن الله ،تسنن اور فی بیوتکن وغیرہ لہٰذا شیعہ حضرات کا اعتراض باطل ہوا کہ کلام عرب میں اظہار محبت کے لیے مونث کے لیے تو مذکر کا صیغہ استعمال ہو سکتا ہے مگر مذکر کے لیے مونث کا صیغہ اور مونث کی ضمیر کا استعمال کہیں سننے اور دیکھنے میں نہیں آیا۔

حضرت ابو اسید ساعدی بدری سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلبؓ کو فرمایا: اے ابوالفضل! کل تم اور تمہاری اولاد اپنے گھر میں ہی رہنا' باہر کہیں بھی نہیں جانا' مجھے تمہارے ساتھ کام ہے۔ وہ اپنے گھر میں سرکار دو عالم ﷺ کی تشریف آوری کے منتظر رہے۔ آپ ﷺ قدم رنجہ فرما ہوئے اور فرمایا اسلام علیکم! انہوں نے جواب میں وعلیکم اسلام ورحمۃ اللہ وبرکاۃ عرض کیا' صبح کس حال میں کی ہے آپ ﷺ نے دریافت فرمایا؟ الحمدللہ خیر و عافیت کے ساتھ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ذرا ذرا قریب قریب ہو جاؤ اور ایک دوسرے کی طرف کھسک کر نزدیک ہو جاؤ' تین مرتبہ آپ ﷺ نے یہ کلمات دہرائے' جب وہ اس قدر اکٹھے ہو گئے کہ آپ ﷺ کا ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ لینا ممکن ہو گیا تو آپ ﷺ نے اپنی چادر مبارک ان کے اردگرد پھیلا دی اور اس کے گھیرے میں لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا فرمائی " هذا العباس عمی و ضو ابی و هو لا ء اهل بیتی اللهم استر هم منالنار کستری ایا هم بملا نی هذاه (یہ عباس ہیں جو کہ میرے چچا ہیں اور میرے باپ کے ساتھ والی شاخ (جو ایک تنے سے نمودار ہونے والی ہے) اور یہ میرے اہل بیت ہیں۔ اے اللہ ان کو آگ سے پوشیدہ رکھ (اور دور) جیسے کہ میں نے ان کو اپنی اس چادر میں چھپایا ہوا ہے اور نگاہ اغیار سے پوشیدہ اور دور کر رکھا ہے۔ آپ ﷺ کے دہن مبارک سے یہ کلمات نکلنے ہی تھے کہ دروازے کی دہلیز اور اس منزل کے سبھی در و دیوار نے تین مرتبہ آمین کہی۔ (الوفا:۳۸۴)

(مترجم) اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ سرور عالم ﷺ نے حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کو بھی اپنے اہل بیت قرار دیا ہے اور جس طرح حسنین کریمین اور سیدہ فاطمہ زہراءؓ اور علی المرتضیٰؓ کو چادر میں لے کر دعا فرمائی اسی طرح ان کے لیے بھی دعا فرمائی لہٰذا اہل بیت کا صرف پنجتن میں حصر درست نہیں ہے بلکہ اہل بیت عام ہیں جن میں نسبی لحاظ سے بنو ہاشم و بنو عبدالمطلب داخل ہیں۔ ولادت کے لحاظ سے سرور عالم ﷺ کی اولاد صلبی بیٹے اور بیٹیاں اور حضرات حسنین اور ان کی بہنیں داخل ہیں اور سکونت کے لحاظ سے جملہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنھم داخل ہیں۔ (اشعۃ اللمعات)

اعتراض نمبر ۱۲۳

حدیث میں اہل بیت نبوت میں ازواج کو داخل نہیں فرمایا گیا۔

جواب: حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چاروں حضرات کو فرمایا ''اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں''۔ اس سے بعض میں اہل بیت نبوت میں ازواج کو داخل نہیں کیا جب کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں، ان کو بھی آیت تطہیر کی فضلیت میں داخل ہونا ہے اور ان کو بھی اس کرامت میں شامل فرما۔ آپ ﷺ کا مقصود اس سے حصر نہیں کہ بس اہل بیت ہیں اور ازواج

مطہرات اہل بیت نہیں ہیں۔ یوں بھی ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب ان چاروں کو عبا میں داخل فرمایا تو سیدہ ام سلمہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو۔۔۔اس کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں عبا میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں، تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو۔

دوم: علماء کرام نے لکھا ہے کہ لفظ اہل بیت کے عموم میں اپنے ان خاص عزیزوں کو بھی داخل کرنا مقصود تھا اس وجہ سے ان چاروں کے لیے دعا فرمائی اور بعض روایات میں سیدنا عباسؓ اور ان کی اولاد کو بھی عبا میں لے کر اہل بیت میں داخل فرما کر دعا کی۔

سوم: سیدہ ام سلمہؓ کو اہل بیت میں شمار کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''تو اہل بیت میں سے ہے''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ''اور تیری بیٹی بھی''۔

چہارم: بعض روایات میں ہے کہ سیدنا علیؓ اور آپ کے دوسرے افراد کے لیے یہ آیت نازل ہوئی تھی، تو دوسرے افراد کو شامل کر کے دعا فرمانا چہ معنی دارد؟

پنجم: بعض روایات میں ہے کہ سیدنا علیؓ اور ان کے اہل خانہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے ام سلمہؓ کو بلایا اور اپنی عبا میں داخل کر کے ان کے لیے بھی دعا فرمائی۔ اس حدیث کو جیسے بعض حضرات کا خیال ہے صحیح نہیں ہے۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ پانچ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک بیٹی اور اس کے دو بچوں اور داماد کو عبا میں لے کر دعا فرمائی اور دوسری بیٹی جو گھر میں موجود ہے، اس کو اور اس کی اولاد کو اپنی تمام رحمتوں سے دور کیوں رکھا جبکہ یہ آپ ﷺ کی شان رحمۃ العالمینی سے دور ہے۔

اعتراض نمبر ۱۲۴

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس وقت آپ ﷺ کی کوئی اور بیٹی زندہ نہ تھی سوائے حضرت فاطمہؓ کے۔

جواب: آپ ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ اپنے بچوں کے ساتھ زندہ تھیں کیونکہ حضرت زینبؓ کی وفات آٹھ ہجری کو مدینہ میں ہوئی اور ان کی تجہیز و تکفین اور غسل میں سیدہ سودہؓ، سیدہ ام سلمہؓ اور سیدہ ام ایمنؓ نے حصہ لیا تھا۔ ان کے خاوند ابوالعاص اسیران بدر میں سے تھے۔ شادی جمادی الاول چھ ہجری میں ہوئی۔ ان کے قافلہ کو مسلمانوں نے پکڑ لیا لیکن ابوالعاص قافلہ سے پہلے مدینہ پہنچ گئے اور اپنی بیوی حضرت زینبؓ کے ہاں پناہ لی۔ حضرت زینبؓ کی سفارش پر ابوالعاص کو چھوڑ دیا اور ساتھ ہی سارا سامان تجارت واپس کر دیا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت زینبؓ اپنے بچوں کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں تھیں لیکن آپ نے ان تینوں یعنی حضرت زینب بنت رسولؓ، ان کی بیٹی اور بیٹے کو (امامہ۔علی) جو بیت نبوت میں مقیم تھے، ان کو اپنی عبا میں نہ لے کر اہل بیت سے خارج کر دیا اور دوسرے گھر کے چار افراد کو بلا کر اہل بیت میں شمار کر

لیا۔ یہ بات بعید از قیاس ہے۔ اندازہ لگائیے کہ جو بیٹی اپنے بچوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ہاں رہ رہی ہے اور وہ بیٹی جو دوسرے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے ان میں سے گھر میں رہنے والی کو چھوڑ دیں اور دوسرے گھر میں رہنے والی کو اہل بیت میں شمار کریں سوء ادبی ہے۔ مختصر یہ کہ اہل بیت سے مراد تو ازواج مطہرات ہیں ہی، ان کے علاوہ اگر کسی صحیح روایت میں دیگر حضرات کا شامل ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ ازواج مطہرات کے طفیل ہے، بالذات نہیں کیونکہ قرآن کریم نے ازواج مطہرات کو اہل بیت کہا ہے۔

(امہات المومنین۔۲۳۸۔۲۳۷)

ام المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش

نام زینبؓ، کنیت ام الحکم، قبیلہ قریش کے خاندان اسد بن خزیمہ ہے۔ ان کا پہلا نام برہ تھا۔ آپ ﷺ نے تبدیل فرما کر زینب رکھا۔ (مسلم شریف حدیث نمبر ۲۱۴۲)

آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آنے سے قبل آپ ﷺ کے متبنیٰ بیٹے زید بن حارثہ کے عقد میں تھی۔ وہ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ اس وقت عرب معاشرہ میں دستور تھا کہ غلاموں سے مناکحت کو باعث ننگ و عار سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے سیدہ زینبؓ کو اپنے غلام زید بن حارثہؓ سے شادی کرنے کا پیغام دیا تو زینبؓ اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحشؓ نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ "وما کان لمومن ولا مومنة اذاقضیٰ الله و رسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امر هم و من یعص الله و رسوله فقد ضل ضلا لاً مبینا "۔ اس آیت میں مومن سے عبداللہ بن جحشؓ اور مومنہ سے زینبؓ مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مومن اور مومنہ کے لیے یہ زیبا نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ دے دے تو ان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی بلا شبہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوا۔ اس لیے اس آیت کے نزول پر دونوں بہن بھائی راضی ہو گئے اور بحکم خداوندی حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت زیدؓ سے ہو گیا۔

شادی تو ہو گئی مگر لڑائی ہوتی رہتی جس سے زیدؓ آنحضرت ﷺ سے اس معاملہ کی شکایت کرتے اور عرض کرتے کہ میں زینبؓ کو چھوڑ دیتا ہوں لیکن آپ ﷺ اسے منع فرماتے۔ جب مزاج میں موافقت اور یکسانیت کا عنصر مفقود رہا تو بالآخر زیدؓ نے طلاق دے دی، یہ سن کر آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔

سیدنا انسؓ سے مروی ہے کہ سیدہ زینبؓ کی عدت پوری ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے زیدؓ ہی کو حکم دیا کہ تم خود جا کر زینبؓ سے میرے نکاح کا پیغام دو (تاکہ اچھی طرح ثابت ہو جائے کہ یہ نکاح زیدؓ کی رضامندی سے ہوا) حضرت زیدؓ پیغام لے کر سیدہ زینبؓ کے گھر گئے اور دروازہ کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گئے (حالانکہ پردہ کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا مگر یہ کمال ورع اور کمال تقویٰ تھا) اور کہا: اے

زینب! مجھے رسول اللہ ﷺ نے تم سے اپنے نکاح کا پیغام دے کر بھیجا ہے۔ سیدہ زینبؓ نے فی البدیہہ جواب دیا کہ میں اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتی، جب تک میں اپنے پروردگار سے مشورہ نہ کرلوں (یعنی استخارہ نہ کرلوں) اس وقت اٹھیں اور گھر میں جا کر ایک جگہ جو مسجد کے نام سے عبادت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی، وہاں جا کر استخارہ میں مشغول ہو گئیں، ادھر جبرائیل یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ ''فلما قضیٰ زید منھا وطرا زوجنا کھا۔۔۔'' ترجمہ: پس جب زیدؓ زینبؓ سے اپنی حاجت پوری کر چکے اور ان کو طلاق دے دی تو اے محمد ہم نے زینبؓ کا نکاح تم سے کر دیا''۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ سیدہ زینبؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، اور زینبؓ حرم نبوی میں آ گئیں۔ آپ ﷺ کی اس شادی پر طرح طرح کی باتیں کفار نے کیں۔ یہ بھی کہا کہ ہمیں تو منع کیا جاتا ہے کہ اپنے بیٹوں کی طلاق یافتہ بیویوں سے شادی نہ کریں اور خود اپنے متبنیٰ بیٹے کی بیوی سے شادی رچا لی۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس الزام کا جواب فرمایا'' مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ اے لوگو! محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

سیدہ زینبؓ کی شادی کے سلسلہ میں آیت کی تفسیر میں من مرضی کی رنگین داستانیں رقم کی گئی ہیں۔ جو باطل تو ہیں ہی مگر نہایت دل خراش اور توہین و بے ادبی سے بھرپور ہیں۔ آیت یہ ہے۔'' وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ط فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ط وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ (الاحزاب ۳۶، پارہ ۲۲) ترجمہ: اور یاد کرو (اے نبی ﷺ) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام کیا، کہہ رہے تھے۔۔۔ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر! اور (اے نبی) تم چھپا رہے تھے اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور ڈر رہے تھے لوگوں سے حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو۔ پس جب زید اس سے (اپنی بیوی سے) ضرورت پوری کر چکا تو ہم نے تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی تا کہ اہل ایمان پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جبکہ وہ (منہ بولے بیٹے) اپنی بیویوں سے ضرورت پوری کر لیں، اور اللہ کا حکم ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے لے پالک بیٹوں کے بارے میں صریحاً حکم فرمایا اور اسی شادی کے موقع پر حکم ہوا۔ ارشاد خداوندی ہے'' وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ط ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ط وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ج۔'' (ترجمہ) اور نہ

اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہی صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔'' اس آیت وَاِذْ تَقُوْلُ ـ ـ ـ اَمرَ اللہِ مَفعُولا (الاحزاب ۳۶، پارہ ۲۲) کے بارے میں مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عتاب ظاہر کر رہا ہے کہ بظاہر تو اے نبی! تم زید کو طلاق دینے سے روک رہے تھے، مگر دل میں یہی خواہش تھی کہ زیدؓ طلاق دے تاکہ تم اس کی بیوی سے شادی کر لو، لیکن اس بات کو چھپا رہے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ظاہر کرنے والا تھا۔ آخر زید نے طلاق دینی تھی اور تمہاری اس ساتھ شادی ہونا تھی اس لیے جب زید نے طلاق دینے کی بات کہی تو تمہیں اس سے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ، یہ بات تم نے محض لوگوں کے ڈر کی وجہ سے کہہ دی، حالانکہ لوگوں کی نسبت اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو۔ وَتُخْفِی فِی نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ط'' اور چھپا رہے تھے تم اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور ڈرتے تھے تم لوگوں سے حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا، کہ تم اس سے ڈرو۔'' علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ قتادہ، ابن زید اور مفسرین کی ایک جماعت جس میں طبری وغیرہ بھی شامل ہیں، نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔

اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو سیدہ زینبؓ اب زیادہ اچھی لگنے لگی تھی اور آپ ﷺ شادی کے لیے از حد بے قرار ہو گئے تھے، تو جناب والا! بتائیے کہ آپ ﷺ نے ان سے پہلے شادی کیوں نہ کی۔ کنواری بھی تھیں، متبنیٰ بیٹے کی بیوی بھی نہیں تھی اور کفالت کے سبب آپ کی نظروں کے سامنے بھی تھیں، اب جب کہ وہ منکوحہ ہو گئیں، زیدؓ سے شادی ہو گئی تو اتنی محبت بھڑک اٹھی اور بے تابی اس قدر بڑھی کہ آپ ﷺ خواہش مند تھے کہ کوئی لمحہ آئے کہ زید طلاق دیں اور آپ اس سے شادی کر لیں ـ ـ ـ خدا کی پناہ! اس کا جواب جماعت مفسرین یہ دیتی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دن اتفاقاً سیدہ زینبؓ کو اس حال میں دیکھ لیا تھا کہ اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اس وجہ سے ان سے محبت شدید ہوئی۔ اس کا استدلال انہوں نے ایک غیر معتبر روایت سے کیا جو مختلف الفاظ کے ساتھ متعدد تفسیروں اور تاریخوں میں مذکور ہے۔ صاحب سید الوریٰ بحوالہ علامہ قرطبی جو اپنی تفسیر الجامع الاحکام القرآن میں لکھتے ہیں ''مقاتل نے کہا کہ جب نبی ﷺ نے زینبؓ کی شادی زیدؓ سے کر دی تو وہ زید کے پاس کچھ عرصہ تک رہیں پھر ایک دن نبی ﷺ زید کو تلاش کرتے ہوئے ان کے گھر آئے تو آپ ﷺ نے زینبؓ کو کھڑے دیکھا وہ گوری چٹی، خوبصورت اور گدرائے ہوئے بدن والی ایک بھرپور قرشی عورت تھیں۔ انہیں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو ان سے محبت ہو گئی اور آپ نے کہا: سُبحَانَ اللہِ! مُقَلِّبِ القُلُوب (پاک ہے

اللہ، دلوں کو پھیرنے والا) یہ تسبیح زینبؓ نے بھی سن لی اور جب زید آئے تو ان کو یہ بات بتا دی۔ زید سمجھ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے زینبؓ کو طلاق دینے کی اجازت دیجئے کیونکہ اس میں کبر ہے، وہ مجھ پر برتری جتاتی ہے اور اپنی زبان سے مجھے دکھ پہنچاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔۔۔اَمۡسِكۡ عَـلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو پاس رکھو اور اللہ سے ڈر) اس روایت میں نہایت دل خراش باتیں بیان ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ سیدہ زینبؓ خوبصورت، گوری چٹی تھیں۔ کیا یہ حسن اور حسن میں شباب اب آیا تھا؟ گوری چٹی اب نظر آئی تھی، کیا وہ پہلے سے خوبصورت اندام نہیں تھیں جب کہ وہ کفالت میں آپ کے سامنے رہیں؟ آپ نے ان کو کنوارے پن میں دیکھا تھا، اس وقت محبت میں کیوں گرفتار نہ ہوئے؟

سیدہ زینبؓ نے رسول ﷺ کی تسبیح بتائی تو زیدؓ سمجھ گئے۔۔۔ کیا سمجھے پہلے بہن بھائی تو زیدؓ سے رشتہ کرنے کو تیار نہ تھے جب آیت کا نزول ہوا تو بسر وچشم اور برضا ورغبت تیار ہو گئے۔ یہاں کبر جتلاتی ہے اپنی برتری بتاتی ہے اور اپنی زبان سے دکھ پہنچاتی ہے۔ یہ کیونکر درست ہے کہ سیدہؓ نے یہ نسبت قبول فرمائی اور اب وہ ایسی باتیں کریں ناممکن ہے۔ ایسے سوالات کے جوابات کے لیے ایک اور روایت کا سہارا لیا گیا ہے۔ روایت یہ ہے "اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیجا تو اس نے زینبؓ سے پردہ ہٹا لیا اور زینبؓ اس وقت عام گھریلو لباس میں تھیں، جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس حال میں دیکھا تو وہ آپ ﷺ کے دل میں کھب گئی اور زینب بھی سمجھ گئی کہ میں رسول اللہ ﷺ کے من کو بھا گئی ہوں۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب رسول اللہ ﷺ زیدؓ کو ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئے۔ پھر جب زیدؓ گھر آئے تو جو کچھ پیش آیا تھا، زینبؓ نے ان سے کہہ دیا ،اس وقت زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔"

اس روایت کو علامہ قرطبی نے "کہا گیا ہے" کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ روایت گھڑنے والا مجہول ہے۔ علامہ نے اسے مقاتل کے حوالے سے نقل کیا ہے اور مقاتل ابن سلیمان ایسا مفسر ہے جو اسرائیلی روایات کا شیدائی ہے اور مانا ہوا کذاب ہے۔ یہ روایت گھڑنے والے نے تمام مومنین کی ماں کا پاس نہ کیا۔ جان دو عالم ﷺ جیسے پیکر حیا کی جانب ایسی باتیں منسوب کر دیں نیز اللہ تعالیٰ کو بھی اس عشقیہ کہانی میں شامل کر لیا اور کہہ دیا۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھیجا تو اس نے زینبؓ سے پردہ ہٹا دیا، گویا اللہ تعالیٰ بھی اس عشق کو پروان چڑھانے میں شامل تھا۔۔۔۔۔۔!! (تفصیل کے لیے دیکھیئے سید الوریٰ۔۳۔۴۵۱)

مقاتل کے بارے محدثین کی آراء

وکیع نے کہا۔۔۔ کذاب تھا۔

یحییٰ نے کہا۔۔۔ اس کی حدیث کسی کام کی نہیں ہے۔

جوز جانی نے کہا۔۔۔دجال اور بے باک تھا۔
ابن حبان نے کہا۔۔۔قرآن کی تفسیر میں یہود و نصاریٰ کی ایسی روایتیں لیا کرتا تھا جو ان کی کتابوں کے موافق ہوتی تھیں اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق جیسا سمجھتا تھا اور حدیث میں جھوٹ بولتا تھا۔
خارجہ بن مصعب نے کہا۔۔میں کسی یہودی کا خون بہانے کا بھی روادار نہیں ہوں لیکن مقاتل اگر مجھے تنہائی میں مل گیا تو اس کا پیٹ ضرور چاک کردوں گا۔
اس طرح کی اور روایتوں میں بھی الجھنیں ہیں جیسے علی ابن حسین بن علی سے ایک روایت کی جاتی ہے، اس میں بھی ایسی باتیں ہیں جو محل نظر ہیں، البتہ اس میں دوسری روایتوں کی طرح لغویت نہیں ہے۔
دراصل یہ کہانی علی ابن زید بن جدعان نے تیار کی ہے جو اس روایت کی جملہ اسانید کا مرکزی راوی ہے۔ یہ شخص پیدائشی اندھا تھا مگر قدرت نے حافظہ بلا کا عطا کیا تھا۔۔۔ بیشتر آئمہ جرح و تعدیل اس کے لیے اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں اور کچھ محدثین اسے سچا اور قابل قبول قرار دیتے ہیں، مگر اکثریت کی رائے اس کے خلاف ہے۔ ان کی آراء کا حاصل یہ ہے کہ وہ زیادہ قوی نہیں بلکہ ضعیف اور لاشی ہے۔ حدیثوں کو الٹ پلٹ دیتا ہے۔۔۔احمد ابن عجلی کہتے ہیں کہ وہ شیعہ مسلک رکھتا تھا۔ یزید ابن ذریع کہتے ہیں ”میں نے علی ابن زید کو دیکھا تو ہے مگر اس سے کوئی روایت نہیں اٹھائی کیونکہ وہ رافضی تھا۔۔۔ابو احمد ابن عدی کہتے ہیں” تمام اہل بصرہ میں غالی شیعہ تھا۔ شیعت میں غلو کا یہ عالم تھا کہ اس قسم کی روایتیں بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منسوب کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔۔۔(جب تم معاویہ کو ان لکڑیوں پر یعنی منبر پر دیکھو تو اسے قتل کر دو اور ایک روایت میں ہے کہ اسے سنگسار کر دو۔ (سیدالوریٰ ۳۔۴۵۷۔۴۵۸)
اب مقاتل کی اور علی ابن زید کی بیان کردہ دونوں روایتیں من گھڑت ہیں تو ان روایات پر مبنی ہر دو تفسیریں بھی کالعدم ہو جائیں گی۔۔۔۔
اس تفسیر پر غور فرمائیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”اور یاد کرو (اے نبی) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام کیا، کہہ رہے تھے۔
اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ:۔۔۔اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ۔
وَاتَّقِ اللّٰهَ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور اللہ سے ڈر
وَتُخۡفِىۡ فِىۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِيۡهِ۔۔۔۔اور چھپاتے تھے تم (اے نبی) اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔
وَتَخۡشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰهُ ؕ۔۔۔اور ڈرتے تھے لوگوں سے حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس کا' کہ تم اس سے ڈرو۔

یہ چار جملے بہت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ایک ہی لڑی میں پروے ہوئے ہیں۔ مفسرین نے وضعی اور غیر صحیح روایات کے زیر اثر آخری دو جملے پہلے دو جملوں سے الگ کر دیئے ہیں اور یہ سمجھ لیا ہے کہ پہلے دو جملوں میں رسول اللہ ﷺ زیدؓ سے کہہ رہے ہیں" امسك علیك زوجك ،اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ! واتق الله، اور اللہ سے ڈر"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ پر عتاب فرماتے ہوئے آپ ﷺ سے کہہ رہا ہے وَتُخْفِي فِي نفسک ما اللہ مبدیہہ، اور چھپاتے تھے تم (اے نبی) اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے ،وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ط" اور ڈرتے تھے لوگوں سے حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے اس کا، کہ تم اس سے ڈرو!

حاصل یہ کہ ابتدائی دو جملوں میں اللہ تعالیٰ متکلم ہے اور زیدؓ مخاطب ہے جبکہ آخری دو جملوں میں اللہ تعالیٰ متکلم ہے اور رسول اللہ ﷺ مخاطب ہیں۔۔۔۔۔ درحقیقت یہ چاروں جملے رسول اللہ ﷺ نے زیدؓ سے کہے تھے۔ یعنی اے زید! اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ، اور (اے زیدؓ) اللہ سے ڈر، اور (اے زیدؓ) تو چھپا رہا ہے اپنے دل میں اس چیز کو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے، اور (اے زیدؓ) تو ڈرتا ہے لوگوں سے حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تو اس سے ڈرے۔۔۔۔۔ اب اس کی وضاحت دیکھئے

حضرت زیدؓ نے بی بی زینبؓ کی شکایت کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ وہ مجھ پر برتری جتاتی ہے اور اپنی زبان سے دکھ پہنچاتی ہے، تو یہ بات سراسر خلاف حقیقت تھی۔ شادی سے پہلے انہوں نے زیدؓ کے رشتہ پر ناگواری کا اظہار ضرور کیا تھا مگر اس دوران جب یہ آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے" کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا" تو زینبؓ نے جان دو عالم ﷺ سے پوچھا!۔۔۔ قَدْ رَضِيْتَهُ لِي يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مُنْكَحًا ۔۔۔؟ (یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ نے زیدؓ کو میرے لیے شوہر کے طور پر پسند کر لیا ہے۔)

جان دو عالم ﷺ نے جواب دیا۔ نعم (ہاں) یہ سن کر بی بی صاحبہ نے فی الفور سر تسلیم خم کیا اور کہا۔۔۔ اگر یہ بات ہے تو میں ہرگز رسول اللہ کی نافرمانی نہیں کرتی۔۔۔ میں نے اپنے کو زیدؓ کے نکاح میں دے دیا۔

جو حق پسند دوشیزہ شادی سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے روبرو عہد واقرار کر لے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم سے سرتابی نہیں کرتی اور پھر آپ ﷺ کی خوشنودی کا اتنا خیال رکھے کہ ایسے مواقع پر ایک کنواری بچی کو جو فطری شرم وحیا لاحق ہوتی ہے اس کو آپ ﷺ کی رضا پر قربان کرتے ہوئے اپنے منہ سے کھل کر کہہ دے کہ میں نے اپنے آپ کو زیدؓ کے نکاح میں دے دیا، اس سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس نے

شادی کے بعد شوہر کو دکھ دینے اور ایذا پہنچانے کا وطیرہ اپنا لیا ہوگا۔۔۔!!

کیا اس کو مندرجہ بالا آیات بھول گئی تھیں کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے بطور شوہر پسند کیا ہے، اس کو ایذا اور دکھ دے کر میں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی مرتکب ٹھہروں گی؟ کیا اس کو شوہر کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کی ممانعت سے متعلقہ رسول اللہ ﷺ کے سارے احکام نسیاً منسیاً ہو گئے تھے؟ یا جان بوجھ کر بی بی نے ان احکامات کو پس پشت ڈال دیا تھا اور۔۔ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا کے زمرے میں داخل ہونے پر کمر بستہ ہو بیٹھی تھی؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا، نہ اس اطاعت شعار خاتون سے اس طرز عمل کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جان دو عالم ﷺ چونکہ اپنی پھوپھی زاد کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ وہ شوہر کو دکھ دینے والی کوئی حرکت کر ہی نہیں سکتی، اس لیے جب زیدؓ طلاق کی اجازت طلب کرنے آئے اور شکایت کی کہ زینبؓ احساس برتری میں مبتلا ہے اور مجھے ایذا پہنچاتی ہے، تو آپ سمجھ گئے کہ زیدؓ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر خواہ مخواہ اپنی بیوی سے بدگمان ہو گیا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے زیدؓ کو تنبیہ کی ''اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور خدا سے ڈر'' یعنی اس پر ایسے الزامات مت لگا جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ خود سوچیے! کہ اگر زینبؓ فی الواقع تیز مزاج ہوتیں تو پھر اللہ سے ڈر، کہنے کا کیا موقعہ تھا؟ اس صورت میں تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اس کی تلخی و تیز مزاجی پر صبر کر اور کسی نہ کسی طرح نباہ کرنے کی کوشش کر! اتق اللہ ''یعنی خدا سے ڈر! کا تو صاف صاف مطلب یہی ہے تو جو شکایتیں لگا رہا ہے وہ خلاف واقعہ ہونے کی وجہ سے تقویٰ کے تقاضوں کے منافی ہیں، اس لیے خدا سے ڈر اور ایسی باتیں نہ کر!

مزے کی بات یہ ہے کہ '' اتق اللہ '' کا یہ مفہوم بعض مفسرین نے بھی بیان کیا ہے چنانچہ علامہ قرطبی لکھتے ہیں ''یعنی کہا گیا ہے کہ اتق اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ سے ڈر اور اس حوالے سے زینبؓ کی برائی مت بیان کر کہ وہ بڑائی جتاتی ہے اور خاوند کو دکھ دیتی ہے، اس تفسیر سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زیدؓ کی شکایات کو درست نہیں سمجھا اور اتق اللہ کہہ کر ان کو ایسی باتیں کرنے سے منع کر دیا، لیکن اتق اللہ کا اگر یہ مفہوم تسلیم کر لیا جاتا تو پھر زینبؓ کی تیز مزاجی اور شوہر کی تحقیر و تذلیل کے وہ افسانے کہاں جاتے' جنہیں داستان گوئی کے رسیا راویوں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا، اس لیے یہ تفسیر روایات کے غوغا میں دب گئی اور عام مفسرین اس طرف چلے گئے کہ اتق اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ سے ڈر اور اپنی بیوی کو طلاق مت دے حالانکہ اگر زینبؓ فی الواقع جھگڑالو اور شوہر کی نافرمان ہوتی تو پھر ایسی عورت کو طلاق دینے سے بھلا تقویٰ کی کیا خلاف ورزی لازم آتی تھی۔۔۔؟ کیا تقویٰ کا یہی تقاضہ ہے کہ بیوی جو چاہے کہتی رہے اور جس طرح اس کی مرضی ہو خاوند کی توہین کرتی رہے اور خاوند سب کچھ کان دبا کر سنتا رہے اور ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر بنا رہے۔۔؟

قارئین کرام! اب آپ کے ذہن میں یہ سوال قدرتی طور پر ابھر رہا ہوگا کہ اگر زینبؓ احساس برتری میں مبتلا نہ تھی، نہ ان کے مزاج میں کسی قسم کی تلخی پائی جاتی تھی تو پھر زیدؓ نے ان کو طلاق کیوں دی۔؟ اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے کے باوجود۔۔۔۔۔۔؟ آخر زیدؓ کی اتنی شدید غلط فہمی اور بدگمانی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا۔۔۔۔!!

جواباً عرض ہے کہ اس کا سبب حضرت زیدؓ کی کوئی نفسیاتی گرہ تھی جس کی وجہ سے ایک زینبؓ ہی کیا، وہ کسی بھی عالی نسب اور خاندانی عورت کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتے تھے، اور انتہائی مختصر عرصے میں نوبت طلاق تک پہنچ جاتی تھی۔ اس بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے حضرت زیدؓ کی عائلی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی پڑے گی۔ حضرت زیدؓ کی پہلی شادی ام ایمنؓ سے ہوئی۔ ام ایمنؓ جان دو عالم ﷺ کے والد ماجد کی کنیز تھی جو وراثت میں جان دو عالم ﷺ کے حصہ میں آئی۔ جان دو عالم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے موقعہ پر انہیں آزاد کر دیا۔ آزادی کے بعد ان کی پہلی شادی عبید بن یزید سے ہوئی، جس سے ایمن نام کا بیٹا پیدا ہوا، اور اسی نسبت سے آپ ام ایمنؓ کہلائیں۔ عبید بن یزید کے بعد ان کی شادی زیدؓ سے ہوئی، اس وقت وہ بالکل نوجوان تھے جبکہ ام ایمن ان سے دوگنی عمر والی ایک گرم و سرد چشیدہ عورت تھیں۔ اگر عمر کے تفاوت کو مدنظر رکھا جائے تو ایسی بے جوڑ شادی شائد ہی کوئی ہوگی مگر ازدواجی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ایک کامیاب ترین شادی تھی جو زیدؓ کے دنیا سے رخصت ہونے تک قائم رہی اور کسی ناخوشگوار نشیب و فراز سے دوچار نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ شوہر و بیوی دونوں ایک مرتبہ کے تھے، یعنی معاشرتی اور سماجی معیار دونوں کا یکساں تھا۔ ام ایمن آزاد کردہ لونڈی تھیں جبکہ زیدؓ آزاد کردہ غلام تھے۔ معاشرتی معیار کی اسی یکسانیت نے دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی اس لیے بخوبی گزر بسر ہونے لگی، لیکن زینبؓ کا معاملہ ام ایمنؓ سے یکسر مختلف تھا۔ وہ نہایت اونچے خاندان کی معزز خاتون تھیں۔ اس بناء پر زیدؓ ان کے مقابلہ میں احساس کمتری کا شکار ہو گئے اور ان سے نباہ نہ کر سکے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زینبؓ کسی قسم کے احساس تفاخر و برتری میں مبتلا نہیں تھیں بلکہ درحقیقت خود زیدؓ احساس کمتری کے اسیر تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ زینبؓ کے علاوہ بھی کسی عالی نسب عورت کے ساتھ گزارا نہ کر سکے۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں۔ ''ترجمہ (جب زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی شادی ام کلثوم بنت عقبہ سے کرا دی، پھر انہوں نے ام کلثوم کو بھی طلاق دے دی اور درہ بنت ابی لہب سے شادی کر لی، پھر درہ کو بھی طلاق دے دی اور زبیر کی بہن ہند بنت العوام سے شادی کر لی) یہ تمام عورتیں خاندانی لحاظ سے نہایت معزز اور بلند پایہ تھیں۔ اگر زینبؓ میں مزاج کی تلخی تھی تو دیگر شریف النسب خواتین کے بارے میں کیا کہا جائے گا، جنہیں زیدؓ نے طلاق

دے دی تھی۔۔۔؟ کیا وہ بھی جھگڑالو اور بدمزاج تھیں؟ کیا ام کلثوم بھی کبر میں مبتلا تھیں اور اپنی برتری جتاتی تھیں۔۔۔؟ کیا درہ بھی ان کی توہین کرتی تھیں اور ایذا پہنچاتی تھی۔۔۔۔؟

زینبؓ کے سلسلے میں تو پھر بھی بقول مورخین یہ پس منظر موجود تھا کہ انہوں نے ابتدا میں زیدؓ سے رشتہ ہونے پر ناگواری کا اظہار کیا تھا، بعد میں آیت نازل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے کہنے اور سننے پر بظاہر رضامند ہوگئی تھیں مگر دل سے خوش نہیں تھی اس لیے زیدؓ سے نباہ نہ کرسکیں۔ اگر زینبؓ کے بارے میں یہ باتیں مان بھی لی جائیں تو دیگر خواتین کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا، وہ سب تو اپنی خوشی اور رضامندی سے زیدؓ کے عقد میں آئی تھیں، پھر ان کے ساتھ زیدؓ کی کیوں نہ نبھ سکی۔۔۔؟ زیدؓ کی شکایتیں لگانے کے باوجود زینبؓ نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مکمل خاموش رہیں، چاہتیں تو جوابی شکایت لگا سکتی تھیں، یا کم از کم اپنا دفاع کر ہی سکتی تھیں، مگر انہوں نے معاملہ اپنے رب پر چھوڑے رکھا اور خود اس جھگڑے سے بالکل کنارہ کش رہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے صبر اور رضا بالقضا کا یہ انداز اتنا پسند آیا کہ جب زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی تو اس صمد و بے نیاز مولا نے بنفسِ نفیس ان کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے کیا اور ان کو امہات المومنینؓ کے مقدس اور پاک زمرے میں شامل کردیا۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ (اے نبی) جب زیدؓ نے زینبؓ سے اپنی ضرورت پوری کرلی اور اسے چھوڑ دیا، تو ہم نے خود تمہارا عقد اس کے ساتھ کردیا، اس طرح مومنین پر واضح ہوگیا کہ منہ بولے بیٹے اگر اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں تو ان سے نکاح کرنے میں کوئی حرج اور تنگی نہیں ہے۔ (سیدالوریٰ سے اقتباس ختم ہوا)

حضرت زیدؓ ہوں یا زینبؓ، دونوں پر اللہ تعالیٰ کی نوازشات ہیں جس طرح زینبؓ کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ دنیا بھر کی خواتین کے نکاح ان کے اولیاء نے کرائے مگر زینبؓ کا نکاح خود رب العالمین نے کرایا اور فرمایا۔۔۔ زَوَّجۡنٰکَهَا اور حضرت زیدؓ کو یہ انعام خداوندی عطا ہوا کہ جہاں بھر کے ممتاز اور بڑے بڑے افراد کا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا جبکہ زیدؓ کا نام بارگاہ ایزدی سے قرآن پاک میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا اور فرمایا۔۔۔ (فَلَمَّا قَضٰى زَيۡدٌ) صرف حضرت زیدؓ کا نام قرآن مجید میں کیوں آیا ہے؟ حضرت امام سہیلی نے لکھا کہ آپ کا نام باقی صحابہ کو چھوڑ کر اس لیے قرآن مجید میں ہے جب آیت ادعوھم لا بائھم نازل ہوئی تو زیدؓ کو زیدؓ بن محمد ﷺ کہنے کی بجائے زیدؓ بن حارثہ کہنے لگے۔ چونکہ زید بن محمد پکارا جانا ان کے لیے بہت بڑی شرافت تھی۔ اس شرافت کے چھن جانے سے وہ مغموم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وحشت اور غم کو دور کرنے کے لیے قرآن کریم میں ان کا نام درج فرمادیا، اب انہیں وہ شرافت ملی کہ نمازوں اور محرابوں میں پڑھا جانے لگا۔ (فیوض الرحمان ترجمہ روح البیان۔ ج۔۸۔ ص۔۵۲۲)

اعتراض نمبر ۱۲۵

آنحضرت ﷺ نے خود اپنے قول کی اپنے فعل سے مخالفت کی اور اصول شکنی کرتے ہوئے سیدہ زینبؓ سے شادی کر لی جوان کے منہ بولے بیٹے کی بیوی تھی۔

جواب: گربہ کشتن روز اول کے مصداق جب معاشرے میں کوئی رسم بد پھیل رہی ہو تو اس کی آغاز ہی میں بیخ کنی کرنا آسان ہوتا ہے اگر آغاز سے غفلت برتی جائے اور اس کا تدارک نہ ہو سکے اور یہ جڑ پکڑتی جائے تو اس کا خاتمہ از حد مشکل اور کٹھن ہو جاتا ہے۔ یہ افراد کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور ناسور کی طرح معاشرے میں سرایت کر جاتی ہے' اس کے مضر اثرات موجود نسل اور آنے والی نسلوں کے افراد کے لیے سم قاتل ہوتے ہیں لمحہ فکریہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس رسم بد کا ادراک بھی ہوتا ہے اور اس کے برے اثرات سے بھی باخبر ہوتے ہیں پھر بھی اس رسم کی اندھا دھند پیروی کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ آہستہ آہستہ رسم بد ان کے رسم و رواج کا حصہ ہی نہیں بلکہ مذہبی رکن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے حالانکہ رسم بد کے اپنانے والوں کے مذہب میں اس کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی بلکہ یہ مذہب کے خلاف رسم اپنے پنجے گاڑھ چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح عرب معاشرے میں کئی بری رسموں میں سے ایک رسم بد تبنیت کی تھی جسے نیست و نابود کرنا آسان نہ تھا ۔کیونکہ عوام کو اپنا مخالف بنانا تھا اور ہر طرف سے طوفان بدتمیزی اور طعن و تشنیع کے تیروں کی بوچھاڑ ہو جاتی۔ اس کی ہوش ربا اور بلند بالا موجیں اتنی مضبوط اور مستحکم ہوتی ہیں کہ ایسے پہاڑ بھی ان کے سامنے کھڑے نہیں رہتے اور بڑے بڑے لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ وہ اپنے کرم سے ایسے ذرائع پیدا کر دیتا ہے جس سے لغو وفضول اور قبیح رسوم کی سونامی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مخلوق خدا پر اپنا رحم فرماتے ہوئے ایک ذریعہ بصیرت جناب مصطفی ﷺ منتخب فرمایا۔ آپ ﷺ نے اپنے عمل سے اس بدترین رسم تبنیت کو ختم کر دیا۔ متبنیٰ کی بیوی بعینہ حقیقی بیٹی کے تھی عرب کا قانون اپنے منہ بولے بیٹے جسے حقیقی بیٹے کا درجہ حاصل تھا' کی زوجہ سے نکاح کی اجازت نہیں دیتا تھا اس کے حرام ہونے میں انہیں قطعاً کوئی شبہ نہ تھا۔ جب سیدنا زیدؓ بی بی زینبؓ کو طلاق دے دی تو آپ ﷺ نے بحکم خداوندی انہیں شرف زوجیت بخشا اس طرح اس بدنما رسم پر کاری ضرب لگا کر ہمیشہ کے لیے اس کا قلع قمع کر دیا۔

رسم تبنیت قدرت خداوندی کا گستاخانہ جواب تھی۔ متبنیٰ بنانے والا شخص گویا خدا سے یہ کہا کرتا تھا کہ اگر تو نے مجھے اولاد نرینہ سے محروم کیا ہے تو کیا ہوا' یہ دیکھا میں نے بیٹا حاصل کر لیا ہے اس کے علاوہ اس رسم کا خاندانی وارثان بازگشت کے حقوق پر بہت برا اثر پڑتا تھا بلکہ یہ کارروائی زہر قاتل تھی کیونکہ ورثاء تو حقیقی طور پر وارث ہوتے تھے اور یہ محروم کنندہ مصنوعی طریقہ سے وارث بنایا جاتا تھا خصوصاً جب

املاک و جائیداد جدی پیدا کردہ ہوتی تھی اس طرح رسم تنبیت سے تمام خاندان میں عداوتوں اور نفرتوں کی بنیاد قائم ہو جاتی تھی اور کبھی نہ ختم ہونے والے جھگڑے برپا ہو جاتے تھے۔ بننے والے فرزند جو شجرہ خاندان سے کٹی ہوئی شاخ کی مانند ہوتا تھا اس کے دل اور روح میں یہ حقیقت کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی تھی کہ اس نئے خاندان سے حقیقت میں اس کا کوئی خونی تعلق نہیں ہے بلکہ دکھاوے کی ساری بنیاد ظاہر داری اور اوپری رسوم پر ہے۔ وہ اگر اپنے حقیقی بھائیوں کو اچھی حالت میں دیکھتا تو ان پر حسد رکھتا تھا اور اگر اس کے حقیقی بھائی اسے اچھی حالت میں دیکھتے تو اس سے حسد کیا کرتے تھے، متبنیٰ کرنے والا اگرچہ لے پالک کو اس کے بچپن اور لڑکپن میں بڑے لاڈ' چاؤ اور پیار سے پرورش کیا کرتا لیکن اس کے جوان ہونے کے بعد جب دیکھتا کہ اس شخص کے خاندانی اوصاف سے وہ کافی حد تک معرا اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ اس کی کتنی بیگانگی اور دوری ہے اس سے اس کا دل بجھ جاتا۔ اس رسم ناگفتہ بہ کی اصلاح کے لیے بلکہ ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو منتخب فرمایا اور قرآن پاک میں بھی اس کا بطلان فرما دیا۔ قرآن مجید میں ہے ''خدا نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا۔ یہ تمہاری باتیں اپنے ہی منہ کی ہیں اور اللہ سچ فرماتا ہے اور سیدھے راستہ پر چلاتا ہے ایسے بیٹوں کو ان ہی کے باپوں کے نام سے پکارا کرو خدا کے ہاں یہی بات ٹھیک انصاف کی ہے۔ اور یہ بھی فرما دیا ''ما کان محمد ابا احد من رجالکم (محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں)'' ان آیات سے اس بری رسم کا بطلان ہو گیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرما چکا تھا ''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ'' (اس سے اس جہالت کا پہاڑ اکھاڑ پھینکنے اور سمندر پاٹ دینے کے لیے آپ ﷺ ہی کو نمونہ بنایا) لے پالک کو بیوی ہمیشہ کے لیے اس کے باپ پر حرام ہوتی ہے اب کہ زیدؓ کی بیوی کو حکم قرآنی سے نبی ﷺ کی بیوی بنا دیا گیا لہٰذا تنبیت کی تائید میں کسی بھی اور چھوٹی بڑی تاویل کی گنجائش نہ رہی۔ حضرت زینبؓ کی شادی زید سے ہونے میں ایک اور خطرناک اور قبیح رسم کا خاتمہ مقصود تھا وہ بھی خاک بوس ہوئی۔ وہ رسم یہ تھی کہ خاندانی کروفر' خاندانی امتیاز اور افتخار نے عرب معاشرے میں ڈیرے ڈال رکھے تھے بڑے اور چھوٹے کی تفریق کی دھن ان کے سر پر سوار تھی اور یہ جنون ان کے دل و دماغ پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ میدان جنگ میں بھی مبارزت طلبی کرتے تو قریش ببانگ دہل کہتے کہ ہمارے درجے اور پلے کا آدمی مقابلہ میں آئے جیسا کہ جنگ بدر میں عتبہ بن ربعیہ جو مکہ کے رئیس' ابوسفیان کا سسر اور بنو امیہ کا چشم و چراغ تھا' میدان میں اترا۔ ایک طرف اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور دوسری طرف اس کا بیٹا ولید تھا۔ دعوت مبارزت دی تو تین انصاری' عوف بن حارثؓ معوذ بن حارثؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ نکلے۔ عتبہ نے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم انصار میں سے ہیں۔ یہ سن کر عتبہ نے کہا ہم کو

ان لوگوں سے مطلب نہیں ہم اپنی قوم سے لڑنا چاہتے ہیں جو ہمارے برابر اور مساوی جوڑ کے ہوں' پھر اونچی آواز سے بولا! اے محمد (ﷺ) ہماری قوم میں سے ہمارے برابر کے لوگ لڑنے کے لیے بھیجو۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے حمزہ بن عبد المطلبؓ' علی بن ابی طالبؓ اور عبیدہ بن الحارث کو بھیجا ان تینوں کا تعلق بنی ہاشم سے تھا اس کے ساتھ ہی خاندانی عصبیت کا ایک اور واقعہ بھی سن لیں۔ ابولہب جو حضور ﷺ کا جانی دشمن اور خون کا پیاسا تھا۔ اس کے بارے امام جوزیؒ نے لکھا ہے کہ ابو طالب کی وفات کے بعد جب آپ پر طرح طرح کی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تو آپ ﷺ کی بے بسی کو دیکھ کر ابولہب کا دل بھی تڑپ اٹھا اور وہ بڑے درد دل کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا'' محمد (ﷺ) جو کچھ تمہاری مرضی میں آئے کرو اور جس طرح ابو طالب کی زندگی میں آپ دینی دعوت دیتے تھے اب بھی اسی طرح اس دعوت کو دیتے رہو' مجھے لات وعزیٰ کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں کوئی شخص تیری طرف نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا''۔ اس کے بعد حارث بن قیس بنی عدی نے آپ ﷺ کو گالیاں دیں تو ابو لہب اس کے گھر گیا اور اس کی خوب گوشمالی کر کے واپس آیا' اس کے بعد ایک مجمع میں جا کر کہا اے قریش کی جماعت! ابولہب صابی ہو گیا ہے؟ یہ آواز قریش پر بجلی بن کر گری چنانچہ قریشی فوراً اس کے مقام پر گئے۔ ابولہب نے کہا'' میں نے عبد المطلب کی ملت سے مفارقت نہیں کی لیکن یہ بات مجھے قطعاً گوارا نہیں کہ میرے بھتیجے پر ظلم اور زیادتی ہو''۔ روسائے قریش نے از راہ نفاق ابولہب کی پالیسی کو سراہا اور کہا کہ یہ قدم اٹھا کر تم نے واقعی صلہ رحمی کا حق ادا کر دیا۔۔۔ اس خاندانی تفاخر کو مٹانے کے لیے آپ ﷺ نے اپنے غلام زید بن حارثہؓ کے ساتھ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کی شادی کر دی غلام و آزاد' امیر اور غریب کے فرق کے بت کو پاش پاش کر دیا اور خطبہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہ دہرا کر'' کسی عربی کو عجمی پر' کسی عجمی کو عربی پر' کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضلیت نہیں' مہر ثبت کر دی اور بی بی زینبؓ کے زیدؓ سے نکاح کر کے عرب کے جاہلی افتخار اور وقار پر کاری ضرب لگائی اور ہمیشہ کے لیے اس فرق کو پیوند خاک کر دیا اور اس کی جگہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا قانون انسانیت کو دیا'' ان اکر مکم عند اللہ اتقا کم '' اس کا رد اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا'' اور خدا نے تمہارے متبنیٰ کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا یہ تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، اللہ حق کہتا ہے اور وہی راستہ کی ہدایت کرتا ہے، متبنیٰ کو اپنے باپ کی طرف منسوب کر کے پکارا کرو۔۔۔ درحقیقت یہ پابندی بیٹے کے اپنے مرحوم باپ کی بیوی سے شادی کرنے سے متعلق تھی بعد ازاں ایک وحی کے نزول کے ذریعے حکم ہوا کہ لے پالکوں کا مقام حقیقی اور قدرتی بیٹوں جیسا نہیں، جس سے اسلام نے متبنیٰ بنانے کو ممنوع قرار دیا۔ جان ڈیون پورٹ لکھتا ہے'' جناب محمد ﷺ کے خلاف ان کے دشمنوں کا یہ الزام کہ لے پالک کی بیوی سے شادی کرنا ناجائز تھا، بے معنی ہے۔ اصل حقائق یہ ہیں کہ نفاذ

اسلام سے پہلے عربوں میں ایک رسم تھی کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ماں کہہ کر مخاطب کر بیٹھتا تو وہ اس عورت کے ساتھ بطور خاوند نہیں رہ سکتا تھا، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی نوجوان کو بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا تو اس نوجوان کو فی الفور حقیقی بیٹے جیسے حقوق کا حق دار ٹھہرایا جاتا مگر قرآن کریم نے ایسی تمام روایتوں کو کالعدم قرار دے دیا ۔۔۔۔۔ کوئی شخص اپنے لے پالک کی بیوی سے شادی کرے تو ایسی شادی شرعاً جائز ہوگی۔ اس رسم بد کو ختم کرنے کے لیے یہ شادی معرض وجود میں آئی اگرچہ اور بھی کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

اعتراض نمبر ۱۲۶

عیسائی حضرات، زینبؓ کی شادی کے واقعہ سے رنجیدہ اور ملول ہیں کیوں؟

جواب: کیا تورات نے تبنیت کو حق ٹھہرایا ہے؟ کیا مسیحؑ نے تبنیت کو جائز تسلیم کیا؟ اور ایک حرف بھی اس کے جواز میں کہا ہے اگر نہیں تو عیسائیوں کو رنج کیوں ہے؟ اس پر وہ سیخ پا کیوں ہوتے ہیں؟ در حقیقت حضرت زینبؓ کی شادی سے کئی ایک قبیح رسوم کا خاتمہ ہوا ہے ان میں سے ایک تثلیث ہے۔ گویا اس رنج کی وجہ یہ ہوئی کہ نبی ﷺ کے اس مبارک نکاح سے نہ صرف رسم تبنیت کا بطلان ہوا بلکہ تثلیث کی چولیں ہلا دیں کیونکہ جب اسلام نے ثابت کر دیا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا بیٹا کہنا' ایسی حالت میں کہ دونوں کے درمیان خون کا رشتہ نہ ہو' بالکل جھوٹ اور باطل ہے اور کامل افتراء وصریح بہتان ہے کھلم کھلا دروغ۔ کیونکہ انسان کو خدا کے ساتھ کوئی مشابہت ہے ہی نہیں' یہ جسم اور روح سے مرکب انسان جو سینکڑوں حوائج انسانی کا محتاج ہے جو ایک دن پیدا ہوا ہے اور اس سے پہلے نہ تھا جو ایک دن مر جائے گا' وہ لقمہ فنا ہوگا کیونکر اس حی وقیوم زندہ' خدا کا فرزند ہو سکتا ہے جس کی ذات سرمدی ازل سے بھی اول اور ابد سے بھی آخر ہے پس یہی ہے وہ راز ہے جس کی وجہ سے عیسائی مبلغین ومستشرقین اس قصہ سے زیادہ ناراض رہا کرتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۱۲۷

بعض کہتے ہیں کہ حکم خداوندی شادی کرنے کا نازل ہوا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے تاخیر کی حالانکہ لوگوں کی تنقید کیے بغیر رب العزت کی مرضی اور حکم کی بجا آوری کرنا چاہیے تھی۔

جواب: اس کا مفصل جواب پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے اور یہ تاخیری پہلو بھی روایات پر مبنی تفسیروں کی گڑبڑ سے پیدا ہوا ہے۔ البتہ یہاں اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ نے زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد اور عدت ختم ہونے کے بعد شادی کر لی۔ جو حضرات تاخیر سے شادی کو ڈر کی وجہ بتاتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ بتائیں جب آپ ﷺ نے شادی کر لی اس وقت ڈر کہاں چلا گیا تھا؟ لوگوں کی

تنقید کی بھی پروانہ رکھی، تو پھر یہ جرات کیسے ہوئی؟ ارشاد ربانی ہے۔
اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (ترجمہ) ''جو امید کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔'' تو پھر یہ بات کس درجہ میں قابل قبول ہو سکتی ہے کہ باقی رسولوں کی تو یہ شان ہو کہ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ، اور جملہ انبیاء ورسل کے سردار تاجدار سے کہا جائے، وَتَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ۔۔۔ بعض تفاسیر کے مطابق وَتَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ سے مخاطب جان دو عالم ﷺ ہیں اور اللہ پاک آپ ﷺ پر عتاب نازل کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اے نبی! تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو یہ خطاب آپ سے نہیں ہے اس کی چند وجوہ ہیں اولاً ۔۔۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک اچھی قوم کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے ولا یخافون لومتہ لائم' یعنی وہ لوگ اسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے'' عام خوف خدا رکھنے والا شخص ڈر کو خاطر میں لاتا تو آپ ﷺ کیسے ڈریں گے مساجد کی تعمیر وغیرہ کرنے والے لوگوں کی شان میں ارشاد ربانی ہے ''ولم یخشی الا اللہ'' یعنی اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے۔ وہ لوگ جو ملامت کرنے والے سے نہیں ڈرتے' مقدس کاموں کی تکمیل میں لوگ کسی ڈر اور خوف کا شکار نہیں ہوتے اور متقین کو بھی ڈر نہیں ہوتا تو بھلا رسولوں کو ڈر کیونکر لاحق ہو سکتا ہے جبکہ ان کے بارے میں نص قطعی موجود ہے۔ ارشاد خداوندی ہے ''اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ'' (جو اللہ کے پیغامات لوگوں تک پہنچاتے ہیں (رسول) اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔) تمام رسولوں کی شان وریٰ الوریٰ ہے اور وہ اس صفت سے بدرجہ اتم متصف ہیں تو تمام انبیاء اور رسل کے سرتاج کے متعلق کہا جائے کہ لوگوں کے ڈر سے شادی میں تاخیر کی' یہ محض معترض کے تعصب کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ الزام کے رد میں ایک حدیث پاک درج کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کو نصرت الرعب عطا کی گئی تھی۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ''مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں ان میں سے پہلی یہ ہے ''ابھی ایک ماہ کی مسافت ہو کہ دشمن پر میرا رعب طاری ہو جاتا ہے۔'' ۔۔۔ آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی میں جھانک کر دیکھا جائے تو آپ ﷺ شہر مکہ کے اندرون و بیرون تن تنہا دن رات آتے جاتے نظر آتے ہیں مگر کسی کو حملہ کرنے کا یارا نہ ہوا ۔تجارتی سفروں' شہروں اور منڈیوں میں ہزاروں اشخاص سے آمنا سامنا ہوا کلمہ توحید بلند کیا اور کفر و شرک سے پرہیز کرنے کی تعلیم دی۔ مکہ سے دور قبائل جو اخلاق سے عاری اور خون بہانے کے خوگر تھے وہاں جاتے تھے اور صرف ابوبکرؓ ہمراہ ہوتے ہر جگہ دعوت توحید دیتے لیکن کوئی بھی مذہبی جنون یا اپنے

مذہب کی مخالفت پر آپ ﷺ سے لڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ طائف کا حکمران اور اہل طائف آپ ﷺ کے شدید مخالف تھے اوباش اور آوارہ لڑکوں نے آپ ﷺ پر آوازے کسے اور سنگ باری کر کے لہولہان کر دیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کے دلوں میں آپ ﷺ کا رعب کیوں نہ ڈالا گیا؟ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے عظیم مظاہر ہیں۔ ان حکمتوں کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ رسل وانبیاء علیھم السلام کی عادت ہے آزمائش کی جاتی ہے اور یہ ان کے لیے عاقبت کی نیکی ہوتی ہے اس میں حکمت الٰہی یہ ہے کہ اگر انبیاء کو ہمیشہ نصرت دی جائے تو البتہ مسلمانوں میں وہ لوگ شامل ہو جائیں گے جو کہ مسلمانوں میں سے نہیں ہیں اور صادق اپنے غیر سے جدا ہونے والا نہ ہوگا اور اگر ہمیشہ رسل علیھم اسلام کو شکست ہو تو بعثت (اعلان وظہور نبوت) سے مقصود حاصل نہ ہوگا چنانچہ حکمت الٰہی نے ان دوامروں کے درمیان جمع کرنے کا تقاضا کیا تا کہ سچائی جھوٹ سے جدا ہو جائے اور وہ یہ ہے کہ منافقوں کا نفاق مسلمانوں سے چھپا ہوا تھا۔ اپنے قول وفعل سے جو شے چھپائے رکھی تھی، وہ صاف ظاہر ہوگئی۔ انہی مظاہر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض جگہوں میں نصرت کی تاخیر نفس کی شکست اور اس کی بلندی وتکبر کی شکست مقصود ہوتی ہے۔ اور یہ بھی حکمت ہے کہ مومن بندوں کے لیے جو درجات اور منازل اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں ان تک پہنچنے کے لیے ابتلاء ورنج کے اسباب جمع کر رکھے ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ درجات اور منازل تک پہنچ پائیں۔

اب اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں یعنی نصرت الرعب! اس وقت یمن کی سلطنت ایران کے قبضہ سے نکل جاتی ہے اور کسی جنگ کے بغیر اسلام کے مطیع ہو جاتی ہے مگر سلطنت ایران یمن کی طرف منہ بھی نہیں کرتی اس لیے کہ حضور ﷺ کا رعب ان کے دل ودماغ پر مستولی تھا۔ شمالی عرب، سلطنت رومہ کے اقتدار سے نکل جاتا ہے اور رومہ کا شہنشاہ فوج کی فراہمی اور حملہ آواری کا حکم جاری کر دیتا ہے اور اس کے دفاع کے لیے حضور ﷺ عرب کی سرحد تبوک تک تشریف لے جاتے ہیں مگر ایک ماہ کی راہ پر (یروشلم میں) بیٹھے ہوئے ایمپرر (emperior) کا دل خوف کے مارے ڈوبنے لگتا ہے حتیٰ کہ سابقہ احکام جنگ منسوخ کر کے دم بخود ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ عرب کی قدیم ترین سلطنتیں حیرہ وغسان قائم تھیں انہی کے دربار کے شعراء خاص حسان بن ثابت اور کعب انصاری تاج پوش بادشاہوں کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ کے آستان پر حاضر ہو جاتے ہیں مگر ان حکمتوں میں سے کسی کو یہ جرات نہیں ہوتی کہ اپنے شاعروں کو واپس لینے کے لیے طاقت کا اظہار کریں اور دربار عالی کے خدام تک کوئی دھمکی آمیز فقرہ بھی پہنچا سکیں۔ ذی ظلیم، ذی بران کی حکومتیں یمن کی جانب اور مکہ سے متصل قائم تھیں ہر ایک حکومت کے پاس باقاعدہ فوج بھی تھی اور خزانے بھی لیکن وہ گھر بیٹھے حضور ﷺ کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ ذوالکلاح حمیری جو اپنے کو سجدہ کرواتا تھا وہ خدا بنا بیٹھا تھا پھر بھی وہ پریشان ہے کیونکہ ایسے کئی فرعون اس اللہ کے

بندے یعنی رسول اللہ ﷺ نے غرقاب کر دیے۔ نبی اکرم ﷺ کی یہ صفت دور و نزدیک ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں ''جو کوئی حضور ﷺ کے سامنے یکا یک آجاتا وہ خوف زدہ ہو جاتا۔ وہی جانی دشمن ابو جہل جب تاجر سے مال لے کر رقم ادا کرنے سے مکر جاتا ہے تو آپ ﷺ اس تاجر کے ساتھ ابو جہل کے گھر جاتے ہیں اور دستک دیتے ہیں وہ باہر آتا ہے تو آپ ﷺ کو دیکھ کر اس قدر خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ فوراً گھر لوٹتا ہے اور رقم لا کر تاجر کو تھما دیتا ہے۔ یہ عطا کردہ نصرت جہاں آپ ﷺ کی عزت و عظمت کو چار چاند لگا رہی ہے وہاں یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ کو سوائے خدا کے کسی کا خوف دل میں نہیں تھا۔ فرض کریں کہ ڈر کی وجہ سے تاخیر ہوئی، مان لیں تو کیا عرب معاشرہ نے اس شادی کو جائز قرار دیا تھا یا رسم تنبیت کو خیر باد کہہ چکے تھے یا تاخیر کی وجہ سے ڈر جاتا رہا تھا؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا لہٰذا یہ الزام کہ شادی رچانے میں ڈر کی وجہ سے تاخیر کی گئی سراسر غلط ہے۔

ولیم میور کی زینبؓ کی شادی سے متعلق افسانوی داستان

محمد ﷺ کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ عمر میں اضافہ کے ساتھ جنس کے معاملہ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور ان کے بڑھتے ہوئے حرم کی کشش ان کو اپنی وسیع حدود سے تجاوز سے باز رکھنے کے لیے کافی نہ تھیں۔ ایک روز وہ اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ سے ملنے ان کے گھر گئے۔ وہ گھر پر موجود نہ تھے، انہوں نے دستک دی اور زیدؓ کی بیوی زینبؓ رسول اللہ ﷺ کا مہذبانہ استقبال کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگیں، لیکن ان کا حسن نیم وا دروازے کے راستے محمد ﷺ کی مشتاق نگاہوں کے سامنے اپنے آپ کو منکشف کر چکا تھا۔ اس منظر سے مغلوب ہو کر انہوں نے بے ساختہ کہا: سبحان اللہ! اے اللہ! لوگوں کے دلوں کو کیسے پھیر دیتا ہے۔ وہ الفاظ جو محمد ﷺ نے واپس جاتے وقت اپنی زبان سے ادا کیے تھے، وہ زینبؓ نے سن لیے تھے۔ وہ اپنی فتح پر نازاں تھیں اور انہوں نے یہ واقعہ اپنے خاوند کے سامنے بیان کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہ کی۔ زیدؓ یہ سن کر فوراً آپ ﷺ کے پاس گئے اور ان کی خاطر اپنی زوجہ کو طلاق دینے کے لیے پیش کش کی۔ انہوں نے کہا: خدا سے ڈر اور اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ! یہ الفاظ بے دلی سے ان کی زبان پر آئے تھے۔

طلاق کے بعد وہ قصہ یوں بیان کرتا ہے ''اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے شادی ایسی بات تھی جو عرب جیسے ملک میں نئی تھی۔ آپ نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نکاح سے ان کی بڑی بدنامی ہو گی لیکن محبت کا شعلہ بجھنے والا نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے ضمیر کی ہر خلش کو جھٹک دیا اور ہر قیمت پر زینبؓ کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا''۔ شادی تو حکم ربی تھا مگر سر ولیم میور کہتا ہے اس نکاح سے محمد ﷺ کی کچھ بدنامی نہ ہوئی اور اپنی شہرت کو محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے وحی کا سہارا لیا اور ایک آیت کی تشہیر کی گئی، جس

میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دیا گیا تھا بلکہ اس بات پر آپ ﷺ کو تنبیہ کی گئی کہ انہوں نے لوگوں کے خوف سے اس شادی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیوں کیا؟ پھر قرآنی آیات پر تبصرہ کرتا ہے ''کیا وحی کے مزاج کو اس سے آگے لے جانا ممکن ہے؟ اس کے باوجود یہ آیت وحی جس میں زینبؓ سے شادی نہ کرنے پر آپ ﷺ کو تنبیہ کی گئی ہے اور دیگر آیات جن میں آپ ﷺ کے اپنے اہل خانہ کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے، وہ سب قرآن مجید کا حصہ ہیں اور آج تک دنیائے اسلام کی ہر مسجد میں کلام اللہ کے طور پر ان کی تلاوت ہوتی ہے۔''

جواب: ضیاالنبی جلد ۷ ص ۵۳۵ پر ہے کہ مستشرق یہ بتائے کہ اس نے آپ ﷺ کی زینبؓ سے محبت کا جو افسانہ تراشا ہے، کیا اس قسم کے افسانے کے مرکزی کردار سے زندگی میں کسی عظیم کارنامے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ جو شخص ساٹھ سال کی عمر میں بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا، صنف نازک کی کشش سے وہ رشتوں کے تقدس کو بھی بھول جاتا ہے، اپنی شہرت اور وقار کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایسے کام کرتا ہے جو خود اس کے اصولوں کے بھی خلاف ہوں اور اس کے وقار کے لیے بھی تباہ کن ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا شخص جب عنفوان شباب میں تھا تو اس وقت اس کے جذبات اس کے کنٹرول میں ہوں گے اور وہ جذبات سے آزاد ہو کر انسانیت کی خدمت میں مگن ہوگا؟ اس بات کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہی انسانی تجربہ۔ ساٹھ سال کی عمر جذبات کی طغیانی کی عمر نہیں ہوتی اور اس عمر کے انسان کی عقل اس کے جذبات پر غالب ہوتی ہے۔ جس شخص کی عمر ساٹھ سال ہو لامحالہ وہ اپنے دور شباب میں اپنی خواہشات کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوگا اور ایسے شخص سے کسی عظیم کارنامے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔''

ولیم میور کی کہانی سابقہ بیان کردہ روایات سے جوڑی گئی ہے ان کا شافی جواب پیچھے گزر چکا ہے اور اس کہانی کا رد ان میں موجود ہے۔

دوسرا جز: میور کا یہ کہنا ''کیا وحی کے مزاج کو اس سے آگے لے جانا ممکن ہے؟ اس کے باوجود یہ آیت اور وہ وحی جس میں زینبؓ سے شادی نہ کرنے پر آپ ﷺ کو تنبیہ کی گئی ہے اور دیگر آیات جن میں آپ ﷺ کے اپنے اہل خانہ کے ساتھ تعلقات کا ذکر ہے، وہ سب قرآن کا حصہ ہیں اور آج تک دنیائے اسلام کی ہر مسجد میں ان آیات کی تلاوت ہوتی ہے''۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سر ولیم میور کی رائے میں خدا کی طرف سے جو قانون نازل ہو، اس میں انسانوں کی خانگی زندگی کا ذکر نہ ہو، خانگی امور سے متعلق الہامی کتاب میں ذکر وحی کے ساتھ مذاق کے زمرہ میں آتا ہے۔ کاش ولیم تھوڑا سا غور کر لیتا تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ بائبل میں خدا کے مقدس نبیوں اور رسولوں کی طرف جو باتیں اور انسانیت کے خلاف حرکتیں بیان کی گئی ہیں، وہ اس

مستشرق کو وحی کے ساتھ مذاق نظر نہیں آتیں۔قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق رہنمائی فراہم کرتا ہے، تو کیا خانگی معاملات میں رہنمائی وحی کے ساتھ مذاق ہے؟ علامہ قرطبی کے حوالہ سے مصنف (ضیا النبی۔۷۔۵۲۹) لکھتے ہیں کہ یہاں جو افسانہ گھڑا گیا ہے یہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جنہیں نبی کریم ﷺ کی عصمت کا علم نہیں یا انہوں نے دانستہ شان نبوت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔علامہ آلوسی کی بھی یہی رائے ہے۔

''امام ابو بکر ابن العربی اس الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ قصہ باطل ہے اس کی طرف دیکھنا بھی صحیح نہیں ہے۔حضرت زینبؓ ہر وقت اور ہر جگہ آپ کے ساتھ رہیں، ان کے درمیان حجاب نہ تھا کہ حضور ان کو دیکھ نہ سکتے تھے نیز یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں نے ایک ساتھ پرورش پائی ہو اور حضور ﷺ انہیں ہمیشہ دیکھتے رہے ہوں مگر ان کی محبت حضور ﷺ کے دل میں پیدا نہ ہوئی ہو اور جب ان کی شادی ہو چکی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی ہو تو اچانک حضور ﷺ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو گئی ہو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جان حضور ﷺ کو ہبہ کی تھی اور کسی کو پسند نہ کیا تھا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضور ﷺ نے پروا نہیں کی تھی، تو وہ محبت جو اتنا عرصہ حضور ﷺ کے دل میں پیدا نہ ہوئی تھی، وہ اچانک کیسے پیدا ہو گئی؟ یقیناً حضور ﷺ کا قلب اطہر اس قسم کی چیزوں سے قطعاً پاک ہے۔''

منٹگمری واٹ اس لغو الزام کو یوں رد کرتا ہے ''ہر قسم کی کہانیوں کے باوجود یہ بات ناممکن ہے کہ زینبؓ کی جسمانی کشش کی وجہ سے محمد ﷺ کے قدم ڈگمگائے ہوں۔کہا جاتا ہے کہ محمد ﷺ کی دوسری بیویاں زینبؓ کے حسن سے خائف تھیں لیکن محمد ﷺ کے ساتھ شادی کے وقت ان کی عمر ۳۵ یا ۳۶ سال تھی۔ایک عرب عورت کے لیے یہ عمر بڑی شمار ہوتی ہے''۔ایک اور موقعہ پر اس شادی کو یوں بیان کرتا ہے۔''یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ محمد ﷺ جیسا ۵۶ سالہ شخص ایک ایسی عورت کے متعلق جذبات کی رو میں بہہ گیا ہو جس کی عمر ۳۵ سال یا اس سے زیادہ تھی'' اس شادی کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہی مورخ لکھتا ہے ''زینبؓ بنت جحش سے محمد ﷺ کی شادی کے وقت جو تنقید ہوئی تھی اس کی وجہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی، جس کو اسلام نے ختم کر دیا اور اس شادی سے آپ ﷺ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے رویہ پر اس پرانی رسم کا جو غلبہ تھا، اس کو ختم کیا جائے۔اس شادی کا یہ مقصد اس کے دیگر ممکنہ مقاصد کے مقابلے میں کتنا اہم تھا؟'' واٹ کی تردید نے ولیم میور کے الزام کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔باسورتھ کہتا ہے ''غلط فہمی کی بنیاد پر کی گئی اتہام طرازی سیدہ زینبؓ کی داستان میں کارفرما نظر آتی ہے مثال کے طور پر سیدہ زینبؓ بنت جحش جناب پیغمبر ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور جب پیغمبر ﷺ کی ان کے ساتھ شادی کوئی امر مانع نہیں تھا خصوصاً جب دونوں عنفوان شباب سے گزر رہے تھے۔(امہات المومنین اور مستشرقین۔ص۔۱۶۶)

اعتراض نمبر ۱۲۸

ولیم میور اور ٹارانڈرائے اس قصہ کو افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہیں لیکن فدنزیو (Fidenzio) نے اسے مزید پر کشش بنایا ہے اور تاریخی حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے تخیل کی بنیاد پر افسانہ کو یوں لکھتا ہے۔ ''اس علاقہ میں سیدروس نامی ایک شخص رہتا تھا، جس کی بیوی زینب تھی۔ یہ اپنے زمانہ کی خوبصورت عورت تھی۔ محمد ﷺ نے اس کے حسن و جمال کا شہرہ سنا اور ان کے دل میں اس کی محبت نے میں ڈیرے ڈال لیے۔ محمد (ﷺ) نے اس عورت کو دیکھنے کا ارادہ کیا اور اس کے خاوند کی عدم موجودگی میں اس کے گھر گئے۔ انہوں نے عورت سے اس کے خاوند کے متعلق پوچھا: عورت نے کہا (یارسول اللہ!) آپ کیسے ہمارے گھر تشریف لائے ہیں، میرا خاوند تو اپنے کام پر گیا ہوا ہے؟ عورت نے اس ملاقات کی خبر اپنے خاوند سے پوشیدہ رکھی۔ خاوند نے اس سے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ یہاں تشریف لائے تھے۔ اس نے جواب دیا، ہاں! وہ یہاں آئے تھے، خاوند نے پوچھا: کیا اس نے تمہارا چہرہ دیکھا تھا؟ اس نے کہا: ہاں! انہوں نے میرا چہرہ دیکھا تھا اور دیر تک اسے دیکھتے رہے، اس پر اس عورت کے خاوند نے کہا کہ اس کے بعد میرا تمہارے ساتھ رہنا ناممکن ہے۔ (ضیا النبی۔ ۷۔ ۵۳۳)

جواب: مستشرقین نے اپنے تعصب کی بنیاد پر اپنے اپنے انداز میں من مرضی کے اعتراض کیے ہیں فدنزیو نے بھی اپنے انداز میں نہایت دل خراش اور لغویت سے بھرپور کہانی بیان کی ہے۔ اس اعتراض کی تردید اور رد میں ان کے اپنے ہم نوا جان بیگٹ گلب (John bagot glubb) کا بیان نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ نوجوان تھے۔ خدیجہ کے بطن سے ان کے چھ بچے تھے، لیکن ان کے بعد ماریہ قبطیہ سے ایک بیٹے کے علاوہ دوسری عورتوں سے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آپ کی اکثر زوجات گویا بالکل نوجوان تو نہ تھیں البتہ وہ بچوں کو جنم دینے کے قابل تھیں۔ مدینہ میں محمد ﷺ کو فرصت کا وقت بہت کم ملتا تھا اور اکثر اوقات آپ ذہنی اور جسمانی طور پر بہت زیادہ تھکے ہوئے ہوتے ہوں گے، خصوصاً جبکہ آپ ﷺ کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی، یہ حالات ایسے نہیں جن میں مرد زیادہ جنسی تعلقات کی طرف رغبت محسوس کرتے ہوں۔'' (حوالہ بالا۔ ۵۴۳)

حضور ﷺ کی ایک حدیث پر خوبصورت انداز میں تبصرہ کرتا ہے جس سے بیگٹ مذکورہ اعتراض کی نفی کرتا ہے۔ حدیث یہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس دنیا میں مجھے عورت اور خوشبو پسند ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔ بیگٹ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ کا عورتوں کی محبت کو عبادت کے ساتھ جمع کرنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ کا عورتوں کی معیت کا شوق بالکل معصوم تھا۔ (حوالہ بالا) عنفوان شباب میں آپ ﷺ نے کسی زوجہ مطہرہ کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر شادی نہیں کی تھی

۔آپ ﷺ نے تو کفار مکہ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا جب انہوں نے کہا کہ اگر آپ حسین وجمیل دوشیزہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ہم انتظام کر دیتے ہیں۔ زیدؓ آپ کا متبنیٰ تھا اور آپ کا غلام تھا اور زینبؓ آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں جس کا نکاح آپ نے اپنے غلام زیدؓ سے کیا لیکن سیدروس ایک غیر معروف نام ہے جس کا آپ سے رشتہ نامعلوم ہے اور زینب سے بھی کوئی آگاہی نہیں کہ اس کا آپ ﷺ کے ساتھ کیا رشتہ تھا صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ زینب سیدروس کی بیوی تھی اس طرح سے اس کہانی کے من گھڑت ہونے کی غلطی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کہانی کا ہر لفظ اس کے وضعی ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔

اعتراض نمبر ۱۲۹

B.Z.U میں ایم فل اور پی ایچ ڈی طلبہ وطالبات کے ایک عالم دین سے پوچھے گئے سولات بسلسلہ تفردات ''سیدالوریٰ'' میں ایک طالب علم کا سوال یہ تھا کہ آیت ''وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ'' میں عورت کی آزادی رائے کو سلب کیا جارہا ہے۔

جواب: روز اول ہی سے مخلوقات خدا میں برتری و بڑائی اور خاندانی افتخار اور امتیاز کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ معاشرہ رنگ ونسل' لسانی اور علاقائی لحاظ سے بٹ چکا ہے ان عارضی امتیازات و مفادات نے علم وعمل کو اپنی بساط میں لپیٹ کر علم وعمل کی سیدھی راہ ٹیڑھی کردی ہے۔ ہر فرد پر بلند و بالا مقام کے حصول کی دھن سوار ہے۔ قصہ آدم وابلیس نے دورویوں مثبت اور منفی برتری اور کمتری کو جنم دیا۔ فوقیت کی انگیخت پر ابلیس نے کہا ''انا خیر منہ'' اور اس دعوی کی دلیل یہ پکڑی کہ ''خلقتنی من نار و خلقتہ من طین'' اللہ تعالیٰ کو یہ بڑا بول پسند نہ آیا اور '' فاخرج منها فانك رجيم '' فرما کر راندہ درگاہ بنادیا۔ اسلام میں برتری اور بڑائی اور اس پر اترانے اور فخر کرنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے جس نے بھی اس پر عمل کیا وہ سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ دوسری طرف نسل رنگ' لسانی اور علاقائی تفاخر پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ان امتیازات کو ختم کر کے انسان کی عزت ووقار کا وہ نفع بخش سنہری ضابطہ ''ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم'' عطا فرمایا جس کی رو سے ایرانی نژاد فارسی مسلمان صحابی سلمان کو مخاطب کر کے یہ اعزاز ''سلمان من اہل البیت'' بخشا۔ ایک موقعہ پر ان امتیازات کے خاتمہ کے لیے فرمایا ''الناس کلھم بنی آدم و آدم من تراب'' (تمام انسان بنی آدم ہیں اور آدم مٹی سے ہیں)

اسلام میں سب انسانوں کو برابری کا مذہبی' اخلاقی اور قانونی حق حاصل ہے۔ رنگ ونسل کی تفریق اس برابری کے حق کو چھین نہیں سکتی۔ غسان کا ولی عہد جبلہ بن ایہم نے عیسائیت کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کر لیا وہ ایک دن شہانہ لباس میں ملبوس محو طواف تھا' ساتھ ہی ایک بدو بھی خانہ کعبہ کے طواف میں مگن تھا کہ اچانک بلا ارداہ بدو کا پیر جبلہ کے لباس سے جا ٹکرایا' نسلی تفاخر سے بھرا شہزادہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بدو کے تھپڑ رسید کیا۔ ہر بندہ حالات سے باخبر تھا اور ہر کوئی جانتا تھا کہ یہاں انصاف ملتا ہے اور ہر

فیصلہ برمبنی انصاف ہوتا ہے۔ بدو حضرت عمرؓ کی خدمت میں شکایت کرتا ہے‘ خلیفہ نے انصاف کو سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے ولی عہد شہزادہ کے خلاف اپنا فیصلہ دیا: فرمایا! دیکھو جبلہ! اسلام میں سب انسان برابر ہیں اور اس حق کو رنگ ونسل‘ علاقہ اور لسان کمزور نہیں بنا سکتے‘ اس غریب بدو کو راضی کردو‘ ورنہ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ‘‘ اَلْاِنْسَانُ بِاَصْغَرَیْهِ الْقَلْبُ وَالِلّسَانُ ‘‘ اس بنیادی تمہید کے بعد اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

ایک طالب علم کا سوال یہ تھا کہ قاضی صاحب نے پھوپھی زاد بہن کے حوالے سے جب یہ گفتگو کی تو اس سے پہلے وہ یہ کہہ چکے تھے کہ عورت کو مکمل آزادی دی گئی ہے حتیٰ کہ اللہ کے نبی‘ آخری پیغمبر ﷺ بھی کسی عورت سے نکاح کی خواہش کریں تو وہ عورت انکار کر سکتی ہے۔ چونکہ اسے بھی آزادی رائے کا حق حاصل ہے لیکن جب یہ واقعہ ہوا اور آپ ﷺ نے چاہا کہ بی بی زینبؓ کا نکاح زیدؓ سے ہو جائے اور اس پر آپ ﷺ نے بی بی زینبؓ کو زیدؓ سے نکاح کا پیغام بھیجا تب یہ آیت نازل ہوئی‘‘ وما کان لمومن ولا مومنته اذا قضی الله و رسوله ‘‘ کیا یہ ڈرایا دھمکایا نہیں جا رہا ہے؟ اس آیت کے بعد ان کا مان جانا اس بات کو اور اس آیت کا خاص اس موقعہ پر نزول جیسا کہ قاضی صاحب بتا رہے ہیں تو یہ کس بات کی طرف اشارہ ہے؟ پروفیسر حافظ سلیم نے کہا کہ تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ بات آزادی نسواں کے خلاف ہے‘ کھل کر کہیں طالب علم نے کہا جی! ان کی گفتگو سے بظاہر یہی لگ رہا ہے‘ کیونکہ وہ فرما رہے ہیں کہ عورت کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے جیسے ایک خاتون حضرت ریحانہؓ نے انکار بھی کر دیا اس پر قاضی صاحب نے کہا کہ میں عرض کروں کہ ایک ہے فیصلہ ہو جانا کسی چیز کا‘ اذا قضی الله و رسوله اور ایک ہے کسی چیز کو بطور مشورہ کے پیش کرنا۔ پہلے تو حضرت زینبؓ کے سامنے حضور ﷺ نے مشورہ کے طور پر نکاح کا پیغام بھیجا‘ اس وقت ان کی طبیعت نہ مانی پھر جب قضی اللہ و رسولہٗ ہو گیا‘ یعنی اللہ اور رسول نے فیصلہ فرما دیا‘ اس کے بعد کسی کو حق نہیں ہے۔ بی بی ریحانہؓ والا یہ معاملہ نہیں ہوا تھا ان سے شادی کرنے کا مشورہ تو کیا تھا لیکن قضی اللہ و رسولہ کا مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بی بی ریحانہؓ نے اس وقت انکار کر دیا تھا لیکن پھر اگر وحی آتی کہ کسی مومن کو حق نہیں ہے وہ نبی ﷺ کے بارے میں اس طرح کی بات کرے تو پھر ان کے لیے انکار کی گنجائش نہ تھی: اس سوال پر پروفیسر عبدالباسط ڈاکٹر عبدالقدوس اور ڈاکٹر سعید الرحمٰن نے بھی طالب علموں کے علاوہ حصہ لیا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے طالب علم نے کہا کہ میرا سوال وہیں کا وہیں ہے۔ پروفیسر سعید الرحمٰن اس طالب علم سے مخاطب ہوئے اور کہا اس پر تم سے ایک assignment لکھواؤں گا پھر باقی حضرات کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جواباً عرض ہے کہ بی بی زینبؓ کو حضرت زیدؓ سے نکاح کا پیغام بھیجا جاتا ہے یہ ایک مشورہ اور

تجویز تھی۔ یہ بات بالکل درست ہے پھر یہ کہنا کہ طبیعت نہ مانی' اس کے بعد قضی اللہ ورسولہ' ہو گیا یعنی اللہ اور اس کے رسول نے فیصلہ دے دیا کہ اس کے بعد کسی کو کوئی حق نہیں۔۔۔ یہاں پر قاضی صاحب کو سہو ہوا ہے وہ یوں کہ مشورہ ہو یا تجویز اس میں مکمل طور پر عورت کو رائے کی آزادی ہے لیکن بات یہاں گڈ مڈ ہو گئی ہے جب بی بی زینبؓ نے کہا "میں زیدؓ کو پسند نہیں کرتی ہوں کہ میں ایک قریشی خاتون ہوں اور نسب کے لحاظ سے اس سے بہتر ہوں" تجویز کو صرف اور صرف نسبی برتری پر تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے' جو غلط ہے کیونکہ اسلام کسی بڑائی اور برتری کو پسند نہیں کرتا بلکہ برتری کا معیار ان الفاظ میں برملا کرتا ہے "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" ' اللہ تعالیٰ نے بی بی زینبؓ کی آزادی رائے کو اس وقت سلب کیا جب اس میں حسب و نسب کی خام خیالی برتری کی باطلانہ آمیزش ہوئی۔ اگر یہ باطلانہ آمیزش نہ ہوتی اور سیدھا سادھا جواب دیا جاتا کہ میں انہیں ناپسند کرتی ہوں یا اس کے علاوہ بی بی ام ہانی کی طرح معقول عذر پیش کرتی تو پھر اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ اور ہوتا یعنی بی بی زینبؓ کی آزادی رائے کا پورا پورا احترام اور خیال رکھا جاتا۔ اس مثال کو پڑھیے جس سے یہ معاملہ صاف اور واضح ہو جاتا ہے اور ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے نیز مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت ام ہانی (دختر ابو طالب) کا شوہر ہبیرہ بن ابی وہب اپنی اولاد کو چھوڑ کر دم دبا کر بھاگ گیا۔ ازاں بعد حضرت علیؓ نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ ام ہانی اسلام قبول کر چکی ہیں لہٰذا اگر قرابت کے ساتھ رشتہ ءمناکحت بھی ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو! آپ ﷺ نے علیؓ کی تجویز منظور فرمائی اور نکاح کا پیغام بھیجا۔ ام ہانی نے جواب میں کہا: میں جب زمانہ جاہلیت میں آپ ﷺ کی ذات سے انس و محبت کرتی تھی تو زمانہ اسلام میں تو اس کا کیا ہی کہنا مگر میں بال بچوں والی ہوں اور اسے برا جانتی ہوں کہ آپ ﷺ کی زحمت کا باعث بنوں۔ (امیر المومنین علی: ۴۴۔۴۵)

آپ ﷺ نے ان کے عذر کو شرف قبولیت بخشا اور آپ ﷺ نے زبردستی اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسا اور نہ ہی دھونس دھمکی سے منوایا بلکہ ان کی مجبوری اور جائز عذر کو قبول فرمایا۔ یہ ہے آزادی رائے کا احترام' لیکن بی بی زینبؓ والے معاملہ میں عذر درست نہ تھا اسلامی تعلیمات کے خلاف اور ابلیسی نظریات کے مطابق تھا اگر یہ عذر تسلیم کر لیا جاتا تو جہالت اور اسلام میں کیا فرق رہ جاتا؟ زمانہ جہالت میں اشراف کی بیٹیاں آزاد شدہ غلاموں سے نکاح کرنا عار اور توہین سمجھتی تھیں جبکہ اسلام اس کے خلاف درس دیتا ہے کہ چاہے کوئی بھی اسلام کے خلاف برتری و بڑائی کا اظہار ہوا سے ناجائز سمجھ کر اس برتری کے بت کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیا جائے۔ خطبہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا "اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہو اور پرہیزگار' یاد رکھو کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی برتری

نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری ہے مگر تقویٰ کی وجہ سے۔'' آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہاں! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے ساتھ لیا ہے اور اللہ کے کلمہ کے ساتھ حلال کیا ہے' یہ بھی جان لو کہ تمہارا بھی تمہاری بیویوں پر حق ہے اور ان کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔۔۔۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر بی بی زینبؓ کے نکاح کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ صادر ہوا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ فیصلہ نہ دھمکی تھا اور نہ زبردستی اس حکم کو منوایا گیا بلکہ یہ بی بی زینبؓ کے خام عذر کی بنیاد پر فیصلہ آیا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دیں تو کسی مومن یا مومنہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرے۔ آزادی رائے کے باب میں اسلامی تاریخ کا یہ ایک تاباں اور درخشاں باب ہے اور نبی پاک ﷺ صحابہ کرام کی آراء کے بڑے قدردان تھے اور کئی مواقع پر ان کی آزادی رائے کو پسند کیا اور قبول فرمایا۔

اعتراض نمبر ۱۳۰

ایک دانشور کا سوال ہے کہ جب بی بی زینبؓ کنواری تھیں تو اس وقت آپ ﷺ ان سے نکاح نہیں کرتے ہیں اور جب وہ شادی شدہ ہو جاتی ہیں تو ایک سال کے اندر ہی آپ ﷺ کا دل کرتا ہے کہ میں ان سے نکاح کروں یہ بات خلاف عقل لگتی ہے گھٹیا بندہ بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو ایسا کام آپ ﷺ کیوں کرتے ہیں؟ صرف رسم کو توڑنے کے لیے؟

جواب: جب نبی ﷺ نے زینبؓ کی شادی زیدؓ سے کر دی تو وہ زیدؓ کے پاس کچھ عرصہ تک رہیں پھر ایک دن نبی ﷺ زیدؓ کی تلاش میں ان کے گھر گئے تو آپ ﷺ نے زینبؓ کو کھڑے دیکھا اور زینبؓ گوری چٹی' خوبصورت اور گدرائے بدن والی ایک بھرپور قریشی عورت تھیں۔ انہیں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو ان سے محبت ہو گئی اور آپ ﷺ نے فرمایا ''سبحان اللہ مقلب القلوب'' (اللہ دلوں کو پھیرنے والا ہے) یہ تسبیح بی بی زینبؓ نے بھی سن لی جب زیدؓ آئے تو ان کو یہ بات بتائی زید سمجھ گئے۔ اور رسول اللہ سے کہا یا رسول اللہ! مجھے زینبؓ کو طلاق دینے کی اجازت فرما دیں کیونکہ اس میں کبر ہے' وہ مجھ سے برتری جتاتی ہے اور اپنی زبان سے مجھے دکھ پہنچاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: امسک علیک زوجک واتق اللہ'' (اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر) مذکورہ روایت میں نہایت دل خراش باتیں ہیں۔ مثال کے طور پر کبر' گوری چٹی' خوبصورت' گدرائے بدن والی اور ایک بھرپور قریشی عورت وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی محبت نے آپ ﷺ کے دل میں اس وقت کیونکر گھر نہ کیا جب وہ کنواری تھیں' غیر شادی شدہ تھیں اور ان سے شادی کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ اس وقت ان کی خوبصورتی اور گدرائے بدن کا اثر آپ ﷺ پر کیوں نہ ہوا۔ اب ایسا کیا ہوا کہ شادی کے بعد

اس قدر پسند آئیں کہ آپ ﷺ زیدؓ اور زینبؓ کے درمیان علیحدگی کے خواہش مند ہوئے اللہ کی پناہ! آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ مباح کاموں میں طلاق سب سے ناپسندیدہ عمل ہے۔ کیا یہ فرمان آپ ﷺ کے لیے نہیں تھا صرف دوسروں کے لیے تھا؟ ہرگز ہرگز نہیں کیونکہ آپ ﷺ نے زیدؓ کو طلاق دینے سے منع فرمایا تھا۔ اس روایت میں ہے کہ ''آپ ﷺ کا دل کرتا ہے کہ وہ زینبؓ سے نکاح کر لیں'' اب اچانک انہیں زینبؓ سے شادی کرنے کا خیال کیونکر ہوا جب کہ شادی سے پہلے ان سے رشتہ مناکحت نہ جوڑا۔ آپ ﷺ نے عمر بھر لوگوں کو جوڑا ہے' توڑا نہیں تو اب زیدؓ کے گھر کو کیوں آباد رہنا پسند نہیں کرتے یہ ناممکن ہے کہ بی بی زینبؓ کی خوبصورتی اتنی پسند آئی اور ان سے نکاح کے لیے دل آ گیا حالانکہ آپ ﷺ کی زندگی میں حسین وجمیل خواتین کی کمی نہ تھی۔ آپ ﷺ کو یہ طلب ہوتی تو عرب معاشرہ جس میں نکاح کرنے کی رکاوٹ نہ تھی' کر سکتے تھے مگر ایسا نہیں کیا آپ ﷺ کا دل کرتا ہے کہ الفاظ شان نبوت میں گستاخی ہے اور آپ ﷺ پر یہ الزام لگانا توہین اور بے ادبی ہے۔ دوسری طرف بی بی زینبؓ نے اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر سرِ خم تسلیم کیا اور دل وجان سے زیدؓ کے ساتھ نکاح کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

شادی کے بعد پھر سے بڑائی اور برتری جتلانا شروع کر دی ہو ممکن نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ پر شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کی پاسداری رکھے گی اور اپنے شوہرِ نامدار کا ادب واحترام کرے گی اور گھر کے کاموں کو سلیقہ شعار بیوی کی طرح نمٹائے گی انہوں نے ایسا ہی کیا اور ان کی طرف سے کسی قسم کی برتری جتانے کی ایذا رسانی نہیں ہوتی۔ البتہ سو ہاتھ لمبا رسہ سرے پے گانٹھ یعنی زیدؓ احساس کمتری کا شکار تھا اس مصیبت میں دوچار ہو کر حضرت زیدؓ نباہ نہیں کر سکتے تھے اور طلاق دے دی۔

ایسا کوئی غیر جانب دار مصنف خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو' ایسی دکھ دینے والی اور دلخراش بات نہیں کر سکتا جیسی اپنوں نے' زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھنے کی بجائے نمک پاشی کی۔ وہ ذات جس نے پچیس سال تک جوانی کا زمانہ بغیر شادی کے بِتا دیا اور برائیوں کے شکنجہ میں جکڑا عرب معاشرہ میں کوئی برائی بھی آپ ﷺ کے پاک دامن اور عصمت کو مکدر اور آلودہ نہ کر سکی۔ دین اسلام کی دعوت سے کفار اور مشرکین لرزاں وترساں تھے کیونکہ انہیں معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے خداؤں اور معبودان باطل' دیوی دیوتاؤں کا اقتدار چراغ سحری ہے اس کو روکنے کے لیے آپ ﷺ کو ڈرایا دھمکایا گیا' بادشاہ بنانے کا لالچ دیا گیا اور عرب کی دوشیزہ حسیناؤں کی پیشکش کی لیکن آپ ﷺ پر دھونس ودھمکی کا کچھ اثر نہ ہوا لالچ کے برے جال میں نہ پھنسے اور دل فریب ودلکش پیشکش کو ٹھکرا دیا اور دعوت توحید کو لوگوں تک پہنچانے پر سودا بازی نہیں کی۔ جب آپ ﷺ کی عمر مبارک ۵۷ سال تھی' اس وقت عہد جوانی قصہ پارینہ ہو چکا تھا اور کہولت کا دور

سایہ فگن تھا نہ جانے کس چیز نے آپ ﷺ کو انگیخت دی کہ جذبات کے سمندر میں تلاطم خیز طوفان برپا ہوتا ہے اور بی بی زینبؓ جس سے جوانی میں شادی نہ کی اس کی گوری رنگت اور خوبصورت' گدرائے بدن کو دیکھ کر اب دل کرتا ہے۔ایسا کچھ بھی نہیں بلکہ یہ شادی بی بی زینبؓ کے تالیف قلب کے لیے تھی۔

جب زیدؓ نے اپنی بیوی زینبؓ کو طلاق دے دی تو جہاں بی بی زینبؓ کو دھچکا لگا ہو گا وہاں آپ ﷺ کو بھی بہت دکھ اور صدمہ ہوا ہو گا کیونکہ وہ رشتہ جو آپ ﷺ نے خود کروایا تھا ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر طرف سے آوازے کسے جاتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کر کے طوفان بدتمیزی اٹھ آتا ہے۔طعن و تشنیع کے تیروں کی بوچھاڑ ہوئی ہو گی۔کسی نے کہا ہو گا کہ غلام سے شادی کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا' کسی نے کہا کہ بچاری زینبؓ کی ایک نہ سنی گئی اگر چہ اس نے صاف انکار کیا تھا۔کوئی یہ کہتا ہو گا کہ بھلا غلام کب اپنے بنتے ہیں۔کوئی کہتا ہو گا اپنے خاندان کے وقار کو بھی بٹہ لگایا لیکن شادی قائم نہ رہی' اب معاشرہ میں اس کی عزت کیا رہ گئی اور معاشرہ اسے قبول کرتا ہے یا نہیں یعنی اس سے کوئی شادی کرنے کو تیار ہوتا ہے کہ نہیں کیونکہ فی الحال اس کی دنیا اجڑ چکی تھی' مقدر گہنا گیا تھا اور بظاہر یہی لگتا تھا مگر کسے خبر تھی کہ اس کا مقدر پہلے سے بھی روشن اور تابناک ہے۔اس گلشن معاشرت میں پھر سے بہار بے خزاں آنے کو ہے۔ اس کے بخت کا ستارا طلوع ہونے کو ہے اور اس کی عزت وعظمت کی بلندی پر اوج ثریا بھی رشک کناں ہے آخر کار بختوں کا سورج چمکا' سارے دکھ اور غم کافور ہو گئے اور سارے سکھ بی بی زینبؓ کی جھولی میں سمٹ آئے وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور بی بی زینبؓ کا نکاح خود اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ سے کر دیا اور بی بی زینبؓ ام المومنین کے اعزاز سے نوازی گئیں۔آپ نے یہ شادی بی بی زینبؓ سے محض تالیف قلبی کی وجہ سے کی تھی کسی رسم بد کے خاتمے پر اس کا انحصار نہ تھا البتہ اگر کوئی رسم قبیح اس شادی کے سبب ملیا میٹ ہو گئی تو فبھا۔نہ اس سبب سے آپ ﷺ نے بی بی زینبؓ سے نکاح کیا کہ ان کی رنگت سفید اور جوانی سے بھرا بدن اور بھر پور قریشی تھیں۔صرف اور صرف طلاق کے بعد ان کو سہارا دینے کے لیے یہ اقدام اٹھایا گیا تھا۔

اعتراض نمبر ۱۳۱

آپ ﷺ نے رسم تنبیت توڑنے کے لیے بی بی زینبؓ سے نکاح کیا۔

جواب: ام ایمن کی شادی پہلے عبید بن یزید سے ہوئی۔ان کے ہاں ایمن نامی بیٹا پیدا ہوا جس کی نسبت سے وہ ام ایمن کہلائیں۔ازاں بعد ان کی شادی زید بن حارثہؓ جو آپ ﷺ کے غلام تھے ان کے ساتھ ہوئی۔یہ شادی عمر کے بہت زیادہ فرق کے باوجود کامیاب رہی۔عمر بھر خوب گزر بسر ہوتی رہی حتیٰ کہ زیدؓ کے اس دنیا سے دوسری دنیا کو سفر کرتے وقت تک قائم رہی۔زیدؓ کی دوسری شادی آپ ﷺ کی

پھوپھی زاد اور حضرت عبدالمطلب کی نواسی زینبؓ سے ہوتی ہے۔انہیں طلاق دینے کے بعد زیدؓ ام کلثوم بنت عقبہ سے شادی کر لیتے ہیں' انہیں بھی طلاق دے دی پھر درہ بنت ابی لہب سے شادی کا رشتہ جوڑتے ہیں ان سے بھی نباہ نہ ہوسکا اور نوبت طلاق تک جا پہنچی بالآخر انہیں بھی طلاق دے دی اور زبیرؓ کی بہن ہند بنت العوام سے شادی کر لی۔ یہ تمام خواتین جن سے زیدؓ نے رشتہ مناکحت جوڑا وہ خاندانی عزت و وقار اور بلند درجہ کی تھیں۔فرض کریں کہ بی بی زینبؓ کے مزاج میں سختی و درشتی تھی وہ جھگڑتی رہتی تھیں تو باقی خواتین جنہیں زیدؓ نے طلاق دی تھی وہ بھی سخت و درشت مزاج اور جھگڑالو تھیں یا وہ اپنی خاندانی برتری جتاتی اور زیدؓ کو ایذاء پہنچاتی تھیں۔۔۔؟ دوسری طرف ام ایمن سے شادی کامیاب رہی اس قدر کامیاب کہ زیدؓ کے مرتے دم تک قائم رہی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیدؓ کسی بیماری کا شکار تھے کہ یکے بعد دیگرے شادیاں کرتے رہے اور طلاق دیتے رہے۔وہ بیماری احساس کمتری کی لگتی ہے۔ام ایمن کے بجز باقی تمام خواتین اعلیٰ نسب اور عمدہ درجہ کی تھیں۔اس درجہ کے تفاوت سے ان کی شادیاں ناکام ہوئیں بی بی زینبؓ کی غلام سے شادی کی بناء پر بندہ و آقا کا فرق مٹ تو گیا لیکن شادی ناکام ہوئی لیکن ان نکاحوں سے کسی رسم کو مٹانے کی غرض نہیں تھی کیونکہ زیدؓ نے تمام بیویوں کو محض احساس کمتری کے اسیر ہونے کے سبب سے طلاق دی تھی۔

آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا" جاہلیت کے تمام امور میرے قدموں کے نیچے پامال ہیں اور جاہلیت کے تمام خون معاف اور ختم ہیں اور سب سے پہلے میں ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کے بیٹے کا خون جو ہذیل کے ذمہ ہے معاف کرتا ہوں" (یہ بچہ بنوسعد نے دودھ پی رہا تھا کہ بنوہذیل نے اسے قتل کر دیا) یہ بھی فرمایا" جاہلیت کے تمام سود ختم کر دیئے گئے ہیں تمہارے لیے اب صرف راس المال ہے' نہ تم ایک دوسرے پر ظلم کرو' نہ قیامت کے دن تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے گا۔اللہ تعالیٰ نے سود کو ممنوع قرار دیا ہے سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سارا سود ساقط اور باطل کرتا ہوں"۔قارئین کرام دیکھا! کہ ایسی قبیح رسموں کے خاتمہ کے لیے پہل اپنے گھر سے کی کہ کوئی یہ نہ کہہ دے' اوروں کو نصیحت اپنے تئیں فضیحت۔

اعتراض نمبر ۱۳۲

اسلام عورت کو آزادی رائے کا حق نہیں دیتا' اس کی دلیل میں سورہ الاحزاب کی آیت نمبر ۳۶ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

جواب: آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو اپنے غلام زیدؓ سے نکاح کرنے کا پیغام بھیجا انہوں نے کہا" یارسول اللہ! میں زیدؓ کو پسند نہیں کرتی کیونکہ میں ایک قریشی خاتون ہوں اور وہ آزاد کردہ غلام ہیں' اور نسب کے لحاظ سے اس سے بہتر ہوں"۔اس پر قرآن کریم کی سورہ الاحزاب کی آیت ۳۶ کا

نزول ہوتا ہے (کسی مومن مرد اور عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔'' اس آیت کے نزول کے بعد بی بی زینبؓ نے زیدؓ سے نکاح کرنے کی حامی بھر لی تا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے بچ جائیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نکاح کا پیغام آیت قرآنی کے نزول سے پہلے بھیجا تھا یا بعد میں؟ نکاح کا پیغام وحی کے اترنے سے پہلے بھیجا گیا تھا کیونکہ اگر وحی کا نزول پہلے ہوتا تو نکاح کا پیغام بھیجنے کے ساتھ اس پیغام الٰہی سے بھی مطلع کر دیا جاتا تو بی بی زینبؓ کبھی انکار نہ کرتیں جیسا کہ انہوں نے آیت مذکورہ سنی تو زیدؓ سے شادی کرنے کی برضا و رغبت ہاں کر دی۔ یہ انکار کی نوبت اس وقت پیش آئی جب وحی کا نزول نہیں ہوا تھا اور یہ انکار ان کی آزادی رائے کے حق کے عین مطابق تھا لیکن اس انکار میں جو عذر پیش کیا گیا کہ '' میں زیدؓ کو پسند نہیں کرتی کیونکہ میں ایک قریشی خاتون ہوں اور وہ آزاد کردہ غلام' اور نسب کے لحاظ سے اس سے بہتر ہوں۔'' یہ وہ باطلانہ نظریہ ہے جو اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے۔ خاندانی برتری اور بڑائی کے سبب انکار کا عذر باطل ٹھہرا اس ابلیسی نظریہ تفاخر '' خلقتنی من نار و خلقته من طین '' کی آمیزش نے بی بی زینبؓ کے حق آزادی کو سلب کر دیا اس لیے کہ یہ بڑا بول بارگاہ رب العزت میں پسند نہ آیا تبھی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس آیت کے نزول کا بعد از انکار کا قرینہ اور دلیل یہ ہے کہ یہ تنبیہ بعد از انکار ہوسکتی ہے کیونکہ جب تک انکار نہ کیا جائے تو اس انکار کی تنبیہہ نہیں ہوسکتی اس پر مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو پھر اسے معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار رہے۔ یہ وہ سبب تھا جس کی بنیاد پر زیدؓ کی شادی زینبؓ سے ہوئی یہ آزادی کا حق ان سے چھینا نہیں گیا بلکہ یہ اس وقت سلب کیا گیا جب آزادی رائے کے حق کو غلط استعمال کیا گیا۔ کیونکہ اسلام نے ہمیشہ آزادی رائے کا حق دیا ہے۔ عہد فاروقی میں بعض عورتوں کے مہر کی رقم زیادہ دی جانے لگی جس سے معاشی حیثیت سے کمزور لوگ پریشان حال تھے' اس پر خلیفہ ثانی نے مہر کی رقم کم سے کم مقرر کرنے کے ارادے سے لوگوں کو آگاہ کیا تو مجمع میں سے ایک خاتون نے قرآن مجید کی یہ آیت '' الخدھن قطاً مرا فلا تاخذ منه اشیاء '' (تو خود تم نے اسے ڈھیر سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو' اس میں سے کچھ واپس نہ لینا) حضرت عمرؓ نے برملا تسلیم کیا کہ خاتون نے سچ کہا اور عمرؓ غلطی پر ہے' اگر یہ عورت نہ ہوتی تو آج عمرؓ ہلاک ہو جاتا' اس کے ساتھ انہوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ مہر اگر آخرت میں فلاح اور عظمت کی چیز ہوتی تو یقیناً رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیاں زیادہ مستحق تھیں۔ معترضین کی غلطی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ سمجھے کہ سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ کے نزول سے پہلے اللہ اور اس

کے رسول ﷺ نے فیصلہ دے دیا اور زینبؓ کو مجبوراً شادی کرنا پڑی۔ اور بی بی زینبؓ کو آزادی رائے کے حق سے محروم کر دیا گیا جبکہ آیت مبارکہ میں نزول بی بی زینبؓ کے انکار کے بعد ہوتا ہے جس کی ایک دلیل یہ ہے کہ اسلام آزادی رائے کا حق دیتا ہے تو پھر یہ ممکن نہیں کہ اس حق سے کسی کو محروم کر دیا جائے کیونکہ اسلام کی تعلیمات میں تضاد نہیں ہے لہٰذا بی بی زینبؓ سے آزادی رائے کو چھین لینے کی کوئی معتبر اور معقول وجہ تھی اور وہ وجہ یہ تھی کہ ان کے انکار میں ابلیسی نظریہ کبر و تفاخر کی آمیزش تھی، جس کے سبب انہیں اپنے آزادی رائے کے حق سے ہاتھ دھونا پڑے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کیا ثابت ہوا کہ آزادی رائے کے بنیادی حق کو ختم نہیں کیا گیا تھا اور فیصلہ پر مبنی انصاف تھا۔ اسی طرح اگر بی بی زینبؓ کا عذر معقول ہوتا، ابلیسی باطلانہ نظریے کی آمیزش نہ ہوتی تو یقیناً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ کچھ اور ہوتا اور ضرور بالضرور بی بی زینبؓ کی آزادی رائے کا پورا پورا احترام کیا جاتا یوں کہہ دیں تو بجا ہوگا کہ یہ سب کچھ ان کے کیے کرائے کا نتیجہ تھا۔ اسلام آزادی رائے کے حق کو عطا کرتا ہے تو بھلا کس طرح کسی سے آزادی رائے کے حق کو چھینا جا سکتا ہے۔ اسلام کی پوری تعلیمات میں تضاد کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے مخالفین کا یہ اعتراض باطل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عورت دو انتہاؤں کے چنگل میں پھنسی رہی ہے۔ ایک یہ کہ زمانہ جاہلیت اور پھر دور ملوکیت کی قبائلی روایات نے اس صنف نازک کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیا۔ دوسری انتہا کہ جدید جاہلیت کے دل فریب تصورات نے عورت سے نسوانیت کو چھین کر جنازہ نکال دیا۔ پیارے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور قانون سازی کر کے عورت کو معاشرے میں عزت و عظمت و احترام دیا۔ وہ مظلوم اور بے بس مخلوق نہ رہی کہ جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو اور اسے بنیادی حقوق بھی ملے اور اپنی نسوانیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف شعبہ ہائے انسانی زندگی میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک و قوم کی خدمت اور ترقی میں فعال کردار ادا کر سکتی ہے۔ روبن لیوی کہتا ہے کہ اسے یہ اعتراف ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایسی عورتیں موجود ہیں جو اپنی عزت کو داؤ پر لگائے بغیر اپنے شوہروں سے علیحدگی اختیار کر سکتی تھیں۔ اسلام نے مرد و زن کو پورا پورا آزادی رائے کا حق دیا۔ ایسا نہیں کہ مرد کو آزادی حاصل ہو اور عورت کو نہ ہو۔

اعتراض نمبر ۱۳۳

لفظ طلاق سے بھی یورپین مصنفین بہت برہم ہوا کرتے ہیں۔ (رحمۃ اللعالمین۔ ا۔۱۶۴) سر ولیم میور کہتا ہے اگر چھوٹی چھوٹی باتوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی مذہب دین اسلام سے تین بڑی بڑی خامیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ اس میں سے ایک سے زیادہ جوروؤں کا ہونا اور دوم طلاق دے دینا اور سوم غلام بنا لینا۔ (خطبات احمدیہ ۱۵۶۔۱۵۷)

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری (رحمت اللعالمین۔ ا۔۱۶۴) فرماتے ہیں کہ وہ یہ فراموش کر

دیتے ہیں کہ جیسٹنین کوڈ میں طلاق کی کامل آزادی عیسائیوں کے لیے بحال رکھی گئی ہے، وہ یہ بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ آج دنیا میں صرف یورپ ہی ہے جہاں طلاق بکثرت دی جاتی ہے اور طلاق منظور کرنے والی عدالتیں جداگانہ یورپ ہی میں ہیں۔ اسلام نے تو یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین عرب کی بے روک ٹوک طلاق پر بہت سی قیود بڑھا دیں جس سے طلاق کی رسم قریباً ملیا میٹ ہوگئی۔

(۱) مہر زوجہ طلاق کی ایک رکاوٹ ہے۔

(۲) طلاق شرعی تین ہیں، ہر طلاق ایک حیض کے بعد ہو یہ تین ماہ کی مدت بھی طلاق کی روک ہے۔

(۳) آخری طلاق تک خاوند بیوی ایک گھر میں رہیں یہ تدبیر بھی طلاق کی روک ہے۔

(۴) طلاق پر دو گواہ ضروری ہیں اور یہ بھی اہل غیرت کے لیے جو غیر کے سامنے اپنا پردہ کھولنا نہیں چاہیے، طلاق کی روک ہے۔

(۵) مطلقہ عورت پہلے خاوند سے نکاح نہیں کر سکتی جب تک کوئی اور اس سے نکاح نہ کرے اور پھر اپنی مرضی سے چھوڑ نہ دے۔

(۶) سب سے بڑھ کر ان البعض الملال عنداللہ الطلاق، سب سے زیادہ طلاق روکنے والی یہ حدیث ہے جس کا ترجمہ ہے ''جائز کاموں میں سب سے زیادہ قابل نفرت کام اللہ تعالی کے نزدیک طلاق ہے۔

(۷) قرآن پاک میں ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے صحابی زیدؓ سے فرمایا امسک علیک زوجک واتق اللہ (الاحزاب۔۳۷)۔۔۔لیکن سارے قرآن مجید میں کہیں بھی نہیں آیا کہ کسی کو طلاق دینے کی بابت کہا گیا ہو۔

(۸) قرآن مجید نے ظہار کو لغو ٹھہرایا حالانکہ عرب کے نزدیک یہ بھی ایک طلاق تھی، یہ بھی ایک روک ہے۔

(۹) قرآن مجید میں ایلا کی اصلاح کی حالانکہ عرب میں یہ بھی طلاق کے معنی میں استعمال ہوتا تھا ،اس سے بھی طلاق کی کمی ہوئی۔

(۱۰) قرآن مجید میں لازم ٹھہرایا کہ نا چاقی اور بدسلوکی کی حالت میں ایک ثالث شخص شوہر کے کنبہ کا ہو اور ایک ثالث شخص بیوی کے کنبہ کا مقرر کیے جائیں اور یہ دونوں میاں بیوی کی شکایات سن کر ان کی اصلاح کرا دیں، یہ تدبیر بھی طلاق کی روک کے لیے ہے۔ اگر کسی مذہب نے طلاق کی روک میں اتنی اور ایسی تدابیر کی تعلیم دی ہے تو وہ پیش کرے۔ ان احکام کا عملی نتیجہ دیکھو کہ مسلمانوں میں طلاق کا استعمال شاذونادر کیا جاتا ہے لیکن یورپ میں جو عدم جواز طلاق کے مسئلہ پر مفتخر ہے، کوئی شہر کوئی محلہ ایسا

نہ ملے گا جہاں طلاق کی دو چار مثالیں نہ مل سکیں۔ کاش یہ مستشرقین یہود و نصاریٰ سمجھ پاتے۔ اور اپنے اپنے گھر کی خبر لیتے تو برہم نہ ہوتے‘ آیئے انہیں آئینہ دکھاتے ہیں۔

امریکہ کے مختلف علاقوں میں شرح طلاق

علاقہ	۹۸	۹۷	۹۶	۹۵	۹۴
	شادی۔طلاق	شادی۔طلاق	شادی۔طلاق	شادی۔طلاق	شادی۔طلاق
ohio	۸۴۹۲۸	۸۴۹۱۳	۸۳۸۵۱	۸۸۹۶۴	۹۲۱۵۱
	۴۶۵۹۶	۴۷۴۲۷	۴۴۹۱	۴۸۲۲۶	۵۰۲۳۵
Franklin	۷۷۶۵	۹۱۶۴	۹۱۹۸	۹۴۷۹	۸۸۸۸
	۴۵۶۹	۴۹۴۵	۴۷۲۷	۴۹۰۴	۵۱۹۴
Hamilton	۵۵۸۳	۹۵۶۸	۵۹۱۴	۶۳۵۹	۶۱۳۷
	۲۹۷۵	۲۵۳۱	۲۵۰۴	۲۹۰۶	۲۹۵۴
Miami	۸۱۳	۵۱۷	۷۲۵	۹۰۳	۸۸۹
	۴۵۹	۴۶۱	۵۱۸	۵۳۰	۵۸۹
Montgomery	۴۰۸۴	۴۱۶۸	۲۸۲۳	۴۵۹۸	۴۶۸۵
	۱۷۶۶	۲۶۹۱	۲۸۲۳	۲۸۳۰	۲۸۵۴
Washington	۵۸۱	۵۷۸	۵۹۸	۵۷۵	۶۱۱
	۳۱۷	۳۱۱	۳۲۸	۳۲۹	۳۰۰

دیگر ممالک میں شرح طلاق (۱۹۹۶ء)

آسٹریلیا: ۱۰۶،۱۰۰ شادیوں سے ۵۲،۵۰۰ طلاق پر منتج ہوئیں۔

کیوبا: شرح طلاق ۷۵ فی صد ہے

فرانس: ۱۱۷،۱۶ طلاقیں ہوئیں جن میں سے ۹۵ فی صد کا مطالبہ عدم تحفظ حقوق کے سبب سے خود خواتین نے کیا۔

سکاٹ لینڈ: ۲۹،۶۱۱ شادیوں سے ۱۲،۲۲۲ طلاق کا شکار ہوئیں۔

سوئٹزرلینڈ: ۳۸،۵۰۰ شادیوں سے ۱۷،۸۰۰ طلاق کا شکار ہوئیں۔

۱۹۹۸ میں ہونے والی طلاقوں میں ۱۱،۸ء خواتین بیس سال سے کم، ۵۵،۷ خواتین ۲۰ سے ۲۹ سال کے درمیان، ۲۵،۸ خواتین ۳۰ سے ۴۴ سال کے درمیان اور ۶،۸ خواتین ۴۵ سے زائد عمر کی ہیں

اور ہر آنے والے سال میں شرح طلاق اضافہ پذیر رہی۔

مغربی معاشرے کے خاندانی ڈھانچے کی شکست و ریخت کی صورت نہایت ابتر ہے پھر بھی مستشرقین اسلامی معاشرے سے برہم نظر آتے ہیں جبکہ مذکورہ طلاق کی شرح میں ان کے پول کی قلعی کھول دی ہے۔ جو کہتے ہیں کہ اسلام میں عورت کو کم درجہ عطا کیا ہے۔ کیا یہ مغرب میں عورت کو اونچا درجہ دیا ہے جہاں کوئی گھر طلاق کے ناسور سے دوچار نہ ہوا ہو، اس سے عورت کے درجہ میں بلندی ہوئی ہے یا جگ ہنسائی۔ اندازہ لگائیے کہ ۱۹۹۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۳۲۶ ملین ہونے والی شادیوں میں سے ۳،۱ ملین طلاق کا شکار ہوئیں جو ۱۹۶۰ء کی تعداد کا تین گناہ ہے یہ عزت عورت کو مغرب کے معاشرہ نے بخشی ہے کہ انہیں کچھ دیر کے لیے اپنائے رکھا اور پھر چھوڑ دیا، ان کی عزت کی قیمت یہی ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے بعد طلاق کا تحفہ دی کر گھر سے نکال دیا۔ جبکہ اسلام نے اس فعل طلاق کو سب سے زیادہ مباح کاموں میں ناپسندیدہ چیز قرار دیا اور ایسے اقدامات کیے کہ اسلامی معاشرہ حتی الامکان اس ناسور سے قریباً آزاد ہے اور مسلم معاشرہ کی ازدواجی زندگی خوب بسر ہو رہی ہے۔ اور ہنستے بستے گھر نظر آتے ہیں۔

قدیم و جدید مذاہب میں نکاح کا عام رواج تھا یہ انسان کی ذاتی فلاح اور تمدنی بھلائی کی بنیاد ہے۔ اور جو چیز فلاح و بہبود کو تہس نہس کر دے اور ذاتی و تمدنی فوائد ختم کر ڈالے وہ شے نہایت ناپسندیدہ اور مضرت رساں ہے۔ وہ ہے طلاق! اسی سبب سے روم کے گرجا میں اس کی حفاظت کے لیے نکاح کو اپنے ساتھ پاک رسموں میں شمار کر کے مقدس و متبرک ٹھہرایا ہے اور انگلستان کے پروٹسٹنٹوں نے طلاق کا حکم صرف ایک حالت میں جائز رکھا جبکہ ہاؤس آف لارڈز سے زر کثیر صرف کرنے کے بعد حاصل ہوا یہ انتظام ۱۸۵۶ تک قائم تھا، طلاق سے متعلق مقدمات سننے اور جیوری کی رائے سے ایک نئی عدالت قائم کی گئی۔

یہودی مذہب: یہودی مذہب میں طلاق دینا بغیر کسی شرط و حالت کے مرد کے اختیار میں تھا۔ اپنی مرضی سے جب چاہیے طلاق دے اور ایسا کرنے سے وہ گناہگار نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کیا جیسا کہ آجکل عیسائی سمجھتے ہیں اور ایک خاص وجہ کے اور کسی حالت میں طلاق دینا جائز نہیں رکھا۔ فرمایا: میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی اور سبب سے طلاق دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی عورت سے شادی کرتا ہے وہ بھی زنا کرتا ہے۔ زنا کی حالت میں عورت جائز ہی نہیں رہتی اور اسے فارغ کر دینا ضروری ہوتا ہے، طلاق کے ذریعہ نہیں بلکہ قتل سے۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ مرد و زن میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح دور نہ ہو سکتی ہوں اور روز روز کی لڑائی، بدمزگی اور گھر کا سکون تلپٹ ہو جائے اور اولاد پر بھی برا اثر پڑے تو اس کا علاج صرف طلاق ہے جس سے ہر دو یعنی مرد اور عورت کو آزادی ہو جاتی ہے، جن کی زندگی تلخ اور اجیرن ہو چکی تھی۔ روز

افزوں کی رنجشیں اور لعن طعن سے خلاصی ہوتی ہے تو ایسے حالات میں طلاق جائز ہے اور کسی طرح بھی حسن معاشرت کے گلشن کو کملا نہیں سکتی، یہی وجہ ہے دین اسلام میں بطور علاج کے جائز اور روا رکھا ہے اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”مباح چیزوں میں سب سے زیادہ خدا کو غضب میں لانے والی چیز طلاق ہے اسی طرح عورتوں کے بارے میں فرمایا ”جو عورت اپنے خاوند سے بغیر ضرورت شدید اور بغیر حالت سختی کے طلاق چاہے، اس کو جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ایک دفعہ رسول خدا ﷺ کو اطلاع ہوئی کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعتاً تین طلاقیں دے دی ہیں، یہ سن کر آپ غصہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا خدائے بزرگ کے حکم کو کھیل بنایا ہے ایسی حالت میں بھی کہ میں تم میں موجود ہوں، یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! کہ کیا میں اس کو قتل کر ڈالوں۔ (یعنی وہ شخص آنحضرت ﷺ کے غصہ ہونے سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کیے جانے کے لائق کام کیا ہے۔) (خطبات احمدیہ۔۱۷۱)

پوری طرح علیحدگی واقع ہونے کے لیے تین طلاق دینے پر موقوف کیا پھر ساتھ ہی تین طلاق میں ممانعت فرمائی کہ دفعتاً نہ دی جائیں بلکہ تین طہر میں۔ دو طلاق تک رجوع کی گنجائش رکھی لیکن تین طلاق کے بعد مکمل جدائی ہو جاتی ہے اس سلسلے میں ایک عمدہ بات یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت کو الگ رہنا پڑتا ہے جب تک طلاق مکمل نہ جائے اس سے شائد محبت عود کر آئے اور ایسا جذبہ پیدا ہو کہ دونوں مرد و زن کے دلوں سے طلاق کا خیال محو ہو جائے۔

ام المومنین سیدہ ام حبیبہؓ

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ، ابوسفیان بن حرب کی بیٹی تھیں ان کی والدہ صفیہ بنت ابوالعاس تھی جو حضرت عثمانؓ کی پھوپھی تھیں۔ ابوسفیان اور صفیہ سے ایک بیٹی ہوئی جس کا نام رملہ رکھا۔ ام حبیبہؓ عبیداللہ بن جحش کی زوجہ تھیں ان کے ساتھ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ دوسری ہجرت حبشہ میں بھی دونوں میاں بیوی شریک تھے۔ حبشہ میں قیام کے دوران ان کے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا جس کا نام باپ نے حبیبہ رکھا۔ اس کے بعد رملہ کو سب لوگ ام حبیبہؓ کے نام سے منسوب کرنے لگے پھر یہی نام بہ زبان زد عام ہو گیا۔ عبیداللہ بن جحش مرتد ہو گئے اور وہ دین اسلام چھوڑ کر عیسائی بن گئے لیکن سیدہ ام حبیبہؓ دین اسلام پر قائم رہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ: ابن حبان نے سیدہ عائشہؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ عبداللہ بن جحشؓ نے ام حبیبہؓ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی، جب وہ حبشہ پہنچے تو عبداللہ بیمار ہو گئے اور وفات پا گئے۔ جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو اس نے رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک وصیت چھوڑی، پس آپ نے وصیت کے پیش نظر ام حبیبہؓ سے نکاح کیا اور نجاشی بادشاہ نے سیدہؓ کو شرجیل بن حسنہؓ کی معیت میں حبشہ سے مدینہ روانہ

کر دیا۔ (امہات المومنین ۔۲۶۸) اس روایت میں دو باتیں قابل غور ہیں ۔اول تو نام ہے جو اس روایت میں عبداللہ آیا ہے حالانکہ صحیح نام عبیداللہ ہے۔ابن حبان کو سہو ہوا ہے نیز یہ درست ہے کہ عبداللہ بن جحش نے پہلی ہجرت حبشہ کی طرف کی لیکن ام حبیبہؓ سے اس کا نکاح نہیں تھا بلکہ ام حبیبہؓ عبیداللہ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک تھیں اور یہی عبیداللہ بعد میں عیسائی ہو گیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عبداللہ بن جحش اسلام پر قائم رہے تھے۔غزوہ احد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک تھے اور جام شہادت نوش کیا جبکہ عبیداللہ نے مرتد ہوکر عیسائیت کو قبول کرلیا تھا۔اس طرح ابن حبان کی روایت میں عبداللہ بن جحش کا نام غلطی سے درج ہوا ہے یا کتابت کی غلطی سے ہوا یا ابن حبان کو سہو ہوا ہے۔ایک اورشبہ کا ازالہ: صحیح مسلم میں ہے کہ لوگ ابوسفیان کو نظر اٹھا کر دیکھتے اوران کے پاس بیٹھنا ناپسند کرتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نبی مکرم ﷺ سے تین چیزوں کی درخواست کی،جن میں ایک یہ تھی کہ آپ میری بیٹی ام حبیبہؓ سے شادی فرمالیں۔آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی۔اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان کے مشرف با اسلام ہونے تک ام حبیبہؓ، رسول اللہ ﷺ کے عقد میں نہیں آئی تھیں لیکن یہ راوی کا وہم ہے۔ام حبیبہؓ حرم نبوی میں داخل ہوچکی تھیں،اس میں ابوسفیانؓ کا کوئی عمل دخل نہ تھا اور نہ ہی انہوں نے آپ ﷺ سے ام حبیبہؓ کو بیاہنے کی درخواست کی تھی چنانچہ ابن سعد، ابن حزم،ابن الجوزی،ابن اثیر،بیہقی اورامام منذری نے اس کے خلاف روایتیں کی ہیں اورسب نے اس روایت کی تردید کی ہے۔جمہور کی آراء کے مطابق ام حبیبہؓ کا نکاح حبشہ یا مدینہ میں ہوا۔ان ہر دو صورتوں میں ان کے باپ کے اسلام لانے سے قبل یہ نبی مکرم ﷺ کے عقد میں آچکی تھیں اور مسلم کی حدیث ''میں اپنی بیٹی کا نکاح آپ سے کرنا چاہتا ہوں کیسے درست ہوسکتی ہے؟ اس وجہ سے ابن حزم نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے دوسروں نے اس کو راوی کا وہم قرار دیا ہے۔اگرچہ امام نووی نے ان چیزوں کا رد کر کے بہت سی تاویلیں کی ہیں لیکن وہ بعید از قیاس ہیں۔علامہ ابن القیم ان سب اقوال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ حدیث غیر محفوظ ہے اوراس میں تخلیط واقع ہوئی ہے۔ابن خیثمہ نے مصعب بن عبداللہ الزبیری سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ام حبیبہؓ سے نکاح کیا تو اس زمانہ میں ابو سفیان مشرک تھے اورآپ سے برسرپیکار تھے،ان سے کہا گیا کہ محمد ﷺ نے آپ کی بیٹی سے نکاح کرلیا ہے ،یہ سن کر ابوسفیان نے کہا''جواں مرد ہیں،ان کی ناک نہیں کاٹی جاسکتی یعنی وہ بلند ناک والے معزز ہیں،ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں اورادھر ہماری لڑکی ان کے نکاح میں چلی گئی۔(امہات المومنین۔۲۷۲)

کفار نے معاہدہ حدیبیہ کو توڑ ڈالا تھا جس کی بناء پر حالات بہت کشیدہ ہوگئے تھے۔ان حالات کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے کفار نے معاہدہ کی تجدید کی ترکیب سوچی اور فتح مکہ سے قبل ابوسفیان جو ابھی

مشرف با اسلام نہیں ہوئے تھے۔ تجدید معاہدہ کے لیے مکہ سے مدینہ گئے اور آپ ﷺ نے صحابہ کو خبر دی کہ ابوسفیان مکہ سے مدینہ مدت صلح کو بڑھانے اور عہد کو مضبوط کرنے کے لیے آ رہا ہے چنانچہ وہ مدینہ پہنچا اور سب سے پہلے اپنی بیٹی کے گھر گیا۔ ابوسفیان، آنحضرت ﷺ کے بستر پر بیٹھنے لگا تو ام حبیبہؓ نے بستر لپیٹ دیا تو ابوسفیان نے ناراض ہو کر پوچھا: بیٹی! تو نے بستر کیوں لپیٹ دیا؟ کیا تو نے بستر کو میرے قابل نہیں سمجھا یا مجھے بستر کے قابل نہیں سمجھا؟ سیدہؓ نے جواب دیا یہ آنحضرت ﷺ کا بستر ہے، اس پر ایک مشرک جو شرک کی نجاست سے ملوث اور آلودہ ہو، نہیں بیٹھ سکتا۔ ابوسفیان جھلا کر بولا خدا کی قسم! تو میرے بعد شر میں مبتلا ہو گئی ہو۔ سیدہؓ نے جواب دیا: شر میں نہیں بلکہ کفر وظلمت سے نکل کر دائرہ اسلام کے نور و ہدایت کی روشنی میں داخل ہو گئی ہوں اور تعجب ہے کہ آپ سردار قریش ہو کر پتھروں کو پوجتے ہیں جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں۔ اس واقعہ سے صریحاً ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان نے سیدہ ام حبیبہؓ سے نکاح کے لیے آپ ﷺ سے کسی قسم کی درخواست نہیں کی تھی اور ان کا نکاح حبشہ یا مدینہ میں فتح مکہ سے پہلے ہوا جبکہ ابوسفیان فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرتے ہیں۔ حبشہ کی سرزمین پر ام حبیبہؓ سے آپ ﷺ کے نکاح پر تاریخ شاہد ہے۔ نجاشی نے خود خطبہ نکاح پڑھا وہ خطبہ یہ تھا۔ ترجمہ ”حمد و ستائش ہے خداوند تعالیٰ اور خدائے غالب اور عزیز و جبار کی، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور رسول برحق ہیں اور آپ وہی نبی ہیں جن کی عیسیٰؑ ابن مریم نے بشارت دی ہے۔ اما بعد رسول اللہ ﷺ نے مجھے تحریر فرمایا ہے کہ میں آپ ﷺ کا نکاح ام حبیبہ بنت ابوسفیان سے کر دوں۔ میں نے آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق آپ کا نکاح ام حبیبہؓ سے کر دیا اور چار سو دینار مہر مقرر کیا۔ اس وقت چار سو دینار خالد بن سعید اموی کے حوالے کر دیئے گئے، اس کے بعد خالدؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا ”میں اللہ کی حمد وثناء کرتا ہوں اور اس سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول برحق ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکین کو ناگوار ہو۔ اما بعد! میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیام کو قبول کیا اور آپ ﷺ سے ام حبیبہؓ کا نکاح کر دیا، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ (امہات المومنین۔ ۲۷۰) بعد میں نجاشی کی طرف سے ولیمہ کیا گیا۔ نکاح کے بعد سیدہ ام حبیبہؓ مدینہ چلی آئیں اس وقت آپ خیبر میں تھے، یہ سن چھ یا سات ہجری کا واقعہ ہے۔

اعتراض نمبر ۱۳۴

ا۔ ”جناب پیغمبر ﷺ کو یہ امید تھی کہ ام حبیبہؓ کے وارث ابوسفیان کو وہ اپنے مشن کی کامیابی کے

لیے مددگار بنانے کی توقع کر سکتے تھے‘‘ (ولیم میور)

۲۔ بیوہ ام حبیبہؓ، رسول اللہ ﷺ کے کٹڑ دشمن کی بیٹی تھیں، پیغمبر خدا کی سیاسی سوچ یہ تھی کہ ام حبیبہؓ سے شادی کر لینے سے اس کے باپ کی دشمنی کو کم کیا جا سکے گا۔ (اروِنگ)

۳۔ حضرت حفصہ کی شادی کے باب میں واٹ کہتا ہے کہ اس شادی یا دیگر شادیوں کا جناب پیغمبر ﷺ نے اپنے لیے یا اپنے پیروؤں کے لیے خود اہتمام کیا، ان میں سیاسی مقاصد یقیناً پیش نظر تھے کوئی دیگر وجوہات نہیں تھیں۔

جواب: سیاسی مقاصد کو مستشرقین پیش نظر رکھتے ہیں لیکن سوائے اس کے امہات المومنین کی شادیوں کی حکمتوں اور مصلحتوں اور دیگر مقاصد کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حضرت ام حبیبہؓ کو ہی لیجئے کہ ماں باپ دشمن ہیں، انہیں اسلام ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ام حبیبہؓ ہجرت کر جاتی ہیں، وہاں ان کا شوہر فوت ہو جاتا ہے، اس اندوہناک صورت میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑا نہیں جا سکتا کیوں کہ اس کا عارضی سہارا شوہر بھی چل بسا، اب وہ جائے تو جائے کہاں، ماں باپ کے گھر بھی آنے سے رہی اس لیے ان غموں کا ازالہ کرنے کے لیے آپ نے ان سے شادی کی۔ اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر اس جیسی غموں سے نڈھال بیواؤں کو بے سہارا چھوڑ دیا جاتا تو دوسرے اسلام قبول کرنے والے نو وارد افراد بھی اسلام کے متعلق کوئی اچھی رائے نہ رکھتے اور کہہ دیتے کہ اتنی مصیبتیں جھیلیں اور پھر بھی ہمارا کوئی پرسان حال نہیں ہے اس لحاظ سے اسلامی ساکھ کو دھچکا لگتا اور کفار طعنہ دیتے کہ یہی دین اسلام ہے جس کی تعلیمات میں ہے کہ دکھیوں کی مدد کی جائے، اور اب تم پر آزمائش پڑی تو کسی نے دھیان نہ دیا، بس یہ ان کی مفاد پرستی تھی نہ کہ غریب بیواؤں سے ہمدردی تھی تو ایسے دین کو گلے لگانے سے کیا فائدہ! مرد و زن میں سے جس نے بھی اسلام کو گلے لگایا وہ اسلام ہی ہو کے رہ گیا' ایسا نہیں کہ آزمائش و ابتلا میں گھر کے اسلام کو خیر باد کہہ دیا ہو بلکہ پہاڑوں جیسی سامنے کھڑی مصیبتوں سے نہیں گھبراتے تھے اور سینہ سپر مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں حتیٰ کہ اس راہ میں جان قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے بلکہ اسے زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔

ام المومنین سیدہ صفیہؓ بنت حییؓ

آپ یہودی قبیلہ بنی نضر کے سردار حیی ابن اخطب کی بیٹی تھیں۔ والدہ کا نام خرد تھا۔ وہ شوال، قریضہ کے سردار کی بیٹی تھیں۔ سیدہ صفیہؓ کا پہلا نکاح مسلم بن مشکم سے ہوا۔ انہوں نے طلاق دے دی، تب کنانہ ابن الحقیق کے نکاح میں آئیں، یہ چھٹا یا ساتواں سن ہجری کا آغاز تھا۔ کنانہ کو محمد بن مسلمہ نے قتل کر دیا کیونکہ اس کے بھائی محمود کو یہودیوں نے کنانہ کے اشارے پر زندہ جلا دیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودیوں کی خفیہ سازش کو ناکام بنانے کے لیے خیبر پر چڑھائی کی، خیبر فتح

ہوا، مال غنیمت ہاتھ آیا نیز قیدی بھی ہوئے، ان قیدیوں میں صفیہ نامی خاتون بھی تھی۔ صفیہ دحیہ الکلبی کے قرعہ میں پڑی مگر پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں آٹھ عدد جانوروں کے بدلے میں آزاد کرایا جو بعد میں ان کا حق مہر قرار پایا۔ آپ ﷺ نے شادی کا کہا تو وہ مان گئیں اور مسلمان بھی ہو گئیں۔ دحیہ الکلبی کو ایک یا سات لونڈیاں دے کر آپ ﷺ نے آزاد کرایا پھر ان سے نکاح کر کے حرم نبوی میں داخل فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ صفیہؓ کو آپ ﷺ نے دحیہ الکلبی سے سات انسان کے بدلے میں خریدا تھا لیکن علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ خریدنا مجازاً کہا گیا ہے۔ (اصح السیرؒ۔۶۰۲)

(۲) بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے خیبر کی فتح کے بعد غنیمت میں صفیہ قیدی ہو کر آئیں اور دحیہ الکلبی کے حصہ میں آئیں، ان کا خاوند جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے حسن و جمال کی تعریف کی اور کہا ہم نے قیدیوں میں اس جیسا کسی کو نہیں دیکھا چنانچہ آپ ﷺ نے دحیہ کو دوسری لونڈی عنایت کر دی اور صفیہؓ کو آزاد کر کے اس سے خود نکاح کر لیا اور تین دن ولیمہ کیا، یہی ان کا مہر تھا۔ (امہات المومنین اور مستشرقین۔۱۵۲)

ابن ہشام کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے صفیہؓ کو لانے کا حکم دیا۔ صفیہؓ سمٹتی ہوئی رسول اللہ ﷺ کے پیچھے آگئیں، آپ ﷺ نے ان پر اپنی چادر ڈال دی، مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ نے انہیں منتخب فرما لیا ہے۔ (ابن ہشام۔ جلد۲۔ ص۔۴۰۲)

اعتراض نمبر ۱۳۵

بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت صفیہؓ کے حسن و جمال کی خاطر نکاح کیا تھا۔

جواب: حضرت انسؓ سے متعدد روایتیں ہیں جو باہم مختلف ہیں۔ بخاری کی غزوہ خیبر کے ذکر میں روایت ہے جس میں تصریح ہے ''جب قلعہ فتح ہوا تو لوگوں نے آپ کے سامنے صفیہؓ کے حسن کا ذکر کیا ان کو اپنے لیے لے لیا'' الفاظ یہ ہیں ''جب خدا نے قلعہ کو فتح کرا دیا تو لوگوں میں سے کسی نے صفیہ بنت حیی کے حسن و جمال کی تعریف کی، اس کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا وہ ابھی دلہن تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنے لیے پسند فرمایا''۔ (صحیح بخاری جلد اول۔ ص ۶۶۰ کتاب المغازی) مگر بخاری شریف کتاب الصلوۃ۔۱۔۱۲۶، اور مسلم شریف باب فضل عتق الامتہ میں خود انسؓ کی یہی روایت یوں نقل کی گئی ہے کہ لڑائی کے بعد قیدی اکٹھے کیے گئے تو دحیہ کلبی نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو۔ آپ نے انہیں اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو، انہوں نے صفیہؓ کا انتخاب کیا۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر کہا اے پیغمبر خدا! آپ نے صفیہ کو دحیہ کلبی کے حوالے کیا وہ قریظہ اور بنی نضیر کی رئیسہ ہے اور آپ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں۔ آپ نے فرمایا،

ان کو مع صفیہ کے لے آؤ جب نبی ﷺ نے صفیہؓ کی طرف نظر کی تو فرمایا کہ ان کے علاوہ کوئی اور لونڈی قیدیوں میں سے لے لو، انسؓ کہتے ہیں پھر نبی ﷺ نے صفیہؓ کو آزاد کر دیا اور ان سے نکاح کر لیا۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے ''پیغمبر خدا آپ ﷺ نے صفیہؓ کو دحیہ کے حوالے کیا وہ قریضہ اور نضیر کی رئیسہ ہے اور آپ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں'' ابو داؤد کی شرح میں مازری کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صفیہؓ کو اس لیے حضرت دحیہ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ ''چونکہ وہ عالی مرتبہ اور رئیس یہود کی صاحبزادی تھیں۔ اس لیے ان کا کسی اور کے ساتھ جانا ان کی توہین تھی۔'' یہ بات نہیں کیونکہ اسلام خاندانی تفاخر اور چھوٹے بڑے کے فرق کو مٹاتا ہے لیکن یہ گمان غالب ہے کہ خود حضرت صفیہؓ دوسروں کے پاس جانے کو اچھا نہ سمجھتی ہوں اور اگر لحاظ مراتب نہ رکھتے ہوئے کسی اور کے ہاں اسے رخصت کر دیا جاتا تو بی بی صفیہؓ آپ ﷺ کی عدل گستری پر افسوس کناں ہوتی کیونکہ اسے ابھی اسلام کے قواعد وضوابط کا علم نہ تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر یا بیوی یا کنیز بن کر رہتی۔ وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھی اور ان کا شوہر نضیر کے قبیلہ کا سردار تھا باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے اس حالت میں ان کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا (بلکہ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپ ﷺ کے نکاح میں آنا قبول کریں، انہوں نے دوسری صورت پسند فرمائی)۔

ف: آپ ﷺ نے اس کے رنج وغم کو غلط کرنے کے لیے پہلے آزاد کیا پھر نکاح کیا انہیں یہ اختیار بھی دیا کہ وہ آزاد ہے اپنے گھر چلی جائے مگر انہوں نے آپ ﷺ کے ہاں رہنے کو ترجیح دی۔ (۲) دحیہؓ سے بی بی صفیہؓ کے حسن و جمال کی وجہ سے نہیں لیا تھا بلکہ صحابہ کی تجویز پر اپنے حرم میں داخل کیا۔ (۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ صفی سے صفیہ ہے۔ ابو داؤد نے صحیح اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے لیے مسلمانوں کے ساتھ سہم (حصہ) مقرر کیا جاتا تھا۔ جس کو صفی کہا جاتا ہے۔ صفی وہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے لیے ہر شے سے پہلے ہی علیحدہ کر دیا جاتا تھا۔ شعبی کے طریق سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا سہم ہوتا تھا جس کو صفی کہا جاتا تھا، وہ لونڈی ہو یا گھوڑا ہو، آپ ﷺ خمس سے وہ اپنے لیے منتخب فرما لیتے تھے۔ قتادہؓ کے طریق سے ذکر کیا کہ آپ ﷺ غزوہ فرماتے تو آپ ﷺ کا ایک خاص سہم ہوتا تھا جسے آپ جہاں سے چاہیں لے لیتے تھے اور صفیہ اس میں سے تھیں، اس لیے انہیں صفیہ کہا جاتا ہے جب کہ ان کا اصل نام ''زینب'' تھا۔ قیدی ہونے پر جب صفی سے چن لی گئیں تو ان کا نام صفیہ ہو گیا یعنی آپ ﷺ کے مقرر کردہ حصہ سے یہ امر ہے جیسے اوپر ذکر

ہوا کہ آپ جہاں سے چاہیں سہم لے سکتے تھے اس طرح صفیہؓ کو لے لیا۔ (تفہیم البخاری۔۶۔۳۱۲۔۳۱۱)

ایک شبہ کا ازالہ: بی بی صفیہؓ دحیہؓ کے قرعہ میں آئی تھیں، یہ بات درست نہیں ہے کہ بی بی صفیہؓ دحیہ کے قرعہ میں پڑی تھی بلکہ دحیہؓ نے خود لونڈی عنایت کیے جانے کی بارگاہ نبوی ﷺ میں درخواست کی تھی، جس پر آپ نے فرمایا: خود جا کر لے لو۔ یہ انہوں نے خود لی تھی، انہیں دی نہیں گئی تھی اور نہ ہی ان کے فال میں نکلی تھی نیز دحیہؓ کو اجازت نہ مرحمت فرماتے اگر آپ نے صفیہؓ کو حرم نبوی میں داخل فرمانا ہوتا۔ صحابہ کی رائے صائب تھی اور صفیہؓ کی تالیف قلب اسی طرح ممکن تھی کہ آپ ﷺ بی بیؓ کو اپنے حرم میں داخل فرمائیں چونکہ بی بیؓ کا باپ اور شوہر ہلاک ہو چکے تھے اور وہ اپنے قبیلوں کے سردار تھے۔ صفیہؓ بیوہ ہو گئیں سر کا تاج چل بسا بادشاہی جاتی رہی غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تو ان حالات میں ایسے سہارے کی ضرورت تھی جس سے ان کے دکھوں کا مداوا ہو سکے لہٰذا آپ ﷺ کی کرم نوازی سے سارے دکھ حرف مکرر کی طرح مٹ گئے۔

اعتراض نمبر ۱۳۶

ا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے بی بی صفیہؓ کو اپنے لیے منتخب فرمایا اور غنیمت کی تقسیم سے پہلے ان کو الگ کر لیا۔ اا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے دحیہؓ سے انہیں خرید لیا تھا کیونکہ یہ تقسیم میں دحیہؓ کے حصہ میں آئی تھیں۔ (امہات المومنین۔۲۸۰) ااا۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے حسن و جمال کی تعریف سنی تو دحیہؓ کو معاوضہ دے کر خود نکاح کر لیا (انسان کامل و نبی اکمل۔۱۲۴)

جواب: (ا) آپ ﷺ نے اپنے لیے سیدہ صفیہؓ کو منتخب فرمایا، درست ہے کیونکہ آپ ﷺ اپنا حصہ غنیمت سے جہاں سے اور جس سے چاہیں لے سکتے تھے یہ سہم مقرر کیا جاتا تھا اور ہر شے سے پہلے آپ ﷺ کے لیے الگ کر دیا جاتا تھا یہ قانون اور ضابطہ کے عین مطابق ہے، اس میں کوئی حرج والی بات نہیں۔

(۲) دوسری روایت میں بھی کوئی ایسی بات پائی نہیں جاتی جس کے سبب اس سے انکار ممکن ہو وہ یوں کہ تقسیم سے قبل دحیہؓ سے انہیں حاصل کیا تھا اور انہیں جو رقم عطا کی تھی، وہ قیمت خرید نہ تھی بلکہ انعام اور ہبہ کے طور پر تھی۔ (امہات المومنین۔۲۷۹) اگر آپ ﷺ نے رقم دی تو لونڈیاں دحیہؓ کو کیونکر عطا کی گئیں نیز یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ حضرت صفیہؓ کے بدلہ میں سات لونڈیاں دیں۔ امام شافعیؒ کتاب الام میں واقدی کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں کہ دحیہ کلبیؓ کو آنحضرت ﷺ نے بلوایا اور صفیہؓ کے بدلہ میں ان کے شوہر کنانہ کی بہن کو دیا۔ (اصح السیر۔۶۰۲) بی بی صفیہؓ دحیہ کو نہیں دی گئی تھیں البتہ اس کی درخواست پر انہوں نے خود انتخاب کیا جس پر صحابہ کرام نے اصرار کیا تو صفیہؓ ان سے لے لی، اس میں بھی کوئی قباحت اور حرج نہیں، کیونکہ اول تو آپ ﷺ کا سہم تھا، دوم دحیہ کا خود انتخاب تھا اور آپ ﷺ نے انہیں صفیہؓ عطا

نہیں کی تھی اور نہ ہی عطا کرنے کے بعد واپس لی تھی بلکہ ان کی خاندانی وجاہت اور صحابہ کرام کی رائے کو قبول کیا اور ان پر ٹوٹے غموں کے پہاڑ کے سبب آپ ﷺ نے ان کی دل جوئی کی خاطر حرم میں داخل فرمایا۔

(۳) جہاں تک حسن و جمال کا تعلق ہے، ساٹھ سال کی عمر میں اس قسم کی پسند کے جذبات نہیں ابھرتے اور ایسے کریم النفس ہستی سے یہ امید رکھنا نادانی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے جوانی کے ایام میں خدیجہ الکبریٰؓ کے ساتھ شادی کر کے پچیس سال گزارے اور کسی عورت سے شادی نہیں کی حالانکہ کفار مکہ نے آپ کو حسین و جمیل دوشیزاؤں کی پیشکش کی تھی کہ ان کے آباؤ اجداد کے مذہب کو برا بھلا کہنے سے باز رہیں مگر آپ ﷺ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا حالانکہ اگر وہ حسین و جمیل عورتوں کو اپنے حرم نبوی میں داخل کرنے کے خواہاں ہوتے تو یہ سنہری موقع تھا۔ لیکن

اتنا کہاں بہار کی رنگینیوں کا شوق
شامل کسی کا خونِ تمنا ضرور تھا

حضرت صفیہؓ نے خواب میں دیکھا کہ چاند آسمان سے اتر کر میری جھولی میں آ گیا ہے۔ یہودی کاہنوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کی شادی عرب کے حکمران سے ہوگی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (محمد رسول اللہ ۔۱۸۰) بتاتا ہے کہ رحمت اللعالمین نے شرفاء یہود میں سے ایک ایسی خاتون جس نے خفیہ اسلام قبول کیا ہوا تھا، شادی کی۔ وہ چاند آپ ﷺ ہی ہیں اور صفیہؓ کا حرم نبوی میں داخل ہونے کا فیصلہ ازلی تھا۔ اس لحاظ سے ہر قسم کے وسوسے اور خدشات دم توڑ دیتے ہیں۔ حضرت صفیہؓ کو مومنین کی ماں بننے کا اعزاز ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا تو پھر بھلا وہ حرم نبوی میں کیونکر داخل نہ ہوتیں۔

اعتراض نمبر ۱۳۷

حضرت صفیہؓ نے اپنے بھتیجے (جو یہودیت پر قائم تھا) کے حق میں وصیت کی اور جائیداد کا تیسرا حصہ ان کے نام کیا جس پر بعض مسلمانوں کو اعتراض تھا''۔

۱۱۔ بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ دین یہودیت پر قائم رہی تھیں۔

جواب: حضرت صفیہؓ نے بچت کر کے خاصی رقم جمع کی تھی۔ آپ کا بھتیجا یہودیت پر قائم تھا۔ علامہ غلام رسول سعیدی (شرح مسلم۔۵۔۵۹۳) کہتے ہیں کہ ایک تہائی یعنی ایک لاکھ درہم میرے غیر مسلم بھانجے کو دیئے جائیں۔ اس کے حق میں وصیت کی۔ اسلام نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی جو تلقین کی ہے اور اس رعایت سے (کہ ترکہ میں حصہ دار افراد کے علاوہ دوسروں کے حق میں بھی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم وصیت کی جا سکتی ہے) کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بی بی صفیہؓ نے اپنی جائیداد کا تیسرا حصہ اس یہودی بھتیجے کے نام کر دیا۔ اس پر بعض مسلمانوں نے سخت اعتراض کیا مگر امہات المومنین حضرت عائشہؓ نے مداخلت کی اور اس بات پر زور دیا کہ حضرت صفیہؓ کی وصیت پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ

ایسا ہی کیا گیا۔ یہ حضرت عائشہؓ کی کمال انصاف پسندی کا اقدام ہے جب کہ آنحضرت ﷺ کی حیات مبارک میں ان دو بیبیوں میں سخت جملوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک روز حضرت عائشہؓ نے حضرت صفیہؓ کو یہودن کی بیٹی کہہ دیا تو اس پر حضرت صفیہ ؓ کو بہت رنج ہوا اور انھوں نے آنحضرت ﷺ سے بی بی عائشہؓ کی شکایت کی۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے حضرت صفیہؓ سے فرمایا کہ اگر آئندہ ایسا ہو تو تم جواب میں یہ کہنا کہ ''میرے والد اللہ کے رسول حضرت ہارونؑ اور میرے چچا اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰؑ اور میرے شوہر حضرت محمد ﷺ ہیں۔ بتاؤ تم میں ایسی خوبیاں ہیں؟ مگر بی بی عائشہؓ کی علمیت اور دور رس نگاہوں سے ایسی دلیل کا جواب مشکل نہ تھا بل کہ آسان اور ممکن تھا جو انھوں نے دیا۔ انھوں نے پھر یہودن کی بیٹی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ جواب تمھارے ذہن کی پیداوار نہیں''۔

ایک شبہ کا ازالہ: حضرت ہارونؑ کی کسی بیٹی کا نام صفیہؓ تھا' یہ درست نہیں۔ پامر نے سورہ حجرات کی ۱۱ ویں آیت کی شانِ نزول یہ نقل کی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ام المومنین صفیہؓ کو یہودی النسل ہونے کا طعنہ دیا جس کی شکایت حضرت صفیہؓ نے حضورؐ سے کی۔ جس پر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور محمدؐ میرے شوہر ہیں۔ کیا کوئی شخص اس انداز بیان سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ چونکہ یہاں صیغہ حال استعمال ہوا ہے لہٰذا یہ ساری شخصیتیں ایک ہی دور کی ہیں یا یہ کہ متکلم کو ان کے تشخص میں کوئی غلط فہمی تھی یا یہ کہ اگر حضرت ہارون کی کسی بیٹی کا نام اتفاقاً صفیہ ہوتا تو ام المومنین صفیہ کو حضرت ہارون کی حقیقی دختر تصور کیا جاتا' ایسا تصور کرنا یقیناً کم علمی کی دلیل مانا جائے گا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ ''مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے نجران کی طرف بھیجا تو وہاں کے لوگوں (عیسائیوں) نے کہا، کیا تم نے کبھی خیال کیا کہ تم لوگ' یا اخت ہارون پڑھتے ہو حالانکہ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ سے اتنے زمانے قبل گزرے ہیں۔ انھوں نے یہ بات رسول اللہ کو بتائی۔ آپؐ نے فرمایا: تم نے ان کو یہ خبر کیوں نہ دی کہ وہ (بنی اسرائیل) انبیاء ماقبل اور صالحین کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھا کرتے تھے''۔ (اسلام۔ پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر۔ ۲۵۳)

جواب دوم: ایک روایت میں ہے کہ حضرت صفیہؓ کی ایک کنیز سیدنا عمرؓ کے پاس گئی اور کہا کہ سیدہ صفیہؓ میں یہودیت کا اثر آج تک باقی ہے۔ وہ یوم السبت کو آج تک اچھا سمجھتی ہیں اور یہودیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتی ہیں۔ سیدنا عمرؓ نے ان کے پاس تحقیق احوال کے لیے ایک شخص بھیجا۔ سیدہ صفیہؓ نے جواب دیا: جب سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں جمعہ کا روز عطا فرمایا ہے' یوم السبت کو بالکل ناپسند کرتی ہوں۔ البتہ میں یہود کے ساتھ صلہ رحمی کرتی ہوں' کیوں کہ وہ میرے خویش و اقارب ہیں۔ اس کے بعد اس لونڈی کو حضرت صفیہؓ نے بلا کر پوچھا کہ تو نے سیدنا عمرؓ سے میری شکایت کس کے اکسانے پر کی؟ اس نے کہا:

شیطان کے اکسانے پر۔ سیدہ صفیہؓ خاموش ہو گئیں اور پھر بولیں جاؤ! تم آزاد ہو (امہات المومنین ۲۷۸)

ف: اگر وہ یہودیت پر قائم رہتیں تو حضرت عمرؓ یا دیگر صحابہ خاموش نہ رہتے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے لونڈی کی شکایت کرنے پر تحقیق کی نیز اپنی بریت ظاہر کرنے کے لیے جمعہ اور صلہ رحمی کو دلیل بنا کر جواب دیا جس کو حضرت عمرؓ نے قبول کیا کیوں کہ اس کے بعد ان سے کسی قسم کی کوئی اور بات ثابت نہیں جو انھوں نے کہی ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ یہودیت پر قائم رہیں اور نبی مکرم ﷺ ان سے کنارہ کش نہ ہوں نیز آپؐ سے زیادہ حضرت صفیہؓ کے حال احوال سے کون واقف و باخبر ہو سکتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ازواج میں شکر رنجی وقتی طور پر ہوتی تھی اسے پلے باندھ کر اس وقت کا انتظار نہیں کرتی تھیں کہ موقع ملے جب انتقام لیا جا سکے۔ دو بیبیوں (عائشہ۔۔صفیہ) میں سخت جملوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اگر صفیہؓ یہودی مذہب پر کاربند رہتیں تو عائشہ کبھی خاموش نہ رہتیں۔ اس راز کو فاش کر دیتیں۔ یہ ان کی شکر رنجی پر مبنی اقدام نہ تھا بل کہ اسلام کے عین مطابق ہوتا کہ وہ بتا دیتیں۔ خواہ یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی حیات مبارک میں ہوتا یا آپ ﷺ کے بعد کی زندگی میں ہوتا' آگاہ فرما دیتیں۔ ان بیبیوں کو دنیا کی عورتوں کے لیے نمونہ بننا تھا تو وہ بھلا کیسے اسلام کے خلاف کوئی اقدام کر سکتی تھیں۔ سوائے لونڈی کے کسی اور کی شہادت نہیں ملتی کہ وہ یہودیت پر قائم رہی تھیں اور لونڈی نے بھی آپ کی بریت کا اظہار کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ شیطان کے اکسانے پر حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ گویا ان میں یہ بات نہ تھی وہ تو محض شیطانی بہکاوے میں آ کر لونڈی کہہ بیٹھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بی بی صفیہؓ نے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا' اگر جنابہ صفیہؓ کے دل میں خدشہ یا یہ بات کھٹکتی کہ لونڈی کو آزاد کر دیا تو میری مزید شکایتیں کرے گی تو اس سے رعایت برتتی۔ ان کو زیادہ چاہتیں، اس کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتیں۔ مراعات دیتیں تا کہ پھر وہ ایسے ویسے راز فاش نہ کرے۔ مگر قربان جایئے ادھر تو صورت بھی مختلف ہے کہ کنیز آزاد ہو جاتی ہے۔ اب وہ آزاد ہے اسے کھلی چھٹی ہے۔ جو مرضی چاہے ان کے متعلق کہتی پھرے نہ دھونس، نہ دھمکی کا ڈر۔ مگر اس کی زبان پر اس کے بعد حرفِ شکایت نہیں آتا۔ اگر ام المومنین صفیہؓ کے پاس ہوتی تو کچھ خوف، ڈر ہوتا لیکن آزاد ہونے کے بعد کا ہے کا ڈر اور خوف؟ آپ کی بریت کی دلیل قاطع ہے۔ صاحب ضیا النبی لکھتے ہیں ”اگر وہ دین یہودیت پر قائم رہتیں تو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل نہ کر سکتیں“۔ (ضیا النبی جلد ۷ ص ۵۱۶)

اہم نکتہ: کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت عمرؓ کے ڈر سے اپنی بریت میں کہہ دیا کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے جمعہ کا دن عطا فرمایا ہے میں یوم السبت کو ناپسند کرتی ہوں' اس کا جواب حضرت صفیہؓ کے اس بیان کے دوسرے حصہ میں موجود ہے۔ انھوں نے اقرار کیا کہ یہود کے ساتھ صلہ رحمی کرتی ہوں کیونکہ وہ میرے خویش و اقارب ہیں“۔ اگر ڈر اور خوف ہوتا تو یہ بھی نہ کہتیں مگر انھوں نے برملا کہا۔ کیوں کہ ان

کے دل میں اسلام کے بارے میں ذرا برابر شک نہ تھا اور سمجھتی تھیں کہ برحق دین ہے۔ اسلام کی حقانیت ان کے دل و دماغ میں موجزن تھی جس نے سب خوف مٹا دیئے تھے۔ اب انھیں کوئی خوف و خطر نہ تھا۔

ایک اور اہم نکتہ: مسلمانوں کے درمیان یہ بات زیرِ بحث تھی کہ آیا سیدہ صفیہؓ رسول اللہ کی زوجہ محترمہ ہیں یا کنیز؟ اس موضوع پر ایک روایت حضرت انسؓ سے مروی ہے ''پیغمبر اسلام ﷺ خیبر اور مدینہ کے درمیان تین دن قیام پذیر رہے۔ اس دوران انھوں نے بی بی صفیہؓ کے ساتھ شب بسری کی اور مجھے حکم دیا کہ مسلمانوں کو شادی کی دعوت میں شریک ہونے کے لیے بلاؤ''۔ روٹی اور گوشت میسر نہ تھا مگر مسلمانوں کی تواضع کھجوروں، پنیر اور روغن خورانی سے کی گئی۔ ۲: یہ بھی لوگوں نے کہا کہ اگر پیغمبر اسلام ﷺ نے انھیں پردہ یا برقع میں رکھا تو وہ ازواج مطہراتؓ میں سے ہیں بصورت دیگر کنیز ہیں۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ کی جانب سفر کیا تو انھوں نے اپنے پیچھے سیدہ صفیہؓ کے لیے جگہ بنائی اور ان کے اور دیگر لوگوں کے درمیان ایک پردہ لٹکا دیا۔ اس طرح پُر تجسس ذہنوں کی تسلی کرا دی کہ مدتوں پرانی رسم کے مطابق انھوں نے سیدہ صفیہؓ کو زوجہ ہونے کا درجہ مرحمت فرمایا۔ اس عمل سے تمام وسوسے اور خدشات خاک بوس ہوگئے اور لوگوں نے جان لیا کہ سیدہ صفیہؓ آپ کی ازواج میں سے ہیں۔ (امہات المومنین اور مستشرقین، ۱۵۳۔۱۵۴)

ایک اور اہم نکتہ: آنحضرت ﷺ نے آٹھ ازواج پر راتیں تقسیم کی تھیں۔ حضورؐ کی ایک زوجہ اس تقسیم میں شریک نہ تھیں یعنی سودہ بنت زمعہ کیوں کہ وہ ضعیف ہوگئی تھیں اور اپنی باری انھوں نے حضرت عائشہؓ کو ہبہ کر دی تھی۔ صحیح مسلم میں عطا کا قول ہے کہ صفیہ بنت حیّ باری میں شریک نہ تھیں مگر وہ صحیح نہیں ہے۔ قاضی عیاض اور امام طحاوی نے کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ عطا کے وہم کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ سے حضورؐ ناراض ہوئے۔ صفیہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ کو مجھ سے راضی کر دو تو اپنی نوبت تمھیں ہبہ کر دوں گی۔ حضرت عائشہؓ نے منظور کیا اور صفیہؓ کے باری والے دن حضورؐ کے بغل میں جا کر بیٹھیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ! الگ رہو آج تمھاری باری کا دن نہیں ہے صفیہؓ کا دن ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ ذَالِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ، (یہ خدا کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے'')۔ اس سے عطا نے سمجھا کہ عہد کے موافق صفیہؓ نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو ہبہ کر دی ہوگی مگر یہ ایک نوبت کا ہبہ تھا کیوں کہ اگر صفیہؓ کو باری میں شمار نہ کیا جائے تو آٹھ ازواج پر باری تقسیم نہ ہوگی۔ حالانکہ اصح ترین روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ آٹھ ازواج پر باری تقسیم کرتے تھے۔ (اصح السیر۔ ۵۶۵) عطاؒ نے کہا کہ ہم حاضر ہوئے ابن عباسؓ کے ساتھ سرف میں جنازہ پر میمونہ کے جو بی بی تھیں جنابِ رسول اللہ ﷺ کی تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ خیال رکھو یہ بی بی صاحبہؓ ہیں جنابِ

رسول اللہ ﷺ کی۔ پھر جب ان کا جنازہ مبارک اٹھانا تو ہلانا ڈلانا نہیں اور بہت نرمی سے لے چلنا اور بات یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس نو بیبیاں تھیں اور ان سے آٹھ کے لیے باری مقرر تھی اور ایک کے لیے نہیں اور عطا نے کہا کہ وہ صفیہ ؓ تھیں۔ (مسلم شریف کتاب رضاع۔ ج ۴ ص ۸۱) ابنِ جریج سے اسی سند کے ساتھ مروی ہے کہ عطا نے کہا کہ وہ سب کے آخر میں متوفی ہوئی تھیں اور انھوں نے مدینہ میں وفات پائی تھی (حوالہ بالا) جب کہ ان کا آخر میں فوت ہونا بھی نہیں بنتا۔

ایک اور اہم نکتہ: حضورؐ نے بعض ازواج کے ساتھ طلاق کا معاملہ کیا۔ رجعت کیا۔ ایک مہینہ کا موقت ایلاء کیا مگر حضورؐ نے ظہار نہیں کیا۔ جن لوگوں نے کہا کہ حضورؐ نے ظہار کیا ہے (انھوں نے بڑی سخت غلطی کی ہے) (حوالہ بالا)

ایک سوال: کیا امہات المومنین صرف مومنین کی مائیں ہیں یا مومنین و مومنات دونوں کی؟

دو طرح کی روایتیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں مگر سنداً یہ قوی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ایک عورت سے کہا "ترجمہ: یعنی ہم تمھاری ماں نہیں ہیں۔ تمھارے مردوں کی ماں ہیں"۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم" یعنی نبی مومنین کے لیے ان کے اپنے نفوس سے اولیٰ ہے اور نبی کی ازواج مومنین کی مائیں ہیں۔ یہ حکم حضورؐ کے ان تمام ازواج مطہرات کو شامل ہے جن کے ساتھ حضورؐ نے نکاح کیا اور وہ حضورؐ کے ماتحت رہیں۔ چاہے حضورؐ سے پہلے ان کا انتقال ہوا ہو یا حضورؐ کے بعد۔ یہ بھی متفق علیہ ہے کہ ان کا حکم امہات کی طرح دو باتوں میں ہے ایک یہ کہ ان کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ دوم: ان کی تعظیم و تکریم اسی طرح واجب ہے جس طرح حقیقی ماں کی بل کہ زیادہ۔ لیکن نظر و خلوت کے بارے میں ان کا حکم ماں کی طرح نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اوا سأء لتموھن متاعاً فسئلوھن من وراء حجاب" یعنی جب ان سے کوئی چیز مانگو تو حجاب کے باہر سے مانگو اور نہ انساب میں اس کا اعتبار ہے یعنی امہات المومنین کی بیٹی، بہن، ماں، باپ، حقیقی بہن، خالہ، نانی، نانا کی طرح حرام نہ ہوں گی۔ (اصح السیر ۔۵۶۶)

اعتراض نمبر ۱۳۸

"واٹ کہتا ہے کہ یہودیوں کی بیٹیوں صفیہ اور ریحانہ سے رشتہ داری استوار کرنے کے سیاسی محرکات ہو سکتے ہیں"۔

جواب: آپ ﷺ کی شادیوں کے متعدد مقاصد ہیں۔

تعلیمی مقاصد: بے شمار مسائل خصوصاً جو عورتوں سے متعلق ہیں۔ ان مسائل کی تفصیلی راہنمائی اسلام مہیا کرتا ہے۔ ایسے مسائل جو عورتوں کی نسوانی زندگی سے عبارت ہیں۔ انہیں کوئی عورت غیر محرم مرد کے ساتھ بات چیت کرنے سے شرم و حیا کی وجہ سے ہچکچاتی ہے اس لیے عورتوں کے مسائل جو

تعلیمات اسلامی آپ ﷺ لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے، انہیں سمجھانے اوران پر عمل کر کے نمونہ فراہم کرنے کے لیے ایسی خواتین کی ضرورت تھی جو انتہائی نیک، پارسا ہوں اور فریضہ رسالت کی تبلیغ کے لیے مخلص کارکنوں کی حیثیت سے کام کرتیں۔حیض ونفاس، جنابت وغسل اور زوجیت کے متعلق مسائل ایسے تھے جنہیں خواتین آپ ﷺ کے سامنے پیش نہیں کر سکتی تھیں اور نہ آپ ﷺ ان کا جواب دے پاتے۔آپ ﷺ شرم وحیا کے اعلیٰ معیار پر فائز تھے۔حدیث کی کتب میں ہے کہ آپ ﷺ اتنے حیادار تھے جتنی حیادار دلہن اپنے مجلۂ عروسی میں ہوتی ہے۔بعض ایسے مسائل آپ ﷺ سے پوچھے گئے وہ آپ ﷺ نے اشارے کنائے سے سمجھائے لیکن وہ خواتین نہ سمجھ پاتیں۔حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ ایک انصاری عورت نے حضور ﷺ سے غسل حیض کے متعلق سوال کیا۔آپ ﷺ نے غسل حیض کا طریقہ بتایا اور پھر فرمایا ایک خوشبودار روئی کا گالا لو اوراس کے ذریعے طہارت کرو۔ اس عورت نے روئی کے گالے کے ذریعے طہارت کرنے کے بارے میں پھر پوچھا کہ کیسے کروں آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔عورت پھر بولی کیسے طہارت کروں۔آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے ذریعے طہارت حاصل کرو۔حضرت عائشہؓ نے یہ حالت دیکھی تو انہوں نے اس عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اوراسے وہ طریقہ سمجھایا۔لہٰذا ایسے مسائل کو تفصیلاً سمجھانے کے لیے واقعی عورت ہی بہتر سمجھا سکتی ہے۔اس سلسلے میں ازواج مطہرات نے تعلیم امت کے فریضہ کی ادائیگی میں خوب کردار ادا کیا۔

تشریعی مقاصد: ان میں تشریعی مقاصد بھی تھے۔کئی ایک بدرسمیں عرب معاشرہ کو لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ان میں ایک قبیح رسم غیر کو اپنا بیٹا بنانے کی تھی (لے پالک)۔کسی کا بیٹا کوئی اپنا بیٹا بنا لیتا تھا اس سے وہ نسب، میراث، طلاق اور مصاہرت کے تمام مسائل میں حقیقی بیٹا تصور کیا جاتا تھا جس سے معاشرہ بے شمار مسائل کا شکار ہو جاتا تھا۔مستحق لوگ میراث سے محروم ہو جاتے اور غیر حق دار ساری جائیداد کے مستحق قرار پاتے۔ان رسموں کو ختم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔طعن وتشنیع کے تیروں کی بارش برسنا شروع ہوتی گویا ایسی قدیم رسموں کو توڑنا جان جوکھوں میں ڈالنا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس بدرسم کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو منتخب فرمایا۔آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی کی بیٹی حضرت زینب بن جحشؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا جو پہلے آپ ﷺ نے اپنے منہ بولے بیٹے کے نکاح میں دے دی تھی۔حضور ﷺ کے متعدد خواتین کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے کچھ مقاصد تشریعی نوعیت کے تھے۔حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ ﷺ کی شادی اس کی بہترین مثال ہے۔

سماجی مقاصد: آپ ﷺ کی شادیوں میں سماجی مقاصد بھی بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں آپ ﷺ کے غلاموں کی جان نثاریوں کا اصل بدلہ تو قیامت کے دن خود اللہ تعالیٰ عطا کرے گا لیکن حضور ﷺ نے

اس دنیا میں اپنے غلاموں کو نوازنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ خادموں اور غلاموں کو نوازنے کے لیے آپ ﷺ کا ایک نرالا اور دل فریب اسلوب تھا۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ رشتہ مصاہرت جوڑا۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادیوں کو اپنے حرم میں داخل فرمایا اور حضرت علیؓ و عثمانؓ کو اپنی صاحبزادیاں ان کے نکاح میں دے کر رشتہ مصاہرت قائم کیا اور حضرت زیدؓ جنہوں نے اپنے باپ پر حضور ﷺ کو ترجیح دی تھی اور اپنی زندگی حضور ﷺ کے ساتھ بتا دینے اور غلامی کی زندگی کو آزادانہ زندگی پر برتر سمجھا۔ اور تبلیغ کے کٹھن اور دشوار گزار مرحلے میں قدم قدم پر جاں گسل تکلیفیں برداشت کیں۔ آپ ﷺ نے ان کی دلجوئی فرمائی اور اپنی پھوپھی کی بیٹی زینبؓ کا نکاح ان سے کر دیا جو بعد میں زید نے طلاق دے دی اور آپ ﷺ نے انہیں اپنی حرم میں داخل فرمالیا۔

سیاسی مقاصد: اس سے انکار نہیں ہے بلکہ متعدد مقاصد میں سے ایک مقصد دشمنوں کے دلوں کو جیتنا تھا تاکہ اسلام کی مخالفت میں کمی آئے اور اسلام پھلے پھولے۔ آپ ﷺ کی شادیوں سے سیاسی فوائد بھی حاصل ہوئے جیسے غزوہ بنو مصطلق میں اس قبیلے کو شکست فاش ہوئی۔ بہت سے قیدی ہوئے نیز ان میں اس قبیلے کے سردار کی بیٹی جویریہ بنت حارث بھی تھیں۔ آپ ﷺ نے اس خاتون کی تکالیف کو بھانپ کر ان کا زرفدیہ ادا کر کے ان سے نکاح کر لیا اور تمام قیدی رہا کر دیئے۔ آپ ﷺ کی عالی ظرفی اور عالی شان جذبہ کو دیکھ کر سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ یہ بات غیر معمولی ہے کہ ایک شادی کے بدلے اسلام کے جانی اور خون کے پیاسے دشمن کا قبیلہ مشرف با اسلام ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''ہم نے کسی عورت کو نہیں دیکھا جو اپنی قوم کے لیے اس سے زیادہ برکت کا باعث بنی ہوں جتنی برکت کا باعث جویریہؓ اپنی قوم کے لیے بنیں''۔ حی بن اخطب کی بیٹی غزوہ خیبر میں گرفتار ہوئیں آپ ﷺ نے انہیں بلایا کہ وہ اسلام قبول کریں تو آپ ﷺ آزاد کر کے اپنے نکاح میں لے لیں گے اور اگر وہ یہودیت پر قائم رہنا چاہیں تو آزاد کر دیتے ہیں اور اپنی قوم میں چلی جائیں۔ انہوں نے آپ ﷺ کی پہلی بات کو پسند کیا اس طرح حضرت صفیہؓ حرم نبوی میں داخل ہو گئیں۔

سیاسی محرکات ہو سکتے ہیں اور سیاسی محرکات کو تسلیم کرنے میں کوئی حرج اور قباحت نہیں ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ صرف سیاسی محرکات ہی کارفرمانہ تھے بل کہ عظیم اور کثیر المقاصد تھے جن میں سے ایک عظیم مقصد تالیف قلبی بھی ہے۔ بی بی صفیہ کا باپ جنگ میں کام آیا۔ شوہر بھی جنگ میں ہلاک ہوا۔ وہ رئیس باپ کی لڑکی اور رئیس شوہر کی بیوی تھی۔ اب بیوہ ہو گئیں۔ غموں نے راہ دیکھ لی۔ آفتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایسی کڑی آزمائش میں بے یار و مددگار خاتون کو ایک سہارے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سہارا پیغمبر اسلام ﷺ نے فراہم کیا۔ ان کا غم غلط کرنے کے لیے انھیں حرم نبوی میں داخل فرمایا جس سے ان کے ٹوٹے دل اور زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھا۔ یہی تو آپ ﷺ کی رحمۃ اللعالمینی کا اعجاز ہے

کہ دکھیوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ ان کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔ گویا واٹ کا رشتہ داری استوار کرنے کا محض سیاسی محرکات بتانا درست نہیں ہے جیسا کہ مذکورہ مثال سے صاف مقصد تالیف قلبی مترشح ہوتا ہے۔

اعتراض نمبر ۱۳۹

ایک اور انداز میں ''منٹگمری واٹ'' کہتا ہے کہ ''جناب محمد ﷺ کی شادیوں کے بارے میں آخری خاص بات جو زیر نظر ہے وہ یہ کہ آپؐ نے اسے اپنے قریب ترین ساتھیوں کے تعلقات اور وسیع تر سیاسی مفادات کے حصول کے لیے استعمال فرمایا اور بلاشبہ قدیم ترین عرب کے دستور کا تسلسل تھا۔ جنابِ محمد ﷺ کی شادیوں کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کا مطمع نظر صرف سیاسی دائرہ کار میں دوستانہ مراسم کو آگے بڑھانے کے لیے تھا''۔ (امہات المومنین اور مستشرقین۔۱۱۱)

جواب: ''واٹ'' کا کہنا کہ قریب ترین ساتھیوں کے تعلقات مضبوط بنانا تھا۔ وسیع تر سیاسی مفادات کا حصول تھا اور سیاسی دائرہ کار میں دوستانہ مراسم کو ترقی کی راہوں پر ڈالنا مقصود تھا۔ صرف ان ہی باتوں پر آپؐ کی شادیوں کے مقاصد کو محدود کر دینا ناانصافی ہے۔ جب کہ شادیاں کثیر المقاصد تھیں جن میں تالیف القلب اور جذبہ ترحم کو اولیت حاصل ہے۔ مومنین اور مومنات کی قربانیوں کے پیش نظر اور بے سہارا بیواؤں اور بے آسرا یتیم بچوں اور بچیوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ پھر ان میں دوست اور دشمن سب شامل تھے سب اس مد میں یکساں شریک تھے۔

دوم: ازواجی مسائل عقیدہ اسلام کی روح کے عین مطابق حل کرنا ضروری تھے۔ ان مسائل سے آگاہی کے لیے عورتیں ہی موزوں تھیں۔ ان عقائد کو زبانِ نبوت سے سن کر ازواج مطہرات دوسری عورتوں تک خوب پہنچانے کا فریضہ انجام دے سکتی تھیں۔ اس سلسلے میں مختلف قبائل میں شادیوں سے اس فریضہ کی تکمیل میں بہت مدد ملی اور خواتین کے مختلف مسائل اور ازواجی زندگی کے متعلق جو سوالات تھے، ان خواتین نے باحسن طریق دوسری خواتین کو پہنچائے، سکھائے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی علم کے زیور سے آراستہ ہو گئیں۔

سوم: نیز اپنے غلام زید بن حارث سے اپنی پھوپھی زاد بہن مذکور کی شادی کر کے اعلیٰ وادنیٰ، غلام اور آقا کے فرق کو مٹا ڈالا پرانی رسموں کا خاتمہ ہوا جن میں سے ایک رسم بد زمانہ قدیم سے متبنیٰ کی چلی آ رہی تھی جسے حقیقی بیٹے کی طرح تمام حقوق ومراعات حاصل تھے۔ سیدہ زینب بنت جحش کی شادی سے اس باطل رسم کی جڑ کاٹ کے پھینک دی گئی۔ نیز یہ رسم بد قدرت خداوندی کا گستاخانہ جواب تھی اور اس رسم سے خاندانی حقیقی وارثوں پر زہریلا اثر پڑتا تھا۔ وہ جائیداد وغیرہ سے محروم ہو جاتے اور لے پالک مصنوعی طریقہ سے وارث بن جاتا تھا۔ اس سے کئی قسم کے جھگڑے جنم لیتے تھے اور ختم ہونے کا نام نہیں

لیتے تھے۔ متبنیٰ کی بیوی باپ پر حرام ہوتی تھی۔ حالاں کہ وہ اس کا اصل باپ نہ تھا۔ نبی محترم نے خود اپنی مقدس اور نورانی شخصیت سے اس رسمِ جاہلیت کو ختم کر دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے ''مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ''۔ (محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کا بھی باپ نہیں ہے)

چہارم: جذبہ ترحم اور صلہ رحمی کے پیشِ نظر مطلقہ، بیوہ اور جن کے ہمراہ کچھ بچے بھی تھے انھیں نان و نفقہ اور محفوظ زندگی فراہم کرنے کے لیے حرمِ نبوی میں داخل فرمایا۔ تو بھلا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ صرف سیاسی دائرہ کار میں دوستانہ تعلقات کو آگے بڑھانے کے لیے تھا۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ حضرت عمرؓ وہ خوش نصیب ہیں جب وہ ایمان لائے تو مومنین کی تعداد ۴۰ تھی۔ اس وقت آپؐ نے ان صحابہ کرامؓ کے ہاں ازواجی تعلقات نہیں جوڑے تھے وہ تو ایمان پہلے لا چکے تھے اور سسرالی رشتہ بعد میں قائم ہوا، اپنے مقاصد کی خاطر کیے ہوئے کہیں وہ رشتے ٹوٹنے والے تھے؟ یا ان کو مزید مستحکم کرنا اس لیے تھا کہ ایمان لانے والے ساتھ نہ چھوڑ جائیں (لاحول و لاقوۃ)۔ بایں سبب یہ باتیں خام خیالی کا نتیجہ ہیں۔ ان صحابہ کی تعلق داریاں تو خونی رشتہ کے علاوہ دینی رشتہ پر استوار تھیں جو کبھی نہ ختم ہونے والا تعلق اور رشتہ تھا۔

آپؐ کی ازواج مطہرات میں دو خواتین کنواری تھیں، ایک سیدہ عائشہؓ دوسری ماریہ قبطیہ۔ ان کے علاوہ باقی تمام خواتین بیوائیں یا مطلقہ تھیں لہٰذا آپ ﷺ پر جنس پرستی کا الزام خاک بوس ہو جاتا ہے کیا ایک جنس پرست انسان جو مدینہ کی ریاست کا منتظمِ اعلیٰ ہے اور طلاق یافتہ یا بیواؤں کو اپنے حرم میں داخل کرتا ہے جب کہ آپ کا کسی بھی کنواری خاتون سے شادی کرنا مشکل نہ تھا۔ انھوں نے کنواریوں سے شادی کیوں نہ کی؟ حالاں کہ عیاشی اور جنس پرستی کی اولین خواہش باکرہ خواتین ہوتی ہیں نہ کہ بیوائیں اور مطلقہ۔ ان کے ہم خیال مستشرق نے ہمارے موقف کی حمایت کر دی۔ G.L BERRY۔ جی ایل بیری کہتا ہے کہ ''زندگی کے آخری چند سال میں متعدد شادیوں کا سبب غالباً انسانی ہم دردی اور جذبہ ترحم کے تحت اپنے پیروکاروں کی بیواؤں کو احساسِ تحفظ فراہم کرتا ہے اور یقیناً جنسی تشفی کے لیے ایسا نہیں کیا گیا۔

ڈیون پورٹ کہتا ہے ''یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض و مفاد پرستی سے کلیتاً خالی تھی۔۔۔۔ انہوں نے اپنی ذات اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا بلکہ آخر وقت تک اسی سادہ طرز و انداز کو برقرار رکھا جو اول دن سے ان کے بود و باش سے نمایاں تھا (ن۔۱۱۔۵۴۷)

اتنا کہاں بہار کی رنگینیوں کا شوق
شامل کسی کا خونِ تمنا ضرور تھا

سٹینلے لین پول (STANLAY LAN POOL) شہوانیت پرستی کے جھوٹے الزمات کی

تردید کرتے ہوئے کہتا ہے" انھوں نے کبھی اپنی کسی بیوی کو طلاق نہیں دی جو کہ ماسوائے دو کے تمام بیوائیں یا مطلقہ تھیں اور ان میں سے بہت کی شادیاں یقیناً اسی جذبہ کے تحت کی گئیں کہ وہ خواتین جن کے خاوند اسلام کے تحفظ میں لڑی جانے والی جنگوں میں شہید ہو گئے اور اب وہ اس طرح اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے حضور کی کریم النفسی کی دعوے دار تھیں جن کی خاطر انھوں نے جہاد کیا"۔ عیش کوشی، جنس پرستی اور نفس پرستی کے الزامات مغربی لٹریچر کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ یہ الزامات ان کے لٹریچر کا روح رواں اور محبوب و مرغوب طبع آزمائی کا مشغلہ ہیں۔ جب کہ ان الزامات کا حقیقت سے کچھ واسطہ و تعلق نہیں ہے۔ کارلائل کی سنیے " We shall err widely if consider, This man as common voluptuary intent mainly on base enjoyment, Nay onenjoyment of any kind"

ترجمہ: ہم بہت بڑی غلطی کریں گے اگر ہم ان کو ایک ایسا عام لذت پسند شخص گردانیں گے جو بنیادی طور پر گھٹیا عیش پرستی پر مائل ہو (جب کہ وہ) کسی بھی قسم کی لذت اندوزی نہیں کرتے تھے"۔ عالم شباب عیش و عشرت کا دور ہوتا ہے لیکن آپ ﷺ نے پچیس سال کی جہاں حسین و جمیل زندگی ایک خاتون حضرت خدیجہؓ کے ساتھ بِتا دی۔ لذت کشی کا خیال تک نہ آیا۔ ان سالوں کی تابانیاں ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ یہ ہی نہیں بل کہ ہجرت مدینہ کے بعد صلح حدیبیہ تک کم از کم چھ سال ایسی شدید کفار سے دشمنی سے دو چار رہے کہ آرام و سکون کم میسر آتا تھا۔ ایک طرف معاشرہ کی تعمیر و ترقی، پاکیزگی و بالیدگی اور دوسری طرف وسائل کی کمی جیسے مسائل کے پہاڑ سامنے تھے۔ دفاعی مسائل ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔ زندگی کے آخری چار سال بھی جدوجہد کا طرہ امتیاز تھے۔ اس دوران فتح خیبر، فتح مکہ، جنگِ حنین، محاصرہ طائف، غزوہ تبوک اور کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں پیش آئیں۔ وفود عرب، حجۃ الوداع اور لشکر اسامہؓ کی روانگی کا حکم، کی سی مصروفیات آخرِ دم تک رہیں اور یہاں تک کہ اسامہؓ کے لشکر کو روانہ کیا۔ آپ ﷺ کی علالت شدید کی وجہ سے لشکرِ اسامہ واپس آ گیا تھا اور آپؐ اس دنیا سے انتقال فرما گئے۔ تو کس لمحہ کس دن کس مہینے اور کس سال آپ عیش و عشرت سے متمتع ہوئے۔ محض مستشرقین کی حیلہ سازیاں ہیں۔ بعض ان میں سے حقائق کو پیش کر ہی دیتے ہیں۔ جیسے" کارلائل" کہتا ہے کہ" محمدؐ کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ لیں (یہ بات واضح ہے کہ) آپ ﷺ نفس پرست انسان ہرگز نہ تھے"۔ (محمد رسول اللہ اکرم طاہر۔ ۳۳۹)

"مسٹر جان آرکسن" کہتا ہے" ہم نہیں جانتے کہ محمدؐ اپنی زندگی میں کبھی کسی رذیل حرکت کے مرتکب ہوئے ہوں۔ البتہ نہایت اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔ (ان ۴۔ ۴۸۹)

مسٹر والٹر لکھتا ہے" اے پادریو اور راہبو: اگر تمہارے لیے جولائی کے مہینہ میں جب رمضان

شریف کے روزے رکھنے پڑ جائیں اور ایک مقررہ وقت تک کھانے پینے سے روک دیے جانے کا قانون بنایا جائے، شراب کا پینا روک دیا جائے، گرم ریگستانوں سے گزر کر حج کرنے کا حکم دیا جائے، اٹھارہ عورتوں کے ساتھ رفاقت کی بجائے چودہ عورتیں کم کر دی جائیں، کا حکم دیا جائے تو پھر مجھے ایمانداری اور جرات کے ساتھ بتائیں کہ اسلام کا مذہب کس طرح عیش پرست۔ میں یہ کہوں گا کہ وہ لوگ جاہل اور بدھو ہیں جو اسلام پر تہمتیں اور بے تکے الزام لگانے سے نہیں شرماتے۔

آپ کی زندگی سادہ تھی۔ غذا سادہ، گھریلو کام میں ہاتھ بٹاتے، اپنے جوتے خود گانٹھ لیتے، کپڑے میں پیوند لگا لیتے۔ مکان کچے تھے۔ مکان کا دروازہ تک نہ تھا۔ ایک ٹاٹ کا پردہ لٹکا رہتا تھا۔ کھجور کی چھال سے بھرا تکیہ، سادہ بستر یا کھجور کی چٹائی سامانِ راحت تھی۔ ریشم اپنے اور سب کے لیے ممنوع قرار دیا، اوڑھنے کے واسطے ایک کمبل کالا، سفر کے لیے ایک خیمہ۔ نہانے کے لیے ایک برتن اور ایک ٹب لکڑی کا تھا۔ مسجد ناپختہ اینٹوں سے بنی تھی جہاں نماز پنج گانہ کے علاوہ دربارِ نبوی سجتا تھا۔ کھجور کے ستون سے پشت لگاتے منبر نہ تھا' نہ پردہ نہ دربان نہ محافظ۔ خزانہ یعنی بیت المال نہ تھا۔ دولت آتی تو ساری مستحق لوگوں میں بانٹ دی جاتی۔ الغرض بہ وقت وصال ترکہ میں ایک درہم بھی نہ چھوڑا۔ گھر کا چولہا کئی ماہ تک گرم نہیں ہوتا تھا۔ ورثے میں تلواریں، زرہیں، خود، ڈھال اور چند مویشی چھوڑے۔ نہ ذاتی جائیداد نہ جمع پونجی چھوڑی۔ صرف اللہ کی ذات اپنے ورثاء بل کہ سب کے لیے چھوڑی۔ کیا اس کو عیش وعشرت، لذت اندوزی، نفس پرستی اور جنس پسندی کہا جا سکتا ہے؟ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور رسول خدا یہی کہتا ہے کہ میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم انھیں تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔ قرآن اور میری سنت یا قرآن اور میری اہلِ بیت۔ ایک اور روشن وتاباں حقیقت ہے اور یہ ہی ایک واقعہ نبی کریمؐ پر جنسیت پرستی کے الزام کی نفی کے لیے کافی ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ نے کفارِ مکہ کی وہ پیش کش کہ آپؐ سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم آپؐ کو سردار تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

۲: اگر آپؐ مال دار بننا چاہتے ہیں تو ہم آپؐ کو زرِ کثیر اکٹھا کر دیتے ہیں جو آپؐ بل کہ آپ ﷺ کی آئندہ نسلوں کے لیے بھی کافی ہو گی اور اگر جنسی تسکین کے خواہش مند ہیں تو قبیلہ قریش کی دس خوب صورت دوشیزائیں آپ انتخاب کر لیں۔ آپؐ نے جواباً قرآن پاک کی آیت تلاوت فرمائیں (امہات المومنین اور مستشرقین ۱۱۶) ایام جوانی میں ایسی پیش کش کو ٹھکرا دیا تو بھلا آخری عمر میں کس جنس پرستی کا جذبہ ابھر آیا تھا؟ اس کا جواب مستشرقین کے ذمہ قرض ہے۔

''جی ڈبلیو لیٹنر'' لکھتا ہے کہ ''اچھا یہ بتایئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ پر لگائے گئے جنسیت پرستی کے الزامات کی اچھی بری یا مشکوک شہادتوں کی بنیاد کیا ہے؟ میں بلا تامل تصدیق کرتا ہوں کہ میں ہر الزام کے

ماخذ تک پہنچا ہوں اور ہر الزام مکمل طور پر بلا ثبوت نکلا جب کہ اس کے برعکس یہ بات نبیؐ کے لیے موجب افتخار ہے کہ انھوں نے بے شمار ترغیبات کے باوجود بہ درجہ اتم پاک دامنی کو محفوظ رکھا جو ایسے معاشرہ میں عنقا تھی۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ آخری عمر میں کثیر الازواجیت کا سبب اپنے ستم رسیدہ پیروکاروں کی بیواؤں کے تحفظ فراہم کرنے اور بہتر زندگی گزارنے کا موقع دینا تھا۔ ایک شادی شدہ انگریز عورت سے ایک شادی شدہ مسلمان خاتون بہتر قانونی حق رکھتی ہے اور جمہوریہ فرانس کی عورت کے حقوق کے برعکس مسلمان خاتون کی گواہی قابلِ قبول ہے۔ (امہات المومنین اور مستشرقین ۱۱۹)

''جان بیگٹ'' کہتا ہے ''یہ قابل غور ہے کہ پیغمبر نے اپنی جوانی میں سیدہ خدیجہؓ سے شادی کی اور انھوں نے آنحضرتؐ کے چھ بچوں کو جنم دیا۔ دیگر ازواج سے ماسوائے ماریہ قبطیہ کے ایک بیٹے کے سوا اولاد نہ ہوئی تھی۔ مدینہ میں دس سال کا وقت تھا آپؐ کی جسمانی تھکاوٹ بھی تھی۔ بالخصوص جب آپ ﷺ کی عمر پچاس سال اور مابعد ساٹھ سال سے اوپر تھی، یہ حالات ایسے نہ تھے کہ کوئی شخص جنسی تسکین کے لیے شادیاں رچاتا پھرے''۔ (حوالہ بالا)

ام المومنین سیدہ میمونہؓ بنت الحارث

سیدہ میمونہؓ کی والدہ کا نام ہند بنت عوف ہے۔ ابن قتیبہ نے لکھا کہ پوری روئے زمین پر ہند بنت عوف سے زیادہ کوئی عورت اپنے دامادوں کے لحاظ سے بزرگ اور خوش قسمت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے دامادوں میں درج ذیل شخصیتیں ہیں۔

۱: سرکارِ دو عالم آپ ﷺ کے داماد تھے۔ ۲: سیدنا صدیقؓ اکبر۔ ۳: سیدنا حمزہؓ بن عبدالمطلب۔ ۴: سیدنا عباسؓ بن عبدالمطلب۔ ۵: سیدنا جعفرؓ الطیار بن ابی طالب۔ ۶: سیدنا علیؓ ابن طالب۔ ۷: شدادؓ بن الحاد (امہات المومنین۔ ۲۸۹)

ایک شبہ کا ازالہ: ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے حرم میں آنے سے قبل سیدہ میمونہؓ ابو رھم کے نکاح میں نہیں تھیں۔ بل کہ سبرہ بن ابی رھم کے نکاح میں تھیں۔ اگر برہ سے مراد ابو السیرہؓ صحابی ہیں تو یہ غلط ہے کیوں کہ ابو السیرہؓ السابقون والاولون میں سے ہیں۔ انھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ تمام جنگوں میں شرکت کی اور عہدِ عثمان میں وفات پائی اور کسی نے انھیں سیدہ میمونہ کا خاوند نہیں لکھا اور اس بات پر اتفاق ہے کہ سیدہ میمونہ اپنے خاوند کی وفات کے بعد حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ لہٰذا ابو برہ ان کے خاوند نہیں ہیں۔ ۲: ابو برہ نے عہدِ عثمانی میں وفات پائی تو کہیں یہ ذکر نہیں ملتا کہ ابو برہ نے انھیں طلاق دی ہو۔ جب ان سے جدائی ہوئی ہی نہیں تو پھر رسول اللہ کے عقد میں کیسے آسکتی ہیں جب کہ ان کا خاوند زندہ ہے۔ نیز ان کا انتقال عہد عثمانی میں ہوتا ہے اور اس بات پر اتفاق ہے کہ سیدہ میمونہؓ کا نکاح ان کے

شوہر کے انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ سے ہوا۔ آپ نے اس دنیا سے ابو برہ سے پہلے انتقال فرمایا تو یہ نا ممکن ہے کہ یہ ابو برہ ہوں کیوں کہ وہ تو زندہ تھے اور عہدِ عثمانی میں فوت ہوئے۔

ایک اور شبہ کا ازالہ: روایات میں ہے کہ ذی قعدہ ۷ھ میں آپ عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ اسی احرام کی حالت میں سیدہؓ سے نکاح ہوا لیکن روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آپ کا یہ نکاح احرام میں ہوا یا حلال میں ہوا۔ سیدہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے مقام سرف پر نکاح کیا۔ اس وقت ہم دونوں حلال تھے یعنی احرام باندھے ہوئے نہیں تھے۔ ابو رافع کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میمونہؓ سے نکاح فرمایا اس حالت میں کہ آپ بغیر احرام کے تھے یعنی حلال تھے اور میں اس وقت دونوں کے مابین سفیر کا فریضہ ادا کر رہا تھا۔ امام مسلمؒ نے سیدہ میمونہؓ سے روایت کی ہے کہ نبی محترم ﷺ نے مجھ سے نکاح کیا تو آپ اس وقت حلال تھے لیکن سیدنا عباس کی روایت میں ہے کہ آپ نے محرم ہونے کی حالت میں سیدہؓ سے نکاح فرمایا (بخاری۔۱۸۳۷) (مسلم ۱۴۱۰)۔ ان دونوں قسم کی روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ بقول علامہ ابن عبد البر سیدہ میمونہؓ سے یہ روایت کہ حضورؐ نے مجھے حلال ہونے کی حالت میں نکاح فرمایا، متواتر کے درجہ تک پہنچ چکی ہے۔ پھر اس روایت کی تائید ابو رافع کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سعید بن متیب، سلیمان بن یسار، ابوبکر بن عبد الرحمٰن، ابن شہاب زہری اور جمہور علمائے مدینہ کا مسلک یہی ہے کہ نبی مکرم نے حلال ہونے کی حالت میں نکاح کیا' سوائے سیدنا ابن عباس کے، کسی اور صحابی سے یہ مروی نہیں کہ آپؐ نے محرم ہوتے ہوئے نکاح کیا۔ اس لحاظ سے فردِ واحد کے مقابلہ میں جماعت کی روایت کو ترجیح ہے کیوں کہ فردِ واحد غلطی کے زیادہ قریب ہوتا ہے بمقابلہ ایک جماعت کے۔ علاوہ ازیں سیدنا ابن عباس کی حدیث کے اکثر احوال ہماری دوسری ذکر کردہ روایات کے متعارض ہیں۔ چنانچہ اس حالت میں سب روایات سے احتجاج ساقط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں کسی اور دلیل سے احتجاج کیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں سیدنا عثمانؓ بن عفان کی روایت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے محرم کے نکاح سے منع فرمایا اور آپ نے یہ فرمایا کہ "محرم نہ خود نکاح کرے اور نہ اس کا نکاح کیا جائے"۔ (امہات المومنین۔۹۳/۲۹۲) چنانچہ اس غیر معارض روایت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ امر محال ہے کہ حضورؐ ایک کام سے منع فرمائیں اور خود اس کو کریں۔ پھر خلفائے راشدین سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ اور علیؓ کا عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے اور سیدنا ابن عمرؓ اور اکثر اہلِ مدینہ کا قول بھی یہی ہے' (امہات المومنین۔ حکیم محمود احمد ظفر۔۲۹۳۔۲۹۲) اس بارے میں عبد اللہ بن عباسؓ کو کیونکہ ان کے درمیان ابو رافع سفیر تھا وہ اس بات کو زیادہ جاننے والا ہے علاوہ ازیں سیدنا ابن عباسؓ کی عمر اس وقت دس سال تھی یا

اس سے کچھ زیادہ اور وہ اس واقعہ میں موجود بھی نہیں تھے۔

مستشرقین کی آراء

واشنگٹن ارونگ: ''بلا شبہ پیغمبر (ﷺ) کی حکمت عملی کے تحت یہ ایک اور شادی تھی۔ گرچہ سیدہ میمونہؓ ۵۱ برس کی بیوہ تھیں لیکن اس رشتے سے دو زبردست مقاصد کا حصول ممکن ہوا، اور دو کافر اپنے ملحدانہ عقائد ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہو گئے جن میں سے ایک تو بیوہ خاتون کے بھانجے خالد بن ولید تھے جو کہ ایک بہادر جرنیل تھے اور دوسرے عمرو بن العاص جو خالد بن ولید کے دوست تھے''۔

جی ایم ڈیکارٹ: ''یہ پیغمبر اسلام ﷺ کی آخری شادی تھی، اس طرح آنحضرت ﷺ نے اپنے کئی مخالفین کو زیر کرنے کی بے بدل سیاسی دور اندیشی اختیار کی''۔

سر ولیم میور: ام المومنین سیدہ میمونہؓ کی ایک بہن خالد بن ولید کی والدہ تھیں۔ اپنی خالہ کی شادی کے بعد وہ مدینہ منورہ آئے اور دامن اسلام سے وابستگی اختیار کر لی اور اپنی خدمات اسلام کے لیے پیش کر دیں'' (امہات المومنین اور مستشرقین ۔۱۷۴)

اعتراض نمبر ۱۴۰

آنحضرتؐ نے اپنے اوپر شہد کو حرام کر لیا۔ ۲: آپؐ نے اپنے لیے ماریہ قبطیہ کو حرام کر لیا۔
۳: افواہ اُڑی کہ آپؐ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔

جواب؛ یہ درج ذیل آیات قرآنی کی تفسیر سے مذکورہ اعتراض کیے گئے ہیں۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ، تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمٌ ۔۲: قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ، وَاللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَالْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ O ۳: وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ، فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا وَقَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ O ۴: اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ O ۵: عَسٰی رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا O (سورۃ تحریم ۱۔۵ پارہ ۲۸)

''اے نبی! تم کیوں اپنے لیے ممنوع قرار دیتے ہو اس چیز کو جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال کی ہے۔ تم تو اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔
۲: اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے قسمیں کھولنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے۔
۳: اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی کو ایک راز کی بات کہی پھر جب اس نے وہ بات کسی اور کو بتا

دی اور اللہ تعالیٰ نے نبی کو اس چیز سے آگاہ کر دیا تو نبی نے اس بیوی کو اس بات کا کچھ حصہ بتا دیا اور کچھ سے صرف نظر کیا۔ پھر جب نبی نے بیوی کو بات کے افشاء سے آگاہ کیا تھا تو وہ بیوی بولی۔۔آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے۔ نبی ﷺ نے کہا: مجھے مطلع کیا ہے علم والے نے اور خبر والے نے'

۴: اگر تم دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو تو تمھارے دل اس بات پر مائل ہو چکے ہیں اور اگر تم دونوں نے نبی کی مرضی کے خلاف اتحاد کئے رکھا تو اللہ تعالیٰ جبرائیل اور نیک مومن اس کے مددگار ہیں' اس کے علاوہ تمام فرشتے بھی اس کے معاون ہیں۔

۵: اگر نبی نے تم سب کو طلاق دے دی تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو تمھارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمادے' اسلام والیاں، ایمان والیاں، عاجزی والیاں، توبہ کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں۔ بیوہ اور کنواریاں۔۔۔

پہلی تفسیر: رسول اللہ ﷺ نے شہد حرام کر لیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ میں آئندہ شہد استعمال نہیں کروں گا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیوی کے پاس شہد کا شربت نوش کیا تو دو یا تین بیویوں نے ایک منصوبہ بنایا اور جب آپ ان کے پاس آئے تو ہر ایک نے کہا آپ ﷺ سے ''مغافیر'' کی بو آتی ہے' کیا آپ نے مغافیر کھائے ہیں۔۔؟ رسول اللہ ﷺ نے کہا: کہ نہیں؛ میں نے تو شہد پیا ہے۔ انھوں نے کہا ہو سکتا ہے شہد کی مکھیوں نے ''عرفط'' کا رس چوسا ہو اور اس کی بدبو شہد میں شامل ہو گئی ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی خوشنودی کی خاطر شہد حرام کر لیا اور ان میں سے کسی کے سامنے قسم اٹھائی کہ آئندہ شہد استعمال نہیں کروں گا۔ ساتھ ہی اس بیوی کو تاکید کر دی کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتانا' مگر وہ بیوی اس بات کو اخفا نہ رکھ سکی اور دوسری کو بتا دی۔ اس افشائے راز سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کر دیا اور مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔۔۔ پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تنبیہ کی گئی کہ آپ نے ایک حلال چیز کو حرام کیوں کیا؟ یہ کام ویسے بھی نامناسب ہے اور محض یہودیوں کو خوش کرنے کے لیے تو اور بھی نامناسب ہے' بہ ہر حال اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ دوسری آیت میں بتایا گیا کہ قسم کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر ہے یعنی کفارہ۔ اس لیے آپ کفارہ دیجئے اور شہد استعمال کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر بات کو جانتا ہے اور اس کے ہر حکم میں حکمت ہوتی ہے۔ تیسری آیت میں افشائے راز کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیوی کو رازدارانہ طریقہ سے یہ بات بتا دی کہ میں نے شہد حرام کر لیا ہے مگر اس نے دوسری کو بتا دی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس بات سے آگاہ کر دیا اور آپؐ نے اس بات کا کچھ حصہ بیان کر کے بیوی سے شکوہ کیا کہ تُو نے یہ بات دوسری کو بھی بتا دی ہے۔ حالانکہ میں نے تاکید کی تھی کہ کسی سے نہ کہنا!۔ اس نے پوچھا: آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ

نے بتایا ہے جو ہر چیز کا علم رکھنے والا اور باخبر ہے“۔

چوتھی آیت میں روئے سخن ان دو بیویوں کی طرف ہے جن کی کوششوں سے رسول اللہ ﷺ نے شہد اپنے اوپر حرام کرلیا تھا اور ان سے کہا گیا کہ اگر تم دونوں اپنی غلطی سے توبہ کرلو جو تمھارے دل اس طرف مائل ہو چکے ہیں اور اگر تم نے رسول اللہ ﷺ کی منشاء کے خلاف ایکا کیے رکھا تو اس سے رسول اللہ ﷺ کو نقصان نہیں پہنچے گا کیوں کہ اللہ تعالی اور کارکنانِ قدر و قضا ان کے معاون و مددگار ہیں۔ اگر تمھارے رویے سے تنگ آ کر رسول اللہ ﷺ نے تم سب کو طلاق دے دی تو اللہ تعالیٰ ان کو تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمائے گا۔ اس تفسیر کی بنیاد ان دو روایتوں پر ہے جو بخاری و مسلم کے علاوہ حدیث کی دیگر کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں ایک روایت مختصر ہے، دوسری مفصل ہے۔

پہلی روایت: حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، زینب بنت جحشؓ کے پاس ٹھہرا کرتے تھے اور وہاں شہد پیا کرتے تھے۔ تو میں نے اور حفصہ نے اتفاق کیا کہ رسول اللہ ﷺ وہاں سے اٹھ کر جب ہمارے پاس آئیں گے تو ہم میں سے ہر ایک ان سے یہ کہے گی کہ آپ سے مغافیر کی بو آتی ہے، کیا آپ نے مغافیر کھائے ہیں؟ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ ان میں سے ایک کے پاس آئے تو اس نے یہی بات ان سے کہی۔ رسول اللہ نے کہا کہ میں نے مغافیر تو نہیں کھائے ہیں البتہ زینب کے ہاں شہد پیا ہے اور آئندہ کبھی شہد نہیں پیوں گا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ یاایھا النبی لم مکرم۔۔۔تا۔۔۔ان تتوبا (اگر تم دونوں توبہ کرلو) دونوں سے مراد عائشہ اور حفصہ ہی (سورۃ تحریم آیت ا۔۴)

دوسری روایت: حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ شہد اور میٹھی چیز کو پسند کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ نماز عصر کے بعد اپنی بیویوں کے پاس جایا کرتے تھے اور ان میں سے کسی ایک کے قریب ہوا کرتے تھے۔ ایک دن آپ ﷺ حفصہؓ کے پاس گئے اور عام دِنوں کی نسبت زیادہ ٹھہرے۔ اس پر مجھے غیرت آئی اور میں اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے پوچھ گچھ کرنے لگی۔ مجھے بتایا گیا کہ حفصہؓ کے قبیلہ کی ایک عورت نے حفصہؓ کے لیے شہد کی ایک چرمی تھیلی بھیجی ہے اور اس نے رسول اللہ ﷺ کو شہد کا شربت پلایا ہے۔ میں نے کہا' اللہ کی قسم! ہم اس کے لیے کوئی حیلہ سازی کریں گی“۔ چنانچہ میں نے سودہ بنت زمعہ سے کہا”ابھی رسول اللہ ﷺ تمھارے پاس آئیں گے' جب وہ تمھارے نزدیک ہوں تو پوچھنا ، کیا آپ ﷺ نے مغافیر کھائے ہیں؟ وہ کہیں گے نہیں، تم کہنا ”پھر آپ سے یہ بو کیسے آرہی ہے؟ وہ کہیں گے، میں نے حفصہؓ کے پاس شہد پیا ہے۔ تم کہنا، ہوسکتا ہے کہ شہد کی مکھیوں نے عرفط کا رس چوسا ہو“ پھر جب رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئیں گے تو میں بھی یہی کہوں گی اور صفیہؓ! تم بھی اسی طرح کہنا۔ بعد میں سودہؓ نے مجھے بتایا کہ اس سے تھوڑی ہی دیر بعد رسول اللہ ﷺ میرے دروازے پر آ کر

ٹھہرے اور میں نے تمھارے ڈر سے وہی کچھ کہا جو تم نے مجھے بتایا تھا۔ چنانچہ آپ سودہؓ کے قریب ہوئے تو اس نے کہا: کیا آپ نے مغافیر کھائے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے کہا آپ سے یہ بو کیسے آ رہی ہے۔ آپ نے فرمایا؛ حفصہؓ نے مجھے شہد کا شربت پلایا ہے۔ سودہ نے کہا ہوسکتا ہے کہ شہد کی مکھیوں نے عرفط کا رس چوسا ہو۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئے تو میں نے بھی یہی کہا۔ پھر صفیہؓ کے پاس گئے تو اس نے بھی یہی باتیں کہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب دوسرے دن رسول اللہ ﷺ حفصہؓ کے پاس گئے اور اس نے پوچھا کہ کیا میں آپ کو شہد کا شربت پلاؤں؟ تو آپ نے جواب دیا: کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی''۔ اس پر سودہؓ نے مجھ سے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کو (ان کی پسندیدہ شے سے) محروم کر دیا ہے۔ میں نے کہا: چپ کر! (دونوں روایات دیکھنے کے لیے صحیح بخاری کتاب الطلاق) اَستَغفِرُ الله وَلَا حَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِالله ،،،۔۔۔۔۔۔۔

تضادات: ۱: پہلی روایت میں شہد پلانے والی حضرت زینبؓ ہیں اور وسری میں حضرت حفصہؓ ،۲: پہلی روایت میں حیلہ سازی میں شریک حضرت حفصہؓ ہیں جب کہ دوسری میں ان کے خلاف حیلہ سازی کی گئی۔ ۳: پہلی روایت میں جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے والیاں حضرت عائشہ اور حفصہ ہیں اور دوسری میں تین حضرت عائشہؓ، سودہؓ اور صفیہؓ (معاذ اللہ)۔ ۴: پہلی روایت میں رسول اللہ ﷺ زینبؓ کے پاس ٹھہرا کرتے تھے۔ ''کَانَ یمکث عند زینب''، یعنی یہ آپ کا معمول تھا یا کم از کم کئی دن سے ایسا ہو رہا تھا جب کہ دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ، سودہؓ اور صفیہؓ نے پہلے ہی آپ کو شہد سے متنفر کر دیا تھا۔ ۶: پہلی روایت میں ہے کہ ابھی ایک بیوی نے آپ سے کچھ کہا تھا کہ آپ سے مغافیر کی بو آ رہی ہے تو آپ نے شہد کو حرام کر لیا تھا جب کہ دوسری روایت میں ہے کہ تین بیویوں نے یکے بعد دیگرے آپؐ سے یہ بات کہی تھی۔ ۷: پہلی روایت کے مطابق اِن تَتوبَاً (اگر تم دونوں توبہ کر لو) کی مخاطب حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ ہیں جب کہ دوسری روایت اس سے ساکت ہے' کیوں کہ اس میں تین بیویوں کا ذکر ہے اور ان کو تتوباً سے خطاب نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تتوبا تثنیہ کا صیغہ ہے۔ طبرانی اور ابن حاتم نے بسند صحیح روایت' روایت کی ہے کہ شہد پلانے والی حضرت سودہؓ تھیں جب کہ ابن جریر طبری اور ابن سعد کی روایت کے مطابق شہد پلانے والی حضرت ام سلمہؓ تھیں۔ شارحین بخاری کی توجہ باقی تضادات کی طرف نہ گئی البتہ یہ دوئی سی بات ان کو بھی کھٹکتی ہے کہ ایک روایت میں شہد پلانے والی حضرت زینبؓ اور دوسری میں حضرت حفصہؓ ہیں۔ اس نمایاں تعارض کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے دو جواب دیئے ہیں۔

جواب اول: یہ کہ دونوں روایتیں ایک وقت سے متعلق نہیں ہیں۔ دو الگ الگ واقعات ہیں ایک واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کے پاس شہد پیا اور دوسرے میں حضرت حفصہؓ کے

ہاں۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے کیوں کہ دونوں روایتوں میں مغافیر کی بو کا ذکر ہے اور جس چیز کو رسول اللہ ﷺ ایک بار بو کی وجہ سے ترک کر چکے ہوں اس کو دوبارہ استعمال کرنا کیسے گوارا فرما سکتے ہیں؟ نیز اس صورت میں ازواج مطہرات کو دو مرتبہ اور اگر طبرانی اور طبری کی روایات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو چار مرتبہ کذب بیانی اور رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی کا مرتکب ماننا پڑے گا۔ حالاں کہ ان پاک بیبیوں کی طرف ایک مرتبہ بھی ایسی حرکات منسوب کرنے کے لیے دل پر بھاری پتھر رکھنا پڑتا ہے پھر بھی ضمیر مطمئن نہیں ہوتا اور ان کا جواز فراہم کرنے کے لیے دور از کار توجیہات، تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے مثلاً شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں (اگر تم اعتراض کرو کہ عائشہؓ وحفصہؓ کے لیے جھوٹ بولنا اور ایسا اتفاق کرنا جس میں رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی ہو کیوں کر نا جائز تھا؟) تو میں جواب دوں گا کہ عائشہؓ کی عمر چھوٹی تھی نیز ان کا مقصد رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانا نہیں تھا بل کہ یہ ویسا ہی ایک حیلہ تھا جیسا کہ عورتیں اپنی سوتن کی رقابت میں کیا کرتی ہیں۔ اس جواب میں متعدد جھول ہیں مگر ہم ان سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف وہ نمایاں کمزوری بتا دیتے ہیں جس کی بنا پر علامہ شبلی نے اس جواب کو مسترد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''لیکن علامہ موصوف (بدرالدین عینی) کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے تو یہ واقعہ ایلاء کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے جو ۹ ھ کو واقع ہوا تھا۔ اس وقت حضرت عائشہؓ سترہ برس کی ہو چکی تھیں۔ دوسرے عائشہؓ کم سن تھیں لیکن دوسری ازواج مطہرات جو اس میں شریک ہوئیں وہ تو پوری عمر کی تھیں۔ خود حضرت حفصہؓ کی عمر آنحضرت ﷺ سے شادی کے وقت ۳۵ برس تھی جناب شبلی نے علامہ عینی کے جواب کو تو مسترد کر دیا لیکن خود بھی چوں کہ ان روایتوں کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے یہ عجیب و غریب توجیہہ پیش کرتے ہیں ''ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہیں تھی۔ تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ لطیف المزاج تھے اور بُو کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے۔ مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ واقعی اس میں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن اس صورت میں انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ چند ازواج مطہرات کو تو اس کرختگی کا احساس ہو گیا لیکن خود رسول اللہ ﷺ کو مطلق پتہ نہ چلا اور مزے سے ناگوار اور کرخت بو والا شہد پی لیا۔ ایک بار نہیں کئی بار۔۔!! حالاں کہ تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ لطیف المزاج تھے اور بو کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے''۔ پھر مغافیر کی کرخت بو میں بسا ہوا شہد کیسے نوش فرما سکتے تھے۔ اِنَّ ھٰذا لَشَیءٌ عَجَائِبٌ!

دوسرا جواب: یہ کہ دونوں روایتیں ہیں تو ایک ہی واقعہ سے متعلق لیکن پہلی روایت جس کا ایک راوی حجاج ہے۔ زیادہ صحیح ہے اس لیے اس کو ترجیح حاصل ہوگی۔ علامہ نووی لکھتے ہیں نسائی نے کہا کہ

حجاج کی بیان کردہ حدیث کی سند صحیح اور نہایت عمدہ ہے۔اس جواب کے مطابق شہد پلانے والی حضرت زینبؓ ہی قرار پائے گی اور دوسری روایت میں ان کی جگہ حضرت حفصہؓ کا نام راوی کی غلطی پر محمول کیا جائے گا۔قطع نظر اس سے کہ یہ جواب پہلے جواب کے منافی ہے۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا واقعی حجاج کی روایت زیادہ صحیح ہے اور اس کی سند نہایت عمدہ ہے؟ تو آیئے پہلے سند پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

ہم ان میں سے صرف دو راویوں کے حالات کا اسماالرجال کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ایک حجاج۔جس کے حوالے سے امام نسائی نے اس روایت کو زیادہ صحیح کہا ہے۔دوسرا ابن جریج جو حجاج کا استاد ہے۔اس روایت کے دیگر سلسلوں میں بھی موجود ہے۔حجاج اگر چہ ثقہ ہے مگر آخری عمر میں ان کو اختلاط ہو گیا تھا یعنی حافظہ اس قدر خراب ہو گیا تھا کہ مختلف روایتیں اور سندیں ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیتا تھا۔اس کی یہ حالت دیکھ کر مشہور محدث اور نقاد یحییٰ ابن معین نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ اب کسی کو حدیث سننے کے لیے شیخ (حجاج کے پاس مت لے جانا!) (جب حجاج آخری بار بغداد آیا تو حدیثوں کو خلط ملط کرنے لگا۔یہ دیکھ کر یحییٰ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اب کسی کو شیخ (حجاج) کے پاس نہ لے جانا) اتنے اہم معاملہ میں ایسے مریض اختلاط کی روایتوں کا بھلا کیا اعتبار؟ ہوسکتا ہے کہ یہ روایت بھی اس عالم اختلاط میں بیان کی ہو۔ابن جریج حجاج کا استاد ہے اور بہت پختہ کار راوی ہے۔حدیث کی بیش تر کتب میں اس کی روایات موجود ہیں اور محدثین کی اکثریت اس کو ثقہ اور قابلِ اعتبار راوی تسلیم کرتی ہے مگر امام مالکؒ فرماتے ہیں ''ابن جریج حاطب لیل'' تھا۔حاطب لیل' رات کو لکڑیاں چننے والے کو کہتے ہیں۔چوں کہ اس کو اندھیرے کی وجہ سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ سوکھی لکڑی ہاتھ آتی ہے یا گیلی اس لیے ہر قسم کی لکڑیاں جمع کر لیتا ہے۔اس مناسبت سے محدثین اس راوی کو حاطب لیل کہتے ہیں۔جو روایات میں امتیاز نہ کرتا ہو اور ہر طرح کی رطب و یابس بیان کرتا رہتا ہو۔یزید ابن زریع کہتے ہیں ''حاطب لیل'' اور صاحب غثاء ہونا بذات خود ایسی خامیاں ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ابن جریج کی روایات پر اعتماد کرنا مشکل ہے' لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس شخص کا عقیدہ اور کردار اچھا نہیں تھا۔جریر کلبی کہتے ہیں' ابن جریج متعہ کو جائز سمجھتا تھا اس نے ۶۰ عورتوں سے شادی کی تھی لیکن امام شافعیؒ نے اس کی بیویوں کی تعداد نوے بتائی ہے۔۔ہمارے خیال میں اس روایت کا بنیادی واضع اور موجد ابن جریج ہے۔بہ ہر حال یہ دونوں روایتیں اس قابل نہیں کہ ان کو بنیاد بنا کر آیت قرآنی کی تفسیر کی جائے اور ایک تو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ گمان کیا جائے کہ انھوں نے محض اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے شہد جیسی اعلیٰ نعمت اپنے لیے حرام کر لی تھی۔۔حالاں کہ قرآن کریم نے شہد کو باعث شفا قرار دیا ہے۔فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ''۔ دوسرے ازواج مطہرات کے گٹھ جوڑ کر کے جھوٹ گھڑنے والیاں مانا جائے حالاں کہ ان پاک بیبیوں کی

طہارت پر ''ویطھرکم تطھیرا''، قطعی ہے اوران کا مقام اتنا بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ،، سورۃ الاحزاب۔۳۲) (اے نبی کی عورتو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو) کیا ایسی پاک باز اور عالی مرتبہ خواتین کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان سے ایسی گھٹیا حرکتیں سرزد ہوئی ہوں گی جن کا تذکرہ مندرجہ بالا دو متعارض روایات میں کیا گیا ہے۔ حاشا وکلا ہرگز نہیں۔

دوسری تفسیر: رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماریہ قبطیہ ؓ کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، اس تفسیر کی آیات تحریم کے ساتھ تطبیق بعینہٖ پہلی تفسیر کی طرح ہے۔ حرف شہد کی جگہ حضرت ماریہ ؓ کا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماریہ ؓ کو کیوں حرام کیا تھا؟؟ روایات میں اس کی وجہ جو بیان کی گئی ہے وہ اس قدر لغو بلکہ شرم ناک ہے کہ ہم اس کی تفصیلات بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب کہ علامہ نووی نے صاف لکھا کہ ماریہ کو حرام کر لینے کا قصہ کسی بھی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ جو واقعہ کسی بھی صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے اس کو نہ صرف یہ کہ تمام مفسرین نے ذکر کیا ہے' بل کہ خطابی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اکثر مفسرین کے نزدیک آیات تحریم' ماریہ ہی کے قصہ میں نازل ہوئی تھیں۔ خلاصہ اس تمام تحقیق کا یہ ہے کہ شہد یا حضرت ماریہ ؓ کو حرام کر لینے کے سلسلہ میں وارد ہونے والی تمام روایات جعلی، خود ساختہ اور امہات المومنین ؓ پر بہتان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی شہد کو اپنے لیے حرام کیا تھا نہ حضرت ماریہ ؓ کو۔ رسول اللہ ﷺ تو لوگوں کے لیے پاک اور طیب چیزوں کو حلال کرنے والے ہیں۔ یحل لھم الطیبات''۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنے لیے پاک چیز کو حرام کر لیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آیات تحریم کا مفہوم کیا ہے تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ تمام الجھنوں کی جڑ شہد اور ماریہ والی روایات ہیں، اگر ان سے صرف نظر کر لیا جاتا تو حقیقت تک رسائی مشکل نہ تھی۔

صحیح تفسیر: یعنی (آنحضرت ﷺ) نے قسم کھائی تھی کہ میں ایک مہینے تک اپنی بیویوں سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ اس عارضی تعلق کو قرآن کریم نے تحریم سے تعبیر کیا ہے جس طرح حضرت موسیٰؑ کے دودھ نہ لینے کے لیے تحریم کا لفظ استعمال فرمایا، ''وَحَرَّمْنَا عَلَیْہِ الْمَرَاضِعَ'' (اور حرام کر دیں ہم نے موسیٰؑ پر دودھ پلانے والیاں) یہاں ''حرمنا'' کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے موسیٰ کے لیے پلانے والیوں کا دودھ شرعی طور پر حرام کر دیا تھا بل کہ مراد یہ ہے کہ ان کی والدہ کے آنے تک باقی عورتوں کا دودھ پینے سے ہم نے موسیٰؑ کو روک دیا تھا۔ ایلاء میں بھی یہی صورت تھی' یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو ایک مہینے تک بیویوں کے پاس جانے سے روک دیا تھا۔ اس امتناع کو تحریم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خود حضرت عائشہ ؓ بیان فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ نے ایلاء کیا تھا اور تحریم کی تھی تو ایلاء کے بارے میں آپ کو کفارہ کے لیے کہا گیا ہے اور تحریم کے سلسلے میں کہا گیا ''لِمَ تُحَرِّمُ'' عربی کی مشہور لغت ''لسان العرب'' سے حضرت عائشہ ؓ کے فرمان''

اِلٰی رَسُولِ اللّٰہِ وَحَرَّمَ“ کی تشریح کی گئی ہے۔اس سے حضرت عائشہؓ کی مراد یہی تحریم ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ایلاء کے ذریعے کی تھی۔غرض کہ رسول اللہ ﷺ نے شہد کو حرام کیا تھا نہ ماریہ قبطیہؓ کو۔صرف عارضی طور پر ازواج مطہرات سے قطع تعلقی کی قسم کھائی تھی جسے تحریم سے تعبیر کیا گیا ہے۔یہ قطع تعلقی اگرچہ عارضی تھی لیکن بہ ہر حال ازواج مطہرات کی آزردگی کا باعث تھی اور یہ چیز رسول اللہ ﷺ کے عمومی طرزِ عمل کے خلاف تھی‘ کیوں کہ آپ ہمیشہ اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے خواہاں رہتے تھے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس جانب متوجہ کرتے ہوئے فرمایا ”اے نبی جو چیز اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حلال کی ہے (یعنی ازواج کی قربت) اس کو کیوں اپنے لیے ممنوع قرار دیتے ہو“۔ ”یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ“ (اس طرح تو تمھاری بیویاں آزردہ ہو جائیں گی) حالاں کہ تم انھیں خوش رکھنا چاہتے ہو۔ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے“ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔اگر چاہو تو بیویوں کے ساتھ حسب سابق عمدہ تعلق قائم رکھو اور قسم کا کفارہ ادا کر دو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قسموں کے کھولنے کا طریقہ مقرر کر رکھا ہے۔ (یعنی کفارہ کی ادائیگی) اور اللہ تعالیٰ سب کا آقا اور وہ علم والا حکمت والا ہے۔ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ ، وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۔اس تفسیر سے نہ تو اس آیت میں رسول اللہ ﷺ پر کسی قسم کا عتاب ہے نہ اس بات پر اظہارِ ناراضگی ہے کہ آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں بل کہ اس کے بر عکس بتایا یہ جا رہا ہے کہ رسول اللہ کا اپنے اہلِ خانہ سے حسن سلوک اتنا مثالی ہے کہ آپ ان کی خوشنودی کے متلاشی رہتے ہیں۔آپ خود فرماتے ہیں ”اَنَا خَیْرُکُمْ لِاَهْلِیْ“۔(میں تم سب کی بہ نسبت اچھا سلوک کرنے والا ہوں اپنے اہل خانہ کے ساتھ)۔اب رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے ایلاء کیا کیوں تھا؟ تو اس کا پس منظر یہ ہے کہ ہجرت کے بعد ابتدائی دنوں میں مہاجرین و انصار کی معاشی حالت خاصی کمزور تھی۔مہاجرین کی اس لیے کہ وہ اپنا سب کچھ مکہ چھوڑ آئے تھے اور انصار کی اس لیے کہ ان پر مہاجرین کی کفالت و ضیافت کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رسول اللہ ﷺ کی رحمت و برکت کے صدقے رفتہ رفتہ حالات سدھرنے لگے اور فتوحات وغیرہ کی وجہ سے مہاجرین و انصار کسی حد تک خوش حال ہو گئے‘ پہلے کھجوروں اور ستوؤں پر گزارہ تھا۔اب بہت گھروں میں کھانے پکنے لگے۔ پہلے کسی کو ڈھنگ کے کپڑے میسر نہ تھے۔اب مدینہ میں مرد و زن نسبتاً اچھے لباسوں میں ملبوس نظر آنے لگے۔ازواج مطہرات بھی اسی معاشرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔اس لیے جب تک لوگ تنگی سے گزارا کرتے رہے‘ ازواج مطہرات بھی روکھی سوکھی پر قانع رہیں اور کسی قسم کا مطالبہ نہ کیا مگر جب باقی گھروں میں آسودگی کے آثار پیدا ہوئے اور مدینہ کی عورتیں اچھے اچھے کپڑے پہن کر ازواج مطہرات کے پاس آنے جانے لگیں تو ازواج مطہرات کے دلوں میں اچھا کھانے اور پہننے کی خواہش پیدا ہوئی اور انھوں

نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ہمیں پہلے سے زیادہ نان ونفقہ اور خرچہ دیا جائے۔ اچھے رہن سہن کی خواہش کوئی معیوب بات نہ تھی نہ ہی شوہر نامدار سے ضرورت کے مطابق خرچہ مانگنے میں کسی قسم کی قباحت تھی مگر زہد وفقر کے جس بلند مقام پر رسول اللہ ﷺ فائز تھے اس کے پیش نظر آپ کو اپنی بیویوں کا عام عورتوں کی طرح دنیاوی آسائشوں کی طرف راغب ہونا پسند نہ آیا تاہم اس مطالبے میں پیش پیش چوں کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ تھیں اور وہی باقی ازواج کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ اس لیے رسول اللہ نے غالباً ان کی تسلی کے لیے ان کو یہ تکوینی راز بتا دیا کہ تم دونوں کے والد یکے بعد دیگرے میرے جانشین ہوں گے مگر یہ بات دیگر ازواج کو نہ بتانا مگر حضرت حفصہؓ نہ ضبط کر سکیں اور یہ بات آگے بڑھا دی۔ اس افشائے راز سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو مطلع کر دیا تو آپ نے حضرت حفصہؓ سے باز پرس کی اور کہا کہ کیا میں نے تمھیں تاکید نہیں کی تھی کہ کسی اور کو مت بتانا۔؟

حضرت حفصہؓ کو حیرت تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہ بات ظاہر کر بیٹھی ہوں۔ چناں چہ انھوں نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو اس افشائے راز کے بارے میں کس نے بتایا؟ آپ نے جواب دیا کہ ''العلیم الخبیر'' نے۔ بہ ہر حال رسول اللہ کو تو ازواج مطہرات کا نان ونفقہ طلب کرنا ہی پسند نہ آیا تھا اوپر سے افشائے راز نے معاملہ مزید سنگین کر دیا اور آپ نے ازواج مطہرات کو تنبیہ کے لیے ان سے ایک مہینے تک ہر قسم کا تعلق منقطع کرنے کی قسم کھائی تھی۔ یہ تھا ایلاء کا سبب۔

اس کے مطابق باقی ماندہ آیات کی تفسیر اس طرح ہوگی۔ واذ اسوالنبی الی بعض ازواجہ حدیثا، (اور جب نبی نے اپنی بعض بیویوں کو پوشیدہ طور پر ایک بات بتائی (یعنی حضرت حفصہ، حضرت عائشہ، یا دونوں) کو یہ بتا دیا کہ تمھارے والد یکے بعد دیگرے میرے جانشین ہوں گے)۔ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِہٖ۔ جب یہ بات ان میں سے کسی نے دیگر ازواج کو بتا دی ''وَ اَظۡهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيۡهِ' اور اللہ تعالیٰ نے نبی کو آگاہ کر دیا۔ عَرَّفَ بَعۡضَهٗ، تو نبی نے (افشائے راز کردہ راز کا کچھ حصہ اس بیوی کو بتا دیا)۔ وَ اَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ اور کچھ حصہ سے اعراض کیا (یعنی بیان نہ کیا۔ مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں افشائے راز سے باخبر ہو چکا ہوں اور اس مقصد کے لیے اشارۃً کچھ حصہ جتلانا کافی تھا) فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ، جب نبی نے اس بیوی کو افشائے راز کے بارے میں بتایا ''قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا'' اس نے پوچھا کہ آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟ نَبَّاَنِىَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ، نبی نے جواب دیا کہ علم والے اور خبر رکھنے والے، یعنی اللہ تعالیٰ نے۔ نفقہ کا مطالبہ اگرچہ تمام ازواج نے کیا تھا مگر ان کی ترجمانی کا فریضہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ نے انجام دیا تھا اس لیے اگلی آیت میں دونوں کو متنبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُكُمَا۔ یعنی طلب نان ونفقہ پھر افشائے راز کی صورت میں تم سے جو کوتاہیاں سرزد ہوئی

ہیں ان سے اگر تم دونوں توبہ کر لو تو بہتر ہے کیوں کہ (تمھیں غلطی کا احساس ہو چکا ہے) اور تمھارے دل توبہ کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ لیکن اگر تم نے ایکا کیے رکھا (اور اپنے مطالبے سے دستبردار نہ ہوئیں تو اس سے نبی کو کوئی نقصان نہ ہوگا) فَاِن الله هو مولاه و جبريل و صالح المومنين و الملائكة بعد ذلك ظهير، کیوں کہ اللہ تعالیٰ جبریل، صالح مومن اور ملائکہ سب اس کے معاون و مددگار ہیں۔ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ، اگر نبی ناراض ہو کر تمھیں طلاق دے دی تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو تم سے بھی بہتر بیویاں عطا کر دے۔ الآیہ۔ (لطف یہ کہ اس فقیرانہ زندگی پر آپ نے صرف یہ کہ مسرور و مطمئن ہوئے بل کہ اَلْفَقْرُ فَخْرِی کہہ کر اس پر ناز کیا کرتے تھے اور دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاکِیْنِ، (اے اللہ! مجھے زندگی بھر مسکین رکھنا، مرتے وقت بھی مسکین رکھنا اور محشر میں بھی مسکینوں کے ساتھ اٹھانا)۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اس موقع پر آیات تطہیر نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں ازواج کو بتایا کہ اگر تمھیں دنیاوی آسائش و آرائش مطلوب ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمھارا گزارا مشکل ہے۔ اس صورت میں رسول اللہ ﷺ تمھیں سامان وغیرہ دے کر فارغ کر دیں گے اور اگر تمھیں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت مرغوب ہے تو پھر دنیاوی عیش و آرام کی طلب سے دستبردار ہونا پڑے گا اور فقیرانہ زندگی گزارنا ہوگی۔ اب تمھاری مرضی ہے اور تمھیں پورا پورا اختیار ہے کہ ان میں سے جو صورت چاہو پسند کر لو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفت گو کی اور کہا: میں نے تم سے ایک بات پوچھنی ہے مگر اس کے جواب میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، بل کہ چاہو تو اپنے والدین سے بھی مشورہ کر لو! حضرت عائشہ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ وہ کون سی بات ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں آیات تطہیر پڑھ کر سنا دیں۔ ترجمہ: (اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دو اگر تمھیں دنیاوی زندگی اور اس کی زیبائش مطلوب ہے تو آؤ، میں تم کچھ سامان دے دوں اور اچھے طریقہ سے تم کو آزاد کر دوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور عالم آخرت کی طلب گار ہو تو اللہ نے تم میں سے اچھے عمل کرنے والیوں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے)۔ ازواج مطہرات کی ترجمانی کرتے ہوئے جب حضرت عائشہؓ نے نان ونفقہ کا مطالبہ کیا تھا تو ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر دنیاوی آسائشیں حاصل کی جائیں بل کہ وہ تو آپ ﷺ کی رفاقت کے شرف سے بہرہ ور ہوتے ہوئے آسائشیوں کی طلب گار تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ آپ ﷺ کی رفاقت کے شرف اور متاع دنیا یکجا نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے کسی ایک کو بہ ہر حال چھوڑنا پڑے گا، تو ایسی کون سی زوجہ ہو سکتی ہے جو آپ کی رفاقت پر دنیاوی عیش و نعم کو ترجیح دیتی!؟ چناں چہ حضرت عائشہؓ نے فی الفور جواب دیا ''کیا میں آپ پر دنیا کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟

نہیں یا رسول اللہ ﷺ ۔۔ میں دنیا کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں اور پسند کرتی ہوں۔ بعد میں باقی ازواج مطہرات نے بھی یہی جواب دیا۔اس طرح رسول اللہ ﷺ کا ملال یکسر جاتا رہا اور پھر سے خوشگوار زندگی کی بہاریں لوٹ آئیں۔(صاحب سید الوریٰ کا بیان ختم ہوا)

ایک اہم نکتہ

مدینہ میں افواہ گردش کرنے لگی کہ آپؐ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے؟

جواب: ایلاء کے واقعہ میں آپؐ نے تنہائی اختیار کر لی تھی۔ مدینہ میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ آپ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔اس افواہ سے مسلمان پریشان تھے لیکن یہ دشمنوں کا الزام خاک بوس ہو گیا جب آپ انتیسویں دن بالا خانہ سے اترے اور گھر تشریف لائے۔ غیر متوقع آمد پر ازواج حیران رہ گئیں۔ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ اجازت پا کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں' حضرت عمرؓ اللہ اکبر پکار اٹھے اور پھر عرض کی کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم بیٹھے ہیں۔اجازت ہو تو انھیں خبر کروں کہ یہ واقعہ (یعنی طلاق دینے کا) غلط ہے۔ چوں کہ ایلاء کی مدت یعنی ایک ماہ گزر چکا تھا۔آپ ﷺ بالا خانہ سے اترے اور عام باریابی کی اجازت ہوگئی اور آیت تخییر کا نزول ہوا۔ مدینہ والوں نے طلاق دینے کا خواہ مخواہ شوشہ چھوڑا جب کہ مسلمانوں کو بھی صحیح طور پر اس واقعے کا علم نہ تھا۔ جیسے حضرت عمرؓ بھی بارگاہ نبوی میں عرض کرتے ہیں کہ کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔صحابہ کی پریشانی آپ کی تنہائی تھی۔ نیز ادھر اُدھر کی طلاق والی غیر یقینی باتیں سن کر بھی مغموم تھے۔

ایک شبہ کا ازالہ: آنحضرت ﷺ بالاتفاق ۲۹ دن بالا خانہ میں تشریف فرما رہے۔حضرت عمرؓ کا مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخر کا؟ روایت کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پہلے دن کا ہے اور آخر کے الفاظ سے معلوم ہے کہ یہ مہینہ کی ۲۹ ویں دن کا واقعہ ہے۔آخری فقروں کے مدِ نظر بظاہر ۲۹ ویں دن کا واقعہ شمار کیا جاتا ہے۔اس میں احتمال ہے کہ ۲۸ روز تک حضرت عمرؓ کو اطلاع ہی نہ ہوئی ہو؟ حالاں کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں بدیں سبب محدثین نے اس کی تاویل کی کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے دن کا ہے اور اترنے کا واقعہ آخری دن کا ہے۔راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا۔

ایک اور شبہ کا ازالہ: بالا خانہ کے لیے احادیث میں ''مشربہ'' کا لفظ آیا ہے۔مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربہ ام ابراھیم (ماریہ قبطیہ کے فرزند) مشہور ہوا۔اس لیے بعض کو یہ شبہ ہوا کہ یہ وہی بالا خانہ تھا لیکن یہ درست نہیں۔مشربہ ابراھیم مدینہ سے باہر واقع تھا اور حضرت عمرؓ کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جو حضرت حفصہؓ کے گھر اور مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمرؓ دوڑ کر کبھی ادھر جاتے

اور کبھی اُدھر جاتے تھے۔ ابوداؤد میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کا بالا خانہ تھا جو مسجد نبوی کے متصل تھا۔ دیگر ازواج کے حجروں کے برابر تھا۔

نکتہ: ایلاء کے سلسلے میں انتیس دن گزارنے کے بعد غیر متوقع طور پر بالا خانہ سے اتر کر گھر تشریف لائے۔ اہلِ خانہ حیران رہ گئے اور عرض کی یارسول اللہ! آپ نے تو ایک مہینہ تک کی قسم کھائی تھی۔ ابھی ایک مہینہ میں ایک دن باقی ہے۔ مہینہ پورا نہیں ہوا۔ آنحضرت نے فرمایا: مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے

اخلاق منورہ کے بارے واقعہ ایلاء: علامہ شبلی نعمانی (سیرت النبی۔ ج۔ا۔ ۳۲۰/۳۲۱) بتاتے ہیں ماریہ قبطیہؓ کی روایت تفصیل سے مختلف طریقوں سے نقل کی گئی ہے جس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا راز جو حضرت حفصہؓ نے فاش کر دیا تھا انہی ماریہ قبطیہؓ کا راز تھا۔ اگرچہ یہ روایتیں بالکل لغو، موضوع اور ناقابل ذکر ہیں لیکن چوں کہ یورپ کے اکثر مورخین نے آنحضرت ﷺ کے معیارِ اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا گل سر سبد یہی ہیں اس لیے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔ ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے لیکن ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ ماریہ قبطیہؓ آنحضرت ﷺ کی موطوۃ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے آپ پر حرام کر لیا۔ حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۃ تحریم میں لکھتے ہیں ''ترجمہ: اور سعید بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہٰی ہوتی ہے، یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہیں کریں گے'' اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند (ہشیم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک شرم ناک اخلاق سوز اور باطل وہ ہے۔''

وللطبرانی من طریق الضحاك عن ابن عباس قالت دخلت حفصه بیتها فوجده یطاء ماریه معابتة' '(اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہؓ اپنے گھر گئیں تو آنحضرت کو حضرت ماریہ کے ساتھ ہم بستر دیکھا، اس پر انھوں نے آنحضرت ﷺ کو معاتب کیا)

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے۔ ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے یہ تمام محض اختراع اور بہتان ہیں۔'' والصیح فی سبب نزول الآیة انه فی قصة العسل لافی قصه ماریة المروی فی غیر الصیحین و قال نووی ولم تات قصة ماریة من طریق صحیح ''۔ ترجمہ: اور آیت کی شان نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے، ماریہ کے قصہ باب میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے۔ نووی نے کہا کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے''۔ یہ تفسیر ابن جریر، طبرانی، مسند ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے ان کی کتابوں میں عموماً اس قسم کی رطب و یابس روایتیں مذکور ہیں۔ اس لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص

تصریح نہ ہو لائق التفات نہیں۔ حافظ ابن حجر نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروق ہیں۔ لیکن اولاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں، صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت نے جو حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے۔ اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں۔ یعنی آنحضرت کو نہیں دیکھا تھا اس لیے یہ روایت اصول حدیث کی رو سے منقطع ہے۔ یعنی اس کا سلسلہ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔ اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے لیکن اس طریقہ کے ایک راوی عبدالملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دار قطنی نے لکھا ہے۔ ترجمہ: سندوں میں اصل الفاظ حدیث میں بہت خطا کرتے ہیں''۔ یہ بحث اصول روایت کی بنا پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کد و کاوش کی حاجت نہیں جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں۔ وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جا سکتے' نہ کہ اس ذات پاک کی طرف جو تقدس و نزہت کا پیکر تھا ''ﷺ'' کیے جائیں۔

اعتراض نمبر ۱۴۱

''آنحضرت ﷺ کو عائشہؓ اور حفصہؓ نے زہر دے کر شہید کیا''۔ عیاشی بسند معتبر از حضرت صادقؒ روایت کردہ است کہ عائشہ و حفصہ آنحضرت (ﷺ) را بزہر شہید کردند۔ (امہات المومنین۔ حکیم محمود احمد ظفر۔ ۱۴۸)

جواب: جناب قاضی عبدالدائم (سید الورٰی۔ ۲۔ ۵۳، ۴۵۲) لکھتے ہیں کہ ''بیماری دراصل اس زہر کا نتیجہ تھا جو تین سال پہلے آپ کو یہودیوں نے خیبر میں دیا تھا۔ تفصیل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ خیبر کی فتح سے فارغ ہوئے تو مرحب کی بھتیجی زینب بنت حارث زوجہ سلام بن مشکم نے زہر ملا کر ایک بکری بھونی، بازوؤں، پٹھوں میں زہر خاص طور پر زیادہ کر دیا کیوں کہ سن چکی تھی کہ آپ ﷺ کو ان جگہوں کا گوشت بہت مرغوب ہے۔ نماز مغرب کے بعد آپ ﷺ نے اس عورت کو اپنے پیروں کے پاس بیٹھے دیکھا۔ دریافت کرنے پر کہنے لگی، ابوالقاسم (رسول اللہ کی کنیت) میں آپ ﷺ کے لیے ہدیہ لائی ہوں' قبول کر لیجیے''۔ آپ ﷺ نے بکری قبول فرما لی اور چند صحابہ کے ساتھ کھانے بیٹھ گئے۔ ان ہی میں ایک حضرت بشر بن البراء بن معرور بھی تھے۔ آپ نے حسب عادت بازو کاٹا اور ایک بوٹی نوچ کر کھانے لگے۔ بشرؓ نے بھی کچھ گوشت کاٹا اور منہ میں لے لیا۔ حضرت بشرؓ پر تو وہیں بیٹھے بیٹھے زہر کا اثر ہو گیا لیکن آپ نے فوراً شانہ اقدس سے فصد کھلوائی (یعنی رگ سے خون نکلوایا) اور دوسرے صحابہ کو بھی اس کا حکم دیا۔ اس کے بعد اگرچہ آپ تین برس اور زندہ رہے مگر زہر کا اثر اپنا کام بتدریج دکھاتا رہتا تھا۔ کبھی اس کا زور ہو جاتا تو آپ فصد کھلوا ڈالتے تھے اور تخفیف ہو جاتی تھی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں'' جب سے آپ

ﷺ کو زہر دیا گیا' اس کا اثر آپ کے کوّے اور تالو میں برابر دیکھا کرتا تھا۔ پس مرض الموت درحقیقت اسی زہر کا نتیجہ تھا۔ خود آپ بھی اس آخری بیماری میں حضرت عائشہؓ سے اکثر فرمایا کرتے تھے ''خیبر میں جو لقمہ میں نے کھایا تھا' اس کا فساد برابر پا تا رہا ہوں یہاں تک کہ اب رشتہ حیات کٹ جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اسی طرح دوران مرض جب بشر بن البراءؓ کی ماں نے عرض کی ''آپ پر میرے ماں باپ قربان! کسی بیماری کا خیال نہ کیجیے۔ اگر آپ کو کوئی بیماری ہے تو وہی لقمہ ہے جو آپؐ کے ساتھ کھانے والے (یعنی بشرؓ) نے کھایا تھا''۔ آپ نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: میں بھی یہی سمجھتا ہوں' اب رشتہ حیات منقطع ہو جانے کی گھڑی آ پہنچی ہے''۔ مصنف (تمدن عرب۔ ص۔۱۵۳) لکھتا ہے کہ ''اگرچہ آنحضرت ﷺ کو خدا نے بچا لیا لیکن آپ ﷺ کو اس زہر کا اثر بقیہ عمر تک محسوس ہوتا رہا اور مورخین قبول کرتے ہیں کہ اس وقعہ کی وجہ سے آپ ﷺ نے تین برس بعد اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ علماء نے لکھا ہے کہ زہر کی وجہ سے وفات پانے میں حکمت یہ تھی کہ آپ کو شہادت کا درجہ بھی حاصل ہو جائے۔ اللہ سے وہ علماء اجر پائیں جنھوں نے آپ کے درجہ شہادت کے حوالہ سے بات کہہ دی اور یہ اعزاز بھی ان سے منسوب کر دیا۔ ادھر دشمنان نبوت کو دیکھیے کہ وہ دشمنِ خدا اور رسول جس نے زہر میں بھونی بکری پیش کی اور اس کو بری کر دیا اور ازواج مطہرات کے سر الزام تھوپ دیا کہ انھوں نے آپ ﷺ کو زہر سے شہید کیا۔ واہ بھئی واہ! کافرہ کو چھوڑ دیا۔ جس نے زہر میں بھونی بکری پیش کی اور دوسری طرف ازواج مطہرات جن کا عمل دخل بھی نہیں تھا انھیں ملوث کر دیا۔ اوروں کا پھندا بھی (یعنی دشمنان اسلام کا) اپنوں (یعنی ازواج مطہرات) کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ قصور کسی کا نام کسی کا۔

تُو وہ بت تیری نخوت سے جو ہوتا آگاہ
کبھی فرعون خدائی کا نہ دعوٰی کرتا

آنحضرت ﷺ کو رسولوں میں بھی منتخب رسول فرمایا گیا تھا جس کا عمل ولادت' مقام ہجرت پہلے سے سب منتخب ہو چکے تھے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ عالم تقدیر میں اس کی زوجیت کے لیے عورتوں کا انتخاب پہلے نہ ہو چکا ہوتا۔ قرآن کریم فرماتا ہے ''الطیبات للطیبین والطیبون الطیبات''۔ تو یہ کیوں کر نہ ہوتا کہ سارے جہان سے زیادہ طیب ذات کے لیے تمام جہان سے بڑھ کر طیبات انتخاب نہ کی جاتیں۔ ساتھ ہی یہ فرما کر مہر ثبت کر دی کہ نبی کی عورتیں دوسری عورتوں جیسی نہیں ہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔ ''یا نساء النبی لستن کاحد من النساء'' (الاحزاب ۳۲) ترجمہ: اے نبی کی عورتو تم دوسری عورتو کی طرح نہیں ہو۔ اس لیے انبیاء کے بعد تمام انسانوں میں اشرف انسان کی بیٹی حضرت عائشہؓ کو منتخب کیا اور عالم رویا میں یہ راز کھول دیا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے ان کا انتخاب کیسے کیا۔ عبدالرحمٰن بن

الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مجھ سے نکاح فرمانے سے قبل ہی جبرائیل نے میری صورت لاکر دکھا دی تھی۔ گویا آپ کی ازواج مطہرات کا انتخاب منشائے الٰہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ام المومنین کا اعزاز بھی انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن کریم نے واضح طور پر فرمادیا۔ ''وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا '' (الاحزاب) ترجمہ: اور تمھیں نہیں پہنچتا کہ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دو اور نہ یہ کہ ان کے بعد کبھی بھی ان کی بیبیوں سے نکاح کرو۔۔

ام المومنین سیدہ ماریہ قبطیہؓ

سیدہ ماریہ قبطیہ بنت شمعون کو بطور ہدیہ شاہ مقوقس نے آپؐ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ (تبیان القرآن جلد ۱۲ ص ۱۰۳) پر ہے '' دو بہنیں ماریہ اور سیرین' ایک ہزار مثقال سونا، بیس ملائم کپڑے، خچر (دلدل) ایک دراز گوش گدھا یعفور یا عفیر تھا اور اس کے ساتھ ایک خصی شخص جس کا نام ثابور تھا اور ایک بوڑھا شخص جو ماریہ کا بھائی تھا۔ اس نے مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ مقوقس مصر کے ہرقل (قیصر روم) کا نائب تھا۔ مقوقس اس کا لقب تھا۔ مسلمان مورخین نے اس کا نام جریج بن سینا القبطی بتایا ہے۔ مقوقس نے تحائف بھیجے جن میں دو قبطی النسل کی معزز خواتین، ایک خلعت، سواری کے لیے گھوڑا (افرازہ نامی) ایک سفید خچر (دلدل) اور ایک گدھا یعفور یا عفیر شامل تھے۔ (دائرۃ معارف الاسلام ج ۲۱ ص ۴۵۵) لیکن صاحب مدارج النبوہ (مدارج النبوہ جلد دوم ص ۲۸۳) لکھتے ہیں کہ ان تحائف میں ایک نیزہ، بیس قد کا لباس اور ہزار مثقال سونا، مزید لکھتے ہیں کہ حاطب بن بلتعہ کو سو مثقال سونا اور پانچ کپڑے بطور انعام کے دیئے''۔ آپ ﷺ نے حضرت ماریہ کو حرم نبوی میں داخل فرمایا۔ ان سے جناب ابراھیم پیدا ہوئے۔ ساتویں روز ان کا عقیقہ کیا گیا۔ سر منڈھا کر بالوں کے برابر چاندی تول کر صدقہ کی۔ دو مینڈھے ذبح کیے۔ جناب ابراھیم ۱۷ یا ۱۸ ماہ کی عمر میں ہجرت کے دسویں سال انتقال کر گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا!! ابراھیم ہم تمھاری موت سے نہایت غمگین ہیں، آنکھ رو رہی ہے اور دل غم زدہ ہے مگر ہم ایسی کوئی بات زبان سے نہ کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی نہ ہو''۔

رسمِ باطل کا خاتمہ: جس روز آپ کا انتقال ہوا، اتفاق سے سورج کو گہن لگا۔ عرب سمجھتے تھے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کسی بڑے آدمی کی موت سے واقع ہوتے ہیں۔ اس عقیدہ کی بنیاد پر مدینہ کے مسلمان یہ کہنے لگے کہ سورج گرہن حضرت ابراھیمؑ کی وفات کے سبب ہوا ہے۔ آپ ﷺ کو یہ بات ناگوار گزری کیوں کہ یہ بات عقیدہ توحید کے خلاف تھی۔ کیوں کہ اللہ ہی خالق و مالک ہے، جو زندگی اور موت دیتا ہے۔ کسی اور کے بس میں نہیں کہ کوئی کسی کو زندگی دے یا موت۔ یہ زمانہ جاہلیت کی رسم تھی۔ لوگوں کے سامنے آپ ﷺ

نے خطبہ دیا (تقریر فرمائی) فرمایا: ''سورج اور چاند کو کسی کی موت سے گرہن نہیں لگتا بل کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ جب تم ایسا دیکھو تو نماز پڑھو اور اللہ جل شانہ کے حضور جھک جاؤ''۔

حضرت ماریہ آزاد کر دی گئیں: بادشاہ مقوقس نے حضور کی خدمت میں دو قبطی کنیزیں حضرت ماریہ اور سیرین ہدیہ کے طور پر بھیجیں۔ حضورؐ نے سیرین کو حضرت حسان کے حوالے کیا اور ماریہؓ کو اپنی ملک میں رکھا۔ انھیں کے بطن سے حضرت ابراھیمؑ ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت ماریہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی جاگیر العالیہ میں رکھا تھا یہ وہ جگہ ہے جو اموال بنو نظیر میں سے آنحضرت ﷺ کے حصہ میں آئی تھی۔ حضرت ابراھیمؑ کی ولادت سے حضرت ماریہؓ آزاد کر دی گئیں اور حضور ﷺ نے فرمایا ''اعتق ام ابراھیم ولدھا'' یعنی ابراھیم کی ماں کو اس کے بیٹے نے آزاد کر دیا۔ (ن جلد اول ۵۱۸)

ایک شبہ کا ازالہ: مقوقس نے دو خواتین سگی بہنیں ماریہ قبطیہ اور سیرین بطور تحفہ آپؐ کی خدمت اقدس میں بھیجی تھیں ''سیرین'' نام جو اصلاً فارسی نام ہے اس کا معرب شیریں ہے کیا وہ ایرانی لڑکی تھی اور کیا وہ اپنی دیگر ساتھی لڑکیوں سے جدا ہو کر پیچھے رہ گئی تھیں ان کا کارواں آگے نکل گیا اور اس نے بعد ازاں عیسائیت قبول کر لی' یہ ایسے سوالات ہیں جو ہنوز جواب طلب ہیں۔ ابن عبدالحکم جو مصری تاریخ کے ایک قدیم مصنف ہیں' نے اسے ''حنہ'' کا نام دیا ہے جبکہ اپنے ایک بیان میں انہوں نے مذکورہ لونڈی کا نام قیصرہ بھی لیا ہے' اگر واقعی ایسا ہی ہے تو ان کا بتدائی نام اور اصلی نام ''حنہ یا قیصرہ'' نہیں ہے بلکہ سیرین ہے مذکورہ نام عیسائیت کے قبول کرنے کے بعد معروف ہوئے ہوں گے انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا اصل نام دوبارہ اختیار کر لیا (پیغمبر اسلام'' محمد حمید اللہ۔۳۲۲) ۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے ماریہؓ سے نکاح کیوں کیا اور سیرین سے نکاح نہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ماریہؓ نے سیرین سے پہلے اسلام قبول کیا جب کہ سیرین نے کچھ تردد کے بعد اسلام قبول کیا۔ قبول اسلام میں اولیت اختیار کرنے پر آپ ﷺ نے ماریہ کو حرم میں داخل فرمایا۔ سید امیر علی (حیات محمد۔۴۳۸) بتاتے ہیں کہ ''یہ دو کنیزیں سگی بہنیں تھیں۔ رسول اکرم نے انھیں دعوتِ اسلام دی تو ماریہ نے فوراً اور سیرین نے کچھ توقف کے بعد کلمہ شہادت پڑھا۔ اس لیے ماریہ حرم نبوی میں داخل کی گئیں''۔ اولیت کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن کریم نے صحابہؓ کی شان میں ''السابقون الاولون'' کے الفاظ سے خطاب فرمایا ہے۔

ایک اور شبہ کا ازالہ: حضرت حاطبؓ کی تعلیم سے دونوں خواتین اسلام میں داخل ہو چکی تھیں تو پھر نبی کریم ﷺ نے انھیں دعوتِ اسلام کیوں دی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں کسی خوف اور ڈر کے سبب تو اسلام قبول نہیں کر بیٹھیں یا آپ ﷺ اپنی موجودگی میں اسلام کے قبول کرنے کے الفاظ ان کی زبان سے سننا چاہتے تھے تا کہ آپؐ کے حضور اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ انھوں نے برضا و رغبت اسلام قبول

کیا تھا، کسی ڈر اور خوف سے نہیں۔

اعتراض نمبر۱۴۲

مستشرقین کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ لونڈیوں سے متمتع ہوتے تھے۔ وہ دو لونڈیاں ریحانہ بنت زید بن عمروؓ اور بعض کے نزدیک ریحانہ بنت شمعون اور ماریہ قبطیہ کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایک مورخ نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ بانی اسلام (ﷺ) جب سات سو مقتولوں کی لاشوں کو تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر آ کر تفریح خاطر کے لیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' ۔ بعض نے لکھا کہ ریحانہ کے بارے حکم دیا کہ الگ کر لی جائے اور چند دن بعد اپنے حرم میں داخل کر لیا''۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے ہی آپ کے لیے ریحانہ الگ کر لی گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

(۲) حضرت ماریہؓ سے آپ ﷺ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۳۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ کنیزیں تھیں اکثر ارباب سیر نے بھی ہی کنیزیں لکھا ہے۔ کیا وہ کنیزیں تھیں؟ حقیقت کیا ہے؟

جواب: مولانا شبلی نعمانی کی تقریر؛ ریحانہؓ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں لیکن واقدی نے تصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا تھا۔ ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے اس میں خود ریحانہؓ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ فاعتقنی و تزوج بی'' پھر آنحضرت ﷺ نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کیا''۔ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔

'' وكانت ريحانة القرظية زوج النبى ﷺ تسكنه'' ،اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت کی زوجہ تھیں اس مکان میں رہتی تھیں''۔

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثین مابعد کا مآخذ ہے۔اس میں یہ الفاظ ہیں۔

''واستسری ریحانة من بنی قریظة ثم اعتقها ملحقت باهلها واحتجبت و هی عندا هلها''۔'' ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں''۔

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں'' وهذه فائدة جليلة اغفلها ابن الاثير '' اور یہ بڑی مفید تحقیق ہے جس سے ابن اثیر نے غفلت کی''۔

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے ان کو آزاد کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔ ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم بنویمین میں آئیں تو تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں، کنیز نہ تھیں۔۔

حضرت ریحانہؓ کے متعلق کتب سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں۔ایک یہ کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں۔ یہ روایت ابن مندہ کی ہے مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں۔ دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنین کے رکھنا چاہا مگر انھوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور کی خدمت میں رہنا قبول کیا۔ یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور نے ان کو خود مختار بنا دیا تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو آپ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ یہ روایت واقدی کی ہے۔ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے۔امام زہری نے بھی زوجیت کی تائید کی ہے(شبلی کا بیان ختم ہوا)

ہیکل (حیات محمد۔۳۹۰) کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی عورتوں میں سے بنی عمرو بن قریظہ کی ایک عورت ریحانہ بنت عمرو بن خناقہ کو اپنے لیے منتخب فرما لیا تھا اور آپ ﷺ کے وصال تک آپ ﷺ کی ملکیت میں آپ ﷺ کے پاس رہی۔ رسول اللہ ﷺ نے پیشکش کی تھی کہ وہ آپ ﷺ کی زوجیت قبول کر کے اپنے پر پردہ کرے ریحانہ نے عرض کی یارسول اللہ! آپ ﷺ مجھے اپنی ملکیت میں ہی رہنے دیں۔اس میں میرے لیے بھی اور آپ ﷺ کے بھی سہولت ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا۔ جب آپ ﷺ نے اسے گرفتار کیا تھا تو اس نے اسلام سے انحراف کیا تھا اور یہودیت پر ہی ڈٹی رہی، اس پر آپ ﷺ اس سے کنارہ کش ہو گئے اور دل میں اس کے معاملے کا خیال کیا پھر ایک موقعہ پر حضور ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اپنے پیچھے سے کسی کے آنے والے کے جوتوں کی آواز سنی، فرمایا: بے شک یہ ثعلبہ بن سعید کے جوتوں کی آواز ہے جو مجھے ریحانہ کے قبول اسلام کی خوشخبری دینے آرہے ہیں چنانچہ انہوں نے حاضر خدمت ہو کر بتایا۔ یارسول اللہ ﷺ! ریحانہ نے اسلام قبول کر لیا ہے اس کے اس عمل پر آپ ﷺ کو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔

فیوض الرحمان ترجمہ روح البیان جلد۔۸۔۴۵۹ پر ہے کہ ” آپ ﷺ اپنے لیے ریحانہ بنت شمعون کو مخصوص فرمایا کیونکہ وہ قبیلے کے سردار کی بیٹی تھیں اور مسلمان ہو گئی تھیں، انہیں آزاد کر کے نکاح فرمایا اور وہ آپ ﷺ کی زوجیت میں رہیں یہاں تک کہ حجتہ الوداع کے موقعہ پر واپسی پر ان کا انتقال ہوا۔ یہ ہجرت کا دسواں سال تھا، انہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا، یہ واقعہ آخر ذی قعد سن پانچ ہجری میں ہوا۔

دوم: عالم شباب میں آپ ﷺ نے چالیس سالہ خاتون سے شادی کی۔اس وقت آپ کی یہ حالت تھی کہ آپ تازہ شادی کے بعد کئی روز تک گھر سے غیر حاضر رہ کر تزکیہ نفس اور ریاضت کشی میں مشغول رہتے تھے۔ بی بی عائشہؓ اور ماریہ قبطیہؓ کے سوا جتنی عورتیں آپ کے عقد میں آئیں سب کی سب

بیوہ تھیں یا مطلقہ۔ ان حالات پر فرداً فرداً غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام شادیاں جنسی تلذذ کی خاطر نہ تھیں بل کہ کسی اخلاقی ذمہ داری کی خاطر تھیں۔ (ن ۔۴۔ ۴۵۵)

لالہ سرداری لال کہتا ہے ''زمانہ جاہلیت کی زہریلی آب وہوا اور ایسے ہلاکت خیز ماحول میں ایک شخص پرورش پا کر جوان ہوتا ہے اور اس کی یہ حالت ہے کہ اس کے مقدس ہاتھوں نے کبھی شراب کو نہیں چھوا۔ اس کی پاک نگاہ کبھی نسوانی حسن و جمال کی دل فریبیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ وہ کبھی قتل و غارت میں شریک نہیں ہوا۔ کسی کو برا نہیں کہا۔ کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ اس نے کبھی قمار بازی میں حصہ نہیں لیا اور لوگ جن برائیوں اور گناہوں میں مبتلا تھے ان میں سے ایک بھی اس نے اختیار نہیں کیا۔ (ن ۴۵۴ / ۴)

ٹامس کارلائل کہتا ہے '' کہنے کو خواہ کچھ کہا جائے لیکن محمدؐ کے دامن پر کبھی ہوس پرستی کا دھبا نہیں لگ سکتا' یہ انتہائی غلطی ہوگی اگر ہم (آپ ﷺ) کو عیش پرست سمجھیں اور خیال کریں کہ آپ (ﷺ) کسی طرح عیش وعشرت کے عادی تھے''۔!!

عیسائیوں کے روایتی تصورات راسخ ہو چکے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو انھوں نے اس کسوٹی پر پرکھا اور اس کوشش میں ناکام رہے اور ٹھوکریں کھائیں۔ مسیحؑ نے متاہل زندگی گزاری جبکہ محمد ﷺ نے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تالیف قلبی کے سبب ایک سے زائد شادیاں کیں ان مقاصد کو پس پشت ڈال کر اپنوں نے بھی (نعوذ باللہ) نفس پرستی قرار دے دیا۔

سوم: مزید اس الزام کے رد میں مستشرقین کی آراء لکھتے ہیں۔

ولیم میور: اہل تصنیف محمد ﷺ کے بارے میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کم یاب تھی، متفق ہیں۔

ایمائل ڈرمنگھم کہتا ہے کہ ''وہ نہ تو حریص تھے نہ متکبر' نہ متعصب اور نہ ہوائے نفس کے پیرو بل کہ نہایت بردبار، نرم دل اور بہت ہی بڑے کردار کے مالک تھے۔ (ن ۴۔ ۴۹۰) باقی الزامات کا رد پچھلے صفحات میں کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت موسیٰؑ کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا تھا ''اگر تم دشمن کے خلاف جنگ کرنے کے لیے جاؤ اور تمھارا خدا دشمنوں کو تمھارے قبضہ میں دے دے۔ تم ان کو قیدی بنا لو اور تم ان میں خوب صورت عورت دیکھو جو تمھیں اچھی لگے اور تم اسے بیوی بنا لو تو تم اسے اپنے گھر میں لاؤ۔ وہ اپنا سر مونڈے اور ناخن تراشے اور غلامی کا لباس اتار کر تمھارے گھر میں رہے اور پورا ایک قمری مہینہ اپنے ماں باپ کا سوگ کرے۔ اس کے بعد تم اس سے خلوت کرو اور بہ طور دلہن اسے اپنے قبضہ میں لو اور وہ تمھاری بیوی ہے۔ (ضیاء النبی ۲۷ / ۴ / کتاب استثناء باب ۲۱ آیات ۱۳۔۱۰)

چہارم: عیش پسند اور عشرت کے دل دادا لوگ اپنے بے ہودا، اور فضول شوق کو پورا کرنے کے لیے طرح طرح کی خورونوش کا اہتمام کرتے ہیں۔ شراب کباب طاقتور معجونیں اور منشیات کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی زندگی کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر چند مدنی زندگی میں اشیائے خورونوش وافر تھیں لیکن آپ ﷺ کا معمول حسب سابق تھا۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جب بھی آپ ﷺ کے سامنے کھانا رکھا جاتا، فرماتے، آواز دے کر پوچھ لو، کوئی بھوکا تو نہیں اور اکثر اصحاب صفہ میں سے کوئی ایک بول پڑتا، کھانا اسے دے دیا جاتا اور آپ ﷺ تھوڑی سی کھجور یا تھوڑے ستو پھانک کر پیٹ کو سہارا دے لیتے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حرم نبوی میں کئی کئی دن چولہا نہیں جلتا تھا۔ جہاں خورونوش کی یہ حالت ہو وہاں حضور ﷺ کو عیش پسند کے مکروہ الزام سے نشانہ تنقید بنانا بڑی حماقت و نادانی ہے۔

اعتراض نمبر ۱۴۲ کا دوسرا جز

حضرت ماریہؓ سے آپ ﷺ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ کنیزیں تھیں۔ ارباب سیر نے بھی کنیزیں ہی لکھا ہے۔ کیا وہ کنیزیں تھیں؟ حقیقت کیا ہے؟

جواب: مذکور اعتراض کی مستشرقین یہ دلیل دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے شاہوں کے نام خطوط نہیں لکھے تھے۔ کچھ مستشرقین ان خطوط کے متن میں شک پیدا کرتے ہیں، ان ہر دو صورتوں میں ماریہؓ کے حرم نبوی میں داخل ہونے کا انکار کرتے ہیں نیز ان کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ تولد ہوئے، کا بھی انکار کرتے ہیں انہوں نے تنقیص پیغمبر ﷺ کی انتہا کر دی ہے۔ آپ ﷺ کے خطوط سے انکار کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ماریہؓ کا حرم نبوی میں داخلہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ان کے بطن سے ان کے بیٹے حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے۔ کس قدر تعصب اور نفرت کا اظہار ہے جو کسی عام آدمی کے بارے میں نہیں کیا جا سکتا کہ کسی شخص کو اس کی جورو اور اولاد سے محروم کر دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کا الزام باطلہ ماخذ اور تاریخ کے خلاف ہے۔

۲۔ جواب: مولانا شبلی نعمانی (سیرت النبی ۲۱۳) بتاتے ہیں کہ ”ارباب سیر ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں لیکن مقوقس کے خط میں جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے کہ ”مصریوں میں بڑی عزت ہے“۔ یہ لونڈی کی شان میں استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ وہ دونوں لونڈیاں نہیں تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ کے حرم میں آئیں“۔ مقوقس کا جوابی خط قابلِ غور ہے ”محمد بن عبداللہ کے نام

مقوقس رئیس قبط کی طرف سے اسلام علیک، کے بعد میں نے آپ ﷺ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا۔ مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں لیکن سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے۔ میں نے آپ کے قاصد (ﷺ) کی عزت کی اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں (مصریوں) میں بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپ کے لیے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں''۔ مولانا شبلی نعمانی (سیرت النبی ۱/۲۷۳) حاشیہ پر لکھتے ہیں ''ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے۔ عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی''۔ یہ لفظ جوان کی نسبت لکھا ہے یعنی کہ مصریوں میں بڑی عزت ہے یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ شبلی نعمانی کے استدلال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے۔ سیدنا ابراھیم بن محمد ﷺ کی والدہ ماریہ خاتون جو قبطی خاندان سے تھیں۔ جس طرح والدِ حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ابراھیمؑ کے ہم عصر شاہِ مصر حضرت بی بی ہاجرہ کو پیش کیا تھا اسی طرح نبی کریم کے ہم عصر شاہِ مقوقس نے ماریہ خاتون کو پیش کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراھیمؑ کے زمانہ کا بادشاہ بت پرست تھا جب کہ آپ ﷺ کے عہد کا بادشاہ عیسائی ہے۔ اس واقعہ سے وہ پیش گوئی پوری ہوئی جو حضرت داوٗدؑ کی معرفت دی گئی ہے ''بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں بل کہ اوقیر کے سونے سے آراستہ ہو کے تیرے داہنے ہاتھ کھڑی ہیں''۔ (رحمت اللعالمین ۲/۹۸) ''داہنے ہاتھ'' کے الفاظ اہم اور غور طلب ہیں یہ ''ملک یمین کا ترجمہ ہے'' سب مورخین ماریہ قبطیہؓ کو ملک یمین بتاتے ہیں جب کہ مذکور پیش گوئی میں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ وہ شہزادی ہوں گی اور ان کا آنا ملک یمین کی شان میں ہوگا۔

ضمناً اعتراض

حضرت ماریہ قبطیہ پر ثابور یا مابور کی تہمت لگی۔۔

جواب: رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ جب حضرت علیؓ وہاں پہنچے تو وہ اس وقت ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا: نکلو! اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کو نکالا۔ تب حضرت علیؓ نے دیکھا کہ اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا تھا۔ تب حضرت علیؓ رک گئے اور بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا ہے۔ اس پر قاضی عیاض مالکی کی بحث بہت خوب صورت اور نفیس ہے ملاحظہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ (ماریہ) کو اس سے محفوظ رکھا کہ ان کی طرف سے کوئی تقصیر ہو اور واقعہ یہ تھا کہ ثابور قبطی تھا اور حضرت ماریہ بھی قبطیہ تھیں اور ہم زبان اور ہم علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کے پاس آجاتا تھا اور ان سے باتیں کرتا تھا۔ نبی پاک ﷺ نے اس کو باتیں کرنے سے منع فرمایا تھا اور جب اس نے عمل نہ کیا تو مستحق قتل ہو گیا۔ آپ نے یا تو اپنی مخالفت پر قتل کا حکم دیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی پاک دامنی کا علم ہو

اور آپ کو معلوم ہو کہ اس کا آلہ تناسل نہیں ہے اس کے باوجود اس کا قتل کرنے حکم فرمایا تا کہ حضرت علیؓ اس کو برہنہ دیکھ لیں اور ان پر حقیقت حال منکشف ہو جائے اور جو لوگ اس کو ماریہ کے ساتھ تہمت لگاتے ہیں وہ تہمت زائل ہو جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی ہو کہ آپ اس کو قتل نہ کریں کیوں کہ آپ پر اس کا حال منکشف ہو جائے گا۔ اور وہ کنویں میں برہنہ نہا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے آپ نے اس کو حقیقتاً قتل کرنے کا حکم دیا ہو۔ حالاں کہ آپ کو علم تھا کہ وہ قتل نہیں ہوگا کیوں کہ اس تہمت سے بری ہونا آپ کے نزدیک دلیل سے واضح ہو جائے گا (بتیان القرآن ۔ جلد ۱۲ص ۱۰۳)

تعداد ازواج پر الزامات

اعتراض نمبر ۱۴۳

۱: فلپ اسکاف کہتا ہے کہ ان کی تعدد الازواج جنسیت پرستی کے سبب تھی اور اولادِ نرینہ کی خواہش میں عمر کے ساتھ ساتھ شدت آتی گئی۔ (امہات المومنین اور مستشرقین ۶۸)

۲: ''ول ڈیورا اینٹ'' اپنی کتاب ''دی ایج آف فیتھ'' میں انتہائی غیر منصفانہ طور پر پیغمبر کو جنس پرست انسان لکھتا ہے۔

۳: نابیہ ایبٹ اپنی کتاب ''عائشہ محبوبہ محمدؐ میں آپ کو جنس پرست بیان کیا ہے (معاذ اللہ) (حوالا بالا)

جواب: مستشرقین وہ تمام سیاسی، اخلاقی، سماجی وجوہات اور اسباب کو آسانی سے فراموش کر دیتے ہیں جن کی بنیاد پر نبی کریمؐ نے تعدد الازواج کی زندگی بسر کی۔ یہ انتہائی اہم بات کہ آپؐ سے قبل اس دنیا میں تشریف لانے والے انبیاء کرام تعدد الازواج کی نہ ہی مخالفت کرتے بل کہ اسے اپناتے ہیں لیکن مستشرقین سابقہ پیغمبروں پر حرف زنی نہیں کرتے کیوں؟ آپؐ ہی کو نشانہ تنقید بناتے ہیں کیوں؟ اس سے غیر جانب دار اور دانش مند شخص بہ خوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ کوئی نبی تعدد الازواج کی نفی نہیں کرتا بل کہ وہ کئی خواتین سے شادیاں کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسیحؑ کے بارہ میں ہے کہ وہ بھی تعدد الازواج کو روا رکھتے ہیں۔ یہ لوگ کسی نبی پر جنس پرستی کا الزام نہیں دھرتے لیکن آپؐ کی ذات کو ایسے بے بنیاد الزام لگا کر معاف نہیں کرتے کیوں؟

اعتراض نمبر ۱۴۴

۱۔ مستشرقین اسلام کو شہوانی مذہب سمجھتے ہیں۔

۲۔ ویل ڈیورانٹ پیغمبر اسلام (ﷺ) کو جنس پرست لکھتا ہے (نقل کفر کفر نباشد) امہات المومنین اور مستشرقین ۔ ۶۹)

جواب: اسلامی عقائد اتنے مضبوط اور سکون پرور ہیں کہ جہاں بھی ان کو اختیار کیا گیا وہاں صدیاں بیت گئیں مگر عقیدہ میں فرق نہ آیا اور نہ ہی کوئی دوسرا عقیدہ پروان چڑھ سکا۔ مستشرقین کو نہ جانے اسلام میں عیش کوشی اور عیش پرستی کے کون سے آثار نظر آتے ہیں۔ یہاں فحاشی و بدمعاشی کی ممانعت، نشہ آور چیزیں حرام، سادگی کی تلقین، ارتکاز دولت کی پابندی، دولت کو معاشرہ پر خرچ کرنا ثواب، نمائش ناجائز، کمائی حرام کی ممنوع اور جائز احسن قرار پائی۔ اٹھتے بیٹھتے یادالٰہی اور پانچ وقت کی نماز کا حکم، زکوٰۃ مال کی پاکیزگی، تزکیہ نفس کے لیے سال میں ایک ماہ روزے، ایک بار حج فرض، کم خوری، کم خوابی، کم گوئی شعار ٹھہرا۔ غیبت، چوری، جوا، شراب گناہ، شہوت پرستی گناہِ کبیرہ، عدل وانصاف معاشرے کی جان، قانون مستقل اور ابدی، دوستی اور دشمنی کا معیار حق، ماں باپ، بیوی بہن اور بیٹے، بیٹیوں کے حقوق وفرائض کی تقسیم، تکبر، ریا، کنجوسی سے پرہیز، دنیا کی زندگی نیابت خداوندی، عقبٰی کی فکر، نیک اعمال کے بدلے جنت اور برے اعمال کی سزا جہنم۔ جنت کی بشارت بے راہ روی سے بچاتی ہے اور جہنم کا خوف بے اعتدالی کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں ترک دنیا اور رہبانیت کی قطعاً گنجائش نہیں۔ نجی، ملی، معاشی و معاشرتی، سیاسی و مذہبی، سماجی وثقافتی وغیرہ سب کے سب دین کے ماتحت ہیں کیوں کہ ''جدا ہو دین سے سیاست تو بن جاتی ہے چنگیزی۔ ہر انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات کے لیے حدیں مقرر ہیں۔ یہ اجمالی مذہبی کیفیت پیغمبر اسلام ﷺ نے دیں۔ اس میں عیش کوشی کے تصور نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

اعتراض نمبر ۱۴۵

مستشرقین اسلام کو عیش کوش مذہب کہتے ہیں۔ اس کا جواب بھی ان کے ہم خیال ایک مستشرق کی زبانی لیتے ہیں۔

جواب: ''والٹیر'' کا عیسائیت کے مذہبی پیشواؤں کے خلاف تصادم شدت اختیار کر گیا۔ اس نے عیسائیوں کو شدت پسند اور عدم برداشت کا طعنہ دیا اور ساتھ ہی اسلام کے بارے میں کسی طرح سہی' صحیح بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کہتا ہے ''میں ایک بار تمہیں پھر بتاتا ہوں کہ یہ آپ کی جہالت ہے جس کی وجہ سے تم محمد رسول اللہ ﷺ کے مذہب کو شہوانی سمجھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں ایک لفظ بھی سچائی نہیں ہے۔ اس بات پر بھی کئی دوسری سچائیوں کی طرح آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔ تمھارے راہب، پادری، مذہبی رہنما کیا انسانوں پر یہ قانون لاگو کر سکتے ہیں کہ صبح کے چار بجے سے رات دس بجے تک نہ کچھ کھانا ہے نہ پینا ہے اور روزہ رکھنا ہے۔ کیا شراب ممنوع قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا جلتے ہوئے صحراؤں میں سفر کر کے تم حج کا حکم دے سکتے ہو؟ کیا تم غریبوں کو اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ زکوٰۃ دے سکتے ہو؟ اگر تم اٹھارہ اٹھارہ عورتوں کی محبت سے لطف اٹھا رہے ہوتے اور حکم دیا جاتا کہ صرف چار بیویاں ہی رکھی جا سکتی ہیں تو کیا تم یہ حکم مان لیتے؟ کیا تم ایسے مذہب کو

شہوانی کہتے ہو؟'' (محمد رسول اللہ پروفیسر اکرم طاہر۔۳۱۷) عیسائیت میں گناہِ آدم کی وجہ سے ہر شخص گنہ گار ہے جب کہ اسلام میں انسان پیدائشی معصوم ہے۔ اپنے عمل سے نیک اور گنہ گار بنتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عیسائیت ثنویت کا درس دیتی ہے اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔ بل کہ قل ھو اللہ احد کا پیغام دیتا ہے۔ مادر پدر آزادی نہیں ہے۔ حجر و شجر، شمس و قمر اور آگ وغیرہ مسجود نہ رہے۔ ارتکاز دولت اور سود کی ممانعت ہوئی۔ فحاشی کا قلع قمع ہوا۔ نشہ اور قمار بازی کا خاتمہ کیا۔ امیر غریب میں تفریق اٹھ گئی اور ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ حرام کی کمائی پر پابندی اور حلال کی ہدایت، عیب جوئی، غیبت، بدظنی، شہوت پرستی، چوری، ڈکیتی، بغض و کینہ، لالچ وحسد جیسے رذائل سے سختی سے روکا گیا۔ پانچ وقت نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج فرض ٹھہرے۔ نیک عمل کے بدلے جنت کی بشارت دی اور ہر برے کام سے روکا۔ دوزخ کے عذاب کی سزا سنائی۔ تمام انسانی رشتوں کے ادب و احترام میں کوتاہی نہ کرنا، ایمانداری اور دیانت داری کو اوڑھنا بچھونا بنانے کا درس دیا۔ جرائم کی سزا سے معاشرے میں امن بحال رکھا۔ زنا کی سزا مقرر کی۔ قانون و انصاف کی نظر میں سب برابر ہوئے۔ آپ کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ بنی مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ نامی چوری کر بیٹھی۔ قبیلہ کی عزت کے پیشِ نظر طے پایا کہ حضورؐ کے دربار میں معافی کی درخواست پیش کی جائے۔ آپؐ کے حضور درخواست گزاری کے لیے حضرت اسامہ بن زیدؓ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اسامہ سفارش کرتے ہیں، آپؐ ناراض ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ''پہلی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ ان کے بڑوں نے کوئی گناہ کیا تو چھوڑ دیے جاتے تھے اور اگر کوئی غریب گناہ کرتا تو اسے سزا دی جاتی۔ اگر میری بیٹی فاطمہ بنت محمدؐ بھی ہوتی تو اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا''۔ اسلام برابری کا بے نظیر درس دیتا ہے۔ اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ یہ شہوانی مذہب جسے مستشرقین نشانہ تنقید بناتے ہیں اور چہ مگوئیاں کرتے نہیں تھکتے ان کی باچھیں کھلی رہتی ہیں۔ کبھی ان قواعد و ضوابط اسلامی پر عمل پیرا ہوں تو لگ پتہ جائے کہ عیش کوش مذہب ہے یا محنت اور عمل کا مذہب ہے۔ ایک بار پھر والٹیر کا بیان پڑھ لیجیے تا کہ مزید مستشرقین کے عیش کوش مذہب کی قلعی کھل جائے۔ اس جملہ پر غور کیجیے۔

اٹھارہ اٹھارہ عورتیں رکھنے والوں کو اور لطف اٹھانے والوں کو حکم دیا جاتا کہ صرف چار ہی بیویاں رکھی جا سکتی ہیں تو کیا تم یہ حکم مان لیتے؟ کیا تم ایسے مذہب کو شہوانی کہتے ہو''۔؟

اعتراض نمبر ۱۴۶

ویل ڈیورینٹ پیغمبر اسلام کو جنس پرست لکھتا ہے۔(نقل کفر کفر نباشد) امہات المومنین اور مستشرقین۔۶۹)

نابیہ ابٹ نے بھی آپ ﷺ کو جنس پرست ہونے کا بیان کیا ہے۔حوالہ بالا۔

ان معترض مستشرقین کے لیے ان کے ہم خیال مستشرقین کی آراء لکھتے ہیں۔سر ولیم میور کہتا ہے کہ ''تمام مستند و مقتداء ماہرین متفق ہیں کہ جناب محمد ﷺ کا عہد جوانی شرافت، حیا، سادگی، انکساری اور پاکیزگی کا مرقع تھا اور اس پاکیزگی اخلاق و عادات اہل مکہ میں مفقود تھی۔(حوالہ بالا۔۸۰)

پی۔ڈی لیسی جان سٹون (P.De Laey johnstone) اپنی کتاب MUHAMMAD AND HIS POWER میں لکھتا ہے ''تمام لوگوں میں وہ ﷺ ایک بلند پایہ کردار کے حامل تھے۔ان کی ذات پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا''۔

ریو مارکس ڈاڈس (REV MACUS DODS) اپنی کتاب محمدؐ، گوتم بدھ اور مسیح میں لکھتا ہے'' آپ کی غیر شادی شدہ جوانی کا دور حیران کن طور پر بے داغ تھا''۔ایمائیل ورمنگھم اپنی کتاب لائف آف محمد میں تحریر کرتا ہے''محمدؐ کا عہدِ شباب پارسائی اور پرہیز گاری کا مرقع تھا''۔سر جان بیگٹ کلب کہتا ہے'' آپؐ آزاد جنسی پیار و محبت کے قائل نہ تھے۔آپ ﷺ اللہ کی حمد وثنا بیان کرتے تھے اور اپنے مشن سے پہلے کے جوانی کے دور میں بھی ان کے کسی عورت کے ساتھ غیر اخلاقی تعلقات نہ تھے اور اپنا مشن شروع کرنے کے بعد ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سوائے اپنی بیوی کے کسی غیر عورت کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا''۔عرب معاشرہ جس میں پیارے رسول نے آنکھ کھولی اس میں آزاد جنسی تعلقات اور اختلاط کا دور دورہ تھا۔بغیر شادی کے میل جول پر پابندی نہ تھی۔رنڈی بازی قابلِ نفرت نہیں تھی۔عصمت فروشی اور جسم فروشی عام معمول تھی۔ریبون لیوی (RUBEN LEVY) آپؐ کے زمانہ ولادت اور پھر عہدِ جوانی کے دور میں لکھا'' جنابِ محمد ﷺ کی ولادت باسعادت سے قبل کھلے بندوں عصمت فروشی رائج الوقت تھی اور یہ امر واضح ہے کہ عربوں میں رنڈی بازی کو قابلِ نفرین نہیں گردانا جاتا تھا''۔(حوالہ بالا۔۷۹۔۷۸) آپؐ کی ولادت سے قبل عرب معاشرہ اخلاق سوز، حیا سوز، بے حیائی، فحاشی، زنا کاری اور عصمت فروشی کے گھناؤنے افعال و حرکات سے بھرپور تھا۔ان بری حرکات پر پابندی نہ تھی بل کہ انھیں برائی بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔اس معاشرہ میں پاک صاف سیرت و کردار والا شخص جس کی صفات پاکیزگی اپنے اور پرائے شہادتیں دیں۔صادق والامین کے القاب دیتے ہوں تو پھر کوئی مستشرق الزام لگائے تو بڑی جسارت اور دیدہ دلیری ہے بل کہ یوں کہہ دیں تو بجا

ہوگا ''چہ دلا ور است دزدے بکف چراغ دارد''۔ ہاں ہاں مستشرقین کو اپنوں کی بات پر تو کم از کم غور کرنا چاہیے۔ ان ہی کی سن لیتے تو ایسا نہ کہتے، سچ ہے کہ آنکھیں ہیں مگر حقائق دیکھنے سے عاری ہیں۔ کان تو ہیں، سنتے ہیں مگر سننے کے باوجود بھی دوسروں اور اپنوں کی نہیں سنتے، گویا صم بکم۔۔۔۔

اعتراض نمبر ۱۴۷

حضور ﷺ کے تعداد ازواج کے متعلق غیر مسلموں کا ایک ناگفتہ بہ الزام یہ بھی ہے کہ خاکم بدہن اس کا سبب ہوائے نفسانی غلبہ تھا۔

ان کی تعداد ازواج کے متعلق فلپ سکاف لکھتا ہے ''ان کی تعداد ازواج جنسیت پرستی کے سبب تھی اور اولادِ نرینہ کی خواہش میں عمر کے ساتھ شدت آتی گئی۔ گبن نے بھی ایسی ہی الزام تراشی کی ہے۔

جواب: آپ ﷺ نے ۲۵ سال تک مجرد زندگی بسر کی۔ اس قدر صاف وشفاف اور پاکیزہ کہ غلیظ برائیوں سے بھرے معاشرے میں بھی ادنیٰ سا اشارہ نہیں ملتا جو آپؐ کی پاک دامنی کے دامن کو آلودہ اور داغ دار کر سکے۔

پی ڈی لیسی جان سٹون لکھتا ہے ''تمام لوگوں میں وہ ایک بلند کردار کے حامل تھے' ان کی ذات پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا''۔ جنسی اختلاط پر کوئی پابندی نہ تھی۔ یہ برائی معاشرہ کی جڑوں میں سرایت کر چکی تھی۔ ایک دوشیزہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ آپؐ حسن و جمال میں یکتا ہیں۔ ساری قوم صادق والامین کہتی ہے اور اس کھلے ماحول میں بھی اپنی بے داغ زندگی کی مثال پیش کرتے ہیں جو عدیم المثال ہے۔ ۲۵ سال کی عمر میں بیوہ سے شادی کی۔ وہ دو شوہروں کی بیوی رہ چکی تھیں۔ اس بیوی کی زندگی میں کسی اور سے شادی نہیں کی۔ اسے ہوائے نفسی کا غلبہ کہتے ہیں؟ حالاں کہ چاہیے تو یہ تھا کہ کئی دوشیزائیں ہوتیں۔ ان سے متمتع ہوتے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ دوم وہ یہ کہ خدیجہؓ کی وفات کے بعد پچاس سالہ خاتون سودہ بنت زمعہ سے شادی کرتے ہیں اور ۵۵ سال تک وہی ایک رفیقہ حیات رہیں۔ پھر ۵۵ تا ۵۹ سال تک دو دو، تین تین شوہروں والی خواتین سے شادی کرتے ہیں جب کہ دوشیزاؤں کی کمی نہ تھی۔ کیا نفسانی خواہشات اور ہوائے نفسانی سے مغلوب شخص دوشیزاؤں کی بجائے معمر اور کئی کئی شوہروں والی خواتین سے شادیاں کرتا ہے۔ کیا ہوائے نفسانی کے غبارہ سے ہوا نہیں نکلتی کہ وہ دوشیزاؤں سے شادی نہیں کرتا جو نفسانی خواہش کا طرہ ہوتا ہے۔ آپؐ کی تمام تر زندگی صاف شفاف، پاک اور بے داغ ہے۔

ایو مارکس ڈاڈس کہتا ہے ''آپؐ کی غیر شادی شدہ جوانی کا دور حیران کن طور پر بے داغ رہا''۔

سر جان بیگٹ کہتا ہے ''آپؐ آزاد جنسی پیار و محبت کے قائل نہ تھے۔ آپؐ اللہ کی حمد وثناء بیان کرتے تھے اور اپنے مشن سے پہلے کے جوانی کے دور میں بھی ان کے کسی عورت کے ساتھ غیر اخلاقی تعلقات نہ تھے

اور اپنا مشن شروع کرنے کے بعد بھی ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سوائے اپنی بیوی کے کسی غیر عورت کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا"۔ تو کیا ۵۵ سال سے پہلے اور ۵۹ سال کے بعد یعنی (۵۹ تا ۶۳) عمر میں ہوائے نفسی کے غلبہ کا شائبہ تک موجود نہیں صرف (۵۵ تا ۵۹) یعنی پانچ سالہ پیریڈ میں ہوائے نفسانی کی ہوس پیدا ہوئی جب کہ تم جانتے ہو اور تاریخ گواہ ہے کہ ۵۔۶ نبوی میں تبلیغ دین کو روکنے کے لیے قوم ،دولت، سیادت، حسین ترین دوشیزائیں پیش کر رہی تھیں لیکن آپؐ نے ذرا برابر دھیان نہ دیا جب کہ حرم پاک نبوی میں ۶۰ سالہ بوڑھی خاتون حضرت خدیجہؓ کے سوا کوئی زوجہ محترمہ موجود نہیں تھی۔ آپؐ پر کفار مکہ نے شاعر، مجنوں، جادوگر اور سحر زدہ کے الزام لگائے لیکن کسی جانی دشمن نے بھی آپؐ کی خواہش نفسانی کے غلبے کا الزام نہیں لگایا کیوں کہ قوم دوشیزاؤں کی پیش کش کر کے آزما چکی تھی کہ آپؐ میں جنسیت کا میلان نہیں ہے اور یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ جن لوگوں کے سامنے تعدد ازواج کا عقیدہ پیش کیا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ قد کاٹھ کا انسان مغلوب النفس نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اگر وہ ہوائے نفسانی کے غلبے سے متاثر ہوتا تو اسے تعدد ازواج کا قانون پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ولیم میور کہتا ہے "اب محمدؐ کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن جنسِ مخالف کی طرف آپؐ کے میلان کی کمزوری میں عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا، آپؐ کو اپنی وسیع حدود سے تجاوز سے روکنے کے لیے کافی نہ تھی"۔ (ضیاالنبی ۷۔۴۶۹) اس سلسلے میں مستشرق نے یہ نہ سوچا کہ ایسی ہستیاں اور بھی موجود ہیں جن پر یہ الزام لگتا ہے۔ جنھوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں اور اپنی زوجیت میں جمع کیا، کیسی نادانی و حماقت ہے کہ جس ذات پر یہ الزام لگتا ہے کسی دوسرے پر الزام کیوں نہیں لگاتے؟ یہ عجیب غیر جانب داری ہے۔ نیز یہ الزام دھرتے ہوئے خیال نہ رکھا کہ ایسی بات یعنی متعدد ازواج سے متعلق آپ کی پوری زندگی کے پس منظر کو سامنے رکھا جاتا مگر ندارد! حد تو یہ ہے کہ تعدد ازواج کی رسم عام تھی۔ عظیم تاریخی شخصیات نے بھی رسم کو اپنایا لیکن کسی نے ان شخصیات کو ہدف تنقید نہیں بنایا جن الزامات کا آنحضرت ﷺ کو نشانہ بنایا گیا۔ نیز اسلام تو عام آدمی پر بھی اس قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا۔ (مسٹر بی ایس کشالہ (ن ۴۔۴۵۵) کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے کثرت ازواج کے متعلق بہتان باندھا گیا ہے یہ محض غلط ہے' بے شک آپ ﷺ نے کئی بیویاں کی تھیں مگر زمانے کے برے رواج کو مٹانے کے لیے اور ہر طبقہ کی عورتوں کو نکاح میں لا کر ان کا سہارا بن جانے کے لیے اور لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے' وہ بھی بیوہ' باکرہ' غلام اور لا وارث عورتوں کو اپنے نکاح میں لائیں اور آپ ﷺ کے نمونہ کی پیروی کریں' آپ ﷺ نے اپنی نفسانی خواہش کے لیے نکاح نہیں کیے آپ ﷺ نے نفسانی خواہش کی کوئی بھی دلیل یا علامت نہیں پائی جاتی۔

اعتراض نمبر ۱۴۸

تعدد ازواج کا مقصد نہ تو سماجی اور نہ ہی معاشی حیثیت کو بلند کرتا ہے بل کہ یہ صرف مرد کی جنسی رغبت اور خواہشِ نفسانی کا نتیجہ ہے۔

جواب: اگر انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی۔۔۔۔۔۔ یہ جملہ ایک نہایت بلیغ اور وسیع مفہوم کا عکاس ہے۔ انصاف کے دائرہ میں ہر وہ چیز آتی ہے جس سے کسی الجھن کا کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہ ہو۔ بعینہ معاشی تنگی اور سماجی پیچیدگیوں کا خطرہ سامنے لاحق ہے تو صرف ایک بیوی کی اجازت ہے تا کہ معاشی کمزوری یا سماجی الجھنیں بوجھ نہ بن جائیں اور گھر پہلوانوں کا اکھاڑہ نہ بن جائے۔ حالاں کہ انصاف ہی کی بدولت معاشی اور سماجی حیثیت بلند ہوتی ہے۔ جیسے ہندو معاشرہ کے شکاری قبائل شکار پر گزر بسر کرتے تھے، مل کر دولت کماتے اور بانٹ لیتے تھے۔ آج بھی عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کرتی نظر آتی ہیں نیز دفاتر اور مختلف اداروں میں کام کرتی ہیں۔ اس سے معاشی حیثیت بلند ہوتی ہے۔ معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ سماج بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس سے سماجی مقام میں بلندی اور بہتری رونما ہوتی ہے۔ عورت کی پاک دامنی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یورپی معاشرے کی طرح ایک بیوی رکھ کر کئی داشتاؤں کے رکھنے سے نفسانی خواہش کا غلبہ اور جنسی رغبت میں اضافہ ہوتا ہے اور ہوس، شہوت درندگی کا روپ دھار لیتی ہے۔ معاشی مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ غیر ضروری خرچوں سے جائز ضروریات پوری ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ بھئی یہی تو انصاف کہتا ہے کہ اگر تمھارے معاشی مسائل گھمبیر ہیں ان سے نبرد آزما ہونا تمہارے بس کا روگ نہیں تو ضروری نہیں ہے کہ سر اوکھلی میں ڈالیں لہٰذا ایک ہی بیوی کافی ہے۔ دو دو، تین تین اور چار چار کی رخصت ہے اور وہ بھی مشروط رخصت۔ اگر انصاف نہ کرسکو تو پھر ایک ہی۔

اعتراض نمبر ۱۴۹

ہندو قانون میں ایک ہندو کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا خلافِ قانون ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں کی تعداد کم ہے۔ اس لیے کثرت ازواج کی ضرورت نہیں'۔

جواب: ڈاکٹر ذاکر نائیک کہتا ہے کہ ''اپنے کچھ پڑوسی ممالک سمیت ہندوستان کا شمار دنیا کے ان چند ملکوں میں ہوتا ہے جہاں خواتین کی آبادی مردوں کی آبادی سے کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بیش تر لڑکیوں کو شیر خوارگی ہی کے موقعہ پر ہلاک کر دیا جاتا ہے جب کہ دوسری طرف اس ملک میں ہر سال دس لاکھ سے زائد بچیوں کو اسقاط حمل کے ذریعے آنکھ کھولنے سے پہلے ہلاک کر دیا جاتا

ہے۔یعنی جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فلاں حمل میں لڑکی پیدا ہوگی تو اسقاط حمل کے ذریعے وہ حمل ضائع کر دیا جاتا ہے۔اگر یہ ظالمانہ عمل روک دیا جائے تو یہاں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہوگی (ضیائے حرم جولائی ۲۰۱۴)

زرتشت مذہب میں حقیقی ماں، بہن، بیٹی سے شادی جائز تھی۔ مسیلمی قربت کی شادی کو برا جانتے تھے۔ بدھ عورت سے کنارہ کشی کو اچھا سمجھتا ہے۔گوتم نے فرار اختیار کیا اور رہبانیت اختیار کر لی۔ مانی مذہب میں جنسی تعلقات خواہ تفریحاً ہوں اجتناب ضروری ہے مگر عام پیروؤں کو اجازت تھی۔اسلام کی آمد سے زندگی میں انقلاب برپا ہوا۔اسلام نے وہ تمام حقوق عطا کیے جو قبل از اسلام کسی مذہب نے نہیں دیئے تھے۔روتی، پیٹتی اور سسکتی خواتین کو مردوں کے برابر درجہ عطا کیا۔اسقاط حمل سے اولاد کشی کو روک دیا۔''

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا '' (المائدہ ۳۲، پارہ ۶)(جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کیے تو گویا اس نے سب لوگوں کا قتل کیا)

اس قبیح رسم کو ساڑھے چودہ سو سال قبل جس کی لپیٹ میں آج بھی کئی ملک نظر آتے ہیں اور جدید طریقوں سے بچیوں کو قتل کرتے ہیں جب کہ اسلام نے بجائے کسی کو قتل کرنے کے' فطری اور مفید طریقہ عطا کیا کہ متعدد شادیاں کی جائیں اور وہ شادیاں بھی حدود کے اندر رہ کر نہ کہ اپنی خواہشات کے بل بوتے پر' ان گنت شادیاں رچالی جائیں۔

اعتراض نمبر ۱۵۰

ایک خاوند اور کئی بیویوں پر مشتمل گھرانہ جو مدتوں عیسائیوں کی نظروں میں اسلامی معاشرہ کی خصوصی پہچان رہا، وہ محمد ﷺ کے ذہن کی اختراع تھی۔ممکن ہے کہ آپ سے پہلے اس کی چند مثالیں موجود ہوں لیکن یہ رسم نہ تھی اور خصوصاً اہلِ مدینہ کے لیے یہ بات بالکل نئی تھی۔ پھر سورہ النساء کی آیت نمبر ۳ جس کا ترجمہ ہے''اور اگر تم ڈرو اس سے کہ نہ انصاف کر سکو گے تم یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمھیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک ہوں تمھارے دائیں ہاتھ' یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ان کی طرف نہ جھک جاؤ'' لیکن ''واٹ'' تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے''دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ یہ آیت لامحدود کثرت ازواج کی سابقہ رسم کی حد بندی نہیں کرتی جن لوگوں کی چھ یا دس بیویاں تھیں' یہ آیت ان سے یہ نہیں کہہ رہی کہ تمھیں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں۔اس کے برعکس جن لوگوں کی ایک بیوی تھی یا دو بیویاں تھیں' یہ آیت ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ وہ چار تک شادیاں کریں۔اس آیت میں کسی پرانی رسم پر پابندی

نہیں لگائی جا رہی ہے بل کہ ایک نئی چیز متعارف کروائی جا رہی ہے''۔ (ضیاء النبی۔ ۴۲۹۔ ۴۲۸/۷)

۲۔ تعدد ازواج آپؐ کی ذہنی اختراع تھی، اسلام سے پہلے یہ قانون عام نہ تھا اور خاص طور پر اہل مدینہ تعدد ازواج سے بے خبر تھے۔ جواب: ''واٹ'' کی دروغ گوئی تاریخی حقائق سے چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔ دراصل قبل از اسلام ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ہر مرد آزاد تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق جتنی شادیاں چاہتا' رچا لیتا۔ سچ کہتے ہیں کہ دروغ گورا حافظہ نباشد، (جھوٹے کا حافظہ نہیں ہوتا) خود ہی اپنے مذکور بیان کی تردید کرتے ہوئے کہہ دیتا ہے'' کہا جاتا ہے کہ طائف کے ایک آدمی کی دس بیویاں تھیں اور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ سب بہ یک وقت اس کے نکاح میں تھیں۔

"A man of Taif is said to have ten wives,apparently at once"

وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ابنِ سعد نے ایسے لوگوں کی ایک فہرست دی ہے جن کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں لیکن وہ کہتا ہے کہ اس فہرست سے تعدد ازواج کی رسم اس لیے ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ ایسی عورتیں بھی تھیں جن کے ایک سے زیادہ خاوند تھے۔ اس لیے یہ فہرست تعدد ازواج کی رسم کے باوجود دلیل نہیں بن سکتی اور حساب برابر ہو جاتا ہے۔ قبل از اسلام اور خصوصاً مدینہ میں ایک سے زیادہ بیویوں کا رواج نہ تھا بل کہ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ عرب میں مدینہ سمیت کچھ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک آدمی نے دو بہنوں کو بہ یک وقت رشتہ ازواج میں منسلک کر رکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ There are a few examples including some from medium of a man marrying two sisters.

کچھ مثالیں ایسی ہیں جن میں کچھ مثالیں مدینہ کی بھی ہیں کہ ایک آدمی نے دو بہنوں سے شادی کر رکھی تھی۔ یہود و نصاریٰ مذاہب کے سامنے تعدد ازواج رہا۔ زرتشت مذہب میں حقیقی ماں بہن بیٹی سے شادی جائز تھی۔ بدھ مت میں خود بدھا اپنے عیال کو چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر بیٹھا لیکن انھیں روکنے کے لیے اف تک نہ کی۔ ذکریا ہاشم کہتے ہیں'' ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر موسیٰؑ تک تمام شریعتوں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت تھی اور میں نہیں سمجھتا کہ حضرت عیسیٰؑ پر جو انجیل نازل ہوئی تھی اس نے اس کی ممانعت کی ہو۔ لیکن شریر لوگوں نے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے جو شرائط تھیں ان سے تعدد ازواج کی ممانعت سمجھی اور انجیل میں تحریف کر دی''۔ (ضیاء النبی ۷۔۴۴۲) مگر اسلام وہ دینِ رحمت ہے کہ نہ تو حقیقی رشتوں سے شادی جائز قرار دیتا ہے نہ ہی دو بہنوں کے ساتھ بہ یک وقت۔ '' وَاَن تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ''۔ اور نہ ہی بدھ مذہب

کی طرح رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ ہمیشہ راہ اعتدال کی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ دیکھا قارئین کرام اولاً مخالفت میں رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے پھر خود ہی تردید کر کے رائی کے بنے پہاڑ کو زمیں بوس کر دیتا ہے حتیٰ کہ نشان تک رہنے نہیں دیتا۔ یہ تضاد بیانیاں مستشرقین کی گھٹی میں پڑی ہیں اور مورخ کبھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑتا اور غیر جانب داری سے معلومات فراہم کرتا چلا جاتا ہے لیکن ان مستشرقین کے لیے یہ ضروری نہیں۔

دوم: سورہ النساء کی آیت کو بطور دلیل پیش کر کے کہا کہ کثرت ازواج کی سابقہ رسم پر پابندی نہیں لگائی گئی۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔ چار سے زیادہ بیویوں والے لوگوں پر صرف چار بیویوں کو رکھنے کی کوئی شرط عائد نہیں کی گئی نیز پرانی رسم کو برقرار رکھا۔ آیت پاک کا ترجمہ ''اور اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو گے تم یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) اور نکاح کر و جو پسند آئیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتیں، دو دو، تین تین، چار چار اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک ہیں تمھارے دائیں ہاتھ، یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ایک طرف ہی نہ جھک جاؤ''۔ قارئین کرام! کثرت ازواج کے لیے شرط لگائی جا رہی ہے کہ اگر انصاف نہ کر سکو تو صرف ایک بیوی کافی اور جائز ہے۔ اس سے کثرت ازواج مشروط ٹھہرتی ہے بل کہ ازواج کثرت پر پابندی لگ رہی ہے۔ یہ شرط اتنی کڑی ہے گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جس نے انصاف کا دامن تھامے رکھنا ہے وہ اس میدان میں سوچ سمجھ کر قدم رکھے گا۔ شائد مستشرقین اپنے آزادانہ معاشرے کے رواج کو سامنے رکھتے ہوئے کہتے ہیں کیوں کہ وہاں آئے دن شادیاں رچائی جاتی ہیں۔ یہ شادی ختم کرنے میں مذہبی، اخلاقی، معاشرتی آداب آڑے نہیں آتے۔ انھیں کیا پتہ کہ انصاف کیا ہے؟ بایں سبب ان پر کوئی شرط یا عائد پابندی جو اسلام نے کثرت ازواج کے لیے مقرر کر رکھی ہے نظر نہیں آتی۔ حالاں کہ صریحاً یہ آیت کثرت ازواج کی روک تھام اور آزاد راہ کو مسدود کر رہی ہے۔ اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ محض جنسی اختلاط اور جنسی تلذذ کی خاطر شادی نہیں ہو گی۔ اس عیش و عشرت کے دروازہ پر تالا لگا دیا گیا ہے جس سے دوسری شادی کا جواز نہیں رہتا۔ بہ صورت دیگر انصاف کی دھجیاں بکھر جاتیں اور اپنی شہوت پرستی اور جنسی تلذذ کی خاطر نہ جانے کتنی عورتوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا۔ اسلام نے عورت کی عزت و عظمت کو چار چاند لگا دیئے۔ وہ بھی معاشرہ میں اعلیٰ مقام کی مالکہ بن گئی۔ ہر درجہ عورت کے حقوق مقرر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جیسے یتیم بچیوں کے معاملہ میں بھی انصاف کو مقدم رکھا کہ عدل نہ ہو سکے تو ان سے بھی شادی ان کے مال و دولت یا جنسی تلذذ کی وجہ سے منع فرما دی۔ یتیم کو وہ مقام بخشا کہ کوئی بے سہارا نہ رہے اور در بہ در کی ٹھوکریں کھانے سے نجات پا جائے۔ گویا ہر وہ صورت جس سے انصاف کے تقاضے پورے نہ ہوتے ہوں حقوق کی

پائمالی ہو، شرائط عائد کر کے یکسر دروازہ مقفل کر دیا۔ مستشرقین کو یہ بات مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ آیت چار سے اوپر بیویوں والوں کو اور نہ ہی ایک سے زیادہ چار تک بیویاں رکھنے والوں کو کھلم کھلا اجازت دے رہی ہے بل کہ ایسی پابندی لگا رہی ہے کہ کثرت ازواج رک جائے گی۔

سوم: اس آیت پاک کی روشنی میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ پیروان اسلام پر اس کی پابندی (کثرت ازواج) لازمی ہے بل کہ یہ ایک رخصت ہے اور اجازت ہے اور یہ رخصت بھی مشروط ہے اور شرط کے پورا نہ کرنے کی صورت میں قطعاً گنجائش نہیں ہے بل کہ رخصت بھی منسوخ ہو جاتی ہے۔ قید اور شرط یہ ہے ''اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک تمھارے داہنے ہاتھ ہیں۔ یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ایک طرف ہی نہ جھک جاؤ''۔ ایک اور مقام پر ہے'' وَلَن تَستَطِعیوا۔۔۔۔ کان غفور رحیما'' ''بیویوں کے درمیان عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں، تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو، اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

قبل از اسلام ایک مرد کی کئی بیویاں ہوتی تھیں۔ آپؐ نے صحابہ کو حکم فرمایا کہ جو پسند ہوں انھیں اختیار کریں اور باقی بیویوں کو آزاد کر دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے ''غیلان بن سلمہ ثقفیؓ اسلام لائے۔ ان کی زمانہ جاہلیت میں دس بیویاں تھیں۔ وہ ان کے ساتھ مسلمان ہو گئیں۔ آپؐ نے حکم فرمایا کہ وہ ان میں سے چار کو اختیار کریں۔ حضرت قیس بن حارثؓ نے فرمایا کہ جب میں مسلمان ہوا تو میرے پاس آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے نبی پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کو بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا ''ان میں سے چار کو اختیار کر لو'' اس سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ چار بیویوں کو اختیار کرنے کے بعد باقی کو آزاد کر دیا جائے گویا کثرت ازواج کو چار تک محدود کر دیا اور یہ پابندی بھی کم ہو کر صرف ایک بیوی پر آ کر ختم ہو جاتی ہے وہ اس طرح کہ بات واضح ہے کہ اگر مرد انصاف نہ کر سکیں۔ یہی کثرت ازواج کا شور برپا کر رکھا ہے ان لوگوں نے۔ امید ہے اب سمجھ گئے ہوں گے وہ اس طرح کہ بات واضح ہے مگر نہ ماننا اور بات ہے۔

کوتلیہ چانکیا: اس کے نزدیک کسی معقول عذر کی بناء پر شادی جائز ہے جیسے اولادِ نرینہ نہ ہو۔ اس صورت میں معقول رقم زرتلافی عورت کو دے اور اثاثے اس کے حوالے کرے پھر جتنی شادیاں چاہے کی جاسکتی ہیں۔ دیکھا حضرات کتنا بڑا ظلم ہے کہ پہلی بیوی کو اپنے ہاں رہنے نہیں دیا جاتا۔ اسے بے دخلی کے آرڈر دیے جاتے ہیں۔ صرف چند کوڑیوں کے عوض اس سے زوجیت کے تمام حقوق چھین لیے جاتے ہیں لیکن دین اسلام پہلی بیوی کو اپنے ساتھ رکھنے اور انصاف سے سلوک کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر اس سے

زیادتی ہوتی ہے یا انصاف نہیں ہو پاتا تو مرد کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ پہلی بیوی کو طلاق دے دے تو پھر اجازت ہے۔ کیسا حسین ہمدرد، خیر خواہ انصاف پسند مذہب ہے کہ کسی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور اسے زوجیت کے حقوق سے محروم کرنے کے آرڈر کی اجازت نہیں ملتی۔

منومہاراج اور قانون ازواج: ہندو معاشرہ میں قانون وضع کرنے والے قانون ساز منوراج میں کثرت ازواج کی اجازت ہے مگر صرف برہمن، کھشتری اور ویش کو۔ شودر صرف ایک بیوی رکھ سکتا ہے۔ برہمن، کھشتری ویش عورتوں سے شادی کریں اور کم زور ذات دونوں شامل ہوں تو برتری میں برابر ذات والی کو اونچا مقام حاصل ہوگا۔ دوسری شادی کے لیے اجازت لینا اس مذہب میں ضروری قرار پاتا ہے۔ بے اولاد یا بیٹوں کا نہ ہونا وغیرہ کی صورت میں سوتن لائی جا سکتی ہے۔ البتہ جھگڑالو نہ ہو نیز پہلی بیوی کی اجازت سے سوتن لائی جائے گی۔

سوامی دیا نند سرسوتی اور تعدد ازواج: چند شرائط کے ساتھ کئی شادیوں کے کرنے کی اجازت ہے۔ پیر کرم شاہ بھیروی لکھتے ہیں ”آریوں میں تعدد ازواج کی اجازت ہے۔ چار عورتوں سے بہ یک وقت شادی کر سکتے ہیں اور ان کے مہاراجے راجے ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہیں۔ انھیں ان گنت عورتوں سے شادی رچانے کی کھلی چھٹی تھی“۔ ہندومت میں سری رام چندر جی کے والد مہاراجہ دسرت کی کئی بیویاں تھیں۔ سری کرشن چندر جی کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ پانڈوں کے راجا پانڈو کی دو بیویاں تھیں۔ بچھترا یزج کی دو بیویاں اور کنیز تھی۔

پرانوں میں کثرت ازواج: کرشنا مہاراج وشنو دیوتا کا اوتار تھا۔ وہ بھی کئی بیویوں کا مالک تھا۔ ہرانوں میں اس کی سولہ ہزار آٹھ سو بیویاں گنوائی گئی ہیں اور ان سے سولہ ہزار بیٹیاں پیدا ہوئیں (یہ مجذوب کی بڑ ہے) بہ ہر حال اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ اس نے کئی شادیاں کی تھیں۔

یہود و نصاریٰ: کثرت ازواج پر یہود و نصاریٰ طعن کرتے ہیں۔ اس کا رد اللہ تعالیٰ نے فرما دیا۔ ارشاد ربانی ہے،

”وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً“ (ال رعد ۶۴) ”اور بے شک ہم نے تجھ سے پہلے پیغمبر بھیجے اور ان کو عورتیں اور اولاد دی“۔ اس سے جناب ختمی المرتبت محمد ﷺ پر لگائے گئے کثرت ازواج کے الزام اور طعن کا رد فرمایا گیا ہے۔ اس کی دلیل یہ فرمائی کہ آپؐ سے پہلے پیغمبروں کو بھی عورتیں اور اولاد دی۔ آپ کا شادیاں کرنا عین اسلام ہے اور قرآنی مذکور آیت سے ثابت ہے جب کہ دیگر انبیاء نے بھی ایسا کیا۔

حضرت ابراھیمؑ	۳ بیویاں	پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۹ باب ۱۶ آیت ۳

حضرت یعقوبؑ	۴ بیویاں	پیدائش باب ۲۹ باب ۳۰ آیت (۴-۹)
حضرت موسیٰؑ	۲ بیویاں	خروج باب آیہ ۲۱، اعداد باب ۱۲ آیت اول
حضرت جدعونؑ	بہت سی بیویاں جن سے ستر لڑکے پیدا ہوئے	اقتضا باب آیت ۳۰
حضرت داؤدؑ	۴۳ بیویاں	دوم سموئیل باب ۳ آیت ۲ تا ۵ آیت ۱۳
حضرت سلیمانؑ	بہت سی عورتیں (۷۰۰)	باب ۱۱ آیہ ۳-۴

حقیقت یہ ہے کہ ایک سے زائد بیویاں بیاہ لانا نبوت کے منافی نہیں البتہ سموئیل میں پیغمبروں کی شان جن سے بے ادبی کا مظاہرہ کیا گیا ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں۔

(حیات محمد۔ ہیکل ٦٥٨)

حساب برابر: ''واٹ'' کہتا ہے کہ ابن سعد کی تاریخ میں بے شمار مثالیں ایسی ہیں جن میں سے ایک مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں لیکن ایسی عورتوں کی مثالیں بھی موجود ہیں جن کے ایک سے زیادہ خاوند تھے۔ اس لیے حساب برابر ہو جاتا ہے۔'' (ضیاء النبی ۷-۴۴۰)

اس کا جواب یہ ہے کہ واٹ: تعداد ازواج کا اقرار کرتا ہے اور اپنے اس موقف (تعدد ازواج) کے غلط ہونے کے سلسلے میں حساب برابر کرنے کی دلیل لاتا ہے کہ اگر ایک مرد کے کئی بیویاں تھیں تو ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں کئی عورتوں کو ایک ہی خاوند میسر تھا۔ اسلام واٹ کے ہر دو مفروضوں کا رد کرتا ہے اول یہ کہ واٹ تعداد ازواج کا انکاری ہے۔ دوم مانتا ہے تو حساب برابر کرنے کے چکر میں کہ کئی عورتوں کے لیے ایک خاوند ہوتا تھا۔

واٹ کی تردید، جارج سیل: کچھ یہودی علماء نے باہمی مشورہ سے بیویوں کی تعداد چار مقرر کی تھی لیکن ان کا مذہبی قانون کوئی پابندی نہیں لگاتا ہے۔ مزید کہتا ہے ''کئی پڑھے لکھے لوگ اس عامیانہ غلطی میں مبتلا ہیں کہ محمد ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو لا تعداد عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھنے کی اجازت دی''۔

اعتراض نمبر ۱۵۱

تعداد ازواج سے معاشرے میں ہم آہنگی کی بجائے نفرت۔ اور بغض وعناد کے جذبات جنم لیتے ہیں۔

جواب: حضرت ام حبیبہؓ کو چھ ہجری میں حبالہ عقد میں لیا۔ ابوسفیان کی مخالفت ڈھیلی پڑ گئی۔ یہ وہ شخص ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کا جانی دشمن ہے۔ ازاں بعد حضرت معاویہؓ اور یزیدؓ بن ابوسفیان ایمان لائے۔ حضرت جویریہ بنت حارث کا نکاح آٹھ ہجری کے بعد ہوا، حارث اور ان کا سارا خاندان مصطلق ڈاکہ زنی کو چھوڑ دیتا ہے اور اسلام قبول کر لیتا ہے۔ حضرت صفیہؓ بنت حیّ کے حرم نبوی میں داخل

ہونے سے یہود کی دشمنی میں کمی ہی نہیں آتی بلکہ وہ کسی سازش میں حصہ لیتے نظر نہیں آتے۔ سات ہجری میں ام میمونہؓ کے نکاح میں آنے سے نجد کے فتنے ختم ہوتے ہیں معاشرہ امن اور سکون کا گہوارا بن جاتا ہے۔ کہیں اب نفرت وعناد کی آندھیاں چلتی دکھائی نہیں دیتیں۔ تعدد ازواج کی برکت سے امن وامان اور خوشحالی کی فضا اطراف واکناف میں پھیلی۔ نہ جانے مستشرقین کو تعدد ازواج سے معاشرہ میں ہم آہنگی کی بجائے نفرت اور رقابت کے جذبات جنم لیتے کیوں نظر آتے ہیں؟ حالانکہ مذکورہ تاریخی حالات سے ثابت ہے کہ معاشرے میں خوشگوار اور پیار ومحبت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ اچھے تعلقات کی بناء پر دشمنی اور نفرت دم توڑ دیتی ہے اور ایسا مثالی معاشرہ معرض وجود میں آتا ہے جس کی نظیر رہتی دنیا تک تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ ﷺ نے جن جن خواتین کو حرم نبوی میں شامل ہونے کا شرف بخشا ان کے وارثوں نے کبھی ازاں بعد حضور ﷺ کی مخالفت نہ کی' اگر تھی تو کمی واقع ہوئی۔ آپ ﷺ کے جانی دشمن آپ ﷺ کے جانثار اور اللہ کے دین کی خاطر جان کی بازی لگانے والے بن گئے' یہ آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ اور غریبوں' یتیموں اور بیواؤں سے ہمدردی کا نتیجہ ہے۔ آپ ﷺ نے نفرت اور بغض کی کریہہ صورت کو مسخ کر دیا۔

اعتراض نمبر ۱۵۲

مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام نے تعدد ازواج کی اجازت دے کر عورت کا احترام کم کیا ہے۔ (ضیاء النبی ۷۔ ۴۵۰)

جواب: پیر کرم شاہ بھیروی صاحب لکھتے ہیں ''ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ معاشرے کی وہ عورتیں جن کے لیے خاوند موجود نہیں، کیا وہ عورت کہلانے کی مستحق نہیں؟ کیا ان عورتوں کی فطرت ان چیزوں کا تقاضا نہیں کرتی جن کا تقاضا دوسری عورتوں کی فطرت کرتی ہے؟ کیا معاشرے کا یہ فرض نہیں کہ وہ ان محروم عورتوں کے متعلق غور کرے؟ اگر معاشرے میں ایسے باہمت لوگ موجود ہوں جو ایک سے زیادہ بیویوں کے حقوق پورے کر سکتے ہوں تو کیا یہ مناسب نہیں کہ وہ قربانی کے جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں اور ان محروم عورتوں میں سے حسبِ استطاعت دو یا تین خواتین کو اپنی زوجیت کے سائے میں لے لیں؟ اس صورت میں تعدد ازواج کا قانون مرد کی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہوگا بل کہ بے آسرا خواتین کو عزت ووقار، گھر، سکون اور اولاد جیسی نعمتیں دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بل کہ وہ عورتیں جن کی زندگی کے بے شمار مسائل کا حل معاشرہ نہیں سوچتا ان مسائل کا حل وہ خود سوچتی ہیں۔ اس کا نتیجہ معاشرے کو فحاشی کے اڈوں، کنواری ماؤں، ناجائز بچوں اور جنسیت زدہ قوم کی شکل میں نظر آجاتا ہے۔۔ معاشرہ جن عورتوں کو خاوند مہیا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا وہ عورتیں طوائفیں بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور معاشرے میں جگہ جگہ طوائفیں پھر رہی ہوں وہاں کسی عورت کو یہ ضمانت نہیں

مل سکتی کہ اس کا سہاگ کسی اور زلفِ پیچاں کا اسیر نہیں بن جائے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ برازیل میں نوجوان عورتوں نے تعدد ازواج کو جائز قرار دینے کے مطالبے کیے ہیں‘‘۔

اسلام نے عورت کو مرد کے برابر حقوق عطا کیے ہیں۔ اسلام مرد کو مرد کے درجہ میں اور عورت کو عورت کے درجہ میں رکھتا ہے۔ اگر دونوں اصناف آپس میں گڈ مڈ ہو جائیں تو نظام ہستی اور عائلی زندگی کے نظام کا جنازہ اٹھ جائے گا۔ جیسے آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ کیوں کہ مرد اور عورت کی تقسیم اللہ پاک نے کی ہے۔ اس تقسیم کی بقاء انسانی زندگی کی بقا ہے۔ اسلام میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے Duplicate نہیں بل کہ تکملہ یعنی Compliment ہیں کیوں کہ ان میں ناقابل تقسیم حیاتیاتی فرق پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق اس لیے ہے کہ مرد کی کمی عورت اور عورت کی کمی مرد پوری کرے تا کہ زندگی میں نظم اور توازن برقرار رہے۔ اسلام نے ہی ماں کے قدموں تلے جنت کا درس دیا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی اعزاز ہے؟ آپ ﷺ نے اپنے اسوہ حسنہ سے ثابت کیا کہ کثرت ازاوج سے عورت کے احترام میں کمی نہیں آتی بلکہ کثرت ازواج سے معاشرہ کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں ان کے رویوں سے معاشرہ ہنستا بستا اور مثالی بن جاتا ہے اور ہر طرف سے امن وسکون کے گلشن میں خوشگوار ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر دوسری شادی کی اجازت نہ ہوتی تو عورت دوسروں کے رحم وکرم پر ہوتی اپنے خاندان والوں کے عزت و ناموس پر کلنک کا ٹیکہ ہوتی اور معاشرے کے لیے ناسور بن جاتی۔ ایک سے زیادہ شادیوں کو قبیح سمجھنے سے فحاشی کے اڈے معرض وجود میں آجاتے ہیں جہاں شب وروز یعنی دن کے اجالے اور رات کے اندھیروں میں قحبہ گری جاری رہتی ہے جہاں عزت و ناموس کی چادر تار تار ہوتی ہے۔ حسن معاشرت کا نظم تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ وہ مالی ضیاع اور شاہ خرچیاں کی جاتی ہیں۔ دولت کو بے دریغ لٹایا جاتا ہے۔ کرنسی نوٹوں کو آگ لگا کر سگریٹ کی طرح کش لگا کر دھویں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ قوم کے محافظ اور اس کے نگران ان فحاشی کے اڈوں کو ختم کرنے کی بجائے اور قصور زدگان کو سزا دینے کے بجائے خود رنگ رلیاں مناتے ہیں کثرت ازواج ایسی بری اور گھناونی رسموں کو مٹا دیتی ہے۔ اگر اسلام کے حسین وجمیل نظریہ ازواج پر عمل کیا جاتا تو یہ برائیاں دم توڑ دیتیں اور تماش بین عورت کو حرم میں داخل کرتے تو متعدد گرل فرینڈز اور داستاؤں کو اپنانے سے باز رہتے۔

اعتراض نمبر ۱۵۳

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلام میں عورت کو بھی ایک مرد سے زیادہ مرد رکھنے کی اجازت دینی چاہیے جیسے ایک مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی رعایت حاصل ہے‘‘۔ (ضیاء النبی ۷/۴۶۰)

جواب: مستشرقین اور روشن خیال نام نہاد تعلیم یافتہ افراد کا عقیدہ ہے جن کے سر پر مساواتی اور

برابری کی دھن سوار ہے۔ یہ لوگ مساواتی نظریہ کے جیالے اور علم بردار ہیں۔ حالاں کہ انھیں خبر ہونی چاہیے کہ مرد اور عورت میں طبعی فرق موجود ہے مگر اسے وہ ذرا برابر اہمیت نہیں دیتے۔ خیر اس اہمیت سے انکار تو کر دیا جاتا ہے مگر ہو سکتا ہے کہ کسی ذی فہم شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کل یہ نظریہ اور عقیدہ رکھنے والے افراد کہیں کہ جن ازواجی مراحل سے عورت کو گزرنا پڑتا ہے، انھیں مراحل کو مرد طے کرے تاکہ مساوات کا حق ادا ہو سکے؟ رات کو دن سے ملا دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ مرد کا کئی شادیاں کرنے سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں نیز وہ عین فطرت بھی ہے۔ ایک عورت کا کئی مرد رکھنا دردِ سر ہے اور بے شمار خطرناک مسائل کا پیش خیمہ ہے۔ ایک خرابی یہ کہ نسب محفوظ نہیں رہتا۔ بیٹا یا بیٹی کس باپ سے منسوب ہو گی۔ کس باپ کا بیٹا کہلائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کئی باپ ہونے کے سبب بیٹا یا بیٹی کے بارے میں لڑ پڑیں۔ ایک کہے میری بیٹی ہے دوسرا کہے نہیں میری بیٹی ہے۔ تیسرا کہے بیٹا تو میرا ہی ہے۔ بچوں کا جنم خوشی کا باعث نہ ہوا بل کہ گھر پانی پت کا میدان جنگ بن گیا۔ نسب عزت و شرافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بے نسبی سے نام کو بٹہ لگتا ہے بل کہ معاشرہ تو ایسے بچوں کو حرامی (ولد الزنا) بچے پکارتا ہے۔ ایسے بچے چھپتے چھپاتے پھرتے ہیں۔ معاشرہ کے لیے رستا ہوا ناسور اور روز کا دردِ سر بن جاتے ہیں۔ دوسری گھمبیر خرابی یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ یوں کہ طاقت ور جانور جیسے مادہ کو حاصل کر لیتا ہے کم زور منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح طاقت ور شوہر اپنی جنسی خواہش کی پیاس بجھانے میں کامیاب ہو سکتا ہے مگر کم زور اور ناتواں دل میں حسرتیں لیے کڑھتا رہتا ہے۔ یہ عمل اور بیماری معاشرہ کو بے عزتی، بے غیرتی اور بے حیائی کا تحفہ دیتی ہے۔ اس سے باہمی تنازعات کو ہوا ملتی ہے اور جہاں گھر کا ماحول بے سکونی کی نذر ہو جاتا ہے وہاں مثالی معاشرہ بننا تو درکنار بل کہ یہ بیماری پورے معاشرہ کے امن و سکون کو تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ مرد کی شادیاں زیادہ ہوں تو اس کے بچے وراثت کے مالک ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو اسلامی قانون کے مطابق حصہ ملتا ہے لیکن کئی شوہر والی بیوی کے بچے کس کس باپ کی وراثت سے حصہ لیں گے۔ یہ معمہ لاینحل ہے۔ قیافہ شناسوں سے زمانہ جاہلیت میں مدد لی جاتی تھی کہ وہ بچہ یا بچی کو اپنے علم قیافہ کی بنیاد پر بتاتے تھے کہ یہ بچہ یا بچی فلاں شخص کا ہے۔ وہ قیافہ شناس کسی بھی مرد کے کھاتے میں ڈال دیتے تھے۔ وہ اسے قبول کرتا لیکن یہ کوئی حتمی فیصلہ نہ تھا کہ بچہ یا بچی اسی شخص کا ہے جس کے سپرد قیافہ شناس نے کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی باپ بچہ یا بچی کو قبول نہ کرے تو بچہ کہاں جائے گا؟ بچہ کس کے رحم و کرم پر ہو گا؟ لاوارث ہو کر در بہ در کے دھکے کھائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے بچہ اور بچی کسی ایک باپ کو مل جاتے ہیں اور باقی محروم رہتے ہیں۔ اگر وہ کوئی اور شادی نہیں کر پاتے تو ان کی نسل کا انقطاع ہو جائے گا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک عورت سے

اولاد زیادہ نہیں ہوتی جتنی کئی عورتوں سے ہوسکتی ہے۔حیض ونفاس کے بارے میں حکم ہے" فاعتزلوا لنساء فی المحیض" ان ایام میں عورتوں سے الگ رہو۔عورت استقرارِ حمل، وضع حمل، رضاعت، بیماری وغیرہ سے دوچار ہوتی ہے۔عورت کے جنسی جذبات میں کمی آتی ہے جب کہ مرد جذبات کے ساتھ تندرست وتوانا رہتا ہے۔ایک مرد کی تسلی کے لیے ایک عورت ناکافی ہے تو کئی شوہروں والی عورت کئی خاوندوں کی تسلی وتشفی اور راحت وسکون کا سامان کیسے فراہم کرسکتی ہے؟اور ممکن ہے اس کی صحت بھی جواب دے جائے اور ایک مرد کے لیے بھی مفید نہ رہے۔موجودہ یورپ نے صرف اسلام کی مخالفت کے تعدد ازواج کی مخالفت میں شوشے چھوڑے جب کہ یورپ میں نسوانی ناموس کی دھجیاں بکھر چکی ہیں۔نسوانی ناموس مٹ رہی ہے۔سرِ بازار لٹی جارہی ہے مگر اسے آزادی نسواں کا نام دے کر مسلمانوں کی مخالفت میں ڈھول پیٹے جارہے ہیں جب کہ انھیں اپنی عزت کا پاس تک نہیں ہے۔اب یورپ میں یک زوجگی کا تعلق ختم ہو چکا ہے۔اکثریت بغیر نکاح کے میاں بیوی بن رہے ہیں۔انگلستان میں جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لیے ۱۷ویں صدی میں کثرت ازواج کا چرچا شروع ہوا۔چناں چہ ۱۶۵۸ء میں ایک شخص نے زناکاری اور نومولود حرامی بچوں کی اموات روکنے کے لیے کثرت ازواج کی حمایت کردی اور پمفلٹ شائع کیا۔اس کے ایک صدی بعد ایک باکردار پادری نے اس کی حمایت میں کتاب لکھی۔مشہور ماہر دینیات جیمس ہلٹن نے فحاشی اور زناکاری کو روکنے کے لیے کثرت ازواج کے طریقہ کو اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔شوپن نے لکھا" ایک بیوی پر اکتفا کرنے والے کہاں ہیں؟ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں،ہم میں سے ہر شخص کثرت ازواج کا قائل ہے۔چوں کہ ہر آدمی کو متعدد عورتوں کی ضرورت ہے۔اس لیے مرد پر کسی قسم کی تحدید عائد نہیں ہونی چاہیے۔ماہر جنسیات کیلی چن کہتا ہے کہ " گوانگلستان میں کثرت ازواج کے اصول پر عمل ہوتا ہے لیکن سوسائٹی اور قانون ابھی اس چیز کو تسلیم نہیں کرتے۔سوسائٹی ان اعمال پر خاموش رہتی ہے جو ایک بیوی یا شوہر سے شادی کرکے دو یا تین داشتاؤں یا آشناؤں سے تعلقات رکھتے ہیں لیکن سوسائٹی چیخ اٹھتی ہے جب کوئی شخص یہ تحریک پیش کرتا ہے کہ مرد کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دینی چاہیے"۔داشتائیں بیوی کی جگہ نہیں لے سکتیں وہ تو صرف عارضی شہوت رانی کی پجاری ہیں اسے حقوق نسواں سے کوئی غرض نہیں حالانکہ وہ ان تمام حقوق ومراعات سے محروم رہتی ہیں جو ایک شوہر سے بیوی کو حاصل ہوتے ہیں نیز داشتاؤں کو رکھنا گناہ ہے جس کی اسلام میں قطع اجازت نہیں ہے کیونکہ یہ ایک زنا ہے۔

اجتہادی غلطیاں

۲۱ جولائی سن ۱۹۶۰ کے مقدمہ رشیدہ بیگم بنام شہاب الدین میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے

ایک رکن فاضل جج محمد شفیع صاحب نے مذکورہ مقدمہ کے فیصلے میں تعدد ازواج کے مسئلے پر سورہ النساء کی آیت نمبر۳ ''وَاِنْ خِفْتُمْ اِلَّا ۔۔۔۔ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ'' کے تحت اجتہاد کیا اگرچہ حضانت اور سرقہ کے بارے میں بھی اجتہاد کیا لیکن ہمارا مضمون تعدد ازواج کے بارے میں ہے لہذا اسی کو زیر بحث لاتے ہیں ۔اور مولانا مودودی کے جوابات ان اجتہادی غلطیوں کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔

پہلی غلطی: تعجب ہے کہ فاضل جج کو اپنے ان دونوں فقروں میں تضاد کیوں نہ محسوس ہوا۔ پہلے فقرے میں جو اصولی بات انہوں نے خود فرمائی اس کی رو سے زیر بحث آیت کا کوئی لفظ زائد از ضرورت یا بے معنی نہیں ہے۔اب دیکھیے! آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس کے مخاطب افراد مسلمین ہیں ۔ان سے کہا جا رہا ہے کہ ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملے میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے، لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ اگر نہ کر سکو گے تو ایک ہی سہی ۔۔۔'' ظاہر ہے کہ عورتوں کو پسند کرنا، ان سے نکاح کرنا اور اپنی بیویوں سے عدل کرنا یا نہ کرنا افراد کا کام ہے نہ کہ پوری قوم یا سوسائٹی کا۔لہٰذا باقی تمام فقرے بھی جو بصیغہ جمع مخاطب ارشاد ہوئے ہیں، ان کا خطاب بھی لامحالہ افراد ہی سے ماننا پڑے گا۔اسی طرح یہ پوری آیت اول سے لے کر آخر تک دراصل افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں مخاطب کر رہی ہے اور یہ بات انہیں کی مرضی پر چھوڑ رہی ہے کہ اگر عدل کر سکیں تو چار کی حد تک جتنی عورتوں کو پسند کریں، ان سے نکاح کر لیں، اور اگر یہ خطرہ محسوس کریں کہ عدل نہ کر سکیں گے تو ایک ہی پر اکتفا کریں۔سوال یہ ہے کہ جب تک فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ اور فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا کے صیغہ خطاب کو فضول اور بے معنی نہ سمجھ لیا جائے اس آیت کے ڈھانچے میں نمائندگان قوم کس راستے سے داخل ہو سکتے ہیں؟ آیت کا کون سا لفظ ان کے لیے مداخلت کا دروازہ کھولتا ہے؟اور مداخلت کی اس حد تک کہ وہی اس امر کا فیصلہ بھی کریں کہ ایک مسلمان دوسری بیوی کر بھی سکتا ہے یا نہیں، حالانکہ کر سکنے کا مجاز اسے اللہ تعالیٰ نے خود بالفاظ صریح کر دیا ہے،اور پھر ''کر سکنے'' کا فیصلہ کرنے کے بعد وہی یہ بھی طے کریں کہ ''کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق کر سکتا ہے۔'' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز فرد کے اپنے انفرادی فیصلے پر چھوڑی ہے کہ اگر وہ عدل کی طاقت اپنے اندر پاتا ہو تو ایک سے زائد کرے ورنہ ایک ہی پر اکتفا کرے۔

۲۔دوسری غلطی: وہ یہ کہتے ہیں کہ از راہ قیاس ایسی شادی کو یعنی ایک سے زائد بیویوں کے ساتھ شادی کو یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے جیسا بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ آیت میں چونکہ یتامیٰ کے ساتھ انصاف کا ذکر آ گیا ہے اس لیے لامحالہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے معاملے میں کسی نہ کسی طرح یتامیٰ کا معاملہ بطور ایک لازمی شرط کے شامل ہونا چاہیے۔اس بارے میں عرض ہے کہ اگر قرآن میں

کسی خاص موقعہ پر جو حکم دیا گیا ہو اور اس موقعہ کا ذکر بھی ساتھ کر دیا گیا ہو وہ حکم صرف اس موقعہ کے لیے خاص ہو گا تو اس سے بڑی قباحتیں لازم آئیں گی جیسے مثلاً عرب کے لوگ اپنی لونڈیوں کو پیشہ کمانے پر زبردستی مجبور کرتے تھے قرآن نے اس کی ممانعت ان الفاظ میں فرمائی "لاتکرھوا فتیتکم علی البغاء ان اردن تحصنا" (النور ۳۳ پارہ ۱۸) ترجمہ "اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ بچی رہنا چاہتی ہوں"۔

کیا یہاں از راہ قیاس یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ حکم صرف لونڈیوں کے متعلق ہے اور یہ کہ لونڈی اگر خود کو بدکار رہنا چاہتی ہو تو اس سے پیشہ کرایا جا سکتا ہے۔ خاص واقعاتی پس منظر جب تک نگاہ میں نہ ہو آدمی قرآن کریم کی ایسی آیات جن میں کوئی حکم بیان کرنے سے کسی خاص حالت کا ذکر کیا گیا ہے، ٹھیک سمجھ نہیں سکتا۔

آیت وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمیٰ کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ عرب میں اور قدیم زمانے کی پوری سوسائٹی، صدہا برس سے تعدد ازواج مطلقاً مباح تھا۔ اس کے لیے کوئی نئی اجازت دینے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ قرآن کا کسی رواج عام سے منع نہ کرنا خود ہی اس رواج کی اجازت کا ہم معنی تھا۔ اس لیے فی الحقیقت یہ آیت تعدد ازواج کی اجازت دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ جنگ احد کے بعد جو بہت سی عورتیں کئی کئی بچوں کے ساتھ بیوہ رہ گئی تھیں ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ ان مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ اگر شہدائے احد کے یتیم بچوں کے ساتھ تم یوں انصاف نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے ایک سے زائد بیویاں کرنے کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا ہے، ان کی بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان کے ساتھ نکاح کر لو، تا کہ ان کے بچے تمہارے اپنے بچے بن جائیں اور تمہیں ان کے مفاد سے ذاتی دلچسپی پیدا ہو جائے اس سے یہ نتیجہ کسی منطق کی رو سے نہیں نکالا جا سکتا کہ تعدد ازواج صرف اسی حالت میں جائز ہے جبکہ یتیم بچوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش ہو۔ اس آیت میں کوئی نیا قانون بنایا ہے وہ تعدد ازواج کی اجازت دینا نہیں ہے کیونکہ اس کی اجازت تو پہلے ہی تھی اور معاشرے میں ہزاروں برس سے اس کا رواج موجود تھا، بلکہ دراصل اس میں جو نیا قانون دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد پر چار کی قید لگا دی ہے جو پہلے نہ تھی۔

۳۔ تیسری غلطی: اگر ایک مسلمان کہتا ہے کہ میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا کہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ اس عجیب طرز استدلال کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے گا تو وہ اس آزادی کو استعمال کرتا ہے جو اس کی خانگی زندگی کے بارے میں خدا

تعالیٰ نے اسے دی ہے۔ وہ اس آزادی کو شادی نہ کرنے کے بارے میں بھی استعمال کرسکتا ہے۔ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے میں بھی استعمال کرسکتا ہے، بیوی مرجائے تو دوسری شادی کرنے یا نہ کرنے میں بھی استعمال کرسکتا ہے اور کسی وقت اس کی رائے بدل جائے تو ایک سے زائد بیویاں کرنے کا فیصلہ بھی کرسکتا ہے لیکن جب قوم تمام افراد کے بارے میں کوئی مستقل قانون بنادے گی تو فرد سے اس کی وہ آزادی سلب کرلے گی جو خدا نے اسے دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسی قیاس پر کیا قوم کسی وقت یہ فیصلہ کرنے کی بھی مجاز ہے کہ اس کے آدھے افراد شادی کریں اور آدھے نہ کریں؟ یا جس کی بیوی یا شوہر مر جائے وہ نکاح ثانی نہ کرے؟ ہر آزادی جو افراد کو دی گئی ہے اسے بنائے استدلال بنا کر قوم کو یہ آزادی دینا کہ وہ افراد سے ان کی آزادی سلب کرے، ایک منطقی مغالطہ تو ہوسکتا ہے مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ قانون میں یہ طرز استدلال کب سے مقبول ہوا ہے۔ تاہم تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مان لیتے ہیں کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت مثلاً ان میں چار کروڑ ایک ہزار مل کر ایسا کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے صرف چند ہزار مل کر اپنی ذاتی رائے سے اس طرح کا کوئی قانون تجویز کریں اور اکثریت کی رائے کے خلاف اسے مسلط کردیں تو فاضل جج کے بیان کردہ اصول کی رو سے اس کا کیا جواز ہوگا؟ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی آبادی میں سے ایک لاکھ بلکہ پچاس ہزار کا بھی نقطہ نظر یہ نہیں ہے کہ قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی حالت اس امر کا تقاضہ کرتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا تو قانوناً ممنوع ہو البتہ اس کا گرل فرینڈز سے آزادنہ تعلق یا طوائفوں سے ربط وضبط یا مستقل داشتہ رکھنا از روے قانون جائز ہے۔ خود وہ عورتیں بھی جن کے شوہر کا نکاح ہو جائے تو ان کی زندگی ستی سے بدتر ہوجائے گی لیکن اسی عورت سے ان کے شوہر کا ناجائز تعلق رہے تو ان کی زندگی جنت کا نمونہ بنی رہے گی۔

۴۔ چوتھی غلطی: فاضل جج صاحب کہتے ہیں کہ اس آیت کو دوسری دو آیتوں سے ملا کر پڑھنا چاہیے ان میں سے پہلی آیت سورہ النور کی ۳۳ ہے جس میں طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے ذرائع نہ رکھتے ہوں، ان کو شادی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو ایک بیوی سے روکا جا سکتا ہے تو انہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بناء پر اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔

یہاں پھر موصوف نے خود اپنے بیان کردہ اصول کو توڑ دیا ہے آیت کے اصل الفاظ یہ ہیں" ویستعفف الذین لا یجدون ۔۔۔ من فضلہ (النور۔۲۴۔۳۳) ترجمہ "اور عفت مآبی سے کام لیں وہ لوگ جو نکاح کا موقع نہیں پاتے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کردے"

ان الفاظ سے ایسے لوگوں کو نکاح نہ کرنا چاہیے کا مفہوم کیسے نکلتا ہے اگر قرآن کی کسی آیت کے

الفاظ کو فضول اور بے معنی سمجھنا درست نہیں ہے تو نکاح سے منع کر دینے کا تصور اس آیت میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ نکاح کے ذرائع فراہم نہ کر دے اس وقت تک مجرد لوگ عفت مآب بن کر رہیں، بدکاریاں کر کے اپنے نفس کی تسکین نہ کرتے پھریں تاہم کسی نہ کسی طرح نکاح سے منع کرنے کا مفہوم ان الفاظ میں داخل کر بھی دیا جائے، پھر بھی اس کا روئے سخن فرد کی طرف ہے قوم کی طرف ہے نہ کہ ریاست کی طرف۔ یہ بات فرد کی اپنی صوابدید پر چھوڑی دی گئی ہے کہ وہ کب اپنے کو شادی کر لینے کے قابل کرتا ہے اور شادی کے قابل کب نہیں پاتا اور اسی کو یہ ہدایت دی گئی ہے (اگر فی الواقع ایسی کوئی ہدایت کی بھی گئی ہے) کہ جب تک وہ نکاح کے ذرائع نہ پائے، نکاح نہ کرے اس میں ریاست کو یہ حق کہاں دیا گیا ہے کہ وہ فرد کے اس ذاتی معاملے میں دخل دے اور یہ قانون بنا دے کہ کوئی شخص اس وقت تک نکاح نہ کرنے پائے جب تک وہ ایک عدالت کے سامنے اپنے آپ کو ایک بیوی اور گنتی کے چند بچوں کی (جن کی تعداد مقرر کر دینے کا حق بھی فاضل جج کی رائے میں یہی آیت ریاست کو عطا کرتی ہے) پرورش کے قابل ثابت نہ کر دے؟ آیت کے الفاظ اگر ''فضول اور بے معنی'' نہیں ہیں تو اس معاملے میں ریاست کی قانون سازی کا جواز ہمیں بتایا جائے کہ اس کے کس لفظ سے نکلتا ہے؟ اور اگر نہیں نکلتا تو اس آیت کی بنیاد پر مزید پیش قدمی کر کے ایک سے زائد بیویوں اور مقررہ تعداد سے زائد بچوں کے معاملے میں ریاست کو قانون بنانے کا حق کیسے دیا جا سکتا ہے؟

۵۔ پانچویں غلطی: دوسری آیت جسے سورہ النساء کی آیت نمبر تین کے ساتھ ملا کر پڑھنے اور اس سے ایک حکم نکالنے کی فاضل جج نے کوشش کی ہے، وہ سورہ النساء کی آیت نمبر ۱۲۹ ہے۔ اس کا صرف حوالہ دینے پر انہوں نے اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ اس کے الفاظ انہوں نے خود نقل کر دیئے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ ''ولن تستطعوا ان تعدلو۔۔۔ غفوراً الرحیما'' اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدل کرو عورتوں (یعنی بیویوں) کے درمیان خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہش مند ہو لہٰذا (ایک بیوی کی طرف) بالکل نہ جھک پڑو کہ (دوسری کو) معلق چھوڑ دو اور اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ یقیناً درگزر کرنے والا رحیم ہے''

ان الفاظ کی بنیاد پر فاضل جج پہلے تو یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کر دے وہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے اور قرآن مجید میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دونوں بیویوں کے ساتھ

یکساں برتاؤ نہیں ہوسکتا لہٰذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔ہمیں سخت حیرت ہے کہ اس آیت میں سے اتنا بڑا مضمون کس طرح اور کہاں سے نکل آیا۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ضرور فرمایا ہے کہ انسان دو یا زائد بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا، مگر کیا اس بنیاد پر اس نے تعدداز واج کی وہ اجازت واپس لے لی ہے جو عدل کی شرط کے ساتھ اس نے خود ہی سورہ النساء کی آیت نمبر۳ میں دی تھی۔؟ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس فطری حقیقت کو صریح لفظوں میں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ دو یا زائد بیویوں کے شوہر سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک بیوی کی طرف ہمہ تن نہ مائل ہو جائے کہ دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق چھوڑ دے یعنی پورا عدل نہ کرسکنے کا حاصل قرآن کی رو سے یہ نہیں ہے کہ تعدداز واج کی اجازت ہی سرے سے منسوخ ہو جائے بلکہ اس کے برعکس اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ شوہر ازدواجی تعلق کے لیے ایک بیوی کو مخصوص کر لینے سے پرہیز کرے اور تعلق و ربط سب بیویوں سے رکھے خواہ اس کا دلی میلان ایک ہی کی طرف ہو۔حکومتی اور عدالتی مداخلت اس صورت میں پیش آتی ہے جب شوہر نے ایک بیوی کی خاطر دوسری بیویوں کو معلق کر کے رکھ دیا ہو اس صورت میں وہ بے انصافی واقع ہوگی جس کے ساتھ تعدداز واج کی اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا لیکن کسی منطق کی رو سے اس آیت کے الفاظ اور اس کی ترکیب اور فحویٰ سے یہ گنجائش نہیں نکالی جاسکتی کہ معلق نہ رکھنے کی صورت میں ایک ہی شخص کے لیے زائد بیویوں کو از روے قانون ممنوع ٹھہرایا جاسکے، کجا کہ اس میں سے اتنا بڑا مضمون نکال لیا جائے کہ ریاست تمام لوگوں کے لیے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کو مستقل طور پر ممنوع قرار دے قرآن کی جتنی آیتوں کو بھی آدمی چاہے، ملا کر پڑھے لیکن قرآن کے الفاظ میں قرآن ہی کا مفہوم پڑھنا چاہے۔کوئی دوسرا مفہوم کہیں سے لا کر قرآن پڑھنا اور پھر یہ کہنا یہ مفہوم قرآن سے نکل رہا ہے، کسی طرح بھی درست طریق مطالعہ نہیں ہے کجا کہ اسے درست طریق اجتہاد مان لیا جائے۔آگے بڑھنے سے پہلے ہم فاضل جج کو اور ان کا سا طرز فکر رکھنے والے دوسرے حضرات کو بھی، ایک سوال پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔قرآن مجید کی جن آیات پر وہ کلام فرما رہے ہیں، ان کو نازل ہوئے ۱۳۷۸ سال گزر چکے ہیں۔ اس پوری مدت میں مسلم معاشرہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں مسلسل موجود رہا ہے۔آج کسی ایسی معاشی یا مدنی یا سیاسی حالت کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جو پہلے کسی دور میں بھی مسلم معاشرے کو پیش نہ آئی ہو لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ پچھلی صدی کے نصف آخر سے پہلے پوری دنیائے اسلام میں کبھی یہ تخیل پیدا نہ ہوا کہ تعدداز واج کو روکنے یا اس پر سخت پابندیاں لگانے کی ضرورت ہے؟ اس کی کوئی معقول توجیہ اس کے سوا کی جاسکتی ہے کہ اب ہمارے ہاں تخیل ان مغربی قوموں کے غلبے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو ایک سے زائد بیوی

رکھنے کو ایک قبیح و شنیع فعل، اور خارج از نکاح تعلقات کو (بشرط تراضی طرفین) حلال وطیب یا کم از کم قابل در گزر سمجھتی ہیں؟ جن کے ہاں داشتہ رکھنے کا طریقہ قریب قریب مسلم ہو چکا ہے مگر اسی داشتہ سے نکاح کر لینا حرام ہے؟ اگر صداقت کے ساتھ فی الواقع اس کے سوا اس تخیل کے پیدا ہونے کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی تو ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح خارجی اثرات سے متاثر ہو کر قرآنی آیات کی تعبیریں کرنا کیا کوئی صحیح طریق اجتہاد ہے؟ اور کیا عام مسلمانوں کے ضمیر کو ایسے اجتہاد پر مطمئن کیا جاسکتا ہے؟ (سنت کی آئینی حیثیت ۲۳۹)

اعتراض نمبر ۱۵۴

عیسائی کہتے ہیں کہ اسلام نے چار (شادیوں) کو ہی کیوں جائز قرار دیا''۔ (رحمت اللعالمین جلد اول۔۱۶۴۔۱۶۵)

جواب: قاضی (رحمۃ اللعالمین۔۱۶۴) فرماتے ہیں ''ہم پوچھتے ہیں کہ کیا مسیحؑ نے یہودیوں کے رواج کثرت زوجات میں کوئی اصلاح کی تھی؟ اگر نہیں تو یہ بھی اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے جملہ مذاہب عالم میں سے اس مسئلہ کے متعلق ایک حد مقرر کی۔ انجیل متی ۲۵ باب کو شروع سے پڑھ کر دیکھیں جس میں ایک دولہا کے ساتھ دس کنواریوں کی شادی کا ذکر ہے جن میں پانچ تو دلہا کے ساتھ گئیں اور پانچ اپنی نادانی سے پیچھے رہ گئیں۔ یہ تمثیل کثرت زوجات کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں دو تین چار تک اجازت دے کر پھر فرمایا گیا ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً''۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ تم اپنی بیویوں کے لیے عدل نہ کر سکو گے تب صرف ایک بیوی کرنا۔ پھر یہ بھی فرما دیا ''وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ''۔ تم کبھی اپنی بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو گے اگرچہ تم خود بھی ایسا کرنا چاہتے ہو۔ پس یہ اسلام ہے جس نے دنیا کی تمام مذہبی کتابوں سے پیشتر ''تب صرف ایک بیوی'' کے الفاظ کو قانونی اور حکمی طور پر بیان کیا ہے۔ اسلام کے لیے یہی فخر اور فضل کافی ہے۔ جب قومی عزت و وقار کا حصر آبادی پر ہو، تب اس وقت قومی عزت کے لیے ایک سے زیادہ بیوی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ گویا ذاتی آرام ایک سے زیادہ بیوی کرنے میں نہیں رہتا لیکن دنیا کے عقل مند جانتے ہیں کہ مبارک وہ ہیں جو قوم کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے ہر خاتون کے اپنے اپنے جذبات ہوتے ہیں۔ ہر عورت اپنے حقوق کے حصول کی متمنی ہوتی ہے اس سلسلے میں شادی کے مسئلہ کو دیکھیں تو عورتوں کی تعداد کے زیادہ ہونے کے باعث ہر عورت شادی نہیں کر سکتی لہٰذا اسے اس کا حق اور اس کے جذبات کی تسکین کے لیے اسلام نے نہایت اعلیٰ اور خوبصورت نظام دیا کہ مرد انصاف کر سکے تو وہ چار عورتوں سے شادی کر سکتا ہے اس صورت میں عورتوں کی زیادہ تعداد آڑے نہیں آتی۔

اعتراض نمبر ۱۵۵

بعض کہتے ہیں کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے جس سے عورت کو کم تر مرتبہ دیا گیا ہے۔(اسلام میں خواتین کے حقوق ۹۹)

جواب: اسلام کے قانون وراثت کا سطحی مطالعہ کرنے سے یہ مغالطہ لگتا ہے کہ عورت کا مرتبہ مرد سے کم تر ہے۔ شاید یہ غلط فہمی قرآن حکیم کی درج ذیل آیت پاک کی حکمت صحیح طور پر نہ سمجھنے کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ ”لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ“۔(النساء۱۷۶)(ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے)۔

مرد و عورت کے مساوی حصہ کی نظیر: علامہ طاہر القادری (اسلام میں خواتین کے حقوق۔۱۰۲) لکھتے ہیں ”معاشرے میں بعض مرد اور عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر عمر رسیدگی یا کسی اور سبب سے مالی ذمہ داریوں کا بوجھ رہتا یا کم از کم مرد پر عام حالات کی طرح عورت کے مقابلہ میں زیادہ بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ دونوں یکساں مالی ذمہ داریوں کے حامل ہو جاتے ہیں۔ یہ مقام اس وقت آتا ہے جب مرنے والے کے والدین زندہ ہوں اور اس متوفی کی اولاد بھی ہو، جب اس صاحب اولاد متوفی کی وراثت تقسیم ہو گی تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکہ کا ۱/۶ حصہ ملے گا۔

وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ“۔(النساء۱۱، پارہ۴)

”اور (میت کے) ماں باپ کے لیے ان دونوں میں سے ہر ایک کو (برابر) ترکہ کا چھٹا حصہ (ملے گا) بہ شرط کہ مورث کی کوئی اولاد نہ ہو“۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔” وَاِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ“۔

”اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کی وراثت تقسیم کی جا رہی ہو جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ کوئی اولاد اور اس کا ماں کی طرف سے ایک بھائی یا ایک بہن ہو (یعنی اخیافی بھائی یا بہن) تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے (برابر طور پر) چھٹا حصہ ہے“۔

اس طرح باوجود یہ کہ وراثت کی تقسیم مرد و عورت کے مابین ہو رہی ہے، یہ برابر ہو گی۔ اگر اسلام کے نظام وراثت میں محض مرد ہونے کی وجہ سے عورت کے حصے سے دو گنا قرار پایا ہوتا یا عورت کا حصہ محض عورت ہونے کی وجہ سے نصف ہوتا تو پھر اس مقام پر جب وہ ماں باپ کی حیثیت سے وراثت لے رہے ہیں۔ تو یہاں بھی ان کے حصے کا فرق برقرار رہتا جب کہ یہاں ایسا معاملہ نہیں ہے۔ گویا عورت کا حق وراثت مرد سے نصف نہیں کیا گیا بل کہ مرد کا حقِ وراثت اس کی اضافی ذمہ داریوں کی وجہ سے بڑھا دیا گیا ہے۔ اس طرح مرد و عورت کی معاشرتی، سماجی اور عائلی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مالی توازن قائم کر

دیا گیا ہے تا کہ مرد اپنے اوپر عائد جملہ ذمہ داریوں سے بطور احسن عہدہ برآ ہو سکیں۔ عورت کو اپنے والدین کے گھر سے وراثت کا حق ملتا ہے اور سسرال کے ہاں جانے سے سسرال سے بھی حقِ وراثت ملتا ہے۔ دونوں طرف سے اسے حصہ مل رہا ہے لیکن اس کے برعکس بیٹے کو صرف والدین کی طرف سے وراثت کا حق ملتا ہے۔ لہٰذا بیٹے کی مالی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ دیا جاتا ہے۔

ضمناً اعتراض

روبن لیوی لکھتے ہیں کہ اپنے قانون وراثت کے لیے تو محمد ﷺ بلاشبہ وقتی تقاضوں کے ہاتھوں مجبور تھے جب مردان کے آدرش کے لیے میدان جنگ میں جان قربان کر رہے تھے تو آپ قدیم نظام کو کیونکر برقرار رکھ سکتے تھے جبکہ اس صورت میں مومنین کی بیویاں اور بچے تو محروم رہ جاتے اور وہ لوگ اس (جائداد) سے مستفید ہوتے جو آپ ﷺ کے کٹر مخالفین تھے۔ (روبن لیوی) ''محمد رسول اللہ اکرم طاہر۔ ۲۹۸''

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ عورتوں نے ہجرت کرنے میں شرکت کی۔ جنگوں میں بھی حصہ لیا زخمیوں کی دیکھ بھال کے علاوہ پانی پلانے کا کام بھی کرتی تھیں نماز باجماعت مسجد میں پڑھتی تھیں ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا میں مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میں اس کو لمبا کروں، پھر میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں نماز مختصر کر دیتا ہوں اس اندیشہ کی بنیاد پر کہ اس کی ماں کو تکلیف دوں گا (بخاری شریف۔ کتاب الصلوۃ)

ظہار کو ختم کر کے صنف نازک پر احسان فرمایا۔ مہر مقرر کر کے عورت کی عزت افزائی کی ایک وقت تھا کہ حضرت عمرؓ نے کم آمدنی والے لوگ جو مہر کی زیادہ رقم ادا کرنے پر پریشان تھے، مہر کی رقم کم کرنے کا اعلان فرمایا تو مجمع سے ایک عورت بول اٹھی اور اس آیت کو پڑھا۔

'' وَّ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡـًٔا (النساء ۲۰، پارہ ۴) (ترجمہ) تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سارا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا'' اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر یہ عورت نہ ہوتی تو آج عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

بعض مستشرقین نے عورت کے مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کی ہے اور عورت کو اسلام کے عطا کردہ حقوق کو سیاسی مصلحتوں کا پلندہ کہا یا پھر جاہلیت کے معاشرے کی باقیات سے جوڑ دیا جبکہ عورت کو تمام حقوق عطا کر کے صنف نازک کو مردوں کے برابر لا کھڑا کیا اس بات کا روبن لیوی کو بھی اعتراف ہے وہ کہتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں عورتوں کو اپنی عزت و ناموس کو داؤ پر لگائے بغیر خلع مل جاتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ روبن لیوی ایک عجیب بات کہہ دیتا ہے کہ محمد ﷺ کے عہد میں بھی نظام کہن کے کچھ ایسے اثرات باقی تھے جن کی رو سے شادی کا مطلب خاوند کا بیوی پر مکمل حاکمیت نہ تھا''

اس کا جواب یہ ہے کہ اس بچارے کو یہ خبر نہ ہوئی کہ دور جہالت کا معاشرہ مرد کی غیر مشروط مکمل حاکمیت کا عکاس ہے اس وقت عورت کو اسلام نے وراثت وحق نکاح، حق خلع، جائداد و نان نفقہ کا حق دوسری شادی کا حق ولعان کا حق یعنی اسلام نے ہر شعبہ میں عورت کو حقوق عطا کر کے بڑا احسان کیا۔ یہ اس وقت حقوق دیئے جب عرب معاشرہ جاہلیت کے گھٹا ٹوپ منحوس رسم و رواج میں گھرا ہوا تھا۔ عرب بیٹی کی پیدائش پر نادم ہوتے اور جل بھن جاتے۔ لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے حتی کہ نومولود بیٹیوں کو زندہ درگور کر کے سکھ کا سانس لیتے تھے قرآن مجید میں ہے ''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی اور وہ بس خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائے اور سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دئے'' (النحل۔۵۹۔۵۸)۔

یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ اس نے بیٹی کو رحمت کا اعزاز بخشا بہن کو نعمت قرار دیا اور ماؤں کے قدموں تلے جنت کی خوشخبری سنائی۔ آجکل بھی بیٹیوں کو زندہ قبر میں ڈالنے کی مختلف صورتیں ایجاد ہو چکی ہیں لیکن اسلام ان بھیانک رسموں کو کسی طور قبول نہیں کرتا۔

''اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں'' جو کہتے ہیں کہ عورتیں شیطان سے بھی زیادہ مکار ہیں۔ وہ سورہ یوسف کی قرآنی آیت اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ ''بے شک عورتوں کا مکر بہت بڑا ہے اور شیطان کے بارے میں ہے ''اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا'' (بے شک شیطانی مکر بہت کمزور ہے، اس موخر الذکر آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ شیطانی مکر ضعیف اور کمزور ہے اور اول الذکر آیت میں عورتوں کے مکر کو بڑا یعنی عظیم کہا گیا ہے اس لیے عورت شیطان سے زیادہ عیار ہے۔ تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ بعض سلسلہ کلام میں آیت کی معنویت کو سمجھنے سے قاصر رہے، دراصل شیطان کے مکر والی آیت اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور اول الذکر آیت میں عزیز مصر کے ردعمل کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی زوجہ کی بے وفائی پر آگاہ ہوا اور بول اٹھا کہ بے شک عورتوں کا مکر بہت بڑا ہے۔ ایک اور مفسر نے یہ تو اقرار کیا کہ مذکورہ قول اللہ تعالیٰ کا نہیں، زلیخا کے شوہر کا ہے تاہم اسے یہ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قول کی تردید نہیں کی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔ جب بات واضح ہے تو پھر کسی تائید کی ضرورت نہیں رہتی اور نہ ہی تردید کی۔ (محمد رسول اللہ (اکرم طاہر)۔۲۷۲)

اعتراض نمبر ۱۵۶

مستشرقین کہتے ہیں " The fatal point in isalm is the degradition of women" یعنی اسلام کا تباہ کن پہلو عورت کو حقیر درجہ دینا ہے۔'' (امہات المومنین ۱۵)

جواب: اسلام سے قبل کے مذاہب تجرد کو پارسائی اور اخلاقی معیار گردانتے تھے۔ اس کا سبب یہ

تھا کہ عورتوں کو حقیر سمجھتے تھے اور کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنی زندگی میں عورتوں کو شامل کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے ''تجرد کسی نہ کسی شکل میں پوری مذہبی تاریخ میں موجود رہا۔ عملی طور پر وہ دنیا کے تمام بڑے مذہبوں میں پایا جاتا رہا'' (امہات المومنین ۱۵) اسلام نے اس کا قلع قمع کر دیا۔ سرکارِ دو عالمؐ نے فرمایا ''نکاح میری سنت ہے جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں''۔

ان کہنے والوں کے اپنے اندرونی حالات کا جائزہ پیش کریں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں، نبض ڈوبنے لگتی ہے، سانس رکنے لگتا ہے کہ یہ لوگ کیا ہیں؟ کس قسم کے ہیں؟ کہنے کو کچھ کہتے ہیں مگر کرتے کچھ اور ہیں۔ امریکہ کی کارکن خواتین کے بارے میں رپورٹ ملاحظہ کیجئے۔ ایک بنک کے پریزیڈنٹ سڈنی ٹیلر نے اپنے بنک کی ایک خاتون کارکن مائیکل ونس کو جسمانی ایذا دی اور اس کی عصمت دری کی۔ یہ سلسلہ چار سال تک چلتا رہا۔ یہ خاتون عورتوں کی ایک تنظیم کی مدد سے عدالت میں گئی۔ ڈسٹرکٹ کورٹ نے اپیل خارج کر دی اس وجہ سے کہ وہ چار سال تک خاموش رہی اور اس نے بنک کے شکایتی نظام سے مدد کی درخواست نہیں کی۔ عدالت نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان رضا کارانہ تعلق تھا۔ ہائی کورٹ سے مسئلہ حل نہ ہوا۔ آخر سپریم کورٹ میں پہنچا۔ گذشتہ پانچ برسوں میں دفتروں میں کام کرنے والی عورتوں کی نصف تعداد اس قسم کی بدسلوکی کا نشانہ بنی۔ دوم. ۴ فیصد کو پریشان کیا گیا۔ ریاستی اور میونسپل حکومتوں کے مختلف شعبوں میں کارکن ۶۰ فیصد خواتین نے بتایا کہ جنسی بدسلوکی کے لیے عام تجربہ بن چکی ہے۔

ملازمتیں: ۱۹۶۴ء میں لنڈن جانسن نے ایک صدارتی حکم میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ سرکاری ملازمتیں دینے کو کہا۔ اس چارٹ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں لگ پتہ جائے گا۔

ادارہ/اونچے سکیل کی سرکاری ملازمتیں

عہدہ	مرد	عورت
فیڈرل اپیل کورٹ	۹۷ جج	ا جج
فیڈرل ڈسٹرکٹ کورٹ	۲۰۲ جج	۴ جج
سپریم کورٹ	۹ جج	صرف کلرک جج کی ا عورت
امریکی سینٹ	ـ	ا
ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو	ـ	اا
کل ججز	۱۰۰۰۰	۲۰۰

اٹارنی جنرل	-	-
فیڈرل سروس ڈسٹرکٹ اٹارنی	۹۳	-
سائنس دان	۹۰٪	۱۰٪
نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے منتخب ممبر ۸۰۰ سے زیادہ	۹۱٪	۹٪
نوبل انعام پانے والے	۲۷۸	۶
وکلاء(قانون دان عورتیں ۸۴٪ پرائیویٹ کام کرتی ہیں)	۵۰٪	۱۳٪
ٹوٹل: ۳۲۵۰۰۰	۳۱۶۰۰۰/۳۲۵۰۰۰	۹۰۰

کوئی عورت تا حال صدر نہ بن سکی اور نہ ہی کوئی عورت نائب صدر کے عہدے تک پہنچی ہے۔ ہمارے ملکوں میں عورتیں وزیر اعظم اور صدر کے عہدے تک پہنچی ہیں۔تمام دیگر شعبوں میں خاطر خواہ شریک کار ہیں مگر ہمارے مخالفین کا معاملہ یہ ہے کہ'' اوروں کو نصیحت خود میاں فضیحت ! امریکی سپریم کورٹ کی پیشانی پر یہ فقرہ لکھا ہوا ہے'' قانون کے تحت یکساں انصاف'' لیکن آپ نے مذکورہ چارٹ میں دیکھا کہ عورت کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اسے یکساں انصاف کہا جا سکتا ہے؟ پھر کس بنیاد پر عورت کے وکیل بنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام کا تباہ کن پہلو یہ ہے کہ اسلام عورت کو حقیر درجہ دیتا ہے۔ وہ اسلام جو ماؤں کے قدموں تلے جنت ٹھہراتا ہے۔وہ اسلام کا پیغمبر ﷺ ہے جو حقیقی نہیں رضاعی ماں بہن کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دیتا ہے۔وہ اسلام ہے جس کا شارح اپنی بیٹی کی آمد پر اٹھ کر استقبال کرتا ہے۔وہ اسلام جو دختر کشی کی لعنت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا حکم دیتا ہے۔یہی دین اسلام ہے جو دو بہنوں کو بہ یک وقت زوجیت میں لینے سے منع فرماتا ہے۔عورت کے ہر شعبہ زندگی سے متعلق حقوق عطا کرتا ہے۔خواہ ماں بہن بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے حق ہو یا شادی بیاہ، خیار بلوغ، کفالت، تحفظ، بچوں کی پرورش، خلع، مہر، میراث، گواہی اور رائے دہی کے حق سے سرفراز کرتا ہے۔لیکن مستشرقین پھر بھی ہم سے گِلہ کرتے ہیں کہ وفادار نہیں۔ یہ تو ان کی ناانصافی اور عقلی فتور کی جلوہ گری ہے۔

اعتراض نمبر ۱۵۷

بعض حقِ رائے دہی کا سہرہ مغرب کے سر رکھتے ہیں''۔

جواب: اسلام نے عورت کو سربراہ مملکت کے چناؤ، قانون سازی اور دیگر ریاستی معاملات میں مردوں کے برابر رائے دہی کا حق عطا کیا ہے۔ برطانیہ میں ۱۸۹۷ء میں رائے دہی کے لیے جدو جہد کا

آغاز ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں تیس سال سے زائد عمر خواتین کو رائے دہی کا حق دیا گیا۔ امریکہ میں جولائی ۱۷۷۶ء کا اعلان آزادی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے مگر اس میں بھی عورت کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ رچرڈ این کرنٹ کہتا ہے ''نو آبادیاتی معاشرہ میں ایک شادی شدہ عورت کے کوئی حقوق نہ تھے اور نہ ہی انقلاب آزادی سے اس میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی''۔ انیسویں صدی کی امریکہ کی عورتوں کی علم بردار Susan B Anthony کو ۱۸۷۲ء میں صدارتی الیکشن میں ووٹ ڈالنے پر گرفتار کر لیا گیا اور ایک سو ڈالر کا جرمانہ کیا گیا۔ کیوں کہ رائے حق دہی حاصل نہیں تھا۔ عورتوں کو حق رائے دہی کے تفویض کرنے کے لیے جدوجہد ہوتی رہی۔ بالآخر پہلی بار سب سے پہلے نیوزی لینڈ وہ ملک ہے جس نے یہ حق ۱۸۹۳ء میں عورتوں کو دیا۔ آج کی جدید دنیا میں عورت کو حق رائے دہی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ ۱۴۴ ممالک میں عورتوں کو ملنے والے حق رائے دہی کی جدوجہد ۱۸۹۳ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۸۰۔۱۹۷۵ (Vanuatu) تک حق رائے دہی ملتا رہا۔ جب کہ مسلمان خواتین کو مدتوں پہلے یہ حق اسلام نے عطا کر رکھا تھا۔ قرآن حکیم میں عورتوں کی بیعت سے متعلق ہے۔ ترجمہ: اے نبی جب آپ کی خدمت میں مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گی اور چوری نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے کوئی جھوٹا بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گی (یعنی شوہر کو دھوکہ دیتے ہوئے کسی غیر کے بچے کو اپنے پیٹ سے جنا ہوا نہیں بتائیں گی) اور (کسی بھی) امر شریعت میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی تو آپ ان سے بیعت لے لیا کریں اور ان کے لیے اللہ سے بخشش طلب فرمائیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔ (الممتحنہ ۶۰۔۱۲)

آپ کی اس سنت مبارکہ پر عمل خلافت راشدہ میں بھی ہوتا رہا اور رائے دہی کے معاملات میں خواتین بھرپور شرکت کرتی تھیں۔ حضرت مسور بن مخرمؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے بعد جانشین کے انتخاب کے لیے چھ رکنی کمیٹی بنائی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو چیف الیکشن کمشنر بنایا گیا۔ انھوں نے استصوابِ عام کے ذریعے مسلسل تین دن گھر گھر جا کر لوگوں کی آراء معلوم کیں۔ جن کے مطابق بھاری اکثریت نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنائے جانے کے حق میں ہاں کر دی۔ اس الیکشن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ تاریخ میں پہلی بار ایسی مثال قائم کی گئی۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے آج سے چودہ سو سال قبل عورت کو حقِ رائے دہی عطا کیا''۔ (اسلام میں خواتین کے حقوق ۱۱۱۔۱۲۶) دہلی ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس مسٹر راجندر سچر نے ایک مرتبہ دہلی کی ایک تقریب میں کہا ''تاریخی طور پر اسلام عورتوں کو جائیداد اور پراپرٹی کے حقوق عطا کرنے میں بہت زیادہ فراخ دل اور ترقی پسند واقع ہوا ہے۔

یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ ۱۹۵۶ء تک ہندو Codebill (کوڈ بل) بننے سے پہلے ہندو عورتوں کا جائیداد میں کوئی حصہ نہ تھا۔ جب کہ اسلام مسلم عورتوں کو یہ حقوق چودہ سو سال قبل دے چکا تھا''۔(امہات المومنین۔۱۵۔۱۴) اسی طرح اسلام نے ہر شعبہ زندگی سے متعلق حقوق، عورت کو عطا کیے اور حقِ رائے دہی بھی اسلام کا مرہون منت ہے۔

اعتراض نمبر ۱۵۸

امت کے لیے تو مثنیٰ وثلث اور ربع کے اجازت کے بعد چار تک کی تحدید کر دی گئی اور جن امتیوں کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں ان سے چار کے علاوہ کو جدا کیا گیا لیکن خود حضورؐ نے اس پر عمل نہیں فرمایا بل کہ جو نو بیویاں نزول آیت کے وقت تھیں وہ بدستور رہیں۔ اپنے لیے یہ رعایت اور امت کو اس رعایت سے محروم رکھتے ہیں، کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ یہ دوہرا معیار کیوں؟

جواب: ڈاکٹر حمید اللہ کی تقریر: ''تعداد ازواج کے سلسلے میں قرآن مجید کے نئے حکم سے ازواج مطہرات کو آگاہ کیا کہ ایک مرد کے ہاں چار بیویاں بہ یک وقت رہ سکتی ہیں۔ احکام خداوندی کی بنیاد پر رسول اللہ نے انھیں بتایا ''اگر چہ میں تم سب کو اپنی بیوی کی طرح رکھنے کو تیار ہوں مگر ایک شرط پر کہ میں ازواجی تعلقات ایک وقت میں چار سے رکھوں گا۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ رسول خدا نے آیت کے الفاظ کی تعبیر اس طرح کی جیسا قرآن بتاتا ہے (۳۳۔۵۱) ''ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم زدہ نہ ہوں''۔ دراصل نبی کریم جن چار بیویوں سے ازواجی تعلقات رکھتے تھے ان میں وہ ردوبدل کرتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پہلی چار کی جگہ دوسری چار جگہ لے لیتی تھیں لیکن قرآنی آیات کی تفسیر وتعبیر اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلی آیت نازل ہوئی (۳۳۔۵۲) اس کے بعد آپ کے لیے عورتیں حلال نہیں ورنہ یہ آپ ان سے اور عورتیں تبدیل کریں۔ اگر چہ آپ کو ان کا حسن پسند آئے۔ اِلّا جو آپ کی مملوکہ ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود رسول اللہ کی ذات شادی کے معاملے میں بھی قانون سے بالاتر نہیں''۔ (محمد رسول اللہ۔۲۵۸۔۲۵۶)۔(ن۲۔۶۴۶)

سورہ الاحزاب آیت ۵۰ تا ۵۳ کا ترجمہ: ''اے نبی! ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیں وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمھاری ملکیت میں آئیں اور تمھاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی اور وہ مومن عورت جس نے اپنے کو نبی کے لیے ہبہ کیا ہو، اگر نبی ان سے نکاح کرنا چاہیں، یہ رعایت خالصتاً تمھارے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ تمام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کی ہیں۔ تمھیں اختیار ہے کہ اپنی بیویوں میں

سے جسے چاہیں اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلا لو، اس معاملے میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ اس کے بعد دوسری عورتیں تمھارے لیے حلال نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویوں کو لے آؤ، خواہ ان کا حسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو البتہ لونڈیوں کی تمھیں اجازت ہے۔ اللہ ہر چیز پر نگران ہے"۔ ان آیات میں مذکورہ الزام کا جواب دیا گیا ہے "جنھیں مہر دے کر تم اپنے نکاح میں لائے ہو ہم نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ۱: عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے بھی ہم ہیں اور اپنے نبی کو اس قید سے مستثنٰی کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔

۲: اگر وہ قید لگانے کے ہم مجاز ہیں تو آخر اس استثناء کے مجاز ہم کیوں نہیں ہیں؟

۳: قرآن کی ایک محکم آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ نبی نے چار بیویوں کے عام قانون سے اپنے آپ کو مستثنٰی نہیں کیا بل کہ یہ استثناء کا فیصلہ ہمارا کیا ہوا ہے۔

۴: وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپ کی ملکیت میں آئیں' اس اجازت کے مطابق حضور نے غزوہ بنی قریظہ کے سبایا میں سے حضرت ریحانہؓ غزوہ بنو المصطلق کے سبایا میں سے حضرت جویریہؓ غزوہ خیبر کے سبایا میں حضرت صفیہؓ اور مقوقس مصر کی بھیجی ہوئی ماریہ قبطیہ کو اپنے لیے مخصوص کیا۔ ان میں سے مقدم الذکر تین کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا لیکن ماریہ قبطیہ کو اپنے لیے مخصوص کیا۔ ان میں سے مقدم الذکر تین کو آپ نے آزاد کر کے نکاح کیا تھا لیکن ماریہ سے بر بنائے ملک یمین تمتع فرمایا۔

۵: آپ کی چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں میں سے وہ خواتین جو ہجرت میں بھی آپ کے ساتھ رہی ہوں بل کہ یہ تھا کہ وہ بھی اسلام کی خاطر راہ خدا میں ہجرت کر چکی ہوں۔ حضور کو اختیار دیا گیا کہ ان رشتہ دار مہاجر خواتین میں سے بھی جس سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ اس اجازت کے مطابق ۷ھ میں آنحضرتؐ نے ام حبیبہ سے نکاح فرمایا۔

۶: ضمناً اس آیت میں یہ بھی ہے کہ چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں ایک مسلمان کے لیے حلال ہیں۔ اس معاملہ میں اسلامی شریعت عیسائی اور یہودی دونوں مذاہب سے مختلف ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ایسی عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا جس سے سات پشت تک مرد کا نسب ملتا ہو اور یہودیوں کے ہاں سگی بھانجی، بھتیجی تک سے نکاح جائز ہے۔

۷: وہ مومن عورت جو اپنے آپ کو نبی پاک کے لیے ہبہ کرے یعنی بلا مہر اپنے آپ کو حضور کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو اور اگر حضور اسے قبول کریں، اس اجازت سے آپ نے شوال ۷ھ میں حضرت میمونہ سے نکاح فرمایا لیکن آپ نے پسند نہ کیا کہ مہر کے بغیر ان کے ہبہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اس لیے آپ نے ان کی کسی خواہش اور مطالبہ کے بغیر ان کو مہر دیا تھا۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ حضور کے نکاح میں کوئی موہوبہ بیوی نہ تھی مگر اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپ نے ہبہ کرنے والی بیوی کو بھی مہر دیے بغیر نہیں رکھا۔

۸: (یہ رعایت خالصتاً تمھارے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں) اس فقرہ کا تعلق اگر صرف قریب کے فقرہ سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ کوئی عورت خود کو اس کے ہبہ کرے اور بلا مہر اس سے نکاح کرے اور اگر اس کا تعلق اوپر کی پوری عبارت سے مانا جائے تو اس سے مراد ہوگی کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی رعایت بھی صرف نبی مکرم ﷺ کے لیے ہے عام مومنین کے لیے نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کچھ احکام نبی کریم ﷺ کے لیے خاص ہیں۔ جن میں امت کے دوسرے لوگ آپ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ قرآن وسنت کے ذریعے ایسے متعدد احکام کا پتہ چلتا ہے مثلاً حضور ﷺ کے لیے نماز تہجد فرض تھی اور باقی تمام امت کے لیے نفل ہے۔ آپ ﷺ کے لیے اور آپ ﷺ کے خاندان والوں کے لیے صدقہ حرام ہے اور کسی دوسرے کے لیے حرام نہیں۔ آپ ﷺ کی میراث تقسیم نہیں ہوسکتی تھی، باقی سب کی میراث کے لیے وہ احکام ہیں جو سورہ النساء میں ہیں۔ آپ ﷺ کے لیے چار سے زائد بیویاں حلال کی گئیں، بیویوں کے درمیان عدل آپ پر واجب نہیں کیا گیا، اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کرنے کی آپ کو اجازت ہے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی بیویاں تمام امت پر حرام کر دی گئیں۔ ان میں سے کوئی خصوصیت بھی ایسی نہیں جو حضور کے علاوہ کسی مسلمان کو حاصل ہو نیز کتابیہ عورت سے نکاح ممنوع تھا حالاں کہ باقی امت کے لیے وہ حلال ہے۔

۹: قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِىٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ''۔ ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیں تمھیں ان حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے تا کہ تمھارے اوپر کوئی تنگی نہ رہے''۔ یہ وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو عام قاعدہ سے مستثنیٰ فرما دیا۔ ''تنگی نہ رہے'' کا مطلب یہ نہیں کہ نعوذ باللہ آپ کی خواہشات نفسانی بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ اس سے آپ کو بہت سی بیویوں سے شادی کی اجازت دے دی گئی تھی تا کہ آپ صرف چار بیویوں تک محدود نہ رہیں اور تنگی محسوس نہ کریں۔ اس فقرہ کا مطلب صرف وہی شخص لے سکتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو کر اس بات کو بھول جائے کہ محمد ﷺ نے ۲۵ سال کی عمر میں ایک ایسی خاتون سے شادی کی جن کی عمر ۴۰ برس تھی اور پورے

۲۵ سال تک آپ ﷺ ان کے ساتھ نہایت خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے ایک سن رسیدہ خاتون حضرت سودہؓ سے نکاح کیا اور چار سال تک تنہا وہی آپ ﷺ کی بیوی رہیں۔ اب کون صاحب عقل اور ایمان دار یہ تصور کر سکتا ہے کہ ۵۳ سال عمر گذر جانے کے بعد یکا یک حضور ﷺ کی خواہشات نفسانی بڑھتی چلی گئیں۔ اور تنگی محسوس کی، دراصل تنگی نہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کارِ عظیم کو نگاہ میں رکھے جس کی ذمہ داری اللہ پاک نے آپ پر ڈالی تھی۔ دوسری طرف ان حالات کو سمجھیں جن میں یہ کارِ عظیم انجام دینے کے لیے آپ کو مامور کیا گیا تھا۔ تعصب سے ذہن پاک کر کے ان دونوں حقیقتوں کو سمجھ لینے سے ہر فرد بخوبی جان لے گا کہ بیویوں کے معاملے میں آپ کو اجازت دینا کیوں ضروری تھا اور چار کی قید میں آپ کے لیے کیا تنگی تھی۔ (تفہیم القرآن ۴۔۱۱۳)

دوسروں کے لیے چار، اپنے لیے نو بیویوں کی چھوٹ کیوں؟ اور بعض اسے سنت قرار دیتے ہیں (اس الزام کے جواب میں محمد جعفر کی تقریر)

مسیحی اور دوسرے غیر مسلموں اور ان کے ہم نوا آزاد خیال حضرات کی نظروں میں حضور اکرم کا بہ یک وقت نو بیویاں حرم میں رکھنا بہت کھٹکتا ہے اور دوسری طرف خود مسلمان حضور کی صحیح پوزیشن کو نہ سمجھنے کے باعث ہر حال میں تعدد ازواج کو سنت قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ امت کے لیے تو مثنیٰ، ثلث اور ربع کے نزول کے بعد چار تک تحدید کر دی گئی اور جن امتیوں کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں ان سے چار کے علاوہ جدا کر دیا گیا لیکن خود حضور نے اس پر عمل نہیں کیا بل کہ جو نو بیویاں نزول آیت کے وقت تھیں وہ بدستور رہیں۔ اپنے لیے یہ رعایت اور امت کو اس رعایت سے محروم رکھنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ بظاہر ایسا ہی لگتا ہے کہ حضورؐ کے لیے یہ رعایت ہے اور امت اس رعایت سے محروم ہے لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مندرجہ ذیل حقائق پر غور کیجیے۔

الف: ہر مسلمان کے لیے چچا، ماموں اور خالہ اور پھوپھی زاد بہنیں نکاح میں لانا جائز ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے لیے ان نو عورتوں کے بعد ہمیشہ کے لیے نکاح کا دروازہ بند ہو گیا۔ ارشاد ربانی ہے۔ ''لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِن بَعدُ وَلَا اَن تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِن اَزوَاجٍ وَّلَو اَعجَبَکَ حُسنُهُنَّ'' ''اے رسول! اب موجودہ بیویوں کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ ان کو الگ کر کے دوسری ازواج کرنا حلال ہے اگرچہ دوسری عورتوں کا حسن بھی آپ کو بھاتا ہو۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے حضور کے لیے ان سے اسی صورت میں نکاح جائز ہے جب کہ ان عورتوں نے اسلام کی خاطر ہجرت کی ہو۔ ارشاد خداوندی ہے ''بنت عمک و بنت عمتک و بنت خالک و بنت خالتک التی ھاجرن معک'' یہی وجہ ہے کہ حضور کے سگے چچا ابو طالب کی بیٹی ام ہانی حضور کے لیے حلال نہ تھیں کیوں کہ وہ فتح مکہ کے بعد ایمان

لائی تھیں جب کہ ہجرت ختم ہو چکی تھی۔

ب: ہر امتی بشرط عدل وانصاف چار بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن قانوناً وہ ان سب کو یا بعض کو الگ کر کے دوسری عورتوں کو حبالہ عقد میں لاسکتا ہے۔ وہ اس طرح قانون سے اپنی ہوس اور نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سینکڑوں نکاح کر سکتا ہے۔

ف: امت کا کوئی فرد ایک بیوی کی وفات کے بعد یا ضرورت ہو تو زندگی میں دوسری اور یوں ہی تیسری، چوتھی بیوی کر سکتا ہے لیکن رسول کے لیے ام المومنین میمونہؓ کے بعد یہ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

امت کے لیے بیویوں کو طلاق دے کر اس کے بجائے دوسری بیویاں کرنے کا امکان موجود ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کو اس کی بھی اجازت نہیں۔

امت کے لیے ناموافقت مزاج یا کسی دوسری عورت کی کشش حسن تبدیل زوج کا بہانہ بن سکتی ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ راہ بھی مسدود ہے۔ ذرا انصاف کیجئے! رعائتیں امت کے لیے ہیں یا رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں؟ یہاں زیادہ سے زیادہ چار کی تحدید ہے لیکن موت زوجہ، ناموافقت مزاج اور کسی کی کشش حسن تبدیل وتجدید ازواج کے بہانے بن جاتے ہیں لیکن وہاں ایک کے سوا ساری عورتیں سن رسیدہ، بیوہ، مطلقہ ہونے کے باوجود نہ تجدید بعد الموت کی اجازت ہے نہ تبدیل بعد از طلاق کی اور نہ نو پر کسی اضافے کی۔ بنظر غور دیکھتے ہیں تو رعایت امت کے لیے زیادہ ہے یا خود رسول اللہ ﷺ کے لیے؟ تقریر ختم ہوئی۔

نو میں سے پانچ بچ رہیں۔ ان نو بیبیوں میں سے پانچ کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو زوجیت میں رکھنا ناگزیر ہے۔ ارشاد خداوندی ہے

''وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا'' (الاحزاب ۵۳، پارہ ۲۲) ترجمہ: اور تمھیں نہیں پہنچتا کہ رسول اللہ کو ایذا دو اور نہ یہ کہ ان کے بعد کبھی ان کی بیبیوں سے نکاح کرو''۔ کیوں کہ جس عورت سے آپ نے نکاح فرمایا وہ آنحضرت ﷺ کے سوا ہر شخص پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی۔ اس طرح وہ کنیزیں جو باریاب خدمت ہوئیں اور قرابت سے سرفراز ہوئیں اسی طرح وہ بھی سب کے لیے حرام ہیں (کنز الایمان ص ۷۶۸) اس آیت کی روشنی میں اگر انھیں دور کر دیا جاتا تو کسی اور کے نکاح میں آتی نہیں ہیں تو وہ کس طرح بے کیف زندگی گزارتیں اگر وہ بے یار و مددگار چھوڑ دی جاتیں تو دشمن طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیتے اور آوازے کستے اور کہتے پہلے انھیں رکھا، اب ان سے علیحدگی کر لی وغیرہ وغیرہ۔ ''اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ'' (الاحزاب ٦، پارہ ۲۲)۔ ترجمہ: نبی مومنوں کے ساتھ

خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

اس صورت میں وہ کسی کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔ وہ مومنوں کی مائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہنے، سننے، سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

بائبل کے موجب حضرت مسیحؑ کا نسب کہ وہ حضرت مریمؑ سے بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں یہ نسب خود ان کے حق میں درست اور ثابت ہے اور عام ضابطہ میں مرد و زن یعنی جوڑے سے پیدائش ہوتی ہے گویا یہ قانون صرف حضرت مسیحؑ سے متعلق ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے ایک قبطی و اسرائیلی کو باہم لڑتے دیکھا تو قبطی کو مکا مار کر ہلاک کر دیا (کتاب استثناء باب ۲۱) کیا یہ قتل جائز تھا یا ناجائز۔۔۔ اگر جائز ہے تو بائبل سے ثابت کریں اگر ناجائز ہے تو کیا حضرت موسیٰؑ کی نبوت اس سے داغدار نہیں ہوتی' اگر نہیں ہوتی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر قتل ناجائز تھا تو حضرت موسیٰؑ کو اس وقت کے قانون کے مطابق قتل کی سزا دی گئی یا نہیں' اگر دی گئی تو ثابت کریں۔ اگر نہیں دی گئی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت بن باپ اور حضرت موسیٰؑ کا قتل استثنائی اور اسپیشل قانون کے مطابق تھا اسی طرح چار سے زیادہ بیویوں کا رکھنا آپ ﷺ کے حق میں کیونکر استثنائی قانون نہیں ہوسکتا اور اس پر اعتراض کیوں؟

دوسرا جواب یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے۔ " وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ (رعد: ع٦) ترجمہ: اور البتہ بے شک ہم نے تجھ سے پہلے پیغمبر بھیجے اور ان کو عورتیں اور اولاد دی"۔

اس آیت میں واضح بتایا گیا ہے کہ اے محبوب ﷺ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے ہیں ہم نے ان کو عورتیں دیں جیسا کہ تجھ کو دیں۔ پہلے پیغمبروں کی بیویاں مانتے ہو تو رسول اکرم ﷺ کی تعدد ازواج پر الزام کیوں ہے؟

ہیکل نے تصریح کی ہے کہ حضور ﷺ کی بیویوں کا نکاح آٹھ ہجری سے قبل یعنی قانون مثنیٰ وثلث و ربع سے قبل وجود میں آیا قانون اربعہ سے قبل امت کے لیے بھی چار سے زائد کی اجازت تھی کیونکہ قانون اربعہ کے نزول سے پہلے فرق ہی نہ تھا۔ نبی اور امتی کے لیے چار سے زائد کی بندش نہ تھی۔ اس پر اگر یہ اشکال وارد ہو تو نزول قانون اربعہ کے بعد زائد بیویوں کو الگ کر دیا گیا ہے جسے ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے تو حضور ﷺ بھی امت کی طرف چار بیویاں جن کا نکاح مقدم تھا ان کو چھوڑ کر باقی کو الگ کر دیتے' تو میں کہتا ہوں اس میں نبی اور امتی کا فرق کیا گیا ہے اور یہ حضور ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

کتابیات

۱۔ تفسیر ابنِ کثیر: حافظ عماد الدین ابوالفدا ابنِ کثیر مترجم خطیب الہند مولانا جونا گڑھی

۲۔ تفسیر ضیا القرآن: پیر محمد کرم شاہ

۳۔ تفہیم القرآن: سید ابوالاعلیٰ مولانا مودودی

۴۔ تبیان القرآن: علامہ غلام رسول رضوی

۵۔ کنز الایمان: صدر الفاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

۶۔ تفسیر کبیر: امام فخر الدین، محمد بن عمرازی، مترجم مفتی محمد خان قادری

۷۔ تفسیر روح الایمان: لعلامہ الالوسی البغدادی

۸۔ تفسیر فیوض الرحمان ترجمہ روح البیان: شیخ التفسیر الحدیث، حضرت مولانا مفتی فیض احمد اویسی رضوی

۹۔ تفہیم البخاری: شیخ الحدیث، علامہ غلام رسول رضوی

۱۰۔ موطا امام مالک: امام ابوعبداللہ مالک بن انس بن مالک مترجم ابوالعلا محمد محی الدین جہانگیر

۱۱۔ ترمذی شریف: امام ابوعیسیٰ، محمد بن عیسیٰ

۱۲۔ مسلم شریف: علامہ وحید الزماں

۱۳۔ نسائی شریف: امام عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی

۱۴۔ مشکوٰۃ شریف: فاضل شہیر مولانا عبدالحکیم خاں

۱۵۔ تدوین حدیث: مناظر احسن گیلانی

۱۶۔ ترجمان السنہ: حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی

۱۷۔ الشفا: حضرت علامہ قاضی عیاض مکی

۱۸۔ الوفا: امام ابنِ جوزی

۱۹۔ سیرت النبی: علامہ شبلی نعمانی

۲۰۔ حیاتِ محمد ﷺ: محمد حسین ہیکل

۲۱۔ سیرتِ مصطفیٰؐ: عبدالمصطفیٰ اعظمی

۲۲۔ سیرتِ رحمۃ اللعالمین: قاضی سلیمان، محمد سلمان منصور پوری

۲۳۔ النبی الخاتم: شیخ مولانا منظر احسن گیلانی
۲۴۔ دلائل النبوۃ (اردو ترجمہ): ابو بکر احمد بن الحسین بیہقی
۲۵۔ السیرت النبویہ دھلانی: امام زینی دھلان
۲۶۔ سیرت خاتم النبیین: حکیم محمود احمد ظفر
۲۷۔ سیرتِ مصطفیٰؐ جانِ رحمت: امام احمد رضا خان بریلوی
۲۸۔ سیرتِ طیبہ: ڈاکٹر ربانی
۲۹۔ سید المرسلین: ڈاکٹر محمد الطیب النجار رئیس جامعہ الازہر مترجم رخسانہ جبین
۳۰۔ سیرتِ محمدیہ ترجمہ مواہب الدنیہ: حضرت امام احمد بن محمد بن ابی بکر الخطیب القسطلانی،
ترتیب وتدوین جدید: محمد عبد الستار طاہر مسعودی
۳۱۔ سیرتِ سید الوریٰ: قاضی عبد الدائم دائم
۳۲۔ سیرت سہل السیر: مولانا حکیم ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری
۳۳۔ پیغمبر اسلام: ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۳۴۔ محمد رسول اللہ ﷺ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۳۵۔ مدارج نبوت: حضرت علامہ شیخ محمد عبد الحق محدث دہلوی
۳۶۔ محمد رسول اللہؐ: پروفیسر محمد اکرم طاہر
۳۷۔ ضیاء النبیؐ: پیر کرم شاہ الازہری
۳۸۔ پیغمبرِ اعظم وآخر: ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
۳۹۔ حیاتِ سرورِ کائنات: مارٹن لنگن مترجم (ابو بکر سراج الدین)
۴۰۔ سیرت ابنِ ہشام: مولانا عبد الجلیل صدیقی
۴۱۔ محمد ﷺ: مارٹن لنگس مترجم ابو بکر سراج الدین
۴۲۔ روحِ اسلام: سید امیر علی شاہ
۴۳۔ سیرۃ النبی (اعلان نبوت سے پہلے): مسعود مفتی منصور احمد بٹ
۴۴۔ نبی اکرمؐ کا گھرانہ: ڈاکٹر محمد اختر نواز
۴۵۔ امہات المومنین: حکیم محمود احمد ظفر
۴۶۔ امہات المومنین ومستشرقین: پروفیسر ظفر علی قریشی
۴۷۔ نقوش رسول نمبر: محمد طفیل

۴۸۔ محمد ﷺ: ریو مارکس ڈاؤس

۴۹۔ محمد اینڈ ہز پاور: پی۔ڈی۔لیسی جان سٹون

۵۰۔ جیول آف مدینہ: شیری جونز

۵۱۔ بلاوہ: قاضی عبدالدائم ،دائم

۵۲۔ خطباتِ احمدیہ: سرسید احمد خاں

۵۳۔ قرآنِ پاک ایک ابدی معجزہ: سلطان بشیر محمود

۵۴۔ تاریخِ اسلام: شاہ معین الدین ندوی

۵۵۔ علوم اسلام اور مستشرقین: ڈاکٹر ثناءاللہ ندوی

۵۶۔ امیر المومنین حضرت علی: حکیم محمود احمد ظفر

۵۷۔ تاریخ الخلفا: حضرت علامہ جلال الدین سیوطی

۵۸۔ سو بڑے آدمی: مائیکل ہارٹ

۵۹۔ کائنات در کائنات: اختر کشمیری

۶۰۔ سیرتِ عائشہ صدیقہ: سید سلیمان ندوی

۶۱۔ مقالاتِ افغانی: شیخ الاسلام، محقق الاثر حضرت علامہ سید شمس الحق افغانی

۶۲۔ اسلام اور مستشرقین، مغرب کا اندازِ فکر: ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

۶۳۔ تمدنِ عرب: ڈاکٹر گستاؤلی بان، مترجم شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی

۶۴۔ سیرتِ خدیجۃ الکبریٰ: محمد حسیب القادری

۶۵۔ سیرت الکبریٰ: تاج الدین تاج

۶۶۔ بائبل، قرآن اور سائنس: مورس بکائیے

۶۷۔ مغلوں کا زوال: ہاشم فرید آبادی

۶۸۔ شرح بالِ جبریل: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

۶۹۔ شمعِ حقیقت: قاضی محمد علی

۷۰۔ نور اللغات: مولوی نور الحسن نیر

۷۱۔ نسیم اللغات: سید قائم رضا نسیم امروہوی

۷۲۔ المنجد: مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی

☆☆☆☆☆☆☆☆

رسولِ کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے حوالے سے قلم فرسائی کا موقع خدا کسی کسی کو عطا کرتا ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے چنیدہ ہوتے ہیں۔ ماسٹر محمد نواز بھی اللہ تعالیٰ کے ان چنیدہ لوگوں میں سے ایک ہیں جنھیں حضور ﷺ کی ذات کے حوالے سے دین اور اردو زبان دونوں کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مستشرقین کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے حضور اکرم ﷺ کی ذات کے حوالے سے من گھڑت کہانیاں جوڑتے اور مسلمانوں کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماسٹر محمد نواز نے ان کے اِن سوالات کے مدلل اور واضح جوابات پیش کیے ہیں۔ ان کا انداز محققانہ اور مدبرانہ ہے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے محقق کی طرح لفظوں کو ناپتے ،تولتے اور بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے تمام سوالات کو رد ہی نہیں کیا بلکہ ان کے مثبت جوابات دلائل کے ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کاوش اُن کے ایک قرآن فہم اور تاریخ دان ہونے کی غماز ہے۔ علمی اور فنی اعتبار سے نہ صرف اردو زبان پر ان کی مہارت دکھائی دیتی ہے بلکہ عربی اور انگریزی پر دسترس بھی ان کے عالم ہونے کا ثبوت ہے۔ ''سیرتِ سرورِ عالم ﷺ'' کی اشاعت پر ان کے لیے بھرپور مبارک پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کا یہ کام ان کے لیے توشہ آخرت ثابت ہو۔

طالب حسین کوثری، فیصل آباد